رجسٹرڈ نمبر ا ۸۱ ے

جنوری سنہ ۱۹۳۹ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت : پانچ (۵) روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سیرۃ النبی

رسول اللہ صلعم کے حالات وغزوات، اخلاق وعادات اور تعلیم وارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جس کا نام **سیرۃ النبی** عام طور سے مشہور ہے، مسلمانون کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت واہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔

ابتک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہین، پہلے مین ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہین، اور ابتدا مین ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہی جسمین فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہی دوسرے حصہ مین تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہی تیسرے حصہ مین آپ کے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہے اسمین سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثین کیگئی ہین، پھر ان معجزات کی تفصیل ہی جو بروایات صحیحہ ثابت ہین، اسکے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کیگئی ہے، چوتھے حصہ مین ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپکے ذریعہ مسلمانون کو تعلیم کئے گئے ہین کوشش کی گئی ہی کہ اس مین قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائین، پانچویں حصہ مین عبادت کی حقیقت، عبادت کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح وحکم کا بیان ہی اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ وموازنہ ہے،

چھٹا حصہ جو اخلاق پر مشتمل ہی تقریباً چھپ گیا ہی، مارچ کے شروع مین انشاء اللہ شائقین کے ہاتھون مین پہنچ جائیگا

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول تقطیع خورد للعہ ر، حصہ دوم تقطیع کلاں ے، تقطیع خورد ۵ روپیہ حصہ سوم تقطیع کلاں ے، للعہ، تقطیع خورد معہ دصہ حصہ چہارم تقطیع کلاں عہ وسے، تقطیع خورد عہ حصہ پنجم تقطیع کلاں صہ وللعہ ر، (مینیجر دار المصنفین اعظم گڈھ)

فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۴۳

جنوری سنہ ۱۹۳۹ء تا جون سنہ ۱۹۳۹ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	اسمائے گرامی	صفحہ	شمار	اسمائے گرامی	صفحہ
	شعراء		۵	سہیل، مولوی اقبال احمد صاحب سہیل ایم اے ایل ایل بی،	۳۰۹
۱	احساس، جناب زاہد حسین صاحب احساس مرادآبادی	۱۴۷	۶	سیماب، جناب سیماب اکبرآبادی	۱۴۷
۲	احسان، جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے ال ال بی،	۴۷۳	۷	کیفی، مولانا کیفی چریاکوٹی،	۳۹۳
۳	امجد، حکیم الشعراء جناب امجد حیدرآبادی	۱۴۸، ۴۷۴	۸	نشور، جناب نشور واحدی،	۲۳۶، ۴۷۴
۴	جگر، جناب جگر مرادآبادی،	۱۴۶، ۲۳۵	۹	یحییٰ، جناب یحییٰ صاحب اعظمی	۶۹

فہرست مضامین

جلد ۴۳

جنوری سنہ ۱۹۳۹ء تا جون سنہ ۱۹۳۹ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۴۳ | ماہ ذیقعدہ ۱۳۵۸ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۳۹ء | عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

قومون کی ترقی کا اصول ہمیشہ ایک رہا ہے، چند سچی حقیقتون پر مستحکم یقین، اور اس یقین کے مطابق عمل، اور کامیابی کے لئے مسلسل جدوجہد، سعی ومحنت، اور اس راہ مین جو تکلیف ومصیبت پیش آئے اس کو ہنسی خوشی جھیل لینا، زمانہ کی اصطلاحین بدلتی رہینگی، لیکن اصطلاحون کے بدلنے سے حقیقتین نہین بدلتین، اسلام کی اصطلاح مین اس مستحکم یقین کا نام ایمان، اس کے مطابق عمل کا نام عمل صالح اور مسلسل جدوجہد اور سعی ومحنت کا نام جہاد، اور اس کے لئے پامردی کا نام صبر وثبات ہے، دنیا مین جب کسی قوم کو کامیابی ہوئی ہے تو اسی اصول کے مطابق ہوئی ہے اور جب ہوگی تو اسی اصول کے مطابق ہوگی،

جانی اور مالی ایثار اس جدوجہد کی لازمی حقیقتین ہین جنکو قرآن پاک کی اصطلاح مین جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کہتے ہین، دنیا کی کوئی تحریک اس مالی اور جانی جہاد کے بغیر نہ کامیاب ہوئی ہے نہ ہوگی، مذہبی تحریکون کو جانے دیجئے آج سیاسی اور تمدنی تحریکون کا دور ہے، ان مین سے کونسی تحریک کی گاڑی ان دو پہیون کے بغیر چل رہی ہے، روس کا انقلاب، جرمنی اور اٹلی کا فسزم، اسپین مین جمہوریت اور آمریت کا تصادم، فلسطین کی شہادتگاہ، ان مین سے کس کو ان دو کے بغیر کامیابی نصیب ہوئی ہے یا ہوگی، پھر ہندوستان کے مسلمان اس عرصۂ حیات مین کچھ انوکھی مخلوق

نہین، کہ ان کے لئے دنیا کا اصول بدل جائیگا، اور اللہ تعالیٰ ان کیلئے اپنے قانون قدرت کو توڑ ڈالیگا،

اب پوچھنا یہ ہے کہ مسلمانون نے اس ملک مین اپنے قومی و سیاسی ایمان کے لئے کونسی چند حقیقتون اور سچائیون کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا ہے؟ اور اس کے حصول کے لئے وہ کونسی سرفروشی اور قربانی کر رہے ہین،

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ سلبی اور ہنگامی حقیقتین کبھی دائمی سربلندی کا جوش و خروش نہین بخش سکتین سکھون اور مرہٹون کی قوتون کی جوانامرگی کے اسباب بتانے والے بہت کچھ بتا سکتے ہین لیکن میرے نزدیک تو اس کا جواب یہ ہو کہ مغلیہ سلطنت سے کینہ اور دشمنی، یا مسلمانون سے عداوت ہی فرض کر لیجئے، ان دونون قومون کا ایسا ہنگامی جذبہ تھا، جو پورا ہو جانے کے بعد خود بخود ختم ہو گیا، اور بقا اور استحکام حاصل نہ کر سکا، آریہ سماج تحریک کا حشر بھی اس سے زیادہ نہین،

اب مسلمانون کو سمجھنا چاہئے کہ اگر کسی قوم سے مخالفت اور آزردگی ہی ان کی قومی و سیاسی کوششون کا محور قرار پائے تو ان کا یہ جذبہ کہانتک ان کو اونچا لے جا سکتا ہے اور ان کی سعی و محنت جد و جہاد اور جوش و خروش کو کبتک قائم رکھ سکتا ہے؟ جو طوفان اور سیلاب دم کے دم مین آتا ہے وہ اسی طرح دم کے دم مین چلا بھی جاتا ہے،

ہمارے سامنے اسلام خود ایک بہت بڑی حقیقت اور صداقت ہے، وہ مذہب بھی ہے، سیاست بھی ہے، اقتصاد بھی ہے، معاشرت بھی ہے، اس کے مذہبی و سیاسی و اقتصادی و اجتماعی پیغامات کو پھیلانا، مساوات اور عدل قائم کرنا، اسلامی احکام کی تبلیغ کرنا، دنیا سے سود، بدکاری، شراب خواری، قماربازی اور ظلم کو جڑ پیڑ سے اکھاڑنا، اور ملک مین ایک نیا سیاسی و اقتصادی نظام قائم کرنا، اسکے

وہ فرائض ہین جن سے مسلمان غافل ہین، اور غیر مسلمان اس کے لئے آج دنیا مین کٹ مر رہی ہین، یہ نہین کہا جا سکتا کہ جس کے لئے وہ آج کٹ مر رہی ہین وہ عین اسلام ہی بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ اسمین اسلامی نظام کی جھلک ہے، اب یہ خود ہمارا کام ہے کہ ہم آگے بڑھین اور اپنا مکمل سیاسی و اقتصادی نظام دنیا کے سامنے پیش کرین، اور اس کے لئے کم از کم وہ جذبہ دکھائین جو اسپین مین جمہوریت اور فسزم کے حامی دکھا رہے ہین، وہان قومین نہین لڑ رہی ہین، بلکہ ایک ہی قوم کے دو حصے دو مختلف نظریون کے خاطر جان و مال کی بازی لگا رہے ہین،

مسلمانوں نے اسلام کے آغاز مین جو لڑائیان لڑین ان کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ کسی ایک مذہب کو زبردستی پھیلانے کیلئے تلوارین نیام سے نکالی گئی تھین لیکن آج سوشلزم اور فسزم کے باہمی مقابلہ مین جو تلوارین نیام سے باہر ہین کیا وہ بھی کسی خاص مذہب کو زبردستی پھیلانے کی خاطر نہین ہین، سوشلزم کے حامی کہینگے کہ قوم مین طبقون کی جنگ عوام کی بھلائی کے لئے چھیڑتے ہین، تو یہی تو اسلام کے حامی بھی کہتے ہین کہ ہم نے لوگون کی بھلائی کی خاطر تلوارین اٹھائیں اور شہنشاہیون کو مٹایا، سود خوارون کا قلع و قمع کیا، سونے چاندی کے ٹھیکہ دارون کو نیست و نابود کیا، دنیا مین عدل و مساوات کی حکومت قائم کی، اور انسانون کو انسانون کا معبود بننے سے روکا،

آج زمانہ بدل گیا ہے، تو اصطلاحین بدل گئی ہین لیکن حقیقت اپنی جگہ پر ہے، آج پھر اسلام کو اسی فرض کو ادا کرنا ہے، اگر آج کے کلمہ گو مسلمانون مین اس کے اس ادائے فرض کے سپاہی بننے کا ولولہ نہین تو کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ کسی اور قوم کو زندگی کے میدان مین لائے اور اس سے اسلام کا یہ فرض ادا کرائے،

دنیا آج اپنی نجات کی راہ فسزم، نازی ازم، سوشلزم، کمیونزم، بالشوازم میں ڈھونڈ رہی ہے، حالانکہ اسکا ایک ہی راستہ ہے "اسلامزم" لیکن وہ اسلام وہ نہین جو آج عملاً مسلمانون مین ہے، بلکہ وہ جو قرآن و سنت مین ہے، آج کی وہ کونسی مشکلین ہین، جنکا حل ان مین نہین، ضرورت نئی نظر اور نئی قوت کی ہے،

مقالات

ارمغانِ احباب

یعنی

دلّی اور اس کے اطراف

آج سے پینتالیس برس پہلے

از مولانا حکیم سید عبد الحیٔ صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء

مولینا سید عبد الحیٔ صاحب سابق ناظم ندوۃ العلما غدر کے بعد کے اُن نوجوان علما میں سے ہیں، جھون نے اس فتنۂ مشرق میں آنکھیں کھولیں، اور زمانہ کے نئے تغیرات سے بہت حد تک متاثر ہوئے

موصوف کی پیدایش ۱۲۸۶ھ میں دائرۂ شاہ علیم اللہ بیرون رائے بریلی میں ہوئی، اور اس خانوادہ میں ہوئی جس میں ابھی ابھی مجدد وقت امام الہند حضرت مولینا سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ظہور ہوا تھا، اور جو حضرت مولینا شاہ اسمٰعیل شہید رحمہ اللہ کی تحریک کے مرکز عقیدت تھے،

مولینا سید عبد الحیٔ صاحب مرحوم نے اپنی اعلیٰ تعلیم بھوپال میں اس وقت حاصل کی جب نواب صدیق حسن خان کے عہد میں بھوپال فضل و کمال کا مرکز بنا ہوا تھا، اور قاضی شوکانی کے حلقۂ فیض سے مستفید شیخ حسین صاحب یمنی خزرجی درس حدیث کی مسند پر متمکن تھے، مولینا نے شیخ صاحب سے حدیث کی سند حاصل کرنے کے بعد ۱۳۱۲ھ میں جب وہ چھبیس سال کے تھے، دہلی اور اس کے اطراف کے بزرگوں کی خدمت سے فیض اٹھانے کا ارادہ کیا،

اور اسی سلسلہ میں پہلے دہلی کا، اور پھر آس پاس کے دوسرے شہروں کا سفر کیا، اور بزرگوں کی ملاقات سے فیض حاصل کیا، اور اس علمی سفر کی روداد کو روزنامچہ کے طور پر اسی زمانہ میں وہ قلمبند بھی کرتے گئے، جس کا نام انھوں نے "ارمغانِ احباب" رکھا،

یہ مسودہ مرحوم کے چشم و چراغ مولوی سید ابوالحسن علی صاحب ندوی (مدرس دارالعلوم ندوۃ العلما) کے توسط سے میں نے دیکھا، اور اس کے مطالعہ سے بڑا لطف اٹھایا، اور جی چاہا کہ اس ارمغانِ احباب کو احباب تک پہنچاؤں،

یہ دیکھنے کی چیز ہے کہ نوجوان علما پر اردو ادب کے انقلاب کا اثر کتنا جلد پڑ گیا تھا، اور پرانی طرز تحریر کے بجائے صاف اور سادہ لکھنے کی مشق کس حد تک ہو چکی تھی، مرحوم مؤلف اس زمانہ تک "نیچریوں" کے اثر سے بالکل پاک تھے، بلکہ اس کیمپ میں تھے، جو ان کے بالمقابل کھڑا کیا گیا تھا، تاہم خیالات کے انقلاب کی تاثیر وہاں تک پہونچ چکی تھی،

لحاظ کے قابل دوسری چیز یہ ہے، کہ اس وقت تک تباہی و بربادی کے باوجود اسلاف کی کتنی یادگار صورتیں اور نشانیاں باقی تھیں، ایک اور خیال رہے، کہ یہ وہ زمانہ تھا، جب پورے ملک میں مقلد اور غیر مقلد کی بحث پھیلی ہوئی تھی، اور اس آگ کے شعلے اچھے اچھوں کے دامن تک پہونچ چکے تھے، "س"

بسم اللہ الرحمن الرحیم

روز شنبہ ۱۴ رجب ۱۳۱۲ھ، آج خدا کے فضل و کرم کے بھروسہ پر میں اپنے سفر کو شروع کرتا ہوں، یہ سفر بھی میرا اللہ کے فضل سے علم دینی کے طلب کی غرض سے ہے، اسٹیشن تک اعزہ وطن مشایعت

۱؎ یہ سفر قصبہ مہسوہ ضلع فتحپور سے شروع ہوا تھا، جو مولینا کا ننہال اور انکی سسرال بھی ہے،

میں میرے ساتھ آئے، اور تین بجکر بارہ منٹ پر میں پسنجر پر سوار ہوا، للیہ دہلی تک محصول پڑا، فتحپور پہونچکر مولوی ظہور الاسلام[1] صاحب سے ملاقات ہوئی، وہ شیخ محمد حسین صاحب کو پہنچانے آئے تھے، شیخ محمد حسین صاحب حج کو روانہ ہوئے، مولوی نور محمد[2] صاحب بھی آئے تھے، ان سے بھی ملاقات ہوئی،

دہلی | روز یک شنبہ ۱۵ رجب:- ۱۰ بجے میں دہلی پہنچا، دہلی کو دور سے دیکھکر بڑی عبرت ہوئی، یہ شہر تقریباً پانسو برس تک مسلمانوں کا دار السلطنت رہا ہے، اب انگریزی قبضہ میں ہے، صدق اللہ تعالیٰ تلک الایام نداولہا بین الناس فانا للہ وانا الیہ راجعون، اسٹیشن سے بخط مستقیم چھنا مل کی سرائے آیا، یہ سرائے بہت قریب ہے، بلکہ اسٹیشن ہی شہر سے متصل ہے، سرائے میں بھائی جی[3] بیٹھے تھے، ان سے ملاقات ہوئی، اب میں یہاں ٹھہرا ہوں،

سرائے | سرائے کے دروازے نہر بہتی ہے، جس کا عرض تقریباً ۱۲ ہاتھ ہوگا، اس کے اوپر سرائے سے تھوڑے فاصلہ پر مسجد ہے، یہ مسجد غازی الدین خان کی بنوائی ہوئی ہے، نہر کو پُل کے طور پر پاٹ کر مسجد بنائی ہے، ظہر کی نماز میں نے اس میں پڑھی، نماز پڑھکر میں اور بھائی جی خراماں کمپنی باغ دیکھنے گئے، یہ باغ اسٹیشن کے محاذی، اور سرائے کے بہت ہی قریب ہے، باغ بڑا ہے لیکن معمولی ہے،

مدرسۂ طبیہ | باغ سے آکر میں مدرسۂ طبیہ[4] حکیم فضل اللہ پسر حکیم عماد الحسن صاحب صفی پوری سے ملنے کی غرض سے گیا، یہ مدرسۂ طبیہ کی جماعت اول میں پڑھتے ہیں، آجکل بوجہ قرب امتحان کے ایام تعطیل میں

---

[1] مولوی سید ظہور الاسلام صاحب فتحپور کے ممتاز علماء میں تھے، مولانا لطف اللہ صاحب کے شاگرد، اور مولینا فضل رحمٰن صاحب گنج مراد آبادی کے مرید تھے [2] مولینا نور محمد صاحب بھی بڑے عالم متشرع تھے، مولینا فضل رحمٰن صاحب سے فیض پایا تھا، اور مولینا لطف اللہ صاحب کے شاگرد تھے فتحپور کے مدرسہ اسلامیہ میں مدرس اول تھے، وطن شاہ پور پنجاب تھا، مگر وفات فتحپور میں ہوئی، سال پیدائش ۱۲۷۳ھ تھا [3] بھائی جی سے مراد مولوی سید خلیل الدین صاحب رائے بریلوی مرحوم ہیں، جو علاج کی غرض سے ان دنوں دہلی میں تھے [4] مدرسۂ طبیہ سے مراد حکیم عبد المجید خان کا مدرسۂ طبیہ ہے جو اب طبیہ کالج کہلاتا ہے،

کتابیں یاد کرتے ہیں، ان سے مدرسہ طبیہ کے حالات کم و بیش معلوم ہوئے، فن تشریح ڈاکٹری قاعدہ کے موافق خوب ہوتا ہے، ایک ڈاکٹر اسی غرض سے مدرسہ میں مقرر ہے، جماعت اول کے طلبہ مطب میں شریک ہوتے ہیں، مہینہ میں دو ہفتہ حکیم عبدالمجید خانصاحب کے پاس مطب میں نسخہ نویسی کرتے ہیں، اور دو ہفتہ سول سرجن کے یہاں شفاخانہ میں طریق علاج دیکھتے ہیں، جماعت اول کے طلبہ امتحان کے بعد بھی ایک سال تک مطب کرتے ہیں، اوس وقت ان کو سند دیجاتی ہے، ہر جماعت کی خواندگی ایک سال میں ختم ہوتی ہے، چار جماعتیں ہیں، خواندگی ہر جماعت کی علٰحدہ علٰحدہ ہے، دوا سازی میں بھی امتحان ہوتا ہے،

طرز تعلیم اس مدرسہ کا بہت اچھا ہے، مگر طرز مطب جہان تک میں خیال کرتا ہوں ناکافی ہے، کیونکہ بیشتر مرکبات کا استعمال ہوتا ہے، علاج الامراض کے نسخے مطب میں معمول بہا ہیں، بطور خود طلبہ ان کو یاد کر لیتے ہیں، تاہم کشتہ جات کے نسخے نہیں معلوم ہوتے، قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو طلبہ یہاں سے تعلیم چھوڑ کر لکھنؤ چلے جاتے ہیں، وہ پست ہمتی سے تعلیم کی محنت کو گوارا نہیں کرتے، ورنہ طرز تعلیم میں بظاہر کوئی نقص نہیں ہے،

مسجد فتحپوری عصر تک مولوی فضل اللہ کے پاس میں رہا، وہان سے آکر فتحپوری مسجد میں عصر کی نماز پڑھی، یہ مسجد نہایت عالیشان مسجد ہے، وسط کا درجہ بہت وسیع ہے، اس کے دونوں طرف بقدر ایک ایک صف کے چار چار درجے ہیں، ان درجوں کے وسط کے درجے میں محرابوں کے اوپر خط نسخ و کوفی میں آیتیں، اور اسماء الٰہی، اور کلمۂ طیب بہت خوب تحریر ہیں، درجہ وسطانی کے آگے زینۂ منبر کے محاذی میذنہ بہت خوبصورت اور نہایت سبک سنگ خارا کا بنا ہے، اس پر نقش و نگار بہت خوب بنائے گئے ہیں، صحن مسجد کا بہت وسیع ہے، صحن کے کنارے حوض بہت وسیع بنا ہوا ہے کہ کئی زینہ اتر کر پانی تک پہنچتا ہے، مسجد کے چاروں طرف غلام گردش بہت وسیع ہے مکانات

بہت بڑے بڑے بنے ہین، اور ان کے باہر سڑک کی طرف دوکانین ہین،

مولوی سید نذیرحسین صاحب کی مجلس یہان سے مین مولوی نذیرحسین صاحب سے ملنے کی غرض سے حبش خان کے پھاٹک کے اندر گیا، اتفاق سے راہ مین مولوی صاحب مل گئے انکی مسجد گیا بعد تعارف کے مین نے مسلسل[1] بالاولیۃ کی درخواست کی، مگر مولوی صاحب نے تبسم فرماکر دوسرے شخص سے مخاطب ہوکر کہا کہ ہمارے حضرات[2] کے یہان یہ کچھ باتین نہ تھیں، اس کے بعد اور لوگون سے باتین کرنے لگے،

اسی اثنا مین طلبہ نے فتوے پیش کئے، ان کو سنتے رہے، ایک استفتار طلاق کے مسئلہ مین تھا، سوال یہ تھا کہ زید نے اپنے خسر کو لکھ بھیجا، کہ آپ کی بیٹی زیب النسار کو مین نے علی الاتصال ایک سال تک تین طلاق دی، اس سوال پر طالب العلم نے کہا کہ طلاق نہیں ہوئی، کیونکہ اس مین تخاطب شرط ہے، یہان تخاطب نہیں ہے، مولوی صاحب نے کہا کہ تخاطب کئی طرح کا ہوتا ہے، ایک تخاطب بالتسمیہ، دوسرا تخاطب بالخطاب، تیسرا تخاطب بالاشارہ یہان تخاطب بالتسمیہ ہے، اسکے بعد اسکو نصیحت کی کہ خوب غور و فکر سے مسئلہ کو دیکھا کرو، اس کے مناسب یہ حکایت بیان کی، کہ مصنف بحرالرائق دو بھائی تھے، بڑے بھائی بحرالرائق کے مصنف ہیں، دوسرے ابن نجیم بڑے بھائی کے متعلق افتار تھا، دوسرے کے متعلق تدریس، ایک مرتبہ بڑے بھائی بیمار ہوے، ان کی جگہ پر چھوٹے بھائی وکام کرنے لگے، ایک مرتبہ رئیس نے یہ سوال بھیجا، کہ مین حمام مین جاتا ہون میرے ساتھ جواری بھی ہوتی ہین، ہم سب کا برہنہ ہونا جائز ہے یا ناجائز، انھون نے لکھدیا کہ جائز ہے، لکھکر بھیجدیا، اس کے بعد بڑے بھائی سے ذکر کیا، انھون نے کہا کہ تم نے بالکل غلط جواب دیا، گو سائل کو ان جواری کا برہنا دیکھنا جائز ہے لیکن ان کو باہم ایک دوسرے کو برہنا دیکھنا نا درست ہے،

---

[1] ایک حدیث کی سند جو آنحضرت صلعم سے شیخ وقت تک مسلسل چلی آتی ہے، اور لوگ تبرکاً اسکی سند حاصل کرتے ہیں، [2] ہمارے حضرات سے مقصود شاہ ولی اللہ صاحب کا خانوادہ ہوگا،

دوسری حکایت یہ بیان کی کہ مفتی یوسف[۱] صاحب لکھنوی کے پاس یہ سوال آیا، کہ ایک شخص نے اپنی زوجہ کی حقیقی بہن سے نکاح کر لیا، اور اس سے اولاد ہوئی، آیا نسب صحیح ہے، اور وہ ترکہ کا مستحق ہے، یا نہیں، انھوں نے جواب لکھا نسب صحیح ہے، اور جب نسب صحیح ہے، تو ترکہ بھی پا سکتا ہے، یہ جواب جب مفتی صدر الدین خانصاحب کے پاس آیا، تو میں نے کہا کہ یہ غلط ہے، نکاح فاسد کی صورت میں نسب متحقق ہوتا ہے، مگر ترکہ کا استحقاق نہیں حاصل ہوتا، مفتی صاحب کو بہت استعجاب ہوا، میں نے کہا کہ افتا اور چیز ہے، اور تدریس اور چیز، لِكُلِّ فنٍ رجال، ان باتون کے بعد مغرب کا وقت آگیا، میں نے بھی نماز وہیں پڑھی، نماز میں اکثر بلکہ کل غیر متقلد تھے، نماز کے بعد رفع ایدی فی الدعاء[۲] کا دستور نہیں ہے، نماز کے بعد مولوی صاحب اپنی صاحبزادی کے گھر گئے، رات کے کھانے کا شاید یہیں معمول ہے، اور میں ایک طالب العلم سے درس کے اوقات پوچھکر سرائے واپس آیا،

مولوی سید نذیر حسین صاحب کا درس

روز دوشنبہ ۱۷ رجب، حوائج ضروری سے فارغ ہو کر ۹ بجے مولوی نذیر حسین صاحب کے مدرسہ گیا، بخاری شریف کا درس ہو رہا تھا، شریک ہو گیا، ۱۱ بجے تک متعدد کتابوں کے درس ہوئے، سب میں شریک رہا، ابتدا میں معمولی طریقہ تھا لیکن تھوڑی دیر کے بعد معمول سے زیادہ مولوی صاحب ممدوح موشگافیاں فرمانے لگے، میرا گمان یہ ہے کہ (اِنَّ بعض الظن اثم) کہ پیشتر مولوی صاحب نے درس کی مشغولی کی وجہ سے مجھکو نہیں دیکھا، جب انھون نے مجھکو دیکھا، تو اس کے بعد ہی انھوں نے طرز بدل دیا، ۱۱ بجے اٹھے میں بھی ساتھ ہی ساتھ اٹھا، مجھ سے فرمایا کیسے چلے؟ میں نے عرض کیا کہ صرف سماعت کی غرض سے حاضر ہوا تھا، کہنے لگے میان

[۱] مولینا مفتی یوسف صاحب فرنگی محلی، لکھنؤ میں نوابی کے زمانہ میں مفتی تھے، اس کے بعد جونپور کے مدرسہ میں مدرس ہوئے، اپنے زمانہ کے مشہور مدرس علماء میں تھے، مولینا فاروق صاحب چریا کوٹی کے استاد تھے، ۱۲۸۶ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی [۲] نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا،

تم پڑھے لکھے ہو جوان صالح ہو، کہیں بیٹھ کر خود پڑھاؤ، میں بوڑھا آدمی کثیر الامراض ہوش و حواس باختہ سترا بہترا ہوں، میرا پڑھنا پڑھانا کیا، از سرتا پا عوارض میں مبتلا ہوں، اس کا جواب مین نے مناسب الفاظ میں دیا، جیسا ایک ارادتمند کو زیبا ہے، اس پر مولوی صاحب نے فرمایا کہ پھر صبح سے آیا کرو تاکہ سب سبقون میں شریک ہوسکو، میں سلام کرکے واپس آیا،

مولوی حفیظ اللہ صاحب دہلوی واعظ

راستہ میں معلوم ہوا کہ آج دوشنبہ کا دن ہے، مولوی حفیظ اللہ صاحب واعظ دہلی غازی الدین خاں کی مسجد میں اس دن ہمیشہ صبح سے وعظ فرماتے ہیں، میں بھی جاکر وعظ میں شریک ہوا، سورۂ یونس کا بیان تھا، وعظ سن کر سرا ے واپس آیا،

مولوی سید نذیر حسین کا درس

ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر پھر میں گیا، درس ہو رہا تھا، بخاری شریف کے درس کے بعد ہدایہ کا درس شروع ہوا، یہ بالکل معمولی تھا، فارسی ترجمہ بھی نہیں کرتے تھے، کہیں کہیں حاصل ترجمہ مولوی صاحب بیان کردیتے تھے، کہیں پر قاری صاحب، اوس کے بعد اور سبق حدیث کے ہوے، پھر عصر کی اذان ہوئی، نماز میں بھی شریک ہوا، ایک مثل کے بعد ہی نماز ہوئی، نماز کے بعد لوگوں نے دعا مانگی، میرا خیال غلط تھا، رفع ایدی کے ساتھ بعض بعض لوگوں نے دعا کی، اور بعض قبل دعا کے اٹھ گئے، مولوی صاحب بھی سلام پھیرتے ہی قبل دعا کے اٹھکر جاے درس پر جاکر بیٹھ گئے، نماز دوسرا شخص پڑھاتا ہے، نماز کے بعد بھی دو ایک سبق ہوے،

چاندنی چوک اور جامع مسجد

اوس سے فارغ ہو کر ۴ بجے کے بعد مولوی صاحب مکان گئے، اور میں بھی واپس آیا، وہان سے آکر دیکھا تو بھائی جی نہ تھے، تفریحاً کہیں چلے گئے تھے، میں بھی چاندنی چوک کی طرف تفریحاً چلا، دل میں آگیا، کہ چاندنی چوک کی پوری سیر کرلینی چاہئے، اس خیال میں قلعہ تک چلا گیا، واقعی اس میں شک نہیں کہ یہ شہر اپنے حسن و لطافت میں بے نظیر ہے، قلعہ تک پہونچکر واپس ہوا، تھوڑے ہی فاصلہ سے جامع مسجد کو سڑک جاتی تھی، اوس پر ہو لیا، جامع مسجد پہونچکر

اس کی حسن وخوبی کے لحاظ سے حیرت ہوگئی، میں دیر تک ششدر اوس کے نقش ونگار کو دیکھتا رہا، مجھ میں واقعی اتنی قدرت نہیں کہ اسکی واقعی تعریف کر سکوں، اور اس کے واسطے ایک فقرہ درکار ہے،

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

وہ ایک خدا کی عظمت کا نمونہ ہے، گویا فرشتوں نے اپنے پاک ہاتھوں سے اسکی تعمیر کی ہے، یا شاہجہان انار اللہ برہانہ کی نیک نیتی کی مجسم تصویر ہے، جب تک رہا محو حیرت رہا، یورپین مرد وعورت جوق جوق دیکھنے کو آتے ہیں، اور جوتے پہنے ہوئے تمام مسجد میں گشت کرتے ہیں، مغرب کا وقت آگیا اور میں نے مغرب کی نماز جماعت کیساتھ وہیں ادا کی، نماز کے بعد میرے دل نے بے اختیار مجھکو آمادہ کیا، کہ بانی مسجد کے واسطے دل سے دعا کروں، چنانچہ میں نے دعا کی، اوس کے بعد وہاں سے سرائے واپس آیا،

اب تک مجھ کو اجنبیت کی وجہ سے اور نیز مولینا سید نذیر حسین کے یہاں دونوں وقت حاضر ہونے کی وجہ سے اس بات کا موقع نہیں ملا، کہ شہر خموشاں کی سیر کروں اور مشائخ کی ارواح کو فاتحہ پہنچاؤں، یہ بات یاد سے جاتی رہی کہ مولینا ممدوح نے مجھ سے فرمایا تھا، کہ تم سرائے میں ٹھہرے ہو، بے سود خرچ کثیر کے متحمل کب تک ہو سکوگے، یہاں اُٹھ آؤ، میں نے عرض کیا کہ میرے بھائی پیشتر سے علاج کی غرض سے وہاں ٹھہرے ہوئے ہیں، انہی کے پاس آکر ٹھہر گیا، اگر تنہا ہوتا تو بیشک یہاں اُٹھ آتا، رات بھر بارش خوب ہوئی، راستہ خراب ہوگیا ہے، چلنے کے قابل نہیں ہے،

روز شنبہ ۱۱ رجب۔ اس وقت بھی ابروباد ہے، اور راستہ بالکل خراب ہے، لیکن میں مولینا ممدوح کے پاس جانے کو تیار ہوں، ۸ بجے مولوی صاحب کی درسگاہ جو میرے قیام گاہ سے بہت قریب ہے، گیا، راستہ ایسا خراب ہے کہ چار قدم چلنا مشکل معلوم ہوتا ہے، وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ بخاری شریف کا سبق شروع ہوگیا ہے، اس میں شریک ہوگیا، اس کے بعد

مقدمۂ صحیح مسلم ہوا، بالکل سادہ سادہ درس ہے، مالہٗ و ماعلیہ سے بحث نہیں ہوتی، اس کے بعد بیضاوی کا سبق شروع ہوا، مولوی صاحب کے بھتیجے مولوی عبدالحفیظ پڑھتے ہین، اس کا سبق بالکل خراب ہوتا ہے، پڑھنے والے قطعاً نہیں سمجھتے، عبارت بالکل غلط پڑھتے ہیں جس سے سننے والا بھی صحیح مطلب نہیں اخذ کرسکتا، مولوی صاحب کی نسبت سوء فہم کا گمان سوء ظن ہوگا عجب ہے کہ کبر سنی کی وجہ سے اخذ مطلب کے متحمل نہ ہو سکتے ہون، شواہد میں اعشیٰ کا ایک شعر آگیا، اس میں دیر تک قاری اور سامع متوجہ رہے، مگر پھر بھی ناکامیاب ہوئے، مولوی صاحب نے فرمایا کہ حل الابیات ہمارے پاس ہے اس میں خوب حل کر دیا ہے، میرے دل میں بار بار آتا تھا کہ میں کچھ بولون، مگر مولوی صاحب کی خفگی کی وجہ سے نہیں بولا، وہ بہت جلد خفا ہو جاتے ہیں، اور طالب علموں کو الفاظ سخت و درشت کہتے ہیں، .... یہ مصرع بہت پڑھتے ہیں، ع

عیسٰے کے اصطبل میں کوئی خر بھی چاہیے[1]

اور طالب العلم ان کا سننا بھی فخر و سعادت سمجھتے ہین، یہ روسیاہ ان باتوں کے سننے کو بسبب اجنبیت کے گوارا نہیں کرسکا، افسوس ہے کہ بیضاوی بالکل نام ہی کے واسطے پڑھی جاتی ہے، کاش اس کی جگہ پر حدیث کا سبق ہوتا تو گو وہ نہ سمجھیں لیکن الفاظِ نبوی کے ادا ہونے سے ثواب میں داخل ہوتے، مولوی صاحب نے اثنائے سبق میں بیضاوی کی نسبت بھی الفاظِ ناملائم کہے، کہ وہ فلسفی تھا، یہ کچھ نہیں سمجھا، آیات بینات کو اپنی قابلیت جتانے کے واسطے مشکل کر دیا ہے، شاہ ولی اللہ صاحب کبھی اسکو نہیں دیکھتے تھے، ان کو اسکی طرف بالکل اعتنا نہ تھا، الی آخرہٖ،

اس کے بعد اور سبق ہوتے رہے، میں نہایت خاموشی کے ساتھ سنتا رہا، طالب العلم اکثر سمجھدار

---

[1] مولینا از روے مطایبہ جیسا کہ آگے آئیگا طلبہ کو یہ کہا کرتے تھے، مگر مولینا سید عبدالحی صاحب چونکہ فطرۃً نہایت سنجیدہ و متین تھے، اسلئے انکو یہ طریقہ پسند نہ آیا ہوگا، "س"

بھی ہیں لیکن متعصب اور بیباک، حنفیہ کے اقوال کی طرف بالکل اعتنا نہیں کرتے، بلکہ کبھی کبھی نام آتے ہی ناک بھوں چڑھاتے ہیں، ۱۱ بجے وہاں سے واپس آیا، ظہر کی نماز پڑھکر پھر مولوی صاحب ممدوح کے یہاں گیا، کچھ میں سویرے گیا تھا، کچھ مولوی صاحب کے آنے میں دیر ہوئی، اس اثنا میں مولوی ابوالحسن صاحب مولوی صاحب ممدوح کے پوتے نے مجھ سے کہا کہ آپ کو اگر سند لینا ہو تو میاں صاحب سے کیئے، میں نے کہا کہ بیشک ارادہ ہے ایک دو روز میں عرض کروں گا، تھوڑی دیر میں مولوی صاحب تشریف لائے، بخاری کا سبق شروع ہوا اس کے بعد ہدایہ کا سبق ہوا سبق اسی طور پر معمولی تھا، اثنائے سبق میں ایک قول کے نسبت کچھ پڑھنے والے نے شک ظاہر کیا، مولوی صاحب نے فرمایا آگے چند بیوقوف ہو، آگے چل کر دو قول تھے، انھوں نے کہا عجیب طرح کا اختلاف ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے، یوں ہونا چاہئے، مولوی صاحب نے کہا اب تم یہ حاشیہ پر لکھدو کمیٹی کی وہ رائے ہے، تمھاری یہ کچھ خدا و رسول کی طرف سے یہ باتیں تو ہیں نہیں جبکی جیسی رائے ہو، میں ان سب باتوں کو سکوت کے ساتھ سنتا رہا، میرے بولنے کا کوئی موقع نہ تھا، کیونکہ بادی النظر میں میں استفادہ کا منصب رکھتا ہوں، البتہ ذوق کا یہ شعر لسان حال سے پڑھتا جاتا تھا،

جو کہو گے تم کہیں گے ہم بھی ہاں یونہی سہی آپکی گر یوں خوشی ہے مہربان یونہی سہی

اس کے بعد اور سبق ہوتے رہے، یہاں تک کہ عصر کی نماز ہوئی، میں نماز پڑھتے ہی چلا آیا، کیونکہ آج مجھ کو حکیم صاحب کے یہاں جانا تھا، وہاں سے آکر بھائی جی کیساتھ حکیم صاحب کے یہان گیا، حکیم صاحب نہ تھے، بھائی جی اون کے انتظار میں بیٹھے رہے، میں مولوی فضل اللہ سے ملنے چلا گیا، اتفاق سے وہ بھی نہ ملے، وہاں سے لوٹ کر میں نے قمرالدین برادر زادہ قاضی امیر علی کو مدرسہ میں تلاش کیا، وہ وہاں نہ تھے، دوسری جگہ تلاش کرنے سے ملے، ان سے میں نے کہا، کہ ایک کلام مجید تمھارا میں لایا ہوں کل ۱۱ بجے آکر لے لو، غالباً وہ کل آدیں،

میں وہاں سے چاندنی چوک آیا، قصد تھا کہ جامع مسجد جا کر وہاں کسی سے تعارف پیدا کر کے یہاں کے مقامات کے حالات پوچھوں، مگر راستہ میں ایک پادری اور دوسرے مسلمان مولوی سے مناظرہ ہو رہا تھا، اسکو سننے لگا، اتنے میں مغرب کا وقت آگیا، میں فسخ عزیمت کر کے لوٹا، کیونکہ جامع مسجد دور تھی، آتنا سے راہ میں مسجد فتحپوری میں نماز پڑھکر اسوقت قیامگاہ پر واپس آیا ہوں،

افسوس ہے کہ مولینا نذیر حسین صاحب کے یہاں دونوں وقت حاضر ہونے کی وجہ سے ابتک یہاں کے دوسرے اماجد ونیز مقامات متبرکہ کی سیر کا موقع نہیں ملا، اگر مغرب کے قریب کچھ وقت ملتا ہے، تو وہ اس قابل نہیں ہوتا، کہ دور دراز مقامات کی سیر ہوسکے، راستہ ایسا خراب ہے، کہ چار قدم بھی چلنا مشکل ہے، یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے، کہ مولوی نذیر حسین صاحب بہت خوش مزاج ہیں، مطایبہ بہت کرتے ہیں، ان کو اشعار بہت یاد ہیں، سبق میں اکثر اشعار خواجہ حافظ وغیرہ کے اور اردو کی مثلیں اور محاورات استعمال کرتے ہین، طالب العلموں کو اس طرح پر ڈانٹتے ہیں، کہ ان کو ناگوار نہیں ہوتا، گو سخت الفاظ میں ہو، غصہ ور بھی معلوم ہوتے ہیں، اپنے خلاف بات سننے کے متحمل نہیں ہیں، حنفیہ کیساتھ تعصب بھی بہت ہے، ایک شخص نے آکر پوچھا کہ چوہا کنوئیں میں گر گیا ہے، اور سڑ گیا ہے کتنا پانی نکالا جائے، اس کو سن کر پہلے استہزا کرتے رہے، کہ مٹی بھی کھود کر پھینکدو، اس کے بعد کہنے لگے بیوقوف اس سے کیا ہوتا ہے، . . . . پھر کہا کون پوچھتا ہے، سائل نے کہا میں ہوں، کہا اگر عوام کے شور و غل مچانے کا موقع ہو تو ان بیوقوفوں کو دکھانے کو کچھ نکال ڈالو، بلکہ انہی احمقوں کو لگادو وہ محنت کرین گے، جیسے کو تیسا، ہم کو بھی یہ ترکیبیں آتی ہیں، مولوی صاحب کی ڈانٹ ڈپٹ کے بعض انداز ہمارے مولینا فضل[۵۲] رحمن صاحب سلمہم اللہ تعالی سے بہت ملتے ہین، مزاج میں سادگی بہت ہے

---

۵۲ حضرت مولینا شاہ فضل رحمن صاحب گنج مرادآبادی،

روز چہار شنبہ ۱۷ رجب۔ صبح کو حوائج ضروری سے فارغ ہو کر درسگاہ گیا، آج بہ نسبت اور دنوں کے سویرے آیا ہوں، ترجمہ کلام مجید کا سبق ہو رہا ہے، اس سبق میں اس قدر لوگ شریک ہیں جن سے مسجد اندر اور باہر بھری ہوئی ہے، تقریباً چالیس پچاس آدمی ہوں گے، کل طالب العلم و بعض بعض شائقین حلقہ درس میں بیٹھے ہیں، صبح کی نماز کے بعد ہر روز سب سے پیشتر ترجمہ کا سبق ہوتا ہے، مولوی صاحب کا معمول ہے، کہ اثنا سبق میں اکثر تمثیلیں اور حکایات و اشعار بیان کرتے ہیں، اس سبق کا بھی وہی دستور ہے ایک شخص پڑھتا جاتا ہے، اور خود حاصل مطلب بیان کرتے جاتے ہیں،

اس سبق کے بعد مقدمہ صحیح مسلم شروع ہوا، لوگ متفرق ہو گئے، طالب العلم رہ گئے، اثنا سبق میں مولوی فضل حق[۱] و مفتی صدر الدین صاحب مرحوم کے قصے بیان کئے، کہ یہ ارباب دنیا تھے، اسی وجہ سے دنیا میں بھی بحیثیت تدین کے ان کی وقعت کم تھی، یہ قصہ بھی بیان کیا، کہ مولوی اسمٰعیل صاحب رحمۃ اللہ علیہ بلی ماران کی مسجد میں وعظ کہتے تھے، چونکہ مولوی فضل حق کو ان سے تعصب تھا، اور وہ سر رشتہ دار محکمۂ فوجداری میں تھے، اس واسطے انہوں نے کوتوال کو وعظ سے روکنے کے واسطے بھیجا، کوتوال مولوی صاحب کے وعظ سے ایسا متاثر تھا کہ روتا ہوا مولوی صاحب کے سامنے آیا، اور کہا کہ میری کیا طاقت جو وعظ سے منع کروں، لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ یہ حکم دیتے ہیں میں مجبور ہوں، یہاں سے نکل کر آپ بیان کریں تو مناسب ہے،

اُس کا انجام دیکھئے کہ مولوی صاحب ایک شادی میں شریک تھے، گرمیوں کے دن تھے، پلاؤ کھایا ہوگا، ناچ رنگ ہوتا رہا، جس مکان کے بالاخانہ پر یہ جلسہ تھا، وہاں جتنے ظرف پانی کے تھے، سب میں کسی نے جمالگوٹہ ملا دیا، اور آمد و شد کا راستہ بند کر دیا، یعنی زینہ کے دروازہ میں باہر سے قفل لگا دیا، وہاں پلاؤ کھانے کی وجہ سے پیاس کی شدت میں لوگ خوب پانی پیتے رہے،

---

[۱] مولینا فضل حق صاحب خیرآبادی معقولات کے مشہور علماء میں تھے، دہلی میں سر رشتہ دار تھے،

اور دست آنے شروع ہوئے، حاضرین وارباب نشاط سب اس مصیبت میں مبتلا ہوگئے، راستہ بند ہونے سے اور پریشانی پھیلی، وہیں سب اپنی اپنی حالت میں تھے، اور شدت گرمی سے پانی پیتے جاتے تھے، کسی کو یہ خبر نہ تھی، کہ اس پانی میں زہر گھلا ہوا ہے، رات جو پولیس کے جوان روندیں ادھر آنکلے، تو شور وغل سن کر اوپر چڑھے، دروازہ توڑا تو لوگوں کی یہ حالت دیکھی، ان میں مولوی صاحب بھی تھے، جیسی کچھ خفت ان کو ہوئی وہ ظاہر ہے، کسی کو یہ بات نہ سوجھی تھی، کہ پانی ہی میں یہ بلا ہے، پیتے تھے، اور دست پر دست آتے تھے، آخرالامر کسی کو یہ بات سوجھ گئی، اس نے کہا یارو کہیں پانی میں کسی نے کچھ شر نہ کیا ہو، اس کے سنتے وہ لوگ رک گئے،

اثنائے سبق میں اس بات کا بھی ذکر ہوا، کہ بعض بڑے عابد زاہد ہوتے تھے لیکن حدیث میں معتبر نہیں، اس پر فرمایا کہ مثلاً خواجہ معین الدینؒ، قطبؒ صاحب، فرید شکر گنجؒ، سلطان جیؒ وغیرہ یہ اپنے واسطے سب کچھ سہی لیکن وہ محدث نہ تھے، خواجہ صاحب کی کتاب ہے، توبہ توبہ اس کو دیکھ کر ہم ایسوں کو وسوسہ ہونے لگتا ہے[۱] سلطان جیؒ البتہ جانتے بوجھتے تھے، ہاں البتہ پیران پیر[۲] اور مجدد صاحب[۳] بڑے عالم تھے، اب جاہلوں کو بزرگوں کی سند لانا حماقت ہے، وہ اپنے واسطے عابد زاہد سہی

---

[۱] یہ بزرگوار اپنے اپنے زمانہ کے صاحب علم تھے، اس سے انکار نہیں کرنا چاہئے، البتہ ان کے ملفوظات میں ضعیف روایتیں ملتی ہیں، محدثین نے بھی زہد و قناعت اور ترغیب و ترہیب میں تساہل کرکے اسکو جائز رکھا ہو، ساتھ ہی یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ ان کتابوں کا ان بزرگوں کی تصنیف ہونا بہت کچھ محل نظر ہے، شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں لکھا ہے، کہ شیخ نظام الدین سلطان الاولیا رنے فرمایا ہے کہ "من ہیچ کتابے نہ نبشتہ ام زیراکہ شیخ الاسلام شیخ فریدالدین و شیخ الاسلام قطب الدین واز خواجگان چشت ہیچ شخصے تصنیف نہ کردہ است" (ص ۸۰، ذکر شیخ نصیرالدینؒ محمود دہلوی) " س "

[۲] حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ [۳] حضرت مولینا شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی،

لیکن ان کو علم سے کیا نسبت، اس سبق کے بعد صحیح بخاری کا سبق ہوا، پھر مشکوٰۃ المصابیح کا، پھر صحیح بخاری کا، پھر جلسہ برخاست ہوا،

خواجہ باقی باللہ کا مزار

میں قیام گاہ پر واپس آیا، کھانا کھانے کے بعد قیلولہ کے واسطے لیٹ گیا، نیند آگئی اور آنکھ دیر میں کھلی، اٹھکر نماز پڑھی، اس کے بعد میں نے خیال کیا، کہ آج دیر ہوگئی ہے، جلسہ درس میں اب جانا فضول ہے، آج چلو زیارت ہی کر آئیں، اس تہیہ سے جو میں اٹھا، تو بھائی جی بھی ساتھ ہو گئے، اجنبیت کی وجہ سے راستہ دریافت کرنے کی ہر جگہ ضرورت ہوئی، اور کہیں کہیں چکمہ بھی کھا گئے، تاہم لاہوری دروازہ گئے، وہاں سے فصیل پر ہو کر فراش خانہ کی کھڑکی تک برابر فصیل فصیل گئے، وہاں سے شہر کے باہر نکل کر اولاً خواجہ باقی باللہ صاحب کے مزار پر گئے، ان کے مزار پر فاتحہ پڑھکر خواجہ کلاں خلف الرشید خواجہ صاحب ممدوح کے مزار پر گئے، وہاں سے خواجہ خردؒ کے مزار پر آئے، جو خواجہ باقی باللہ صاحب کے مزار کے قریب ہی ہے، ان بزرگوں کے مزاروں پر فاتحہ پڑھکر مسجد آئے، یہ بالکل متصل ہے، ان کی مزار پر انوار کی مسجد کے ایک جانب ان کا مزار ہے، دوسری جانب اخوند شاہ عبد العزیز صاحب کا مزار ہے، ان کے مزار پر فاتحہ پڑھکر واپس ہوئے، اس جگہ ایک شہر خموشاں ہی، جدھر نگاہ جاتی ہے، مزار ہی مزار ہیں، خواجہ صاحب کے مزار سے آتے ہوئے عین راستہ پر ایک قبر ملتی ہے، اس پر لکھا ہے کہ للہ اس پر بھی فاتحہ پڑھتے جاؤ، اسکو دیکھ کر میں ٹھہر گیا، اور خاصۃً اس مزار پر بھی فاتحہ پڑھا،

قدم شریف

وہاں سے نزدیک قدم شریف ہے آبادی کے اندر یہ آبادی بہت پرانی معلوم ہوتی ہے، ایک قلعہ ہے اس قلعہ کا نشان مسلمانوں کی عملداری سے پیشتر تک معلوم ہوتا ہے، بہت قدیم اور پرانا اور بوسیدہ قلعہ ہے، اس کے اندر جا کر پھر ایک کوٹ ملتا ہے، وہ قدم شریف کے نام سے موسوم ہے، اندر ایک مسجد ہے اور مسجد کے متصل صحن کے برابر بہت سی قبریں ہیں، یہ قبریں شاہزادوں

اور نواب زادوں کی ہین، ان قبروں سے نکل کر ایک بلند مکان قبہ دار ہے، جس میں متعدد درجے ہین، بیچ میں ایک قبہ بنا ہے، اس سب مکان کی عمارت سنگ خارا کی ہے، اس قبہ کے اندر سنگ مرمر کا فرش ہے، بیچ میں ایک تابوت جالدار رکھا ہے، اس پر ایک پتھر غالباً سنگ خارا کا ٹکڑا ہے، اوس پر قدم رسول کا نشان بتایا جاتا ہے، اس میں پانی بھرا ہے، جب بٹھایا جاتا ہے تو وہ نشان نظر آتا ہے، مین نے غور سے دیکھا، لیکن پانی کی وجہ سے مجھے نہیں نظر آیا، وہی پانی تبرکاً مجاور لوگوں کو دیتا ہے، وہ لوگ اسکو تبرکاً چہرہ پر ملتے ہین، اور کچھ پی جاتے ہین، مجھ سے بھی اس نے کہا، لیکن میں نے اعتنا نہیں کیا، گمان کیا جاتا ہے، کہ وہ قدم شریف حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت اپنے فرقِ مبارک پر رکھ کر عرب سے لائے تھے، اسوقت اسکے واسطے یہ عمارتیں بنائی گئیں، اور جب ہی سے یہاں رکھا ہے، پھاٹک پر ایک دوکان عطار کی ہی، وہ بزرگ ایک ٹوکری میں گلاب کے پھول رکھے ہوئے ہیں، جو اندر جاتا ہی یہیں سے چڑھانے کو پھول لیتا ہی،

شاہ ولی اللہ صاحب کے خاندان کے مزار

وہاں سے نکل کر پھر شہر کی طرف آئے، شہر میں فراش خانہ کی کھڑکی ہو کر داخل ہوئے، وہاں سے آتے آتے فراش خانہ کے پھاٹک تک جو شہر کے اندر بازار کی طرف ہے، وہاں ایک یکہ کرکے ہندیوں کی طرف چلے، یہاں سے یکہ پر جامع مسجد کی پشت پر ہوتے ہوئے دہلی دروازہ سے نکل کر کوٹلہ پہونچے، وہاں معلوم ہوا کہ ہندیان دوسری جانب ہے، دریافت کرکے اس طرف چلے جیل خانہ کے پشت پر ہندیان میں یکہ کو سڑک پر چھوڑ کر پیادہ پا وہاں گئے، ایک مسجد ہے، اور مسجد کے احاطہ میں اور اس کے باہر قبرستان ہے، پہلے عصر کی نماز پڑھی، اس کے بعد مزاروں کی تفتیش کی، کوئی شخص مجاور کی قسم سے یہاں نہ تھا، جس سے معلوم ہوتا، اکثر مزاروں پر لوح نہ تھی، اور جن پر تھی وہ قریب العہد معلوم ہوتی تھی، مسجد کے داہنے جانب مزارات پرانے معلوم ہوتے تھے، ان پر گمان ہوا، کہ شاید یہ ہوں، لیکن کوئی وجہ قاطع نہ تھی، اور طبیعت بھی پیچھے کو

سنتی تھی، میں نے دل میں خیال کیا کہ جو ارتباط مجھ سے اور ان بزرگوں سے ہے، وہ خود راہبری کرے گا، اسی فکر میں وہاں سے مایوس ہو کر لوٹا اور سخت خلجان تھا کہ جس واسطے آیا، وہ بات نہ حاصل ہوئی، جیسے ہی منہ پھیرا مسجد کے بائیں طرف دو تین مزاروں پر کچھ تحریر نظر آئی، دیکھا تو شاہ عبدالرحیم اور شاہ ولی اللہ لکھا تھا، ان مزاروں پر پہنچکر فاتحہ پڑھا، ان کے پائتی شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدینؒ صاحب کا مزار تھا، ان دونوں پر فاتحہ پڑھا، اور شاہ عبدالعزیز صاحب کا مزار پیرا تو ر جو شاہ ولی اللہؒ صاحب کے مزار کے پاس مغرب کے جانب تھا، اس پر فاتحہ پڑھا، اور سور قرآنی مثل الھٰکم التکاثر وسورہ یٰسین وغیرہ کو پڑھکر ایصال ثواب کیا، طبیعت کو اس قدر دلبستگی ہوئی کہ دیر تک وہاں بیٹھا رہا، اور خدا سے ان لوگوں پر رحمت نازل فرمانے اور اپنے لئے حصول علم وعمل کی دعا کرتا رہا، قبل مغرب وہاں سے اٹھ کر پھر شہر کی طرف روانہ ہوا، مغرب کی نماز قیام گاہ کے قریب جو مسجد ہے وہاں آکر پڑھی،

درس حدیث | روز پنجشنبہ ۱۹ ار رجب۔ آج صبح کو اٹھکر حوائج ضروری سے فراغت کر کے درس گاہ گیا، ترجمہ کا سبق ہو رہا تھا، اس کے بعد مقدمۂ صحیح مسلم شروع ہوا، اس کے بعد صحیح بخاری کا سبق ہوا، اثنائے سبق میں کتاب الحیض میں اس کا ذکر تھا کہ اقل مدت طہر کی امام صاحب کے نزدیک ۱۵ دن ہیں، اس پر مولوی صاحب بہت برہم ہوئے، کہا خانہ ساز بات ہی، کوئی حدیث اُن کے پاس نہیں ہے، طہر کی کوئی مدت نہیں حائضہ کی رائے پر ہے، حدیث میں کوئی تحدید نہیں ملی،

آج کل مولوی صاحب کے یہاں صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، مشکوٰۃ المصابیح، ہدایہ اور بیضاوی ہوتی ہیں، بخاری شریف چار پانچ جگہ ہوتی ہے، اور صحیح مسلم صرف دو جگہ، اور اکثر ان کے یہاں صحاح میں صحیحین اور جامع ترمذی ہوتی رہتی ہیں، ابی داؤد ابن ماجہ نسائی وغیرہ نہیں ہوتیں، میں نے دریافت کیا کہ ابی داؤد بہت مشکل کتاب ہے، یہ کیوں نہیں ہوتی، تو معلوم ہوا کہ اس کا

کوئی صحیح نسخہ نہیں ملتا، اس وجہ سے متروک ہے،

اوقات | اوقات سبق کے یہ ہیں، کہ طلوع آفتاب سے تقریبًا گیارہ بجے تک اور دو بجے سے چار بجے تک، اس عرصہ میں ۴ بجے کے قریب عصر کی نماز بھی ہوجاتی ہے، چار بجے گھر چلے جاتے ہیں پھر قبیل مغرب آتے ہیں، اس وقت جسکو جو پوچھنا ہوتا ہے وہ پوچھتا ہے جسکو ملاقات کرنا ہوتا ہے، وہ ملاقات کی غرض سے آتا ہے، مغرب کے بعد گھر چلے جاتے ہیں، عشا، اور صبح کی نماز گھر میں پڑھتے ہین، کھانا دونوں وقت اپنی بیٹی کے گھر میں کھاتے ہیں، اور رات کو پوتون کے یہاں سوتے ہین، دو پوتے ہیں، ایک کا نام عبدالسلام ہے، دوسرے کا نام ابوالحسن، آج کل عبدالسلام مقدمہ صحیح مسلم پڑھتے ہیں، صبح کو ترجمہ کے بعد ان کا سبق ہے، اور افتاء کا کام انہی کے متعلق ہے، انھوں نے قطبی تک درسیات پڑھی ہیں، ہدایہ وغیرہ بھی پڑھا ہے، صحاح ایک مرتبہ پڑھ چکے ہیں، اور ابوالحسن کے دو سبق ہیں، ایک صحیح مسلم کا، دوسرا صحیح بخاری کا، ایک مولوی صاحب کے بھتیجے ہیں، عبدالحفیظ وہ آج کل ہدایہ اور بیضاوی پڑھتے ہیں، انھون نے بھی درسیات میں صرف مختصرات پڑھی ہیں،

شاہ محمد عمر صاحب | حسب معمول گیارہ بجے کے قریب قیام گاہ پر میں واپس آیا، کھانا کھا کر قیلولہ کے بعد ظہر کی نماز مسجد مین پڑھی اس کے بعد ارادہ ہوا کہ شاہ محمد عمر سے جو اخوند صاحب کے نواسہ مشہور ہین ملاقات کرنے کو جاؤن وہ فراش خانہ کی کھڑکی کے پاس رہتے ہیں، اور اخوند صاحب کے سجادہ نشین ہیں، وہان گیا، تو معلوم ہوا کہ خلوت خانہ میں ہیں، یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ مولوی فریدالدین صاحب کے بیٹے اور حافظ اکرام الدین صاحب مصنف تفسیر سورۂ فاتحہ کے پوتے ہیں، اور اخوند صاحب مجرد تھے، ان کے بھائی کے نواسہ ہین، یہ بھی مجرد ہیں، عمر چالیس کے قریب ہے، اوقات کے بہت پابند ہیں، شب کو خلوت خانہ میں آرام کرتے ہین، دو ڈھائی بجے سے اٹھکر اذکار و اشغال میں مصروف

رہتے ہیں، صبح کی نماز پڑھکر پھر حجرہ میں چلے جاتے ہیں، اور ۱۰ بجے تک کنڈی بند رہتی ہے، اس کے بعد نکلتے ہیں، واردین وصادرین سے ملتے ہیں، پھر اندر چلے جاتے ہیں، ظہر کی نماز کے واسطے نکلتے ہیں میں بیٹھا تھا کہ وہ اندر سے نکلکر مصلے پر کھڑے ہوگئے، میں بھی نفل کی نیت سے شریک ہوگیا، نماز کے بعد معمولاً ختم خواجگان کے واسطے بیٹھے، میں بھی شریک ہوگیا، بعد ختم کے نشست کے کمرہ میں جاکر بیٹھے، میں بھی جاکر بیٹھا، معمولی تعارف مجھ سے ہوا، اثنائے گفتگو میں مجھ سے کہا، کہ آپ کہاں بعیت ہیں، میں نے کہا، اپنے ہی خاندان میں، اس کے بعد میرے خاندان کے سلسلہ کا حال پوچھنے لگے، میں نے سب بیان کیا، پھر میں نے کہا کہ رسالہ فخر الحسن کے دیکھنے کا مجھکو بہت شوق ہے، آپ کے یہاں ہو تو عنایت فرمائیے، کہا کہ میرے یہاں نہیں ہے، مگر میں نے دیکھا ہے، وہ عربی میں ہے، اسکی ایک شرح ہے، القول المستحسن، وہ بھی عربی میں ہے، میں نے کہا کہ خاندان نقشبندیہ کے سلسلہ میں بھی انقطاع بیان کیا جاتا ہے، کہنے لگے کہ شیخ ابوالحسن خرقانیؒ اور حضرت بایزید بسطامیؒ کا لقا ثابت نہیں ہے، میں نے کہا دوسرے طور کا اور بھی ہے یعنی حضرت قاسم[1]، اور حضرت سلمانؓ[2] کے لقا میں گفتگو ہے، کہنے لگے یہ مجھکو معلوم نہ تھا آج معلوم ہوا، پھر مجھ سے کہا کہ یہ کہاں سے معلوم ہوا، میں نے کہا کہ کتب طبقات سے کہنے لگے آپنے دیکھی ہیں، میں نے دو چار کتابوں کے نام لئے، پھر پوچھا آپ نے تحصیل کہاں کی ہے، میں نے کہا لکھنؤ میں، کہا حدیث کس سے پڑھی ہے، میں نے کہا شیخ حسین صاحب محدث یمنی سے، اور مسلسل بالاولیہ کی روایت شاہ ابوالحسین صاحب مارہروی سے بھی حاصل کی ہے، اس کے بعد پوچھتے رہے، کہ شاہ صاحب سے کہاں ملاقات ہوئی، میں نے سب حال بیان کیا، یہ بھی کہا کہ مجھکو شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی سے سند حاصل کرنے کا بہت شوق تھا، اس وجہ کر زیادہ تر میں نے اون سے سند لی، پھر پوچھا کہ یہاں کیونکر آپ تشریف لائے، میں نے کہا، کہ زیارت قبور مشائخ وملاقات اکابر وقت کے لئے، اور آپ کی خدمت میں اس لئے کہ زیارت بزرگوں کی

---

[1] حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکرؓ، [2] حضرت سلمانؓ فارسی،

باعثِ کفارۂ گناہ ہے، اور یہ بھی خیال ہے کہ اپنی استعداد کے موافق کچھ استفادہ کر حصل کروں، اسکو سنکر نہایت ہی تواضع وانکسار کی راہ سے کہنے لگے، کہ حضرت میں تو آپ ہی بزرگوں کا خوشہ چیں ہوں، نہ پڑھا نہ لکھا، گلستاں بوستاں کچھ پڑھ لی ہے، بدنام کنندۂ بزرگاں ہوں، اور انہی کی جوتیاں اٹھاتا ہوں، اور اسی کو باعثِ نجات جانتا ہوں، میری صورت شکل دیکھ کر لوگوں کو دھوکا ہوجاتا ہوگا، ورنہ میں کچھ بھی نہیں ہوں، آپ میرے واسطے دعا کیجئے، آپ کی دعا کی برکت سے خدا میری مغفرت فرمائے، میں اس کا جواب مناسب الفاظ میں دیتا رہا، اس کے بعد رخصت ہوا، رخصت کے وقت نصف قد تعظیم کے واسطے اٹھے، میں چلا آیا،

یہ بزرگ نہایت سنجیدہ فہیدہ خوش رو خوش پوشاک خوش خلق ہیں، تکسیر ورقیت میں ان کو بہت دخل ہے، اخوند عبدالعزیز صاحب کے صاحب سجادہ ہیں، وہ حضرت اچھے میاں صاحب مارہروی کے خلیفہ تھے،

کتابوں کی نایابی | انکے یہاں سے آکر عصر کی نماز پڑھی، اس کے بعد میاں صاحب[1] کی خدمت میں گیا، دیر تک صحبت رہی، مختلف قسم کی باتیں کرتے رہے، کتابوں کا کچھ ذکر آیا کہنے لگے، اب اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل کیا ہے، کہ افراط کیساتھ کتابیں ملتی ہیں، جو کتابیں خواب وخیال میں نہ تھیں، وہ اب کوڑیوں کے مول ملتی ہیں، عالمگیری عزیز الوجود تھی، گورنمنٹ نے کلکتہ میں غدر سے پہلے چھپوائی، وہ نو سے روپیہ کو ملتی تھی، تفسیر کبیر تین سو روپیہ کی، ایک نسخہ بادشاہ کے یہاں تھا، جب شاہ عبدالعزیز صاحب کو ضرورت ہوتی تھی، تو بادشاہ کے یہاں سے منگوا کر دیکھتے تھے، فتح الباری کو کوئی جانتا بھی نہ تھا، دہلی بھر میں صرف تین جگہ چند چند اجزا اوس کے تھے، تمام دہلی میں بخاری کے صرف اٹھارہ نسخے تھے، بعض بعض فیاض لوگوں نے بخاری کے پارہ پارہ الگ کر دئے تھے، کسی

[1] مولینا سید نذیر حسین،

طالب علم کو پہلا پارہ دیدیا، کسی کو دوسرا، یوں طالب علموں کو پڑھنا میسر آتا تھا، میں جب ترمذی میاں صاحب کے یہاں پڑھتا تھا، اس وقت ترمذی کے ایک نسخہ میں ہم تین آدمی شریک تھے، اور تینوں جدا جدا رہتے تھے، ایک شہر کے اس کنارے ایک دوسرے کنارہ میں ریل کے اسٹیشن کے پاس رہتا تھا، ایک آدمی دو تین گھنٹہ لاکر مطالعہ کرتا تھا، پھر دوسرا لیجاتا تھا اسی طور پر دن بھر وہ گشت کرتا رہتا تھا، کوئی کتاب پوری پڑھنی کسی کو نصیب نہیں ہوتی تھی، ہدایہ کے جزو جزو کرکے طلبہ پر تقسیم ہوجاتے تھے، کوئی یہاں سے پڑھ رہا ہے، کوئی وہاں سے، جب جزو ختم ہوتا تھا، تو چار سطریں رہ جاتی تھیں، بسبب فقد سیاق و بے ربط ہونے کے، اسی طور پر ہر کتاب ناقص رہتی تھی کسی کے پاس اگر غلط نسخہ بھی پورا ہوا تو وہ نعمت کبری سمجھا جاتا تھا، اور وہ شخص بڑا دولت مند خیال کیا جاتا تھا، اسی اثناء میں استفتے پیش ہوئے، ایک فتویٰ اس بارے میں تھا، کہ آیا نماز عید کی عیدگاہ میں ہونی چاہیئے، یا مسجد میں اس بارہ میں پٹنہ میں بڑا مناظرہ ہو رہا ہے، طالب علم نے جواب پڑھکر سنایا، کہ عیدگاہ میں پڑھنا چاہیئے، اگر کوئی عذر ہو تو البتہ مسجد میں ہوسکتی ہے، اس کے دلائل اس نے کئی ورق میں لکھے تھے، سب سنتے سنتے مغرب کا وقت آگیا، میں نے بھی مغرب کی نماز وہیں پڑھی، بعد نماز مغرب کے میں قیام گاہ پر واپس آیا،

مولوی محمد حسین فقیر | روز جمعہ ۱۰ رجب آج چونکہ مولوی نذیر حسین صاحب کے یہاں درس نہیں ہوتا، اس واسطے میرا قصد یہ ہے، کہ مولوی محمد حسین صاحب فقیر سے ملاقات کراؤں، اور اگر ممکن ہو تو خانقاہ شریف میں جاکر فاتحہ خوانی سے مشرف ہوں، اس ارادہ سے میں چاندنی چوک ہوتا ہوا، ان کے مکان کی تلاش میں چلا، آتنا مجھکو معلوم تھا، کہ جامع مسجد کے پشت پر ٹوکری والوں میں رہتے ہیں، اس واسطے جامع مسجد کی طرف چلا، جامع مسجد کے راستہ معہود کو میں نے چھوڑ دیا، دوسری سڑک گھنٹہ گھر کے سامنے واہنے ہاتھ کو تھی، اس طرف ہولیا، تاکہ ضمناً ہر حصہ شہر کی سیر ہو جائے، بہت دور جاکر جامع مسجد کی طرف جانے کی

سڑک ملی، اس سڑک پر ہوکر جامع مسجد کی جنوبی سیڑھیوں پر پہونچا، ان سیڑھیوں کے سامنے ایک گلی ملتی ہے، اس کا نام ہے، امام کی گلی، اس کے اندر ہوکر ٹوکری والوں میں پہونچا، وہاں مولوی محمد حسین صاحب کا مکان تلاش کرکے دروازہ پر آواز دی، معلوم ہوا کہ مولوی صاحب سفر میں گئے ہیں، ایک مہینہ میں آئیں گے، ناکام واپس ہوا۔

خانقاہ مجددی

اور ایک گلی میں ہوکر چتلی قبر کو پوچھتا ہوا آگے بڑھا، چتلی قبر میں دو راستے ہیں، ایک داہنے ہاتھ کو ہے، وہ سیدھا خانقاہ شریف کو گیا ہے، جب خانقاہ کے دروازہ پر پہنچا تو پھاٹک بند تھا، معلوم ہوا، کہ یہ پھاٹک کبھی نہیں کھلتا، دو برس سے صاحبزادہ[۱] صاحب کسی سے نہیں ملتے، امرا و غربا، علما، فقرا، مریدین، مخلصین، واردین صادرین کسی سے ملاقات نہیں کرتے، آگے جمعہ اور عیدین کی نماز کے واسطے عام اجازت تھی، اب وہ بھی بند کردی گئی ہے، دو چار خادم ولایتی[۲] ہیں، ان کو کسی وقت حضوری نصیب ہوتی ہے، ورنہ وہ بھی محروم ہیں، غیر تو کیا ان خادموں کی بھی مجال نہیں، کہ بے اجازت پھاٹک کے اندر قدم رکھیں، سقا، دھوبی، بھنگی، کوئی نہیں جانے پاتا، کوئی ماما بھی صاحبزادہ صاحب کے یہاں ملازم نہیں ہے، ایک خود ہیں، اور ایک ان کی بیوی صاحب، ایک ولایتی اپنے ہاتھ سے پانی بھر لاتا ہے، وہی پیتے ہیں، جب کبھی علیل ہوتے ہیں، تو صرف حکیم عبدالمجید خانصاحب کو اجازت ہوتی ہے، وہ جاتے ہیں، ورنہ شہر کے لوگوں میں سے بھی کوئی شخص نہیں جانے پاتا، خادم صرف خانقاہ کی ڈیوڑھی تک جانے پاتے ہیں، خطوط جو چٹھی رسان لاتا ہے، اس کے واسطے یہ قاعدہ ہے، کہ پھاٹک کے بائیں جانب ایک کھڑکی ہے، اس میں کٹہرہ لگا ہے، اس کے اندر ایک لیٹر بکس کے طور پر بکس رکھا ہے، اس میں قفل لگا ہے، اس کے اندر چٹھی رساں خط ڈالدیتا ہے، جب حکم ہوتا ہے تو

---

[۱] حضرت مجدد الف ثانی کے خاندان کا ایک حصہ دہلی آکر آباد ہو گیا تھا، جس میں شاہ عبدالغنی مجددی غدر کے بعد ہجرت کرکے حجاز چلے گئے تھے، صاحبزادہ سے مقصود شاہ ابوالخیر صاحب ہیں۔ [۲] ولایتی سے مقصود افغانی ہیں

ایک خاص خادم ان خطوں کو نکال کر حضور میں لیجاتا ہے، یا جس کا جی چاہے، کچھ لکھ کر ڈال دے، وہ پہونچ جاتا ہے، اور جواب بھی ملجاتا ہے، مگر اس کے واسطے کوئی خاص دن مقرر نہیں ہے، جب ان کا جی چاہتا ہے، اسدن حکم ہوجاتا ہے، ایک ولایتی خادم پھاٹک کے باہر ایک پھوس کے دالان میں رہتا ہے، اس کے معرفت جواب ملجاتا ہے، گویا وہ قلعدار ہے، میں نے یہ حالت دیکھکر ایک خط پنسل سے وہیں لکھکر اس کے اندر ڈالدیا ہے، جس کا مضمون یہ ہے، کہ میں عرصہ سے آستانہ بوسی کا مشتاق تھا، اب اسکی توفیق پائی ہے، امید ہو کہ محروم واپس نہ کیا جاؤں، اپنا نام اور پتہ اس پر صاف صاف لکھدیا ہے، اس ولایتی خادم نے کہا، کہ جب ڈاک کھولی جائے گی، اس وقت جیسا جواب ملے گا، میں تم سے کہدوں گا، کسی روز پھر آجانا،

جامع مسجد میں نماز جمعہ اس کارروائی کے بعد میں واپس آیا، آتے ہی کھانا کھاکر نماز جمعہ کے واسطے جامع مسجد گیا، یہ عجیب وغریب مسجد ہی، جس کی تعریف و توصیف کرنا غیر ممکن ہے، اس سال بجلی کے گرنے سے ایک مینار ایک گنبد اور مشرقی دروازہ پر صدمہ پہنچا ہی، اسکی مرمت ہو رہی ہی، رئیس بھاولپور اس کے مصارف کے متکفل ہوئے ہیں، اس مسجد کے شمالی غلام گردش میں مشرقی گوشہ پر ایک نہایت آراستہ دالان میں بہت بڑی ضریح رکھی ہے، یہ ضریح بہت ہی مکلف ہے، اس کے اندر قدم شریف رسول صلعم کا نشان بتایا جاتا ہے، جمعہ کی نماز میں اس مسجد کی وسعت کے موافق لوگ نہ تھے، تاہم بہت بڑی جماعت تھی،

شاہجہان بادشاہ مرحوم نے جس کو امامت کے واسطے عرب سے بلایا تھا، انہی کی اولاد میں یہ خدمت چلی جاتی ہے، یہ بزرگ قوم کے سید ہیں، ایک نقرئی عصا لیکر خطبہ پڑھتے ہیں، اس عصا کے اوپر طلائی تکیہ ہے، متعدد مکبر ہیں، بعد نماز کے تین جگہ وعظ ہوا، کبھی کبھی اس سے زیادہ وعظ ہوتا ہے، ایک صاحب منبر پر بیٹھکر کہتے ہیں، دوسرے میذنہ کے قریب تیسرے حوض پر، لوگوں کا ہجوم بھی بہت ہوتا ہے،

مسجد کے باہر مزارات مسجد کے مشرقی دروازہ کے قریب سرمدؒ کا مزار ہی، اسی کے پاس ہرے بھرے کا اور

تھوڑے فاصلہ پر قلعہ کے جانب حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کا مزار ہے، مزار کے گرد کٹہرہ بنا ہوا ہے، یہ بزرگ بڑے عارف کامل تھے،

لال قلعہ | آج پیشتر سے ہم نے قلعہ کی سیر کا ارادہ کر لیا تھا، اسواسطے کا لیخان کو قبل نماز کے کہدیا تھا، کہ ٹکٹ لے رکھنا، جب ہم نماز سے فارغ ہوئے تو انھوں نے ٹکٹ پیش کیا، یہ ٹکٹ چار آدمیوں کے واسطے کافی تھا، ڈھائی آنے اس کے حصول میں صرف ہوئے، مسجد سے براہ راست قلعہ گئے، یہ قلعہ بالکل سنگ سرخ کا بنا ہوا ہے اپنی لطافت اور سبکی میں بے نظیر ہے، دروازہ پر ایک گورہ ٹہل رہا تھا، اس نے ٹکٹ لے لیا، اور ہم اندر روانہ ہوئے، قلعہ کے اندر جانے کے بعد متعدد دروازے اور ڈیوڑھیان مسلسل ملتی ہیں ان میں ان میں اب آجکل گورہ بازار ہے، اس سے نکل کر پھر بالکل ویران اور غیر آباد ہے کہیں کہیں انگریزی عمارتیں اور بارکین بنی ہوئی ہیں، شاہی عمارتیں بالکل متاصل کردی گئی ہیں، ان کے نشانات اب صرف دربار عام کے ایک درجہ سے اور دربار خاص وحمام و مسجد و مثمن برج سے معلوم ہوتے ہیں، جنکے دیکھنے سے ایسی عبرت و رقت ہوتی ہے، جو کسی طرح بیان میں نہیں آسکتی، سبحان اللہ یہ وہ مکانات ہیں جنمیں ہرکس و ناکس کے پہونچنے کی مجال نہ تھی، بڑے بڑے امرا ہفت ہزاری و پنجہزاری دربار عام تک پہونچنے کو فخر و سعادت سمجھتے تھے، وہی تخت جس کے سامنے دربار اکبری و جہانگیری میں سجدہ کرتے تھے، اور دربار شاہجہانی و عالمگیری میں اوس کے پایہ کے بوسہ دینے کو فخر سمجھتے تھے، آج ادنی ادنی گورہ جوتہ پہنے ہوئے، اس کو روندتا ہے، فاعتبروا یا اولی الابصار

الملک للہ والامر للہ والارض للہ یورثہا من یشاء

آن شاہ کہ خویش را ہلاکو می گفت | وز کبر و منی سخن بہ ابرو می گفت

بر کنگرۂ سرائے او فاختۂ | امروز نشستہ بود کو کو می گفت

ناظرین مجھ کو معاف کیجئے گا، ان مکانوں کے دیکھنے سے میرا دل ایسا بے قابو ہے کہ مین

ان کے حالات بیان کرنے سے بھی قاصر ہوں، بلکہ جو شخص ان درباروں کی ہسٹری اور قلعہ کی جاگرفی سے واقف ہے وہ کیا ممکن ہو کہ ان کو دیکھ کر آٹھ آٹھ آنسو نہ روئے اس کا دل بے چین نہ ہو جائے اسکے بدن پر رونگٹے نہ کھڑے ہو جاویں، اسکی آنکھوں کے سامنے خدا کی سچی عظمت وہیبت نمودار نہ ہو جائے، دنیا کے فانی ہونے کا طلسمی پردہ نہ اٹھ جائے، ذرا تھوڑی دیر کے واسطے آپ حدیقۃ الاقالیم میں محمد شاہی دربار کا سماں دیکھ لیجئے، پھر عالم شاہی دربار کا تنزل ملاحظ فرمائیے، پھر ان ٹوٹی پھوٹی دیواروں میں کرّ و فرّ شہنشاہی کے آثار دیکھیے، اللہ اللہ ولا موجود الا اللہ،

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ آثار پدید است صنادید عجم را

اب نہ وہ زمانہ ہے نہ وہ لوگ ہیں، نہ بادشاہ ہیں، نہ ان کے درباری یہ ٹوٹی پھوٹی عمارتیں باقی ہیں، جو زبان حال سے مسلمانوں کے اقبال وادبار ترقی و تنزل کا بیان کر رہی ہیں، بڑا سنگدل ہے وہ شخص جو ان کو دیکھ کر نہ رو اٹھے، بڑا قاسی القلب ہو وہ مرد جو ان کو دیکھ کر متاثر نہ ہو، بڑا بے حمیت ہے وہ مسلمان جو مسلمانوں کے اقبال وادبار کی ان حقیقی تصویروں کو دیکھ کر خاموش رہے، بڑا بے غیرت ہے وہ نیچری جو کارخانہ قدرت کی ان نیرنگیوں کو دیکھکر اپنے عقیدہ پر نادم نہ ہو،

خلیلی ھل ھاتان دارۃ جلجل ودارۃ سلمی فی قفاف عقنقل

کیا یہ وہی دربار خاص ہے جسمیں بڑے بڑے سلاطین ہند علی قدر مراتب کھڑے ہونیکو فخر سمجھتے تھے، کیا یہ وہی تخت ہو جس کے سامنے بڑے بڑے مہاراجہ سر جھکانے کو اپنا دین وایمان جانتے تھے، یہ سب کارخانہ قدرت کی نیرنگیاں ہیں، فانی ہے، اور زائل تمام کائنات اور باقی ہو وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں تمام عالم کی موت وحیات ہو جس کی قدرت اور بقاء پر عالم کے نشیب و فراز گرم وسرد، تلخ و شیرین تغیرات وحوادث بآواز بلند گواہی دے رہے ہیں، کل شئی ھالک الا وجھہ

ہر کرا بینم درین عبرت سرائے بہر مردن زندگانی می کند (نظامی)

میں ان باقی ماندہ عمارتوں کی بعینہٖ حالت کیا دکھا سکتا ہوں، اسکی واقعی کیفیت بھی کیا بیان کرسکتا ہون البتہ یہ بتانا چاہتا ہون، کہ اب کیا کیا عمارتیں باقی ہیں، گویا بقول شاعر

آمادہ گشتہ ام دگر اینک نظارہ را　　پیوند کردہ ام جگر پارہ پارہ را

ہرچند کہ جو جو عمارتون کے بقیۃ النہب درجے باقی ہیں، ان سے یہ بھی پتہ نہیں چل سکتا کہ پوری پوری عمارتوں کا گذشتہ زمانہ میں کیا انداز تھا، تاہم بفحوائے البعرۃ تدل علی البعیر و نقش القدم علی المسیر پرانی عظمت و جلال کا نمونہ دکھاتی ہیں، ان مسلسل ڈیوڑھیوں سے نکل کر ایک پرتاب تیر کے فاصلہ پر پھر ایک ڈیوڑھی ملتی ہے لیکن صرف ڈیوڑھی ہی ڈیوڑھی ہے چار دیواری قائم نہیں ہے، نہ یہ معلوم ہوتا ہے، کہ کسی مکان کی ڈیوڑھی ہے لیکن گمان غالب یہ ہے کہ شاہی محلات کی ڈیوڑھی ہے، کیونکہ اس کے محاذی کچھ دور پر دربار عام کا ایک درجہ ملتا ہے، یہ سنگ سرخ کی عمارت ہے، بہت بڑے بڑے دالان اور بہت مضبوط کھنبوں پر قائم ہیں، غالباً یہ وہی ستون ہیں جن کے پاس ہر ہر راجہ اور امیر علیٰ قدر مراتب کھڑا ہوتا تھا، کنارے پر تخت ہے سنگ مرمر کا، اس پر سنگ موسی اور عقیق و نیلم کے نقش و نگار متعلق بدیدہیں نشنید، اس تخت کے گرد لوہے کا کٹہرہ ہے، شاید حفاظت کی غرض سے اب بنا دیا گیا ہے، اس سے آگے بڑھکر کچھ دور جاکر ان عمارتون کے نشان ملتے ہیں، جن کا نظیر چار دانگ عالم میں نہیں بتایا جاتا، یعنی دربار خاص و مثمن برج و حمام، وہان جاکر عقل دنگ ہو جاتی ہے، اور جگمگاہٹ سے آنکھون کو چکا چوند ہونے لگتی ہے، اے اللہ اے صانع کائنات یہ انسانی کاریگری کا نمونہ ہے، یا بہشت بریں کا ٹکڑا، اگر بہشت بریں کا ٹکڑا ہے تو اس کے رہنے والے کون ہیں، کیا جنت میں جانے کے بعد نکال بھی دیئے جاتے ہیں، وہ کہاں گئے، یہ کیوں غیر آباد ہے، پھر ان کے ساتھ اتنا نشان بھی کیون باقی رکھا گیا، کیا ہم لوگوں کے رونے کے واسطے، عبرت کے واسطے، اے کاش اب بھی عبرت

حاصل کرنی بڑے ظرف تھے اون کا جو اس میں رہتے تھے، اور پانچ وقت خدا کے سامنے سجدہ کرتے تھے،
تف ہو فرعون پر جس نے صرف مصر کی ان گڑھ بے جوڑ عمارتوں پر خدائی کا دعوی کیا، آفرین ہے شاہجہان
پر جس نے تخت طاؤس چار کرور روپیہ صرف کر کے بنایا، اور اس پر بیٹھتے ہی خدا کے سامنے نہایت
عاجزی و فروتنی کی راہ سے سر جھکا دیا یعنی دو رکعت نماز ادا کی، یہ ہے

تواضع زگردن فرازاں نکواست گدا گر تواضع کند خوئے اوست

اے ناظرین عبرت! عبرت!! عبرت!!! کل شئی ھالک الا وجہہ یہ عمارتیں بالکل سنگ مرمر کی ہیں،
چھت اور ستونوں پر بالکل سونے کے نقش و نگار ہیں جن پر نگاہ نہیں ٹھہرتی آنکھوں کے سامنے چکا چوند
آجاتی ہے، معلوم ہوتا ہے، کہ کاریگروں نے اس وقت اسکی تعمیر سے فرصت پائی ہے، فرش پر مختلف
قسموں کے پتھروں کی میناکاری قابل دید ہے نہ شنید، وہ لطافت وہ پاکیزگی، وہ باریکی، وہ سادگی
ہے جو کسی طرح بیان نہیں کیجا سکتی، دربار خاص میں کنارہ پر سنگ مرمر کی ایک چوکی ہے، غالباً اسی
پر تخت طاؤس رہتا ہوگا، اب خالی پڑی ہے، نہ تخت طاوسی ہے نہ تخت نشین، نہ وہ مکان ہے نہ مکین،
عبرت کے واسطے ایک ٹکڑا اس کا باقی چھوڑ دیا گیا ہے، جس کو دیکھ کر سیاحان گیتی نورد کے ہوش اڑتے
ہیں، ایھا الناس اعتبروا بالقیاس، کہاں ہیں شاہجہان اور عالمگیر، کدھر ہیں اکبر اور جہانگیر کہاں
ہیں وہ ہفت ہزاری امرا، کدھر ہیں مشائخ اور علما، کہاں ہیں وہ چاؤشوں کی آوازیں، کدھر ہیں نقیبوں
کی صدائیں، کہاں ہیں وہ نگاہ روبرو رکھنے والے، کدھر ہیں وہ نظر بر قدم رکھنے والے، کہاں ہیں وہ
شعرا کی قصیدہ خوانی، کدھر ہے وہ امرا کی لن ترانی، کہاں ہے وہ لال پردہ، کدھر ہے وہ نقرئی
طلائی کٹہرہ، سچ یہ ہے، کہ جو کچھ ان لوگوں نے دیکھا، وہ خواب تھا، جو ہم سنتے ہیں، وہ افسانہ ہے،
بقول خواجہ میر درد،

وائے نادانی کہ بعد از مرگ یہ ثابت ہوا خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا (باقی)

مغالطۂ تحلیل

از

جناب خواجہ عبدالحمید صاحب لکچرار فلسفہ، گورنمنٹ کالج، گجرات پنجاب

کسی مخلوط وجود مثلاً کسی مشین کے سمجھنے کے لئے ہمیں سب سے پہلے اسکی تحلیل[1] کرنی چاہیئے یعنی اُس مخلوط وجود (یا مشین) کا اس کے اجزاے مرکبہ میں تجزیہ کرنا چاہیئے تحلیل یا تجزیہ اس اصول پر مبنی ہے کہ وجود مخلوط کے اجزار کی ساخت اور کیفیت فرداً فرداً بہ نسبت خود اس مخلوط وجود کی ساخت اور کیفیت کے جو ان اجزار سے بنا ہے، زیادہ آسانی سے سمجھ لیجا سکتی ہے، ہر جزو کی ایک خاص ساخت اور ایک خاص "ماموریت" (یعنی کوئی ایسا کام جو اسکے ساتھ مخصوص ہوتا ہے) ہوتی ہے، جب مختلف اجزار ایک مخلوط وجود کی صورت میں جمع ہوتے ہیں، تو ان کی مختلف ماموریتیں (یعنی ان کے وہ مختلف کام جو ہر ایک جزو کے ساتھ فرداً فرداً خاص ہیں) ایک خاص مخلوط شکل پا جاتی ہیں، اور اس خاص مخلوط شکل میں ان اجزار کی ماموریتیں ضم ہو جاتی ہیں، اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان ماموریتوں کی کیفیتیں، اور ان کے کارہاے مخصوص، بالکل نئی نوعیت اختیار کر لیتے ہیں، چنانچہ وجود مخلوط کی مجموعی ماموریت، بسا اوقات اپنے اجزاے مرکبہ کی ماموریتوں سے مختلف اور زیادہ پیچیدہ ہوتی ہے، مثلاً ہائیڈروجن گیس سب سے زیادہ ہلکی گیس ہے، اور آتشگیر ہے، آکسیجن گیس کافی بوجھل ہوتی ہے، آتشگیر نہیں ہے لیکن آتشگیری کی موید ہے، اور حیات کی حامی ہے لیکن پانی جو وجود مخلوط ہے، اور ان دو گیسوں سے مرکب ہے؛

[1] تحلیل اور تجزیہ کو میں نے اس مقالہ میں مترادف سمجھا ہے،

وہ نہ تو خود گیس ہے نہ آکسیجن اور نہ آتشگیری کا موید ہے، البتہ حیات کا وہ حامی ہے، لیکن آکسیجن سے بالکل مختلف طریقہ پر،

اس سے ظاہر ہوا کہ اگر ہم بعض منفرد اجزار کی خاصیتیں کیفیتیں اور کارہائے مخصوص اچھی طرح سے سمجھ لیں، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا، کہ ہم نے اس مخلوط وجود کی مجموعی خاصیت، کیفیت اور کارِ مخصوص کو بھی سمجھ لیا ہے، جو ان منفرد اجزار کی جمعیت یا ترکیب سے بنا ہی،

۲۔ مغالطۂ **تحلیل** سے مراد یہ دعویٰ ہے، کہ اگر ہم کسی وجود مخلوط کے اجزاے مرکبہ کی خاصیتیں کیفیتیں اور کارہاے مخصوص کلی طور پر سمجھ لیں، تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ ہم نے خود اس وجودِ مخلوط کی خاصیت کیفیت اور کار مخصوص کو سمجھ لیا ہے،

مندرجۂ بالا سطور (یعنی فصل نمبر ۱ میں) اس مغالطہ کی نوعیت سرسری طور پر ظاہر ہو چکی ہے آیندہ سطور میں ان امور پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی،

۱۔ مغالطۂ تحلیل کو مغالطہ کیوں کہا گیا ہے،

۲۔ کیا تحلیل ہر حالت میں مغالطہ ہے،؟

۳۔ اگر نہیں تو کہاں کہاں تحلیل مفید اور ضروری ہوتی ہے،؟

۴۔ اور وہ کون مقام ہے جس سے اگر تحلیل آگے نکل جائے، تو مضر ہو گی، اور مغالطہ بنے گی

۳۔ **تحلیل** سے مراد ہے، وجودِ مخلوط کا اس کے اجزار میں تجزیہ کرنا، یہ اجزار حتی الوسع منفرد ہوں یعنی علم وقت کے مطابق ان اجزار کا مزید تجزیہ ممکن نہ ہو،

وجود مخلوط کے سمجھنے کے لئے تحلیل مفید ہوتی ہے، کیونکہ اکثر اوقات اجزار کا سمجھنا وجود مخلوط[۱]

---

[۱] اس فقرے میں ہم وجود مخلوط کی علمی اور نظری حیثیت کی طرف نہیں بلکہ صرف اسکی عملی حیثیت کی طرف اشارہ کیا کر رہے ہیں، مثلاً آجکل منفرد اجزار کا سمجھنا جدید سائنس کے دقیق ترین نظریوں کے بغیر ممکن نہیں ہے، لیکن عملی

کے سمجھنے سے آسان تر ہوتا ہو، اگر ہم اجزاء پر قابو پا جائیں، تو ان سے مرکب وجود مخلوط پر قابو پا جانا بھی ممکن اور آسان ہو جاتا ہے، اگر عمارت کے وہ اجزاء ہمارے پاس موجود ہیں جن سے اس عمارت کی ترکیب ممکن ہے، تو عمارت کی داغ بیل عملی طور پر ڈالی جا سکتی ہے، علوم کونیہ[۱] میں تحلیل وہی کام دیتی ہے، جو عملی سیاست میں "آپس میں پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کا اصول کام دیتا ہے، جو وجود مخلوط چونکہ مخلوط ہے، اسلئے اس میں اس کے اجزاء سے کم از کم ایک پیچیدگی، تو ضرور زیادہ ہوگی، یعنی اس کا مخلوط ہونا، لیکن اب سوال یہ ہے کہ

کیا تحلیل بذات خود اس وجود مخلوط کے صحیح اور مکمل فہم و ادراک کے لئے کافی ہے،؟

اگر ہم موٹر کار یا طیارے کا چھوٹا سا نمونہ لیں، اور اسکی تحلیل اس کے اجزاء میں کریں (یعنی ان میکانیکی[۲] ٹکڑوں میں کریں جن سے وہ نمونہ بنا ہے) تو پھر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اس نمونہ کی ساخت کو اور اس کے طریق کار کو کسی حد تک سمجھ لیا ہے، لیکن ابھی ہمیں اس نمونہ یا مشین کا مکمل ادراک یا فہم نصیب نہیں ہوا، وجہ یہ ہے کہ مکمل فہم کے لئے صرف تحلیل ہی کافی نہیں، ترکیب اور اصول ترکیب کا سمجھ لینا بھی اسکے لئے اشد ضروری ہے،

تحلیل کا کام صرف یہ ہے کہ وجود مخلوط کا اس کے اجزاء میں تجزیہ کر دے، تاکہ اس وجود کے مکمل ادراک و فہم کے لئے راستہ کھلے، اور اس کام کے لئے پہلی اور نہایت ضروری منزل طے ہو جائے لیکن جب تحلیل اس فرض کی ادائگی سے ذرا آگے بڑھتی ہے، اور اپنی اہمیت کو اس سے زیادہ بڑھاتی ہے، تو وہ بجائے مفید ہونے کے مضر ہو جاتی ہے، اور مغالطہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۲) حیثیت سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ اگر ایک مشین دس پرزوں سے بنی ہے، تو ان پرزوں کا ادراک اس مشین کے ادراک سے آسان تر ہے، [۱] Cosmic Sciences

[۲] Mechanical

چنانچہ یہ مغالطہ اپنی وسعت، ہمہ گیری اور آسانی کے باعث سائنس اور فلسفہ میں بے شمار غلطیوں کا محرک اور علت بن چکا ہے،

مثلاً غور کیجئے، کیا موٹر کار یا طیارے کے نمونے کے تجزیہ سے ہم نے اس نمونہ کی ساخت کو اور اس کے طریق کار کو مکمل طور پر سمجھ لیا ہے، جب ہمارے ہاتھ میں اس نمونے کے اجزا رہوتے ہیں، تو کیا خود نمونہ ہمارے ہاتھ میں ہوتا ہے، ؟ کیا موٹر کار کے ٹکڑے موٹر کار ہوتے ہیں، ؟ ہرگز نہیں، جب تک ہم ان تحلیل شدہ اجزار کو (یعنی ان ٹکڑوں کو) اس وجود مخلوط کی صورت اور ترکیب نہ دیں یعنی جس کی تحلیل کے بعد یہ ٹکڑے ہمارے ہاتھ آئے تھے، اس وقت تک ہم یہ کہنے کے حقدار نہیں ہیں، کہ ہم نے اس نمونہ کو یا اس مشین کو یا اس وجود مخلوط کو صحیح اور مکمل طور پر سمجھ لیا ہے، موٹر کار یا طیارے کی مشین کو صرف وہ شخص سمجھتا ہے، جو اس کی تحلیل بھی کرلے، اور پھر اس کے اجزا کو صحیح طریقہ پر جوڑ کر دوبارہ وہی موٹر کار، اور وہی طیارہ بنا بھی لے، روزمرہ کے علم وعمل کے لئے صحیح فہم وادراک کا یہی طریقہ ہے مکمل عرفان کے لئے البتہ یہ کافی نہیں، اس کے لئے ہمیں اپنے زمانہ کے علم کے مطابق ان نظری اصولوں کے فہم کی ضرورت بھی ہے جو اصول اس وجود مخلوط اور اسکے اجزاے مرکبہ میں کارفرما ہیں،

۴۔ کسی وجود یا حادثہ کے صحیح اور مکمل فہم وادراک کے لئے (خواہ وہ وجود یا حادثہ مخلوط ہے یا منفرد) یہ دو عمل ناگزیر ہیں، جامع تحلیل (یعنی اس درجہ تک تحلیل کہ اس سے آگے بڑھنا ممکن نہ ہو) اور مکمل ترکیب (یعنی وہ ترکیب جس کے مطابق اگر اجزاے مرکبہ کو جمع کیا جائے، تو وہی وجود یا حادثہ ہاتھ آئے، جس کی تحلیل سے وہ اجزار ملے تھے: ان دو عملوں میں ترکیب کا عمل زیادہ ضروری اور زیادہ مشکل ہے،

عمل ترکیب زیادہ ضروری اسلئے ہے، کہ (۱) نہ صرف اس کے بغیر فہم نامکمل رہتا ہے بلکہ

اسلئے بھی کہ (۲) اس کے بغیر عمل تحلیل بسا اوقات گمراہ کن اور پر از مغالطہ ہوتا ہے، عمل ترکیب مشکل

اسلئے ہوتا ہے کہ تخریب تعمیر سے توڑنا جوڑنے سے اور گم کرنا حاصل کرنے سے آسان تر ہوتا ہے،

۵ - اب ذرا غور فرمائیے کہ تحلیل خالص (یا تحلیل محض) یعنی وہ تحلیل جس کے ساتھ ترکیب کا کوئی

عنصر شامل نہیں ہے، کس قدر مضر ہوتی ہے، اعلم کے ہر شعبہ میں اس کے فساد آمیز تاثرات

پائے جاتے ہیں،

مثلاً شعور کے متعلق اکثر اوقات نفسی یہ کہتے ہیں کہ شعور مجموعہ ہے اُن تمام نفسی یا ذہنی حالتو نکا

جو بیداری کے عالم میں ہم پر وارد ہون، مثلاً خیالات، جذبات، حرکات، عمل،

خواہشات محسوسات وغیرہ، اگر ہمارے یہ جذبات، خیالات، حرکات، خواہشات وغیرہ موجود

نہیں ہیں، تو ظاہر ہے کہ ہمارا شعور موجود نہیں ہے، کیونکہ شعور مجموعہ ہے اُن ذہنی حالتوں اور

عملوں کا، ایک تمثیل کے ذریعہ "شعور" اور شعوری حالتوں کا تعلق ذہن نشین کیا جاتا ہے، فرض کرو

ہمارے سامنے ایک میز ہے، یہ میز کیا چیز ہے ؟ جواب ملتا ہے کہ یہ میز مجموعہ ہے چار پایون

اور ایک تختہ کا، اگر ان چار پایون کو اور اس تختہ کو ہم گم کردین تو کیا میز باقی رہے گا، ہرگز نہیں،

اسی طرح سے ہم کہہ سکتے ہین، کہ اگر ہم اُن تمام ذہنی حالتوں اور عملوں کو جن سے شعور مرکب ہے،

یا جو مل کر شعور بنتے ہیں، گم کردیں، یا اپنے شعور مین سے کسی طریقہ سے خارج کردیں، تو شعور باقی

نہ رہے گا، وغیرہ وغیرہ،

ہم یہ بات ہرگز کہہ نہیں سکتے کہ امریکہ کے جس مشہور نفسی سے شعور کا یہ بیان ماخوذ ہے اس

کا مافی الضمیر درحقیقت یہ تھا کہ میز محض ایک نتیجہ ہے چار پایوں اور ایک تختہ کا، یا شعور محض ایک

نفسی نتیجہ ہے ہمارے محسوسات، جذبات خواہشات، حرکات وغیرہ کا لیکن ایسے طرز استدلال

اور اس تمثیل سے متا خیال اسی طرف جاتا ہے کہ میز اور شعور کا یہ تمثیلی موازنہ اس مصنف کے تخیل ہیں

کسی ایسی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے، جسے وہ حقیقت سمجھتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ وہ نفسی، اور اس مذہب کے تمام دوسرے نفسی بھی خود اپنے عمل تحلیل کے شکار ہوتے ہیں،

علامتی طریقے سے اگر ہم ان کے اس استدلال کو بیان کریں، تو یوں ہوگا،

فرض کرو "ا" ایک وجود ہے، جب ہم اس کی تحلیل کرتے ہیں، تو ہمارے ہاتھ دو خاصیتیں آتی ہیں یعنی ج اور د، اس تحلیل سے مراد یہ ہے کہ اگر ہم اس وجود میں سے کسی طرح سے ج اور د کو خارج کر دیں تو "ا" باقی نہ رہے گا، بالکل معدوم ہو جائیگا، اس سے یہ ثابت ہوا کہ ا برابر ہے ج جمع د کے یعنی (ا = ج + د)

اب اس استدلال میں تحلیل نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے، کہ اگر ہم ج اور د کو ا سے خارج کر دیں، تو پھر ا باقی نہ رہے گا، لیکن اس عمل تحلیل کی صحت کے باوجود بھی یہ فارمولا (قاعدہ مختصرا) کہ ا = ج + د بالکل غلط ہے، یہ صحیح ہے کہ اگر ہم میز میں سے پایے اور تختہ خارج کر دیں، تو کوئی میز باقی نہ رہے گا، لیکن پھر بھی ہمیں یہ کہنے کا حق نہیں ہے، کہ میز مجموعہ ہے چار پایوں اور ایک تختہ کا، بات یہ ہے کہ مجموعے کئی طرح کے ہو سکتے ہیں، مثلاً ایک طرح کا مجموعہ ہمیں صرف پایون اور تختہ کا نتیجہ دیتا ہے، دوسری طرح کا مجموعہ ہمارے ہاتھ میں میز دیتا ہے، پس یہ دونون مجموعے، اور تحلیل دونوں حالتوں میں صحیح ہیں، اس سے ظاہر ہوا کہ محض تحلیل کافی نہیں، اب عمل ترکیب کو شامل کیجئے تو صحیح فارمولا یہ بنے گا کہ

ا (میز) مجموعہ ہے ج (پایوں) اور د (تختہ) کا بشرطیکہ ج اور د اس طرح جمع ہوں کہ ان کے ملنے سے ہمارے ہاتھ میں ا (میز) اور صرف ا آئے یعنی" ا = ج + د + ا ج د،

اس فارمولے میں ا ج د سے مراد ج اور د کا وہ اتصال یا اجتماع ہے، جس کا نتیجہ ا اور صرف ا ہو، ظاہر ہے کہ یہ ٹکڑا ا ج د اس فارمولے کی روح رواں ہے، جب یہ ٹکڑا شامل ہے، تو فارمولا

صحیح ہے، ورنہ بالکل غلط، خیر فارمولا تو ہمارا صحیح ہو گیا لیکن کس قیمت کی ادائگی کے بعد؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم مغالطۂ "انحصار مقدمہ[۱] بر نتیجہ" کے بہت قریب پہنچ گئے ہیں، اگرچہ خیریت گذری کہ اس مغالطہ میں ہم گرنے نہیں، ہماری مراد یہ ہے کہ اگر ج اور د، ا کے خواص صرف اُس حالت میں اور محض اس وجہ سے ہیں، کہ اُن کے اتصال سے ہمیں ا ہاتھ آتا ہے، تو پھر ا کی تحلیل ج اور د میں نہ تو بہت زیادہ حد تک مفید ہے، اور نہ اس تحلیل ہی نے ہم پر ا کی پوری حقیقت واضح کی ہے،

متذکرۂ بالا بحث سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں، کہ جامع اور مکمل تحلیل بھی ہمیں صرف حق کی طرف لیجاتی ہی لیکن خود حق نہیں ہی،

۵- ہم نے اوپر دیکھ لیا ہے کہ میکانیتی[۲] وجود مثلاً موٹر کار، طیارہ، مشین، میز وغیرہ کا صحیح ادراک و فہم ناممکن ہی، جب تک کہ تحلیل کیساتھ صحیح ترکیب شامل نہ ہو، اب سوال یہ ہے کہ ذی حیات وجود (یعنی جسم آلی یا موجود حیہ) کے صحیح ادراک کے لئے عمل تحلیل کس حد تک مفید اور بکار آمد ہے، اگر سفیدہ سلول[۳] (یعنی مادہ ذی حیات) کو اس کے کیمیاوی اجزا میں تحلیل کیا جائے،

---

[۱] صحیح استدلال میں نتیجہ، نتیجہ ہوتا ہے مقدمات کا یعنی اگر مقدمات تسلیم نہ کئے جائیں، تو نتیجہ بھی تسلیم نہ ہوگا، غلط ہوگا، اگر ہم صحیح استدلال کے برعکس خود مقدمہ یا مقدمات کو نتیجہ کی مدد سے حاصل کریں، تو یہ مغالطہ انحصار مقدمہ بر نتیجہ ہوگا، مثلاً ہم ثابت کرنا چاہتے ہیں، کہ بعض انسان عقلمند ہیں، اگر ہم بغیر کسی حجت یا دلیل کے پہلے ہی تسلیم کرلیں، کہ تمام انسان عقلمند ہیں، اور پھر کہیں، کہ اس وجہ سے بعض انسان عقلمند ہیں، صحیح نتیجہ ہے، تو یہ مغالطہ ہوگا، کیونکہ جو کچھ ہم کو ثابت کرنا تھا، اسے ہم نے بغیر حجت کے پہلے ہی ایک عام شکل میں تسلیم کرلیا ہی [۲] میکانیتی وجود میں عنصر حیات شامل نہیں ہوتا [۳] سفیدہ سلول (Protoplasm) سے مراد وہ مادہ ذی حیات ہی جس سے تمام زندہ وجود بنے ہیں یعنی نباتات، حیوانات اور انسان،

جیسا کہ کیمیاے حیاتی[1] کے ۔۔م علما کا دستور ہے، تو عنصر حیات جو مادۂ ذی حیات (یا موجود حیہ) کا طغراے امتیاز ہے، ہاتھ نہیں آتا یعنی مادۂ ذی حیات کی کیمیاوی تحلیل ایسے اجزا پر مشتمل ہوتی ہے، جو خود ذی حیات نہیں ہیں، تو کیا ایسی تحلیل سے ہمیں حیات کا ادراک ہوا ہے؟ ہرگز نہیں یہ عجیب تحلیل ہے کہ جس مقصد کے لئے یہ عمل کیا جارہا ہے، وہ مقصد ہی فوت ہوگیا ہے، کیا ان غیر ذی حیات کیمیاوی اجزا کا مجموعہ ذی حیات بن جاتا ہے؛ ہرگز نہیں، زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ بعض اوقات جب یہ کیمیاوی اجزا ایک خاص مجموعہ کی شکل اختیار کرتے ہیں، تو ان کے اتصال و اجتماع کے بعد یا ان کے اتصال و اجتماع کیساتھ ہی ایک نئی خاصیت کا ظہور ہوتا ہے، اور یہ نئی خاصیت بطور نتیجہ ظاہر نہیں ہوتی، بلکہ ایک ہمراہی، یا ساتھی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے،

"علم حیات" اگر صرف عمل تحلیل پر مبنی ہوگا تو زیادہ سے زیادہ وہ یہ کرسکتا ہے کہ عنصر حیات کی موجودگی کے لئے جو طبعی اور کیمیاوی شرائط ضروری ہیں، ان کا ادراک کرلے لیکن خود عنصر حیات کے متعلق یہ علم خاموش ہوگا، اس وجہ سے ایسے علم حیات کو حیات کا علم کہنا بجا نہیں، ظاہر ہے کہ یہاں بھی تحلیل خالص کا فارمولا (ا = ج + د) صحیح نہیں ہے، اگر ا ایک ذی حیات وجود ہے، اور اسکی طبعی و کیمیاوی تحلیل سے ہمیں چند اجزا "ج اور د" ہاتھ آتے ہیں، تو ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں، کہ اگر ج اور د کو ا سے خارج کردیا جائے، تو ا (یعنی وجود ذی حیات) باقی نہ رہے گا لیکن اگر ہم یہ نتیجہ نکالیں کہ ا ـ ج + د تو ہم مغالطہ میں ہیں، صحیح فارمولا وہی ترکیبی گر ہوگا، کہ "ج اور د" یعنی طبعی و کیمیاوی عناصر صرف اس صورت میں ا کے عناصر کہلائے جاسکتے ہیں، جبکہ انسان کے اتصال یا اجتماع سے صرف ا پیدا ہو یعنی ا = ج + د + ا ج د،

میکانیوی علماے حیاتیات (وہ علما جو "وجود حیہ" کی طبعی و کیمیاوی تحلیل پر قانع ہیں، اور

---

[1] Organic Chemistry.

اسی کو "حیات" کا صحیح ادراک سمجھتے ہیں) کے طرزِ استدلال کو دیکھ کر اقبالؔ کا یہ فلسفیانہ قطعہ یاد آتا ہے،

بلند بال تھا لیکن نہ تھا جسور و غیور — حکیم سرِ محبت سے بے نصیب رہا،

پھرا فضاؤں میں کرگس اگرچہ شاہیں وار — شکارِ زندہ کی لذت سے بے نصیب رہا[1]،

سفیدۂ سلول کی اجزائے غیر حیہ میں پر از احتیاط تحلیل کے بعد میکانزمی منکر حیاتیات اپنے ہاتھ میں وہ عنصر نہیں پاتا، جس کے صحیح ادراک کے لئے وہ عمل تحلیل استعمال کر رہا تھا، اگر وہ اس ناکامیابی پر کفِ افسوس ملتا، تو ہم کہہ سکتے تھے، کہ شاہی علم کے پنجہ سے شکار نکل گیا، لیکن وہ تو عملِ تحلیل پر قانع ہے، اور اس مغالطہ میں ہے کہ "حیات" مرکب ہے غیر ذی حیات عناصر سے اسلئے وہ مستحق ہے کہ اسے فضائے علم کا "کرگس" کہا جائے،

پس ثابت ہوا کہ جس طرح غیر حیہ وجود مخلوط کے صحیح و مکمل ادراک کے لئے تحلیل محض ناکافی و گمراہ کن تھی، یا جس طرح تحلیل محض شعور کے صحیح ادراک کے لئے ناکافی بلکہ گمراہ کن تھی، اسی طرح (بلکہ اس سے بھی زیادہ شدت سے) یہ عملِ تحلیل وجود حیہ کے صحیح و مکمل فہم و ادراک کے لئے ناکافی و گمراہ کن ہے،

۶۔ اب ہمیں ایک قدم اور آگے بڑھنا چاہئے،

کیا محض و خالص عمل تحلیل سے ہم معاشرتی نیاسی اور اخلاقی حوادث کی اہمیت، اور ان کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں،؟ کیا صرف اس عمل کی مدد سے ہم ان حوادث کی علل کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں،؟

اوپر ہم دیکھ چکے ہیں، کہ شعور کے متعلق تحلیل خالص کا فارمولا بالکل غلط ہے، یہی حالت ہیں معاشرتی سیاسی اور اخلاقی حوادث کے تحلیلی طریق فہم کی نظر آتی ہے، افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ سیاسیین، مفکرین

[1] بالِ جبریل صفحہ ۲۱،

اجتماعیات، اور فلاسفۂ علم الاخلاق بالعموم اس طریق تفکر پر اپنا استدلال قائم کرتے ہیں، حالانکہ ایسے استدلال کے نتائج نہایت نقصان دہ ثابت ہوئے ہیں،

مثلاً مذہب مفیدیت[1] کا نظریۂ خیر و شر لیجئے، اس مذہب کے مطابق کسی چیز کا خیر یا شر، نیک یا بد ہونا صرف اس امر پر منحصر ہے کہ وہ چیز کس حدتک عوام کے لئے مفید ہو سکتی ہے، اخلاق کا بہترین معیار اس مذہب میں یہ ہو کہ عوام زیادہ سے زیادہ تعداد میں اور زیادہ سے زیادہ حدتک خوشی حاصل کر سکیں، اور خوشی اس شے سے حاصل ہوتی ہے، جو مفید ہو، گویا کہ اخلاق کا تنہا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ عوام کثیر تعداد میں مفید اشیا سے زیادہ سے زیادہ خوشی حاصل کر سکیں، جو شے اس طرح مفید نہیں ہے، یعنی جس سے عوام کو خوشی (فوراً یا کچھ عرصہ کے بعد) حاصل نہ ہو، وہ خیر نہیں ہو بلکہ شر ہے اور ایسی شر انگیز اشیاء کی خواہش کرنے والا شخص نیک نہ ہوگا، بد ہوگا،

مذہب مفیدیت کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ جماعت (سوسائٹی) مرکب ہے، اشخاص سے اور ہر شخص کم و بیش آزاد ہے، اسکی جبلی خواہش یہ ہے، کہ حتی المقدور لذت اور خوشی کو حاصل کرے (جلب منفعت) اور درد و زحمت سے بچا رہے، (دفع مضرت) ایسے آزاد اشخاص جن کی سرشت کے جبلی قوانین جلب منفعت اور دفع مضرت ہیں، باہم دگر مل کر ایک جماعت پیدا کرتے ہیں، اور اس جماعت کا مشترکہ اخلاقی قانون یا نصب العین یہ ہوتا ہے یا ہونا چاہئے (اس بارہ میں مفیدین کے دو فرقے ہیں) کہ جماعت کا ہر فرد پوری جماعت کیلئے جلب منفعت اور دفع مضرت کا خواہاں ہو، اور صرف اسی مقصد کے لئے کوشاں رہے۔

یہاں مفیدیت کی مفصل تنقید کا موقع نہیں، مختصراً عرض ہو کہ یہ مذہب نفسی اور استدلالی حیثیتوں سے بہت کمزور ہے، اسی لئے آج کل خالص مفیدیین بہت کم نظر آتے ہیں، اس کمزوری کی وجہ صرف یہ ہے کہ مفیدیت نے "فرد انسان" کی نفسی تحلیل میں دو فاش غلطیاں کی ہیں، اول یہ کہ اس نے ہر انسان

[1] Utilitarianism

کو جبلی طور پر صرف جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کا پرستار اور حاصل بنا دیا، حالانکہ روزمرہ کی زندگی میں ہر فرد واحد بیسیوں ایسے کام کرتا ہے، جن میں اسے نہ جلبِ منفعت کا خیال ہوتا ہے اور نہ دفعِ مضرت کا، یہ کام صرف اسلئے کئے جاتے ہیں، کہ کسی نہ کسی وجہ سے انھیں کئے بغیر چارہ نہیں جب ہمیں بھوک لگتی ہے، تو ہم کھانا کھاتے ہیں، صرف اسلئے کہ کھانا سامنے موجود ہے، اور بھوک لگ رہی ہے، یہ صحیح ہے کہ کھانا کھانے میں کچھ لذت حاصل ہوتی ہے، بھوک کی جو تھوڑی بہت زحمت تھی، وہ دور ہو جاتی ہے، ہمارے جسمی نظام کو فائدہ پہنچتا ہے، اور کھانا نہ ملنے سے جو مضرت لابدی تھی، وہ دفع ہو جاتی ہے لیکن کھانا کھاتے وقت یہ خیالات یا یہ خواہشات اس عمل کی محرک نہ تھیں، کھانا سامنے تھا ہم سے کھائے بغیر نہ رہا گیا، جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کا فلسفہ سیر ہو جانے کے بعد ذہن میں آسکتا ہے، ایک اور مثال لیجئے. عورت جب بچہ جنتی ہے، تو کیا اس کے دل میں دفعِ مضرت اور جلبِ منفعت کا خیال ہوتا ہے،؟

دوسری فاش غلطی مفیدیت نے یہ کی، کہ اس نے فرد واحد کی نفسی تحلیل کو (حالانکہ انسانی محرکات کی یہ تحلیل بھی غلط تھی، جیسا کہ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں) جماعت (جو ان افراد سے مرکب ہے) کی نفسی تحلیل سمجھ لیا یعنی یہ غلط خیال اپنے نظریہ اور استدلال میں داخل کر لیا، کہ اگر افراد زید، بکر، عمرو کے نفسی محرکات فرداً فرداً ك هـ ن ہیں، تو اگر زید اور بکر اور عمرو ملکر ایک منظم جماعت قائم کریں تو اس جماعت کے نفسی محرکات صرف یہ ہونگے، ك، هـ، ن، حالانکہ یہ خیال ہر لحاظ سے قطعاً غلط ہے، بہت ممکن ہے کہ اس جماعت کے نفسی محرکات میں ك، م، ن کے ساتھ کسی نئے محرک ع کا بھی اضافہ ہو جائے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ك م، ن سرے سے غائب ہی ہو جائیں، اور ان کے بجائے بالکل نئے محرکات پیدا ہو جائیں، اگر زید اور بکر اور عمرو، فرداً فرداً جبلی طور پر ضعیف الارادہ اور بزدل ہیں، تو کوئی تعجب نہ ہوگا، اگر وہ من حیث الجماعت قوی الارادہ اور شجاع ثابت ہوں ایک

اور ایک گیارہ ضرب المثل ہے، اور اسی حقیقت کو ظاہر کرتی ہے،

یہاں اس حقیقت کی مزید تفصیل کی گنجایش نہیں، مقصد صرف یہ تھا کہ مذہب مفیدیت کی اس بنیادی غلطی پر غور کیا جائے، کہ اوّل تو اس نے فرد انسان کے نفسی محرکات کی غلط تحلیل کی پھر اس غلط تحلیل کو جماعت انسانی کے متعلق صحیح سمجھا، مزید برآن یہ کہ ان دو فاش غلطیوں کو اپنے فلسفۂ اخلاق کی بنیاد بنا دیا، اگر مفیدیین نے تحلیل کے ساتھ ترکیب پر بھی غور کیا ہوتا، تو کم از کم انھیں دوسری غلطی سے دوچار نہ ہونا پڑتا، اور تیسری غلطی کی باری نہ آتی، وہ فوراً پہلی غلطی (یعنی محرکات انسانی کی نامکمل تحلیل) کی طرف رجوع کرتے، اور کیا تعجب ہو کہ وہ اپنے جلب منفعت اور دفع مضرت والے غلط نفسیاتی قانون کے شکار نہ ہوتے،

ستم یہ ہے کہ مفیدیت کے مخالفین اور معترضین نے بھی اپنی تنقیدی گولہ باری زیادہ تر مفیدیت کی پہلی غلطی پر کی ہے، یعنی ان کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ مفیدیت غلط اسلئے ہو کہ اُس نے انسانی محرکات کی غلط اور نامکمل تحلیل کی، اور اسی غلط تحلیل پر اُس نے اپنا نظریۂ اخلاق قائم کیا، ان معترضین کا خیال ہے کہ اگر عمل انسانی کے محرکات کی تحلیل مکمل کی جائے، تو وہ تمام الجھنیں خود بخود سلجھ جائینگی، جن سے مفکر اخلاق کو قدم قدم پر دوچار ہونا پڑتا ہے، الغرض مفیدیین اور ان کے معترض دونوں عمل تحلیل ہی کو اہم اور قاطع مشکلات سمجھتے ہیں، مفیدیین نے تو سرے سے عمل ترکیب استعمال ہی نہیں کیا، اور نہ ان میں اس کی ضرورت کا خیال پیدا ہوا، لیکن ان کے معترضین عمل ترکیب کی اہمیت اور ضرورت کا زبانی اقرار تو ضرور کرتے ہیں، البتہ حقیقت یہ ہے، کہ ان کے اپنے استدلال میں بھی تحلیلیت کا تعصب پایا جاتا ہے، علم معاشرت کے وہ مفکرین جنھیں نفسیات معاشرت سے دلچسپی یا واقفیت ہو، بڑے شد و مد سے اس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں، کہ جماعت محض افراد کا مجموعہ نہیں ہو، اور آجکل کے مفکرین علم الجماعت نسیائین، اور اخلاقیین کی اکثریت بھی اسی حقیقت کی اقراری ہو لیکن یہ ماننا پڑتا ہے

کہ یہ اقرار عملی نہیں بلکہ زیادہ تر زبانی ہے ان کی تصانیف میں جو اہمیت عمل تحلیل کو دیجاتی ہے وہ عمل ترکیب کو نصیب نہیں،

ان مفکرین کا یہ خیال غلط نہیں ہے کہ اسوقت تک ان علوم کو جو ناکامی معاشرتی، اقتصادی، اخلاقی اور سیاسی مشکلات اور پیچیدگیوں کے حل کرنے اور ان کے صحیح علاج کی دریافت مین ہوئی ہے وہ بہت حد تک نامکمل تحلیل کی وجہ سے ہے، اور اگر ان تمام مبہم تاریک اور دقیق محرکات عمل انسانی کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کیا جائے جو اسوقت تک نظرانداز ہوتے رہے ہین، تو اغلب ہے کہ بعض عقدوں کی کشایش ہوجائیگی اور بعض مشکلات خود بخود حل ہوجائیں گی، مثلاً ہم نے اوپر دیکھا ہے، کہ دانستہ جلب منفعت اور دفع مضرت بہت کم مواقع میں نفسی محرک کا کام دیتی ہے، اس کے علاوہ سینکڑوں اور محرکات ہین جو بالکل جبلّی ہیں، اٹل ہیں، ہمارے قابو سے باہر ہیں، اور اپنی گرفت میں سخت مضبوط ہیں، اور یہ محرکات جسمانی بھی ہیں، ذہنی بھی، اور روحانی بھی ہمیں پہلے ایسے محرکات کا صحیح اندازہ کرنا چاہئے، جب کہین جاکر ہم اس قابل ہوں گے، کہ اخلاقیات، معاشریات، سیاسیات، اور اقتصادیات کی بنیادیں استوار کرین،

یہ سب کچھ صحیح ہے، لیکن اگر عمل ترکیب کی اہمیت اور طریق کار کے متعلق جو کچھ گذشتہ صفحات میں عرض کیا گیا ہے صحیح ہے، تو اس حقیقت کا ہمیں اعتراف کرنا پڑیگا، کہ محرکات عمل انسانی کی نفسی تحلیل خواہ کتنی ہی مکمل کیون نہ ہو جب تک فرد انسان اور جماعت انسانی کے نفسیات کو ترکیبی نقطۂ نگاہ سے دیکھا نہ جائیگا، (اور اس وقت نفسیات کے مختلف شعبوں نے کافی مواد جمع کردیا ہے) اس وقت تک اخلاقیات، معاشریات، اقتصادیات اور سیاسیات کے علوم تشنہ و ناکام رہیں گے، بلکہ یوں کہئے کہ انسان اور جماعت انسانی کے حق میں یہ علوم اسی طرح مضر رہیں گے، جیسے کہ اب تک رہے ہیں، فی الحال تو ان علوم کی تحلیلی کوششوں نے نرگس نے پر پھیلا رکھے ہیں، بات یہ ہے کہ محض تحلیل کی مدد سے علوم انسانی کی پیچیدگیاں حل کرنے کی کوشش کرنا، اصولاً غلط ہے،

(باقی)

حضرت ظہیر بلگرامی

از

ازجناب حامد حسن صاحب، ام اے، بلگرامی

خاندان صانع کے چشم وچراغ حضرت منشی محمد مسعود صاحب کے فرزند ارجمند جناب منشی ظہیر الدین خان المتخلص بہ ظہیر نے اپنے زمانہ میں جو عزت وناموری حاصل کی، وہ آج ایک بھولا ہوا افسانہ معلوم ہوتی ہے، جس طرح آپکے حالات زندگی ایک عرصہ تک تاریکی میں پڑے رہے، اسی طرح آپ کی بیشمار قابل قدر تصانیف طاق نسیاں کے حوالہ ہوگئیں، مجھے جو کچھ حالات استاد مکرم حضرت مولوی محمود صاحب حمد بلگرامی سے دستیاب ہوئے، وہ مختصراً تحریر کرتا ہوں، جناب حمد صاحب بلگرامی حضرت ظہیر بلگرامی کے فرزند اور اس خاک بلگرام کی آخری عظمت ہیں،

حضرت ظہیر کی پیدائش کا فخر بلگرام کے محلہ قاضی پورہ کو حاصل ہے، آپ ۱۲۱۰ھ میں پیدا ہوئے ظہیر الدین اسی فصلی حساب سے تاریخی نام ہے، کچھ عرصہ تک تو بلگرام ہی کی ادب نواز گلیوں میں تربیت پاتے رہے، اور یہیں کے استادوں سے ابتدائی تعلیم حاصل کرتے رہے، سات سال کی عمر میں ان کے والد بزرگوار منشی مسعود نے انہیں لکھنؤ بلا لیا، منشی صاحب اس وقت سعادت علی خان کے دربار میں ایک ممتاز ہستی تھے، اپنی زیر نگرانی ہونہار بچے کی تعلیم شروع کرائی، تقدیر کا ستارہ بلندی پر تھا، نواب معتمد الدولہ سید محمد خان ضیغم جنگ اُن سے محبت کرنے لگے، اور اپنے بیٹے کی طرح سمجھنے لگے، اسلئے وزراء اور سلاطین کے بچوں کیساتھ تعلیم ہونے لگی، اور آپ امجد علی شاہ کے ہم مکتب ہوئے یہیں

دونوں راہ ورسم کی ابتدا ہوئی، اس صحبت نے ایک طرف ان میں اعلیٰ دماغی اور بلند ذہنیت پیدا کردی لیکن یہی نازپروری تحصیل علم میں سدراہ بن گئی، ان کی ۱۲ سال کی عمر تھی، کہ غازی الدین حیدر کی مسندنشینی کا زمانہ آیا، اس کے کچھ ہی دنوں بعد باپ کی مرضی کے خلاف انھیں تعلیمی مشاغل سے اٹھاکر دفتر وزارت میں انشا اور مسودات نویسی کی خدمت سونپی گئی، اس کم سنی میں اس خدمت کیلئے انتخاب انکی استعداد وصلاحیت کا ثبوت ہے، ان کی خوش قسمتی سے ۱۲۳۵ھ میں ان کے شفیق اور سرپرست نواب معتمد الدولہ وزیر اعظم مقرر ہوئے، حضرت ظہیر نے لفظ "وزیر اعظم" سے تاریخ نکالی ۱۲۳۹ھ میں ان کے والد ماجد منشی مسعود صاحب کے انتقال کے بعد نواب صاحب نے والد کے خدمات کا لحاظ کرکے ان کو ترقی دیکر دفتر وزارت کا سکریٹری بمنزلۂ نائب وزیر بنادیا، اور "دبیر الانشا منشی ظہیر الدین خاں بہادر" نام وخطاب ہوا، اس کے بعد ہی خلعت زرین اور جیغۂ مرصع مروارید عطا ہوا، ملکی سیاسیات اور آپس کے اختلافات کی وجہ سے محمد علی شاہ کے زمانہ میں یہ کچھ عرصہ کے لئے معطل بھی ہوگئے، لیکن حاسدون کی فریب کاریاں زیادہ دنوں تک نہ چلیں، اور آپ ۱۲۵۹ھ میں حضرت امجد علی شاہ کی سفارش سے نیابت جنرلی ومیر بخشی گری پر مامور ہوگئے، نیابت درحقیقت برائے نام تھی، کل کام یہی انجام دیتے تھے، نواب امین الدولہ بہادر نے بھی اپنے خانگی امور و دفتر وزارت کے کل اختیارات انہی کے سپرد کردیئے تھے، اور کوئی کام بغیر ان کے مشورے کے نہ کرتے تھے، اس طرح واجد علی شاہ کے زمانہ تک آپ سلطنت کے آغوش عشرت میں پرورش پاتے رہے، اور اس کے دامن سے وابستہ رہے،

واجد علی شاہی دور میں بادشاہ سے لیکر رعایا تک عیش ونشاط میں ڈوبے ہوئے تھے، لیکن حضرت ظہیر کی طبیعت کا رنگ نمایاں طور سے بدلنے لگا، کچھ عمر کے تقاضے اور کچھ عبرت آموزی سے اسی زمانہ میں آپ کو موت کا خیال اور آخرت کی فکر ہونے لگی، چنانچہ ۱۲۶۲ھ میں آپ نے اپنے والد بزرگوار کی قبر کے پاس اپنی قبر بنوائی، اور تین دن برابر اس صحرائی گورستان میں آرام کیا، کہ طبیعت

مانوس ہوجائے وہیں نماز پڑھتے، اور خود اپنا یہ شعر آہستہ آہستہ ترنم سے پڑھا کرتے،

شدم آہ در انتظارت ہلاک بیا اے اجل زود روحی فداک

پنجشنبہ کے دن عموماً عصر سے عشا تک جہاں تک ہو سکتا، قبرستان ہی میں رہتے، قبر کو غلہ سے بھروا کر غلہ خیرات کر دیتے،

زمانہ پلٹا واجد علی شاہی کا آفتاب غروب ہوا، بادشاہ مٹیا برج کی چہار دیواریوں میں زندگی کے آخری دن گذارنے کے لئے روانہ کر دیا گیا، کچھ درباری اور احباب بھی ساتھ ہوئے، شاہ نے حضرت ظہیر سے ساتھ چلنے کی خواہش کی، لیکن اب ان کو کچھ اور ہی لو لگی تھی، دست بستہ عرض کیا کہ اب قبر سے الفت ہو گئی ہے، اگر اجازت ہو، تو یہیں پیوندِ زمین ہو جاؤں، وہاں سے میری لاش کون لائے گا، اور نہ گئے، یہ معذرت قبول ہوئی،

غدر کے بعد گورنمنٹ کو عطائے وثیقہ کے لیے مستحق اشخاص کی فہرست مرتب کرنے کی ضرورت ہوئی، اس میں ظہیر سے بھی مدد لی گئی، ان کی اعانت سے کئی حقداروں کو ان کے حقوق ملے، اب بھی ان کی تصنیف کردہ کتاب "ضبط قوانین دفعات و وثائق" دفتر وثیقہ میں موجود ہے،

ان کی زندگی کے آخری زمانہ میں جب کیننگ کالج کھلا، تو ان سے اسکی مدرسی قبول کرنے کی استدعا کی گئی، لیکن اب طبیعت پابندیوں سے آزادی چاہتی تھی، اس لئے بڑی مشکل سے مدرسی قبول کی، لیکن پابندیوں سے یہاں سے بھی آزاد ہی رہے، ایک بار پرنسپل نے حکم دیا، کہ لوگ اپنی تنخواہ لینے خود آیا کریں، حضرت ظہیر کی خودداری کو اس سے ٹھیس لگی، کہلا بھیجا کہ روپیہ فقیروں کو بانٹ دیجئے، میں گداگری کرنے نہیں آیا، یہ کہلا کر ملازمت سے استعفا دیدیا، لیکن کچھ دنوں کے بعد پھر بلائے گئے، اور زندگی کے بقیہ دن وہیں گذارے، ۱۲۹۲ھ میں آٹھویں ذی قعدہ شنبہ کے روز فجر کی نماز کے بعد انتقال فرمایا، اور اسی قبر میں جس سے زندگی میں مانوس ہونے کی عادت

ڈالی تھی، میر واحد علی صاحب کی کوششوں سے مدفون ہوئے، جناب منشی محمود صاحب حمد بلگرامی نے تاریخ کہی،

صباح ہشتم ذی قعدہ روز سہ شنبہ ظہیر رفت ز دیر فنا بدار سلام

نوشت خامہ ام اے حمد مصرع تاریخ روانہ والد من شد سوئے ارم بہ مرام

۱۲۹۲ھ

وضع لباس

حضرت ظہیر لکھنو کے لطیف طبع لوگوں میں شمار ہوتے تھے، ہر سال نئی نئی پوشاکیں دور دور سے تیار کرا کے منگاتے، کشمیر سے اپنی پسند کے کپڑے بنواتے، اودھ میں ان کی خوش لباسی حکایت کے طور پر مشہور تھی، لیکن غدر کے انقلاب میں سارا اثاثہ لٹ گیا، پھر بھی جو دو چار چیزیں بچ گئی تھیں، وہ بے نظیر تھیں، غدر کے بعد کا واقعہ ہے، ایک مرتبہ مہاراجہ سر دگجی سنگھ بہادر والی بلرام پور و تلسی پور، ایک بیش قیمت پشمینہ جو انھوں نے کشمیر سے منگایا تھا، حضرت ظہیر کو دکھا کر کہنے لگے، کہ آپ سے زیادہ اس کا قدر شناس کون ہو سکتا ہے، منشی جی نے دیکھ کر فرمایا جی ہاں اچھا ہے، مہاراج بولے کہ اگر پسند ہو تو حاضر ہے، حضرت ظہیر متبسم ہوئے اور خدمتگار کو اشارہ کیا، وہ مکان سے ایک دوشالہ جو نصیر الدین بادشاہ اودھ کی خاص پوشاک میں تھا، اور ان کو بطور خلعت عطا ہوا تھا لایا، منشی جی نے اسے مہاراج کے سامنے پیش کر کے فرمایا، کہ میں اب ضعیف ہو گیا ہوں، یہ پرانے کپڑے جسم چھپانے کے لئے کافی ہیں، اب یہ لباس اس قامتِ خمیدہ پر زیب نہ دے گا،

سلاطین سے تعلقات

حضرت ظہیر کی مراسلت اکثر امراء و سلاطین سے رہتی تھی، آپ نے غالب کی وساطت سے ۱۲۶۹ھ میں اپنی ایک نظم "صراط المستقیم" بادشاہ دہلی کی خدمت میں بھیجی تھی جس کے صلہ میں بادشاہ کی جانب سے ان کے خطابات میں اضافہ کیا گیا، ان کی وہ مہر جس پر ان کے سب خطابات اور نام کندہ ہیں، میری نظر سے گذری ہے، وہ یہ ہے :-

"رفیق الدولہ دبیر الانشا محمد ظہیر الدین خان بہادر مرید خاص حضرت ابو ظفر سراج الدین

محمد بہادر شاہ، بادشاہ غازی، خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ"

بادشاہ دہلی کی ایک تحریر بھی جو منشی جی کے نام تھی، دیکھنے کا موقع ملا ہے، اس کے

بعض فقرے یہ ہیں، :-

"حقائق معروضہ مکشوف گردید، منظومات ملفوفہ بملاحظۂ قدس رسید بسیار پسند طبع گردید

جلد ثانی و رسالہ مرأۃ اشیار مع التفاسیر بمقتضائے مراحم خسروی مرحمت شدہ است"

جس زمانہ میں شاہ اودھ واجد علی شاہ کلکتہ میں اقامت پذیر تھے، حضرت ظہیر نے ایک کتاب

سیر السلطان لکھی تھی، یہ نظم میں واجد علی شاہ کی سوانحمری تھی، اس میں خاص صنعتیں رکھی گئی تھیں جس کی

تفصیل منشی صاحب نے اپنے ایک خط میں کی ہے جو اپنی کتاب کے ساتھ واجد علی شاہ کو بھیجا تھا منشی جی

کے اس خط کیساتھ واجد علی شاہ کا خط بھی نقل کیا جاتا ہے،

نقل خط

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اے خامہ ادب کن کہ مقام ادب است این	این جا چو زسر پا نکنی بس عجب است این
از چوب بسیہ پیش نہ خود حطب است این	گر مرتبۂ خود نشناسی غضب است این
ہان این قدر البتہ ترا قدر نہادند	آنجا تو رسیدی کہ مرا بار نہ دادند

صبا اگر گذرے افتدت بکوے کسے

مزاج دیدہ تواں کرد گفتگوے کسے

حضرت ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی، قبلۂ عالم و عالمیان، دستگیر درماندگان پرورش فرمائے

غلامان و قدیمان عز نصرہٗ و ضاعف قدرہٗ،

عرضی

بجناب عالیان باب

" از آنجا کہ فیض انعام عام بادشاہی چوں رحمت عام نامتناہی بر جمیع خاص و عام است این پیر غلام قدیم کہ از دو پشت خود وشش دورہ ایں سلطنت اودھ از عہد جنت آرامگاہ تا اوائل عہد حضرت سلطان عالم بکار گذاری وخدمات عمدہ این سرکار رتۃ العمر بسر بردہ ہنگام کنارہ کشی کار متعلقہ بنظر قدیم پروری و بے قصوری دو صد روپیہ مشاہرہ معینہ خانہ زاد ماہ بماہ بواسطہ نواب وزیر اعظم حضور عالم می رسد وہر روز بلا ناغہ در مصاحب منزل نزد فتح الدولہ بہادر مرحوم نہیب خود حاضری ماند، مگر دولت ملازمت کہ مقدور نبود میسر نہ شد ؎

آن کیست کہ تقدیر کند حال گدا را در حضرت شاہ

از نغمۂ بلبل چہ خبر باد صبا را جز نالہ و آہے

بہر حال چوں باوجود صرف شاہی مشاہرہ معینہ بیکار خوردن و کارے نہ کردن گوارا نہ شد، لاجرم در ہمان ایام برائے شغل بے کاری چناں بخاطر گذشتہ بود کہ کتابے بطور تاریخ شعریہ حالت خاص حضرت سلطان عالم از ابتدا تا انتہا، بعبارت صاف صاف عام فہم ترتیب دادہ آید، کہ یادگار باشد، وہمہ حال راست براست بیان واقعی وصحیح درو درج کردہ شود، لہذا تحقیقات حالات وحکایات ہمت وسخاوت ودیگر تصانیف خاص وروزنامچہ وسوانح عمری حضرت اقدس واعلیٰ اہتمام وکوشش بکار بردہ کتابے تصنیف تازہ ایجاد کردہ بود کہ ہر ہر فقرہ بلکہ ہر لفظ وحرف سنہ جلوسی وہم سنہ ہجری اوّل جلوس حضرت سلطان عالم وہم اعداد نام حضرت اقدس واعلیٰ وہم

سنہ تصنیف کتاب در و بر می آید، و نام کتاب سیر السلطان سوانح واجدی قرار داده بود، ہنوز نوبت گزشتش نہ رسیدہ بود، کہ گزشت انچہ گزشت، بعدہٗ کہ درین کسر وانکسار عام مسودہ اش نیز با تمام خانہ و خانماں وقف غارت و تاراج عام شد زندگی وبال جان گردید، درچنیں زندگی بدتر از مرگ کہ عالمے در عالم لا یموت فیہا ولا یحیٰی بصد حسرت و یاس بسری برد، کجا ہوش و حواس کہ دست بخامہ آشنا کند، کہ دفعتہً درچنیں عالم یاس انعام فیض عام سلطان عالم جانی تازہ در قالب مقتولان خنجر یاس در دمیدہ از سر نو حیات تازہ بخشید، مفہوم ینزل الغیث مما قنطوا و ینشر رحمتہ ہویدا کرد ایں زدہ دل ہم با ہمہ افسردگیہا تاب ضبط در خود ندیدہ روا نداشت کہ ذکر چنیں سلطان عالم نمونہ رحمت الٰہی خصوصاً چناں بذل عام از صحائف تاریخ معرا باشد، انصاف در کار است کہ از آدم تا ایندم جا کتب تواریخ از حالت اسخیاے زمان لبریز اند، مگر ہمہ ہنگام دولت و مقدرت بہ ہنگام سوال سائلاں را بقدر مقدور عطا کردہ باشند نہ درچنیں حال، و در از حال و چناں بے مقدوری ہا، کہ ظاہر است بدون سوال از طلب ہمہ دورافتادگاں را یک یاد فرمودہ انعام ہا چہ بلکہ حیات تازہ چناں بخشید، کہ اگر اجل موقت مانع نبودی، خوف شادی مرگ بود انصاف رود کہ از ابتداے عالم تا این دم کسے را اگر بایں صفت نشان دہند، کہ با ہمچو ابتلا ہاے ذاتی و صفاتی چناں عطا ہاے عام عند العسرت کردہ باشد، اینک خانہ زاد خام دعوی از دست می اندازد، لہذا ترتیب ہمچو کتاب ملتوی داشتن روا نداشتہ اشعار صنعت اعداد تاریخ کہ مسودہ اش بارے محفوظ بود، بطور نمونہ لعت عرضداشت کردہ شد تا اگر ایما شود دگر رسائل تصانیف حضرت اعلیٰ کہ در ہر علم جدا جدا شنیدہ می شود مع دگر حکایات

وسوانح عمری وروزنامچہ اگر بدست آمدن تواند ایں نفسے چندہمیں تصنیف وتالیف بسر بردہ کہ بدولت ہمچو ممدوح نام مداح ہم بر صفحۂ روزگار یادگار خواہد ماند، فقط نیر ماہ وجلال چوں روشمیش للعلوۃ الوسطیٰ باز باوج دولت واقبال عروج فرمایاذ مجدا لنہ الامجاد،

قطعہ تاریخ مذکور این است

کجاست چشم کہ بیند بدیدۂ ادراک　　　کدام شے کہ درونیست آیتے ز خدا

بہ ذرہ ذرہ عیان است مظہر دانش،　　　اگر یقیں نہ کنی میدہم نظیر ترا

الخ

سلطان نے اسکی بہت قدر کی، اور جوجواب دیاوہ حسب ذیل ہے،

"دبیر الانشا منشی محمد ظہیر الدین بعافیت بودہ بداند، شعاع آفتاب کلامش چناں برذرہ دلم تابید کہ سرتاپا محو گردیدم وچون درحساب سیاق وتخرجہ وتعمیہ دربرو ینیات وتاریخ محض چوب ناتراشیدہ ام، لہذا حسب لعرض اشعار تاریخ گذرانیدہ اش را برائے فہمید نزد سلطان الحکما، مسیح الدولہ بہادر ومنشی جانکی پرشاد کہ مخزن استعداد وجواہر قابلیت اند فرستادہ ام مگر صفائے بندش وحسن کلامش دریافتیم بہر دوست دل گرفتہ ماندم بخدا کہ ہرگز قابل ولایق چنیں تحریر بے نظیر نبودم ولطف وکیفیت وجدانی ازلب نمی خیزد، مگر انچہ دل ریزد دل برد، صلہ اش بعوض ہر لفظ یک گنج مروارید است، مگر این زمانہ مبلغ پنجاہ روپیہ در ماہہ از برائے ضرورت تیاری سیر السلطان سوانح واجدی مقرر نمودم مکتبہ ونوجرہ، یک صد وبست وچہار عدد کہ از نام راقم برمی آید، سبحان اللہ رمزی از عمرورا وسنہ طبعی پیداست وہر انچہ درباب رسائل تصنیف راقم درفنون جدا گانہ مع دیگر روزنامچہ وسوانح عمری عرضداشت صورتش بریں گونہ کہ تالیفات وتصنیفات عمدہ را سیل غارت باغیان ہمچو خس وخاشاک درامواج تاراج چناں غرق ساخت کہ اثر حرفی

ازان باقی نیست و روزنامچہ وسوانحمری جز آہ جگر و دودِ دل مضطر باشام زندان با جسم عریان، یا بجر اشک یا تصادم رشک دور از یاران گشتہ، و مجروح سیوف فراق زمان و فرزندان حالا اگر حیثیت، بہر حال اگر از اقتباس انوارم گونہ لذتے و آگہی داشتہ باشد کالشمس فی النہار است، ع

حاجتِ مشاطہ نیست روے دل آرام را

حبذا کہ از کلکِ صداقت سلکش بمطالعہ راقم در آید، بدانکہ ہمہ تن مشتاق مشاہدہ آن تحریر دلپذیر صدق نظیرم در ارسالش دیر نباید ساخت و مبلغ ویک صد و بست وچہار روپیہ برائے نثار حروف و اعداد نام راقم و دوازدہ عدد اشرفی جہت وزن شکل ہندسہ و مبلغ شصت وسہ روپیہ بنابر تحصیل شصت وسہ روپیہ سرو پائے جلوس میمنت مانوس و دوازدہ اشرفی دیگر برائے اضافہ شصت وسہ مبلغ و عدد جلوسی و یکہزار و دوصد شصت وسہ روپیہ مطابق عدد سنہ جلوس ہجری و دوازدہ اشرفی بعدۂ اسم ذات و دیگر شصت وشش عدد اشرفی باعداد اسم ذات اعنی اللہ موافق فہید خود باد عنایت نمودیم مابقی بعد فہید حمیدہ مع حساب مشہور و مبالغ دو ہزار و نہ صد و دہ روپیہ می شوند، از میر واجد علی ستانند و رسید ارسال دارد و تنخواہ خود بحساب مرقومۂ بالا از کاتب الملوک منشی محمد شفیع الرضوی حسب ضابطہ ماہ بماہ وصول کردہ باشد، بقلم پرور والمجید ابن جانعالم اختر مورخہ بست ونہم شوال المکرم ۱۲۷۵ھ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

عزت وشہرت عزت وشہرت الکتساب سے زیادہ رحمتِ الٰہی کا عطیہ ہیں، حضرت ظہیر کو یہ عطیہ پروردگارِ عالم کے دربار سے ان کی زندگی ہی میں مل گیا تھا، عزت و اقتدار کے نمونے گذشتہ اوراق میں گذر چکے ہیں، خدا نے علمی دنیا میں بھی ان کو عزت و شہرت کا وافر حصہ عطا فرمایا تھا

اس زمانہ کے ممتاز اخبار ان کے کلام کے منتظر رہتے تھے، اور مدحیہ نوٹ کے ساتھ اسے شائع کرتے، انکی شاعری کی نسبت اخبار دو مدم کلکتہ لکھتا ہے،

"واضح باد کہ ما سابق بریں چنان انگاشتہ بودیم کہ دریں زمان ناپرسان ہم چون شعرائے متقدمین در فصاحت وفضیلت کم ترکسے موجود لیکن السابقون السابقون اولٰئک هم المقربون" در متاخرین در برابر سابقین دورے ہم پیدا نیست، بیتما دریں دیار یافتہ شود، ولیکن معنی، فوق کل ذی علم علیم، ولہٰذا ازیں خیالات باز داشتہ، وکذٰلک فضلنا بعضهم علی بعض" زعم فاسد را از ضمیر ما خراشید، بعدہ بہ یقین دانیستم، کہ ملک خدائے تعالیٰ بہ این ہمہ وسعت کہ" ارض اللہ واسعۃ" از وجود این چنیں مردم عدیم الوجود، کہ در علم و ادب وخصائل کسب آراستہ باشد، خالی نیست، تصور عزلت گزینی ماست....

.....نام گرامی د[illegible]م سامی جناب ظہیر الدین محمد رفیق الدولہ بہادر است"

اس کے بعد ان کی کتابوں کا ذکر اور ان کی شاعری پر اظہار راے کیا ہے،

تصانیف مختلف موضوعوں پر حضرت ظہیر کی تصانیف ہیں جن سے ان کی وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے، جو تصانیف مل سکیں، ان کے نام یہ ہیں،

ظہیر الایمان، ظہیر الان، ظہیر الاسلام، محاسبۃ النفس، معالجۃ النفس، مشاہد الحق، ظہیر الانسان، معرفت النفس، معرفت الروح، ماہیت الغنا، وسیلۃ الرزق، ماہیت البلاد، دستور الحبت، اسرار حکمت، اسرار غفلت، اسرار کربلا، اسرار نبوت، ہدایت الہنود، تقویت الاسلام، اسرار واحدی، رسالہ قضا و قدر، ترغیب الفرقان، سراج النبوت، مرثیہ جامی، مرثیہ دہبی، دیوان فارسی،

فارسی دیوان فارسی کے دیوان میں مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے، قصیدوں سے

عربی زبان میں درک کا پتہ چلتا ہے، غزلیات اکثر اساتذہ کی مشہور غزلوں پر لکھی ہیں، تصوف میں حافظ کا تتبع کیا ہے، اور ان ہی کے رنگ سے متاثر ہوئے ہیں، عام شاعری میں نظیری نیشاپوری کا رنگ جھلکتا ہے، وہی عشق و محبت کے جذبات کی شدت، اور وہی تخیل کی بلند پروازی، ذیل کے انتخاب سے ان کی شاعری کا اندازہ زیادہ بہتر کیا جاسکتا ہے،

اے نامِ تو سرنامۂ دیوان تعالیٰ — نام تو بود نام خدا از ہمہ بالا،

چو آندم می پرد ہر لحظ چشم از شوق روئے تو — مگر از رنگ ما آموخت انداز پریدن ہا

نعرہ ام در سینۂ آتش زد ز چشم آب ریخت — آہ من دارد عجائب مختلف تاثیر را،

اشک حسرت شمع می ریزد ز اشکِ چشم من — داغِ دل گردید سوز سینہ ام پروانہ را

دامن کشاں چو بر سر خاکم گذر کند — دستے زند بدامن جانان غبار ما

ز حیرت شود محو حسنِ خودش — چو آئینہ رو بیند آئینہ را

آب گردید گر دم مردم چشم — کشتی چشم رفت در گرداب

گفتم بیا، گفتا کجا، گفتم بہ بر گفتا چرا — گفتم پئے تسکین دل گفتا ولت بارِ من است

گفتم کہ باشد یار تو گفتا کہ بختِ من بود — گفتم ظہیرِ خستہ دل، گفتا کہ بیمار من ست

گفتم چہ دامِ جان و دل گفتا کہ زلف دلکشم — گفتم کدامی دانہ گفت ایں خال رخسارِ من ست

گفتم کہ بلبل در قفس، گفتا دل عاشق بہ تن — گفتم کہ گل در بوستان گفتا کہ رخسارِ من است

زلفش نہ بود دو ز شمع رخ او، — از پاسِ ادب سوے قدم مائل شد

دیدم چو حبیب را ندیدم خود را — ہشیاری دل بہ بیں ز خود غافل شد

جان بدارم تا کنم بر تو نثار اے جانِ من — آمدی چوں بر مزارم شرمسارم بعد مرگ

بیقرارم آں قدر از درد ہجراں اے ظہیر — در لحد ہرگز نمی آید قرارم بعد مرگ

سوزشِ پروانہ کے باشد زعشق — بلکہ می سوزد زرشکِ داغِ ما

زحال گشتہ حال دل پر ملالِ ما — باشد مگر مجالِ ترحم بحالِ ما

درخواب ہم نمی گذرم درخیالِ او — ہست این خیال ہمچو خیال محالِ ما

بہرکار اول نگر راست وچپ — بباید کہ داری نظر راست وچپ

زخود رفتہ اند از یمین و یسار — کند نعرۂ ما اثر راست وچپ

کسے را قضا درجہاں برنداشت — نہ بیند قضا و قدر راست وچپ

بحق واصل شدم در شادی وصل — ظہیر این وصل باشد یا وصال است

کس حقیقت کسے مجاز گزید — فکر ہرکس بقدر ہمت اوست

کار من از دستِ دوست از کار رفت — وا دریغا عمرِ من بیکار رفت

بود زاہل سخن درجہان سخن باقی — قضا اگرچہ بسے را ازیں میاں برداشت

جاے نہ مکانے تو، بہر جاست مکانت — ہر منزل و ہر خانہ مکان ست و مکاں نیست

اگرچہ خاکِ من بر باد داری — ہنوز از مشت خاکِ من غبار ست

یارِ من در کنار آمد و رفت — جان درین جسم زار آمد و رفت

گر کنم اختیار ضبطِ من ء — آہ بے اختیار را چہ علاج

مکن عمارت عالی درین جہان تعمیر — چرا کہ خاک شو و منقلب کنی گرکاخ

چو چشمِ مرا کرد بیمار خود — بگفتم تو ہم نیز بیمار باش،

چو بیہوش کردن مرا بے سبب — زبیہوشی ما تو ہشیار باش،

چوں کشیدیم بہ آغوش خیال — رنگ رویش زنزاکت شد فق،

مرحبا اے انیس تنہائی — کس نشد مونسم سواے فراق

کوفت دست اجل چو کوس رحیل	بر نیامد بجز صدائے فراق
بسکہ خون بیگناہان گشت دامنگیر چرخ	ہر مسا رنگ شفق گردد نمایاں برفلک
گفت گرمخفی زچشم مردماں آیم شبے	خاک من درخانہ ات باشد کجا گفتم بچشم
بقید زندگی از زندگی تنگم اجل باشد	بمدت درہمیں زندان گرفتارم گرفتارم
زقید ہر دو عالم اے ظہیر آزاد گردیدم	کہ من قیدی بے قیدان گرفتارم گرفتارم

چودھویں صدی کی تفسیر کبیر

تفسیر جواہر

مصر کے مشہور عالم شیخ طنطاوی جوہری نے تفسیر جواہر کے نام سے پچیس جلدوں میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی ہے، جو اپنی نوعیت اور معنوی محاسن کے لحاظ سے زمانہ حال کی تفسیروں میں یگانہ حیثیت رکھتی ہو، اسمیں شیخ موصوف نے جہاں سیاست، اقتصاد، فلسفہ وسائنس، فلکیات، طبقات الارض وغیرہ عصری علوم پر قرآن پاک کی آیتوں سے استشہاد کیا ہے، وہاں سلف کی تفسیر کی بھی پوری پوری پابندی کی ہے، ابھی اسکی پہلی جلد کا ترجمہ نہایت سلیس، عام فہم، ہندوستانی زبان میں کیا گیا ہی، جو صرف سورۂ بقر کی تفسیر پر مشتمل ہو، شروع میں علامہ سید سلیمان ندوی کا بصیرت افروز مقدمہ بھی ہی، مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈہ، کاغذ سفید ولایتی ۴۲ پونڈ، اور کتابت وطباعت دیدہ زیب ضخامت ۵۰۰ صفحے قیمت ہے علاوہ محصول ملنے کا پتہ:۔ **سکریٹری عمر لائبریری عمر آباد متصل آمبور ضلع شمالی ارکاٹ**

"صوبہ مدراس"

تلخیص و تبصرہ

فلسفہ کی کانگریس

کا

سالانہ اجلاس

دسمبر کا آخری ہفتہ اپنے علمی جلسوں اور کانفرنسوں کے لئے مشہور ہے، اس سال ہندوستان کی فلسفیانہ مجلس کا چودھواں اجلاس الہ آباد میں ہوا مجلس استقبالیہ کے صدر الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، انھوں نے معزز مہمانوں کا خیر مقدم کیا، اور کہا کہ فلسفیوں کے ایک گروہ کا ایک جلسہ میں بیٹھکر خدا، تقدیر اور قوت ارادی وغیرہ جیسے مسئلوں پر گفتگو کرنا بظاہر ایسے ہی مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے، جیسے روم جب جل کر خاکستر ہو رہا تھا، تو سنیکا کا ایک شاگرد اپنی بانسری بجانے میں مصروف تھا، لیکن یہ ایک حقیقت ہی کہ افراد ہی کے اخلاق حسنہ سے ریاست کی تعمیر ہوتی ہے، اور صرف فلسفیوں کی جماعت ہی اخلاق حسنہ کے اصول بنا سکتی ہے، بلکہ موجودہ حالات تو یہ چاہتے ہیں، کہ اس وقت ہر جگہ فلسفی ہی حکمراں ہوتے یعنی طاقت و اقتدار کے ساتھ سچائی کی پرستش ہوتی اور اس پر عمل بھی ہوتا، اس کے بعد انھوں نے کہا کہ بظاہر فلسفہ اور مذہب میں تضاد معلوم ہوتا ہے لیکن بیکن کا قول ہو کہ فلسفہ کا سطحی علم دہریت اور گہرا علم مذہب کی عقیدت پیدا کرتا ہے، فلسفہ ایک خشک چیز بھی نہیں، ملٹن کہا کرتا تھا کہ وجدانی فلسفہ کبھی مشکل اور غامض نہیں ہوتا ہے، بلکہ اپالو کی بانسری کی طرح شیرینی اور موسیقی سے بھرا ہوتا ہے، ادب کا فلسفہ سے گہرا تعلق ظاہر ہے، سنسکرت میں سینکڑوں ضرب المثلیں اور کہاوتیں ایسی ہیں، جو فلسفیانہ حقائق و معارف کی تشریح کرتی ہیں؛

انگریزی میں شکسپیر کے ڈراموں میں اخلاق، سچائی، نیکی اور معصومیت کے مختلف پہلوؤں کے بہترین نمونے ہیں، اردو میں غالب اور انیس کی شاعری میں فلسفیانہ نکتے کثرت سے ملیں گے، اقبال کا تو ذکر ہی نہیں، کولرج کہا کرتا تھا، کہ ایک آدمی اس وقت تک بڑا شاعر نہیں ہو سکتا، جب تک وہ فلسفی نہ ہو، شاعروں ہی پر کیا منحصر ہے، ہر بڑا آدمی فلسفی ہوتا ہے، یورپ کے آمر، جمہوریت کے علمبردار، ترقی پسند ادیب حتی کہ دہشت انگیزی اور نراجی کے حامی بھی فلسفی ہیں، ایک فرانسیسی بذلہ سنج نے کہا ہے کہ فلسفہ کو مضحکہ خیز بتانے والے بھی دراصل فلسفی ہیں، سسرو کا قول ہو کہ دنیا میں کوئی ایسی مضحکہ خیز چیز نہیں ہے، جو کسی نہ کسی فلسفہ نے نہ کہی ہو،

اس کے بعد جلسہ کے صدر پادری سی اف اینڈریوز نے اپنا خطبہ دیا، وہ فلسفی ہوں یا نہیں لیکن اہنسا کے قائل ہیں، اسلئے ان کے زبانی خطبہ کا یہی موضوع رہا، انھوں نے گوتم بدھ، زرتشت اور حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کی روشنی میں دکھایا، کہ تشدد کا استیصال تشدد سے نہیں ہو سکتا، اور برائی برائی کے ذریعہ سے دبائی نہیں جا سکتی،

دوسرے روز فلسفہ کی مختلف شاخوں کے علحدہ علحدہ جلسے ہوئے، اسی روز ایک نشست میں فلسفہ اور تصوف کے باہمی ارتباط پر ایک دلچسپ مذاکرہ ہوا،

"منطق اور مابعد الطبیعیات" کے اجلاس میں انڈھیرا یونیورسٹی کے پروفیسر، ڈاکٹر پی، ٹی راجو نے صدارت کی، ان کے خطبہ کا موضوع "فوق المرتبہ کا تخیل اور دماغ کا حلقۂ اثر تھا" اس میں انھوں نے یہ بتایا کہ فلسفیانہ تفسیر جدید تخیلات کی تشکیل سے متعلق ہوتی ہے، تاکہ وجود اور زندگیوں کی پیچیدگیوں پر قابو حاصل ہو، وجود کا معیار جتنا ہی بلند ہوتا جاتا ہے، اتنے ہی تخیلات ناقص ہوتے جاتے ہیں، اور نئے نئے نظریے اور خیالات پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، ڈاکٹر موصوف نے اس بحث کو پھیلاتے ہوئے آخر میں کہا کہ اگر دماغ ایک وجود حقیقی ہے جس سے عمل صادر ہوتا ہے، تو عمل

ق المرتبہ کا فعل سمجھنا چاہئے،

"ہندوستانی فلسفہ" کے اجلاس کی صدارت کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر اس سی چرجی نے کی، ان کے خطبہ کا موضوع "فلسفہ اور ہندوستانی نقطۂ نظر" تھا، اس میں تجزیہ کرکے بتایا ہی کہ ہندستانی فلسفہ ظواہر کے بجائے حقائق سے بحث کرتا ہے، اس میں علم کے معنی محض ذہنی ادراک نہیں، بلکہ بجائے خود براہ راست تجربہ حاصل کرنا ہے، اس کی تکمیل محض استدلال سے نہیں، بلکہ تجربہ کے عقلی مطالعہ سے ہوتی ہے، اور یہ اخلاق کے تقدس اور پیہم غور و فکر سے حاصل ہوتا ہی،

اس کانگریس کے اس اجلاس کی ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اسی سال اس میں اسلامی فلسفہ کی بھی ایک شاخ بڑھائی گئی ہے، اس کے صدر جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر خلیفہ عبد الحکیم تھے، انھوں نے اپنے خطبہ میں فرمایا کہ اسلامی فلسفہ ایک ذہنی عمارت ہی، جو اسلام کی بنیاد پر کھڑی کی گئی ہے، یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اسلام کا آغاز کسی مابعد الطبعیاتی عقیدہ کی حیثیت سے نہیں ہوا، اور نہ اس کے پیغمبر اور ان کے خلفار موجودہ معنوں میں فلسفی تھے، اسلام ایک اخلاقی اور عمرانی انقلاب لیکر آیا، اس کے ذریعہ سے کوئی جدید مابعد الطبعیات پیدا نہیں ہوا، البتہ زندگی کے جدید نقطہ ہائے نظر ضرور پیدا ہوئے، اسلامی فلسفہ محض اسلام کے مذہب کا فلسفہ ہے، اور اسلامی اخلاق مذہب اسلام کے فلسفہ کا ضروری جز ہے، پروفیسر موصوف نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا، کہ اب تک ہندوستان کی کسی یونیورسٹی میں اس کے مطالعہ اور تحقیق کے لئے مناسب صورتیں اختیار نہیں کی گئی ہیں، مگر اس کی اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ مختلف یونیورسٹیوں میں لائق اساتذہ کی زیر نگرانی اسکے لئے جلد از جلد شعبے کھولے جائیں،

ہندو کالج دہلی کے ڈاکٹر اندراسین نے شعبۂ نفسیات کی صدارت کی، انھوں نے اپنے خطبہ میں کہا کہ ہندستان ہی ایک ایسا ملک ہی جہاں کلچر کے نفسیات اور فلسفہ پر بہترین طریقہ سے

مطالعہ کیا جا سکتا ہے، کیونکہ یہاں ہر قسم کے کلچر اور مذاہب موجود ہیں، لیکن اب تک ہم ان کی طرف سے غافل رہے ہیں، اب ضرورت اس بات کی ہو کہ ماہرینِ نفسیات اس کی طرف متوجہ ہوں اور یونیورسٹیوں میں ہندوستان کے مختلف کلچر کے نفسیاتی مطالعہ کے لیے سہولتیں پیدا کی جائیں، اس سے بہت ممکن ہو کہ مختلف کلچرل فرقے کے تعلقات خوشگوار ہو جائیں،

کوکناڈا کے مشہور بیرسٹر مسٹر رنگاچاری نے "اخلاق اور معاشرتی فلسفہ" کے شعبہ کی صدارت کی، ان کے خیال کے مطابق گاندھی جی کا فلسفۂ زندگی ایک بہترین نصب العین ہے،

اس کانگریس میں ایک روز سی اف اینڈریوز نے "ہندوستان کی مشترکہ زبان" پر ایک تقریر بھی کی، انھوں نے ہندوستان کے لئے ایک مشترکہ زبان کا ہونا ضروری قرار دیا، اس کیلئے ہندستانی کی حمایت کی، مگر ان کی رائے ہے، کہ یہ مشترکہ زبان محض کاروبار اور بول چال کے لئے ہونا چاہیے علمی کاموں کے لئے مختلف زبانیں بہرحال محفوظ رہیں، اور ذریعۂ تعلیم صوبہ کی زبانیں ہوں، جہاں تک رسم الخط کا تعلق ہے، ہندوستانی زبان تو لاطینی حروف میں ہو، لیکن ہر علمی زبان کیلئے اپنا اپنا رسم الخط ہو،

"ص، ع"

ادارۂ معارفِ اسلامیہ کا دہلی میں اجلاس

ادارۂ معارفِ اسلامیہ کا اجلاس ۲۶، ۲۷، ۲۸ دسمبر ۱۹۳۸ء کو دہلی کے اینگلو عربک کالج میں منعقد ہوا، استقبالیہ کے صدر آنریبل ڈاکٹر سر محمد عبد الرحمن، اور اجلاس کے صدر ڈاکٹر سر شاہ سلیمان تھے، باہر سے آنے والے مہمانوں کی تعداد تیس بتیس کے قریب تھی، یہ لاہور، حیدرآباد، کاٹھیاواڑ، علی گڈھ، رامپور، اعظم گڈھ، اور دوسرے شہروں سے آئے تھے، شہر کے اہل علم بھی جلسہ میں شریک تھے، پہلا جلسہ ۲۶ر دسمبر کو ۱۰ بجے دن کے شروع ہوا، پہلے صدر استقبالیہ نے اپنا خطبہ پڑھا، جس میں مہمانوں کے خیر مقدم

کے بعد اردو زبان کی اہمیت، ضرورت، اور دہلی سے اس کے خاص تعلقات کی تفصیل کی گئی تھی اور آخر میں ہندو مسلمانوں میں باہمی رواداری کی اپیل کی گئی تھی،

اس کے بعد صدر اجلاس ڈاکٹر سر شاہ سلیمان نے اپنا فاضلانہ خطبہ پڑھا، خطبہ گو انگریزی مین چھپا ہوا تھا، مگر موصوف نے اس موقع پر تقریر اردو مین فرمائی، تقریر کا اصل موضوع مسلمانون مین علم کی غرض و غایت تھا، اس کے بعد انھون نے یورپ کے نئے علوم و فنون کو اردو مین اور اسلامی علوم و فنون اور تحقیقات کے نتائج کو یورپ کی زبانون مین منتقل کرنے پر زور دیا،

ان تقریروں کے بعد صدر محترم نے ادارہ کی علمی نمائش کا افتتاح کیا، ادارہ کی دوسری نشست اسی دن ۲ بجے شروع ہوئی، شمس العلماء مولینا عبدالرحمن صاحب پروفیسر عربی دہلی یونیورسٹی جلسہ کے صدر تھے، مولینا عبدالعزیز صاحب میمن پروفیسر عربی علیگڈھ مسلم یونیورسٹی نے اپنا مضمون عربی میں پڑھکر سنایا، مضمون کا عنوان "حجاز اور تہامہ کے جغرافیہ پر سب سے پہلی تالیف" تھا، دوسرا مضمون مولوی عبدالسلام صاحب رامپوری نے ابو ہلال عسکری کی کتاب الاوائل پر پڑھا، پروفیسر موسوی اینگلو عربک کالج دہلی کا مضمون "اعتماد الدولہ" اور خواجہ عبدالمجید دہلی کا "صوفی اور تصوف" پر تھا،

بقیہ اجلاسوں کے مضامین کے عنوانات پروگرام کے مطابق حسب ذیل ہیں، ان مین سے بعض اصحاب تشریف نہ لا سکے تھے، اس لئے اُن کے مضامین پڑھے نہ جا سکے، بہرحال مضامین اور ان کے لکھنے والوں کے نام یہ ہین،

۱۔ ڈاکٹر ہادی حسن کا لکچر "فارسی اخلاق کے چند پہلو"

۲۔ ڈاکٹر زبیر صدیقی، کلکتہ یونیورسٹی "عربی شعر و نقد شعر"

۳۔ پروفیسر عندلیب شادانی ڈھاکہ یونیورسٹی "رباعیات ابوسعید بن ابی الخیر کا مصنف"

۴۔ ڈاکٹر پیر محمد حسن لاہور "شہرزوری کی نزہۃ الارواح"

۵ - پروفیسر سخاء اللہ پشاور "اسلامیہ کالج پشاور کی چند اہم قلمی کتابیں"

۶ - پروفیسر شیرانی لاہور "چند نئی ریختہ نظمیں"

۷ - قاضی احمد میاں اختر جونا گڈھی "عہد اسلامی میں کتب خانوں کا نظم و نسق"

۸ - مولوی امتیاز علی خانصاحب عرشی "ابن حزم ظاہری کی جمہرۃ النسب"

۹ - پروفیسر غلام جیلانی برق، ایم اے، ہوشیار پور "علامہ احمد ابن تیمیہ"

۱۰ - پروفیسر محفوظ الحق کلکتہ "فتوحات مکیہ کا ایک نایاب نسخہ"

۱۱ - پروفیسر ڈاکٹر اطہر علی دہلی "اکبر کی وفات"

۱۲ - مولنیا محمد ادریس صاحب ندوۃ المصنفین دہلی "آذر"

۱۳ - ڈاکٹر قریشی لاہور، اسلامی مدرسوں میں عربی کی تعلیم،

۱۴ - ڈاکٹر حسین ہمدانی بمبئی "لوائح المؤید فی الدین الشیرازی"

۱۵ - ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ ملتان "اسلام کے ازمنۂ وسطیٰ میں موازنۂ مذاہب"

۱۶ - آغا عبد الستار ایم اے لاہور "التمش کے زمانہ کا شاعر تاج رضا"

۱۷ - پروفیسر جمشید علی راٹھور، ایم اے، سیالکوٹ "خواجو بحیثیت غزل گو شاعر کے"

۱۸ - پروفیسر محمد اقبال لاہور "غزنوی عہد کی فارسی شاعری کے کچھ خصوصیات"

۱۹ - پروفیسر ڈاکٹر محمد حسین نینار مدراس "عربوں کا بلہرا"

۲۰ - آغا محمد اشرف ایم اے، ڈہرہ دون اسکول "ایران حاضر"

۲۱ - ڈاکٹر سر شاہ سلیمان "اضافیت جدید"

۲۲ - ڈاکٹر کوٹھاری، ایم اے پی ایچ ڈی، "سائنس میں مسلمانوں کا حصہ"

۲۳ - ڈاکٹر رام بہاری ایم اے پی ایچ ڈی "ریاضیات میں مسلمانوں کا حصہ"

۲۴- پروفیسر ڈاکٹر شجاع منعمی بہاولپور" کمال الدین ابوالحسن فارسی کے نظریہ کے مطابق عکس نور کا نظریہ"

۲۵- پروفیسر عبدالباسط ایم اے لاہور "اولیاء العرب"

۲۶- ڈاکٹر عبداللطیف، حیدرآباد، "خلافت کا ماضی اور مستقبل"

۲۷- ڈاکٹر زبید احمد الہ آباد، "ہندوستان کی تصانیف عربیہ متعلق علوم حدیث"

۲۸- پرنسپل محمد شفیع، "سرو کشمیر"

۲۹- پنڈت لکشمی دھار، "ہندی ادب میں تصوف اور مسلمان"

۳۰- مولوی عبدالخالق صاحب دہلی، مسائل نافع بن الازرق عن عبداللہ بن عباسؓ"

۳۱- ڈاکٹر نظام الدین حیدرآباد، "قدیم فارسی ادبیات کی چند خصوصیتیں"

۳۲- ڈاکٹر ہری رام شرما، ایم اے پی ایچ ڈی، لاہور "احمد شاہ ابدالی کا آٹھواں حملہ ہندوستان"

۳۳- سید سلیمان ندوی، "قنوج اور سندھ"

۳۴- شاہ معین الدین احمد ندوی رفیق دارالمصنفین، "عربی لغات کے عرب مدونین"

۳۵- ڈاکٹر مولوی عبداللہ چغتائی، "ابتدائی ہندی اسلامی تعمیرات"

۳۶- شمس العلماء مولینا عبدالرحمٰن دہلی "پروفیسر مارگولیتھ کے نظریہ عربی شاعری کی اصلیت و تاریخ پر تبصرہ"

۲۰ کی شام کو اردو مشاعرہ ترتیب پایا تھا،

علمی نمایش میں قلمی کتابوں خطاطی کے مختلف نمونوں، وصلیوں کتبوں، اور اسلامی سکوں کا اچھا خاصہ ذخیرہ تھا، جو حسب معمول پروفیسر شیرانی اور مولوی عبداللہ صاحب چغتائی کی محنتوں کا نتیجہ تھا،

اس اجلاس میں حسب ذیل ریزولیشن پاس ہوئے،

۱۔ ادارۂ معارف اسلامیہ گذشتہ اجلاس لاہور کی قرارداد کا اعادہ کرتا ہے، جس میں محکمۂ آثار قدیمہ کی توجہ عربی فارسی کتبات کے تحفظ اور اشاعت کی طرف منعطف کی گئی تھی، ادارہ کو افسوس ہے کہ ان امور کی طرف وہ توجہ اب تک مبذول نہیں کی گئی، جو ہونی چاہئے تھی،

۲۔ ادارۂ معارف اسلامیہ کی رائے میں یہ ضروری ہو کہ کم از کم شمالی ہند کی یونیورسٹیوں میں جہاں تک جلد ممکن ہو ثانوی مدارس اور انٹرمیڈیٹ کے درجوں میں اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا جائے،

۳۔ ادارۂ معارف اسلامیہ دہلی کے ارباب فضل سے توقع کرتا ہو کہ وہ متحدہ کوشش سے اس قدیم دار العلم کی شان کے مطابق معارف اسلامیہ سے متعلق مخطوطات کا ایک مرکزی کتبخانہ قائم کرنے کی سعی فرمائیں، ادارہ اینگلو عربک کالج دہلی کی مجلس منتظمہ اور اولڈ بوائز ایسوسی ایشن سے درخواست کرتا ہو، کہ وہ اس بارے میں ضروری اقدام کریں،

۴۔ ادارۂ معارف اسلامیہ ارباب علم کی خدمت میں قدیم عربی فارسی اور اردو کتب کی نشر و اشاعت کی طرف توجہ دینے کی درخواست کرتا ہے، ہمارے اسلاف کے یہ کارنامے ایک قیمتی ورثے کی حیثیت رکھتے ہیں، جسکی حفاظت ہمارا مقدس فرض ہو، جملہ مسلمان ایسی مطبوعہ کتابوں کی خریداری سے ان کی نشر و اشاعت میں مدد دیسکتے ہیں، اور طابعین اور ناشرین کو اشاعت کی مالی مشکلات سے نجات دے سکتے ہیں،

۵۔ ادارۂ معارف اسلامیہ کا یہ اجلاس پر زور الفاظ میں ذمہ دار مجالس منتظمہ کی خدمت میں درخواست کرتا ہو کہ عربک کالج دہلی میں عربی فارسی اور اردو کی تعلیم کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کیا جائے، جو اسکی سابقہ عظمت اور دہلی کی موجودہ ضروریات کے مطابق ہو،

۶۔ ادارۂ معارف اسلامیہ کا یہ اجلاس تجویز کرتا ہو کہ ادارہ کی ایک شاخ دہلی میں قائم کیجائے، تاکہ وہ ادارہ کے مقاصد کو کامیاب بنانے میں ادارہ کی مجلس عاملہ کی مدد کرے،

دنیا کی بربادی

طبعیات اور نجوم کے بعض ماہروں کا قیاس ہے کہ فطرت کے قوانین کے ذریعہ سے دنیا کی بربادی خود بخود ہو سکتی ہے، مثلاً یہ ممکن ہے کہ آفتاب گرنے والے ستاروں کی طرح بھڑک اُٹھے جس سے اس میں اتنی حدت اور روشنی بڑھ جائے کہ زمین اور اس پر بسنے والے سب جل کر راکھ ہو جائیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چاند زمین کے گرد چکر کرتے ہوئے اس سے اتنا نزدیک آجائے کہ سمندر میں ہلاکت خیز تلاطم برپا ہونے لگے، اور چاند ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین پر گر جائے، ایک پرانا خیال یہ تھا کہ آفتاب دہکتے ہوئے کوئلہ کی طرح آخر میں اتنا سرد ہو جائے گا، کہ زمین پر مخلوقات کی زندگی ناممکن ہو جائیگی، لیکن واشنگٹن یونیورسٹی کے ایک ماہر طبعیات کی تحقیق یہ ہے، کہ آفتاب سرد ہونے سے پہلے بہت زیادہ گرم ہو جائے گا، اسی سلسلہ میں آج کل سائنس والوں میں ایک نیا نظریہ مقبول ہو رہا ہے، وہ یہ آفتاب کی شعاعوں کے ہائڈروجن وزنی اجزا خصوصاً ہیلیم میں منتقل ہو جاتے ہیں، آئنسٹائن کے نظریہ کے مطابق یہ منفصل شدہ اجزا کے ذرات کا کچھ حصہ قوت میں تبدیل ہو جاتا ہی، اس طرح آفتاب کا ہائڈروجن اس سے برابر خالی ہوتا جا رہا ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حساب لگایا گیا ہے، کہ ہائڈروجن کے نکلنے سے دوسرا ہائڈروجن بڑی تیزی سے اور زیادہ مقدار میں بن جاتا ہی جس سے آفتاب نسبتہً زیادہ گرم اور روشن ہو جاتا ہی، مثلاً آفتاب سے ہائڈروجن ایک فی صدی نکل جائے گا، تو آفتاب سے گنا

زیادہ روشن ہوجائے گا، آخر میں آفتاب میں اتنی گرمی اور روشنی پیدا ہوجائیگی، کہ اسکی ساری چیزیں جل کر راکھ ہوجائیں گی، لیکن ماہرین طبعیات کا خیال ہے، کہ اس مدت کو آتے آتے کئی کھرب سال لگیں گے،

طبعیات کا نوبل انعام

۱۹۳۸ئہ میں طبعیات میں نوبل پرائز روم یونیورسٹی کے پروفیسر انریکو فرمی کو ملا ہے، پروفیسر موصوف کا سن ابھی صرف ۳۷ سال کا ہے، ذرات میں سب سے وزنی ذرہ یورینیم سمجھا جاتا تھا، یہ ایک سفید دھات کی قسم کا عنصر ہے، جو رال وغیرہ میں پایا جاتا ہے، پروفیسر مذکور کی تحقیقات نے یہ ظاہر کیا ہے، کہ یورینیم سے بھی زیادہ وزنی ذرہ موجود ہے، اس اکتشاف کے لئے اس نے یورینیم کے اندر نیوٹرون کو داخل کیا، جس سے ایک ایسا عنصر پیدا ہوا جو ذرہ میں رہا، لیکن یورینیم سے زیادہ وزنی تھا، ڈاکٹر فرمی نے اس قسم کے کئی اور ذرے دریافت کئے ہیں،

ایک نئی مشین کی ایجاد

کلیفورنیا کے ایک انجنیر نے سمندر کی تہ سے دھات اور دوسری چیزوں کو باہر نکالنے کیلئے ایک عجیب و غریب مشین ایجاد کی ہے، انجنیر مذکور کو سمندر کو مختلف قسموں کے دھاتوں کا خزانہ بلکہ زندگی کی ماں سمجھتا ہے، گذشتہ جنگ عظیم میں اس نے اپنی انجنیرنگ کے سلسلہ میں مختلف محاذوں پر کام کئے تھے، جنگ کے دوران میں بحر منجمد میں انفلوئنزا کی وبا پھیل گئی، اس کو فکر ہوئی، کہ آخر یہ انفلوئنزا سمندر میں کیوں پھیلا، تحقیق کے لئے وہ سمندر کے پانی کے نمونے جمع کرنے لگا، اسکی تہ سے پانی نکالنے کیلئے اس نے ایک ایسا ڈول بنانا چاہا جس کا منہ سمندر کی گہرائی میں جاکر مضبوطی سے بند ہوجائے، اس ایجاد میں اسکی دلچسپی اتنی بڑھی، کہ وہ انفلوئنزا کی تحقیق کو تو فراموش کرگیا، اور

مسلسل بیس برس تک اس ڈول کی ایجاد میں لگا رہا، ابھی کچھ روز ہوئے کہ اس نے اپنی کامیابی کا اعلان کیا ہے، اسکی ایجاد کی ہوئی مشین سمندر میں ایک ہزار فیٹ تک اندر جاتی ہے، جہاں اس میں نیچے کی چیزیں کثرت سے بھر جاتی ہیں، اور پھر مشین کا منہ اس طرح بھر جاتا ہے، کہ ساری چیزیں نیچے سے اوپر محفوظ چلی آتی ہیں، انجینیر مذکور کا خیال ہے، کہ اس مشین کے ذریعہ سے سمندر کی تہ سے سونا آسانی سے دستیاب ہوسکیگا، الاسکا کے ساحل کے پاس سمندر میں سونے کی کانیں دریافت ہوئی ہیں، وہاں یہ مشین مفید ثابت ہوگی، نہ صرف تجارتی اغراض بلکہ سائنٹفک تحقیقات کیلئے بھی یہ بہت ہی کارآمد ہے،

ممالک متحدہ امریکہ کے گریجویٹ کی پریشانی (۱)

ممالک متحدہ امریکہ کے گریجویٹ عام کساد بازاری کے شاکی ہیں، چنانچہ وہاں کے باشندوں کی دلچسپی اعلیٰ تعلیم سے کم ہورہی ہے، وہاں کی یونیورسٹیوں کے چند استادوں نے مل کر ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۶ء تک کے اعداد وشمار پر غور وفکر کیا تو اس نتیجہ پر پہونچے، کہ اعلیٰ تعلیم اقتصادی کساد بازاری کو دور کرنے میں معاون اور نہ ملازمت دلانیکی ضامن ہوسکتی ہے، انکی تحقیقات ہے کہ ۱۹۲۹ء سے پہلے ۹۰ فی صدی گریجویٹ برسر روزگار ہوجاتے تھے، ۱۹۳۲ء میں صرف ۶۵ فی صدی مرد گریجویٹ اور ۲۵ فی صدی عورتوں کو ملازمت ملی، انجینیروں وکیلوں اور استادوں کو تلاش روزگار میں بڑی دقتیں ہوئیں، ان میں سے جن کو نوکریاں ملیں ایک بڑی تعداد نے مجبوراً دوسرا پیشہ اختیار کیا، جس کے لئے انھوں نے تعلیم نہیں حاصل کی تھی، اور ایک گریجویٹ کو جو تنخواہ عموماً ملتی تھی، اس سے بہت کم ملنے لگی، ۱۹۲۸ء میں ان کو ۱۹۰۰ ڈالر سالانہ ملتے تھے، لیکن ۱۹۳۲ء میں ۱۲۰۰ ڈالر، اور عورتوں کو اس سے بہت کم ملے ۱۹۳۶ء میں ایک گریجویٹ کو روزگار ملنے میں دقت باقی نہیں رہی، لیکن ان کی تنخواہیں صرف ۱۳۵۰ ڈالر تک رہیں جو ۱۹۲۸ء سے نسبتہً کم تھیں، ان استادوں کا خیال ہے، کہ پھر بھی اگر جنگ یا غیر معمولی کساد بازاری

شروع نہیں ہوئی، تو ایک گریجویٹ اپنی تعلیم ختم کرنے کے آٹھ سال کے بعد ۲۰۰۰ سے ۳۰۰۰ ڈالر تک ضرور حاصل کرسکتا ہے، (ایک ڈالر قریب قریب تین روپئے کے برابر ہوتا ہے)

ایک نفسیاتی تجزیہ

مچگن کا ایک شہری نو بچوں کا باپ تھا، لیکن وہ اپنی بیوی اور بچوں کی طرف کبھی مائل نہ ہوا، بلکہ وہ ہمیشہ ان کے ساتھ جھڑکی سختی اور غصہ سے پیش آتا تھا، اس کے چھوٹے بچے کو مچگن کے حاکموں نے باپ سے لیکر لڑکوں کی ایک پرورش گاہ میں داخل کردیا، وہ کچھ بڑا ہوا تو ایک متمول بیوہ کے گھر میں رہنے لگا، تعلیم کیلئے اس کا نام ایک اسکول میں لکھوا دیا گیا، جہاں وہ پڑھنے لکھنے میں نمایاں رہا لیکن اسکے عادات و اطوار پسندیدہ نہ تھے، متمول بیوہ اسکول کی صدر تھی، اسلئے وہ اسکول کے استادوں سے ہر قسم کی مراعات کا خواہاں رہتا تھا، ایک روز وہ اپنے درجہ میں سو رہا تھا، کہ استاد نے تمام لڑکوں کے سامنے اس کی سرزنش کی، اور اسکول سے نکال دیا، وہ فوراً گھر آیا، اور اپنی ماں کا پستول لے کر اسکول واپس گیا، جہاں استاد کے کمرہ میں گھس کر متواتر گولیاں چلائیں، وہ پکڑ لیا گیا، مگر جیل میں نہیں بھیجا گیا، بلکہ اس کو مچگن یونیورسٹی کے ماہرین نفسیات نے اپنے ادارہ میں چار ہفتے تک رکھا، اور اس کے ذہن و دماغ کا نفسیاتی تجزیہ کیا، آخر میں وہ اس نتیجہ پر پہنچے، کہ اس کی تند اور تشدد پسند طبیعت والدین کی الفت و محبت سے محرومی اور گھر میں ضبط و نظم نہ پائے جانے کا نتیجہ ہے، "ص ع"

ادبیات

آہ مولانا شوکت علی

از یحییٰ اعظمی

اُف غمِ روزگار کی باتیں | دھرنا پائدار کی باتیں
جو رہے ایک دم قرار نہیں | آہ لیل و نہار کی باتیں
اس خزاں آشنا زمانہ میں | کیا سنائیں بہار کی باتیں
دل جو پہلو میں ہو تو اب سنئے | دیدۂ اشک بار کی باتیں
ہو گیا آہ آج وہ رخصت | یاد ہیں جس کی پیار کی باتیں
کس کو اب بیقرار کر دینگی | ملتِ دل فگار کی باتیں
کون ہے جو سنے گا اب یا زٓ | اُمتِ سوگوار کی باتیں
قوم کو کون اب سکھائے گا | ہمتِ اُستوار کی باتیں
برق سے بڑھکے کام کرتی تھیں | شوکتِ نامدار کی باتیں
وہ زباں کیا تھی تیغ جوہر دار | جس میں تھیں ذوالفقار کی باتیں
تیغ ابرو کے ہر اشارے میں | خنجر آبدار کی باتیں
تھیں سراپا پیام جوشِ جہاد | اس مجاہد شعار کی باتیں
تا ابد اشک خوں رُلائیں گی | آہ شوکت کی پیار کی باتیں

کانپ اٹھتا تھا لشکرِ باطل آہ کو وہ وقار کی باتیں،

اب کہاں آہ شوکتِ ملت

آئینہ دارِ عظمتِ ملت

اب کہاں وہ وفا شعار افسوس خادمِ کعبہ صد ہزار افسوس

ہند سے لیکے تا بہ خاکِ حجاز غم میں کسکے ہے سوگوار افسوس

اٹھ گیا وہ مجاھد اعظم تھا جو اسلام پر نثار افسوس

اس بہادر سے ہو گئی خالی صفِ میدانِ کارزار افسوس

چل دیا چھوڑ کر غلاموں کو ملکِ ہمت کا تاجدار افسوس

آج خود شیر بیشۂ اسلام ہو گیا موت کا شکار افسوس

وہ زعیمِ فخیم اب نہ رہا جس سے تھا قوم کا وقار افسوس

دشمنوں سے مقابلہ کے لئے تھا وہ اک سدِ استوار افسوس

سرفروشانِ ملک و ملت کا مایۂ ناز و افتخار افسوس

مٹ گئی ہائے بزمِ دنیا سے آج جوہر کی یادگار افسوس

گلشنِ آرزوے ملت کی، خاک میں مل گئی بہار افسوس

شدتِ غم سے کیوں نہ ہو جائے دامنِ صبر تار تار افسوس

صدمۂ ابتلاے پیہم سے دلِ ملت ہے داغدار افسوس

ہیں ہرے آج زخمہاے جگر

آہ تازہ ہوا غمِ جوہر

اٹھ گیا وہ مجاہدِ اسلام حق ہے گر وقفِ غم ہیں مصر و شام

وہ مجاہد کہ زندگی جس کی، تھی سراپا جہاد کا پیغام
وہ اولوالعزم قائدِ ملت، جس سے تھی تازہ شوکتِ اسلام
وہ بہادر کہ ہر ادا جس کی، جرأت آموزِ صد دلِ ناکام
وہ وطن دوست جس نے پہنچایا گوشہ گوشہ میں حریت کا پیام
تھا وہی زیبِ مسندِ اسلاف تھا وہی آج جانشینِ عظام
اجمل و جوہر و تصدق کا اس کی ہستی پہ ہوگیا اتمام
آہ ہوتے ہیں اب کہاں پیدا ایسے عالی ہمم زعیمِ ہمام
عہدِ حاضر کے سرفروشوں میں اس مجاہد کا تھا بلند مقام
تھا وہ ملت کا قائد محبوب تھے فدا اس پہ سب خواص و عوام
روز و شب جد و جہد بے پایاں تھا یہی اس کی زندگی کا نظام
مرتے دم تک شکست دے نہ سکی اس کی ہمت کو گردشِ ایام
رشک ہے اس کی موت پر سب کو مرکے پائی ہے وہ حیاتِ دوام
رو لے جی بھر کے آج اے ملت کہ ہے یہ آب و داع کا ہنگام
اب وہ پیکر نظر نہ آئے گا، یونہی ہوتی رہیں گی صبح اور شام
تھکنے والے تجھے مبارک ہو، ابدی خواب گاہ کا آرام
تیری روحِ عظیم پر صدقے نعمتِ باغِ خلد کا انعام
ہو قبول اے مسافرِ جنت ہم غلاموں کا بھی درود و سلام

آج مختار و جوہر و اقبال
سبھی حاضر ہیں بہر استقبال

باب التقریظ والانتقاد

نئے رسالے

ریویو آف ریلیجنز مرتبہ جناب علی محمد صاحب اجمیری تقطیع اوسط ضخامت ۴۸ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت سالانہ ہے ر طلبہ اور غیر احمدی اشخاص سے عہ ر پتہ :۔

قادیان پنجاب،

ریویو آف ریلیجنز قادیانیوں کا بہت پرانا رسالہ ہے، ہمارے پاس حال میں ریویو کے لئے آیا ہے، اس کے چند پرچے ہماری نظر سے گذرے، قادیانی اخبارات ورسائل کی خصوصیات اور ان کے مباحث معلوم ومشہور ہیں، یہی رنگ اس رسالہ کا ہے، یہ قادیانی جماعت کا تبلیغی رسالہ ہی، عموماً اسی قسم کی بحثیں ہوتی ہیں، لاہوری جماعت پر تنقید کا فرض بھی ادا کرتا ہے، بعض نمبروں میں کوئی خالص مذہبی مضمون بھی نظر آتا ہے، کبھی کبھی اسلام سے متعلق غیر مسلموں کے اعتراضات اور ان کی غلط بیانیوں کی تردید وتنقید کے مضمون بھی اس میں ہوتے ہیں،

صور اسرافیل، مرتبہ جناب یلدرم صاحب یلدرم، تقطیع اوسط ضخامت ۴۸ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت سالانہ :۔ ۳ ہے ر، فی پرچہ ۵ ر، پتہ دفتر صور اسرافیل" نیلنگ روڈ، لاہور،

یہ رسالہ لاہور سے نکلتا ہے، اس وقت تک اس کے کئی نمبر نکل چکے ہیں، علمی ادبی تاریخی

ق کے مفید مضامین پیش کرتا ہے، ادب کیساتھ ملت کا بھی خدمت گذار ہے، عام معلومات کیلئے
رسالہ ہے، لیکن اڈیٹر صاحب کی طرز انشا، کا دور مدت ہوئی کہ ختم ہوچکا "صور اسرافیل" کی مناسبت
ریر میں قائم رکھنا ضروری نہیں ہے، اب تو زبان کو زیادہ سے زیادہ صاف سادہ اور آسان
نے کی ضرورت ہے،

صہبا، مرتبہ جناب محمود قاسم صاحب میکش تقطیع اوسط، ضخامت ۲ ، صفحے، کاغذ کتابت
وطباعت بہتر، قیمت سالانہ ہے، ششماہی عا، پتہ:- دفتر صہبا نمبر ۲ بی امرتلہ لین کلکتہ،
یہ ادبی رسالہ کلکتہ سے نکلتا ہے، بیشتر حصہ افسانوں کا ہوتا ہے لیکن افسانوں کا معیار بلند
ہوا ہے، کوئی نمبر متعدد دلچسپ افسانوں سے خالی نہیں ہوتا، متعلقات ادب میں زبان کے متعلق
اور اچھی بحثیں ہوتی ہیں معلومات کے اعتبار سے بھی کبھی کبھی کوئی سنجیدہ مضمون نظر آجاتا ہے، ادبیات
حصہ بھی خاصہ ہے، ادبی لحاظ سے صہبا اچھے رسالوں میں شمار ہونے کے لائق ہے، کلکتہ جیسے
م پر ایسے رسالہ کو زندہ رکھنے کی ضرورت ہے،

ہندستانی، مرتبہ جناب سہیل عظیم آبادی تقطیع اوسط ضخامت ۴۸ صفحے، کاغذ کتابت و
طباعت بہتر، قیمت :- سالانہ سے، فی پرچہ ۴ر، پتہ:- ہندوستانی پریس بانکی پور پٹنہ،
یہ رسالہ بہار کے نوجوان فسانہ نگار جناب سہیل عظیم آبادی کی ادارت میں نکلتا ہے، رسالہ ادبی
لیکن سیاست پر بھی اظہار خیال ہوتا ہے، بیشتر حصہ ادب و افسانوں کا ہوتا ہے کسی کسی نمبر میں کوئی
سپ اور سنجیدہ مضمون بھی نظر آجاتا ہے، خالدہ ادیب خانم کا مضمون "امتحان کی کٹھن گھڑیاں" دلچسپ ہے اس
لہ کا مقصد جیسا کہ اس کے نام اور زبان سے ظاہر ہوتا ہے، ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ ہندستانی
ن کی اشاعت ہے، اسی لئے رسالہ کے لئے زبان آسان اختیار کیگئی ہے، نامانوس لفظوں اور ترکیبوں
پرہیز کیا جاتا ہے، جہاں کوئی ایسا صاف لفظ نہیں ملتا، وہاں اردو اور ہندی دونوں کے ہم معنی

لفظ لکھ دئے جاتے ہیں لیکن کہیں کہیں اس میں بے اعتدالی بھی پائی جاتی ہے، جیسے سرمایہ داری کے لئے "پونجی شاہی"، تحریک کے لئے "آندولن"، سیاسی کے لئے "راج نیتک" اخلاق کے لئے "نیتکتا"، تنظیم کے لئے "سنگٹھن" مستقبل کے لئے "بھوشیہ"، تجویز کے لئے "پرستاؤ" وغیرہ بالکل اسی کے مقابل کہیں کہیں پر بے تکلف ہلکی تشریح کے عربی اور فارسی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، اعتدال اور سلامت روی ہر چیز کے لئے پہلی شرط ہے،

دلگداز، مرتبہ جناب نشتر جالندھری، تقطیع اوسط ضخامت ۰ ۸ صفحے، کاغذ بہتر، کتابت طباعت معمولی، قیمت سالانہ :- ہیر، علاوہ محصول ڈاک، فی پرچہ ۳ر، پتہ :- کشمیری بازار لاہور،

یہ رسالہ عرصہ سے جناب نشتر جالندھری کی ادارت میں نکلتا ہے، اب انھوں نے اس کو نئے اہتمام سے نکالا ہے، عالمِ نسواں اور بچوں کی دنیا کے تحت میں عورتوں اور بچوں کے مذاق کے مضامین کے مستقل ابواب ہیں، یہ نیا دور پہلے دور سے بہتر ہے، لیکن ابھی اس کو عام ادبی رسائل کی سطح پر لانے کی مزید کوشش کی ضرورت ہے، ادبی مضامین تو خیر غنیمت ہوتے ہیں لیکن علمی مضامین کا معیار مزید توجہ کا محتاج ہے،

حرم، مرتبہ جناب سید عاشق علی صاحب بجنوری، تقطیع بڑی ضخامت ۴۸ صفحے، کاغذ اچھا، کتابت وطباعت معمولی، قیمت سالانہ :- عار، فی پرچہ ۲ر، پتہ :- دفتر حرم، کوچہ پنڈت دہلی،

یہ رسالہ حال ہی میں دہلی سے نکلا ہے، ہم نے اس کے چند نمبر دیکھے، ہر نمبر میں مفید و سنجیدہ علمی ادبی، تاریخی اور مذہبی مضامین نظر آئے، عام رسائل کو دیکھتے ہوئے مضامین کا معیار بھی خاصہ ہے، "مشاہیر اسلام کے سوانح کا سلسلہ" "نئی دنیا عربوں نے دریافت

ں"، "عدن پر انگریزوں کے قبضہ کی داستان"، "نپولین کی بہاوج" مفید مضامین ہیں افسانے
بھی دلچسپ ہیں،

جدید اردو، مرتبہ جناب احمد حسن صاحب اشک تقطیع بڑی ضخامت ۴۰ صفحے، کاغذ کتابت
وطباعت نہایت معمولی، قیمت عہ، فی پرچہ ۳ر، پتہ نمبر ۲۳ مارسڈن اسٹریٹ کلکتہ،

یہ ادبی رسالہ تقریباً ایک سال سے کلکتہ سے نکلتا ہے، ابھی یہ کلکتہ کے اچھے ادبی رسائل سے
بہت پیچھے ہے، مضامین معمولی ہوتے ہیں، لیکن امید ہو کہ وہ اپنی خامیوں کی اصلاح کرکے اپنے
معاصرین کے برابر ہو جائے گا، ایسے رسائل کو چاہئے، کہ وہ اپنے مضامین کو ادبیات اور عام معلومات
تک محدود رکھا کریں، یہ رسالہ اس حیثیت سے قدر افزائی کا مستحق ہے، کہ وہ بنگال میں اپنی بساط کے
مطابق اردو کی خدمت انجام دیتا ہے،

ہدایت، (ہفتہ وار) مرتبہ جناب عبداللہ صاحب قریشی، تقطیع اوسط، ضخامت ۱۶ صفحے،
کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت سالانہ ۱-صر، ششماہی :- ۱۲ر، فی پرچہ ۱ر، پتہ:-
دفتر رسالہ ہدایت لاہور،

جناب عبداللہ قریشی نے بچوں کے لئے یہ رسالہ نکالا ہے، اس میں ان کی اخلاقی تربیت،
تعلیمی ضروریات اور دلچسپی ہر چیز کا لحاظ رکھا گیا ہے، ان کی اخلاقی تربیت کے لئے اخلاقی اور سبق آموز
باتیں، معلومات کے لئے تاریخی واقعات اور حالات، دلچسپی کے لئے دلچسپ قصے، حکایتیں اور لطائف
دلچسپ پیرایے میں ہوتے ہیں، یہ رسالہ بچوں کے لئے دلچسپ بھی ہے اور مفید بھی،

"م"

مطبوعاتِ جدیدہ

تفسیر جواہر جزء اول، مترجمہ مولینا عبید الرحمن صاحب رحمانی استاذ جامعۂ عربیہ دار السلام عمر آباد، تقطیع اوسط، ضخامت ۴۲۹ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت سے، علاوہ محصول ڈاک، پتہ :- سکریٹری عمر لائبریری، عمر آباد متصل آمبور شمالی آرکاٹ مدراس،

زمانہ کے تغیر کے ساتھ ہر دور کا مذاق، اور اس کی ضروریات بھی بدلتی رہتی ہیں، اس لئے ہر دور کی تفسیروں کا رنگ جدا ہے، اب پھر زمانہ کا مذاق بدلا ہے، یہ فلسفہ وحکمت، صنعت و حرفت، تجارت وسیاست کا دور ہے، اس لئے ان چیزوں کی روشنی میں تفسیر قرآن کی ضرورت تھی، یہ دور مفتی محمد عبدہ کے زمانہ سے شروع ہوا، اس دور کے مذاق، رجحان اور ضروریات کی ترجمانی مصر کے مشہور عالم شیخ طنطاوی جوہری کی "تفسیر جواہر" ہے، اس میں جدید علوم اور قوموں کے عروج وزوال کے فلسفہ کی روشنی میں اس طرح کلام اللہ کی تفسیر کی گئی ہے کہ وہ عقلی اور علمی حیثیت سے جدید مذاق کے لئے قابل قبول ہو، کلام اللہ کی تعلیمات، اور اس کے اسرار و حکم دل کے ساتھ دماغ کو بھی اپیل کر سکیں، کلام اللہ کے پیش کردہ عجائبات فطرت جدید علوم کی تحقیقات پر پورے اتریں، مسلمانوں میں اپنے تنزل کا احساس، جدید علوم وفنون کی تحصیل اور دنیاوی عروج وترقی کا ولولہ پیدا ہو، اس تفسیر میں جدید رجحانات کے تمام پہلوؤں کا پورا لحاظ

رکھا گیا ہے، اس کے ساتھ کہیں سے صحیح اسلامی عقائد کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پایا ہے، مولینا عبد الرحمٰن صاحب شکریہ کے مستحق ہیں، کہ انھوں نے اس مفید تفسیر کو اردو کا جامہ پہنایا، ترجمہ صاف اور سلیس ہے، پہلی جلد میں سورۂ بقر کی تفسیر ہے، یہ تفسیر اس لائق ہے، کہ جدید تعلیم یافتہ خصوصیت کے ساتھ اس کا مطالعہ کریں،

مرقع سخن جلد دوم شائع کردہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد، تقطیع بڑی ضخامت ۴۳۱ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مرقوم نہیں، پتہ:- ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد دکن،

آج سے تقریباً ڈیڑھ دو سال پہلے ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد "مرقع سخن" کے نام سے دکن کے آصفی دور کے پچیس نامور شعرار کا تذکرہ شائع کر چکا ہے، مذکورۂ بالا تذکرہ اس کا دوسرا حصہ ہے، اسکی خصوصیات اور دوروں کی ترتیب وہی ہے، جو پہلے حصہ کی تھی یعنی ۱۱۵۰ھ سے لیکر ۱۳۵۵ھ تک پانچ دور قائم کئے گئے ہیں، اس حصہ میں چھٹا دور نوجوان شعرار کا بنا ہے، پہلے حصہ میں پچیس شعرار کا تذکرہ تھا، اس میں پچاس کا ہے، ہر دور کے آغاز میں ایک تمہید ہے جس میں اس عہد کے دکن کے قدردان سخن امرار کے نام اس دور کی شاعری کی مختصر خصوصیات، دکن کے دوسرے شعرار کی فہرست، باہر سے دکن آنے والے شعرا، اور شمالی ہند کے مشہور شعرار کے نام ہیں، پھر اس دور کے دکن کے نامور شعرار کے حالات، ان کے کلام پر مختصر تبصرہ، اس کا نمونہ اور ان کی تصانیف کا تعارف ہے، ہر شاعر کے حالات جامعہ عثمانیہ کے مختلف صاحب قلم اساتذہ اور طلبہ نے کاوش سے لکھے ہیں، جہاں تک ہو سکا ہے، صاحب تذکرہ شعرار اور قدردان سخن امرار کی تصویریں بھی دیدی گئی ہیں، اب بھی دکن کے بہت سے شعرار کے تذکرہ کی ضرورت باقی ہے، لیکن فی الجملہ ان دونوں حصوں میں دکن کی اردو شاعری کی تاریخ بڑی حد تک آگئی ہے،

شہزادہ زرتاش، از جناب سید حمید علی صاحب، تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ صفحے،

کاغذ کتابت و طباعت بہتر مجلد قیمت عہ، پتہ :- دار الاشاعت پنجاب لاہور،

عہد جدید کے بہت سے وہ اکتشافات جنھیں لاعلمی کی وجہ سے اس دور کا کارنامہ سمجھا جاتا ہے، آج سے صدیون پہلے ہو چکے تھے، اس میں ایک شاہزادہ زرتاش کی داستان ہے، اس میں ملیریا کی ہلاکت آفرینی اس کے پھیلنے کے اسباب اس سے بچنے کے طریقوں، اور اس کے علاج کو داستان کی شکل میں بیان کیا گیا ہے، یہ داستان مؤلف کو انڈیا آفس لائبریری میں مشرقی قصص و حکایات کی کتابوں میں ملی تھی، جسے انھوں نے اپنی زبان میں دلچسپ افسانہ کی شکل میں پیش کیا ہے، اگرچہ یہ خشک موضوع ہے، لیکن مشرقی داستانوں کی تخیل آرائی اور مؤلف کے حسن مذاق دونوں نے مل کر اس خشک موضوع کو ایسا دلچسپ بنا دیا ہے، اور اس میں قدیم مشرقی افسانون کی تمام خصوصیات اتنی مکمل موجود ہیں، کہ کہیں سے اس کی افسانویت میں فرق نہیں آیا ہے، لیکن آخر میں جا کر اصل مقصود کا پتہ چلتا ہے، اگر سید حمید صاحب نے اس داستان کے اصل مؤلف اور اس کے زمانہ کا تعین کر دیا ہوتا، تو اس کتاب کی قدر و قیمت اور بڑھ جاتی، بہرحال یہ داستان افسانہ کی حیثیت سے کامیاب اور حفظان صحت کے لحاظ سے مفید کتاب ہے،

نقد سخن از نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ، پتہ :- ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد دکن،

حیدر آباد کے نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز داغ کے تلامذہ میں ہیں، انھوں نے غالباً حیدر آباد کے کسی رسالہ میں باقیات فانی پر تنقید لکھی تھی، جسے ادارہ ادبیات اردو نے نقد سخن کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے، ہم نے اُسے بغور دیکھا، نواب صاحب کی سخن سنجی میں

کوئی شبہہ نہیں، لیکن اس تنقید میں ان کا قلم جادۂ اعتدال سے بہت ہٹ گیا ہے، موجودہ دور کے بعض ممتاز شعراء کے کلام کا یہ مشترک نقص ہے، کہ وہ خیالات کی رو میں زبان کی صحت وسلاست اور طرزِادا کے سلجھاؤ کا لحاظ نہیں رکھتے، اس سے بعض اوقات معنی میں بھی سقم پیدا ہو جاتا ہے، اور عیب چین نگاہوں کو اعتراض کا موقع مل جاتا ہے، فانی کا کلام بھی اس عیب سے خالی نہیں ہے، نقدِ سخن کے اکثر اعتراضات اسی قبیل کے ہیں، بعض میں محض خوردہ گیری کی گئی ہے، بعض اشعار کا مطلب غلط لیکر اعتراض کیا گیا ہے، بعض اعتراضات صحیح بھی ہیں لیکن ان کی تعداد کم ہے، غرض یہ تنقید خود ایک تنقید کی محتاج ہے جس کی اس مختصر ریویو میں گنجایش نہیں، ورنہ اس اجمال کی تفصیل بیان کیجاتی، لیکن تنقید ایک سخن سنج اور صاحب نظر کے قلم سے نکلی ہوئی ہے، اس لئے اس میں زبان اور شاعری سے متعلق بہت سے ادبی نکات آگئے ہیں، جن کا مطالعہ نومشق شعراء میں ادبی بصیرت پیدا کرے گا،

عدلِ جہانگیری، مصنفہ پروفیسر عبدالقوی صاحب فانی، ایم اے، تقطیع کلاں بڑی، ضخامت ۶۳ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت عہ علاوہ محصولڈاک بہت زیادہ ہے، پتہ:۔ دفتر البیان محمود نگر لکھنؤ،

ہندوستان سے فارسی شاعری بلکہ فارسی ادب کا ذوق روز بروز مٹتا جاتا ہے، خال خال اس سے ذوق رکھنے والے نظر آتے ہیں، اس میں ایک پروفیسر عبدالقوی صاحب فانی لکچرار لکھنؤ یونیورسٹی ہیں ان کی متعدد نظمیں فارسی میں شائع ہو چکی ہیں، مثنوی عدل جہانگیری میں انھوں نے عہد جہانگیری کے اس مشہور عام واقعہ کو نظم کیا ہے، کہ ایک مسلمان کوتوال سعد اللہ خان نے ایک ہندو کی حسین وجمیل بیوی پر زبردستی قبضہ کرنا چاہا تھا، اس کی ضعیفہ ساس کی فریاد پر جہانگیر خود اس کے گھر گیا، اور کوتوال کو گرفتار اور قتل کر کے ضعیفہ کو عطوفتِ شاہانہ سے نوازا، اس مثنوی میں قند پارسی

کا پورا لطف ہے، لیکن نظم کی زبان کے مقابلہ میں دیباچہ کی نثر مخمل میں ٹاٹ کا پیوند معلوم ہوتی ہے، اس کا نہ ہونا ہی بہتر تھا،

رشحات القرآن، مرتبہ مولوی ذکاء اللہ خاں صاحب ایم اے ریٹائرڈ کلکٹر، نائب دیوان ریاست دتیا، پتہ: لطیفی پریس، دہلی دروازہ، دہلی،

اس رسالہ میں مرتب نے کلام اللہ سے دلائل توحید، رحمت باری، اثبات رسالت، اتباع رسول، اور اعجاز القرآن وغیرہ، سترہ مضامین کی آیات منتخب کرکے ترتیب کے ساتھ مع ترجمہ جمع کر دی ہیں، کہیں کہیں اپنے ذوق سے ان آیات سے مستنبط فوائد بھی لکھ دیئے ہیں، کتاب مفید ہے،

یارِ غار، مؤلفہ جناب محمد ظفر صاحب ایم ایل ایل بی تقطیع جیبی ضخامت ۱۲۸ صفحے کاغذ کتابت و طباعت نہایت معمولی، ۱/ ٹکٹ بھیجکر انجمن رفیق الاسلام گوڑ گاوان پنجاب سے منگایا جاسکتا ہے،

انجمن رفیق الاسلام گوڑ گاوان مسلمان بچوں کی اخلاقی اور مذہبی تعلیم و تربیت کے لئے اکابر اسلام کے مختصر سوانح اور چھوٹے چھوٹے مذہبی رسالے شائع کرکے مفت تقسیم کرتی ہے، یہ مختصر رسالہ بھی اسی کی ایک کڑی ہے، اس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مختصر حالات ہیں، اس رسالہ کی ظاہری شکل بہت خراب ہے لیکن اس شکل میں بھی مفت تقسیم کرنا بڑی ہمت کا کام ہے،

سعیِ ناکام، مترجمہ امت الرفیق صاحبہ، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۰۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸/ پتہ دار الترجمہ متصل سنہری ہوشیارپور پنجاب،

ڈنمارک کے مشہور افسانہ نگار ہینز اینڈرسن کے آٹھ افسانوں کا ترجمہ ہے، اس کے افسانوں میں تخیل کی دلکشی کی وجہ سے کہانیوں کا لطف آتا ہے اسلئے بچوں کیلئے خصوصیت کیساتھ زیادہ دلچسپ ہیں ان افسانوں کا حسنِ انتخاب اور ان کا کامیاب ترجمہ ہونہار مترجمہ کیلئے فال نیک ہے، "م"

رجسٹرڈ نمبر ل ۱۸۱

فروری ۱۹۳۹ء

معارف

دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مُرتّبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت سالانہ پانچ روپیہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

جلد ۴۳ | ماہ ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۳۹ء | عدد

مضامین

دارالمصنفین نے اپنا جھونپڑا ایسی جگہ ڈالا ہے جہاں تک وہی پہنچ سکتے ہیں جو اخلاص میں پورے ہیں، شرک کا یہاں موقع نہیں، اور نہ "بیک کرشمہ دو کار" کا اصول کارگر، وہ سیدھی ریلوے لائن سے پرے، آباد اور پررونق شہروں سے دور کھیل تماشوں سے خالی، تاریخی دلچسپیوں سے محروم، اور شہری ہنگاموں اور غل شور سے دور ہے، پھر بھی اگر کوئی یہاں پہنچ جاتا ہے تو خلوص کے سوا کوئی اور اس کا رہبر نہیں، یہ دلی، لکھنؤ، لاہور، اور کلکتہ نہیں جہاں "بزم اغیار میں گاہے سر راہے گاہے" ملاقات کا اتفاق ہو جائے، پھر بھی ایسے مخلصوں سے کوئی مہینہ خالی نہیں جاتا،

کچھ دن ہوئے کہ روس کے مشہور مصلح عالم موسیٰ جاراللہ یہاں تشریف لائے تھے، میں نہ تھا، میری ان کی ملاقات ۱۹۲۶ء میں مکہ معظمہ میں ہوئی تھی، اس کے بعد وہ کئی دفعہ ہندوستان آچکے، مگر ملنے کی نوبت نہیں آئی، اس کا سبب بھی وہی اعظم گڈھ کا سیدھی ریلوے لائن سے دور ہونا ہے، بہرحال انھوں نے خود زحمت اٹھائی، اور تشریف فرما ہوئے، ہمارے رفقاء نے ان کی ملاقات اور صحبت سے فیض اٹھایا،

اس مہینہ ہمارے کابل کے دوست سردار خان گویا نے اپنی ملاقات کی مسرت بخشی، یہ کابل کے مشہور سردار عبدالقدوس خاں کے نواسہ ہیں اور خود بھی ممتاز ادیب اور شاعر ہیں، عربی اور انگریزی سے واقف اور فارسی ادبیات کے ماہر ہیں، انجمن ادبی کابل کے ممبر اور وہاں کی نوجوان ادبی تحریکات کی روح رواں ہیں

دبرس ہوئے کہ فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر افغانستان کے نمایندہ ہوکر یہ اور ہزاکسلنسی صلاح الدین سلجوقی سفیر دہلی ایران گئے تھے، اور شاہ پہلوی سے ملے تھے آجکل یہ مکمل تاریخ آل سکتگین بیہقی کی تصحیح اور اس کے نسخوں کی تلاش میں ہیں، اسکا ایک حصہ مدت ہوئی کہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی طرف سے شائع ہوچکا ہے، مگر پوری کتاب اب تک نہیں چھپی ہے، بلکہ ملتی بھی نہیں، سرور خاں نے اس کا معتدبہ حصہ پیدا کرلیا ہے، مگر ابھی تک اس کے ایک مکمل نسخہ کی تلاش جاری ہے،

وہ پشاور اور لاہور ہوکر دہلی آئے، دہلی سے علیگڈھ گئے اور مسلم یونیورسٹی کے کتبخانہ کی سیر کی، یہاں سے حبیب گنج جاکر حبیب گنج کے خزانہ کو پرتالا، وہاں سے رامپور جاکر ریاست کے سرکاری کتبخانہ کو دیکھا، پھر لکھنؤ پہنچ کر دو دن مولوی سید ہاشم صاحب ندوی معتمد دائرۃ المعارف حیدرآباد کے ساتھ ندوہ میں قیام کیا، اور وہاں کے کتبخانہ کی دیکھ بھال کی، اس کے بعد وہ دارالمصنفین اعظم گڈھ آئے اور یہاں تین روز ٹھہرے، یہاں سے بنارس ہوکر پٹنہ گئے، اور وہاں کے مشہور علم دوست رئیس مولوی ریاض حسن خاں خیال کے مہمان ہوئے اور خدابخش خان کے مشہور کتبخانہ کو دیکھا، پٹنہ سے وہ کلکتہ ہوکر شانتی نکیتان پہنچے ہیں، وہاں سے وہ حیدرآباد جائینگے، امید ہے کہ حیدرآباد کے علم دوست اس عزیز مہمان کا شاندار خیر مقدم کرینگے،

دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن نے امسال چند نہایت اہم کتابیں شائع کی ہیں، جنمیں سے ایک اصول روایت میں خطیب بغدادی کی کتاب الکفایہ ہے، اور دوسری فلسفہ میں ابوالبرکات بغدادی کی کتاب المعتبر کی پہلی جلد تیسری ابن جوزی کی صفۃ الصفوۃ کی چوتھی جلد علماے صوفیہ کے حالات مین، چوتھی حدیث میں سنن کبریٰ بیہقی کی نویں جلد، اور پانچویں ابن ہثیم کے آٹھ رسالوں کا مجموعہ (علم نور و مناظر میں) یہ سب کتابیں اسلامی علوم و فنون کی تاریخ میں نہایت اہم اور اساسی تصنیفات ہیں، دائرہ نے ان کو چھاپ کر اپنے نئے کارناموں کی بہترین مثال پیش کی ہے،

حیدرآباد دکن کی ریاست کے خلاف آریہ سماج نے جو شور وغل برپا کر رکھا ہے وہ اس درجہ بے معنی ہے کہ خود ہندو اصحاب اسکی بے مائگی کا جابجا اظہار کر رہے ہیں، یہ کیسی عجیب بات ہے کہ خود حیدرآباد کی ہندو رعایا خاموش ہے، اور پنجاب، دہلی، شولاپور اور پونا کے آریہ شورش کر رہے ہیں، اور بات اتنی ہے کہ ریاست نے باہر کے مقرروں کی بے اجازت تقریروں کو روک دیا ہے جسمیں ہندو مسلمان سب داخل ہیں، یہانتک کہ میں بھی جب دو برس ہوئے حیدرآباد گیا تھا، تو حیدرآباد میں کوئی مذہبی تقریر اجازت کے بغیر نہ کر سکا، اور اسی لئے سکندرآباد میں جاکر تقریر کیجا سکی، ریاست کا مقصود یہ ہے کہ باہر کے مقرر آکر ریاست کی صلح و آشتی اور امن وامان کی فضا کو مکدر نہ کریں،

آریہ سماجیوں کی تقریریں جتنی غیر ذمہ دارانہ اور فتنہ انگیز ہوتی ہیں، وہ ہندوستان بھر میں ان کے اپدیشکوں کی تقریروں سے ظاہر ہے، مسلمانوں، عیسائیوں اور سناتن دھرمیوں کے بزرگوں کی نسبت ان کے ناشایستہ کلمات ایسے ہوتے ہیں جنکی ایک چنگاری سارے ملک کو جلا کر خاک کر سکتی ہے، اور اسکی بارہا مثالیں ملک میں دیکھی جاچکی ہیں، اس لئے ہر حکومت کا فرض ہے کہ وہ ایسی فتنہ انگیزیوں کو جہانتک ہو سکے اپنے ملک میں روکے،

حیدرآباد ہندوستان کا وہ خطہ تھا جو ہندو مسلم اتحاد کا مجسمہ تھا، مگر افسوس ہے کہ پنجاب، دلی اور مہاراشٹر کے مقرروں نے جاجا کر اس مورتی کے کھنڈت میں کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی، اور اگر وہ ابتک ٹوٹ نہیں سکا ہے، تو یہ اس کی غیر معمولی مضبوطی اور استحکام کا نتیجہ ہے۔

حیدرآباد کی بے تعصبی اور رواداری کی اگر کوئی مثال دیکھنی ہو تو وہاں کے مندروں، مذہبی ہندو اوقاف اور جاگیروں کو جاکر دیکھئے، خصوصاً اس زمانہ میں اسکی مثال حیدرآباد کے سوا اور کہاں ملسکتی ہے کہ محکمۂ امور مذہبی میں ہندو مددگار امور مذہبی کا تقرر خاص ہندو معبدوں اور مندروں کی دیکھ بھال کیلئے الگ ہے، اس پر یہ بات بھی جاننے کے قابل ہے کہ حیدرآباد ہندوؤں کا نہیں، اچھوتوں کا دیس ہے، جس کو آریہ ہندوؤں سے کوئی تاریخی تعلق نہیں ہے،

مقالات

قرآن پاک کا تاریخی اعجاز

دنیا کے ہر پیغمبر نے اپنی امت کے سامنے حیرت انگیز معجزے پیش کئے ہیں حضرت نوحؑ کی دعا نے عالم کو غرقاب کر دیا، حضرت شعیبؑ اور لوطؑ کی دعاؤں نے آتش فشاں پہاڑوں کے دہانوں سے آگ برسائی، حضرت موسیٰؑ کے معجزہ نے فرعون کو بحر احمر کا طعمہ بنایا، عصائے موسیٰ کی کارفرمائی نے چٹانوں کی چھاتی سے پانی کا دودھ بہایا، اور بحر احمر کے دو ٹکڑے کر دیئے، دم عیسیٰ نے جنم کے اندھوں کو بینا، اور کوڑھیوں کو چنگا کیا، فرش موت کے سونے والوں کو جگایا، اور قبر کے مردوں کو باذن اللہ کہہ کر جلایا،

یہ واقعات دنیا میں پیش آئے، اور ختم ہو گئے، برق کا شرارہ تھا، جو دم کے دم میں چمکا، اور بجھ گیا، لیکن ایک پیغمبر ایسا بھی آیا جس کے حیرت انگیز معجزہ نے قوموں کو ہلاک کرنے کے بجائے ان کو حیات تازہ بخشی، پتھر دلوں کو موم عقل کے اندھوں کو بینا اور بنی آدم کی پوری جمعیت کو غفلت و بیہوشی کی نیند سے جگا کر ہشیار، اور کفر و شرک کی ہلاکت سے بچا کر زندہ کیا، یہ حیرت انگیز واقعہ بجلی کی چمک کی طرح دفعتہً ظاہر ہو کر غائب نہیں ہو گیا، یہ ید بیضا، عصائے موسیٰ، اور دم عیسیٰ کی طرح اپنے امکان اور وقوع میں فلسفیانہ موشگافیوں اور عقلی نکتہ سنجیوں کا محتاج نہیں، یہ روز روشن کی طرح واقعہ کی صورت میں ظاہر ہوا، اور ہزار سال تک ممتد و متواتر واقعیت بنکر دنیا، اور اہل دنیا کے سامنے جلوہ گر رہا،

محمد رسول اللہ صلعم آخری دین، اور آخری صحیفہ لیکر اور نبوت کی عمارت کی آخری اینٹ بنکر اس دنیا میں تشریف لائے، آپ کے بعد نہ کوئی نیا دین آنے والا، نہ کوئی نئی کتاب اترنے والی، اور نہ کوئی نئی نبوت مبعوث ہونے والی تھی، اسلئے ضرورت تھی، کہ دوسرے انبیا علیہم السلام کی طرح آپ کا خاص معجزہ وقتی اور عارضی نہ ہو، بلکہ جب تک اس دنیا میں آپ کی نبوت کا نور چمکتا رہے، اس کی روشنی بھی قائم رہے، چنانچہ وقتی اور عارضی معجزوں کے علاوہ آپ کو ایک ایسا خاص معجزہ بخشا گیا، جو قیام قیامت تک قائم اور باقی رہنے والا ہے، قرآن نے تحدی کی کہ میں اپنے رسول و پیغمبر کی صداقت کی گواہی ہوں جن و انس مل کر بھی چاہیں، تو مجھ جیسی کتاب، بلکہ مجھ جیسی کتاب کی ایک سورہ، بلکہ ایک آیت بھی بنا کر پیش نہیں کر سکتے، اس اعلان پر پوری چودہ صدیاں گذر چکی ہیں، مگر اب تک فضاے بسیط کے ہر گوشہ میں اسکے جواب میں خاموشی چھائی ہے،

یہاں بھی عقل و فلسفہ کی منطقیانہ نکتہ آرائیوں سے بچ کر آئے تاریخ کے ائینہ میں واقعیت کا چہرہ دیکھیں، قرآن پاک دنیا کی سب سے تاریک سرزمین میں سب سے جاہل قوم پر اترا، جو علم و تمدن سے عاری دولت و ثروت سے خالی، سامان و اسلحہ سے محروم، اور ہر قسم کی دنیاوی اور مادی طاقت سے تہی مایہ تھی، قرآن نے تیرہ برس تک کبھی پہاڑوں کے غاروں سے اور کبھی پہاڑوں کی چٹانوں سے انسانیت کو آوازیں دیں، اس طویل مدت میں اسکی پکار کے جواب میں، سب و شتم، سنگریزے اور پتھر، تیر و تبر اور تیغ و خنجر کی بارش ہوتی رہی، لیکن جونہی کہ چودھویں برس کا چاند طلوع ہوا، اسکی روشنی ماہ شب چہاردہم بن کر نمودار ہوئی، اور چند سال کے عرصہ میں دیکھا تو عرب کا گوشہ گوشہ بقعۂ نور بن گیا،

قرآن کا سب سے بڑا تاریخی معجزہ یہ ہے، کہ ۲۳ برس کی تعلیم میں ایک ان پڑھ اور جاہل قوم کو دنیا کی عالم ترین اور متمدن ترین قوم بنا دیا، جس کی عظمت نے دنیاے قدیم کے دونوں بازو قیصر و کسریٰ کو توڑ دیا، چالیس برس کی مدت میں جب خلافت راشدہ کا دور ختم ہوا، قرآن کے ماننے والوں

نے جو بحر ہند کے دہانہ سے لیکر بحر انطلانتک کے ساحل تک پھیلے ہوئے تھے، دنیا کی کایا پلٹ دی تاریکی کی جگہ نور، جہالت کے بدلہ علم، شرک و کفر کے بجائے خدا پرستی آئی، دنیا کی سب سے غریب و مفلس قوم سب سے بڑی دولتمند، اور سب سے نادان و جاہل و وحشی قوم سب سے بڑی عالم و علم پرور اور متمدن ہوگئی دنیا کی سب سے ضعیف و کمزور قوم سب سے قوی اور سب پر غالب ہوگئی، وہ قوم جس کو دنیا میں کبھی سیاسی عزت و جاہ و جلال نصیب نہیں ہوا تھا، اس نے دنیا کی شہنشاہی کا تاج اپنے سر پر رکھا،

عرب و عجم، ترک و دیلم، حبش و زنگ، ہند و سندھ جس نے بھی قرآن کو اپنے سینہ سے لگایا اس نے فتح و ظفر کا پرچم ہاتھ میں لیا، تخت شاہی اپنے دونوں پاؤں کے نیچے بچھایا، اور حکومت کا تاج اپنے فرق شاہی پر رکھا، عربوں کی کیا بساط تھی، دیلم کو کون جانتا تھا، سلجوق سے کون واقف تھا، غور و خلج و تغلق کس شمار میں تھے، کرد کس گنتی میں تھے، خوارزمشاہی، اتابکی اور مصر کے بحری ممالیک اور ہندوستان کے ترکی غلاموں کی حیثیت کیا تھی، اور مٹھی بھر آوارہ گرد ترک قبیلہ کا سردار عثمان خان جسکی اولاد نے یورپ ایشیا اور افریقہ دنیا کے تین براعظموں پر چھ سو برس تک حکومت کی، اسلام سے پہلے کیا تھا، مگر جب انھوں نے اپنی عقیدت کا سر قرآن کے آگے جھکایا، تو دنیا کی شہنشاہیوں نے ان کے آگے اپنی گردنیں جھکادیں،

عربوں کا تمدن کیا تھا، افریقہ کے وحشیوں کا رتبہ کیا تھا، بربر کی بربریت کی داستانوں سے کون آگاہ نہ تھا، ترک و تاتار کی درندگی کے واقعات سے کس کے کان آشنا نہ تھے، مگر دیکھو کہ جب قرآن نے اُن کے سر پر سایہ ڈالا، تو انہی کے ہاتھوں سے عظیم الشان سلطنتوں کی بنیادیں پڑیں، بڑے بڑے متمدن شہر آباد ہوئے، علوم و فنون کی درسگاہیں کھلیں، اور تمدن و تہذیب کے نقش و نگار اور آثار نمودار ہونے لگے، فلسفہ و عقل کی جلوہ آرائی ہوئی، علم و فن نے ترقی کی، بیسیوں نئے علوم اختراع ہوئے، پچھلے علوم نے رونق تازہ پائی، اوران کی بری اور بحری تجارتوں نے دنیا کی منڈیوں پر قبضہ کرلیا،

ان سب سے ماوراء اور مادہ و مادیات سے ہٹ کر انسانی اخلاق و آداب نے اسی قرآن کی تعلیم و ہدایت سے تکمیل کا درجہ پایا، عدل و انصاف اور اخوت و مساوات کے سبق ازبر ہوئے، اور اہل جہان کی آنکھوں کو وہ منظر دکھادیا، جس کو آغاز آفرینش سے آج تک انھوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا، مغرب کی قوموں کو مشرق سے اور مشرق کی بستیوں کو مغرب سے ملادیا، اور حسب و نسب، قومیت و وطن پستی و بلندی، اور شاہی و گدائی کے ہر قسم کے نشیب و فراز کو مٹا کر قرآن والوں کی ایک برادری اور واحد قومیت پیدا کردی جس کا وطن دنیا کا ہر ملک اور جس کا مسکن دنیا کا ہر گوشہ تھا،

باطل پرستی کے ہر طلسم کو توڑ دیا، بتوں کے ہیکل مسمار کر دیئے، ستارہ پرستی کا چراغ گل کر دیا، انسانی جانوں کی قربانی موقوف کر دی، دختر کشی کی رسم کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا، عورتوں کو عزت، غلاموں کو آزادی، اور غریبوں کو بشارت دی، اور سب کیلئے صرف ایک ایمان اور عمل صالح کو ہر قسم کی ترقیوں اور سعادتوں کا زینہ بنایا، اور بتایا کہ انسانی سعادت کی شاہراہ غاروں، خلوتوں اور پہاڑوں سے ہو کر نہیں گذری ہے، بلکہ شہروں بازاروں مجمعوں اور انسانی بھیڑ بھاڑ کے اندر سے گذری ہے، حق کی نصرت انسانوں کی بھلائی، یتیموں کی سرپرستی، غریبوں کی امداد، گرتوں کی دستگیری مظلوموں کی فریادرسی اور غلاموں کی آزادی ہی نیکیوں کی جڑیں ہیں، اور اس راہ میں ہر قسم کی جد و جہد زحمت کشی و محنت اور ایثار و قربانی، اصلی نفس کشی و ریاضت ہے،

اور سب کے آخر میں اور سب سے بڑھکر اس نے مسلمانوں کو اللہ کے ایک آستانۂ قدس کے سوا دنیا وی قوت کے ہر آستانہ سے بے نیاز کر دیا، خدائے قادر کی قدرت کے سوا ہر قدرت سے وہ بے نیاز، اور ہر قوت سے وہ بے پروا ہو گئے، انھوں نے فرعونوں کو دریا میں ڈھکیل دیا، نمرودوں کے تخت الٹ دیئے، ہامانیوں کی سلطنتیں چھین لیں، اور شدادیوں کی بہشت پر قبضہ کر لیا، اور یہ سب کچھ اسلئے وہ کر سکے، کہ انھوں نے ان سب جھمیلوں کے ساتھ ہر رشتۂ محبت کو توڑ کر صرف خدا سے

اپنا رشتہ جوڑا تھا، ان کے ہر عمل کی غایت اللہ کی خوشنودی، اور رضامندی تھی، تو اللہ بھی اُن سے خوش ہوا، اور اپنی خوشنودی کا ہر خزانہ ان کے لئے کھول دیا،

قرآن نے اللہ والوں کی جماعت پیدا کی، جو اللہ ہی کے لئے کرتی اور چھوڑتی تھی، اللہ ہی کیلئے دیتی اور لیتی تھی، اور اسی کے لئے جیتی اور مرتی تھی،

مسلمانو! ربانی قوت کا یہ سرمایہ اب بھی تمھارے پاس ہے، اور اللہ کے اس خزانۂ رحمت کی کنجی اب بھی تمھارے ہاتھوں میں ہے، ہمت کرو، اور ادب سے اس کے اوراق کو کھولو، اس کے معنوں کو سمجھو، اسکی باتوں پر یقین کرو، اور اس کے حکموں کو مانو اور عمل کرو، پھر دیکھو کہ تم کہاں سے کہاں پہونچتے ہو، والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ،

ارض القرآن حصہ اوّل

عرب کا قدیم جغرافیہ عاد و ثمود، سبا، اصحاب الایکہ، اصحاب الحجر، اصحاب الفیل کی تاریخ اس طرح لکھی گئی ہے جس سے قرآن مجید کے بیان کردہ واقعات کی یونانی، رومی، اسرائیلی لٹریچر، اور موجودہ آثارِ قدیمہ کی تحقیقات سے تائید و تصدیق ثابت کی ہے، طبع دوم ضخامت ۴۲۳ صفحے، قیمت عہ

ارض القرآن حصہ دوم

قرآن مجید کے اندر جن قوموں کا ذکر ہے، ان میں سے مدین اصحاب الایکہ، قوم ایوب، بنو اسمٰعیل اصحاب الرس، اصحاب الحجر بنو قیدار، انصار اور قریش کی تاریخ، اور عرب کی تجارت، زبان اور مذہب پر تفصیلی مباحث، ضخامت ۴۲۰ صفحے، قیمت ۱۲؎، طبع دوم

منیجر

ارمغانِ احباب

یعنے

دلی اور اسکے اطراف

آج سے پینتالیس برس پہلے،

از مولینا سید عبد الحئی صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلما،

(۲)

چاندنی چوک | روز شنبہ ۲۱ رجب، حوائج ضروری سے فراغت کرکے درسگاہ گیا، مقدمہ صحیح مسلم اور بخاری شریف کا سبق سن کر قیام گاہ پر واپس آیا، آج دن بھر طبیعت منغض رہی چار بجے تک کہیں جانیکا اتفاق نہیں ہوا چار بجے کے بعد چاندنی چوک تفریحاً خراماں خراماں گیا، کہ کچھ طبیعت بہلے،

یہ چوک نہایت ہی خوبصورت ہے، اس میں تین سڑکیں ہیں، دورویہ مکانات اور دوکانون کی قطار قابل دید ہے، بیچ کی سڑک کسی قدر بلند ہے، نہر پاٹ کر بنائی گئی ہے، اسی وجہ سے نہر بند ہے، اس کے اندر پانی ہر وقت جاری رہتا ہے، دورویہ اس سڑک کے درخت سایہ دار ہیں، اس پر پیادہ پا چلتے ہیں اس کے دائیں اور بائیں جانب کی سڑکوں پر گھوڑے گھی کی آمد ورفت رہتی ہے، بیچ چوک میں گھنٹہ گھر ہے، گھنٹہ گھر کے سامنے ملکہ کے باغ کا دروازہ ہے، اس میں گھستے ہی ایک بہت بڑی عمارت ملتی ہے، اس میں عجائب خانہ ہے، مین نے ابھی عجائب خانہ کی سیر نہیں کی، یہ باغ اسٹیشن تک برابر چلا گیا ہے، وہان سے آکر قیام گاہ پر رہا کہیں نہیں گیا، کیونکہ بھائی حی تنہا تھے،

پھر خانقاہ | بروز یک شنبہ ۲۲ رجب، آج صبح کو اٹھکر نماز و تلاوت و حوائج ضروری سے فارغ ہو کر درسگاہ گیا، کسی وجہ سے آج سبق نہیں ہوئے، مولوی صاحب ممدوح کو کچھ ضرورت تھی، ترجمہ کے

بعد گھر چلے گئے، میں وہاں سے سیدھا خانقاہ شریف گیا، وہ ولایتی خادم اس وقت نہ تھا، وہاں سے
آگے بڑھ کر شاہ ترکمان کے قبرستان گیا، یہیں خواجہ میر درد علیہ الرحمہ کا مزار ہے، ایک مسجد بنی ہوئی
ہے، اس کے سامنے ایک دالان ہے، دالان کے اندر ہو کر دوسرا کھلا ہوا درجہ ملتا ہے، اس میں مزار
ہے، میں نے فاتحہ پڑھا، اس کے بعد ان کے والد ماجد خواجہ محمد ناصر عندلیب کی قبر پر فاتحہ پڑھا، یہاں
سے نکل کر اور بزرگوں کے مزارات ہیں، ان پر فاتحہ پڑھتا ہوا پھر خانقاہ شریف واپس آیا، اس وقت وہ
ولایتی خادم موجود تھے، ان سے معلوم ہوا، کہ اب تک خطوط نکالنے کا حکم نہیں آیا، آج میں اجازت
حاصل کرکے نکالوں گا، پھر جیسا جواب ملیگا، کل یا پرسوں جب آؤ گے، تو تم سے کہدوں گا، وہاں سے
میں واپس آیا، وہاں سے قریب ہی ایک مسجد ہے، اس میں ایک بنگالی مولوی صاحب رہتے ہیں
انھوں نے کہا مولینا صاحب کسی سے نہیں ملتے، کابل و بخارا کے بڑے بڑے عمائد و درویش و مشائخ
ملنے آیا کرتے ہیں، مگر ناکام واپس جاتے ہیں،

مولینا عبدالحق حقانی

پھر میں قیام گاہ واپس آیا، ظہر کی نماز پڑھکر مولوی عبدالحق صاحب مصنف تفسیر حقانی
سے ملنے کے لئے محلہ بلی ماران گیا، مولوی صاحب ممدوح حکیم عبدالمجید خان کے مکان کے آگے
مطبع فاروقی کے سامنے رہتے ہیں، وہاں جانے پر معلوم ہوا کہ مولوی صاحب نہیں ہیں، کسی سے
ملنے گئے ہیں، تھوڑی دیر بیٹھکر وہاں سے مولوی فضل اللہ کے پاس گیا، ڈپٹی ہادی حسین خان کے مکان
کے سامنے متصل مدرسہ طبیہ کے ایک کمرہ پر بکرایہ رہتے ہیں، وہ ملے، ان کے پاس مغرب تک بیٹھا
رہا، وہاں سے پھر قیام گاہ پر واپس آیا،

پھر خانقاہ

روز دوشنبہ ۲۳ رجب ۔ آج شب ہی سے پانی برس رہا ہے، ترشح کی وجہ سے کہیں جانیکا
موقع نہیں ہے، سڑکیں بہت خراب ہو رہی ہیں، دس بجے ترشح موقوف ہوا، اس وقت میں
خانقاہ کی فکر میں گیا، خانقاہ شریف کے دروازہ پہ امرائے پنجاب کھڑے ہوئے تھے، ان کو بڑا نگی

نہیں دی گئی، فاتحہ باہر سے پڑھکر واپس گئے، میں محمد علیخان ولایتی خادم کے انتظار میں ٹھہرا رہا، اس اثنا میں ایک پیر مرد آئے مجھ سے معمولی تعارف ہوا، خانقاہ شریف کے محاذی دوسرے جانب سڑک کے ایک نہایت عمدہ حویلی ہے، اس کے دروازہ کو کھولکر اندر گئے، تھوڑی دیر کے بعد ایک خادم نکلا، مجھ سے کہا کہ اندر بلاتے ہیں، میں اندر گیا، انھوں نے نہایت عزت و توقیر کیا تھا، اپنے سجادہ کے قریب ایک رومی غالیچہ پر مجھکو بٹھایا، اس کے بعد مجھ سے پوچھا، کہ آپ کہاں سے تشریف لائے میں نے بیان کیا، پھر پوچھا، کہ کیوں تکلیف کی، میں نے کہا، کہ بزرگوں کی زیارت اور مشائخ کرام کے مزاروں پر فاتحہ خوانی کی غرض سے پھر انھوں نے سلسلۂ بیعت کو پوچھا، میں نے اپنے سب سلاسل بیان کئے، ماموں صاحب[۱] مرحوم مغفور کا نام سن کر انھوں نے کہا کہ وہ میرے پیر بھائی تھے، مجھ سے ان سے ظاہری ملاقات نہیں ہے، لیکن میں ان سے خوب واقف ہوں، ان کے انتقال کے بعد ان کے مریدوں میں کچھ جھگڑا ہو گیا تھا، وہ لوگ یہاں آئے تھے، پھر کہنے لگے، کہ آجکل زمانہ کے فتنہ آشوبی کی وجہ سے حقانیت جاتی رہی ہے، للّٰہیت کی جگہ نفسانیت نے دلوں میں گھر لیا ہے، لوگ جو کچھ کرتے ہیں، وہ خدا کے واسطے نہیں کرتے، طلب جاہ و مفاخرت مدنظر ہوتا ہے، اصل یہ ہے کہ ہمتیں قاصر ہیں، جب نوکری چاکری کے قابل نہ ہوے، تو اس طریقہ کو اختیار کرتے ہیں، اور فی زعمہ سمجھتے ہیں کہ یہ طریقہ سہل ہے، حالانکہ یہ بہت دشوار گذار راستہ ہے، آج کل جہاں تک دیکھا جاتا ہے، ایسے مشائخ بہت ملیں گے، جو ظاہرداری درست کئے ہیں، وظیفے وظائف کے بھی پابند ہیں، لیکن ایسے لوگ جو ظاہرداری کیساتھ دل میں خدا کی محبت بھی رکھتے ہیں انکی صحبت سے لوگوں کو فیض بھی حاصل ہوتا ہے، باوجود تعلقات کے ان کی طبیعتیں پابند علائق نہیں ہیں، بہت کمیاب ہیں، بلکہ دیکھا سُنا نہیں جاتا

[۱] حضرت مولینا شاہ سید عبد السلام صاحب ہسوی رحمۃ اللہ علیہ (خلیفہ حضرت شاہ احمد سعید صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ،

اس کے بعد میں نے پوچھا کہ مولینا ابوالخیر صاحب نے خانقاہ شریف کی آمد و شد بالکل مسدود کردی ہے
اسکی کیا وجہ ہے، اس کے جواب میں کہا کہ یوں تو لوگوں کے طرح طرح کے خیالات ہیں، جتنے لوگ ہیں
اتنی رائیں ہیں، لیکن ان کے دل کا حال کس کو معلوم ہے، یہ سنا جاتا ہے کہ بعض لوگوں سے انھوں نے
یہ بیان کیا کہ کوئی ملنے کے لائق نہیں ہے، بعض سے یہ بھی کہا کہ جو ملنے کے لائق ہیں وہ ہم سے ملنے آتے
نہیں، جو ملنے کے لائق نہیں ہیں، وہ آکر گھیرتے ہیں، کوئی کچھ مانگتا ہے، کوئی اپنی حاجت روائی
چاہتا ہے، خیر کوئی سبب ہو، لیکن افسوس یہ ہے کہ اس سے عام ناراضگی پھیلی ہوئی ہے، تمام شہر
برا کہتا ہے، وہ کسی کو مسلمان ہی نہیں سمجھتے، لوگ دور دور سے فاتحہ کو آتے تھے، وہ بند ہے، نماز
کو مسجد میں جاتے تھے، وہ بند ہے، کتنے حسرت کی بات ہے، کہ ان کے آنے سے امید تھی، کہ خانقاہ
آباد ہوگی، اب پہلے سے زیادہ ویران ہے، مسجد میں اذان تک نہیں ہوتی، میں نے کہا کہ اذان کب سے
موقوف ہوئی، اور کیوں موقوف ہے، کہنے لگے، دو برس سے تو پھاٹک بند ہے، لیکن اذان مسجد
میں ہوتی تھی، اس پر کسی طالب العلم نے لکھ کر لیٹر بکس میں ڈال دیا، کہ جب نماز کو کوئی آنے نہیں پاتا تو
بلایا کیوں جاتا ہے، اس وقت سے جس کو آٹھ مہینہ کا عرصہ ہوا، اذان بھی بند کردی، میں نے کہا کہ
جمعہ و اعیاد کی نمازیں جماعت کیساتھ مشروط ہیں، وہ کیونکر ادا ہوتی ہیں، کہنے لگے، شاید وہ کہتے
ہیں، کہ جماعت مسلمانوں کی اور آدمیوں کی ہوتی ہے، جب کوئی آدمی ہی نہیں تو کس کے ساتھ جماعت
کیجائے کہنے لگے صاحبزادہ ہیں سمجھتے نہیں، نماز وغیرہ بند نہیں ہوسکتیں، لیکن ان کے ساتھ کسی نے اب
تک شر نہیں کیا، ورنہ کس کی مجال ہے، کہ وہ بند کردے، ان کو ایسے کسی سے نہیں ملنا ہے تو گھر کے
دروازے بند کرلیں، مسجد سے کیا تعلق، افسوس ہے کہ وہ خانقاہ جہاں کثرت و ہجوم طالبین سے
رہنے کی گنجایش نہ تھی، اب بالکل غیر آباد اور خالی پڑی ہے، لیکن ان کو نشیب و فراز کون سمجھائے
ایسے لوگ جو کہہ سکیں اون کے یہاں جاتے نہیں، جو جاتے ہیں، وہ کہہ سکتے نہیں، مسجدیں قریب قریب ویران

بہت ہیں، اس وجہ سے ہم لوگ چپ ہیں، لوگون نے تکفیر کے فتوے لکھ لکھکر بکس میں ڈال دیئے، مگر ان کو کچھ تنبہ نہیں ہوتا، غربا سے تو ملتے ہی نہیں کسی کسی سے جس کو وہ کچھ سمجھتے ہیں، مل لیتے ہیں، جب بیمار ہوتے ہیں، تو آخر حکیم کو بلاتے ہیں، اکثر خود ان کی طبیعت ناساز رہتی ہے، ان کی دو بچیاں ہیں بیوی ہیں وہ علیل ہوتی رہتی ہیں، حکیم کو بلاتے ہیں، حکیم کو بلانے کے واسطے اور کسی شخص کو بلاتے ہیں تاہم عام طور پر نہیں ملتے، اسکی ابتدار تو چار برس سے پڑ چلی تھی، لیکن اب انتہا رہوگئی، ان بزرگ کا نام عبدالرحیم ہے، ۱۲۴۱ھ میں دہلی آئے، جب سے یہیں رہتے ہیں، چلتے وقت مجھ سے کہنے لگے میں آپ کی کیا تواضع کر دن، کچھ نقل چرونجی دانہ کشتش رکھی تھیں، وہ لاکر دین اور کہا کہ فاتحہ کے تبرک ہیں، ان کے پاس سے اٹھ کر پھر میں باہر آیا، محمد علی خان نہ تھے، ایک مسجد وہان سے بہت قریب ہے، وہاں جاکر بیٹھا رہا، وہی تبرک کھاکر پانی پیا، کچھ تسکین ہوئی، میرا خیال تھا کہ آج جواب ہست نیست کا مل جائے، تو روز روز کی دوادوش سے نجات ہو، خانقاہ شریف میرے قیام گاہ سے بہت دور ہے، وہ شہر کے اس کنارہ ہے، اور میں شہر کے اس کنارہ اسٹیشن کے پاس ٹھہرا ہون، ظہر کی نماز اسی مسجد میں پڑھی، اس کی تھوڑی دیر بعد محمد علی خان وہی پرچہ میرا لیکر آئے، مجھ کو دیا میں سمجھا جواب ہے، اس کو کھول کر دیکھنے لگا، اتنے میں وہ پھر غائب ہوگئے، میں نے خیال کیا، کہ صاحبزادہ صاحب نے جواب لکھنا مناسب نہیں جانا اور یونہی پرچہ پھیر دیا ہے یہ اشارہ اسبات کا ہے، کہ ملنا غیر ممکن ہے، واپس جاؤ، میں جواب ملنے ہی کو غنیمت سمجھ کر باہر سے مرزا صاحب وحضرت شاہ غلام علی صاحب کی روح پر فتوح پر فاتحہ پڑھکر واپس آیا، دو بجے قیام گاہ پر پہنچا، آتے ہی کھانا کھایا، اب پانی اس شدت کا برس رہا ہے، کہ تار ہی نہیں ٹوٹتا، گویا ساون بھادوں کا سامینہ ہے، جھڑی لگ گئی ہے، خدا خیر کرے، اگر یہی حال رہا تو کوئی کام پورا نہ ہوسکے گا،

روز سہ شنبہ ۲۴ رجب، آج بارش کے آثار نہیں ہیں، صبح کو حوائج ضروری | سند مولوی نذیر حسین صاحب

سے فارغ ہوکر مولوی نذیر حسین صاحب کی درسگاہ گیا جسب معمول گیارہ بجے تک شریک درس رہا، اس کے بعد قیام گاہ پر واپس آیا، دو بجے بازار گیا، کچھ چیزیں لینی تھیں، وہ چیزیں لیں عصر کی نماز فتحپوری میں پڑھی اس کے بعد پھر مولوی نذیر حسین صاحب کی مسجد پر آیا، مولوی صاحب آئے نہ تھے، تھوڑی دیر کے بعد وہ آئے میں نے ذکر کیا کہ اب میرا ارادہ جانے کا بہت جلد ہے، میں چاہتا ہوں کہ مجھ کو اجازت آپ بھی عنایت کریں، سن کر فرمایا بہت اچھا بہت بہتر ہے، آپنے جو جو کتابیں حدیث کی پڑھی ہیں، وہ سب لکھ لائیے میں لکھ دوں گا، اسکو بہت خوشی کے ساتھ کئی بار کہا، بہت اچھا بہت بہتر ہے میں ضرور لکھدوں گا، اس وقت مجھ کو بہت افسوس ہوا، کہ میں اپنی سند حدیث کی لیتا نہ آیا، ورنہ وہی دکھادیتا، اسی پر وہ بھی لکھدیتے مجھ کو اس بات کا بہت ہی افسوس ہے، میں ان کے پاس مغرب تک بیٹھا رہا، باتیں کرتے رہے، میں نے پوچھا، کہ آپ نے سید[1] صاحب کو دیکھا ہے، کہنے لگے، ہاں دیکھا ہے، جب وہ سفر کلکتہ سے لوٹے تھے اس وقت میں نے پٹنہ میں ان کو دیکھا ہے، اس زمانہ میں میں یوسف زلیخا پڑھتا تھا، اس کے بعد سید صاحب دہلی آئے، یہاں بہت کم ٹھہرے، مولینا محمد اسمٰعیل[2] صاحب ٹھہر گئے تھے، قریب پانچ چھ مہینہ کے یہاں رہے، جب مسکاف صاحب کلکتہ سے آئے، تو وہ یہاں سے استعجالاً چلے گئے، کیونکہ کلکتہ میں اس سے اور مولینا سے کچھ بحث ہو گئی تھی، معلوم ہوا کہ مولوی صاحب[3] دہلی کے اصل باشندہ نہیں ہیں، صوبہ بہار کے رہنے والے[4] ہیں، مغرب کی نماز میں نے وہیں پڑھی، اس کے بعد قیام گاہ پر واپس آیا،

شیخ احمد پائی کی سرائے روز چہارشنبہ ۵ ۲ر رجب صبح کو اٹھ کر نماز و تلاوت و حوائج ضروری سے فراغت کرکے درسگاہ گیا، معلوم ہوا کہ آج میاں صاحب کی کہیں دعوت ہے، اس وجہ سے نہیں آئے، درس نہ ہوگا، وہاں سے واپس آتے ہوئے شیخ احمد پائی کی سرائے دیکھی نہایت صاف و دلکشا ہے، اس

---

[1] سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ [2] مولینا شاہ اسمٰعیل صاحب رحمۃ اللہ علیہ [3] مولوی سید نذیر حسین صاحب

[4] مولوی سید نذیر حسین صاحب دہلوی مشہور تھے، مگر ان کا اصلی وطن سورج گڑھا ضلع مونگیر صوبہ بہار تھا،

سے ملحق ایک مسجد ہے، اس میں پیرجی عبدالرزاق صاحب مولینا رشید احمد صاحب کے مریدوں میں ہیں، ان سے ملنے گیا وہ نہ تھے، وہاں سے واپس آیا،

مولوی سلیم الدین خاں بن مولوی رشید الدین خاں

ارادہ ہوا کہ آج مولوی سلیم الدین خانصاحب سے مل آؤں، یہ مولوی رشید الدین خاں صاحب مرحوم کے صاحبزادے ہیں، ان کے یہاں پرانا کتب خانہ اچھا ہے، اور شاید جدا بھی کرتے ہیں، ان کا مکان دریافت کیا معلوم ہوا، کہ بلبلے خانہ میں ہے، اور وہ دریبہ خرد میں ہے، اس پتہ سے میں دریبہ خرد میں پہونچا، وہاں دریافت کیا، تو معلوم ہوا کہ بلبلے خانہ چتلی قبر سے آگے کالی مسجد کے قریب ہے، یہ بھی دریافت ہوا کہ مولوی سلیم الدین صاحب کا دو مہینہ ہوئے انتقال ہوگیا، ان کے ایک صاحبزادے تھے رضی الدین خان ان کا مولوی صاحب مرحوم کے سامنے ہی انتقال ہوچکا تھا، ان کی اولاد خرد سال ہے، مجھکو نہایت ہی افسوس ہے،

مدرسہ حسین بخش

اب وہاں جانا بے لطف سمجھ کر یہ ارادہ کیا، کہ شیخ حسین بخش کے مدرسہ کی سیر کرنی چاہئے، یہ مدرسہ جامع مسجد بازار میں بختاور خان کی حویلی کے آگے ہے، وہیں سے روشن الدولہ کے کٹرہ ہوتا ہوا، سیدھا جامع مسجد کے پاس آنکلا، اور جامع مسجد کے پشت پر ہوکر جامع مسجد بازار پہونچا، مدرسہ نہایت پر تکلف ہے، مسجد ہے، اور مسجد کے گرد اسی سے ملحق مکانات و حجرے خوبصورتی کیساتھ بنے ہوئے ہیں، ان میں مدرسین اور طلبہ رہتے ہیں، مدرسہ کا خرچ دو سو روپیہ ماہوار ہے، آمدنی کا کوئی کافی ذریعہ نہیں ہے، چندہ سے چلتا ہے، کچھ محدود آمدنی مقرر بھی ہے چار مدرس ہیں اور پانچ مددگار،

مولوی عبدالعلی صاحب

مدرس اول مولوی عبدالعلی صاحب ہیں، یہ مسجد کے شرقی و جنوبی گوشہ کے مکان میں رہتے ہیں، وہیں درس دیتے ہیں، ذی الحجہ سنہ حال سے یہاں آئے ہیں، پیشتر مرادآباد و سہارنپور میں مدرس تھے، مولوی فیض الحسن و مولانا محمد قاسم و مولینا احمد علی صاحب مرحومین کے شاگرد ہیں، مولینا محمد قاسم صاحب سے زیادہ تر تلمذ ہے، انہی کی صحبت میں زیادہ رہے ہیں، انہی سے ارادت

ہے، آدمی خلیق سنجیدہ بے تکلف سادہ مزاج ہیں، خودداری وپندار سے بالکل کنارہ کش صورت کو علمائے دین کی شان معلوم ہوتی ہے، جب میں گیا تو صحیح مسلم کا سبق ہو چکا تھا، طلبہ سے باتیں کر رہے تھے، مجھ سے نہایت شگفتہ پیشانی کے ساتھ ملے، تعارف کے بعد مجھ سے کہا، اگر اجازت ہو تو میں ایک سبق اور پڑھا دوں، اس کے بعد سنن ابن ماجہ کا سبق شروع ہوا، دیر تک پڑھاتے رہے، اس اثنا میں میں اٹھا، مجھ سے کہا کہ آپ تھوڑی تکلیف اور کیجئے، میں بیٹھ گیا، تھوڑی دیر میں سبق ختم کیا، اور طالبعلموں سے کہدیا کہ باقی سبق سہ پہر کو ہوں گے، پھر مجھ سے نہایت لطف اور بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے، میرے واسطے چار بنوائی، اور اصرار کیساتھ پلاتے رہے، پان خود نہیں کھاتے، مگر میرے واسطے خاص کر منگوائے، باوجود اس کے کہ میں منع کرتا رہا، ان کے اس تواضع واکرام کی وجہ سے میں زیادہ بیٹھا، بارہ بجھنے کو دس بج گئے، دیر تک حضرت سید صاحب کے حالات ذکر کرتے رہے، مولینا قاسم صاحب کے حالات بیان کرتے رہے، یہ بھی کہا کہ اگر مولینا قاسم صاحب کے حالات اور ان کے علم کا مشاہدہ میں نے خود نہ کیا ہوتا تو اگلے زمانہ کے اکابر کے حالات افسانہ معلوم ہوتے، مولینا رشید احمد صاحب کے نسبت کہنے لگے کہ ایسے لوگ اب روی زمین پر ڈھونڈنے سے نہیں ملیں گے، یہ بھی قصہ انھوں نے بیان کیا کہ مولوی سعید الدین ایک معمولی استعداد کے آدمی سید صاحب کے دیکھنے والوں میں ان کے قافلہ کے تھے، سہارنپور میں رہتے تھے، وہ بھی جیسا سید صاحب غفران مآب کے علی العلوم مریدوں کا حال ہے، نہایت باخدا اور سچے مسلمان تھے، ان کے بیٹے سے کسی دوسرے شخص سے جھگڑا ہو گیا، اور نوبت عدالت پہنچی، فریق ثانی نے مولوی صاحب کو گواہی میں لکھا دیا، مولوی صاحب کو جانا پڑا، اور بلا لحاظ واسطہ پدری کے اپنے بیٹے کے مخالف گواہی دی، وہ آخر میں نابینا ہو گئے تھے، اور باوجود پیرانہ سالی کے ہر روز کسی بچہ کو ساتھ لیکر مدرسہ پڑھنے آیا کرتے تھے، کچھ سنتے تھے، کچھ پڑھتے تھے، ہمیشہ ان کا یہ شغل رہا، میں نے ایسے وقت میں دیکھا ہے، کہ نابینا ہو جانے کے بعد اون کی آنکھیں روشن ہو چکی تھیں، اور

خود بلا وساطت کسی کے پڑھتے تھے، اس کا قصہ مولوی ثابت علی صاحب عجیب بیان کرتے تھے، وہ رنبور میں مدرس ہیں، اور میرے دوستوں میں ہیں، وہ کہتے تھے، کہ مولوی صاحب مرحوم اکثر کلام مجید پڑھا کرتے تھے، اور رویا کرتے تھے، ایک مرتبہ میں دیکھتا کیا ہوں کہ وہ خود بخود چلے آرہے ہیں، ان کی آنکھیں روشن ہیں، میں نے پوچھا حضرت یہ کیا بات ہے، معلوم ہوا کہ آج بھی حسب معمولی کلام مجید پڑھ رہے تھے، اور رو رہے تھے، آنسو جیسے ہی پونچھے، آنکھیں روشن تھیں،

یہ بھی قصہ مولوی عبدالعلی صاحب نے بیان کیا، کہ سبزی منڈی یہاں سے بہت قریب ہے، اس محلہ میں ایک مولوی صاحب آکر رہتے تھے، وہ غیر مقلد تھے، دن کو میاں صاحب کے مدرسہ میں رہتے تھے، اور رات کو وہاں کرایہ سے مکان تھا، اس میں ایک بیوی صاحب بھی تھیں، اسی محلہ میں ایک کبیر السن میاں جی رہتے تھے، وہ پابند اوقات تھے، محلہ کے لوگ ان کی تعظیم کرتے تھے، ایک دن ایک بڑھیا نے ان سے آکر کہا کہ مولوی صاحب کی بیوی نے آپ کو بلایا ہے، کھڑے کھڑے ذری کی ذری سن جائیے، میاں جی صاحب گئے، پردے کے پاس بیوی صاحب نے آکر کہا کہ آپ باخدا آدمی ہیں، مجھ کو للہ اس ظالم کے پنجہ سے چھڑائیے، انھوں نے کہا خیر ہے، اس نے کہا خیر کہاں شر ہے، یہ میرا پیر ہے، میں اس کی مرید، میرے خاوند موجود ہیں، دھوکہ سے یہ مجھکو نکال لایا ہے، میاں جی صاحب کو سُن کر نہایت ہی تعجب ہوا، اور واقعی تعجب کی بات ہے، میں نے یہاں تک جب قصہ سُنا، تو مجھکو عجب حیرت ہوئی، مولوی صاحب فرمانے لگے، میانجی نے اسکی تسلی تشفی کی، اس کے بعد چلے آئے، لیکن موقع کے منتظر رہے، ایک دن مولوی صاحب سے خلوت میں کہا کہ مجھکو تنہائی میں آپ سے ایک راز کہنا ہے، بشرطیکہ وہ کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے، آپ تک رہے، انھوں نے کہا فرمائیے میاں جی صاحب نے کہا کہ میں بھی آپ کا ہم مذہب ہوں، مگر حضرت کیا کہئے اس محلہ کے لوگ ایسے سخت ہیں، آپ جانتے ہیں، کہ یہ لوگ آدمی مار ڈالتے ہیں، اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی، اگر میں ظاہر

کردن، تو خدا جانے میری کیا حالت ہو، مولوی صاحب نے کہا خیر یہ بہت مناسب ہے، اب آپ اپنا
مطلب کہئے انھوں نے کہا اصل یہ ہے کہ اس محلہ میں ایک عورت سے مجھ کو کمال درجہ کی الفت ہے،
لیکن اس کے خاوند موجود ہے، میں چاہتا ہوں کہ کوئی ایسی تدبیر ہو کہ وہ میرے قابو میں آجائے
ور شریعت میں بھی جائز ہو، انھوں نے کہا کہ یہ کوئی دشوار امر نہیں ہے، یہ لوگ یعنی حنفی المذہب مستحل الدم
ہیں، ان کا مال مال غنیمت ہے، ان کی بیویاں ہمارے واسطے جائز ہیں، آپ قابو میں نا سکتے ہوں
تو شوق سے لائے، انھوں نے کہا بس مجھ کو یہی چاہئے تھا، اور وہاں سے چلے گئے، دوسرے وقت
محلہ کے عمائد سے یہ قصہ بیان کیا، اور یہ شرط کرلی کہ ان کو جان سے نہ ماریں، ان لوگوں نے اس کے
خاوند کو بلا بھیجا، جب مولوی صاحب نماز کے واسطے آگے بڑھے تو ایک شخص نے نہایت درشتی کے
ساتھ ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا، اور نہایت ہی مرمت کی، اور خاوند اپنی جورو کو لیکر چلا گیا، یہ قصہ حال
ہی کا ہے، مجھ کو اس کے سننے سے عورت کے نکال لانے پر اتنا استعجاب نہیں ہوا، جتنا ان کے حنفیہ کے
مستحل الدم سمجھنے پر تعجب ہوا، باوجودیکہ اس میں کچھ نہیں ہے، بھوپال میں عبد اللہ نا بنیا کہتا ہے کہ
دنیا میں صرف ڈھائی مسلمان ہیں، مولوی محمد بشیر صاحب حنفیہ کو مشرک سمجھتے ہیں، القصہ دو بجے
ل وہاں سے آیا، آکر کھانا کھا کر نماز پڑھی، اس کے بعد مولوی نذیر حسین صاحب کے یہاں گیا، اس
وقت بھی درس نہیں ہوا، وہاں سے آکر چاندنی چوک گیا، کچھ چیزیں لینی تھیں، یہاں یہ بات علی
العموم دیکھی گئی، کہ دوکاندار قیمت زیادہ نہیں کہتے، اور اکثر ایک ہی بات کہتے ہیں، لکھنؤ میں اور یہاں
دونے کا بل ہے وہاں سے آکر غازی الدین خان کی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھکر قیام گاہ پر آگیا،

مدحدیث کی عبارت	روز پنجشنبہ ۲۲ رجب صبح کو اٹھکر حوائج ضروری سے فارغ ہو کر درسگاہ

---

۵ اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے، کہ اس زمانہ میں احناف اور اہل حدیث کے تعلقات کتنے کشیدہ
تھے، اور آپس کی بدگمانیاں کس حد تک بڑھی ہوئی تھیں،

گیا، ترجمہ ہو چکا تھا، اس کے بعد جتنے سبق ہوئے، سب سُنے جب مولوی صاحب گھر جانے لگے، تو میں نے وہ پرچہ دیا، جس میں اپنے حدیث پڑھنے کا حال لکھا تھا، اس کا مضمون یہ ہے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وبہ نستعین الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی وبعد فانی قرات علی شیخنا العلامہ النور الساری حسین بن محسن السبعی الانصاری اولیات الشیخ محمد سعید السنبل والحصن الحصین للجزری وبلوغ المرام للحافظ ابن حجر القسطلانی ومسلسلا بہ والامہات الاربع اعنی بہا الجامع الکبیر لابی عیسے الترمذی والجامع الصحیح لشیخ الاسلام البخاری والصحیح للامام مسلم بن الحجاج النیشا پوری والسنن لابی داؤد السجستانی وسمعت بحق قرات الغیر علیہ طرفامن السنن للنسائی وابن ماجۃ القزوینی واجازنی لکل ما یجوز لہ روایتہ ویصح عنہ درایتہ عن المشائخ الکرام الاجلۃ الاعلام اجلہم السید الشریف الحمید العلامۃ العفیف ذی المنہج الاعدل حسن بن عبد الباری الاہدل عن آبائہ السادۃ ومشائخہ القادۃ ونسلحۃ الشریف العلامۃ محمد بن ناصر الحازمی والشیخ العلامہ احمد بن محمد بن علی الشوکانی عن والد الثانی سند القطر الیمانی شیخ الاسلام محمد بن علی الشوکانی عن الامام الہمام احمد بن عبد القادر الکوکبانی رضی اللہ عنہم وعنا اجمعین الی آخر السند المثبوت المحفوظ عندی بخط شیخنا متعنا اللہ بحیاتہ،

افسوس ہے کہ اگر سند موجود ہوتی، تو مجھکو اس عبارت کے لکھنے کی حاجت نہ پڑتی بہرحال

مولوی صاحب نے وہ پرچہ لیکر رکھ لیا، اور میں قیام گاہ پر واپس آیا،

پیرجی عبدالرزاق | ظہر کی نماز پڑھکر احمد پائی کی مسجد میں پیرجی عبدالرزاق صاحب سے ملنے گیا، یہ بزرگ گنگوہ کے رہنے والے مولینا[1] سلمہ اللہ تعالی کے مریدوں میں ہیں، دہلی میں سترہ برس سے رہتے ہیں، ملاقات ہوئی بیٹھے کلام مجید کی تلاوت کر رہے تھے، آدمی بہت معقول ہیں، جب تک صحبت رہی بزرگوں کا تذکرہ کرتے رہے، مجھ سے نہایت حسن ظن کیساتھ پیش آئے،

سند حدیث پر تصدیق | تھوڑی دیر کے بعد میں واپس آیا، اور سند کے خیال میں مولینا نذیر حسین صاحب کے میان چلا، راستہ ہی میں وہ مل گئے، ڈولی پر کہیں جارہے تھے، ایک خادم ساتھ تھا، مجھ سے کہا کہ میں تمہاری سند لکھ کر قرآن شریف میں رکھکر آیا ہوں، مسجد میں جاکر لیلو، میں مسجد گیا سند رکھی ہوئی تھی، لیکر قیام گاہ پر واپس آیا، خلاصہ مضمون سند کا یہ ہے:-

اِنَّ المولوی عَبْدالحیّ بن السید فخرالدین الحسنی قَدْ قرأ الصحاح السّتة وَمُلْحِقاتِها، عَلَی العَلّامَة المحدث حُسَیْن بن مُحْسِن السبعی الانصاری و طَلَبَ مِنّی اَیْضًا سَنَدَ ها لزیادة الوثوق فاجزت لَه باقراء الکتب المذکورة وتدریسها لانّه اهلها واحق بها،

میاں صاحب نے اپنے حُسن ظن سے یہ فقرہ سند میں بڑھا دیا ہے، لِاَنّه اهلها واحق بها یعنی یہ اس کے اہل، اور سب سے زیادہ حقدار ہیں، ورنہ ایسی صورت میں قاعدہ محدثین کا یہ ہے کہ یہ فقرہ لکھتے ہیں، بالشرط المعتبر عِنْدَ اَهْل الحدیث والاثبت یعنی اس شرط کے ساتھ جو اہل حدیث کے نزدیک معتبر ہے، والحمد للہ علی ذلک،

مدرسہ شاہ عبدالعزیز صاحب | وہاں سے آنے کے بعد میں نے یہ ارادہ کیا، کہ حضرت مولینا و مولی الکل مقتدائے ارباب رشد و تمیز شاہ عبدالعزیز روح اللہ شبوحہ کے مدرسہ کی زیارت کروں، جس میں ہمارے بزرگوں

[1] مولینا رشید احمد صاحب،

نے یکے بعد دیگرے استفادہ کیا ہے، اور جس کی خاکروبی کو فخر و سعادت سمجھا ہے، حضرت شاہ محمد واضح قدس سرہ حضرت شاہ ولی اللہ کے وقت میں تشریف لائے، ان کے بعد شاہ ابو سعید صاحب، مولوی محمد نعمان صاحب، حضرت سید محمد معین صاحب یکے بعد دیگرے آئے، اس کے بعد شاہ عبد العزیز صاحب کے وقت میں حضرت مولینا شاہ سید قطب الہدیٰ صاحب تشریف لائے، ان کے بعد مولینا سید محمد اسحاق صاحب، ان کے بعد حضرت مولینا سید احمد صاحب قدس اللہ اسرارہم آئے، اور فائدہ حاصل کیا جسکو تمام عالم جانتا ہے،

یہاں سے جامع مسجد اور اس کے آگے چتلی قبر تک گیا، چتلی قبر سے دو راستے ہیں، ایک داہنے ہاتھ کو وہ سید رضا خانقاہ کو گیا ہے، دوسرا بائیں ہاتھ کو اس راستہ پر بہت دور تک چلا گیا، آگے بڑھکر بائیں ہاتھ کو کوچۂ فولاد خان کو سڑک گئی ہے، وہ سیدھی کلاں محل تک چلی گئی ہے، کلاں محل میں ہمارے شیخ المشائخ مولینا و مقتدانا رحمہ اللہ تعالیٰ کا مدرسہ ہے، اسکی حالت دیکھ کر خاویۃ علی عروشہا انی یحیی ھذہ اللہ بعد موتہا کی آیت یاد آئی، اللہ اللہ کیا کارخانہ قدرت کی نیرنگیاں ہیں، ایک وہ دن تھا، کہ عرب و عجم کے لوگ اس مدرسہ میں رہتے تھے، اور فائدہ حاصل کرتے تھے اور آج اسکی یہ حالت ہے کہ ویران و خراب پڑا ہوا ہے کوئی رہنے والا نہیں،

شاہ صاحب کی یادگار | مدرسہ میں پہنچکر میں نے مولوی سید ظہیر الدین احمد کو تلاش کیا، وہ زنانخانہ کے قریب کسی مکان کی تعمیر کرا رہے تھے، میں وہاں گیا، اور حضرت شاہ صاحب کے زنانہ مکان کے باہر سے زیارت کی، اسکے بعد مولوی صاحب سے ملے، تعارف ہوا، اور وہاں سے کمرہ میں آکر بیٹھے، پہلے انھوں نے اس بات کی بڑی شکایت کی، کہ آپ سرائے میں کیوں ٹھہرے، اور اسی وقت آدمی کو بھیجنے لگے کہ اسباب اٹھا لائے لیکن میں نے معذرت کی اور کہا کہ میں کل جانیوالا ہوں اب اگر اتفاق حاضر ہونیکا ہوگا تو یہیں ٹھہروں گا، مجھ کو اجنبیت کی وجہ سے معلوم نہ تھا، تاہم وہ بہت دیر تک بجائے مخدومانہ شکایت کے برادرانہ شکایت کرتے رہے پھر اس بات پر مصر ہوئے کہ کل دعوت ہے، اسکو قبول کیجئے، میں نے اس میں بھی معذرت کی، کیونکہ اس وقت میرا قطعی ارادہ کل کے جانے کا تھا، آخر کو انھوں نے مجبور ہو کر کہا کہ آج ہی شب کو کھانا یہاں

کھاؤ میں نے زیادہ انکار مناسب نہیں سمجھا، اور ان کی اس عنایت کا شکریہ ادا کیا، یہ بزرگ شاہ صاحب کے خاندان سے اس طور پر واسطہ رکھتے ہیں، کہ ان کے دادا جناب شاہ رفیع الدین صاحب کے نواسہ تھے، حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کے چھ صاحبزادے تھے، مولوی مخصوص اللہ، مولوی موسیٰ، مولوی مصطفےٰ وغیرہ، ان کے اب کسی کے اولاد نہیں ہے، ایک صاحبزادی تھیں بوبی امۃ اللہ، انکے دو صاحبزادے تھے سید ناصر الدین اور سید نصیر الدین، آخر الذکر مولینا محمد اسحٰق صاحب کے داماد تھے، جو مولینا نصیر الدین مجاہد کے نام سے مشہور ہیں، ان کی اولاد نہیں چلی، اور اول الذکر کے ایک صاحبزادے تھے سید معز الدین، ان کے صاحبزادے ہیں سید ظہیر الدین احمد، انھوں نے اس بات کی کوشش کی ہے، کہ ان حضرات کی تصانیف شائع کیجائیں، چنانچہ اکثر رسائل چھپوائے ہیں، اور باقی چھپ رہے ہیں، ایک پریس بھی قائم کیا ہے، ابتدا میں خاص حضرت مولینا علیہ الرحمہ کے مدرسہ میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا، مگر ابنا ے زمانہ کی بے التفاتی سے وہ ٹوٹ گیا، آج کل انتباہ چھپ کر تیار ہو گئی ہے، اب حضرت شاہ اہل اللہ صاحب کا مطب چھپ رہا ہے، یہ بہت بڑے حکیم بھی تھے، کچھ کتابیں دکھانے کو گھر سے لائے، ایک مجموعہ جس میں حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت شاہ اہل اللہ، حضرت شاہ عبد العزیز صاحب کے مکتوبات تھے، جو باہم علماے معاصرین سے کتابت ہوئی تھی، حضرت ابو طاہر مدنی و سید محمد حسین سیدلے و بابا عثمان بن فاروقی کشمیری کے بھی خطوط تھے، حضرت شاہ عبد العزیز و سید حسین سیدلے کے خطوط ادبا کے واسطے قابل دید ہیں، قول الجمیل بھی اس مجموعہ میں تھی، اس کے حواشی کے نسبت وہ کہتے تھے، کہ خاص جناب مولانا علیہ الرحمہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں، بذور البازغہ بھی دیکھنے میں آئی، ایک رسالہ ملا محب اللہ بہاری کا فطرۃ الالٰہیہ تھا، بذور البازغہ حجۃ اللہ البالغہ کے انداز کا رسالہ ہے حکمت الٰہی میں[1]

شاہ صاحب کا خاندانی مقبرہ، ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مہندیوں میں حضرت شاہ صاحب کے تمام خاندان کے مزار ہیں، شاہ عبد الغنی صاحب بھی وہیں مدفون ہیں، اور حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کے

[1] یہ رسالہ اب چھپ گیا،

سب صاحبزادے اور مولینا اسمٰعیل صاحب کے فرزند رشید مولوی محمد عمر صاحب اور شاہ ولی اللہ صاحب کی والدہ ماجدہ اور مہندیوں کو جاتے ہوئے، راستہ میں سڑک سے کچھ فاصلہ پر حضرت شاہ عبد العزیز شکر بار کا مقبرہ ہے، جو حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب کے نانہالی اجداد میں ہیں، افسوس ہے، کہ یہ خاکسار اسی طرف سے گیا، اور اس مقبرہ میں پہنچکر طبیعت بہت رکی، اور دیر تک وہاں کھڑا رہا، لیکن یہ نہ معلوم تھا کہ حضرت شکر بار کا یہیں مزار ہے، مجھ سے بہت بڑی غلطی یہ ہوئی، کہ پہلے مدرسہ جاکر ان بزرگ سے ملاقات نہیں کی، ورنہ یہ اجنبیت نہ رہتی،

شاہ صاحب کا اصل وطن یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ حضرات اصل باشندہ رہتک کے ہیں، شاہ عبد الرحیم صاحب کے والد ماجد شاہ وجیہ الدین صاحب دہلی تشریف لائے، ان کے بعد شاہ عبد الرحیم صاحب نے یہیں قیام قبول کرلیا، شاہ عبد الرحیم مہندیوں میں رہتے تھے، پہلے وہاں آبادی تھی، جہاں ان کے مزار ہیں، یہ خاص حجرہ شاہ عبد الرحیم صاحب کا تھا، وہاں مدرسہ بھی تھا، اور مسجد بھی، وہ سب مندرس ہوگئی، یہ مسجد جواب ہے، یہ شاہ اسحاق صاحب کے وقت میں کسی ارادتمند نے بنوادی ہے، احاطہ مزاروں کا بالکل شکست ہوگیا ہے، شاہ عبد الرحیم کے بعد شاہ ولی اللہ صاحب نئے شہر میں تشریف لائے، یہ مدرسہ ان کو دیا گیا، اور یہیں رہ پڑے شاہ عبد الرحیم صاحب کی پہلی شادی سونی پت میں ہوئی تھی، ان سے ایک صاحبزادے ہوئے اصلاح الدین، ان سے اولاد نہیں چلی، دوسری شادی ساٹھ برس کی عمر میں حضرت قطب الدین بختیار کاکی کی بشارت کے موافق پھلت میں اپنے ایک مرید کے یہاں کی، ان سے دو صاحبزادے ہوئے، شاہ ولی اللہ اور شاہ اہل اللہ، پھلت والوں کا خاندان صدیقی ہے، اور شاہ صاحب کا فاروقی، شاہ اہل اللہ ہمیشہ ننہال میں رہتے، قرابت اس خاندان کی ہمیشہ سونی پت کے سیدوں میں یا پھلت کے صدیقیوں میں ہوا کی ہے، شاہ ولی اللہ صاحب کی بھی دو شادیاں ہوئیں پہلی پھلت میں ہوئی، شیخ محمد صاحب کی بیٹی سے، جن کے پوتے ہیں شاہ محمد عاشق صاحب ان سے

ـ صاحبزادے ہوئے شیخ محمد صاحب وہ بھی ہمیشہ بہلت میں رہے، دوسری سید ثنار... کی بیٹی کو
ئی، ان سے چار صاحبزادے ہوئے، جو دین کے چار ارکان یا جبد علم کے اربع عناصر تھے، ان حضرات
ت بہت دیر تک مولوی صاحب بیان کرتے رہے، میں نے مغرب کی نماز وہیں پڑھی، پھر کھانا کھا
تھوڑی دیر بیٹھا، مولوی صاحب ان حضرات کے حالات میں ایک کتاب لکھ رہے ہیں، وہ دیر
ـ سنتا رہا، اس کے بعد میں نے خدا حافظ کہا لیکن مولوی صاحب باوجود میرے انکار کے گلی کے
تک مشایعت میں آئے، وہاں سے اپنا آدمی لالٹین لیکر ساتھ کر دیا، چلتے وقت مجھ سے معافی
فرمایش کی، اور میں رخصت ہو کر روانہ ہوا، جامع مسجد کے قریب میں نے ان کے آدمی کو رخصت
، کیونکہ لالٹینیں سڑک پر روشن تھیں، اور راستہ بھی مجھکو معلوم تھا،

ع مسجد میں واعظوں کے دنگل،

روز جمعہ، ۲ رجب، آج صبح سے دوپہر تک قیام گاہ میں رہا، دوپہر کو کھانا کھا کر جامع مسجد نماز کے واسطے گیا، نماز کے بعد چار جگہ وعظ ہونے لگا
ر پر مولوی محمد اکبر وعظ کہتے ہیں، یہ بزرگ حنفیوں کا خوب خاکہ اڑاتے، دل کھولکر تبرا کرتے ہیں
، بات پر فخر کرتے ہیں، کہ ہدایہ پڑھانے سے توبہ کی ہے، فرماتے تھے، کہ "آج کون ہے، کہ جس
ہدایہ پڑھانے سے توبہ کر کے کلام مجید کی تعلیم شروع کی ہو، سب جہنم میں جائیں گے" اور وعظ
، ہر ہر بات پر اپنی بڑائی کرتے ہیں، ہر آیت کو اہل دہلی اور اپنے اوپر اوتارتے ہیں، اہل دہلی کو
ین مشرکین سے ملاتے ہیں، اور اپنے تئیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عیاذاً باللہ، دوسرے صاحب
ذ نہ کے پاس بھی اسی طور پر حنفیہ کا خاکہ اڑا رہے تھے، لیکن کف لسان کے ساتھ، تیسرے صاحب
ب میذ نہ کے محدثین و متبعین سب کی خبر لے رہے تھے، انحنا و قیام تعظیمی کے منع کرنے پر بحث
، رہے تھے، چوتھے صاحب حوض پر کچھ مناجاتیں اور نعتیہ غزلیں پڑھ کر لوگوں کو اپنی طرف راغب
رہے تھے، الغرض ایک ہڑبونگ تھا، اس ہڑدنگے پن کو دیکھ کر نہایت افسوس ہوا، خدا کی مرضی

میں کسی کو دخل نہیں جب سلطنت اسلام جاتی رہی تو جسکا جو جی چاہے کہے، اور کرے،

مدرسہ حسین بخش میں وعظ

وہاں کی یہ حالت دیکھ کر منشی حسین بخش کے مدرسہ آیا، یہاں نماز ہو چکی تھی، اور وعظ کی تیاریاں ہو رہی تھیں، لوگوں کا بہت بڑا ہجوم تھا، جامع مسجد سے بھی لوگ صرف وعظ کے سننے کو یہاں آئے تھے، مولوی کرامت اللہ صاحب یہاں وعظ کہتے ہیں، ان کے وعظ میں فقیر کو بہت دلبستگی ہوئی، اول سے آخر تک بیٹھا رہا، یہ بزرگ صوفی مشرب معلوم ہوتے ہیں، عصر کی نماز پڑھکر چاندنی چوک ہوتا ہوا مغرب تک قیام گاہ پر واپس آیا،

پرانی دلی

روز شنبہ ۲۰ رجب آج صبح کو اٹھکر قطب صاحب کی سیر کا ارادہ ہوا، اس وجہ سے کھانا جلد پکوا کر کھا لیا، یہاں سے وہاں تک ایک روپیہ میں یکہ ہوا، یہ خاکسار اور برادر صاحب مکرمی سید خلیل الدین اور عزیزی محمد صالح سوار ہو کر چلے، دہلی دروازہ سے باہر نکل کر جیلخانہ اور کوٹلہ کے درمیان سے سڑک گئی ہے یہیں سے آثار مندرسہ مساجد و مزارات وقلعجات ومحلات کے شروع ہوئے، جن کے کھنڈروں پر کائی جمی ہوئی ہے، کوئی رہنے والا نہیں، ٹوٹی پھوٹی عمارتیں پڑی ہیں، کوئی یہ بھی نہیں جانتا، کہ ان عمارتوں کو کس کس نے بنایا تھا، ہزاروں عمارتیں ہیں جن کے آثار بھی باقی نہیں ہیں، مساجد ومشاہد کے آثار اسوجہ سے باقی رہگئے، کہ وقف ہونے کی وجہ سے وہ توڑی نہیں گئیں، تاہم کتنی مساجد ومشاہد ہیں، جو نیست و نابود ہو گئی ہیں، کتنے قلعہ ہیں جو سربفلک کشیدہ ہیں لیکن تغیرات زمانہ سے شکست ہو گئے ہیں، کچھ دنوں میں ان کا نام ونشان بھی نہ رہے گا، چار میل پر جاکر اسی قسم کے آثار ونشانات نہ پائے گئے، معلوم ہوتا تھا، کہ ایک شہر ویران وخراب پڑا ہوا ہے جس کے مکانوں کی چھتیں گر گئی ہیں دیواریں ٹوٹ گئی ہیں، کچھ کھڑی ہیں کچھ پڑی، اسی میں حضرت نظام الدین اولیار کا مقبرہ ہے جسکو یہاں کے عرف میں سلطان جی اور نظام الدین کہتے ہیں، پھاٹک کے اندر ایک باولی بھی بہت بڑی ہے، وہ اسی وقت کی بتائی جاتی ہے، اسکی دیوار بہت اونچی ہے، اس کے کنارہ کنارہ ہوکر اندر گئے

بیچ صحن میں قبہ تھا، اس کے اندر مزار مبارک ہے، اس کے گرد سنگ مرمر کا کٹہرہ ہے، جس کو شمس الامرا امیر کبیر خورشید جاہ بہادر نے نذر گزرانا ہے، سرہانے بلندی پر ایک کلام مجید بخط نسخ جلی حروف بہت صحیح رکھا ہے، تمام صحن میں سنگ مرمر کا فرش ہے، وہاں سے آگے بڑھ کر دو مقبرے سنگ مرمر کے ہیں ان پر قبہ نہیں ہے، ان کے کواڑے بھی سنگ مرمر کے ہیں، ان کا کام قابل دید ہے، داہنے طرف والا محمد شاہ کا ہے، دوسرا بائیں طرف مرزا ابو ظفر کے[1]...... کا ان دونوں کی ساخت اعلیٰ درجہ کی ہے، وہاں سے آگے بڑھ کر امیر خسرو دہلوی کا مقبرہ ہے، ان کے مزار کے گرد بھی سنگ مرمر کا کٹہرہ شمس الامرا کا بنوایا ہوا ہے، ان مزاروں پر فاتحہ پڑھکر مسجد دیکھنے کو آئے، اس کے قریب ایک اور سنگ مرمر کا مقبرہ ہے، اس میں تین قبریں ہیں، ایک نواب جہان آرا بیگم کی ہے، اس کے لوح مزار پر یہ شعر کندہ ہے:۔

بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزار مرا　　که قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

اس کے تلے لکھا ہے، "الفقیرۃ الفانیہ جہان آرا بیگم مرید خواجگان چشت بنت شاہجہاں بادشاہ" مسجد علاء الدین غوری کی بنوائی ہوئی ہے، سنگ سرخ کی، اسکی بلندی و وسعت قبہ و سنگ تراشی کا کام قابل دید ہے، دیکھکر آدمی متحیر ہو جاتا ہے، اس کو دیکھکر باہر نکلے، ان مقبروں میں مزارات اور بھی کثرت کے ساتھ ہیں، مجاورین یہاں کے نہایت سلیقہ کے ہیں، ہمارے جانے سے کچھ غل شور نہیں ہوا، سب بجائے خود بیٹھے رہے، کسی نے سوال بھی نہیں کیا، جو دیا وہ لے لیا،

قطب صاحب وہاں سے نکل کر قطب صاحب گئے، قطب صاحب شاہجہاں آباد سے گیارہ میل ہے، اس مسافت میں کئی قلعے راستہ میں ملے، دہلی کی پرانی آبادی یہاں کثرت سے ہے، شہر آباد ہے لیکن نہایت بے رونق، جہاں تک نگاہ جاتی ہے، سوا ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں کے اور کچھ نظر نہیں آتا، ہر چند کہ آبادی کے شروع میں قطب صاحب کی لاٹ ملتی ہے لیکن ہم سیدھے حضرت

[1] اصل مسودہ میں یہ لفظ چھوٹا ہوا ہے،

قطب الدین بختیار کاکی کے مزار پر گئے، راستہ ہی سے مجاورین نے یکہ کیساتھ دوڑنا شروع کیا، شہر میں پہونچکر اور بھی جمع ہوگئے، مزار کے پاس پہونچکر انبوہ ہوگیا، سائلوں نے دست درازی شروع کی، اس مقبرہ میں چار دیواری کی عمارت بھی سنگ مرمر کی ہے، قبہ نہیں ہے، اس کے گرد و پیش صدہا قبریں ہیں، وہاں فاتحہ پڑھکر نکلے، مسجد وغیرہ دیکھیں، سائلوں کا انبوہ ساتھ تھا، جو کچھ ہوسکا ڈانکو دیکر بہ مشکل عقب گذاری کی، وہاں سے بہادر شاہ خاتم السلاطین کے مسرت محل کو عبرت کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے، باہر آئے، باہر ایک مسجد میں ظہر کی نماز پڑھی، بھائی جی وہاں ٹھہر گئے، میں اولیا مسجد دیکھنے کو بازار ہوتا ہوا شہر سے باہر نکلا، جھریا پر وہ مسجد ہے، جہاں پھول والوں کی سیر ہوتی ہے، مسجد کے گرد و پیش مزار ہیں، مسجد بلا محراب و سقف و ستون کے ایک بلند مقام پر ہے، نیچے اوس کے جھیل ہے، اور اس پر سایہ دار درخت ہیں، گرد مرتفع چبوترہ ہے، اس کے نیچے حوض میں مسجد ہے، یہ مقام نہایت ہی دلکشا و فرحت بخش مہبط انوار الٰہی ہے، وہاں جانے سے طبیعت منشرح ہوتی ہے ایک معمر آدمی وہاں ایک کوٹھری میں بیٹھا ہوا تھا، اس سے معلوم ہوا، کہ اس مسجد میں حضرت معین الدین چشتیؒ خواجہ بزرگ اور حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ تشریف رکھتے تھے، اور اولیار کبار اوس وقت جمع ہوتے تھے، واقعی یہ عجیب جگہ ہے، جیسی دلچسپی مجھ کو یہاں ہوئی اس وقت تک کسی مقام میں نہیں ہوئی، اس پیر مرد سے میں نے شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے مقبرہ کو پوچھا، اس نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے ایسا پتہ دیا کہ باوجود کوشش کے میں وہاں تک نہ پہنچ سکا، بلا مبالغہ میں نے اس وقت اپنی پوری ہمت سے کام لیا، اور کم سے کم اس جھیل کے گرد و پیش کھنڈرو کو روندتا مزاروں کو پھاندتا اتنا چلا، کہ کوس بھر سے زیادہ مسافت پڑ گئی، اور میں تھک گیا، پھر کوئی آدمی بھی نہ ملا جس سے نشان پوچھتا، اولیا مسجد سے اتنا دور نکل گیا، کہ پھر لوٹنے کی ہمت نہ ہوئی حالانکہ بعد کو معلوم ہوا کہ اولیا مسجد کے پاس ان کا مزار تھا، وہاں سے آنکھ پھاڑ کر جدھر میں دیکھتا تھا

سوا کھنڈروں کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا، مجبور ہو کر وہاں سے باز رہو تا ہوا اس جگہ پر واپس آیا، جہاں بھائی یحیٰی اور محمد کو چھوڑ گیا تھا، پھر ہم سب یکہ پر سوار ہوئے، اور واپس چلے،

قطب مینار قطب صاحب کی لاٹ پر پہونچکر پھر اترے، اسکی عمارت قابل دید ہے، یہ مسجد کا ایک مینار ہے، جو پرتھی راج کے بتخانہ کو توڑ کر بنوایا جاتا تھا، اس کے بتخانہ کے نشانات بھی مسجد کے زینہ میں اب تک موجود ہیں، ایک مینار صرف بنا تھا، دوسری میں لگا لگا تھا، کچھ محرابیں بن چکی تھیں کہ داعی اجل نے بانی کو پکارا، اور وہ جان بحق تسلیم ہوا، مجھ کو یاد پڑتا ہے، اس مسجد کی شمس الدین التمش نے بنیاد ڈالی تھی، اگر بنجاتی تو تمام عالم مین بے مثل عمارت ہوتی، مسجد اباصوفیہ کی اس کی سامنے کوئی حقیقت نہ ہوتی، ولید بن عبد الملک کی مسجد کو جو دمشق میں ہو لوگ بھول جاتے، اس وقت اس کے صرف ایک مینار کو دیکھنے یورپ سے لوگ آتے ہیں، باوجودیکہ دو کھنڈ اس کی اتار لی گئی ہیں لیکن اب بھی اتنا مرتفع ہے، کہ اس کے برابر اور کوئی مینار مرتفع نہ ہوگا تین سو سے زائد زینے ہیں، ان سب باتوں سے قطع نظر کر کے سنگ تراشی کا کام دیکھئے تو عقل حیران ہوتی ہے، آذر ہوتا تو وہ بھی دیکھکر مبہوت ہو جاتا، میں نے سانچی کا ناکھیڑہ کی عمارتیں دیکھی ہیں، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً چھ سو برس پیشتر کی عمارتیں ہیں، اور سنگ کو موم کر دیا ہے، لیکن میرے نزدیک اس کے سامنے اسکی کوئی حقیقت نہیں، اہرام مصری کا نام ہی نام ہے، وہ انگھڑ بے جوڑ عمارت اسکی برابری کیا کر سکتی ہے، سیاحوں نے مان لیا ہے کہ یہ عمارت لاثانی ہے، اس کے داہنے طرف ایک بہت مرتفع دروازہ ہے، اس کے اندر ایک وسیع گنبد ہے، جس کا کام تعبیہ مینار کا سا ہے، اسکو دیکھکر بھی حیرت ہوتی ہے، اس کو علاء الدین غوری کا بتاتے ہیں، مگر مجھکو اس میں تامل ہے، اس مقام پر تاریخ فرشتہ دیکھنی چاہیئے، یا آثار الصنادید مصنفہ ڈاکٹر سید احمد خاں بہادر، ناظرین یہ عمارتیں ایسی نہیں ہیں، جن کے پورے پورے حالات کوئی بیان کر سکے، اور کوئی شاید بیان کر سکے، لیکن میں معترف ہوں کہ ایک شمہ بھی ان کے واقعی حالات

کا مجھ سے نہیں بیان ہو سکتا، اور وہ شخص کیا بیان کر سکتا ہے، جس نے ان کو آنکھ بھر کر بھی نہ دیکھا ہو، جنے
ایسی آنکھ سے دیکھا ہو، جس میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے ہوں، کوئی یورپین یا ہندو جنٹلمین ان کو تماشا گاہ
سمجھتا ہو تو ہو لیکن میں کیا تمام مسلمان ان کو مرقع عبرت یا افسانہ حسرت خیال کرتے ہیں، مسلمانوں کو اس سے
زیادہ کیا حسرت کا مقام ہوگا، کہ وہ ان اقبال مندیوں کے مقابلہ اپنی حالت کو حقیقی ادبار میں پاتا ہے،
سچ ہے، ملک و دولت میں کسی کا اجارہ نہیں "یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ" ع

اوست سلطاں ہر چہ خواہد او کند،

منصور علی خان کا مقبرہ وہاں سے پھر سوار ہو کر کارخانہ قدرت کی نیرنگیوں کو چپ و راست چشم حسرت سے دیکھتا ہوا
پھر چلا، تقریباً چھ میل نکل کر منصور علی خان کا مقبرہ ملا، یہ نہایت عالیشان مقبرہ ہے، اس کا
رمنہ بہت وسیع ہے، اور اندر وسط میں مقبرہ ہے، پھاٹک کے قریب سنگ سرخ کی مسجد ہے، مقبرہ بھی
سنگ سرخ کا ہے، سنگ مرمر کی گوٹ اور تحریریں قابل دید ہیں، سنگ تراشی اور لداو کا کام نظارہ کر
سے متعلق ہے، ایک عمارت ہو تو اس کی تعریف کی جائے، ایک کو دیکھ کر ایسی حیرت ہوتی ہے، کہ
دوسری بھول جاتی ہے،

میں باوجود یکہ دو ہفتہ برابر کوشش کرتا رہا، تاہم بہت سی عمارتیں دیکھنے کو چھوٹ گئیں،
سید حسن رسول نما کا مزار اجمیری دروازہ سے باہر پہاڑ گنج کے آگے پنچ کنوئن میں ہے، باوجود آرزو کے
وہ بھی نہیں دیکھ سکا، حضرت نصیر الدین روشن چراغ دہلی کا مزار سلطانجی سے کچھ فاصلہ پر راستہ سے دور
بڑی دشوار گذار جگہ میں ہے، کہ یکہ آسانی سے نہیں جا سکتا، اسی کے قریب کچھ ہٹ کر حضرت سید نور محمد
بدایونی کا مزار ہے، ان مزاروں پر بھی نہیں جا سکا، شیخ عبد الحق دہلوی کے مزار تک بھی نہیں پہونچ سکا،
حضرت شیخ محمد عابد سنامی کا مزار قدم شریف سے کچھ آگے ہے، لیکن اب وہ بالکل مٹ گیا ہے، وہاں
بھی جانا نہیں ہو سکا، ان مزاروں کے سوا اور مزاروں کی گنتی نہیں ہو سکتی، اس خاک پاک سے ایسے

ایسے برگزیدہ لوگ نکلے ہیں، اور اسی خاک پاک میں مدفون ہیں جن کا شمار نہیں ہوسکتا،

ماتم | اے دلی اب ہم تجھ سے رخصت ہوتے ہیں، اے مرقع عبرت، اے تازیانۂ غیرت، اے افسانۂ حسرت، اے آئینۂ حیرت اے مسلمانوں کی گذشتہ اقبالمندیوں کے نمونے، اے لق و دق صحرا، اے مسلمانوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندے ہوے میدان، اے درحقیقت مسلمانوں کی خاک پاک تیرا وہ پرانا جاہ و جلال کہاں، وہ لوگ کہاں ہیں جو تیری زیب و زینت کے باعث تھے، جو تیرے آسمان کے ستارے تھے، تیرے وہ دلاور کہاں ہیں، جو راجپوت اور راٹھور بہادروں کی صفیں درہم برہم کردیتے تھے، تیرے وہ بزرگان دین کہاں ہیں، جن سے روحانیات اور ملائکہ مصافحہ کرتے تھے، وہ اہل کمال کہاں ہیں؟ جن سے استفادہ کرنے کو سارے جہان کے لوگ آتے تھے، ہاے دلی ہاے، مردہ قوم کی یادگار، دلی تو وہی ہے، جس میں قطب الدین ایبک کا تہور، شمس الدین التمش کی اولوالعزمی، غیاث الدین بلبن کی تدبیر مسلمانوں کے ظفر و اقبال کا نمونہ تھی، تو وہی دلی ہے جس کے خلجی و تغلق فرمانرواؤں کی سطوت تمام عالم میں ضرب المثل تھی، تو وہی دلی ہے، جس میں لودی اور افغان بادشاہوں کی حکومت رہ چکی ہے، تو وہی دلی ہے، جس کے لعل و گوہر دربار اکبری کے زیب و زینت تھے، اے خاک پاک دلی تجھ میں سیکڑوں خانقاہیں اور مدرسے تھے، ان بزرگوں کو تو ہی نے اپنے آغوش تربیت میں پالا تھا، جن کی جوتیوں کی خاک ہماری آنکھوں کا سرمہ ہے، ہائے دہلی یہ تیرا مرثیہ نہیں ہے، قوم کا مرثیہ ہے، اے ہماری شامت اعمال کی برباد شدہ دلی کیا پھر ہم تیرا اگلا جاہ و جلال دیکھ سکتے ہیں، ہم میں وہ فاروقی جلادت خالدی جرأت، قومی اتفاق اسلامی جوش، انسانی ہمدردی اب کہاں آسکتی ہے،

افسوس کہ گلرخان کفن پوش شدند	وز خاطر یک دگر فراموش شدند
آنانکہ بصد زبان سخن می گفتند	آیا چہ شنیدند کہ خاموش شدند

ان میں تہور تھا ہم میں جبن ہے، اون میں جرأت تھی، ہم میں نامردی ہے، ان میں قومی اتفاق

تھا، ہم میں نفاق، وہ پرجوش تھے، ہم خاموش، ان میں انسانی ہمدردی تھی، ہم میں بیدردی، وہ دین و دنیا کو توام سمجھتے تھے، ہم برہم، وہ غیور تھے ہم بےغیرت، ان میں فخر نہ تھا، ہم میں کبر ہے،

فریب حُسن سے گبر و مسلماں کا چلن بگڑا خدا کی یاد بھولا شیخ بت سے برہمن بگڑا

اے ناظرین کیا ایسی قوم جو متصف بصفات بالا ہو، کبھی گر سکتی ہے، اور کیا ایسی قوم جس میں یہ نقائص ہوں، کبھی ابھر سکتی ہے، کیا مردہ بدن میں روح اعادہ کر سکتی ہے، کیوں نہیں کہتے نہیں جب تک ہم بھی دین و دنیا کو تُوام نہ سمجھیں دنیاوی کاموں کے ساتھ دینی اغراض متعلق نہ کریں نہیں کر سکتی، ہاں ہاں کر سکتی ہے، اے اللہ، اے منشی و معید تجھ میں سب قدرت ہے، تو نے عزیر علیہ السلام کی ویران قیامگاہ کو از سر نو سرسبز کر دیا، تو نے عزیرؑ کے مردہ بدن میں روح پھونکی تو نے حمار کے عظام رمیم پر اکسار، حکم کیا، تو نے اصحاب کہف کے صد ہا سال کے مردہ بدنوں میں روح اعادہ فرمائی، تو نے طیور اربعہ کو متفرق الاجزا ہو جانے پر زندہ کر کے اپنی قدرت کا تماشا دکھایا، تو نے مسیح کو بے باپ کے پیدا کیا، تو نے مسیح کو یہ قدرت دی کہ وہ تیرا نام لیکر مردہ کو زندہ کر دیتے تھے، تو نے عرب کی مردہ اور جاہل قوموں کو دین ابراہیمی ملت حنیفیہ سے ہٹ جانے والے لوگوں کو ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے انفاسِ مسیح سے زندہ کر کے تمام عالم سے زیادہ مہذب کر دیا، تو اس جہان فانی کو یکسر نابود کر کے پھر پیدا کرے گا، اَوَلم یرَ الانسان انا خلقناہ من نطفۃ فاذا ھو خصیم مبین و ضرب لنا مثلاً و نسی خلقہ قال من یحیی العظام وھی رمیم قل یحییھا الذی انشأھا اول مرۃ وھو بکل خلق علیم، اولیس الذی خلق السموٰت والارض بقادر علی ان یخلق مثلھم بلی وھو الخلاق العلیم انما امرہ اذا اراد شیئا ان یقول لہ کن فیکون فسبحان الذی بیدہ ملکوت کل شیئ والیہ ترجعون، اے اللہ اے ارحم الراحمین تو اس مردہ قوم کو از سر نو زندہ کر، ان کے دلوں میں اسلامی جوش، قومی اتفاق، انسانی ہمدردی ان کے بازوں میں قوت ان کے اخلاق میں صلاحیت عطا فرما، پھر تیرے نام پر اپنی جانیں فدا کریں، اور ہم اعدا کے یکدگر ہونے کی عوض میں اعضا یکدگر بنجائیں، آمین آمین یا مجیب السائلین،

(باقی)

بابر کی موت

از

جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ایم اے رفیق دارالمصنفین

بابر کی موت کی تفصیل ابوالفضل نے اکبر نامہ میں یہ لکھی ہے :۔

"وآں حضرت جہانبانی را (یعنی ہمایوں کو) بعد از چندگاہ (کہ در ملازمت بودند) بہ سنبل (کہ بجاے گیر ایشاں مقرر بود) رخصت فرمودند، وتاشش ماہ در سنبل کامیاب عیش وعشرت بودند تا آنکہ عارضۂ تپ بر مزاج اعتدال امتزاج ایشاں طاری شد و رفتہ رفتہ بامتداد کشید حضرت گیتی ستانی فردوس مکانی ازیں خبر جانکاہ بے قرار شدہ از فرط عطوفت فرمودند کہ بہ دلی آرند، واز آنجا بکشتی روانہ سازند تا در حضور طبیبان حاذق معالجہ نمایند وجمعے کثیر از اطباے دانا (کہ در پاے تخت حاضر ند) باستصواب افکار در علاج ہمت گماشتند، در اندک فرصتے براہ دریا قدوم گرامی ارزانی داشتند، ہر چند تدبیر ومعالجات بکار بردند و تدبیرات صحیح نمودند، مزاج از انحراف بصحت زائلہ رجوع نہ کرد،

"چوں مرض مزمن گشت، روزے دران طرف آب جون نشستہ باتفاق دانایان عصر اندیشۂ معالجہ می فرمودند، میر ابوالبقار کہ از اعاظم افاضل آں روزگار بود بعرض رسانید کہ دانشمندان پیشیں چناں رسیدہ کہ در امثال ایں امور (کہ اطباے صوری از معالجہ آں عاجز آیند) چارہ کار چنیں دیدہ اند کہ بہتریں اشیا را تصدق نمودہ صحت از درگاہ الٰہی مسئلت نمایند حضرت

گیتی ستانی فرمودند کہ بہترین چیزہا نزدیک ہمایوں منم و بہترین و شریف تر از من ہمایوں چیزے ندارد و من خود را فدای اومی سازم، ایزد جہاں آفریں قبول کناد، خواجہ خلیفہ و دیگر مقربان بساط والا بعرض اشرف رسانیدند کہ ایشاں بعنایت الٰہی صحت عاجل خواہند یافت و در سایہ دولت آں حضرت بعمر طبیعی خواہند پیوست، ایں حرف چرا بزبان اقدس می گزرانند مقصود ازانچہ از بزرگان پیشین نقل افتادہ آنست کہ بہترین مال دنیا تصدق نمایند پس ہماں الماس بے بہا (کہ از مواہب غیبی در جنگ ابراہیم بہ دست افتادہ بود و آں را با یشاں عنایت فرمودہ اند) تصدق باید کرد، فرمودند، مال دنیا چہ وقع دارد، و عوض ہمایوں چوں تواند شد خود را فدائے او می کنم، کہ کار بر و سخت شدہ، و طاقت از آں گذشتہ کہ بے طاقتی او را توانم دید، و ایں ہمہ رنج او را توانم تاب آورد، آں گاہ بخلوت مناجات در آمدہ شغل خاصے (کہ ایں طبقہ قدسیہ رامی باشد) بجائے آوردہ سہ بار برگرد حضرت جہانبانی جنت آشیانی گشتند چوں دعوت ایشاں بعز اجابت پیوستہ بود، اثر گرانی در خود یافتہ فرمودند، برداشتیم برداشتیم فی الفور حرارت غریبہ عارض بدن آنحضرت شد، و در عنصر حضرت جہانبانی خفتے طاری گشت چنانچہ در اندک فرصتے صحت کامل روی نمود، و ذات مجلی صفات حضرت گیتی ستانی فردوس مکانی زماں زماں گراں تر می شد تا بہ حدے رسید، کہ اختلال در مزاج تزاید و تضاعف گرفت، و امارات رحلت و انتقال از وجنات احوال ہویدا گشت، تا آں کہ بادل بیدار و باطن حقیقت بیں ارکان دولت و اعیان مملکت را احضار فرمودہ دست بیعت خلافت را بر دست ہمایونی نہادہ بجانشینی و ولی عہدی خود نصب فرمودند، و بر تخت خلافت جلوس دادہ خود در پایہ سریر خلافت مصیر صاحب فراش گشتند.......................

.... و بتاریخ ششم جمادی الاول ۹۳۷ھ نہصد و سی و ہفت در چہار باغ

(کہ بر لب آب جون در دار الخلافۃ آگرہ سرسبز کردۂ آن ہمو ر اقبال بود) این عالم بے وفا را بدرود کردند.........." [۵]

مذکورۂ بالا روایت کو ایشیاٹک سوسائٹی جنرل اور کلکتہ ریویو کے ایک مقالہ نگار نے ابوالفضل کا محض ذہنی اختراع قرار دیا ہے، چنانچہ اس کو جھوٹ ثابت کرنے کے لئے اوس نے جو دلیلیں قائم کی ہیں وہ بھی ملاحظہ ہوں،

"ہمایوں نومبر ۱۵۲۹ء میں کالنجر بھیجدیا گیا، جہاں وہ چھ مہینے رہا، اس کے فوراً ہی بعد شاید اپریل ۱۵۳۰ء میں وہ بیمار پڑا، جب اس کی علالت تشویشناک ہوگئی، تو وہ دریا کی راہ سے آگرہ لایا گیا، یہاں اطبار نے ہر طرح کا علاج کیا، لیکن بے سود ثابت ہوا، ہمایوں کی حالت نازک ہوگئی، تو بابر گھبرایا، شہزادہ کی صحت کے لئے دوا کے علاوہ اور بھی تدبیریں سوچی گئیں، میر ابو البقا نے جو اس عہد کے برگزیدہ ولی تھے، ہمایون کے نام سے ایک قیمتی چیز صدقہ کرنے کا مشورہ دیا، کہ شاید قسمت سے ہمایوں شفا پا جائے، کسی نے ڈرتے ڈرتے کوہ نور جسکی قیمت دنیا کے نصف روزانہ اخراجات کے برابر تھی، خدا کی راہ میں دینے کے لئے کہا، لیکن بابر کی رومان پسند طبیعت نے اس کو پسند نہیں کیا، اس نے اس چیز کو قربان کرنا چاہا، جو اس کو سب سے زیادہ محبوب تھی، یعنی اپنی جان کو، اس نے سوچا کہ جان کے عوض میں جان ہی دے کر ہمایوں کو موت کے پنجے سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے، بعض درباریوں نے بیٹے کے ساتھ اتنی شدید محبت اور شفقت کا اظہار کرنے سے روکنا چاہا، بابر ابھی کل ۴۷ سال کا تھا، اس نے ہندوستان میں صرف چار سال تک بادشاہت کی تھی، مغلوں کی حکومت گو وسیع ہو گئی تھی، لیکن ابھی مستحکم نہیں ہونے پائی تھی، اس کی موت سے مغلوں کے لئے مختلف مسائل کے پیدا ہو جانے کا خطرہ تھا، ہمایوں بابر کا کوئی اکلوتا لڑکا نہ تھا"

[۵] ص ۱۱۶-۱۱۷-۱۱۸،

اس کے کئی لڑکے تھے جو ہمایون کی طرح اس کے جانشین ہو سکتے تھے، اس کے علاوہ کیا بابر کو امید تھی کہ اسکی دعا واقعی قبول ہو جائے گی؟ یہ تو ایک معجزہ کے ظہور ہونے کی امید کرنا تھا، گو دعا مانگنے کے معنی معجزے کا ظہور ہی ہونا ہے، لیکن بابر میں کوئی معجزے کی قوت تو تھی نہیں، اس سے قبل وہ کنواہا کی جنگ کے موقع پر اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے تائید الٰہی کا خواہاں ہوا تھا، لیکن ہمایوں کے لئے جان دینا تو محض اسکی رومان پسند فطرت کا اقتضا تھا، اپنی ایک علالت کے موقع پر بھی اس نے قسم کھالی تھی، کہ شعرو شاعری کی آلودگیوں کو ترک کر دیگا، اور اس کے بدلے مذہبی رموز و نکات میں اپنے کو مشغول رکھے گا، ممکن ہے کہ بابر کو یقین ہو، کہ ایک باپ کی شدید محبت کے اظہار سے خدا اس کے لڑکے کی جان بچالے گا، یا ممکن ہے، کہ ہمایون کی زندگی سے مایوس ہو کر اس نے محبت میں ایسا کر لیا ہو، لیکن یہ کہنا مشکل ہے، کہ اس کو سچ مچ یقین تھا، کہ قسام ازل اس کی بات کو منظور کر ہی لیگا، اور وہ محض ہمایوں کی خاطر قبل از وقت مر گیا، گلبدن بیگم کے بیان سے تو یہ مشکوک ہے کہ بابر کو واقعی اس قسم کا کوئی یقین پیدا ہو گیا تھا،

بابر نے محض جذبات سے متاثر ہو کر بیٹے کی محبت میں آسنا رومانی طریقہ اختیار کیا، ایک دن قبل وہ علیؓ سے ہمایوں کی جان بخشی کا خواہاں ہوا تھا، اور اب وہ ہمایوں کے گرد گھوما، اور دعا کی، کہ "اے خدا! اگر جان کے عوض میں جان بدلی جا سکتی ہے، تو میں (بابر) اپنی زندگی اور عمر کے بقیہ سال ہمایوں کو دیتا ہوں"۔

یہ کہنے کے بعد بابر فوراً ہی نہیں، بلکہ اس روز کے کسی وقت میں ہمایوں اس لائق ہو گیا، کہ غسل صحت کرے، اور زنانخانے سے باہر آجائے، لیکن بابر کی مسلسل دعا، اور جذباتی ہیجان جو اس پر گذر . . اس کے لئے سخت ثابت ہوا، ، وہ علیل ہو گیا، اور اسی

حرم کے اندر لیجایا گیا،

بابر کی یہ علالت سخت نہیں رہی، وہ جلد اچھا گیا، اور کام بھی کرنے لگا، اسکی علالت سے اتنی کم تشویش باقی رہ گئی، کہ ہمایوں سنبل چلا گیا،

لیکن ہمایوں جب سنبل میں تھا، تو بابر جولائی ۱۵۳۰ء میں پھر علیل ہو گیا، اس کا مرض بڑھا تو بھی ہمایوں کو اس کی علالت سے بے خبر رکھا گیا، امیر نظام الدین خلیفہ ہمایوں کی جانشینی نہیں چاہتا تھا، .... اسلئے موقع پاکر مہدی خواجہ کو بادشاہ بنا دیا، ......

ہمایوں جلد از جلد سنبل سے آگرہ پہنچا باپ کی حالت دیکھ کر بہت متعجب ہوا، اور چلایا "میں نے تو ان کو اچھا چھوڑا تھا، پھر یکایک یہ کیا ہوا" اس کے بعد بابر کچھ اچھا ہو گیا، چنانچہ اس نے دو شہزادیوں کی شادی کرنے کا حکم دیا، لیکن بابر کی علالت پھر تشویشناک ہو گئی، ہمایوں نے ایک طبی مجلس منعقد کی اور باپ کی بڑھتی ہوئی تکلیف کو دور کرنا چاہا، مشورے ہوتے رہے، آخر میں اطبا نے یہ کہا کہ بابر کا مرض اس زہر کا نتیجہ ہے، جو چند سال قبل ابراہیم لودی کی ماں نے اس کو دیا تھا، چنانچہ طبیبوں نے اس مرض کے علاج سے اپنی مجبوری ظاہر کی، بابر نے ہمایوں کو اپنا جانشین مقرر کیا، اور تین دن بعد بروز دوشنبہ تاریخ ۲۶ر دسمبر ۱۵۳۰ء کو انتقال کر گیا، ....

مندرجۂ بالا واقعات کی سادہ تفصیل سے یہ بات کہیں سے ظاہر نہیں ہوتی ہے، کہ ہمایوں کے بستر علالت کے قریب کوئی معجزہ ظاہر ہوا، بابر کو یہ امید بالکل نہیں تھی، کہ اسکی دعا مقبول ہو گی، گلبدن نے تو محض اسکو مشروط لکھا ہے، اگرچہ بابر اسی روز علیل ہوا، اور محل کے اندر لیجایا گیا، لیکن وہ پھر بہت جلد اچھا ہو گیا، اگر بابر علیل رہتا تو ہمایوں آگرہ چھوڑ کر سنبل نہ جاتا ہی نہیں، بلکہ ہمایوں جب آگرہ واپس آیا، تو اس نے شکایت کی، کہ اسکی غیر موجودگی

میں بابر پھر کیسے علیل ہوا، گلبدن بیگم کے بیان سے ظاہر ہے، کہ ہمایوں کی واپسی کے بعد بابر ایک ہفتہ سے زیادہ زندہ نہیں رہا، پھر امیر خلیفہ ایک دوسرے شخص کی تخت نشینی کے لئے کوشاں تھا، تو یہ بات قابلِ قبول نہیں معلوم ہوتی ہے، کہ ہمایوں کی ماں اس کو بابر کی علالت سے بے خبر رکھتی خصوصاً جب یہ نازک ہو رہی تھی، لہذا یہ ظاہر ہے کہ اس کی علالت ہمایوں کی آمد سے صرف دس روز قبل تشویشناک ہوئی، اور اس کی سخت علالت دسمبر کے دوسرے ہفتہ سے شروع ہوئی، یہ بات تاریخ خاندان تیموریہ[1] سے بھی پایۂ ثبوت کو پہونچتی ہے جس میں بابر کی علالت کی تاریخ رجب لکھی ہوئی ہے (رجب میں تو بابر کے مرے دو مہینے ہو چکے تھے، رجب غلطی سے ربیع الثانی کے بجائے لکھ گیا ہے،) چنانچہ اس لحاظ سے بابر کی سخت علالت کی تاریخ یا تو نومبر کا آخر یا دسمبر کا آغاز ہے،

احمد یادگار کی تاریخ سے واضح ہے، کہ بابر کی علالت ہمایوں کی صحت یابی کے فوراً ہی بعد نہیں، بلکہ ہمایوں کے سنبل جانے کے دو تین مہینے کے بعد شروع ہوئی گلبدن بیگم کا بیان ہے، کہ بابر دو تین مہینے تک بیمار رہا، تو اس لحاظ سے وہ اکتوبر ۱۵۳۰ء میں علیل ہوا،

پھر بابر کے اطباء نے اس کی علالت کا سلسلہ اس کے ایثار اور قربانی سے ظاہر نہیں کیا، وہ بابر کی طرح اس کی بیماری کو خدا کی خوشنودی اور رضامندی سے تعبیر کر سکتے تھے، لیکن انھوں نے ہمایوں سے یہ کہا کہ بابر کا مرض زہر کا نتیجہ ہے،

مرزا محمد حیدر، عبد القادر بدایونی، نظام الدین احمد اور فرشتہ اس باب میں بالکل خاموش ہیں، ان کی خاموشی معنی خیز ہے،

[1] شاید تاریخ سلاطین افغانان مراد ہے،

اس لئے ابوالفضل کا بیان کہ بابر نے ہمایوں کی خاطر جان دی محض اس کا ذہنی اختراع ہے جسکو یقین کرنے کے لئے کوئی وجہ نہیں،.......[1]

فاضل مقالہ نگار نے مذکورۂ بالا نتیجہ دس سال کے غور و فکر کے بعد نکالا ہے' اس کا پہلا مضمون ایشیاٹک جرنل میں ۱۹۲۶ء میں نکلا تھا اسکو از سر نو ترتیب دے کر اور معلومات میں مزید اضافہ کرکے ستمبر ۱۹۳۶ء کے کلکتہ ریویو میں شائع کیا ہے، سوال یہ ہے کہ بابر محض فطری موت مرا، یا اپنی روحانیت کی قوت سے یا اپنے محبوب بیٹے کی شفقت میں قربان ہوکر مرا تو اس کے واضح اور نہ واضح ہونے سے تیموریوں کی تاریخ کے واقعات کی ترتیب میں کون سی کمی یا زیادتی ہوگئی، یا ان کی تہذیب اور معاشرت میں کس چیز کا اضافہ یا فقدان ہوگیا، جس کے لئے تحقیق و تدقیق میں عمر کی ایک کافی مدت خرچ کیجائے البتہ ایک باپ بیٹے کے قلبی تعلقات کے پر کیف جذبہ میں انتشار پیدا کرنا مقصود ہو تو پھر ہر قسم کی ذہنی کاوش جائز ہوسکتی ہے،

مضمون ہذا کے پہلے حصہ میں مضمون نگار کو بابر کی علالت اور موت کے واقعات کی ترتیب میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، اسی لئے کچھ ژولیدہ بیانی آگئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ موصوف کی معلومات کا ماخذ گلبدن بیگم کا ہمایوں نامہ ہے، لیکن اس میں کچھ تفصیلات ایسی ہیں، جن کے اقرار یا انکار سے اس کے مقصد کی کوئی تکمیل نہیں ہوتی ہے، پھر بھی وہ اپنی مسرت کا اظہار کرتا ہے کہ اسی ہمایوں نامہ کے ذریعہ سے بابر کی موت کی مشہور روایت کی تکذیب ہوجاتی ہے، اب ہمایوں نامہ کی عبارت ملاحظہ ہو:۔

"دریں اثنا، عرضہ داشت مولانا محمد فرغولی از دہلی آمد، نوشتہ بود کہ ہمایوں میرزا بیمار اند وحالِ عجبی دارند بشنیدن این خبر حضرت بیگم زود زود متوجہ دہلی می باید شوند کہ مرزا بسیار

[1] کلکتہ ریویو ستمبر ۱۹۳۶ء

بے طاقتی می کند، بمجرد شنیدن این خبر حضرت آکام بے طاقتی کردہ، مانند تشنہ کہ مجور آب باشد بجانب دہلی متوجہ شدند، در متھرا رسیدند، چنانچہ شنیدہ بودند، ازاں دہ چند مضعوف و مجہول بچشم جہاں بین خویش دیدند، وازآنجا ہردو ــ مادر و پسر ــ مانند عیسیٰ و مریم متوجہ آگرہ شدند.........

وقتی کہ ایشاں بیمار بودند حضرت روندہ حضرت مرتضی علی کرم اللہ وجہہ نگاہ داشتند و آن روندہ از روز چہار شنبہ نگاہ می دارند، ایشان از اضطراب و بے طاقتی از روز سہ شنبہ نگاہ داشتند، ہوا بغایت گرم بود، دل و جگر ایشان تفید، و در روندہ مذکور دعا خواستند کہ خدایا ــ اگر بعوض جان جان مبدل شود، من کہ بابرام، عمر و جان خود را بہمایون بخشیدم و در ہمان روز حضرت فردوس مکانی را تشویش شد و ہمایون بادشاہ بر سر خود آب ریختند و بیرون آمد بار دادند، و حضرت بادشاہ بابام را زجہت تشویش درون بردند"[1]

ہمایوں نامہ کی اس عبارت اور اکبر نامہ کے بیان میں کچھ معنوی حیثیت سے زیادہ اختلاف نہین، فاضل مضمون نگار کو بھی اپنے مضمون کی ابتدا مین اس سے انکار نہیں ہے، کہ بابر ہمایوں کی علالت سے متاثر ہو کر اس کے گرد گھوما خدا کی بارگاہ میں گڑگڑایا، اور پھر اسی روز بیمار ہوا، مگر مقالہ نگار نے اپنے مضمون کے آخری حصہ میں ہمایوں نامہ کو چھوڑ کر ایک دوسری تاریخ کا سہارا لیا ہے، اور وہ رقمطراز ہین، کہ بابر کی علالت ہمایون کی صحت یابی کے فوراً ہی بعد نہیں بلکہ ہمایوں کے سنبھل جانے کے دو تین مہینے کے بعد شروع ہوئی، اس کے لئے ان کا ماخذ احمد یادگار کی تاریخ سلاطین افغانان ہے، اب اسکی عبارت ملاحظہ ہو:۔

"بعد ازان (یعنی رانا سانگا سے لڑائی کے بعد) حضرت گیتی ستانی دو ماہ در نواح دہلی

[1] ہمایون نامہ از گلبدن بیگم مرتبہ مسز بیورج ص۲۳،

بسیر و شکار بسر بردہ باگرہ متوجہ شد و محمد ہمایون شاہزادہ را با لشکر گران در صوبہ سنبل فرستاد

ولی عہد کرد و حقیقت آن بود کہ شبے در زمستان حضرت پیالہ نوش جان کردہ بودند، بواسطہ

کارے محمد ہمایوں میرزا طلبید، چوں نونہال شاہی بحضور آمد گیتی ستانی چوں مست بودند

سر بہ بالین نہادہ در خواب شدند، شاہزادہ ہمچناں دست بستہ ایستادہ ماند، چوں نیم شب از

خواب برآمد، ایشان را ایستادہ دیدند، فرمودند کہ تو کے آمدی ایشان عرض داشتند کہ

آں وقت کہ حضرت یاد فرمودہ بودند، بادشاہ را ایں ادب بسیار رضامند شدند فرمودند کہ اگر خدائے

تعالیٰ ترا تخت و افسر نصیب کند، برادران را مکشی، اغماض نظر فرمائی، شاہزادہ سر بر زمیں نہاد

و قبول نمود،..........

الغرض میرزا مذکور با لشکر گران در صوبہ سنبل کہ ماورائے مواس بود فرستادند، بعد

دو سہ ماہ حضرت گیتی ستانی را تکسری در بدن ایشاں ظاہر شد دراں باغ کہ بر لب دریاست

بردند، امیر نظام الدین بغدادی ایشاں قیام می نمودہ کاروبار پادشاہی نیز رواں می کردند،

چوں تکسر روز بروز زیادت می شد، در دل آورد کہ حالات مرض جنت آشیانی باین نمط

رسید فکری باید کرد کہ ایں ملک را صاحبقران ماند و بیگانہ انتقال نماید، چوں بیماری حضرت

کشورستانی روز بروز تزاید شد، چنانکہ بتقضائے اللہ سبحانہ در سنہ ۹۳۷ از فانی بہ

بہشت جاودانی خرامید، ازیں گلخن خار و ار محنت بسوئی گلزار جنت رخت کشید.......

بتاریخ ۹ ذی الحجہ سنہ شاہ کشورستانی از جہاں فانی رفت ....[1]" ٭

اس عبارت میں شروع سے آخر تک جو غلط بیانیاں ہیں، وہ ایک حقیقت ہیں مورخ

پر ظاہر ہیں، الیٹ نے اس کتاب اور مذکورۂ بالا عبارت پر خصوصاً جو اپنی رائے لکھی ہے وہ لائق

[1] تاریخ سلاطین افاغنہ قلمی نسخہ بوہار لائبریری، کلکتہ،

توجہ ہے:۔

"احمد یادگار کو عجیب و غریب اور مضحکہ خیز قصے لکھنے میں بڑی دلچسپی ہوتی ہے لیکن وہ تاریخ (سنین) لکھنے میں کم توجہ کرتا ہے، اس نے بہت ہی کم سنین لکھے ہیں، اور ہمایوں کی موت کے مستند واقعہ کے بیان میں تو وہ بالکل غلط ہے"۔[1]

احمد یادگار تیموریوں کے دشمن پٹھانوں کا مورخ ہے، داؤد خاں کا درباری مورخ تھا، اس نے اپنی کتاب ۱۰۰۰ھ کے بعد یعنی بابر کی وفات کے کم از کم ۶۳ برس بعد لکھی ہے، اب ظاہر ہے کہ احمد یادگار خصوصاً گلبدن بیگم (بابر کی دختر اور ہمایوں کی بہن) کی موجودگی میں زیادہ مستند قرار نہیں دیا جاسکتا ہے،

مقالہ نگار نے گلبدن بیگم کی روایت کو کہیں جھوٹی دکھانے کی کوشش نہیں کی ہے، اس روایت سے اُن کو اختلاف اگر ہے، تو یہ کہ بابر نے جو کچھ کیا کرامت دکھانے کی خاطر نہیں کیا، بلکہ محض ہیجانی کیفیت میں ایک رومانی طریقہ اختیار کیا، اور پھر یہ کہ وہ اس روز علیل ضرور رہا، لیکن پھر اچھا ہوا اور پھر بیمار پڑکر مرگیا،

تو یہ اکبر نامہ کی عبارت سے کب ظاہر ہے کہ بابر سے معجزہ صادر ہوا، بابر کوئی پیغمبر کوئی ولی یا کوئی خدا رسیدہ بزرگ نہ تھا، جو اس سے کرامت یا معجزہ ظاہر ہوتا، بیٹے کی محبت میں سرشار ہوکر اور اس کی تشویشناک علالت سے گھبرا کر اس نے خدائے قدوس کی بارگاہ میں دعائیں کیں اور اپنی محبوب ترین اولاد کے لئے بطور صدقہ بارگاہ ایزدی میں اپنی جان پیش کی، اب اس کو نفسیاتی قوت تاثیر سمجھیے

[1] الیٹ جلد ۵، ص ۲ سے فاضل مضمون نگار کو اس میں شک ہے کہ ہمایوں بابر کا سب سے زیادہ چہیتا لڑکا تھا، اسی لئے وہ کہتا ہے کہ اس کے کئی لڑکے تھے، جو ہمایوں کی طرح اس کے جانشین ہو سکتے تھے لیکن ہمایوں نامہ کی عبارت ملاحظہ ہو:۔

یا ایک مضطرب دل کی سچی دعا، کہ ادھر منہ سے نکلی، اور ادھر قبول ہوئی، اسی وقت وہ بیمار پڑا، اور ہمایوں اچھا ہونے لگا، یہانتک کہ وہ بالکل تندرست ہوگیا، اور بابر نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا،

نفسیاتی قوت تاثیر جو شدتِ یقین کا نتیجہ ہے، آج مسمرازم اور روحانیت کی تاثیر کی عینی شہادت بن گئی ہے، واقعہ واقعہ ہے، اب مادہ پرستی کے دور میں جس کا جی چاہے، جس تاویل و تشریح سے اپنی تسکین کرلے،

اب رہا یہ سوال کہ بابر اس دعا کے فوراً ہی بعد اس دنیا سے چل بسا یا پھر صحتیاب ہوکر مرا، اکبر نامہ کی عبارت سے یہ ظاہر نہیں کہ بابر دعا مانگنے کے ساتھ ہی مرگیا، اگر ایسا ہوتا، تو قدرتِ خداوندی کا ایک غیر معمولی مظاہرہ ہوتا، جس کو ہم بابر کی کرامت کہہ سکتے تھے، ابوالفضل کے بیان سے تو صاف واضح ہے، کہ وہ کچھ مدت تک بیمار رہا، لیکن اس کی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی، اکبر نامہ کی عبارت پھر ملاحظہ ہو،

"و ذات معلّی صفات حضرت گیتی ستانی فردوس مکانی زمان گراں ترمی شد تا بہ حدے رسید کہ اختلال در مزاج تزاید و تضاعف گرفت، و امارات رحلت و انتقال از وجنات

(بقیہ حاشیہ صفہ) "وچوں حضرت (یعنی بابر) آمدند و دریافتند، بمجرد دیدن، آن چہرۂ نور افشاں در کلفت ورقت شد، و ایشاں بیشتر از بیشتر اظہار بے دلی گرفتند"

دریں اثنا حضرت اکام گفتند کہ شما از فرزند من غافلید و بادشاہ اید، چہ غم دارید و فرزندان دیگر نیز دارید، مراغم است کہ فرزند یگانہ دارم، حضرت جواب دادند کہ ما ہم اگرچہ فرزندان دیگر دارم، اما ہیچ فرزندے برابر ہمایون تو دوست نمی دارم، از برائے آن کہ سلطنت و بادشاہی و دنیائے روشن (از برائے آن کہ سلطنت نادرۂ دوران کامگار برخوردار فرزند دلبند ہمایون می خواہم — نہ برائے دیگراں"

حال ہویدا گشت ......"

بابر کی یہ علالت کئی مہینے تک جاری رہی، مگر ہمارے فاضل مضمون نگار نے یہ لکھا ہے، کہ بابر کی یہ علالت سخت نہیں رہی، وہ جلد اچھا ہوگیا، اور کام بھی کرنے لگا، اور اسکی علالت سے اتنی کم تشویش باقی رہ گئی، کہ ہمایوں سنبل چلا گیا، لیکن یہ کسی تاریخ سے پتہ نہیں چلتا، کہ بابر اس علالت سے شفایاب ہوگیا، مقالہ نگار نے محض قیاس سے کام لیا ہے کہ اگر بابر کی علالت تشویشناک ہوتی، تو اس کو چھوڑ کر ہمایوں سنبل نہیں جاتا، اور اپنے قیاس کی بنیاد کو اس سے مستحکم بنانے کی کوشش کی ہے، کہ جب ہمایوں بابر کے دم واپسیں کی خبر پاکر آگرہ لوٹا، تو اس کو دیکھ کر چلایا،

من ایشاں را تندرست گذاشتہ رفتہ بودم، یکبارگی چہ شدہ"[1]،

ہمایوں باپ کو چھوڑ کر سنبل ضرور گیا، مگر یہ بالکل بے جا قیاس ہی ہے، کہ بابر اچھا ہوگیا، تو ہمایوں گیا، کیونکہ ہمایوں نامہ میں صاف درج ہے،

"قریب دو سہ ماہ صاحب فراش بودند، و میرزا ہمایوں بجانب کالنجر رفتہ بود"[2]

ہمایوں قریب تین مہینے باپ کے بستر علالت کے پاس رہا، اس سے زیادہ رہنا ملک گیری اور حکمرانی کے سراسر منافی تھا، ایک ایسے ملک میں جو ابھی ابھی فتح ہوا تھا، اور جس کے اطراف و جوانب دشمنوں سے غیر مامون تھے، ایک مدت تک باپ کا بیمار اور بیٹے کا تیماردار بنا رہنا کہاں تک عقل و ہوشمندی کے مطابق ہوتا، چنانچہ بابر نے خود ہمایوں کو کالنجر بھیجدیا، فرشتہ میں ہے،

"تا آن کہ از حیات مایوس شدہ، شہزادہ محمد ہمایوں را کہ بہ تسخیر قلعہ کالنجر تعین کردہ بود طلب نمودہ قائم مقام خود گردانید"[3]

ہمایوں بابر کو چھوڑ کر سنبل گیا، تو اس کی حالت بہت زیادہ تشویشناک نہ تھی لیکن واپس آیا، تو اس

---

[1] ہمایوں نامہ صفحہ ۲۲، [2] ایضاً، [3] فرشتہ، صفحہ ۲۱۱، نولکشور پریس،

کے شفیق اور محبوب باپ کو سب دنے کے لئے تیار تھے، اضطراب اور بے چینی میں فطری طور پر ایسے موقع پر جو کہنا چاہئیے تھا، وہی اس نے کہا،

مضمون نگار کا خیال ہے کہ اس نازک حالت کے بعد بھی بابر اچھا ہو گیا، چنانچہ اس نے اپنی دو لڑکیوں کی شادی خانہ آبادی کے رسوم بھی ادا کئے، مگر گلبدن بیگم کے ہمایوں نامہ کی اصل عبارت یہ ہے:-

"در حین بیماری حکم کردند یا کام کہ گلرنگ و گلچہرہ بیگم را کدخدا باید کرد"۔[1]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ بابر نے اپنی عین علالت کے زمانہ میں شہزادیوں کی شادی انجام دی، وہ جانتا تھا کہ وہ چند دنوں کا مہمان ہے، اس لئے اپنے لخت ہائے جگر کی تقریب شادی اپنی آنکھوں سے انجام ہوتی ہوئی دیکھکر شاید مطمئن مرنا چاہتا تھا، ورنہ بسترِ علالت پر دراز ہو کر لڑکیوں کی شادی کرنے کے کیا معنی تھے؟

مضمون نگار نے ایک سوال یہ پیدا کیا ہے، کہ امیر خلیفہ ہمایوں کے خلاف ایک دوسرے شخص کو تخت بابری کا وارث بنانے کی کوشش کر رہا تھا، تو ہمایوں کی ماں نے اس کو سنبل سے کیوں نہیں بلایا، خصوصاً جب بابر کی حالت نازک ہو رہی تھی، امیر خلیفہ کی سازش باضابطہ عمل میں نہیں آئی، اسکا خیال تھا کہ خواجہ مہدی کو اپنا آلۂ کار بنائے، مگر یہ محض خیال ہی رہا، اور وہ بہت جلد اس سے باز آ گیا، اسی اثناء میں بابر کی حالت نازک ہو رہی تھی، چنانچہ (جیسا کہ طبقاتِ اکبری میں لکھا ہے) امیر خلیفہ نے خود

"بہ سرعت تمام کس بطلب محمد ہمایوں میرزا فرستاد"۔[2]

لیکن گلبدن بیگم کے بیان کے مطابق خود بابر نے ہمایوں کو بلا بھیجا،

---

[1] ہمایوں نامہ ص ۲۴ [2] تفصیل کے لئے دیکھو طبقات اکبری جلد دوم ص ۲۰، ۲۹، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی،

"میرزا ہمایون بجانب کالنجر رفتہ بودند، چون تشویش حضرت بادشاہ بیشتر شد طلب حضرت ہمایون بادشاہ کس فرستادند"۔

ہمایوں کو اس موقع پر آناچاہئے تھا، ورنہ یہ سوال ہی باقی نہیں رہتا کہ اس کی ماں نے کیوں نہیں بلایا؟

اب ہمایوں نامہ کے اس حصہ کی عبارت پر عمیق نظر ڈالنے کی کوشش کیجئے، جس کی بنا پر ہمارے فاضل مضمون نگار کا خیال ہے، کہ وہ ایک ایسی حقیقت کا انکشاف کر رہا ہے، جس سے صدیوں کی مسلّم روایت محض کذب و افترا کی داستان بن جاتی ہے، اور اس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے، کہ بابر اس زہر کے اثر سے مرا جو ابراہیم لودی کی ماں نے اس کو دیا تھا، ہمایوں سنبل سے واپس آتا ہے، باپ کی نازک حالت دیکھ کر غیر معمولی طور پر متاثر ہو جاتا ہے، خدمت گاروں سے علالت کے متعلق استفسارات کرتا ہے، وہ خاموش رہتے ہیں، تو طبیبوں کو بلاتا ہے ان سے مرض کی شدت اور نوعیت کے بارے میں پوچھتا ہے، لیکن وہ کچھ نہیں بتاتے ہیں،

"حکما و اطبا چیز ہا گفتند"[1]

بابر کی علالت اور بھی زیادہ نازک ہو جاتی ہے، ہمایوں بے چین اور پریشان ہو کر پھر طبیبوں کو اپنے حضور میں طلب کرتا ہے، لیکن وہ پھر کوئی معقول جواب دیکر اس کو مطمئن نہیں کرتے ہیں، :۔

"اطبا و حکما را طلبیدہ گفتند نیک ملاحظہ کردہ، علاج تشویش حضرت نمایند اطبا و حکما رجمع شدہ گفتند کہ کم طالع مایاں است کہ داروئی کارگر نمی شود، امید واریم

---

[1] مسز بیورج نے اس جملہ کا جو انگریزی ترجمہ کیا ہے، وہ ملاحظہ ہو:۔

They said this and that in reply.

از حضرت حق سبحانہ کہ از خزانۂ غیب کہ شفائے عاجل عطا کند"

ایک بار پھر ہمایون کا اضطراب بڑھتا ہے، وہ پھر طبیبوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس بار وہ ہمایوں سے کہتے ہیں کہ یہ علالت اس زہر کا نتیجہ ہے، جو ابراہیم کی ماں نے دیا تھا،

"اطبا بعرض رسانیدند کہ علامت ہمان زہر است کہ والدۂ سلطان ابراہیم دادہ بود"۔

گلبدن بیگم نے طبیبوں کی رائے کا محض حوالہ دیا ہے، اور اس زہر دینے کے واقعہ کی طرف اشارہ کرکے وہ دوسرے واقعات کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے، اگر اس رائے میں کچھ اصلیت ہوتی، تو بابر کے مرض کی تشخیص میں طبیبوں کی بیچارگی اور عاجزی کا اظہار بار بار نہیں کرتی، اور اگر بابر کی موت اسی زہر کے اثر سے ہوئی، تو اس کو اس واقعہ کو درج کرنے کی کیا ضرورت تھی جس سے بابر کی دعا اور ایثار سے حسن عقیدت خواہ مخواہ پیدا ہو جاتا ہے، اور پھر چار برس کے بعد[1] اس زہر کا مہلک ہونا، اور اس کی تشخیص بابر کی کئی مہینوں کی علالت کے درمیان میں نہیں، بلکہ ٹھیک موت کے قبل کرنا، ایک زود اعتقاد عورت کی دلچسپی کا تو سامان ہو سکتا ہے، مگر ایک مورخ کا اس کو تسلیم کر لینا اس کی فرض شناسی اور بصیرت کی دلیل نہیں بن سکتا، یہ واقعہ تو ایسا تھا کہ افغانوں اور لودیوں کے خلاف نفرت اور اشتعال پیدا کرنے کی خاطر تیموری دربار اور اس عہد کا ہر مورخ اس کی طرف اشارہ کرتا، مگر گلبدن بیگم کے ایک خفیف سے اشارہ کے علاوہ کسی اور تاریخ مین اس کا ذکر مطلق نہیں پایا جاتا ہے،

شکر ہے کہ ہمارے مضمون نگار کی دور رس نگاہیں اس حد تک نہیں پہنچیں، ورنہ ایک یورپین مورخ نے تو بڑی باریک بینی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بابر کی موت اس زہر سے ہوئی جو ہمایون نے خود اسکو دیا، اسکی چند سطرین ملاحظہ ہون،

---

[1] بابر کو زہر ماہ صفر ۹۳۳ھ میں دیا گیا،

"بابر کو زہر دیا گیا، گلبدن بیگم صاف صاف لکھتی ہے، کہ یہ رائے ان اطبار کی تھی، جو بادشاہ کے پاس آخر وقت میں موجود رہے، ایک آدمی اس فعل سے مستفید ہونا چاہتا تھا، اور صرف ایک ہی آدمی احتیاط سے اس جرم کے ارتکاب کا ذریعہ رکھتا تھا، وہ ہمایوں تھا، اس کی حمایت میں بہت کچھ باتیں بنائی گئی ہیں، جس سے اسکے متعلق شک اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے، اسی لئے بیٹے کی معصومیت کو اتنی بلند آہنگی سے بار بار دہرانے کی ضرورت ہے،[۱]

مذکورۂ بالا بیان اور استدلال کی تردید کی کوشش کرنا محض وقت اور محنت کو ضائع کرنا ہوگا اب ایک سوال اور رہ جاتا ہے، کہ بابر کی دعا اور اس کے معجزنما اثرات کا ذکر مرزا حیدر دوغلت، ملا عبد القادر بدایونی اور فرشتہ کی تاریخوں میں کیوں نہیں ہے، ؟ میرزا حیدر کی تاریخ رشیدی دراصل وسط ایشیا کے مغلوں کی تاریخ ہے، چنانچہ وہ انہی کی تاریخ تفصیل کیساتھ لکھتا ہے، بابر کے حالات ضمنی طور سے تحریر کرتا ہے، حالانکہ وہ اس کا خالہ زاد بھائی تھا، بابر اور ہمایوں کی معیت میں ہندوستان بھی آیا، اور ان کی جانب سے ہندوستان ہی میں سرکاری عہدوں پر ممتاز رہا، لیکن پھر بھی بابر اور ہمایوں کے حالات لکھنے میں ہر جگہ بخل اور اختصار سے کام لیتا ہے، بابر نے ہندوستان میں جو اہم کارنامے انجام دئیے، ان کو چند سطور میں لکھ کر ختم کر دیتا ہے، ملاحظہ ہو

"بابر بادشاہ تمام قلمرو سلطان اسکندر افغان را متصرف شد، ورانا سنگھ راجہ ہندو بود با چند لک لشکر آمد و مصاف کرد، پادشاہ او را شکست داد، و در منا شیر خود غازی نوشت و بعد ازاں بطرف چتور رفت، آنجا غزوات تنگرف و فتح ہائے ژرف کردہ مراجعت نمود، و دوائی ضبط تمام ہندوستان داشت،

---

[۱] فرنینڈ گری نارڈ، بابر فرسٹ آف دی مغلس ص۲۳۲،

"در شہور سنہ سبع و ثلاثین و تسعمائۃ، چند مرض مزمن بر مزاج شریف مستولی شد اطبا ہر چند انکہ سعی نمودند مفید نیفتاد ......

چوں مشرف بموت شد ہمایوں مرزا کہ از بدخشاں طلب داشتہ وتمام امرا، وخلق جہان را بوے سپرد و جہان را بجہان آفرین داد، انار اللہ برہانہ و نور مضجعہ"[1]

ظاہر ہے کہ ان چند سطور مین بابر کی زندگی اور موت کی تفصیلات تلاش کرنا، اور ان کو نہ پاکر محض قیاس سے کوئی ایک رائے قائم کرلینا، ایک فرض شناس اور ذمہ دار مورخ کا کام نہیں ہوسکتا،

ملا عبدالقادر بدایونی نے بابر کے پورے حالات صرف تین ورق میں لکھے ہیں، انکے یہان تو بہت سی اہم تفصیلات اختصار کے خیال سے نظر انداز کردیگئی ہیں، طبقات اکبری میں منتخب التواریخ سے زیادہ تفصیلات ضرور ہین لیکن پھر بھی بہت سی باتوں میں [illegible] انا سانگا کے مغلوب اور پسپا ہونے پر مسرت کا اظہار کرکے اس کا مصنف بابر کی موت کی تاریخ، اور اس پر چند اشعار لکھ کر ختم کردیتا ہے، حالانکہ فتحپور سیکری کی جنگ اور بابر کی موت کے درمیان بہت سے ایسے اہم واقعات ہیں جنکا ذکر کرنا ایک مورخ کیلئے بہت ضروری تھا، فرشتہ نے بابر کے حالات طبقات اکبری سے بھی زیادہ مفصل لکھے ہیں مگر بابر کی علالت کے زمانہ کے واقعات کو وہ بھی نظر انداز کرگیا ہے، چنانچہ امیر خلیفہ کی معاندانہ کارروائیوں اور بابر کی آخری نصیحتوں کی طرف اشارہ اس نے مطلق نہیں کیا ہے،

اگرچہ یہ لوگ خاموش ہیں، لیکن اس عہد اور اس کے بعد کے ہر دور کی تاریخوں میں اس واقعہ کی تفصیل موجود ہے، مآثر رحیمی اور تاریخ سلاطین چغتا کے مصنفون نے اس واقعہ کے بیان میں اسی عقیدت اور اخلاص کا اظہار کیا ہے جو اس غیر معمولی سانحہ کی اثر پذیری کا نتیجہ ہونا چاہئے، اگر یہ لوگ بھی خاموش رہتے تو گلبدن بیگم کی "ہمایوں نامہ" اس واقعہ کو تازہ رکھنے کیلئے کافی تھی، جس میں معنوی حیثیت سے وہی بات پائی جاتی ہے، جو اکبرنامہ کے مصنف نے لکھی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ مسز بیورج کو بھی اس واقعہ کے یقین کرنے میں تامل نہین ہوا[2]

[1] تاریخ رشیدی از میرزا حیدر دوغلت، قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ [2] بابر نامہ ترجمہ انگریزی ص ۷۰۲

مغالطۂ تحلیل

از

جناب خواجہ عبد الحمید صاحب لکچرار فلسفہ گورنمنٹ کالج، گجرات پنجاب

(۲)

۷۔ مابعد الطبیعیات کا مفکر ہر گزیہ جسارت نہیں کریگا، کہ عمل ترکیب کی صحیح اہمیت کا انکار کردے وہ جانتا ہے کہ کائنات اور اس کے لاتعداد مسائل کے صحیح ادراک اور عرفان کے لئے ترکیبی نقطۂ نگاہ لابدی ہے، وہ تحلیل کی اہمیت سے واقف ہے، لیکن تحلیل کی کم نگاہی بھی اسکی آنکھوں سے چھپی نہیں افسوس یہ ہے کہ باوجود اس اعتراف کے جب وہ خود اپنے ذہن میں کائنات کا تخیل اپنے تصورات کی مدد سے قائم کرتا ہے، تو تحلیل کا تباہ کن فارمولا (ا = ج+د) جگہ جگہ اپنی کرشمہ سازی میں مصروف نظر آتا ہے، اسکے دو وجوہ ہیں، اول یہ کہ تحلیل ہر حالت میں ترکیب سے آسان تر ہے، دوم یہ کہ مفکر مابعد الطبیعیات عموماً اپنے زمانہ کی سائنس کا تربیت یافتہ ہوتا ہے، یا کم از کم اُسے اس سائنس سے اچھی خاصی واقفیت ہوتی ہے، (اور بغیر اس واقفیت کے وہ مابعد الطبیعیات میں فکر کے قابل بھی نہیں) نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ سائنس کا تحلیلی طریق کار اسکی اپنی سرشت میں سرایت کرجاتا ہے، اور دانستہ یا نادانستہ وہ بھی اسی نقطۂ نگاہ کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیکر اپنی تخیلی دنیا کی تعمیر کرتا ہے،

ہم یہ نہیں کہتے کہ مابعد الطبیعیات کے ہر مفکر کے حق میں یہ قیاس صحیح ہے، زمانہ قدیم سے آج تک مفکرین و فلاسفہ اپنے ذہنی مزاج کے لحاظ سے دو فریقوں میں منقسم رہے ہیں، جرمن مفکر نطشے نے ان دو فریقوں کو آپولوڈی[1] اور دنیاسوسی کے القاب دیئے ہیں، ہم ان دو فرقوں کو اہل برہان اور اہل دل کہہ سکتے ہیں، قدیم یورپ کے فلاسفہ میں ان دو فریقوں کی بہترین مثال ارسطو اور افلاطون کا باہمی اختلاف ہے، ارسطو اپنے علم و سائنس سے اور اپنی منطق و استدلال سے حق و عرفان تک پہنچنا چاہتا ہے، اس کے برعکس افلاطون اپنے کشف و نظر سے اور اپنے شاعرانہ تخیل، اور درک[2] مستقیم سے اسی حق و عرفان تک جانا چاہتا ہے، ایک عقل کا پرستار ہے دوسرا دل کا گرفتار، ان دو مختلف ذہنیتوں کے لئے ایک ہی جادہ پر چلنا اور ایک ہی قسم کا طریق کار رکھنا ناممکن ہے، نصب العین دونوں ایک ہی سمجھتے ہیں، یعنی حق و عرفان لیکن اگر ایک حق و عرفان سے وصل کا خواہشمند ہے، تو دوسرا اسی حق و عرفان کی پوری پوری پیمایش کرنا چاہتا ہے، ایک کو دوسرے کا طریقہ پسند نہیں، اور اسے وہ جادۂ حق سے ہٹا ہوا سمجھتا ہے، حکیم رومی اپنے استدلالی اور عقلی مخالفین کو صرف پاے چوبیں کی اجازت دیتا ہے، اور فوراً ہی اس کی بے تمکینی کی تشہیر بھی کردیتا ہے، کیا عقل کے پرستار خاموش ہیں؟ ہرگز نہیں، وہ افلاطونی سیرت کو شاعرانہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں، اور اس کے درک مستقیم کو اہل باطن کی ڈینگ سمجھتے ہیں، یہاں ان مخالف ذہنی کیفیتوں کا موازنہ منظور نہیں، صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ان دو ذہنیتوں میں سے ارسطوی[3] مزاج والوں کا رجحان تحلیل کی طرف غالب رہتا ہے، اور افلاطونی طبیعتیں ترکیب کی طرف

[1] آپولو یونانی دیو مالا میں آفتاب اور علم و فضل کا دیوتا تھا، اور دیناؤس، راز و نیاز اور وارفتگی کا،

[2] درک مستقیم (Direct intuition) سے مراد کسی حقیقت کا پاجانا ہے، بغیر دلیل و حجت کے۔

[3] یاد رہے کہ ارسطو خود تحلیل و ترکیب کے اشتراک عمل کی بہترین مثال ہے، ارسطوی ذہنیت سے مراد صرف یہ ہے کہ طبیعت کا میلان تحلیل کی طرف زیادہ ہے

زیادہ مائل رہتی ہیں، جب ارسطوی علم وسائنس میں سے ترکیب کا عنصر بالکل غائب ہوجاتا ہے، اور جب افلاطونی درک ونظر میں محتاط و مکمل تحلیل بالکل معدوم ہوجاتی ہے، تو دونوں عرفان کے جادۂ حق سے ہٹ جاتے ہیں، فلسفہ کی تاریخ اسی کشمکش کی تاریخ ہے،

یہ ماننا پڑے گا کہ چونکہ افلاطونی مزاج مفکر عمل تحلیل سے متنفر ہے، اسلئے وہ نہایت آسانی سے مغالطۂ تحلیل سے بچ جاتا ہے، اس کی یہ وجہ تھی کہ وہ زیادہ صحیح نظر اور صاحب فضیلت ہے وجہ صرف یہ ہے، کہ وہ یا تو اپنی طبیعت کے جبلی میلان سے مجبور ہوکر اور یا تحلیل کی کوتاہیوں اور اسکی کم نگاہی سے متاثر ہوکر اس عمل سے گریز کرتا ہے، بہرحال چونکہ وہ اس مغالطہ سے بچ جاتا ہے، اس لئے اس کے تخیل میں دوسروں کے لئے ایک قسم کی کشش ضرور ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ایسے مفکرین کی تصانیف ہمیشہ قارئین کے دل ودماغ کو اپنی گرفت میں مضبوطی سے لے لیتی ہیں، قدیم یورپ میں ہیراقلاطیس، افلاطون اور پلاطینس زمانۂ حال میں نطشے اور برگسان اس ذہنیت کی بہترین مثالیں ہیں[1]، دنیاے اسلام کے اکثر صوفی شعراء اور ان کے سرتاج رومی اور حال میں اقبال (اپنے آخری بیس سالوں میں[2]) یہی ذہنیت پیش کرتے ہیں، اس طرح قدیم ہندستان میں فلسفہ، ویدانت نے بھی یہی تعلیم پیش کی تھی[3]،

جب ایسے افلاطینی مفکر کے سامنے اس کا برہانی مخالف اپنے خود تراشیدہ تصورات اپنے خشک دلائل اور اپنے صبر آزما استدلال کو پیش کرتا ہے، تو وہ اس فلسفہ سے اپنی نفرت کا اظہار کرتا ہے، اور اسے نیم کور، چوبیں لنگ، محدود وعقیم وبے حاصل، کرگس وغیرہ کے خطابات

---

[1] یہاں صرف ذہنیت (نفس مزاج) کا ذکر ہے، ورنہ اپنے نظریوں میں ان مفکرین میں بعد المشرقین ہے،

[2] ع "مقام عقل سے آسان گذر گیا اقبال" [3] بلکہ ہندوستان میں توکلی کے تخیلی نظام کو فلسفہ کے بجائے درشن کے نام سے یاد کیا گیا ہے، درشن میں درک مستقیم ہے اور بس کشف ہے استدلال شامل نہیں،

عطا کرتا ہے اس کے برعکس وہ خود اپنے کشف و نظر کو اور اپنے درک مستقیم کو عرفان و حق کا صحیح نمونہ اور حامل گردانتا ہے،

بوعلی اندر غبار ناقہ ماند دست رومی پردۂ محمل گرفت،

برہانی فلسفہ بیچارہ اپنی آنکھوں کا تیل نکال کر مشکل سے مشکل مسائل کی تحلیل کرتا ہے، اپنے آلات کی مدد سے "وجود مخلوط" کا ایسے اجزار میں تجزیہ کرتا ہے جن سے آگے بڑھنا (یا یہ کہو کہ نیچے اترنا) فی الحال ناممکن ہے، اور اسے اپنی اس محنت شاقہ کا پھل کیا ملتا ہے، ؟ نیم کوری اور بے حاصلی؟ وہ نظام عالم کے صحیح ادراک کے لئے اپنے ذہن میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے، اور اسے وجود منفرد، جوہر فرد اور برقیہ تک پہنچا دیتا ہے، لیکن اسے اپنی اس دیدہ ریزی اور کاوش کا صلہ کیا ملتا ہے، ؟ افلاطونی رومی منش شاعر جواُسے سات اندھوں اور ایک ہاتھی والا قصہ سنا دیتا ہے، ! سائنسدان دیدہ ریزی کرکے سفیدہ سلول کی تحلیل اس کے کیمیاوی اجزار میں کر دیتا ہے، اور خوش ہوتا ہے، کہ کائنات کا مشکل ترین عقدہ میری محنت سے آخر کھل گیا، لیکن اقبال فوراً ہی کرگس کی طرف انگشت نمائی شروع کر دیتا ہے، ! بات یہ ہے کہ اہل دل اور افلاطونی مزاج، منکر استدلال کے تکلیف دہ دار و رسن سے آزاد رہنا چاہتے ہیں، ان کے لئے تو التجائے اَرَنی سُرخیٔ افسانۂ دل ہے،

حق یہ ہے کہ وہ استدلال تحلیلی صرف اس حالت میں صحیح اور مفید ہوتا ہے، جب ہم اس کے خود وضع کردہ حدود کو ذہن نشین رکھیں، تحلیل بحیثیت تحلیل صحیح ہے، لیکن جب تحلیل نے ترکیب کی جگہ لینا شروع کی تو تحلیل مغالطہ بن گئی، اگر تحلیلی سائنسدان صرف یہ کہے کہ ان طریقوں سے اگر سفیدہ سلول کی تحلیل کیجائے تو یہ کیمیاوی اجزار ہاتھ آئیں گے، لیکن ان کیمیاوی اجزار میں وہ عنصر حیات دکھائی نہیں دیتا، جو سفیدہ سلول کا طغرائے امتیاز تھا تو کسی کو اس تحلیلی سائنس دان پر اعتراض کرنے کی گنجائش نہیں، لیکن جب وہ تحلیل کرکے دعوی کرتا ہے، کہ بس سفیدۂ سلول کا صحیح فہم و ادراک ہمیں ہوگیا، اور حیات کا لاینحل عقدہ

ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھل گیا ہے، تو کیا حرج ہے، اگر معترض ذرا کرس کی طرف بھی اشارہ کردے،

۸۔ اس بحث سے ضمناً یہ ایک حقیقت کھلتی ہے کہ معرفت حق کے درجے ہیں، سب سے نچلا درجہ وہ ہے، جس میں عوام کھڑے ہیں یعنی حق کا وہ ادراک جو تھوڑا بہت ہر اس انسان کو ہوتا ہے، جو علم نظری و عقلی سے نابلد ہے، اس عام ادراک میں تحلیل بھی کام دیتی ہے، اور ترکیب بھی، ان دو اہم عملوں کے توازن سے روزمرہ کے کام چلتے ہیں، عام انسان توڑتا ہے، اور جوڑتا بھی ہے، بات کی تہ کو بھی پہنچنا چاہتا ہے، اور نئی بات کا اختراع بھی چاہتا ہے لیکن جب وہ عام ادراک کے درجہ سے نکل کر مدرسہ یا دار التجربہ میں جا داخل ہوتا ہے، یا اہل دل کے شعر و سخن، اور ان کی ہاے وہو سے حق و عرفاں کی منزل تک پہنچنے کے لئے وہ استدلال چوبین، کی لمبی اور خشک سڑک کو چھوڑ کر درک مستقیم کی مختصر پک ڈنڈی کو اپنے لئے پسند کرتا ہے، تو عقلی اور نظری خطرات قدم قدم پر اُسے گراتے ہیں، جس وقت علم میں تخصص شروع ہوتا ہے، تو عمق نظر، اور تنگی نظر، دونوں یکجا ہو جاتے ہیں، جس خاص موضوع میں سائنسداں تخصص کرتا ہے، اس میں وہ عمق نظر پیدا کرتا ہے، اس کی چھان بین کرتا ہے، اور اس کی ہر بات کی کھال نکالتا ہے، لیکن اس موضوع کے تنگ حدود کے باہر وہ اپنی نظر ہرگز نہیں دوڑاتا، ان حدود سے جو کچھ باہر ہے وہ گویا اس کے لئے ہے ہی نہیں، اُس سے اُسے کوئی سروکار نہیں، سائنس کے لئے یہ تخصص ضروری ہے، اور جب تک سائنسداں اپنے ان خود ساختہ حدود کو ان کی نوعیت کو اور ان کے مقصد کو اپنے ذہن نشین رکھتا ہے اسکو اس قسم کا عقلی و نظری خطرہ نہیں لیکن جب کوئی فلسفی یا کوئی اور مفکر سائنس کے اس تخصص کے نتائج کو اپنے کونی تخیل کی عمارت میں بجنسہ استعمال کرتا ہے، اور سائنس دان کے حدود ان کی نوعیت اور اس کے محدود مقاصد کو مدنظر نہیں رکھتا، تو اس مفکر کا کونی تخیل یکسر غلط ہو جاتا ہے، سائنسدان کونی تخیل کی عمارت کا معمار نہیں ہے، اور نہ وہ اس کام کے لئے اپنے آپ کو اہل سمجھتا ہے، وہ صرف یہ کہتا ہے کہ فلاں فلاں حالات میں فلاں فلاں حدود کو مدنظر رکھتے ہوئے، اس اس مواد کو استعمال

کرتے ہوئے ان ان آلات کی مدد سے اور اس طریق کار کے استعمال سے یہ یہ نتائج (تحلیلی یا ترکیبی) ظاہر ہوتے ہیں، اگر وہ اس سے زیادہ دعوی کرے، تو وہ قابلِ مواخذہ ہے، اور اگر اسکی اس تحدید کے باوجود کوئی مفکر اس کے نتائج کو وہ کوئی سی اہمیت دے، جس کا خود سائنس دان مخترع دعویدار نہیں ہے، تو اس پر ہم سائنس اور اس کے کام اس کے طریق کار، اور اس کے نتائج پر کسی قسم کی گرفت نہیں کر سکتے، غلطی اگر سرزد ہوئی ہے، تو مفکر سے ہوئی ہے جس نے خاص اور محدود نتائج کو ایک عام غیر محدود دادر کونوی اہمیت دیدی ہے،

۹- یہ امر واقعہ ہے کہ زمانۂ حال کی سائنس میں عمل تحلیل نے بے شمار انکشافات اور اختراعات کئے ہیں، ہر طرف سائنس کے تحلیلی (اور ترکیبی) کرشمے دکھائی دیتے ہیں لیکن اگر ہم ان انکشافات اور اختراعات کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں نہ صرف عمل تحلیل کی صحیح اہمیت اور اسکی کامیابی کا راز معلوم ہو جائے گا، بلکہ اسکی کوتاہیان اور اسکی حدود بھی ذہن نشین ہو جائیں گی،

۱- مثلاً یہ حقیقت ہے، کہ ان انکشافات، اختراعات اور ایجادات کا کثیر حصہ عالم غیر ذی حیات سے متعلق ہے، موٹر کارین، طیارے، ریڈیو، آلاتِ حرب، کیمیاوی مرکبات، بجلی کے آلات، اختراعات میکانوی آلات وغیرہ ایسی اشیا ہیں جن میں، حیات، شعور، اور روحانیت کے عناصر بالکل مفقود ہوتے ہیں، یہی وہ عالم غیر ذی حیات ہے جس میں خالص تحلیل (یعنی وہ تحلیل جس میں عمل ترکیب کا بالکل دخل نہ ہو) نہ صرف ممکن اور مکمل ہو سکتی ہے، بلکہ اس کے نتائج بھی نہایت اہم، نہایت مفید، اور (نظری حیثیت سے) کم گمراہ کن ہو سکتے ہیں، لیکن کائنات کا وہ حصہ جس میں حیات اور شعور کو دخل ہے، صحیح نتائج کے لئے تحلیل خالص و محض متحمل نہیں، پھر عالم غیر ذی حیات کے اجسام غیر آلیہ میں عمل ترکیب نسبتاً آسان بھی ہوتا ہے، سائنسدان اپنے دارالتجربہ میں نہ صرف وجود مخلوط کو اجزائے مرکبہ میں تحلیل کر سکتا ہے، بلکہ ان اجزا کو دوبارہ باہم دگر جمع کر کے یہ فیصلہ بھی کر سکتا ہے کہ تحلیل کا

پہلا عمل صحیح تھا، یا نہیں، اس سے بڑھکر یہ فائدہ ہے، کہ وہ مختلف اجزاء کو لیکر (یعنی ایسے اجزاء کو لیکر جو مختلف تحلیلوں کے بعد ہاتھ آئے ہیں)، نئی نئی ترکیبیں دیکر، نت نئے مخلوط وجود اور اختراعات کرسکتا ہے، اس طرح سے وہ نہ صرف عالم غیر ذی حیات، موجودات کی تحلیل کرسکتا ہے، بلکہ اس عالم کی موجودات میں آئے دن نئے اضافے بھی کرتا رہتا ہے، مثلاً جنگ عظیم سے پہلے کا واقعہ ہے، کہ موجوداتِ ارضی میں اس قدر رنگ موجود نہ تھے جتنے کہ جرمن کیمیاوی تجربہ گاہوں میں صنعتی طریقوں سے سائنسدانوں نے اختراع کرلئے تھے،

پس ظاہر ہوا کہ موجودہ زمانہ میں عمل تحلیل کی کامیابی کی دو وجوہ ہیں، اوّل یہ کہ یہ عمل عالم غیر ذی حیات میں استعمال ہوا، جہاں یہ عمل بُرے نتائج پیدا کئے بغیر اور زیادہ آسانی سے استعمال ہوسکتا ہے، دوم یہ کہ اس عالم غیر ذی حیات میں جس طرح عمل تحلیل آسان ہے، اسی طرح عمل ترکیب بھی مشکل نہیں، اسلئے جہاں تحلیل سے کوئی نتیجہ برآمد ہوا، اس نتیجہ کی دیکھ بھال اور اسکی خامیوں اور کوتاہیوں کی جانچ پڑتال فوراً عمل ترکیب سے کرلی گئی، یعنی ہر قدم پر ترکیب نے تحلیل کے نتائج کا جائزہ لیا، اور اس طرح سے نہ صرف تحلیل کی غلطیوں سے سائنس بچی رہی، بلکہ ترکیب کی مدد سے نئی نئی اختراعات اور ایجادات اور نت نئے مرکب اور مخلوط وجود بھی ظاہر ہوتے رہے، اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں ہے، کہ موجودہ سائنس کی ترقی زیادہ تر عمل تحلیل کے صحیح اور وسیع استعمال سے ہوئی ہے، ترکیب کے بغیر یہ ترقی اگر ناممکن نہیں تو کم از کم مشکل اور سست رفتار ضرور ہوتی، حق یہ ہے کہ سائنس کی ترقی کی رفتار اس تناسب سے ہے، جس سے اسکی ترکیب اور تعمیم بڑھتی گئی ہی،

(باقی)

فہم انسانی

یعنی ڈیوڈ ہوم کی مشہور کتاب ہیومن انڈراسٹینڈنگ کا ترجمہ، اور اس کے مختصر حالات کیساتھ اسکے خیالات فلسفہ پر بحث وتبصرہ، حجم ۲۰۰ صفحات، قیمت عہ

"مینیجر"

تلخیص و تبصرہ

ہندوستان کے وسط ایشیائی مقبرے

مندرجۂ بالا عنوان سے اک ڈچ اہل قلم ڈاکٹر ہرمن گوئٹز نے اکتوبر ۱۹۳۸ء کے اسلامک کلچر میں ایک مقالہ لکھا ہے، ذیل میں ناظرین معارف کے لئے اسکی تلخیص درج ہے،

ہندوستان کا سب سے زیادہ مشہور اور شاندار مقبرہ تاج محل ہے، اس کا طرز تعمیر آرٹ کے طلبہ کے لئے اب تک معمّا ہے، کہ وہ ہندوستانی طرز کی نمایندگی ہے، یا اس میں غیر ملکی عناصر ہیں، یہ خیال کہ اسکے معمار فرانسیسی اور اطالوی تھے، لغو اور مضحکہ انگیز ثابت ہوگیا ہے لیکن اس کے معمار غیر ملکی ضرور تھے، استاد عیسیٰ اور اسماعیل خان ہندوستانی نہ تھے، اسی لئے تاج میں غیر ملکی اثرات نمایاں ہین، جو زیادہ تر وسط ایشیا کے ہیں، لیکن ان کو خالص وسط ایشیائی آرٹ بھی نہیں کہا جا سکتا، کہ اس میں ہندوستانی عناصر بھی کافی ہیں،

تیموریون سے پہلے مسلمانون کے فن تعمیر کو کافی فروغ حاصل ہو چکا تھا، یہ سلطان التمش کے سادہ اور حسین مقبرہ سے شروع ہوا، اور شیر شاہ کے مقبرہ کی سادگی اور تناسب کے مکمل نمونے پر ختم ہوا، عہد تغلق کے مقبرے سادہ اور چوپہل ہوتے تھے، جن کے سامنے چار چھتیں، اور چھوٹی چھوٹی برجیاں ہوتی تھیں، آگے چل کر ایرانی اثرات سے چارون کونوں پر گنبدون کا بھی اضافہ ہوا لیکن پھر جلد ہی ان کی جگہ ہندوستانی وضع کی چھتریوں نے لے لی، آخری عہد میں ہشت پہل اور کثیر الاضلاع

عمارتیں بھی بننے لگیں جن میں گیلریوں اور چھتریوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی، اور ان کی برجیوں کے بیچ کا حصہ اونچا ہوتا تھا،

تیموریوں کے زمانہ سے مقبروں میں وسط ایشیائی طرز شروع ہوا، جو ایران اور ترکستان میں یہاں کی دونوں قوموں کے تخیل کا نتیجہ تھا، یہ طرز سمرقند اور ہرات میں خاندان تیموریہ کے عہد میں پایۂ تکمیل کو پہنچا، اس سے پہلے سلجوقیوں نے اپنے مقبروں میں خیمہ کی شکل کا ایک جدید قسم کا مینار شروع کیا تھا، ایلخانیوں کے دور حکومت میں اس مینار کی شکل رفتہ رفتہ اسی تبدیل ہوگئی، تیمور کے زمانہ میں وسط ایشیا کے پیازی[1] قبے اعلیٰ پیمانہ پر پہونچ گئے تھے، ایلخانیوں کے عہد میں برجیوں والے میناروں میں ایرانی طرز کی چھتیں گیلریوں کے ساتھ ہوتی تھیں، اس قسم کی برجیاں اور مینار سے دہلی کے ترک سلاطین کے مقبروں میں بالکل ناموزوں ہیں، اور وہ ان مقبروں کے اوپر بڑے بڑے تاج کی طرح نظر آتے ہیں،

ہندوستان میں اصلی اور سادہ تیموری وضع کے مقبرہ کا بہترین نمونہ نور جہاں کے باپ آصف خاں کا مقبرہ ہے، اسکے وہ روشن اور رنگین ٹائل محفوظ ہیں، جو از منۂ وسطیٰ میں ترکستان اور ایران کی عمارتوں میں استعمال ہوتے تھے، تاج محل کے پاس ممتاز محل کی خواصوں کے چھوٹے چھوٹے مقبروں میں بھی نمونے اچھی حالت میں موجود ہیں، ان کے چھوٹے اور گول ستون مغلوں کے لال پتھر، اور دہلی کے ترک سلاطین کے زمانہ کے سفید پتھروں سے مزیّن ہیں،

وسط ایشیائی طرز کے ابتدائی نمونے دہلی میں اعظم خاں، ہمایوں اور خانخانان اور فہیم خاں کے مقبروں میں پائے جاتے ہیں، خانخانان اور فہیم خان کے مقبرے تو خالصۃً اسی وسط ایشیائی طرز پر بنائے گئے ہیں، گو موخرالذکر میں نیلے اور سبز رنگ کے ٹائل کے گنبدوں سے زیادہ حسن پیدا ہوگیا ہے، ہمایوں اور اعظم خان کے مقبرے بھی اسی طرز کے ہیں، لیکن ان میں سنگ موسی اور دوسرے قسم کے

[1] یعنی پیاز کی شکل کے،

رنگ برنگ کے اتنے پتھر ہیں کہ تیموریوں سے پہلے سلاطین دہلی کے زمانہ کا طرز پیدا ہو گیا ہے، جو اکبری دور کے آرٹ میں قبول کر لیا گیا تھا، ہمایون اور خانخاناں کے مقبروں کو تاج کے نقوش اولیں سمجھنا چاہئے، ہمایوں کے مقبرہ کی ترتیب اور خاکہ تاج محل سے بہت مشابہ ہے، اگواس میں تاج کی پختگی نہیں، اور وہ ایک سادہ ترکستانی مقبرہ اور دہلی کے شیر منڈل کے وضع کے چارنشینوں کا تودہ معلوم ہوتا ہے، خانخان کے مقبرہ میں چوپہل فرش اور متروک چھتریوں کے باوجود ہمایوں کے مقبرہ سے نسبتہً زیادہ تاج کی مشابہت ہے،

اکبر کے آخری اور جہانگیر کے ابتدائی دور سے وسط ایشیائی طرز کے مقبرہ کا ذوق نہ رہا، اکبر نے جب راجپوتوں اور ہندوؤں کے عادات و اطوار اختیار کرنا شروع کئے، تو اس کے اثرات تیموریوں کی تہذیب، معاشرت، علم، مذہب، اور آرٹ پر بھی ظاہر ہونے لگے، لیکن جہانگیر کے آخری عہد سے پھر ایرانی تمدن کے آثار نمایاں ہوئے، نورجہاں اور اس کے خاندان کے اثر سے ایرانی لباس، ایرانی مصوری، اور ایرانی طرز تعمیر رائج ہوا، ایرانی طرز کی عمارتوں کی بہترین مثالیں وزیر خاں اور دائی انگا کی مسجدیں ہیں، ایرانی طرز میں ترکستانی عناصر بھی شامل تھے، اس طرز کے رائج ہونے سے وسط ایشیائی وضع کی بھی تجدید ہوئی، چنانچہ لاہور میں انارکلی اور آصف خان کے مقبرے اسی طرز پر تعمیر ہوئے، اور آگرہ میں چینی کا روضہ اور خان ملا شکر اللہ کا مقبرہ بنا، شاہجہاں کے زمانہ میں یہی روایات پھیلیں اور تاج میں ان کی پوری تکمیل ہوئی، شاہجہاں اپنے کو تیمور کے ترکی گھرانے کا منتہائے کمال سمجھتا تھا، تیمور سے اسکو خاص عقیدت تھی، اسی لئے صاحبقران ثانی کا لقب اختیار کیا، اسلئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ صاحبقران ثانی نے اپنی محبوب ملکہ کا جو مقبرہ تعمیر کیا، وہ اسی طرز کا تھا، جو صاحبقران اول نے اپنے لئے سمرقند میں بنایا تھا، بیگمات کے لئے عظیم الشان مقبرے بنانے کا رواج ترکستان ہی میں تھا، ہندوستان میں مطلق نہ تھا،

وسط ایشیائی مقبرے کی تصوریت کا اظہار تاج سے زیادہ کسی اور مقبرہ میں نہیں ہوتا ہے
لیکن یہ واضح رہے، کہ تاج سمرقند کے آرٹ کے جمالیاتی اور روحانی تخیل کی تکمیل سے بہت دور ہے
سمرقند کا مقبرہ سنگین حقیقت پسند، مردانہ اور مختلف قسم کے رنگوں سے مزین ہے، اس کے مقابلہ میں
تاج ایک خواب کی دنیا ہے، ایک عورت ہے، جو بے داغ سفید لباس میں کھڑی ہے، وہاں
دنیا کا ایک فاتح سویا ہوا ہے، یہاں ایک رفیقہ حیات محبوبہ محو خواب ہے،

تاج کا فانوس خیال شاہجہانی دربار کے کلچر کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے، اس میں ایک دنیا کی
روحانیت ہے، جو شاہی خاندان کے صوفیانہ تنویر سے پیدا ہوئی، ہندوستان کے آرٹ میں تصوف
کا مظاہرہ جہانگیر کے آخری دور حکومت سے شروع ہوگیا تھا، لیکن شاہجہان کی حکومت میں یہ
صوفیانہ رنگ آرٹ اور تمدن کے ہر شعبہ میں نظر آنے لگا، چنانچہ یہی تصوف روحانیت اور غیر مادی حقیقت
تاج اس کے سفید پتھروں، اس کے خیرہ کرنے والے جواہرات، اس کے فنی تناسب میں نمایاں ہیں،

اس کا خاص حسن ہے،

تاج محل کی تعمیر وسط ایشیائی طرز کے مقبرہ کی تکمیل ہے، اور اس کا آرٹ ہندوستان مغلوں
کے تکوینی تخیل کا کمال ہے، جو بیرونی اور غیر ملکی نہیں کہا جاسکتا، تاج کے آرٹ کو نقل کرنے کی کوشش
کی گئی، لیکن اس میں کبھی کامیابی حاصل نہیں ہوئی، اورنگ آباد میں بی بی کے روضہ میں اس کی تھوڑی
سی جھلک ہے، مگر روضہ میں جو فنی رجحانات اور انسانی تخیلات پائے جاتے ہیں، وہ تاج سے بالکل
مختلف ہیں، اس میں تاج کا ایرانی طرز تناسب اور اسکی روحانیت مطلق نہیں، گو یہ خود ایک انوکھے
طرز کی عمارت ہے، تاج سے انسانی عشق اور روضہ سے انسانی شفقت کا اظہار ہوتا ہے، تاج
کی افقی اور عمودی ساخت سے تناسب اور ترتیب کا حسن پیدا ہوگیا ہے، لیکن روضہ کی تعمیر میں ساری
توجہ نیچے سے اوپر کی طرف منعطف کی گئی ہے، بیچ والے گنبد پر اتنی اہمیت دی گئی ہے، کہ ساری

عمارت اسی کے ساتھ ضمنی ہوئی معلوم ہوتی ہے، اس کے مینارے اس کی چھتریاں اور اس کی چھتیں اس طرح بنائی گئی ہیں، کہ صرف مرکزی گنبد نمایاں ہوگیا ہے، اسی لئے اس میں تاج کی شوکت اور سطوت پیدا نہ ہوسکی، تاج اپنے میناروں پر حاوی ہوگیا ہے، لیکن روضہ پر اس کے مینارے حادی ہوگئے ہیں، روضہ میں بیچ والی نہر کے کنارے ایک چھوٹا مگر لمبا باغ ہے جس کے دونوں جانب چھوٹی چھوٹی فصیلیں ہیں، اس کی روش کی فضا میں ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ روضہ میں آرام کرنے والے اور اس کے بنانے والے میں بڑا انس تھا، اس کا اظہار روضہ کی آرائش، اوس کی نوکدار محرابوں کے چھوٹے چھوٹے روزن اور دیواروں کی استرکاری سے بھی ہوتا ہے، اس قسم کی نسائیت تاج میں بھی ہے، لیکن اس کی نسائیت میں ایک مقدس تخیل کی صوفیانہ شوکت ہے، جس سے ایک پرشکوہ حکمران اور سپہ سالار کی شرمیلی بیوی کی محبوبیت کا اظہار ہوتا ہے،

دہلی میں صفدر جنگ کے مقبرہ میں بھی تاج کی جھلک ہے لیکن یہ محض ایک ایسے خودرو شخص کا خواب ہے، جو مغلوں کی زوال پذیر سلطنت سے فائدہ اٹھا کر اپنی علٰحدہ سلطنت قائم کر رہا تھا یہ مقبرہ گذشتہ شاندار روایات کی محض نقالی ہے، جس میں اس زمانہ کے ذوق کا جمالیاتی پہلو زیادہ نمایاں ہے، اس کے باغ کی روشیں اس عہد کی درباری زندگی کا مکمل نمونہ ہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے یہ ایک ناکام آرٹ ہے،

اورنگ زیب کے بعد عالی شان مقبروں کی تعمیر کا ذوق ختم ہوگیا، خود اورنگ زیب اور اس کی بہن کسی مقبرے میں مدفون نہیں ہیں، حیدرآباد اور بھوپال کے فرمانرواؤں نے بھی بڑے مقبرے بنانے کی طرف توجہ نہیں کی، یہ اس لئے نہیں کہ ہندوستان میں دولت کی کمی ہوگئی، بلکہ اس لئے کہ مذہب میں راسخ العقیدگی زیادہ ہوگئی، اودھ اور مرشدآباد کے نوابوں نے مقبرے

بنائے، لیکن ان سے پرانی روایات مفقود ہوگئیں فیض آباد اور لکھنؤ کے مقبروں میں دکنی شیعوں کے اثرات زیادہ غالب آگئے ہیں، اور یہی طرز سرنگا پٹم اور ویلور کے مقبروں میں ہے،

بہرحال، مغلوں نے ہندوستان میں وسط ایشیائی مقبروں کے طرز کو رائج کیا، تو یہ غیر ملکی ترک اور ایرانی فاتحون کا قومی طرز تھا، لیکن تاج میں یہ غیر ملکی عناصر مغلوں کے کلچرل اور تمدنی ارتقا سے مل کر ایک روحانی کمال میں تبدیل ہوگئے جس سے تاج ہندوستانی آرٹ کا ایک بہترین جوہر ہوگیا،

"ص ع"

چودھویں صدی کی تفسیر کبیر

تفسیر جواہر

مصر کے مشہور عالم شیخ طنطاوی جوہری نے تفسیر جواہر کے نام سے پچیس جلدوں میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی ہے، جو اپنی نوعیت اور معنوی محاسن کے لحاظ سے زمانہ حال کی تفسیروں میں یگانہ حیثیت رکھتی ہے، اس میں شیخ موصوف نے جہان سیاست واقتصاد، فلسفہ و سائنس، فلکیات وطبقات الارض وغیرہ عصری علوم پر قرآن پاک کی آیتوں سے استشہاد کیا ہے، وہاں سلف کی تفسیر کی بھی پوری پوری پابندی کی ہے، ابھی اس کی پہلی جلد کا ترجمہ نہایت سلیس، عام فہم ہندوستانی زبان میں کیا گیا ہے، جو صرف سورہ بقر کی تفسیر پر مشتمل ہے، شروع میں علامہ سید سلیمان ندوی کا بصیرت افروز مقدمہ بھی ہے، مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ، کاغذ سفید ولایتی ۲۴ پونڈ، اور کتابت وطباعت دیدہ زیب، ضخامت ۶۵۰ صفحے قیمت ؎ ، علاوہ محصولڈاک، ملنے کا پتہ :-

سکریٹری عمر لائبریری عمرآباد متصل آمبور ضلع شمالی ارکاٹ (صوبہ مدراس)

اخبارِ علمیہ

سائنس کانگریس کا اجلاس لاہور

امسال سائنس کانگریس کا سالانہ اجلاس لاہور میں ہوا، ڈھاکہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر جے سی گھوش صدر تھے، گورنر پنجاب نے اجلاس کا افتتاح کیا، اور پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر خان بہادر میاں افضال حسین صاحب نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا، کانگریس میں ۷۰۶ مضامین پڑھنے کے لئے موصول ہوئے تھے، جن میں سے ریاضی میں ۴۹، کیمیا میں ۲۰۰، ریاضیات میں ۱۶، علم نباتات میں ۴۵، علم الحیوانات میں ۵۴، علم الانسیانیات میں ۲۶، طب میں ۴۶، زراعت میں ۵۶، عضویات میں ۳۲، اور نفسیات میں ۵۵ مضامین تھے،

شعبۂ ارضیات کے صدر پروفیسر اس کے رائے تھے، جنھوں نے اپنے خطبہ میں کہا، کہ ہندوستان کی معدنی دولت کثرت سے محض اسلئے برباد ہو رہی ہے، کہ اس کی کان کنی کے لئے کوئی با اصول اور منظم سامان نہیں ہے، اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے، کہ اب بھی ہندوستان کے مختلف حصّون میں بے شمار معدنی دولت مدفون ہے، جست کا ذکر چودھوین صدی عیسوی میں ہندوؤں کی کیمیا میں پایا جاتا ہے، لیکن آج یہ ہندوستان سے مفقود ہے، حالانکہ بہار، مدراس، اور پنجاب میں اس کی کانین موجود ہین، مگر اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے، پارہ ہندوستان میں اس وقت نہیں پایا جاتا ہے، لیکن گذشتہ عہد کیمیا میں اس کا ذکر اکثر آتا ہے، ہندوستان میں اس کی کانیں دریافت ہو سکتی ہین اور

ازمنۂ قدیم و وسطیٰ کے ہندوستان میں گندھک کثرت سے استعمال ہوتی تھی، مغلوں نے اپنے زمانہ میں اس سے ہر قسم کا کام لیا، مگر کبھی باہر سے منگوانے کی ضرورت نہیں پڑی، لیکن آج گندھک بہت ہی قلیل مقدار میں یہاں دستیاب ہوتی ہے، گذشتہ صدی کے وسط تک دنیا کے تمام ہیرے ہندوستان ہی کی پیداوار تھے، لیکن آج ہندوستان میں ہیرے کی کان کوئی قابلِ توجہ نہیں، البتہ سونا کی طرف پوری توجہ دی جاتی ہے، ہندوستان کے بہت سے دریاؤں کے نام مثلاً بہار میں سوناپت، سوبرنا ریکھا، آسام میں سوبرن سری، دھان سری، یوپی میں سونا، اور دہلی میں سونا وغیرہ ایسے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے، کہ ان کا تعلق سونا سے کچھ نہ کچھ ضرور رہا ہے،

آخر میں صدر موصوف نے کہا کہ اگر ارضیات کی تعلیم کا بہتر انتظام ہو، تو آج ہندوستان کی پوشیدہ معدنی دولت کے زیادہ سے زیادہ اضافہ ہونے کا امکان ہے،

شعبۂ زراعت کی صدارت ڈاکٹر جے ان، مکرجی نے کی، انھوں نے ہندوستان کی زراعتی زمین کو زرخیز بنانے پر زیادہ زور دیا، پھر اس کی تفصیل بتائی، کہ کس طرح ہندوستان کی زراعتی زمین محض بے توجہی، اور بے اعتنائی کے باعث اب تک اس لائق نہ ہو سکی ہے، کہ اس سے خاطر خواہ فوائد اٹھائے جا سکیں، آخر میں یہ کہا کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے حکومت کی سرپرستی کی بھی ضرورت ہے، لیکن صدر موصوف نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا، کہ اب تک بنگال آسام اور اڑیسہ میں زراعت کی تعلیم کے لئے کوئی کالج قائم نہیں کیا گیا،

شعبۂ جغرافیہ و علم پیمایش ارض میں پروفیسر سوبرمانیم نے کہا کہ ہندوستان میں دنیا کے تمام کلچر اور تمدن آپس میں ملتے ہیں، جن کے اثر سے ایک خاص تمدن پیدا ہو رہا ہے، جس طرح انگلستان شمالی یورپ کے تمدن اور امریکہ پورے یورپ کے تمدن کی ترکیب امتزاجی کا نمونہ ہے، اسی طرح ہندوستان تمام دنیا کے تمدنوں کے امتزاج کا نمونہ ہوگا،

اس کانگریس میں ایک روز سر شاہ سلیمان کا بھی لکچر ہوا جس میں انھوں نے اپنے جدید نظریۂ
[...]ضافیت کی تشریح کی، اور بجلی اور کشش ثقل میں اتحاد دکھایا،

یہودی اور سائنس

جرمنی کا مشہور سائنس دان جوہانس اسٹارک جس کو طبیعیات کی تحقیقات میں ۱۹۱۹ء میں نوبل انعام
[...]ل چکا ہے، انگلستان کے مشہور رسالہ نیچر میں رقمطراز ہے، کہ یہودی مثلاً آئنسٹائن وغیرہ سائنس کی
[...]یقات میں محض ادعا پسند اور نظریے قائم کرنے والے رہے ہیں جس سے ہر زمانہ میں سائنس پر بہت ہی
[...]ا اثر پڑا ہے، اس مضمون سے ممالک متحدہ امریکہ کے سائنس دان بہت برافروختہ ہوئے، اور انھوں نے
[...]ازبواس کے ماتحت ایک مجلس تشکیل کی، فرانز بواس نسلاً جرمن یہودی ہے، اور آج کل کولمبیا یونیورسٹی
[...]ں علم الانسانیات کا پروفیسر ہے، اور گذشتہ چوتھائی صدی سے جرمنوں کے نسلی نظریہ کی تردید شائع
[...]ر رہا ہے، جرمنی میں اس کی تمام کتابیں جلادی گئی ہیں، اسی کی نگرانی میں امریکہ سے اسٹارک کا
[...]اب شائع ہوا ہے، جس پر ۱۲۸۴ سائنس دانوں کے دستخط ہیں، اس جواب میں یہ دکھایا گیا ہے
[...]سائنس کی تحقیقات، مذہبی، قومی، نسلی اور ملکی پابندیوں سے بالکل پاک ہیں، اس کے بعد
[...]ودیوں نے طبیعیات، کیمیا، طب، اور علم الحیوانات میں جو تحقیقات کی ہیں، ان کو بتایا گیا ہے، آخر
[...]ر میں اس کی تردید کی گئی ہے، کہ نظریے قائم کرنے سے تجربی تحقیقات کو ضرر پہونچتا ہے،
[...] پرنیکس سے کیپلر کے زمانہ تک کوئی تحقیق ایسی نہیں ہے جس کے لئے پہلے نظریہ قائم نہ کر لیا گیا ہو،

(ص ع)

برکلے اور اس کا فلسفہ

مشہور فلاسفر برکلے کے حالات زندگی، اور اسکے فلسفہ کی تشریح ضخامت ۱۰۲ صفحے قیمت ۱۲ "منیجر"

خونِ جگر

از جناب جگر مراد آبادی

اب تو نامِ عشق سے بھی سخت گھبراتا ہے دل
اے مرے اللہ! کیا سے کیا ہوا جاتا ہے دل

کیا بتائیں دل سے مل کر کیا غضب ڈھاتا ہے دل
جسطرح آندھی کوئی آتی ہے یوں آتا ہے دل

سامنے ان کے ہمیں سے اسکی ظالم شوخیاں
وہ نہیں ہوتے تو کیا نادان بن جاتا ہے دل

جب ستم ہی مُدعا ٹھیرا، ستم بھی کیا ضرور
کچھ نہ کچھ تسکین سی یوں بھی تو پا جاتا ہے دل

دل تو سینے ہی میں رہتا ہے مگر اسکے حضور
جیسے اب جاتا ہے دل، سینے سے اب جاتا ہے دل

گا ہے گا ہے خود بہک جاتا غنیمت ہے مگر
بس خدا ہی اُس کا حافظ جسکو بہکاتا ہے دل

رہ گیا ہے اب تو بس اتنا ہی ربط اک شوخ سے
سامنا جس وقت ہو جاتا ہے بھر آتا ہے دل

دل کی عظمت اللہ اللہ لیکن اس کا کیا علاج
اپنی ہی موجوں میں ظالم خود بہا جاتا ہے دل

دل سے دل کا آہ ملنا بھی قیامت ہے مگر
اے معاذ اللہ جس دم دل سے ٹکراتا ہے دل

رحم بھی غصہ بھی کیا کیا آہ آتا ہے جگر،
خود پھنسا کر عشق میں جب مجھ کو سمجھاتا ہے دل

غزل

از

جناب زاہد حسین صاحب احساس مرادآبادی

عشق کی فطرت ہے "غم" مسرور کرتے جائیے
کم سے کم اتنا مجھے مجبور کرتے جائیے،

عرض ہے میری اگر منظور کرتے جائیے
درد بخشا، درد کو دستور کرتے جائیے،

دل کو داغِ عشق سے مسرور کرتے جائیے
یعنی روشن اک چراغِ طور کرتے جائیے،

حسن سے کچھ اکتسابِ نور کرتے جائیے،
زندگی کو نعرۂ منصور کرتے جائیے،

ان کا جو ارشاد ہو منظور کرتے جائیے
عشق کو مجبور ہی مجبور کرتے جائیے،

ہاں ان ہی نظروں سے پھر دیجئے فریبِ التفات
میری ہستی سے مجھے پھر دور کرتے جائیے،

عشق میں یوں ہی ملا کرتے ہیں اکثر اعتبار
چاہئے جتنا مجھے مجبور کرتے جائیے،

بڑھتی جائیں گی اسی نسبت سے دل کی قربتیں
خود کو مجھ سے چاہے جتنا دور کرتے جائیے،

عشق میں راحت کی ساری تہمتیں جاتی رہیں
زیست کے الزام کو بھی دور کرتے جائیے،

ہو ہی جائیگی کبھی احساس تکمیلِ حیات
دل کو دردِ عشق سے معمور کرتے جائیے

دعوتِ فکر و نگاہ

از جناب سیماب اکبرآبادی

اب ہیں غلام آفرین مدرسہ و خانقاہ
حجتِ مشرق پہ ہے خندۂ مغرب گواہ

علم کے پردے میں بھی چھپ نہیں سکتا گناہ
درس تہی ہوگیا پردہ درِ خانقاہ

تیری نگہ قید ہی طرۂ و تاج و کلاہ | میری نظر شہپر اشْہَدُ اَنْ لَا اِلٰہ
لالہ و برگ و گیاہ، انجم و خورشید و ماہ | منزلِ مقصود تک سیکڑوں ہیں سنگِ راہ
آہ وہ ظالم جمال، ہائے وہ کافر نگاہ! | میری بھی دنیا خراب دل کی بھی دنیا خراب
مجھ میں ہیں شعلے بھرے برقِ رُخِ دوست کے | پہلے مجھے دیکھ لے پھر مجھے کہہ روسیاہ
حسن میں اور عشق میں فرق اور اس درجہ فرق! | انکی جھلک بھی ثواب میری نظر بھی گناہ
سرخوشِ ذوقِ خودی حُسن سراپا نیاز | جھک نہیں سکتی جبیں، اٹھ نہیں سکتی نگاہ
حاصلِ فکر و نظر، ایک بھی جلوہ نہیں، | اب نہ رہا غالباً دل بھی تری جلوہ گاہ
عشق کے آنسو فقط عشق کی آنکھوں میں ہیں | اہل ہوس کو کہاں حوصلۂ اشک و آہ

میرے لئے وارثی دو ہی پناہیں تو ہیں
مغفرتِ بے حساب، معصیتِ بے پناہ

رباعیاتِ امجد

از

حکیم الشعراء امجد حیدر آبادی

دن رات کا مشغلہ ہے رونا دھونا | عشاق کا کام کیا ہے رونا دھونا
اشکوں سے گنہ کے داغ دھلجاتے ہیں | کیا خوب محاورہ ہے رونا دھونا

تا جان دارم بہ جانِ جان نزدیکم | تا دل دارم بہ دل ستان نزدیکم
نقشِ قدمم خود نگر و یاد م کن، | ہر جا باشم بایں نشان نزدیکم

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے سالنامے اور خاص نمبر

الفرقان مجدد الف ثانی نمبر مرتبہ:۔ مولانا محمد منظور صاحب نعمانی تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۲ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مرقوم نہیں، پتہ دفتر الفرقان بریلی،

بریلی کے مشہور مذہبی اور اصلاحی رسالہ "الفرقان" نے ہندوستان کے مجدد علما، وصلحا کے تجدیدی ـاموں کے حالات میں خاص نمبر لگانے کا مفید سلسلہ شروع کیا ہے، چنانچہ اس سے پہلے وہ حضرت ـنا سید احمد بریلوی اور مولانا محمد اسمٰعیل شہید رحمہما اللہ کے حالات میں "شہید نمبر" نکال چکا ہے، ـرحضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں نکالا ہے اس میں حضرت مجدد صاحب ـسوانح، اور آپ کے مجددانہ کارناموں پر اچھے اور مفید مضامین فراہم کئے گئے ہیں، ان میں مولانا ـعد مہدی حسن شاہجہاں پوری کا مضمون "تجدید دین اور حضرت شیخ احمد سرہندی" مولانا عبد الشکور ـب کا مضمون "الخطبۃ الشوقیہ" مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کا مضمون "الف ثانی کا تجدیدی ـنامہ" اور مولانا منظور نعمانی مدیر رسالہ کا مضمون "حضرت امام ربانی کا جہاد تجدید" زیادہ مفید ـپراز معلومات ہیں، پہلے مضمون میں مجددیت کی حقیقت، اس کے شرائط اور اسکی تاریخ کی روشنی ـحضرت مجدد صاحب کے کارناموں کو پیش کیا گیا ہے، دوسرے مضمون میں آپ کے مکتوبات سے ـکی تجدید دین کو دکھایا گیا ہے، تیسرے مضمون میں عہد اکبری کی بے دینی، الحاد اور استخفاف دین

کو دکھا کر مجدد صاحب کے جہادِ تجدید کی عظمت کو نمایاں کیا گیا ہے، یہ مضمون اس اعتبار سے زیادہ مفید ہے، کہ جب تک عہد اکبری کی دینی ظلمت کا پورا علم نہ ہو، اس وقت حضرت مجدد صاحب کے نورِ تجدید کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا، چوتھے مضمون میں تجدید کے مختلف پہلوؤں کو اختصار اور جامعیت کے ساتھ مکتوبات سے دکھایا گیا ہے، اس کے علاوہ اور متعدد چھوٹے چھوٹے مفید مضامین ہیں، منظومات میں مولانا عبدالرشید صاحب شہزادپوری کی نظم بڑی پرکیف ہے،

اردو اقبال نمبر، مرتبۂ مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو تقطیع بڑی، ضخامت ۲۸۴ صفے، قیمت مرقوم نہیں، پتہ :- انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی،

انجمن ترقی اردو نے حکیم الامتہ شیخ محمد اقبال مرحوم کی یادگار میں اردو کا یہ خاص نمبر نکالا ہے، مرحوم اپنی اور حیثیتوں کو چھوڑ کر تنہا اردو کے محسن کی حیثیت سے بھی اس کے مستحق تھے، مرزا غالب کی موت کے وہ اس لئے بھی ماتم گسار تھے کہ ع گیسوے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے، انھوں نے اردو کی تنگ دامن شاعری کو جس کی ساری کائنات چند فرسودہ مضامین تک محدود تھی، حقائق و معارف کا گنجینہ بنا دیا، اردو نے یہ نمبر نکال کر کلام اقبال کے ایک بڑے تقاضے کو پورا کر دیا، اس میں اقبال کی تعلیمات اور ان کی خصوصیات شاعری کی پوری شرح موجود ہے، اس نمبر میں آٹھ مضامین ہیں، "اقبال کا تصور خودی" ڈاکٹر عابد حسین صاحب" رومی، نطشے اور اقبال" ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ" اقبال اور آرٹ"۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب جامعہ عثمانیہ" "اقبال کی شخصیت اور اس کا پیغام" ڈاکٹر قاضی عبدالحمید صاحب"؛ "اقبال کا ذہنی ارتقا" ابوظفر عبدالواحد صاحب ام اے لکچرار سٹی کالج حیدرآباد د۔" اقبال کا تصور زمان" سید نشیر الدین احمد صاحب" علامہ اقبال کی آخری علالت" سید نذیر نیازی صاحب"، اقبال اور اس کے نکتہ چین" آل احمد صاحب سرور مسلم یونیورسٹی، ان میں چھٹے اور ساتویں مضامین کو چھوڑ کر باقی

چہ مضامین میں اقبال کی شاعری اور ان کی تعلیمات کے تمام اہم پہلوؤں پر نہایت جامع تبصرہ ہے، ہر مضمون میں اس کے متعلقہ مباحث پر نہایت تفصیل و وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، اب تک اقبال کی شاعری کے متعلق جس قدر لٹریچر اردو میں شائع ہو چکا ہے، اس میں سے کسی میں یکجائی طور پر اس نمبر کے برابر اقبال کی شاعری کا ایسا تفصیلی تجزیہ نہیں کیا گیا ہے، جس سے اس کے تمام پہلو آئینہ ہو جائیں، جن لوگوں کو اقبال کے کلام کے مطالعہ کا کم موقع ملا ہے، یا مناسبت نہ ہونے سے ان کی تعلیمات کا پورا نقش ذہن میں نہیں جما انھیں اس نمبر کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے سرور صاحب نے اقبال کے نکتہ چینوں کا تشفی بخش جواب دیا ہے، لیکن ہمارے نزدیک جو لوگ الفاظ کے طلسم میں الجھے ہوئے ہیں، اقبال کا کلام ان کے مطالعہ کی چیز ہی نہیں ہے، اور جنھیں ان کی تعلیمات پر اعتراض ہے، انھوں نے یا اس کا پورا مطالعہ نہین کیا ہے یا اس کی روح سے ناآشنا ہین، ایسے لوگ اور زیادہ لائق خطاب نہین، اقبال اسلامی شاعر تھے، اور اسلام کی دی ہوئی تعلیم کی حد تک ساری دنیا کے لئے امن و آزادی کے پیامی تھے، اس سے زیادہ بلند بانگ دعوون کی حیثیت خوش آیند تخیل سے زیادہ نہیں ہے،

ترجمان القرآن، مرتبہ مولانا ابوالاعلی صاحب مودودی، تقطیع بڑی ضخامت ۳۲۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت عہ، پتہ:۔ دارالاسلام پٹھان کوٹ پنجاب،

مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے موجودہ سیاسی کشمکش میں مسلمانون کی پوزیشن اور ان کے آیندہ طریقۂ کار کے متعلق جو مضامین لکھے تھے، ان کا یہ دوسرا حصہ ہے، اس میں بارہ مضامین یا بحثیں ہیں، ان مضامین میں انھوں نے اپنے نقطۂ نظر سے ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات، سیاسی تحریک کے رہنماؤں کے خیالات اور ان کے مطمح نظر پر تنقید اور موجودہ نظام حکومت کا تجزیہ کرکے دکھایا ہے کہ وہ مسلمانوں کی انفرادی حیثیت کے بقا اور ان کی قومی خصوصیات

کے تحفظ کے لئے سخت مہلک ہے، اس میں رہ کران کی قومی خصوصیات قائم نہیں رہ سکتیں اور وہ دوسری قوموں کے ساتھ ضم ہو جائینگے ان مضرتوں کو دکھانے کے بعد اپنے نقطۂ خیال سے ایسا نظام عمل پیش کیا ہے جو مسلمانوں کی قومی خصوصیات اور ان کی انفرادی بقا کا ضامن ہوسکے،

سب رس دکن نمبر، مرتبہ مجلس ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن تقطیع بڑی، ضخامت ۲۱۲ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت :- عہ، پتہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن

اس نمبر میں قدیم عہد سے لیکر موجودہ دور تک کی دکن کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے، ابتدا میں اسلامی عہد سے پہلے کی مختصر تاریخ ہے، پھر اسلامی فتوحات کے دور کا حال ہے، اس کے بعد دکن کے اسلامی حکمران خانوادوں، بہمنی، عادلشاہی، قطب شاہی اور آصفی فرمانرواؤں کی سیاسی تاریخ اور ان کے امرار کے مختصر حالات ہیں، ضمناً کہیں کہیں علمی اور تمدنی حالات کے اشارے بھی ہیں، اس سیاسی تاریخ کے علاوہ دکن کے قدیم آثار یہاں کے علمی، تمدنی، صنعتی اور معاشرتی حالات پر بھی بعض چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں، سلاطین، امرار اور آثار کے ۸۰ فوٹو دیئے ہیں، اس نمبر کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے، کہ دکن کی تاریخ کا ایک مختصر مجموعہ مرتب ہو جائے، اس لئے اس کا کوئی مضمون مبسوط و محققانہ نہیں ہے، بلکہ ابتدائی درجوں کی درسی تاریخوں کے طریقہ پر دکنی سلطنتوں اور حکمرانوں کے مختصر حالات لکھدیئے گئے ہیں،

سالنامہ ادبی دنیا، مرتبہ جناب عاشق حسین صاحب بٹالوی و صلاح الدین احمد صاحب تقطیع بڑی، تقریباً اخباری، ضخامت ۲۵۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ، پتہ مال روڈ لاہور،

ادبی دنیا کا یہ سالنامہ اس کے گذشتہ سالناموں کی طرح تمام ظاہری اور معنوی خصوصیات کا حامل ہے، علمی و ادبی مضامین، ستھرے افسانے، اور منظومات ہر ذوق کا وافر سامان موجود ہے،

افسانے قریب قریب سب پر لطف اور پڑھنے کے لائق ہیں" نفرت" "من کی من میں" "روشنی کی کرن" "مسافر" "قبرستان کی ساحرہ" دلچسپ ہیں" ایک اتوار" ایک شوہر کا روزنامچہ" "بدلا ہوا زمانہ" "اور کن ل" خصوصیت کیساتھ پڑھنے کے لائق ہیں، افسانوں کے مقابلہ میں علمی مضامین نسبۃً کم اور معمولی ہیں، تاہم ان میں بھی" ودیاپتی اور اس کے گیت" "جرمن نسل کا ایک اردو شاعر" اور "سورج کا زوال" مفید ہیں، پروفیسر براس کا مضمون" جاپانی لڑکیوں کا تخیل" بہت دلچسپ ہے،

سالنامہ عالمگیر، مرتبہ جناب حافظ محمد عالم صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۳۱۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ، پتہ:۔ دفتر عالمگیر بازار سید مٹھا، لاہور،

عالمگیر کا سالنامہ اس مرتبہ کسی قدر پھیکا ہے، پھر بھی اس میں مطالعہ کے لئے دلچسپی کا کافی سامان موجود ہے اصلاحی افسانوں میں" بڑھاپے کی شادی" اور" کامیاب وکیل" سبق آموز ہیں، عام افسانوں میں "فراموش کار" "مادومی" "ڈاکٹر راشد" "خطرناک جادوگر" اور" جوانی کی یاد" دلچسپ ہیں، علمی مضامین میں" شاعر موت کے دروازہ پر" "درہ خیبر" اور" ابواسحٰق شیرازی" اور" ایجاد اولین" فائدہ سے خالی نہیں، مجموعی حیثیت سے یہ نمبر بھی خاصہ ہے،

سالنامہ ساقی، مرتبہ جناب شاہد احمد صاحب بی اے تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱؎، پتہ دفتر ساقی دہلی،

ساقی کا یہ سالنامہ ادب وافسانے کا اچھا مجموعہ ہے، حسب معمول مولوی عنایت اللہ صاحب دہلوی کے قلم سے شکسپیر کے ایک" ڈرامے" بادشاہ لی ار" (King Lear) کا ترجمہ اور مختلف رنگ کے دلچسپ افسانے ہیں، "زندگی کی اندھیری راتیں" "میں نے ایسا کیوں کیا" "ڈاک گھر" اور" بختاور" موثر اور سبق آموز اور" لال قہر" "دسا دھو کی پتری" "رضیہ" "اور چند عاشقانہ خطوط" دلچسپ ہیں" لال قہر میں لونڈی کی بحث میں قلم کی شوخی اعتدال سے بڑھ گئی ہے

ڈرامہ نگاری پر بھی بعض مضامین ہیں،

سالنامہ ہمایوں، مرتبہ میاں بشیر احمد صاحب بی اے آکسن تقطیع اوسط ضخامت ۱۰۴ صفحے،

کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲ر پتہ:- دفتر ہمایوں ۲۳ لارنس روڈ لاہور،

اب غالبًا ہمایوں صرف رسمًا سالنامہ نکالتا ہے، چنانچہ اس کے عام نمبروں اور سالنامو
کوئی زیادہ فرق نہیں ہے، لیکن جو کچھ ہے وہ سنجیدہ اور مفید، فاضل مدیر کے قلم سے "یوم اردو" کا
اور ۳۴ء کے سیاسی حالات و انقلابات پر تبصرہ مفید مضامین ہیں، افسانوں میں نقل و اصل "بہ
دلچسپ ہے، اور بھی چند افسانے اور ادبی مضامین ہیں،

سالنامہ پیام تعلیم، مرتبہ مولوی حسین حسان صاحب ندوی، تقطیع اوسط، ضخامت
ڈیڑھ سو صفحے کاغذ معمولی، کتابت وطباعت اچھی، قیمت مرقوم نہین، پتہ:- دفتر پیام تعلیم
جامعہ ملیہ دہلی،

بچوں کے مفید اور مقبول رسالہ "پیام تعلیم" نے اس مرتبہ اپنا سالنامہ صنعت و حرفت پر
اس میں چھوٹی چھوٹی اور آسان صنعتوں پر مضامین ہین، جنھیں بچے عملًا کر سکتے ہیں، مثلًا کاغذ کے
بنانا، ابری بنانا، گتے کا کام، اور باغبانی وغیرہ، بچیوں کے لئے سلائی اور کشیدہ کاری وغیرہ پر مضم
ہین، ان صنعتون کے نقشے اور عملی شکلین بھی دیدی گئی ہین، جنھین دیکھ کر بچے آسانی کے ساتھ نقل
لیں، یہ مضامین بچون کی صنعتی تربیت کے لئے بھی مفید ہیں اور دلچسپ مشغلہ بھی، صنعتی مضامین کید
ساتھ بچون کے ذوق اور دلچسپی کے لئے کہانیاں اور قصے بھی ہیں، لیکن ان سب مین صنعتی پہلو کا
رکھا گیا ہے، یہ سالنامہ گذشتہ سالناموں کے مقابلہ میں زیادہ مفید ہے،

الاصلاح عید نمبر، مرتبہ جناب علی جان صاحب مسکین، تقطیع بڑی ضخامت ۱۰۴ صفحے،
کاغذ، کتابت وطباعت نہایت معمولی، قیمت مرقوم نہیں، پتہ ڈونگری اسمٰعیل پریس، بمبئی،

الاصلاح خوجہ جماعت کا ہفتہ وار اخبار ہے، عید الفطر کے موقع پر اس نے یہ نمبر نکالا ہے، مذہبی، علمی، اصلاحی، معاشرتی اور ادبی رنگا رنگ مضامین کا ضخیم مجموعہ ہے، یہ ہفتہ وار سیاسی اور ادبی اخبار ہے، اس لئے تمام مضامین بھی اسی درجہ کے ہیں، کتابت کی غلطیوں کے علاوہ واقعات میں بھی کہیں کہیں غلطیاں نظر آتی ہیں، مثلاً ایک جگہ (ص ۶۷) اکبر کو لال قلعہ میں دکھایا گیا ہے، اور اس قبیل کی بعض غلطیاں ہیں، طباعت کی غلطیوں سے آیات قرآنی بہت غلط چھپ گئی ہیں، لیکن ہفتہ وار اخبار کا ایسا ضخیم کم دیکھنے میں آیا ہے، تصویریں بکثرت ہیں،

"م"

تابعینؒ

مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی

علم و عمل اور مذہب و اخلاق میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے، اور صحابہ کرام کے بعد ان ہی کی زندگی مسلمانوں کے لئے نمونۂ عمل ہے، اس لئے سیر الصحابہ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس میں حضرت عمر بن عبد العزیز، حضرت حسن بصریؒ، حضرت اویس قرنیؒ، حضرت امام زین العابدینؒ، حضرت امام باقرؒ، حضرت امام جعفر صادق، حضرت محمد بن حنفیہؒ، حضرت سعید بن مسیبؒ، حضرت سعید بن جبیرؒ، حضرت محمد بن سیرینؒ، امام ابن شہابؒ زہری، امام ربیعہ رائیؒ، امام مکحولؒ شامی، قاضی شریحؒ وغیرہ، چھیانوے اکابر تابعینؒ کے سوانح، ان کے علمی، مذہبی، اخلاقی، اور عملی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے،

ضخامت :- ۵۶۰ صفحے، قیمت :- للعہ

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

مسلمانوں کا ماضی حال اور مستقبل
از میاں بشیر احمد صاحب بیرسٹر ایٹ لا، مدیر ہمایون تقطیع اوسط، ضخامت ۷۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت (؟) پتہ دفتر ہمایون نمبر ۲۴، لارنس روڈ لاہور۔

میاں بشیر احمد صاحب نے انجمن حمایت اسلام لاہور کی طلائی جوبلی کے موقع پر یہ تقریر کی تھی، جسے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے، اس میں مسلمانون کے روشن ماضی اور موجودہ انحطاط پر تبصرہ کرکے آیندہ ان کی اصلاح و ترقی کا پروگرام بتایا ہے، اس سلسلہ میں دنیا کی سیاسی رفتار اور موجودہ عالمگیر انقلابات یورپ کی محدود قومیت اور وطنیت اور زندگی تمام شعبوں میں ان کے مادی نقطۂ نظر اور اس کے نتائج کو دکھا کر اس کے مقابلہ میں اسلام کے روحانی اور اخلاقی نقطۂ نظر، اسکی وسیع اور ہمہ گیر قومیت، اس کے جمہوری نظام اور اخلاق و روحانیت اور عمل سے معمور دستور حیات کو پیش کیا ہے، اس کے بعد مسلمانون کی علمی اور تمدنی ترقیوں، اور اس سے یورپ کے استفادہ کے حالات اور مسلمانوں کے زوال اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے، پھر ہندوستان میں مسلمانوں کی عادلانہ حکومت اور ان کی علم پروری اور تمدن نوازی کا مختصر ذکر کرکے انگریزی عہد میں ہندوستان کے سیاسی ارتقا اور مسلمانون کے زوال و انتشار کی کہانی سنا کر اُن کی آیندہ تعمیر کے لئے مذہبی، معاشرتی، معاشی، تعلیمی اور سیاسی اصلاح و تنظیم کے مشورہ دیئے ہیں، اور اس کے عملی طریقے بتائے ہیں، اس تقریر میں کوئی نئی بات نہیں ہے، بار بار کی کہی ہوئی باتیں ہیں، سیاسی خیالات میں آج کل کا اختلافی نقطۂ نظر نمایاں ہے لیکن میاں صاحب

نے جو کچھ کہا ہے، اسلامی درد سے کہا ہے، اور مذہب سیاست اور تمدن ہر چیز کو اس کے مقام پر رکھا ہے، خدا ان باتوں میں تاثیر عمل عطا فرمائے،

مکاتیب مہدی مرتبہ مہدی بیگم تقطیع بڑی ضخامت ۳۰۲ صفحے، کاغذ سپید کتابت و طباعت روشن، قیمت :- ع۱، پتہ مہدی بیگم بسنت پور، گورکھپور،

مکاتیب مہدی ہماری زبان کے نامور انشا پرداز ایم مہدی حسن افادی الاقتصادی مرحوم کے خطوط کا مجموعہ ہے، مرحوم اردو زبان کے ان صاحب طرز انشا پردازوں میں تھے جن کا طرز انہی کے ساتھ ختم ہو گیا، مولوی محمد حسین آزاد کی طرح ان کا طرز نگارش بھی ناقابل تقلید تھا، وہ فطرۃً حسن دوست اور جمال پرست تھے جس کا پرتو انکی زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں تھا، اس اثر نے انکی انشا کو حسن و پاکیزگی لطافت و نزاکت اور شوخی و بانکپن کا بوقلموں گلدستہ بنا دیا تھا، ان کی کوئی تحریر اس رنگ سے خالی نہ ہوتی تھی، یہی حال ان کے خطوط کا ہے، ان کی شوخی تحریر کبھی کبھی ایسے نازک حد کو پہنچ جاتی ہے، جسکا نبھانا انہی جیسے ادا شناس ادب کا کام تھا، وہ اپنے حسن مذاق سے اس پر ایسا لطیف حجاب ڈالدیتے تھے، کہ کہنے کو پردہ بھی حائل ہو جاتا ہے، اور اندر سے شوخی بھی مسکراتی رہتی ہے، انکی تحریر کی لطافتیں نقد و بصرہ کی متحمل نہیں ہیں، استاذ محترم مولینا سید سلیمان ندوی نے دیباچہ میں بالکل صحیح تحریر فرمایا ہو کہ مرحوم کے خطوط پر نقد و تبصرہ اور انکی خوبیوں کو ایک ایک کرکے دکھانا ایسا ہی ہے جیسے کسی خوشرنگ اور خوشبو پھول کی ایک ایک پنکھڑی کو توڑ کر کوئی ستمگار قدرت کی صناعی کی داد دے، وہ پھول ہیں پھول، انکی قدر یہی کہ آپ ان سے لطف اُٹھائیں اور بس جہاں آپنے ان کی طرف ہاتھ بڑھائے وہ مرجھانے لگے نازک پتیاں آپکی انگلیوں کی سختی سے جھڑنے لگیں" ان کے ادب و انشا کے ادب شناسوں کو اس خزانہ حقیقت کا پورا اندازہ ہوگا، عام طور پر پبلک کی نگاہوں کے سامنے آنے والے مضامین اور نجی کے خطوط بڑا فرق ہوتا ہے، مضامین میں تحسین و قبول کرلئے کچھ ادب و انشا کا اہتمام ہوتا ہے، کچھ ناقابل اظہار

جذبات و خیالات کا اظہار ہوتا ہے، اسلئے کسی شخص کے صحیح خیالات اندرونی جذبات اور بے ساختہ طرز تحریر کا صحیح اندازہ اس کے نجی خطوط ہی سے ہو سکتا ہے، اس میں تکلف و تصنع کا کوئی پردہ نہیں رہتا، اور لکھنے والے کی شخصیت بے حجاب نظر آتی ہے، اس لحاظ سے مرحوم کے مضامین کی انشا کی خصوصیات اور ان کے خطوط میں کوئی فرق نہیں، جو شوخی و سحر طرازی سر محفل تھی، وہی پردہ محمل میں نظر آتی ہے، اس مجموعہ میں مختلف لوگوں کے نام کم و بیش دو سو خطوط ہیں اور مکتوب الیہم کے تعلقات، شخصیت اور مذاق کے لحاظ سے ان کے مضامین مختلف ہیں، کسی میں علمی مشورے ہیں، کسی میں ادبی لطائف ہیں، کسی میں شوخی و ظرافت ہے، کسی میں خانگی باتیں ہیں، غرض یہ مجموعہ رنگا رنگ پھولوں کا گلدستہ ہے، لیکن ادب و انشا کی نیرنگیاں سب میں یکساں ہیں، ان خوبیوں کیساتھ مرحوم انسان تھے، ان کا دور دوسرا تھا، مذاق جدا گانہ تھا، اس لئے آج کل کے مذاق کے لحاظ سے بعض خیالات اور اسلوب اجنبی معلوم ہوں گے، جو زمانہ اور مذاق کے تغیر کا لازمی نتیجہ ہے،

تنویر ادب مؤلفہ جناب احمد جانصاحب ایم اے، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۹۵ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت اور پتہ مرقوم نہیں، غالباً روپیہ سوا روپیہ میں الہ آباد کے تاجران کتب سے ملے گی،

اردو نظم و نثر کی علیحدہ علیحدہ مطول تاریخیں متعدد ہیں، لیکن دونوں کی مشترک بہت کم ہیں، پھر ان میں جدید تحقیقاتوں کا پورا استقصار نہیں ہے، اور ایسی مختصر اور جامع تاریخیں تو بالکل نہ تھیں جو اردو کے طلبہ کو طویل کتابوں کے مطالعہ کی زحمت سے بچا سکیں، اس طرف اس طرز کی ایک دو کتابیں لکھی گئیں لیکن وہ بعض پہلوؤں سے ناقص ہیں، "تنویر ادب" ہر لحاظ سے مکمل اور جامع ہے، اب تک اردو نظم و نثر کے متعلق جو کچھ لکھا جا چکا ہے، اور جتنی تحقیقات ہو چکی ہے، وہ سب بہین سلیقہ کے ساتھ جمع کر دیگئی ہے، ابتدا میں اردو زبان کے ماخذ اور اسکے تکوینی دور کے مختصر حالات اور اسکے ابتدائی تذ

ہیں، پھر شاعری کے ابتدائی دور یعنی دکنی شاعری کی تاریخ ہے، پھر شمالی ہند میں اس کے آغاز سے لیکر موجودہ عہد تک کے تمام دوروں کے حالات، شاعری کی عہد بعہد کی ترقیوں، ان کی خصوصیات اور تغیرات پر تبصرہ ہے، اسی طرز پر نثر کی پوری تاریخ ہے، اس طرح اس میں اردو نظم و نثر کی تاریخ، شعراء، ادیبوں اور مصنفوں کے حالات ہر دور کی ادبی خصوصیات، رجحانات، تغیرات، مصنف کے خدمات، اسلوب تحریر، وغیرہ زبان وادب کے مختلف پہلوؤں پر ناقدانہ تبصرہ ہے، اس کتاب میں معلومات کے لحاظ سے کوئی نیا اضافہ نہیں ہے لیکن اختصار اور جامعیت کیساتھ ترتیب اور تنقید بہت اچھی ہے، خصوصاً اردو نثر کے اصناف کی تقسیم اور تنقید میں حسن مذاق سے کام لیا گیا ہے، یہ کتاب اردو کے طلبہ کیلئے بہت مفید ہے،

حیدرآباد دکن میں آریاسماجی تحریک } شائع کردہ محکمہ اطلاعات ریاست حیدرآباد، تقطیع بڑی ضخامت ۹۵ صفحے، پتہ محکمہ اطلاعات حیدرآباد

آریوں نے جن غلط اور بے بنیاد الزاموں کو آڑ بنا کر ریاست حیدرآباد کے خلاف شورش مچا رکھی ہے، اس سرکاری بیان میں اسکی تردید اور آریوں کی فتنہ انگیزیوں کی پوری تفصیل ہے، آریہ لیڈروں کی اشتعال انگیز تقریروں اور ان کے اخبارات کے مضامین کے اقتباسات مع حوالہ نقل کئے گئے ہیں، ریاست پر جو غلط الزامات لگائے جاتے ہیں، اور واقعات کو جس طرح مسخ صورت میں پیش کیا جارہا ہے، اور ہندو مسلمانوں کی مشترکہ پابندیوں کی جو یک رخی تصویر دکھائی جارہی ہے، ان سب کی حقیقت ظاہر کی گئی ہے، اس بیان کو پڑھنے کے بعد کوئی منصف مزاج ہندو بھی آریوں کی شورش کو حق بجانب قرار نہیں دے سکتا، یہ واقعہ ہے کہ رعایا کی آزادی، اور غیر مذاہب والوں کیساتھ رواداری میں ریاست حیدرآباد اکثر دیسی ریاستوں میں ممتاز ہے، اسکی تفصیلات میں پڑنے کا یہ موقع نہیں ہے، لیکن واقف کار ہندو بھی اس سے انکار نہیں کرسکتے، کہ آج حیدرآباد میں کتنے ہندو

ریاستیں ہیں، کتنے ہندو وظیفہ خوار ہیں، ان کے کتنے اداروں کو امداد ملتی ہے، ان کے معبدوں پر جاگیریں وقف ہیں، بہ حیثیت مجموعی ملازمتوں میں ان کا تناسب مسلمانوں سے کتنا زیادہ ہے، پھر یہ بھی قابلِ غور ہے، کہ مسلمان ریاستوں کے مقابلہ میں ہندو ریاستوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے، اس لئے آج جو آگ حیدرآباد کے خلاف لگائی جارہی ہے، کیا کل اس کے شعلے ہندو ریاستوں میں نہ پہنچ جائیں گے، جائز حقوق کے لئے جد وجہد کرنا بُرا نہیں ہے لیکن اس کو فرقہ وارانہ رنگ دیکر نفرت کی آگ بھڑکانا کسی حیثیت سے مفید نہیں ہے، خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ حیدرآباد میں مزید اصلاحات کا مسئلہ درپیش ہے، جو ہندو اخبارات آزادی کے مدعی ہیں، انھیں چاہئے، کہ اس پمفلٹ کو شائع کریں، یا کم از کم اس کے متعلق اپنی رائے ظاہر کریں،

بالشتیوں کی دنیا مترجمہ جناب سید فخرالدین صاحب، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۲۴ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۱۲، دفتر روزانہ ہند، نمبر ۱۔ ساگر دت لین کلکتہ،

یہ کتاب انگریزی زبان کے مشہور مصنف جوناتھن سیوفٹ (Jonathan Swift) کی نہایت مقبول اور معروف کتاب ہے، مصنف نے اس میں ایک سیاح کے لباس میں بالشتیوں کی ایسی خیالی دنیا کے حالات دکھائے ہیں، جن کے قد کل چھ انچ کے ہیں، اسی تناسب سے یہاں کی ساری مخلوق نباتات، حیوانات، جمادات، پہاڑ، دریا، حکومت، فوج، مکانات، زندگی کے جملہ ساز و سامان چھوٹے چھوٹے ہیں، سید فخرالدین صاحب نے اردو میں اس کا ترجمہ کیا ہے، ترجمہ سلیس اور کتاب اتنی دلچسپ ہے، کہ بغیر ختم کئے ہوئے ہاتھ سے نہیں چھوٹتی،

"م"

رجسٹرڈ نمبر

مارچ ۱۹۳۹ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت پانچ روپے سالانہ

مطبع دار المصنفین اعظم گڑھ

سیرۃ النبی

رسول اللہ صلعم کے حالات وغزوات، اخلاق وعادات اور تعلیم وارشاد کا یہ عظیم الشان
کتابی ذخیرہ جس کا نام سیرۃ النبی عام طور سے مشہور ہے، مسلمانون کی موجودہ ضروریات
کو سامنے رکھکر صحت واہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے،

ابتک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہوچکے ہین، پہلے مین ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات
اور غزوات ہین، اور ابتدا مین ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جسمین فن سیرت کی تنقید [illegible]
ہے، دوسرے حصہ مین تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق وعادات، اعمال وعبادات اور
اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے، تیسرے حصہ مین آپ کے معجزات وخصائص نبوت پر بحث ہے
اسمین سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثین کیگئی ہین، پھر ان معجزات کی تفصیل
ہے جو بروایات صحیحہ ثابت ہین، اسکے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید وتفصیل کیگئی
ہے، چوتھے حصہ مین ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپ کے ذریعہ مسلمانون کو تعلیم کئے گئے ہین
کوشش کی گئی ہے کہ اس مین قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائین، پانچویں
حصہ مین عبادت کی حقیقت، عبادات کی تفصیل وتشریح اور ان کے مصالح وحکم کا بیان ہے
اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ وموازنہ ہے،

چھٹا حصہ جو اخلاق پر مشتمل ہے تقریباً چھپ گیا ہے امید ہے کہ شروع مین انشاء اللہ تعالیٰ ہاتھون مین پہنچ جائیگا
قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول تقطیع خورد [illegible] حصہ دوم تقطیع کلاں [illegible] تقطیع خورد [illegible]
حصہ سوم تقطیع کلاں [illegible] تقطیع خورد [illegible] حصہ چہارم تقطیع کلاں [illegible] تقطیع خورد [illegible]
حصہ پنجم تقطیع کلاں [illegible] (منیجر دار المصنفین اعظم گڑھ)

جلد ۴۳ | ماہ محرم الحرام ۱۳۵۸ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۳۹ء | عدد ۳

مضامین

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چھٹی جلد بحمد اللہ کہ چھپ کر تمام ہوگئی، یہ ۶۱۲ صفحون مین ختم ہوئی، شروع مین ایک مقدمہ ہے جس مین اسلام کے فلسفۂ اخلاق کی پوری تشریح ہے، اس کے بعد حقوق، فضائل، رذائل اور آداب کے عنوانون اور ذیلی عنوانون مین اخلاقی تعلیمات کی تفصیل ہے،

مہتمم دار المصنفین مولانا مسعود علی صاحب ندوی امسال حج کے لئے تشریف لے گئے تھے خدا کا شکر ہے کہ وہ ۲۷ ذیحجہ کو بخیر وخوبی ہندوستان واپس تشریف لائے، اس مقدس سفر مین انھون نے برکتون اور سعادتون کے حصول کی پوری توفیق پائی، دار المصنفین ان کی بخیریت واپسی پر ان کو مخلصانہ مبارکباد پیش کرتا ہے،

بہار کی ہندوستانی کمیٹی اپنا کام مستعدی سے انجام دے رہی ہے، مولوی عبدالحق صاحب کی نگرانی مین ہندوستانی لغت، اور ڈاکٹر تاراچند کے تحت علمی اصطلاحون کا کام ہو رہا ہے: پہلا موقع ہوگا جس مین ہندوستان کی تاریخ جو ہندو مسلمانون کی لڑائی کی اصلی جڑ ہے، اس طرح پڑھائی جائے گی کہ مسلمانون کو شکایت کا موقع نہ رہے،

اعلیحضرت حضور نظام سابع خلد اللہ ملکہ

کا

ارشادِ گرامی

بدعاتِ محرم پر

محرم کے خونین واقعات سے کس مومن کا دل خون نہیں، اور جگر گوشۂ رسول اور اہلبیت اطہار رضی اللہ عنہم کے مصائب کی یاد سے کس مسلمان کا جگر شق نہین، لیکن ضرورت اس کی ہے کہ غم کو غم کی حیثیت دی جاے، اور تولاے اہلبیت کرام کے صحیح آثار پاے جائین، جاہل مسلمانون نے ان واقعات کو لہو ولعب کا ذریعہ بنا لیا ہی، اور اس نام سے وہ کچھ کیا جاتا ہے جس سے اسلام اپنے پیروون سے شرمسار ہے، اور صحیح یہ ہے کہ ہند کے کفرستان مین مسلمان محرم مین وہ کچھ کرتے ہین جو ایسے موحدین کے لئے زیبا نہین، ان منہیات اور بدعات کے خلاف علماے حق نے ہمیشہ آوازین بلند کی ہین، اور ان کو صفائی کے ساتھ خدا اور رسول کی ناراضی کا ذریعہ ظاہر کیا ہے، مگر ان کی باتون کو لوگون نے سمعِ قبول سے نہین سنا، ایران مین اعلیحضرت شہنشاہ پہلوی نے ان بدعات کا بزور قلع وقمع کیا ہے، اور عزاداری کے غلط اور خلاف شرع طریقون سے اپنی

رعایا کو باز رکھا ہے،

ہندوستان مین اس شاہانہ فرض کو صحیح طور سے اعلیحضرت حضور نظام سابع خلد اللہ ملکہ نے ادا فرمایا ہے، اور خود اپنے قلم گوہر بار سے اس مختصر فرمان کو لکھکر شائع فرمایا ہے:

ہم بھی اس غرض سے کہ ہندوستان کے طول وعرض مین مسلمان، شاہ دکن کے اس ارشاد گرامی سے فیض اٹھائین، معارف مین اسکو شائع کرنے کی عزت حاصل کرتے ہین

ارشاد گرامی کے آخر میں جس ربع صدی پہلے کی اصلاح کی طرف اشارہ ہے وہ وہ اصلاح ہے جو شہنشاہ پہلوی کے دور سے بھی پہلے خود اعلیٰ حضرت نے اقلیم دکن میں نافذ فرمائی تھی،

"صحیح تعزیہ داری حسینؑ"

آہ مثل قرون اولیٰ فی زمانا وہ نفوس زکیہ (یعنی بزرگان دین) کہاں "جو فلسفہ شہادت" کے صحیح معنیٰ ومفہوم سے واقف ہوکر اور"شہادت کبریٰ" کی عظمت کو سمجھکر اور تعلیم حسینیؑ سے درس لے کر ایسی"ہستی ذیشان"پر جس نے کہ جان ومال اور سارے کنبہ کو صرف"بقاے اعلاے حق"کے خاطر قربان کر دیا تھا، اس پر ساری عُمر آہ و بُکا کرتے رہے، برخلاف اس کے آجکل دوران ایام عزا مین جو جو بدنما منظر چوطرف نظر آتے ہین وہ یا تو"محض رسمی"طور پر دکھائی دیتے ہین یا" اجرت" وصول کرنے کے خاطر انجام پاتے ہین، یعنی وہ طبقہ یا تو ماتم کرنے والا ہوتا ہے یا منبر کے سامنے بیٹھکر لکھنوی ذاکر کے کلام کی داد اوچھل اوچھل کر دینے والا ہے یا زیادہ سے زیادہ رونے کا منھ بنانے والا یا آواز نکالنے والا ہوتا ہے، جبکہ ایک قطرہ آنسو آنکھ مین

دکھائی نہ دیتا ہو، !!
اس کے سوا یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جھٹکہ کے ٹٹو کو کرایہ پر لاکر گلی کوچہ مین گشت
کرا کے "ذو الجناح" کی تحقیر کی گئی ہے، یا بازارون مین کاغذ کے تابوت کو گشت
کرا کے ندی کے قریب یا چپٹ میدان مین زیرزمین دفن کرکے اس کی بے حرمتی
کی گئی ہے یا سرِ بازار سر پیٹ کر ماتم کی وقعت کو تباہ کیا گیا ہے یا بعض وقت
او شما کو" اکابرِ دین متین صلوٰۃ اللہ علیھم اجمعین کی "تمثیل" بنا کر گناہ کبیرہ
کا ارتکاب کیا گیا ہے، اور ایسے مذموم حرکات کرکے گروہِ بدمعاشان نے اپنے
مذہب کی اپنے ہاتھون سراسر تحقیر غیر مذاہب کے آنکھون مین کرائی ہے، !!
دوسری طرف ابھی تک ان جہلا کو نہ مذہب کے مالۂ وماعلیہ پر دسترس
حاصل ہے اور نہ اس کی اصلی خوبی کو سمجھنے کی اُن کے سرون مین صلاحیت موجود
ہے، کیونکہ ظاہر ہے کہ جس طبقہ سے ان کا تعلق ہے وہ محض "بازاری" ہے، ورنہ اگر
یہ بات پیدا نہ ہوتی تو کیا مجال کہ ایسے مذموم حرکات اس سے سرزد ہوتے" (حاشا)
بہرحال اب بھی وقت باقی ہے کہ ٹھنڈے دل سے ان امور پر غور کرکے اور
ان بدعتون کو یک لخت چھوڑ کر کوئی دوسرا بہتر راستہ "فلاح دارین" کا اختیار کیا جائے
تو نتیجۃً باعثِ نجات اپنے لئے ہو، ورنہ یاد رہے کہ وہ زمانہ دور نہین ہے جب
"عقول ناقدہ" ان پر ایسی گرفت کرینگے کہ اس وقت ان ہفوات کا تنقید کی زد پر
آنا امر محالات سے ہو جائے گا، کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ آجکل کے دہریت کے زمانہ
مین کوئی چیز جو کہ مذہب سے منسوب ہو وہ پہلے" دلائلِ عقلی و نقلی کی کسوٹی پر نہ کس
دیجائے اس کو بے چون و چرا تسلیم کرنے کے لئے" روشن دماغ" تیار نہین ہین اور

امر واقعی بھی یہی ہے کہ جب تک آب دریا خس و خاشاک سے پاک و صاف نہیں ہوتا کبھی وہ گروہ تشنگان کے جاذب نظر نہیں بن سکتا،

ف۲۰، بہرحال جہانتک ممکن ہے جس طرح سے رُبع صدی قبل سے عیش و عشرت، کھیل کود اور مزخرفات کو محرم کے حدود سے خارج کر کے اس کو صحیح روشنی مین "دنیاے اسلام" کے سامنے پیش کیا گیا ہے، اسی طرح تمام بدعتون کو بھی وکن کی حد تک ملیامیٹ کر کے صحیح معنون مین "عظمت ایام عزا" کو برقرار رکھا جانا ضروری ہے کہ منجملہ دیگر فرائض کے ہر مسلم فرمانروا کے ذمہ "حفاظت شعائر دین متین" بھی (از زد بے حرمتی)، کی گئی ہے، جس کی گواہی نص قرآنی سے ملتی ہے کہ

"وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ"

سبحان اللہ اس سے بڑھ کر معاملۂ زیر بحث کی اور کیا توضیح و تشریح ہو سکتی ہے!!

مقالات

عرب اور امریکہ

یہ مضمون دراصل "عربوں کی جہازرانی" کے سلسلہ میں ۱۹۳۱ء میں لکھا گیا تھا، مگر چند حوالوں کے ناقص ہونے کے سبب وہ اس میں شامل نہیں کیا گیا، ۱۹۳۷ء میں علی گڈھ مسلم کانفرنس کی جوبلی میں اسلامی علوم و فنون کے شعبہ میں پڑھکر سنایا گیا،

"س"

عام طور سے مشہور ہے کہ امریکہ کو کولمبس نے ۱۴۹۲ء میں دریافت کیا ہے، یہ شہرت اس لحاظ سے تو صحیح ہے، کہ عام متمدن پرانی دنیا کو اس نئی دنیا سے پوری واقفیت اُسی وقت سے ہوئی، اور اسی کے بعد سے دونوں میں میل جول اور ہر قسم کے علمی و تمدنی و تجارتی تعلقات قائم ہوئے، یہانتک کہ آج نئی اور پرانی دنیا ایک گھر کے دو آنگن بن گئے ہیں، مگر یہ صحیح نہیں کہ کولمبس سے پہلے اس نئی دنیا میں پرانی دنیا کی کسی نو وارد قوم یا اشخاص کے قدم نہیں پہونچے،

یہ مسئلہ کہ امریکہ تک کبھی عرب جہازران پہنچ چکے تھے، گو ہندوستان میں نیا ہو، مگر مصر کے بعض ممتاز فاضلوں نے اس پر متعدد اوقات میں بحثیں کی ہیں، علامہ زکی پاشا نے سسلی کے عرب جغرافیہ نویس ادریسی المتوفی ۵۶۰ھ کی نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق کا ایک حوالہ پیش کیا تھا جس میں بحر ظلمات

میں اندلس کے چند عرب نوجوان جہاز رانون کے جہاز چلانے کا ذکر ہے، مگر ابھی تک نہ تو مصر میں اور نہ ہندوستان میں اس مسئلہ کے تمام اطراف پر بحث کی گئی ہے، اور نہ تمام ممکن مواد بھی فراہم کیا گیا ہے،

اس سلسلہ میں حسب ذیل باتیں تنقیح کے قابل ہیں،

۱- کیا عربوں نے اور زیادہ عام لفظوں میں کیا مسلمانوں نے "ربع مسکون" کے پرانے نظریہ کی تنقید کی تھی،

۲- کیا ان کو زمین کی گولائی اور اس کے تحتانی اور فوقانی حصّوں کا علم تھا،

۳- کیا ماوراے بحر ظلمات انھوں نے پہنچنے کی کوشش کی،

۴- کیا آج کل کے نئے محققین اس نظریہ کو قبول کر سکتے ہیں،

ذیل کی سطروں میں ان میں سے ہر ایک مسئلہ پر تلاش و فکر کے نتیجے پیش کرتا ہوں،

ربع مسکون بطلیموس نے دو خطوں کے تقاطع سے روے زمین کے چار برابر حصّے کئے تھے ایک خط قطب جنوبی کو قطب شمالی تک فرض کیا تھا، اور دوسرا زمین کے بیچ سے آفتاب کے بالمقابل پہلے خط کو کاٹتا ہوا، (اس کو خط استوا کہتے ہیں) وسط افریقہ سے گذرتا ہے، اس طرح دو خطوں کے تقاطع سے زمین کے چار فرضی حصّے ہوے، دو شمالی اور دو جنوبی، اور خط استوا ان دونوں شمالی اور ان دونوں جنوبی حصّوں کے بیچ سے گذرتا ہے، بطلیموس کی رائے یہ ہے، کہ انسانی آبادی روے زمین کے ان چار حصّوں میں سے صرف ایک شمالی حصّے میں ہے، اسی کو اصطلاح میں ربع مسکون کہتے ہیں، یعنی چوتھائی حصّہ (ربع) جو آباد ہے (مسکون) باقی تین چوتھائی حصّے زیادہ تر سمندروں میں غرق ہیں، اور کچھ گرمی اور سردی کی غیر معتدل شدت کے سبب سے سکونت کے قابل نہیں،

مسلمانوں نے شروع میں بطلیموس کے اس نظریہ کو بعینہٖ تسلیم کیا، لیکن بہت جلد وہ اس پر شکوک اور اعتراضات وارد کرنے لگے، بطلیموس کے حامیوں نے اسکی رائے کی صحت پر فلسفیانہ اور طبعی دلائل

...ھ کر کھڑے کئے، مگر دوسروں نے ان کو توڑ دیا، اور ایک مدت تک یہ مناظرہ گرم رہا، بیرونی، ابن رشد،
...سی، قطب شیرازی، شریف جرجانی، برجندی، قوشجی، اور چغمنی کی تصنیفات میں زمین کی ہیئت کے باب
...ں یہ بحثیں مذکور ہیں یہاں مثال کیلئے نصیر طوسی المتوفی ۶۷۲ھ کے تذکرہ اور اسکی شرح توضیح التذکرہ
...لفہ نظام اعرج (تالیف ۷۱۱ھ)، اور اسکے حاشیہ سے کچھ عبارتیں نقل کرتا ہوں،

وھذا التقسیم غیر صحیح فاسد ایضا	یہ تقسیم صحیح نہیں، غلط ہے، اس لئے
لانا مارائینا لھم فی ھذہ المقدمۃ	کہ ان کے دعوی کے ثبوت میں کوئی شبہہ
شبھۃ فضلا من حجۃ فعلی ھذا	بھی میں نے نہیں پایا، چہ جائیکہ کوئی دلیل
یحتمل ان یکون فی الارباع الباقیۃ	ان کے پاس ہو، اس بنا پر یہ بالکل ممکن ہو
عمارات کثیرۃ لم یتصل الینا خبرھم	کہ زمین کی باقی چوتھائیوں میں بہت سی
لما بیننا وبینھم من البحار المغرقۃ	آبادیاں ہوں جن کی خبر ہم تک اسلئے
والجبال الشاھقۃ،	نہیں پہونچی، کہ ہمارے اور ان کے درمیان
(نسخہ قلمی دار المصنفین)	جدا کرنے والے سمندر اور بڑے بڑے پہاڑ ہیں

اسی طرح جنوبی حصہ میں آفتاب کی شدت گرمی کے سبب سے عدم آبادی کا جو پرانا نظریہ تھا، اس
...بھی ضرب کاری لگائی اور کہا،

لجواز ان یکون مسکونا ولم یصل	اس امکان کے سبب سے کہ وہ بھی
الینا خبرھم للبحار العظیمۃ و	آباد ہوں، اور ہم تک ان کی خبر اسلئے
الجبال الشامخۃ الشاھقۃ	نہ پہونچی ہو کہ بڑے بڑے دریا اور پہاڑ
المانعات من ان یصل خبرھم	بیچ میں حائل ہوں، جو ان کے حالات ہم
(کتاب مذکور)	تک پہنچنے سے مانع ہوں،

آخر میں اس نظریہ کی کہ صرف "ربع مسکون" ہی کیوں کھلا ہوا ہے، اعتراض اور جواب کے بعد غالباً کوئی سنجیدہ دلیل نہ پاکر کہا،

وبالجملة ليس لانكشاف هذا	حاصل یہ کہ زمین کے شمالی چوتھائی حصہ
القدر المذكور من الارض اى	کے صرف کھلے ہونے کا سوائے عنایت
الربع المسكون الشمالى سبب	الٰہی کے کوئی سبب معلوم نہیں، ورنہ کوئی
معلوم غير العناية الالٰهية و	دلیل اس پر نہیں کہ کیوں ایک ہی شمالی
الاما فضل احد الربعين الشماليين	چوتھائی حصہ آبادی اور رہنے کے لائق ہو
بها اى بالعمارة والسكنى دون	اور دوسرا نہ ہو، حالانکہ اس کے سب
الآخر مع تساوى ارتفاعهما	حصوں کی وضع (پوزیشن) فلکیات کی
بالقياس الى السماويات، (کتاب مذکور)	نسبت سے برابر ہے،

شارح نے اس "عنایتِ الٰہی" کے نظریہ کو بھی تسلیم نہیں کیا، اور کہا کہ ممکن ہے کہ عنایت نے دوسرے ربع شمالی میں بھی آبادی رکھی ہو،

لجواز ان يكون الربع	اس کا پورا امکان ہے کہ دوسرا چوتھائی
الآخر مسكوناً معموراً ولم	حصہ بھی معمور اور آباد ہو، اور وہاں کے
يصل الينا خبرهم، (کتاب مذکور)	رہنے والوں کا حال ہم کو معلوم نہ ہو،

اس بحث سے اندازہ ہوگا، کہ اس پرانی دنیا کے علاوہ دوسری دنیا کا نظریہ مسلمانوں نے علمی استدلال کے طریقہ سے سمجھا تھا، اور یونانی نظریہ ربع مسکون کی کوئی طبعی اور فلسفیانہ توجیہ ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی، نویں صدی ہجری کے وسط میں قاضی زادہ رومی نے محمود چغمینی المتوفی ۷۴۵ھ ۱۳۴۴ء کی ملخص کی شرح میں جس کو اس نے رصد خانہ سمرقند کے بانی سلطان الغ بیگ کے نام سے لکھا ہے، کہا ہے:

وسائر الارباع خراب ظاهراً و	اور باقی تین چوتھائی زمین بظاہر غیر آباد
الا نوصل خبرهم الينا غالباً و	ہے، کہ اگر غیر آباد ہوتی، تو غالباً اس کا حال
يحتمل ان يكون بيننا وبينهم بحار	ہم تک پہنچتا، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے
مفرقة وجبال شاهقة وبوادٍ	اور وہاں کے باشندوں کے درمیان بڑے
بعيدة تمنع وصول الخبر الينا،	سمندر، پہاڑ اور دور دراز صحرا ایسے ہوں
غيران احد الربعين الجنوبيين	جو ان کی خبر کو ہم تک پہنچنے میں حائل ہوں
قد حكى فيه قليلاً من العمارة،	لیکن یہ بیان کیا گیا ہے، کہ ایک جنوبی چوتھائی
(ص۱۱۳ مطبوعہ ۱۲۷۱ لکھنؤ)	حصہ میں تھوڑی آبادی ہے،

اگر ایک ہی شمالی چوتھائی آباد ہے، تو پھر یہ مسئلہ مشتبہ رہا کہ دو شمالی رخوں میں سے کون آباد ہے، فوقانی یا تحتانی، تو چونکہ ربع مسکوں ہی کے مسئلہ کو مسلمان مشتبہ سمجھ گئے تھے، اس لئے وہ اس کی علت بتانے میں بھی پس وپیش کرتے تھے، اسلئے انھوں نے صحیح طور سے یہ کہا کہ نیچے او پر کی بحث اسلئے فضول ہے، کہ ہر ایک دوسرے کی نسبت سے نیچے اور اوپر ہے، تصریح کے شارح امام الدین لاہوری نے حاشیہ کی یہ عبارت نقل کی ہے،

ان فی تعیین هذا الربع تعسراً	اس چوتھائی زمین کی تعیین مشکل ہے
بل تعذرًا لان لو قیل هذا هو الربع	بلکہ محال ہے، کیونکہ اگر یہ کہا جائے، کہ وہ
الفوقانی لصدق علی الآخر،	فوقانی ربع ہے، تو یہ فوقانی ہونا تو دوسرے
(ص۵۵)	کو بھی کہہ سکتے ہیں،

اسی کی شرح میں عصمت اللہ سہارنپوری نے کہا ہے،

لان کل منهما فوقانی بالنسبة	کیونکہ ان میں سے ہر ایک اپنے اوپر کی

الی من علیہ ۔ نسبت سے فوقانی ہو،

اس کے بعد تصریح کی عبارت حسب تحریر ملا عصمت اللہ حسب ذیل ہے:۔

والحاصل انہ لیس ھنا علامۃ	حاصل یہ کہ یہاں کوئی علامت ایسی نہین
یمتاز احدھما عن الآخر و	ہے جس سے ایک حصہ دوسرے سے
لذلک نراھم یبھمون الکلام	ممتاز ہوسکے، اسلئے ہم دیکھتے ہیں کہ اہل
ویقولون المعمور احد	ہیئت اس مقام پر مشتبہ طریقہ سے یہ
الربعین،	کہہ دیتے ہین، کہ دو شمالی ربعوں میں سے
(باب ملا عصمۃ اللہ ص۹)	ایک آباد ہے،

ملا عصمت اللہ اور امام الدین بعد کے لوگ ہین لیکن انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ اگلوں کی نقل ہے،

ابن خلدون مغربی المتوفی ۸۰۸ھ نے مقدمہ میں رُبع سکون کے نظریہ کی تشریح کے بعد لکھا ہے،

"اور یہیں سے حکما نے یہ اخذ کیا ہے، کہ خط استوا، اور جو اس کے نیچے ہے، آبادی سے خالی ہے، اور ان حکما پر یہ اعتراض کیا گیا ہے، کہ یہ مقام تو مشاہدہ اور سیاحوں کے متواتر بیانات سے ثابت ہے، کہ آباد ہے، تو پھر اس دعوی پر دلیل کیسے قائم ہوگی (یعنی دعوی ہی غلط ہے)

پھر قدیم حکمار کی طرف سے یہ بات بنائی ہے،

"بظاہر حکما کا مقصد یہ نہیں ہے، کہ خط استوا کے نیچے آبادی بالکل محال ہے، جب کہ ان کے استدلال نے ان کو یہاں تک پہنچایا ہے، کہ وہاں گرمی کی شدت کے سبب سے

پیدائش کا فساد قوی ہے، اور اسلئے آبادی اس میں محال ہے، یا بہت کم ممکن ہے، اور وہ ایسا ہی ہے، کیونکہ خط استوار اور جو اس کے نیچے ہے، گو اس میں آبادی ہے، جیسا کہ بیان کیا گیا ہے، مگر بہت کم ہے"

اس مسئلہ کو اس سے بہت پہلے ابن رشد المتوفی ۵۹۵ھ نے پیش کیا اور کہا کہ خط استوار کے دونوں طرف جب یکساں صورت ہے، تو خط استوار کے جنوب میں کیوں آبادی نہ ہو،

"ابن رشد نے کہا ہے، کہ خط استوار معتدل ہے، اور اس کے جنوب میں جو زمین ہے، وہ ویسی ہی ہے جیسی اس کے شمال میں ہے، تو جس طرح خط استوار کے شمال میں آبادی ہے جنوب میں بھی ہوگی"، (مقدمۂ ابن خلدون)

ابن خلدون اسی خیال کی مزید تشریح اور جواب دیتے ہوے کہتا ہے،

"لیکن یہ کہنا کہ خط استوا میں آبادی محال ہے، تو متواتر بیان اسکی تردید کرتا ہے"،

(مقدمہ ص۴۳ مصر)

جو بات ابن رشد نے کہی وہی حسن بن احمد ہمدانی المتوفی ۳۳۴ھ نے جزیرۃ العرب میں کہی ہے،

واما ما خلف خط الاستواء الی الجنوب فان طباعه تكون على طباع شق الشمال سواء في جميع احواله الا قدر ما ذكرنا في كتاب سرائر الحكمة من اختلاف حالي الشمس في راس اوجها ونقطة حضيضها،	"لیکن خط استوار کے نیچے جنوب تک اسکی طبعی کیفیت شمال کی طبعی کیفیت کے مانند ہر چیز میں ہوگی، لیکن صرف اسی قدر اختلاف ہوگا، جس کو میں نے سرائر الحکمۃ میں لکھا ہے یعنی آفتاب کے نقطۂ اوج اور نقطہ حضیض میں اختلاف سے جو اثر پیدا ہوتا ہے

(جزیرۃ العرب ص۴۱)

اس کے بعد لکھا ہے کہ بحر اعظم کی موج وطغیانی کی شدت کے سبب سے ادھر جنوبی سمت (یعنی جنوبی افریقہ میں) سمندر کی طرف سے جانیکی کسی کو ہمت نہیں پڑتی،

ہمدانی نے آفتاب کے نقطہ اوج وحضیض کا جو فرق پیدا کیا تھا، نصیر الدین طوسی المتوفی ۶۷۲ھ نے اسکو کمزور ثابت کیا، اور کہا،

فمن البعید ان یبلغ تاثیرھا الی	یہ دور از قیاس ہے، کہ آفتاب کی تاثیر اس
حد یصیر احد موضعین متساد یین	حد تک پہونچ جائے کہ دو مقام جو وضع
فی الوضع مسکونا والآخر غیر مسکون	(پوزیشن) میں یکساں ہوں ان میں سے ایک
(تقویم البلدان ابو الفدا صفحہ ۵ پیرس)	آباد ہو، اور دوسرا غیر آباد ہو،

ادھر علما تو اس مناظرہ میں مصروف رہے، کہ وہاں آبادی ہے یا نہیں، یا عقلاً ہو سکتی ہے یا نہیں، اور اُدھر کم لکھے پڑھے سیاح اور جہازران خط استوا کو پار کر کے افریقہ کی ہر سمت میں تیر گئے،

جنوبی حصہ میں افریقہ کا جہانتک تعلق ہے، عرب تاجر اور سیاح اس کے گوشہ گوشہ سے واقف ہو چکے تھے، جہاں جہاں موجودہ زمانہ میں اہل یورپ پہنچے، مسافران عرب کے نشان قدم برابر پائے، عملی عربی سیاح اور جہازران خط استوا کو پار کر کے افریقہ کے ایک ایک کونہ اور گوشہ میں پہونچے، اور خط استوا سے نیچے راس الرجاء الصالح (گڈ ھوپ) تک سب چھان مارا، چنانچہ ابو عبد اللہ البکری کی صفۃ الافریقہ والمغرب، ابن بطوطہ کے سفرنامہ کے آخری ابواب اور ابن خلدون کے مقدمہ اور تاریخ میں ان کے حالات موجود ہیں لیکن اصلی باشندوں نے توحش اور جہالت اور حیوانیت کے سبب سے ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی،

ابن خلدون جنوبی افریقہ کے بعض مقامات سلا، تکرور، غانہ اور سلطنت مالی کا نام لیکر کہتا

"اور آج کے زمانہ میں یہ پوری سرزمین سوڈانی قوم کی مملکت میں شامل ہے، اور ان کے ملک تک مراکش کے سوداگر جاتے ہیں، .... اور ان کے پیچھے جنوب میں کوئی قابل ذکر آبادی نہیں، ہاں کچھ آدم صورت انسان ہیں، جو انسانوں کے مقابلہ میں جانوروں سے زیادہ قریب ہیں، وہ صحراؤں اور غاروں میں رہتے ہیں، اور گھاس اور غلہ بن پکائے کھاتے ہیں، اور ان میں ایک دوسرے کو کھا جاتے ہیں، وہ انسانوں کے شمار میں نہیں"

(مقدمہ ص ۴۵ مصر)

مشرقی افریقہ تو عربوں کا وطن ہو گیا، زنجبار پر وہ قابض تھے، اور سواحل میں مڈگاسکر (قنبلو) کے مقابل تک ان کا بحری گذرگاہ تھا، مغربی افریقہ گانا (غانہ) میں ان کی نوآبادی تھی، شمالی افریقہ تو ان کی عظیم الشان سلطنتوں کا مرکز ہے، اور آج تک وہ اس پر قابض ہیں، اور جنوبی افریقہ کے حیوان نما انسانوں کا حال ابھی پڑھ چکے ہیں لیکن انھوں نے محنت کر کے ان میں سے اکثر جانوروں کو انسان بنایا، اور کچھ کو ان کے جانشین اہل فرنگ نے بعد کو انسان بنایا، اور باقی آج بھی جانور ہیں الغرض

"افریقہ کی ہر سمت میں عرب تاجر اور نوآباد پھیل گئے تھے، کانگو، زولو کفر دریا (الکفرہ) میں وہ آباد تھے، اور ان کے قدیم آثار موجود ہیں، سنہ ۱۹۰۳ء میں روڈیشیا شمالی ٹرانسوال میں ایک عرب کی قبر ملی ہے، جس میں مرنے والے کا نام سلام اور تاریخ وفات ۱۱۹۵ھ لکھی ہے، اسی طرح اہل جرمنی نے چند سال ہوئے، مشرقی افریقہ کے اندرونی علاقہ میں قدیم شہر نوکا موبن ڈانگا کے قریب قدیم عربی کتابیں پائے، جن کو وہ برلن عجائبخانہ لے گئے،

"پرتگالیوں کی تاریخ میں ہے کہ جب ان کے جہازات جنوبی مشرقی سواحلی افریقہ، گڈھوپ اور نٹال کے درمیان سفر کر رہے تھے، تو انھوں نے عربوں کو پایا، جن کے جہازات سے ساحل بھرا ہوا تھا، اور کفر دریا کے ملک سے بہت سا سونا اپنے جہازوں میں لاد چکے

تھے، تاکہ وہ اپنے ملکوں کو لیجائیں[۱]"

مغربی افریقہ میں نائجیریا کا وسیع خطہ عربوں کی نوآبادیوں کا مرکز تھا، اور ہے، یہاں پر خصوصیت کیساتھ ہم کو مغربی افریقہ کے ایک گوشہ سے جس کو عرب غانہ اور اہل یورپ گائنا (Guinea.) کہتے ہیں، بحث ہے، اور جو قدیم زمانہ سے سونے کی سرزمین ہے،

غانہ | اہل عرب اس سونے کی سرزمین تک بہت پہلے پہنچ چکے تھے، عربی جغرافیون میں اس کا نام بار بار آیا ہے، اور عجیب بات یہ ہے کہ ہر قوم میں اس ملک کا نام ہی سونا ہوگیا ہے، عربی میں خالص سونے کو تبر کہتے ہیں، یہی تبر اس کا عربوں میں نام ہے، چنانچہ یاقوت نے معجم البلدان میں غانہ کا حال غانہ سے زیادہ تبر میں لکھا ہے، یہ گائنا یورپ میں جاکر گنی کی صورت میں سونے کی اشرفی بن گئی،

گائنا خط استوا کے جنوب میں مغربی افریقہ کے اس ساحل پر واقع ہے، جہاں سے جنوبی امریکہ اور پرانی دنیا کا ایک طرح سے محاذ پڑتا ہے، اسلئے اس موقع پر اسکی خاص اہمیت ہے،

اہل عرب گائنا کب پہونچے، اس کی صحیح تاریخ معلوم نہیں لیکن قیاس ہے، کہ دوسری صدی میں مصر اور نوبہ اور بجہ وغیرہ افریقی قبیلے یہان کے سونے کا خراج مصر میں ادا کرتے تھے اور وہاں مسلمان عمال اور مزدور آباد ہو چکے تھے[۲]، پانچویں صدی ہجری کے اندلسی جغرافیہ نویس ابو عبید عبد اللہ البکری المتوفی ۴۸۷ھ ۱۰۹۴ء نے کتاب المسالک والممالک کے حصہ "افریقہ کتاب المغرب فی ذکر بلاد افریقیہ والمغرب" میں گائنا کا وہان کے قبائل کا، ان کے بادشاہ کا اور اس کی سلطنت کا پورا حال لکھا ہے، اور وہاں کے مسلمانوں کی سکونت اور آمد و رفت کی اطلاع دی ہے، یہ حالات مصنف نے ۴۶۰ھ میں لکھے ہیں، شہر غانہ کے دو حصے تھے، ایک میں مسلمان رہتے تھے جس میں ۱۲ مسجدیں تھیں، ایک جامع مسجد تھی، ان مسجدوں میں امام و موذن، اور علماء و فقہا سکونت پذیر تھے[۳]

---

[۱] یہ دونوں اقتباس مقتطف مصر اگست ۱۹۱۵ء کے مضمون الرحلات الافریقیۃ القدیمۃ سے ماخوذ ہیں [۲] طبری واقعات ۲۳۱ھ

دوسرے میں بادشاہ اور اس کے ارباب حکومت رہتے تھے، بادشاہی عمارت کے پاس بھی ایک مسجد بنی تھی جس میں وہ لوگ فریضۂ نماز ادا کرتے تھے، جو بادشاہ کے پاس آتے تھے، ملک کے دوسرے حصہ میں بھی مسلمانوں کی آبادیاں تھیں، بادشاہ اور اس کے قبیلہ کے لوگ اس وقت تک بت پرست تھے، لیکن مسلمانوں کی پوری عزت کرتے تھے، لیکن اسی زمانہ میں بادشاہ نے ایک مسلمان کی تبلیغ سے اسلام قبول کر لیا، وہاں ایک ایسی عرب قوم بھی آباد تھی، جو بنوامیہ کے زمانہ میں فوج کی حیثیت سے آئی تھی، اور یہیں رہ پڑی، بعد کو وہ اپنا مذہب بھی بھول گئی،[1]

اس بیان سے معلوم ہوا، کہ عرب یہاں بنوامیہ ہی کے زمانہ میں یعنی پہلی صدی ہجری کے آخر یا دوسری صدی ہجری کے شروع میں پہنچ چکے تھے،

چھٹی صدی ہجری میں غرناطہ کے ابو حامد اندلسی المتوفی ۵۹۵ھ نے جو اسپین سے لیکر چین تک سیاحت کر چکا تھا، اور بغداد میں اقامت گزین ہو گیا تھا، تحفۃ الالباب کے نام سے جغرافیہ اور عجائب عالم پر ایک کتاب لکھی ہے، اس میں وہ غانہ کے متعلق لکھتا ہے:۔

وبلادھم متصل الی المغرب الاعلی	ان کا ملک مراکش کے اس حصہ سے جو
المتصل بطنجۃ ممتد اعلی	طنجہ سے ملا ہے اور بحر ظلمات (اطلانٹک) کے
بحر الظلمات[2]	سواحل پر پھیلا ہے متصل ہے،

ابو حامد کا یہ بیان بہت مبہم ہے، مراکش شمال میں ہے، اور غانہ اس کے جنوب میں، اور دونوں کے بیچ میں صحرائے افریقہ ہے، لیکن اس سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ وہ اس سے واقف تھا، بہرحال اس کے زمانہ میں ان اطراف کے پانچ قبیلے مسلمان ہو چکے تھے، جن میں ایک غانہ کا قبیلہ تھا،

---

[1] کتاب المغرب فی صفۃ افریقیہ و بلاد المغرب صفحات ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۹ مطبوعہ الجزائر ۱۹۱۱ء
[2] تحفۃ الالباب صفحات ۴۱ و ۴۲ پیرس،

"ان کے بادشاہوں میں سے پانچ قبیلے جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے مسلمان ہو گئے، ان میں سے قریب تر غانہ ہے، جس کی ریگ میں خالص سونا پیدا ہوتا ہے، اور ان کے یہاں سونا بہت ہے"، (ص ۴۰ و ص ۴۳ پیرس)

اس کے بعد ادریسی مراکشی المتوفی ۵۶۰ھ نے سسلی میں بادشاہ سسلی کے حکم سے جغرافیہ کی مشہور کتاب نزہتہ المشتاق فی اختراق الآفاق لکھی، اس میں غانہ کے حال میں جیسا کہ ابن خلدون نے نقل کیا ہے، لکھا ہو کہ غانہ میں علوی سادات کی سلطنت ہے،

"گنی میں جیسا کہ کہا گیا ہے، بنی صالح نام علویوں کی سلطنت اور حکومت ہے رجاء کی کتاب کے مصنف (ادریسی) نے کہا ہے، کہ اس کے بانی کا نام صالح بن عبداللہ بن حسن بن حسین ہے،

ابن خلدون کہتا ہے کہ عبداللہ بن حسن کی اولاد میں صالح نام کوئی شخص معروف نہیں ہے،

بہرحال ابن خلدون المتوفی ۸۰۸ھ کے زمانہ میں غانہ کا ملک سلطان مالی کے زیر حکومت تھا، [۱] مشہور سیاح ابن بطوطہ جو اسی زمانہ میں تھا، وہ اسی سلطان کے زمانہ میں غانہ پہنچا تھا، اس سلطان اور اسکی مملکت اور قوم کے حالات اس نے اپنے سفرنامہ کے خاتمہ میں بیان کئے ہیں، یہ لوگ دیندار مسلمان تھے، اور عربی زبان افریقہ کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی سرکاری ومذہبی دونوں حیثیتوں سے رواج پذیر تھی، یہیں سے ابن بطوطہ سلطان مراکش کی دعوت پر تمام دنیا کا چکر لگا کر اپنے ملک میں واپس گیا ہے، [۲]

ابوعبید بکری اندلسی، ابوحامد غرناطی یاقوت رومی جغرافیہ کی ان تینوں کتابوں میں غانہ کی سونے کی بڑی بڑی داستانیں ہیں، کہ کس طرح عرب تاجر مراکش اور مغرب سے اونٹوں پر

---

[۱] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۲، مصر ذکر اقلیم اول [۲] سفرنامہ ابن بطوطہ آخری باب،

دکر نمک اور دوسرے معمولی سامان لیجاتے ہیں، اور وہاں سے سونا بھر کر واپس لاتے ہین، اس
ستان کو یہاں زیادہ طول دینے کی ضرورت نہیں، مگر اس کو یاد رکھنا چاہئے، کہ آخری نتیجہ مین
بات کام آئے گی،

الی روس اور بحر بیرنگ | جنوب سے اب شمال کا رُخ کیجئے، عرب چوتھی صدی کے شروع میں
فہ مقتدر باللہ کی خلافت میں انتہائی شمالی روس تک پہنچ چکے تھے، جہاں رات صرف چار گھنٹوں
ں ہوتی ہے، وہاں کا بادشاہ مسلمان ہو گیا تھا، اور خلیفہ سے خواہش کی تھی، کہ اس کی اور اس کی
م کی تعلیم کے لئے کچھ لوگ بھیجے جائیں، خلیفہ نے ابن فضلان کی سرکردگی میں ایک وفد وہاں
انہ کیا، وہ آذر بائیجان ہو کر نہر آتل یعنی والگا طے کرکے انتہائی شمالی روس کے قدیم شہر بلغار میں
نچا، اور کچھ روز رہ کر وہاں سے واپس آیا، اس پورے سفر کی روداد اس وقت بھی مختصر طور سے
م البلدان کے الفاظ بلغار، اور روس میں درج ہے، آٹھویں صدی میں ابن بطوطہ شمالی روس
اس سرے پر پہنچا تھا جس کے آگے شمالی قطب کی برفپوش زمین تھی، اور جہاں بقول ابن بطوطہ
ف پر چلنے کے لئے کتوں کی گاڑیوں کی ضرورت تھی، اور یہ کتے بہت بیش قیمت تھے، اس وجہ
ے ابن بطوطہ آگے نہ بڑھا،[۵] یہ وہی سواری ہے جس سے آج کل کے بہادر بھی قطب شمالی کی منزلیں
طے کرتے ہیں،

روس کے انتہائی شمال پر دریاے بیرنگ ہے، اس کا ذکر بیرونی، نصیر الدین طوسی اور
ب الدین شیرازی نے کیا ہے، اور اس کا صحیح موقع بتایا ہے، بیرنگ ایشیا کی طرف آکر
الکاہل میں ملجاتا ہے، اور شمال کی طرف اسی آبناے بیرنگ کی پتلی سی لکیر شمالی امریکہ (کناڈا)
ور پرانی دنیا کے بیچ میں حائل ہے، مسلمانوں کا علمی قدم اس سمت میں اس پتلی لکیر تک آکر رک گیا،

---

[۵] سفر نامہ ابن بطوطہ

تھا، جہاں سے شمالی امریکہ منجمد برفستان کے پردہ میں چند قدم پر رہ گیا تھا[1]

انتہائی آبادی | مسلمانوں میں علم ہیئت اور ریاضی جغرافیہ کا علم زیادہ تر یونان سے آیا تھا، خصوصاً بطلیموس کی کتاب الجغرافیہ اور مجسطی پر انھوں نے اپنی معلومات کی بنیاد کھڑی کی، بطلیموس نے خطِ استوار کو جو افریقہ سے گذرتا تھا خشکی میں انتہائی آبادی قرار دیا تھا، کیونکہ اس کے خیال میں گرمی کی شدت کی وجہ سے انسانی آبادی اس کے بعد ممکن نہیں تھی، اور اسی طرح طول میں انتہائی آبادی افریقہ کے پار بحرِ محیط کے چند جزائر کو قرار دیا تھا، جن کو اہلِ عرب "جزائر خالدات" کہتے ہیں، جس کا صحیح ترجمہ "جزائر سعیدہ" یا مبارکہ ہے، جس کو بعض عرب اہلِ جغرافیہ اور اہلِ ہیئت نے اختیار کیا ہے، اور جو اصل میں لاطینی لفظ (Fortunatae) کا معرب ہے، اسی یونانی لفظ کو البکری نے اپنے جغرافیہ میں فرطناتس کے نام سے لکھا ہے، اس سے مقصود جزائر کنیری (Canaries) ہیں،

عام طور سے مشرقی اہلِ ہیئت و جغرافیہ ان کو مفقود اور پانی میں غرق سمجھتے ہیں، مگر مغربی جغرافیہ نویس اس سے پوری طرح واقف تھے، ابو عبید عبداللہ بن عبدالعزیز البکری اندلسی المتوفی ۴۸۷ھ، ۱۰۹۴ء لکھتا ہے،

"اور بحر محیط میں طنجہ کے مقابل اور کوہ ایڈلٹ کے سامنے وہ جزیرے ہیں جن کا نام فرطناتس یعنی ہمیشہ سرسبز رہنے والے (سعیدہ) جزائر سعادات و خالدات) ہیں، ان کا یہ نام اسلئے پڑا، کہ ان کی پہاڑیاں قسم قسم کے میوؤں اور خوشبودار پھولوں سے معمور ہیں، یہ میوے اور پھول لگائے بغیر خود بخود اُگتے ہیں، ان کی زمینیں گھاس کے بجائے معطر پھولوں سے آباد ہیں، اور وہ بلاد بربر کے مغرب میں دریائے مذکور میں متفرق

---

[1] تقویم البلدان، ابوالفدا، ص ۳۵، و تذکرہ نصیر طوسی، تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب عربوں کی جہاز رانی، صفحہ ۱۱۳ و صفحہ ۱۱۶،

طور پر واقع ہیں[سلم]۔

دوسری طرف انتہائی آبادی جزیرہ تولی کو بتاتے ہیں جسکو برطانیہ کے اطراف میں اب

طور پر آئسلینڈ کہا جاتا ہے،

..ین گول ہے اور جذب ..ش سے قائم ہے

اس مسئلہ سے بھی اہل عرب واقف تھے، کہ زمین گول ہے، اور جذب و کشش کے اصول پر قائم ہے، کسی بیل کے سینگ یا ستون یا پہاڑ کی پشت

پر گیند رکھا ہوا نہیں ہے،

ابن خردازبہ المتوفی ۳۰۰ھ کہتا ہے،

"زمین کی شکل گول ہے، جیسے گیند، جو فضائے آسمانی میں اس طرح رکھا ہوا ہے، جیسے انڈے کے اندر زردی، اور ہلکی ہوا (نسیم) زمین کے چاروں طرف ہے، اور وہ چاروں طرف سے کشش کر رہی ہے، آسمان تک اسی طرح مخلوقات کے اجسام زمین پر ہیں کہ وہی نسیم ان کے بدنوں میں جو ہلکا پن ہے، اسکو کشش کرتی ہے، اور زمین اس کے ثقل کو کھینچتی ہے، کیونکہ زمین مثل اس پتھر کے ہے، جس کو لوہا کھینچتا ہے (یعنی مقناطیس[سلم])

اس عبارت میں زمین کی گولائی اور جذب و کشش کے علاوہ جس حقیقت کو نسیم جیسی ہلکی پھلکی سے ادا کیا گیا ہے، آج آپ اس کو بے تکلف "ایتھر" کہتے ہیں، نویں صدی کے آخر کا عرب ..از راں ابن ماجد مقناطیس کے بیان میں کہتا ہے،

وقیل ان السبع السموات و	اور کہا گیا ہے کہ ساتوں آسمان اور
الارض معلقات بمقناطیس	زمین قدرت کے مقناطیس سے معلق
القدرة، (کتاب الفوائد صلہ)	ہے"۔

[۵] المغرب فی ذکر بلاد افریقیہ للبکری صفحہ ۱۰۹، الجیریا [۲] کتاب المسالک والممالک ص۴ لیڈن،

جذب و کشش کے مسئلہ کو اہلِ جغرافیہ کے علاوہ دوسرے حکماے اسلام نے بھی بیان کیا ہے مگر اس وقت ہمیں اس سے بحث نہیں،

زمین کو گول تو تمام حکماے اسلام نے تسلیم کیا مگر مجھے اس دعوی پر وہ استدلال پیش کرنا ہے، جو اہلِ جغرافیہ کے قلم سے نکلا ہے،

ابن رستہ (۲۷۰ھ) تیسری صدی ہجری میں تھا، وہ زمین کے گول ہونے پر ستارون کے طلوع وغروب اور ظہور و خفا سے اس طرح محققانہ بحث کرتا ہے،

"تمام اہلِ علم نے اس پر اتفاق کیا ہے، کہ زمین اپنے تمام اجزاء کے ساتھ خشکی و تری کی گیند کی طرح ہے، اور دلیل یہ ہے، کہ سورج چاند اور کل ستارون کا طلوع و غروب زمین کے تمام کنارون میں ایک وقت نہیں ہوتا، بلکہ مشرقی مقامات میں ان کا طلوع مغربی مقامات سے پہلے ہوتا ہے، اور ان کا غروب مشرقی مقامات مین مغربی مقامات سے پہلے ہوتا ہے، اور یہ حوادث فلکی سے ظاہر ہے، جو آسمان میں ہوتے ہیں، تو ایک ہی حادثہ زمین کے تمام اطراف میں مختلف مقامات میں ہوتا ہے، جیسے چندر گرہن کہ اگر ایسے دو مختلف شہرون میں ان کو رصد کیا جائے، جو ایک مشرق میں ہو، اور دوسرا مغرب میں، تو مثلاً اگر مشرقی چندر گرہن کا وقت رات کے تیسرے گھنٹہ میں ہو تو......

(ابن رستہ صفحہ ۱۲)

زمین کی گولائی پر آج کل جہازون کے اوّلاً مستول پھر آہستہ آہستہ بڑھتے بڑھتے پورا جہاز نظر آنے سے جو استدلال کیا جاتا ہے، اس سے بھی وہ واقف تھے، مسعودی لکھتا ہے:

"اور جہاز جب سمندر کے بیچ میں ہوگا، تو دنباوند کے پہاڑ غائب ہو جائین گے، اور نظر نہیں آئیں گے، اور جب دریا میں سو فرسخ کے قریب رہ جائے گا، تو ذرا سا پہاڑ کا

سر انظر آئے گا، اور جیسے جیسے ساحل کے نزدیک ہوتے جائیں گے، پہاڑ بڑا ہوتا جائیگا اور یہ اس بات پر دلیل ہے کہ سمندر کا پانی گول شکل پر ہے اور یہی بحر روم میں حال ہے، یہ شام کے پہاڑ جو انطاکیہ اور لاذقیہ اور طرابلس اور جزیرۂ سائپرس کے ساحل پر ہیں، کہ جہاز میں نگاہوں سے پوشیدہ رہتے ہیں، اور ساحل کے قریب آتے ہوئے آہستہ آہستہ نظر آتے ہیں، (مروج الذہب ا ص۱۹۵ پیرس)

ابو بکر ابن الفقیہ ہمدانی (۲۹۰ھ) نے جغرافیہ کتاب البلدان میں لکھتا ہے:-

"کہتے ہیں کہ سمندر بھی گول ہے، اور دلیل اس کی یہ ہے کہ جب تم ساحل سے بیچ سمندر میں چلے جاؤ، تو ساحل کے پہاڑ اور درخت آہستہ آہستہ تمھاری نظر سے غائب ہونے لگیں گے، پھر جب تم بیچ سمندر سے ساحل کی طرف آؤ، تو وہ آہستہ آہستہ پھر دکھائی دینے لگیں گے" (ص۵۳ لیڈن)

یہ دلیل بعینہٖ وہی ہے جو آج بھی زمین کی گولائی پر عام طور سے پیش کیجاتی ہے،

زمین کے فوقانی اور تحتانی حصے اور رات اور دن

ہر چند کہ یہ مسئلہ عربی علم ہیئت میں آفتاب کے دور اور حرکت کے سلسلہ میں عام طور سے مذکور ہے، لیکن زمین کے تحتانی اور فوقانی حصوں کے تخصیص کیساتھ ذکر کرنے میں بے توجہی کی گئی ہے، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے، کہ مسلمان اس مسئلہ ہی سے واقف نہ تھے، تیسری صدی ہجری کا مصنف ابن رستہ اپنی کتاب الاعلاق النفیسہ کے مقدمہ میں شب و روز کے چوبیس گھنٹوں اور جاڑا گرمی میں روز و شب کے گھٹنے اور بڑھنے کا ذکر کرکے کہتا ہے:-

لان نصف الارض ابدًا	کیونکہ نصف زمین میں ہمیشہ دن
نھارٌ مضیٌٔ ونصفھا لیل مظلمٌ	رہتا ہے، اور دوسرے نصف میں

یدورانِ حیلۃ، اندھیری رات اور یہ شب و روز اس زمین

(صـ۹ لیڈن) پر گردش میں ہیں،

چوتھی صدی کے آغاز کا مصنف مسعودی مروج الذہب میں اسکی تشریح ان الفاظ میں کرتا ہے

"زمین کی آبادی کا آغاز جزائر خالدات سے شمار کرتے ہیں، جو مغربی بحر اوقیانوس میں واقع ہیں، یہ چھ آباد جزیرے ہیں، اور آبادی کی انتہا چین کی انتہائی آبادی پر ہے، ان دونوں کے درمیان ۱۲ گھنٹوں کی مسافت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آفتاب جب چین کے انتہائی حصہ میں ڈوبے گا، تو ان جزیروں میں جن کا ذکر ابھی ہوا، اور جو مغربی بحر اوقیانوس میں واقع ہیں، دن ہوگا، اور جب ان جزیروں میں رات ہوگی، تو اقصائے چین میں دن ہوگا، اور یہ زمین کا نصف دائرہ ہے، اور وہی آبادی کا طول ہے، جس سے وہ واقف ہوئے ہیں، (جلد ۱ صنـ۱ پیرس)

کرۂ ارض کے دوسری جانب آبادی، ربعِ مسکون کا نظریہ ٹوٹ جانے کے بعد کرۂ ارض کی دوسری جانب آبادی کا تخیل بہت قریب ہو گیا، یہ تخیل قدیم سے قدیم تیسری صدی ہجری کے عرب جغرافیہ نویسوں میں ملتا ہے

ابن خرداذبہ المتوفی ۳۰۰ھ اپنے جغرافیہ میں لکھتا ہے،

الا ان العمارۃ فی کرۃ الارض	کرۂ زمین میں آبادی خط استوار کے بعد
بعد خط الاستواء اربع وعشرون	۲۴ درجہ تک ہے، باقی کو بحر محیط نے ڈوبا دیا
درجۃ ثم الباقی قد غمرہ البحر	ہے، تو ہم زمین کے شمالی ربع پر آباد ہیں
الکبیر فنحن علی الربع الشمالی من	اور جنوبی ربع گرمی کی شدت کے سبب
الارض والربع الجنوبی خراب	سے ویران ہے، اور زمین کے دوسرے

لشدة الحرفيه والنصف الباقی	نصف میں جو ہمارے نیچے ہے کوئی
الذی تحتنا لاساکن فیہ (ص ۵ لیڈن)	آباد نہیں،

اس اقتباس کا آخری فقرہ قابلِ التفات ہے، کہ وہ زمین کی دوسری جانب کو کم از کم خشک اور آبادی کے قابل سمجھتا ہے، گو اسکی آبادی کا اسکو کوئی علم نہیں،

اس کے بعد اسی کے ایک ہمعصر ابن رستہ (۲۷۰ھ) کے قلم سے عجیب و غریب حقیقت تراوش ہوگئی ہے، وہ غلطی کیساتھ اس قدر تسلیم کرتا ہے،

وان الناس نزلوا فی النصف الشمالی	اور آدمی نصف شمالی میں آباد ہیں قبہ
بین القبة وبنات النعش وذلك	اور بنات النعش کے بیچ میں، اور وہ
مقسوم علی سبعة اقالیم، وباقی	سات اقلیموں پر منقسم ہے، اور باقی حصہ
ذلك غیر مسکون وینزل فی	غیر آباد ہے، اور نصف جنوبی میں جسکو
النصف الجنوبی من شاء الله	خدا چاہے اپنی مخلوقات سے آباد
من الخلق (الاعلاق النفیسہ ابن رستہ ص ۹ لیڈن)	کرے،

ابن رستہ ربع شمالی کے بجائے نصف شمالی کی آبادی کا قائل ہے، اور جنوب کی نسبت مشتبہ ہوکر کہتا ہے، "وہاں اپنی خلق میں سے جس کو چاہے بسائے" یہ پیشینگوئی اکتشاف امریکہ سے پوری ہوئی،

بیرونی نصیر طوسی قطب الدین شیرازی، اور ان کے تلامذہ کے سوال و جواب اور رد و اعتراض سے لوگوں میں یہاں تک ہمت ہوئی، کہ طوالع الانظار کے مشہور مصنف اور ابن فضل اللہ العمری (مسالک الابصار فی ممالک الامصار کے مصنف) کے استاذ ابوالثنا محمود بن ابی القاسم اصفہانی المتوفی ۷۴۹ھ (۱۳۴۸ء) نے اس نظریہ کے پیش کرنے کی جرأت کی،

لا امنع ان یکون ما انکشف عنہ	میں اس کو ممکن سمجھتا ہوں کہ ہماری
الماء من الارض من جہتنا منکشفا	طرف زمین کا جو حصہ کھلا ہے، وہ دوسری
من الجہتہ الاخری ولا امنع ان یکون	طرف سے بھی کھلا ہو، اور اس کو بھی ممکن
بہ من الحیوان والنبات والمعادن	کہتا ہوں کہ اس میں بھی وہی حیوان نبات
مثل ما عندنا او من انواع اواجناس	اور معدنیات ہوں، جیسے ہمارے حصہ
اخری، (مسالک الابصار جلد ا ص۳ مص)	میں ہیں، یا اور دوسرے قسم کے ہوں،

اس سے زیادہ تصریح اور کیا ہوگی، اسی لئے شاید ابن فضل اللہ نے ربع کے بجائے نصف ارض کو مکشوف قرار دیا،

والبحر محیط بنصف الارض	اور پانی نصف زمین کو چاروں طرف
احاطۃ متصلۃ دائرۃ بہا	سے کمر بند کی طرح گھیرے ہوئے ہے،
کالمنطقۃ لا یظہر منہا الا	زمین کا آدھا ہی حصہ کھلا ہے، اور یہ
نصفہا وہو ما دارت علیہ	وہی ہے، جس پر آفتاب دائرۃ النہار
الشمس فی قوس النہار مثل	میں پھرتا ہے، اس کی مثال اس انڈے
بیضۃ مغرقۃ فی ماء انکشف	کی ہے، جو پانی میں ڈوبا ہو، تو اس سے
منہا ما انکشف وانغمر ما انغمر	کھل جاتا ہے جو کھل جاتا ہے، اور ڈوب
(مسالک الابصار ص۳ جلد ا)	جاتا ہے جو ڈوب جاتا ہے،

لیکن اس سلسلہ میں صحیح بات وہ ہے، جو بیرونی نے اس سے تین سو برس پیشتر کہی تھی کہ اس قسم کے امور استدلال نہیں، بلکہ مشاہدہ پر مبنی ہیں،

جعلوا العمارۃ فی احد الربعین	اس فن کے عالموں نے دو شمالی ربعوں

الشمالیین لان ان ذلک موجب	میں سے ایک ربع کو آباد مانا ہے، اسلئے
امر طبعی فمزاج الهواء واحد	نہیں کہ اس کا کوئی طبعی سبب ہے، کیونکہ
لا یتباین، ولکن امثاله من المعارف	زمین کی ہر طرف ہوا کا مزاج یکساں ہے،
موکول الی الخبر من جانب الثقة	لیکن بات یہ ہے کہ اس قسم کے معلومات
فکان الربع دون النصف هو	کسی ثقہ کی خبر اور اطلاع پر مبنی ہوتی
ظاهر الامر والاولی بان یوخذ	ہیں، اسلئے آباد حصہ جو تہائی مانا گیا ہے
به الی ان یرد خبر خبر	درست ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ اس نظر
طاری،	کو اس وقت تک مانا جائے، جب تک
(تقویم البلدان ابو الفدا ص۱۱)	کسی نئی اطلاع سے اسکی تردید نہ ہو جائے

ان علماء کو اپنے استدلال وجواب وسوال میں مصروف رہنے دیجئے، اور آئیے دوسری طرف ان جاہل جہاز رانوں کی کوششوں پر ایک نگاہ ڈالیں، جو اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈالکر بحر ظلمات کی شناوری میں مصروف ہیں،

(باقی)

عربوں کی جہاز رانی

مسلمانوں نے فن جہاز رانی میں جس قدر ترقیاں کیں جس قدر جہاز بنائے، جہازوں کے بنانے کیلئے جس قدر کارخانے قائم کئے، جس قدر بندرگاہیں قائم کیں، ان سب کے متعلق تاریخی معلومات اسلامی تاریخ میں نہایت منتشر و پراگندہ ہیں، مولینا سید سلیمان ندوی نے ان پراگندہ معلومات کو اس رسالہ میں یکجا کیا ہے، ضخامت ۱۹۹ صفحے قیمت :- عہ/

"منیجر"

ارمغانِ احباب

یعنی

دلّی اور اسکے اطراف

آج سے پنتالیس برس پہلے

از مولینا حکیم سید عبد الحئی صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء

(۳)

پانی پت روز یک شنبہ ۲۹ ر رجب، میں نے شب ہی کو ارادہ کر لیا تھا کہ ۴ بجے کے پسنجر پر پانی پت جاؤنگا، اسی واسطے سب اسباب یکجا کر کے رکھوا دیا، اور کالیخاں سے کہدیا کہ تین بجے جگا دینا، لیکن اس وقت ان کی بھی آنکھ نہ کھل سکی، اور اس وقت کے ارادہ میں یوں تبدیلی کی، کہ ۱۱ بجے دن کو روانہ ہوں، یہ خیال کر کے کہ ابھی دیر ہے، مولوی فضل اللہ سے رخصت ہونے چلا گیا، ان سے حکیم عبد المجید خانصاحب کے کشتہ طلا و حب الجواہر کے نسبت دریافت بھی کرنا تھا، وہاں گیا تو انھوں نے چائے کی دعوت کی واپس آتے آتے وقت نکل گیا، پھر ارادہ ہوا کہ ۳ بجے کی گاڑی میں روانہ ہوں، چنانچہ اس خیال سے دو بجے اسٹیشن نماز ظہر ادا کر کے آگیا بھائی جی اور محمد بھی آئے، ٹہلتے رہے، ان کا ارادہ ایک ہفتہ یہاں ٹھہرنے کا ہے، محمد اس عرصہ میں اٹاوہ چلے جائیں گے، اور وہ ایک ہفتہ کے بعد سیدھے دیوبند جائینگے، میرا ارادہ یہ ہے کہ ایک ہفتہ میں پانی پت، انبالہ، سرہند ہو کر دیوبند پہنچ جاؤں، پھر میں اور وہ بالاتفاق سہارنپور، رڑکی اور گنگوہ جائیں گے، اگر منظور الٰہی ہے، چنانچہ تین بجے کی گاڑی پر میں سوار ہوا،

ن اتفاق سے اس گاڑی پر مولوی ابراہیم صاحب کرنال کے رہنے والے بھی سوار تھے، یہ مولوی عبدالرحمن
حب پانی پتی کے شاگرد ہیں، پانی پت جاتے ہیں، ان کی وجہ سے راستہ بھر بہت دلچسپی رہی، اور اجنبیت کی وجہ کو
ا کو جو دقتیں پیش آنے والی تھیں، ان کا بھی اندیشہ جاتا رہا، راستہ ہی میں عصر کی نماز ریل پر پڑھی، ۵ بجے گاڑی
پانی پت پہنچی،

مولینا عبدالرحمن صاحب پانی پتی	پانی پت دہلی سے ۵۲ میل ہے، اور ۱۱۔ کرایہ ہے، پانی پت پہنچکر انھوں نے دو مزدور کئے

ایک میرے واسطے ایک اپنے واسطے، خود اپنی جاے قیام پر گئے، اور میرے مزدور سے کہدیا
ن کو مولوی عبدالرحمن صاحب کے یہاں لیجاؤ، میں آکر مسجد میں ٹھہرا، مولینا عبدالرحمن صاحب بہت کبیرالسن ہیں،
مسجد میں نہیں آتے، ان کو پانچ چھ برس سے نقرس کا عارضہ ہے، اور ایک سال سے نزول الماء بھی ہوگیا
ہے، کبھی مہینوں نہیں آتے، کبھی جمعہ جمعہ آتے ہیں، کبھی روز عصر کے وقت، مکان اُن کا مسجد سے متصل ہے، اور
مکان کے بالاخانہ پر رہتے ہیں، اس وجہ سے آمد و رفت میں دقت بھی ہوتی ہے، بہت خلوت پسند اور دائم
الصوم ہیں، اسی مسجد کے ایک حجرہ میں پیر محمد ایک میانجی رہتے ہیں، پیر مرد ہیں، انھوں نے میری بہت خاطر
کی، بعد عشا کے کھانا لائے، مجھ کو فی الجملہ یہاں تکلیف ہوئی، پیشتر سے یہ معلوم نہ تھا، کہ یہاں سرائے بھی ہے،
نہ دو روز کے واسطے وہاں ٹھہر جاتا، معلوم جب ہوا کہ میں یہاں ٹھہر چکا ہوں، اب یہاں سے اٹھنا مناسب
نہیں ہے،

مولوی عبدالسلام صاحب	روز دوشنبہ یکم شعبان، میں کل یہ لکھنے کو بھول گیا کہ اسٹیشن سے آتے وقت میں نے

راستہ میں چاند دیکھا، میرے حساب سے یہ چاند ۲۹ کو ہوا، لیکن یہاں آکر سنا کہ آج ۳۰ تاریخ ہے، صبح سے
دوپہر تک مسجد ہی میں رہا، دس بجے کے قریب اطلاع ہونے پر مولوی عبدالسلام صاحب آئے، یہ قاری

۱؎ قاری عبدالرحمن صاحب پانی پتی کے نام سے مشہور ہیں، شاہ محمد اسحاق صاحب کے شاگرد، اس زمانہ کے بہت سے علماء
نے آپ سے حدیث پڑھی، اور قرأت سیکھی، ۱۳۱۴ھ میں اس سفر کے دو برس بعد وفات ہوئی، تس

صاحب کے صاحبزادے ہیں، انھوں نے آکر بہت معذرت کی، کہ مجھ کو مجلا آپ کے آنے کی اطلاع ہوئی، ورنہ میں حاضر ہوتا، صبح کی نماز میں آیا تھا، مگر ضرورتِ شدید کی وجہ سے چلا گیا، اس کے بعد انھوں نے قاری صاحب کو اطلاع کی، انھوں نے بعد نماز ظہر کے بلانے کو کہا، اس عرصہ میں ایک مخدوم زادے، قاضی ثناء اللہ صاحب[1] کے رشتہ داروں میں مجھ سے آکر ملے، اور چار کی دعوت کی، اور ایک شخص مولوی محمد حسین صاحب رامپور کے رہنے والے آج کل قاری صاحب کے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں، قرأت سبعہ حاصل کرتے ہیں، وہ بھی ملے، ان دونوں بزرگوں نے میری ایسی مدارات کی، کہ میں ان کی عنایتوں کا تہ دل سے شکر گذار ہوں، مولوی محمد حسین سے معلوم ہوا کہ قاری صاحب کو مولینا اسحاق صاحب سے بالاضافہ مسلسل بالاوّلیہ کی سماعت ہے حقیقی سماعت اخوند منصور سے ہے، اور ان کو مولینا اسحاق صاحب سے، مجھکو اس بات کے سننے سے نہایت ہی رنج ہوا، کیونکہ میں زیادہ تر مسلسل بالاوّلیہ کے اشتیاق میں آیا تھا، ظہر کے بعد قاری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، اور مسلسل کی درخواست کی، انھوں نے مسلسل بالاوّلیہ سنائی، اور یہ بھی کہا کہ مجھ کو بالحقیقۃ اخوند منصور سے اسکی سماعت ہے، اور ان کو میاں صاحب سے، اور میاں صاحب کو بھی ایک ولایتی سے، اور ان کو حضرت شاہ صاحب سے، اور بالاضافہ مجھ کو اور مولوی عبد القیوم صاحب[2] کو مولینا اسحاق صاحب سے ہے، اور میاں صاحب کو بالاضافہ شاہ صاحب سے، بعد مفارقت طویلہ کرحقیقہ کی نوبت نہیں آئی، اوسکے بعد میں نے اوائل صحاح ستہ کے سنائے، اور اسکی اجازت انھوں نے دی، اور میرے واسطے بایں الفاظ دعا فرمائی، کہ "اللہ تعالیٰ تمھارے پڑھنے پڑھانے میں برکت دے اور نیت بخیر رکھے" میں نے سند لکھنے کی درخواست اس واسطے نہیں کی، کہ وہ آنکھ سے معذور ہیں دوسرے سے لکھوائیں گے تطویل ہوگی، اور مجھکو رہنا بہت کم ہے، بہرحال جو میری غرض تھی وہ حاصل ہوگئی،

---

[1] قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی، شاگرد شاہ ولی اللہ صاحب [2] مولوی عبد القیوم صاحب بھوپالی مولینا شاہ اسمٰعیل شہید کے صاحبزادہ ۱۲۹۹ھ میں وفات پائی، "تس"

مولینا کا درس | آج کل مولوی صاحب باوجود کبرسن و عذر شدید کے تین سبق پڑھاتے ہیں، دو سبق تو قرأت سبعہ کے، ایک عورتوں کو اور ایک مردوں کو، اور ایک سبق موطا کا، یہ سبق وہی صاحب پڑھتے ہیں جو میوات کے رہنے والے ہیں، مولوی صاحب سے رخصت ہو کر میں باہر آیا، اور انہی مخدوم زادہ صاحب کے ساتھ زیارت مشاہد کے واسطے چلا،

پانی پت کے مزارات | پہلے بو علی شرف قلندرؒ کے مزار پر آیا، یہ بہت وسیع حظیرہ ہے، اور نہایت آراستہ مقبرہ ہے، اندر سنگ مرمر کا فرش ہے، آٹھ ستون اس میں کسوٹی کے پتھر کے لگے ہیں، ان کی قبر پر فاتحہ پڑھا، اندر ایک مقبرہ ہے، اس میں مبارز خان کی قبر ہے، مشہور یہ ہے، کہ یہ ان کے محبوب تھے، انکی قبر پر فاتحہ پڑھا،

قاضی ثناء اللہ صاحب کا گھر | پھر قاضی ثناء اللہ صاحب مرحوم کے دولت خانہ پر آیا، بہت بڑے بڑے محلات ہیں لیکن اب شکست ہو گئے ہیں، ان کے اب کوئی اولاد پسری میں نہیں ہے، دختری اولاد میں کچھ لوگ ہیں، ان کی خاص نشست کے مکان میں، اب مدرسہ اسلامیہ ہے، یہ بیس برس سے جاری ہے، مولوی محفوظ اللہ صاحب نے جو قاضی صاحب کے پوتے تھے ۱۲۹۲ھ میں اس کو جاری کیا تھا لیکن افسوس ہے، کہ ان کا اسی سال انتقال ہو گیا، اور یہ مدرسہ انکی زندگی میں نشو و نما کو نہ پہونچا، مولوی راغب اللہ صاحب اس مدرسہ مین مدرس عربی ہیں،

یہ بزرگ مولوی محب اللہ صاحب کے بیٹے ہیں جنھوں نے اول اول اپنی صحت سے لکھنؤ مطبع مصطفائی میں کلام مجید چھپوایا تھا، مولوی راغب اللہ صاحب سے ملاقات ہوئی، بہت خلق و مروت سے پیش آئے، جس وقت میں گیا ہوں ملا جلال کا سبق پڑھا رہے تھے، وہاں سے اٹھکر مدرسۂ قرأت میں آیا، اسکے مدرس حافظ عبد الرحمٰن صاحب نابینا ہیں، انھوں نے اس ناچیز کی حد سے زیادہ توقیر کی، اس مدرسہ میں اٹھارہ طالب علم باہر کے ہیں، باقی شہر کے، حافظ عبد الرحمٰن صاحب نے باوجود بدمزگی طبیعت کے میری

فرمایش سے ایک رکوع سنایا، یہ اہل علم بھی ہیں، قرأت سبعہ کے متعدد سبق انکے یہاں ہوتے ہیں،

قاضی صاحب کا مزار وہاں سے اٹھکر قاضی صاحب کے مزار پر آیا، یہ مزار بھی گو پختہ ہے لیکن سقف وستون گنبد وغیرہ کچھ نہیں ہیں، چار دیواری کے اندر ان کا مزار ہے اور باہر ان کے صاحبزادوں مولوی دلیل اللہ و مولوی احمد اللہ صاحب وغیرہ کا، ان سب پر میں نے فاتحہ پڑھا،

خواجہ شمس الدین ترک کا مزار، وہاں سے خواجہ شمس الدین ترک علیہ الرحمۃ کے مزار پر آیا، یہ شہر سے باہر ہے، یہاں بھی بہت دھوم دھام ہے، فاتحہ پڑھکر آگے بڑھا، انہی کے مزار سے کچھ دور آگے مولوی غوث[1] علی شاہ صاحب کا مزار ہے،

غوث علی شاہ صاحب یہ بہت مشہور بزرگ ہیں، ہمیشہ سیاحت میں ان کی گذری، آخر کو شاہ بوعلی قلندر کے مقبرہ میں قیام فرمایا، اور یہیں انتقال کیا، مزار ان کا ان کی وصیت کے موافق شہر سے باہر بنایا گیا، ان پر فاتحہ پڑھا،

بدر شہید پھر حضرت امام بدر الدین شہید کے مزار پر حاضر ہوا، یہ شہر سے بہت دور ہے، ان کا مزار بھی بہت آراستہ ہے، ان کے مزار سے کچھ فاصلہ پر ان کے لشکر کے علم بردار حضرت سید علی اکبر کا مزار ہے، یہ مزار بھی بے سقف وستون ہے، ایک چار دیواری کے اندر ہے، مجھ کو یہ جگہ بہت پسند آئی، بہت دلچسپ ہے، اس شہر میں چار درگاہوں کے واسطے ایک گاؤں معاف ہے اسی سے ان کے مصارف ہیں،

شاہ بوعلی قلندر ایک شاہ بوعلی قلندر کا مزار، یہ سب مزاروں سے زیادہ دھوم دھام کا ہے، دونوں وقت یہاں نوبت بجتی ہے، دوسرا خواجہ شمس الدین ترک کا، تیسرا امام بدر الدین کا، چوتھا سید جلال الدین کبیر الاولیاء کا، یہ بزرگ مخدوم صاحب کے لقب سے مشہور ہیں، پانی پت کے مخدوم زادے ان ہی

---

[1] مولوی غوث علی شاہ صاحب بہار کے تھے، استھاوان مونگیر یا استھاوان پٹنہ ان کا وطن تھا،

کی اولاد میں ہیں، قاضی ثناء اللہ صاحب بھی انہی کی اولاد میں سے تھے، اون کے مزار پر بھی خاکسار حاضر ہوا،

شہر پانی پت پانی پت بہت پرانا شہر ہے، غدر سے پیشتر ضلع یہیں تھا، اب کرنال میں ہے، اس شہر میں ایک سو چودہ مسجدیں ہیں، اور آٹھ سو سے زیادہ حافظ ہیں، قرآن شریف کے مدرسہ بھی کئی ہیں، یہ شہر چار حصوں پر منقسم ہے، ایک حصہ انصاریوں کا، ان کے متعلقین اور شاگرد پیشہ و رعایا وغیرہ سب اسی محلہ میں ہیں، اُن کی معافیان بھی اسی جانب ہیں، اسی محلہ میں قاری عبد الرحمٰن صاحب رہتے ہیں، دوسرا مخدوم زادوں کا اس میں قاضی صاحب کا مکان ہے، اور مخدوم صاحب کی درگاہ ہے، ان لوگون کی معافیان اسی جانب ہیں، اور رعایا کے مکانات اسی محلہ میں ہیں، تیسرا افغانون کا، چوتھا راجپوتوں کا، ایک حصہ سے نکلئے تو بڑے بڑے پھاٹک ملتے ہیں، آبادی اچھی ہے، سب چیزدن کو دیکھ کر مغرب کے وقت میں مسجد آیا، یہان آکر مولوی محمد حسین رامپوری و قاضی عبد الخالق مخدوم زادہ سے لطف و حکایات میں شب بسر ہوئی،

سرہند کا سفر روز شنبہ دوم شعبان، تین بجے اٹھکر میں نے احتیاطاً وضو کر لیا، اور پانی پت کی آبادی سے نکل کر اسٹیشن آیا، گاڑی کے آنے میں ابھی دیر تھی، وہاں میں نے جو خیال کیا تو اسباب میں لنگی نہ تھی، مگر اب اتنا وقت نہ تھا، کہ میں وہاں جاتا اور آتا، اور آج کا قیام بھی میں نہیں چاہتا تھا، اسی اثنا میں چار بج گئے، تھوڑی دیر کے بعد میں نے اٹھکر صبح کی نماز پڑھی، اور ٹکٹ لیکر گاڑی پر سوار ہو گیا، یہاں سے کمپ انبالہ کے ٹکٹ لئے، میری رائے یہ ہوئی، کہ پہلے سرہند ہو آؤن، پھر مولوی محمد جعفر صاحب سے ملاقات کروں، شاید وہ روکیں تو وہاں کا جانا رہ جائے گا، اس خیال سے میں نے کمپ انبالہ پہونچکر دوسرا ٹکٹ سرہند کا لیا، یہاں گاڑی بدلی جاتی ہے، جو گاڑی کلکتہ سے الہ آباد دہلی ہوتے ہوئے آتی ہے وہ سیدھی کمپ انبالہ سے کالکا چلی جاتی ہے، جو شملہ کا اسٹیشن ہے، دوسری گاڑی

لاہور جانے والی آتی ہے، ادس پر لاہور جانے والے مسافر اس گاڑی سے اتر کر سوار ہوجاتے ہیں، کمپ سے سرہند کا ٹکٹ ۲، ۰، کو ملا، یہاں سے دس بجے روانہ ہوا، اور ۱۲ بجے کے قریب سرہند پہونچا، یہاں سے مرقد مبارک بہت دور ہے، تاہم ۶ ر میں یکہ ہوگیا، اور میں خانقاہ شریف میں پہونچا،

سرہند | یہ خانقاہ شہر سے علحدہ ہے، اصل یہ ہے کہ سرہند اب بہت ویران ہوگیا ہے، عشر عشیر بھی اب آبادی نہیں رہی، میلوں تک بنیادیں اور سڑکیں نظر آتی ہیں، جو اب کھلے میدان میں پڑی ہیں، اس وجہ سے آبادی ایک گوشہ میں ہوگئی ہے، بلکہ دو حصوں پر منقسم ہوگئی ہے، ایک وہی پرانا شہر سرہند، دوسرا خانقاہ شریف کے دوسرے جانب ہے، اس کا نام بسی ہے، یہ بہت پر رونق ہے، بہرحال خانقاہ شریف پہنچکر پہلے میں مسجد گیا، وہاں ولایتوں کا ہجوم تھا،

خلیفہ صاحب | ظہر کی نماز کے بعد خلیفہ صاحب سے ملا، ان کا نام سید محمد حسین ہے، اصل میں مالیر کوٹلہ کے رہنے والے سنجیدہ متواضع متین خلیق منتظم معلوم ہوتے ہیں، خانقاہ شریف کے متولی بھی ہیں، انھوں نے ملاقات کے بعد میرا اسباب اٹھوا کر اپنے حجرہ میں منگوالیا، اس کے بعد خدا بخش خادم آستانہ ایک پیرمرد کو بلاکر حکم دیا، کہ مجھکو زیارت کے واسطے لیجائیں، خدا بخش مجھ کو ساتھ لیگئے، قفل کھولکر کنجی میرے حوالہ کی کہ جبتک دل چاہے بیٹھئے، پھر بند کرکے کنجی مجھ کو دیدیجئے گا،

مجدد صاحب کا مزار | میں اس گنبد کے اندر گیا، ایک بہت بڑی قبر ہے، جس پر سبز ریشمی کام کی بہت بڑی شال جو شاید اسی غرض سے بنوائی گئی ہو پڑی ہوئی ہے، یہ مرقد مبارک حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی نور اللہ روحہ وا وصل الینا فتوحہ کا ہے، اس کے پاس مشرق کے جانب تین قبریں اور ایک دیوار سے ملی ہوئی مختصر سی، اور دو بٹ کران دونوں پر ایک سرخ شال پڑی ہوئی ہے، اون میں سے ایک مزار مبارک خواجہ محمد صادق کا ہے، دوسرا جار الرحمۃ خواجہ محمد سعید رحمۃ اللہ

بھا کا، اور جو قبر دیوار سے ملی ہوئی ہے، اس میں اشتباہ ہے کہ آیا کسی صاحبزادہ کی ہے یا خلیفہ کی،
رحال دیر تک میں وہاں بیٹھا، وہاں سے نکل کر دروازہ بند کرکے اور مزارات پر فاتحہ پڑھا،

دوسرے مزارات | اوسی سے متصل ایک چھوٹا گنبد اور ہے، اس میں تین قبریں ہیں، وسط میں حضرت خواجہ محمد یحییٰ بن امام ربانی رحمہما اللہ کی ہے اور اسکے دونوں پہلووں میں ایک قبر شاہ فقیر اللہ بن شاہ زین العابدین بن شاہ محمد یحییٰؒ کی، دوسری شاہ رضی الدین بن شاہ زین العابدین موصوف کی، ان پر فاتحہ پڑھکر باہر نکلا، یہاں مزارات بہت ہیں، اکثر حضرت کے عشائر و قبائل و خلفاء و مریدین کے و بیشتر شاہزادوں[۵] اور امراء و سلاطین کے جن کو حضرت سے عقیدت تھی، اکثر مزاروں پر فاتحہ پڑھکر باہر آیا، کنجی خادم کو دی، اس وقت کھانا مہمانوں اور مسافروں کو تقسیم ہو رہا تھا، میرے واسطے بھی ایک قاب پلاؤ کی خلیفہ صاحب نے بہت تکلف کے ساتھ بھیجا، ہر چند کہ مجھکو خواہش نہ تھی، کیونکہ کیمپ انبالہ سے کھا کر میں چلا تھا، تاہم ردّ دعوت کو معیوب سمجھ کر میں نے قبول کیا، اس کے بعد پھر میں زیارتوں کے واسطے خانقاہ شریف کے احاطہ سے باہر آیا،

باغ کے احاطہ میں بھی مختلف حضرات کے مزار ہیں، سب سے پہلے حضرت قطب العالم خواجہ محمد زبیر کا مزار پُر نور ہے (بن شیخ ابو العلیٰ بن حضرت خواجہ حجۃ اللہ نقشبند ثانی بن حضرت ایشانؒ) ان پر فاتحہ پڑھ کر باہر آیا،

مزار حضرت خواجہ محمد معصوم ایشاں | اس کے بعد حضرت ایشان کے مزار کا گنبد ہے، اس میں پانچ مزار برابر برابر ہیں اور تین مزار پائین میں، تین پائین کے مزار شاید خلفاء کے ہیں، اور برابر جو مزار ہیں ان میں سب سے بڑا مزار بیچ میں حضرت عروۃ الوثقیٰ خواجہ محمد معصوم حضرت ایشان[۶] کا ہے، اس کے داہنے جانب حضرت ایشان کے مزار کے متصل حضرت خواجہ محمد اشرف فرزند چہارم حضرت ایشان کا مزار ہے، اس کے بعد حضرت قیوم الزمان خواجہ محمد صبغۃ اللہ فرزند نخستین حضرت ایشان کا مزار ہے اور پائین جانب حضرت ایشان کے مزار کے متصل حضرت

[۵] کابل کے افغان امراء اور سلاطین کے یہ مزار ہیں، [۶] حضرت مجدد کے فرزند و خلیفہ ۱۰۷۹ھ میں وفات پائی،

مروج الشریعۃ خواجہ عبیداللہ بن حضرت ایشان کا مزار ہے، اس کے متصل حضرت خواجہ اہل اللہ بن خواجہ عبیداللہ کا مزار ہے، اس مزار میں اشتباہ تھا، اس واسطے اس پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے:۔

"مخفی نماند کہ مرقد مبارک حضرت شیخ ابوالعلی در عمدۃ المقامات بمعہ برادر دوئی کہ شیخ محمد عمر نام دارند، در قبۂ شریف والد ایشان قرار دادہ اند، و تصریح نمودہ اند کہ این دو برادران در قبۂ والا ایشان حضرت خواجہ محمد نقشبند ثانی مدفون اند و صاحب این قبر کہ متصل قبر شریف حضرت خواجہ عبیداللہ است، حضرت خواجہ شیخ اہل اللہ قرار دادہ کہ فرزند ثالث قیوم الزمان خواجہ محمد صبغۃ اللہ است و می نویسند کہ در آخر عمر از دار الارشاد سرہند شریف بدار الخلافہ دہلی بطریق سیر تشریف بردہ بودند آنجا رحلت نمودہ تابوت ایشان از آنجا بدار الارشاد آوردند و در روضۂ منورہ حضرت عروۃ الوثقیٰ متصل قبر مبارک حضرت مروج الشریعۃ دفن کردند رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین واللہ اعلم"

اور حضرت قیوم الزمان خواجہ عبیداللہ کے مزار مبارک پر یہ عبارت منقوش ہے:۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین سیدنا محمد وآلہ وصحبہ اجمعین، اما بعد مخفی نماند کہ این مرقد منور حضرت مروج الشریعۃ عبیداللہ بن حضرت عروۃ الوثقیٰ خواجہ محمد معصوم است رضی اللہ تعالیٰ عنہما ولادتش در ماہ رجب ۱۰۳۴ھ و وفاتش بتاریخ نوزدہم ربیع الاول روز جمعہ وقت اشراق در ۱۰۸۳ھ چنانچہ ازین تاریخ ظاہر می شود، کہ بہ وقت وفات عمر شریف ایشان چہل و چہار بود، در کتاب اولیۃ القیومیت مذکور است کہ حضرت مروج الشریعۃ عبیداللہ را درون گنبد حضرت عروۃ الوثقیٰ خواجہ محمد معصوم در جنب قرآن حضرت سمت مشرق مدفون ساختہ و اولاد و انجاب ہشت تن اند پنج پسران و سہ دختران، اما پسران یکے عبدالرحیم و دیگرے عبدالرحمن این ہر دو در طفولیت فوت شدند، و دیگر خدمت شیخ محمد ہادی

کہ فرزند بزرگ آنجناب است، و دیگر حضرت خواجہ محمد پارسا و دیگر شیخ سالم و اما دختران یکے فضل النساء منسوبہ محمد اسماعیل و دیگر شایستہ بیگم منسوبہ میر فضل اللہ و دیگر حسن النساء منسوبہ شیخ محمد اسماعیل و مخفی نماند کہ قبر حضرت شیخ محمد ہادی درون گنبد روضہ حضرت عروۃ الوثقیٰ مغرب جنوب است و گنبدے خرد براں بنا شدہ است و فاتش در رجب روز جمعہ و قبر حضرت خواجہ محمد پارسا بیرون گنبد حضرت عروۃ الوثقیٰ خواجہ محمد معصوم بر کنج صفہ پاس ؟ صفہ سمت و مشرق وفاتش سنہ ۱۱ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین، و قبر شیخ محمد سالم بیرون گنبد حضرت عروۃ الوثقیٰ ا“

یہ خاص عبارت بہت بے ربط ہے، متولین خانقاہ شریف کی لکھی ہوئی نہیں ہے، کسی زائر نے لکھی ہے، انہی بزرگ کی لکھی ہوئی اور بھی عبارتیں تھیں بعض بعض قبروں پر میں نے اعتنا نہیں لیا، ایک عبارت صرف نقل کی تھی، وہ لکھدی، اسی گنبد کے جانب گوشۂ غرب و جنوب میں ایک چھوٹا سا گنبد ہے، اس میں دو مزار ہیں، ایک خواجہ غلام معصوم الملقب بہ معصوم ثانی ابن خواجہ محمد معین کا، دوسرا خواجہ محمد اسمٰعیل بن خواجہ محمد صبغۃ اللہ بن حضرت الیشانؒ کا اور بڑے گنبد کے باہر گوشۂ جنوب و غرب میں دوسرا چھوٹا سا گنبد ہے، اس میں بھی کئی مزار ہیں، بیچ میں حضرت خواجہ محمد پارسا بن خواجہ عبید اللہ بن حضرت الیشان رح کا ہے، اور اس بڑے گنبد سے شمال کے جانب ایک اور گنبد ہے، اس میں حضرت خواجہ محمد صدّیق بن حضرت الیشان رح کا مزار ہے، اور تین قبریں اور بھی ہیں، وہ معلوم نہیں کسکی ہیں، انہی حضرت سے ہمارے حضرت شاہ محمد صابر علم اللہی قدس سرہٗ نے استفادہ کیا تھا اور اسی سمت کو باغ سے باہر کچھ فاصلہ پر ایک گنبد ہے، اس میں حضرت حجۃ اللہ خواجہ محمد نقشبند ثانی رحمہ اللہ اور ان کے صاحبزادوں کا مزار ہے، ان سب پر فاتحہ پڑھکر یہ روسیاہ اپنی شامت اعمال کا معترف

لہ ... رائے بریلوی،

باغ سے باہر نکلا اور خانقاہ شریف میں عصر کی نماز پڑھکر پھر باہر آیا،

خانقاہ شریف کی پشت پر ایک گنبد اور ہے، اس میں حضرت خواجہ سیف الدین رحمۃ اللہ علیہ بن حضرت ایشانؒ کا مزار ہے، ان پر بھی فاتحہ پڑھا، خدا ان بزرگوں کی برکت سے اس روسیاہ کی حالت بدل دے، اُخری اُولی سے بہتر کرے، اور جمعیت ظاہری و باطنی عطا فرمائے، زیارات سے فارغ ہوکر اور خلیفہ صاحب سے رخصت ہوکر اسٹیشن آیا، ساڑھے سات بجے گاڑی آئی، اس پر سوار ہوکر انبالہ گیا، اور ایک سرائے میں ٹھہر گیا، یہاں توکل شاہ صاحب ایک بڑے مشہور و معروف بزرگ سنے جاتے ہیں، ان سے انشاء اللہ تعالیٰ ملکر کل کمپ انبالہ جاؤنگا،

توکل شاہ صاحب، روز چہارشنبہ سیوم شعبان، حوائج ضروری اور کھانے سے فارغ ہوکر ۸ بجے کے قریب شہر گیا، اودھر اودھر پھر کر ملک تاج الدین ملتان عرف لکھی شاہ کے مزار پر جاکر فاتحہ پڑھا، اسی کے قریب ایک مسجد ہے، وہاں گیا، ایک نوجوان بیٹھے ہوئے تھے، ان سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں، اتفاق سے وہ کرنال کے رہنے والے توکل شاہ صاحب کے مرید تھے، اور یہاں استفادہ کی غرض سے ٹھہرے ہوئے تھے، ان سے معلوم ہوا کہ شاہ صاحب مجدّدی ہیں، اور سلوک بھی مجددیہ طریقہ کے موافق ان کے یہاں کا معمول ہے، ظہر سے پہلے کسی سے نہیں ملتے، ظہر کی نماز کے واسطے جب نکلتے ہیں، تو لوگوں سے ملاقات ہو جاتی ہے، مجھکو پہلے سے بھی اتنا معلوم تھا، اسی وجہ سے میں نے قصداً آنے میں دیر کی تھی، جب تک میں وہاں بیٹھا رہا، وہ مثنوی کے اشعار پڑھتے رہے، مجھکو بہت لطف حاصل ہوا، ظہر کے وقت وہاں سے اٹھکر شاہ صاحب سے ملنے گیا، اس وقت تک وہ برآمد نہیں ہوئے تھے، کچھ لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے، جو ان کے یہاں آتے رہتے ہیں، تھوڑی دیر کے بعد برآمد ہوئے، آتے ہی وضو کیا، اس کے بعد پھر کر ہماری طرف بیٹھے، وظیفہ پڑھتے جاتے تھے، مجھ سے صرف اس قدر دریافت کیا، کہ کہاں آئے تھے، کیوں آئے تھے، پھر مشغول ہو گئے، تھوڑی دیر کے بعد کہا کہ اب معاف کرو، یہ کہکر اندر چلے گئے، بہت ضعیف

اور معمولی وضع میں ہیں، لبس و مسکن وغیرہ میں کچھ تکلف نہیں ہے، ان کے اوضاع و طریقہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ بہت وارستہ مزاج عالی حوصلہ با ہمہ و بے ہمہ صاحب نسبت ہیں، جب تک میں بیٹھا رہا، میری حالت بہت متغیر رہی، ان کے مزاج میں جذب و سلوک ہے، از خود رفتگی و خود فراموشی بڑھی ہوئی ہے، وہاں کے لوگوں سے معلوم ہوا کہ مرتاض زیادہ ہیں، گو کہ ادراکِ نسبت کے واسطے چشم بصیرت درکار ہے، لیکن اس کور باطن کے نزدیک نسبت تو یہ رکھتے ہیں، اور مشائخ کے رسومِ ظاہری کے متقید نہیں ہیں، مجھ کو جو بات اونکی بہت پسند آئی، وہ از خود رفتگی ہے، ؎

اے مرغِ سحر عشق ز پروانہ بیاموز　　کاں سوختہ را جان شد و آواز نیامد
ایں مدعیاں در طلبش بے خبرانند　　کاں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

اون کی زبان پنجابی ہے، میں چونکہ اس سے ناآشنا ہوں اس واسطے گفتگو کا لطف حاصل نہیں ہوا، اور وہ خود بھی ایسے مستغرق تھے، کہ مجھکو موقع نہیں ملا، چونکہ میرے سفر کا زمانہ بہت ممتد ہو گیا ہے، اس واسطے افسوس کیساتھ وہاں سے یکہ کر کے کیمپ انبالہ روانہ ہو گیا، سرہند کے راستہ میں شیخ اللہ دیا تاجر سے ملاقات ہو گئی تھی ان کی دوکان خاص کیمپ میں ہے، اونھوں نے مجھ سے نہایت فروتنی سے استدعا کی تھی، کہ جب کیمپ آنے کا اتفاق ہو تو پہلے انہی کے یہاں آؤں، چنانچہ میں پہلے ان ہی کے یہاں آیا، یہاں پہنچکر مولوی محمد جعفر کو دریافت کیا، انھوں نے اپنا آدمی ساتھ کر دیا، مکان پر پہنچکر جو تحقیق کیا تو معلوم ہوا، کہ مولوی صاحب کئی دن ہوئے کھرنولے، ریاست پٹیالہ چلے گئے ہیں، مجھ کو نہایت ہی افسوس ہے، کہ اس سفر کی صعوبت میں نے انہی کے واسطے اٹھائی، اور وہ سوءِ اتفاق سے نہ ملی، وکان امر اللہ مفعولاً،

دیوبند کو روانگی یہ مغرب کا وقت ہے، آج شب کو یہاں رہونگا، اور کل علی الصباح انشاء اللہ تعالیٰ سہارنپور روانہ ہو جاؤں گا، مغرب کے بعد میری طبیعت او کھڑ گئی، اور میں نے ارادہ کر لیا، کہ

شب ہی کو سہارنپور کی طرف چلا جاؤں، بھائی جی کے پہنچنے سے پہلے اگر میں دیوبند پہنچ جاؤنگا، تو مدرسہ اور کتب خانہ کی سیر کرسکوں گا، ورنہ وہ آکر روانگی میں بہت عجلت کرینگے، باوجودیکہ میرے میزبان نے بہت اصرار کیا کہ دو چار دن یہاں رہوں مگر میں نے معذرت کی، اور عجلت کیساتھ کھانا کھا کر اسٹیشن چلا آیا، ان کے بیٹے اسٹیشن تک مجھ کو پہنچانے آئے، میں اس میزبان کا بہت شکر گذار ہوں کہ باوجود عدم سابقۂ معرفت ویا وجودیکہ مطلع ہونے معززخاندانی کے میری ایسی مدارات کی جو آشنایان صورت پرست سے بھی نہیں ہوسکتی، مجھکو ان لوگوں کے حسن ظن پر کمال حیرت ہے، کہ ہر نا قابل کو قابل خیال کرلیتے ہیں، وہ اور ان کی اولاد بچھی جاتی تھی، ان کے بیٹے اسٹیشن تک ساتھ آئے، اور میں دس بجے کی گاڑی پر دیوبند کا ٹکٹ لیکر روانہ ہوگیا، ۱۳ کرایہ پڑا، راستہ ہی سے پانی شروع ہوا، اس کے آثار انبالہ ہی میں پائے جاتے تھے، ۲ بجے کے قریب دیوبند پہونچا، مزدور اور یکہ کوئی نہ تھا، وہاں سے سرائے تک اوس تیرہ و تاریک شب میں مینہ برسنے کی حالت میں جو تکلیف ہوئی، وہ ناگفتہ بہ ہے سرائے میں آکر ٹھہر گیا،

دیوبند کی سرائے روز پنجشنبہ چہارم شعبان، مینہ کا تار نہیں ٹوٹا، برابر بارش ہو رہی ہے، اور لطف یہ ہے، کہ اس سرائے میں بیت الخلا نہیں ہے، عام دستور جنگلوں میں جانے کا ہے میں سخت متحیر ہوں کہ اس بارش میں کیونکر باہر جاسکتا ہوں، اور جس غرض سے جلدی کرکے آیا، وہ کیونکر حاصل کروں مگر ناچار سنگ آمد وسخت آمد، کچھ بارش کم ہوئی ہے، موقوف نہیں ہوئی، میں جنگل کی طرف چلا شہر سے باہر نکلتے ہی مینہ پھر زور سے آگیا، ایک مسجد میں جا بیٹھا، بیٹھے بیٹھے دس بج گئے، اس وقت پھر بارش کم ہوئی، کسی نہ کسی طرح حاجت ضروری سے فارغ ہوکر بہزار خرابی سرائے آکر کھانا کھایا اب اس وقت بارش نہیں ہے، لیکن ابر وباد کی ہیبت شکل ڈرا رہی ہے، ارادہ ہے کہ اب مدرسہ چلا جاؤں، پھر جو کچھ ہو، میں نے جیسے ہی قصد کیا، پھر زور شور سے پانی برسنے لگا، میں سخت حیران ہوں

...لہ الحالم یہ وقت رائگان ہوتا جاتا ہے، اور جس واسطے میں جلد آیا، وہ بات ہی نہیں حاصل ہوتی،
...سی فکر میں بیٹھا تھا، کہ یکہ پر بھیگتے ہوئے بھائی جی چلے آرہے ہیں انکے آنے سے کچھ طبیعت بٹ گئی،
...فکر والم کم ہوا، لیکن شام تک اسی قید میں بسر ہوئی، عصر کے وقت کچھ ترشح کم ہوا، تو میں نے بھائی
...جی سے کہا، کہ اب آپ تشریف رکھئے، میں مدرسہ دیکھ آؤں، چنانچہ وہ بیٹھے رہے، اور میں
...مدرسہ گیا،

...مدرسہ | چونکہ چار بجے کے بعد گیا تھا، مدرسہ بند ہو گیا تھا، طلبہ موجود تھے، بعضوں سے ملاقات ہوئی،
...اور عمارت کو دیکھا، اس میں شک نہیں کہ اس مدرسہ کی عمارت بڑے سلیقہ سے بنائی گئی ہے، اس کی
...صفائی اور ستھرے پن سے مہتمم مدرسہ کا سلیقہ معلوم ہوتا ہے، اس کو دیکھکر واپس ہوا، کیونکہ مینہ
...کا ترشح پھر شروع ہو گیا تھا، راستے نہایت خراب اور ابتر تھے،

جامع مسجد دیوبند | راستہ میں جامع مسجد کی سیر کی، اس کی بھی عمارت قابل دید ہے، تین درجہ کی مسجد
...ہے، کسی قدر کرسی بھی ہے، صحن بھی وسیع ہے، صحن میں ایک حوض ہے، جس میں ہر وقت پانی بھرا
...رہتا ہے، نہایت عمدہ عمارت ہے، مولوی عبدالخالق صاحب کی سعی اور حاجی محمد عابد صاحب کے اہتمام
...سے بنی ہے، اسکو دیکھکر نہایت افسوس وحسرت کے ساتھ قیام گاہ واپس آیا، رات بھر مینہ برستا رہا، اور
...مجھ کو اپنے اوقات کے ضائع ہونے کا غم رہا،

حاجی محمد عابد صاحب | روز جمعہ پنجم شعبان ۱۳۱۲ھ، صبح کو کسی قدر کھل گیا، بھائی جی اور میں حوائج ضروری
...سے فارغ ہو کر مدرسہ آئے، مدرسہ جمعہ کی وجہ سے بند تھا، وہاں سے محمد عابد صاحب سے ملنے کے لئے
...چھتہ والی مسجد آئے، حاجی صاحب نہایت اخلاق بزرگانہ کے ساتھ ملے، ان سے غرض بیان کی
...گئی، اس کے نسبت دوسرے دن کا وعدہ کیا، یہ بزرگ صالح، اور تکسیر ورقیت میں ماہر ہیں اور اہل
...حوائج اکثر ان کی خدمت میں آیا کرتے ہیں، صبح سے دس بجے تک نقوش اور تعویذ تقسیم کرتے ہیں، مکان

دیوبند انکے بہت معتقد ہیں،

نماز جمعہ میں وعظ | ان سے مل کر مولوی محمود حسن صاحب مدرس اول مدرسہ عربیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اتفاق سے مکان پردہ نہ تھے، وہاں سے قیام گاہ پر واپس آئے، کھانا کھا کر پھر جمعہ کی نماز کے واسطے جامع مسجد آئے، مولوی خلیل احمد صاحب انبٹھوی مدرس دوم مدرسہ عربیہ نے نماز پڑھائی، اوس کے بعد مولوی محمد زکریا صاحب نے وعظ فرمایا، یہ مولوی عبدالخالق صاحب کے بڑے صاحبزادے ہیں، اور مولوی عبدالخالق صاحب مولوی شمس الدین مصنف شریعت کا لٹھ ۱۱کے خلف الصدق ہیں، یہاں میں نے ان کو دریافت کیا، معلوم ہوا کہ وہ آج کل سیر و سفر میں ہیں،

سید صاحب کے ایک مرید | مولوی شمس الدین صاحب ہمارے حضرت سیدنا[1] کے مرید تھے، ان کے مرید ہونے کا عجیب قصہ ہے، پیشتر یہ نہایت شوقین اور مبتدع تھے، انھوں نے حضرت سیدنا کی ہجو میں کچھ اشعار لکھے تھے، اور اس میں نہایت سخت سُست الفاظ لکھے تھے، جب حضرت سیدنا دیوبند تشریف لائے، اور لوگوں کا ہجوم ہوا، تو ان کے بھی دل میں آیا، کہ جا کر ان کو دیکھیں، اس غرض سے گئے، جب وہاں گئے، اور سلام کیا، تو سید صاحب نے فرمایا آپ کا کیا نام ہے، اونھوں نے عرض کیا شمس الدین، حضرت نے فرمایا وہی شمس الدین جنھون نے ہماری ہجو میں اشعار لکھے ہیں، سید صاحب نے اس کو تیز آواز میں فرمایا، اور اس ادا سے فرمایا، کہ یہ بیخود ہو کر گر پڑے، اور لوٹنے لگے، سید صاحب بار بار یہی فرماتے جاتے تھے، اور ان کی وہی حالت تھی، آخر کو جب انھیں ہوش ہوا، تو انھون نے بہت معذرت کی، اور مرید ہوئے، اور ایسے مرید ہوے، کہ سید صاحب کے رنگ میں ڈوب گئے، اور باوجود استداد زمانہ کے ان کی اولاد میں ابتک ان کا رنگ باقی ہے، میں نے آج ان کے پوتے کا وعظ سنا اوسی پر تو یہ ہے، جس پر حضرت سیدنا کے عامۂ اصحاب کا مسلک ہے،

[1] حضرت سید احمد شہید بریلوی؛

...محمود حسن | وغیرہ سن کر ہم پھر مولوی محمود حسن صاحب کی خدمت میں گئے، ترشح ہو رہا تھا، مولوی صاحب
...مکان کے متصل جو مسجد ہے، اس میں تشریف رکھتے تھے، تعارف کے بعد اسی مسجد میں جلسہ رہا، عصر
...مدرسہ کے ابتدائی حالات اور اب جو نزاع واقع ہو گئی ہے، اسکی کیفیت بیان کرتے رہے،

...دیوبند میں ایک پرانا جھگڑا اور مدرسہ کا اصول | مختصر یہ ہے کہ اس نزاع کی بنیاد اسی وقت پڑ گئی تھی، جس وقت مدرسہ کی بنیاد ڈالی گئی تھی، اور اس کی وجہ یہ ہے، کہ بانی مدرسہ جناب مولینا محمد قاسم
...ب مرحوم نے مدرسہ کے جو اصول اس وقت قائم کئے تھے، اور جن پر اب تک عملدرآمد ہے، اون
...سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے، کہ ارباب مشورہ میں ہمیشہ صلحا، اور علما منتخب کئے جایا کریں ارباب
...ہت کو اس میں ہرگز دخل نہ دیا جائے، اور اس میں مصلحت یہ تھی، کہ ان کو ہمیشہ اپنی بات کی پچ پڑ جاتی
...اور اختلاف رائے پر بیش از بیش اصرار ہوتا ہے، گو مدرسہ کی بدخواہی ہی کیوں نہ متصور ہو، اس
...ت دیوبند میں اکثر ارباب وجاہت موجود تھے، جن کو ارباب مشورہ میں منتخب نہیں کیا، باوجودیکہ
...کبیر السن بھی تھے، ان کو اس بات پر بہت ملال ہوا، لیکن وہ تجربہ کار اور پختہ کار تھے، اس
...سطے انھوں نے صریحاً مخالفت کی جرأت نہیں کی جب ان لوگوں کا انتقال ہو گیا، اور ان لوگوں
...اپنے بعد ناتجربہ کار وارث چھوڑے تو ان لوگوں نے اپنی خام خیالی سے کھلم کھلا مخالفت کرنی
...رع کر دی، لیکن خدا کی قدرت سے اب تک کوئی ایسا موقع نہیں ملا جس سے اون کی مطلب
...ری ہوتی،

...ی محمد عابد مہتمم کی معزولی | اب سوء اتفاق سے ایک موقع بھی ان کو مل گیا، وہ یہ ہے کہ حاجی محمد عابد صاحب سابق مہتمم مدرسہ کے سفر حج کے بعد منشی محمد فضل حق صاحب مہتمم مدرسہ کئے گئے،
...سے دو چار نازیبا حرکتیں ایسی صادر ہوئیں، کہ چار و ناچار ان کی اطلاع ارباب مشورہ کو دینی پڑی
...رت مولینا مولوی رشید احمد صاحب سرپرست مدرسہ نے حکم دیا کہ یہ موقوف کر دیئے جائیں،

ان سے ارباب مشورہ نے عرض کیا، کہ ان کے موقوف ہونے سے کوتہ اندیشوں کو درازی کا موقع ملے گا، کیونکہ اکثر مخالفین ان کے عزیز ہیں، اور خود ان کو بھی اپنی موقوفی کا رنج ہوگا، مولینا نے پھر مکرر بھی ارشاد فرمایا، کہ یہ موقوف کردئے جائیں، گو تمام عالم مخالف ہوجائے، جب تک مدرسہ کا تعلق ہم لوگوں سے ہے، اس کے ہم ذمہ دار ہیں، کسی بیجا کارروائی کو ہم چھپا نہیں سکتے، پھر مکرر عرض کیا گیا، کہ جو نزاع برپا ہوگی، اس سے مدرسہ کو مضرت پہونچنے کا اندیشہ ہے، کیا عجب ہو کہ مدرسہ ٹوٹ جائے، مولینا نے فرمایا کہ مدرسہ خدا کی رضامندی کے واسطے کیا گیا ہے، اور جو کچھ ہم کر رہے ہیں، اسی کے واسطے ہے اگر اسی کے ہم گناہ گار ہو کر اس کو انجام دیں تو کون سے ثواب کی بات ہے، جب تک اس کی رضامندی کے موافق کام ہوسکے، اس وقت تک کریں گے، ورنہ چھوڑ دیں گے، جب باوجود اصرار کے مولانا اس پر مصر رہے تو سب چپ ہوگئے لیکن اس بارہ میں سب متزلزل الرائے تھے، مولینا نے فرمایا کہ تم سے نہیں ہوسکتا، تو ان کو ہمارے پاس بھیجدو، ہم سمجھا دیں گے، لوگوں نے بھی اس کو مناسب سمجھا، اور خود منشی فضل حق صاحب نے بھی جب اس قسم کے تذکرے سنے، تو لوگوں سے رائے پوچھی، سب نے بالاتفاق یہ رائے دی، کہ حضرت مولوی رشید احمد صاحب سے مل لیجئے، جیسا ان کے خیال میں ہو اس پر عمل کرنا بہتر ہے، وہ بھی مولینا کے بہت معتقد تھے، گنگوہ چلے گئے، مولانا نے ان سے فرمایا کہ تمھاری نسبت عموماً لوگوں کے ایسے خیالات ہیں، بہتر ہے کہ تم استعفا دیدو، کیونکہ اس میں مدرسہ کی خیر خواہی ہے، انھوں نے ملازمت کی وجہ سے کچھ پس وپیش کیا، لیکن مولینا نے فرمایا کہ نوکری کا کچھ پس وپیش نہ کرو، تمھاری نوکری ہوجائیگی، اس کے بعد مولینا نے بہت نصیحت کی کہ بعد استعفا دینے کے تم اور کچھ خیال کرنا، جیسے اب تک ہواخواہ رہے، ویسے ہی ہمیشہ خیر خواہ بنا اس میں تمھارے واسطے بہتری ہے، وہ یہ سب کچھ سن کر وہاں سے آئے اور طوعاً و کرہاً انھوں نے استعفا پیش کیا، اور وہ استعفا منظور بھی ہوگیا،

مخالفین کی کوششیں | اس کے بعد ان مخالفین کو تہ اندیشیوں نے ان کو برانگیختہ کرنا شروع کیا آخرالامر ان لوگوں نے اس کو مبنی علیہ فساد کا قرار دیکر جو باتیں نہ کرنے کی تھیں، وہ بھی شروع کر دیں، خط پرخط مولینا کی خدمت میں نہایت سخت وسست الفاظ کے لکھ لکھ کر روانہ کئے، اور بہت کچھ ڈرایا دھمکایا، لیکن مولینا نے ان سب خطوں کا صرف یہ جواب دیا، کہ تم ہم سے انتزاع کرنے کے مجاز نہیں ہو، ہم چندہ دینے والوں کے وکیل ہیں، اگر ان کو ہم سے کچھ پوچھنا ہو تو ہم اس کے جواب دہ ہیں، تمہارا جی چاہے تو ان لوگوں سے کہو وہ ہم سے جو پوچھیں گے، ہم اس کا جواب باصواب دیں گے،

جب انھوں نے یہ تدبیر کارگر نہ دیکھی، تو ایک اشتہار چھپوایا، جس میں نہایت صاف صاف ارباب مشورہ کے نسبت سخت سُست الفاظ لکھے تھے، اور مولینا سلمہم اللہ تعالیٰ کو منہ پھوڑ کر گالیاں دی تھیں جس کے دیکھنے اور سننے کے ارادتمند متحمل نہیں ہو سکتے، اور جو کچھ بددیانتی، اور بے ضابطگی اون کے زعم باطل میں تھیں، وہ سب لکھ دیں، اور ایک تاریخ مقرر کی جس میں چندہ دینے والے آکر مدرسہ کا جائزہ لیں اور اپنے مدرسہ کی حقیقۃ الحال کو سمجھیں، اس کی پانسو کاپیاں چھپوا کر تمام چندہ دینے والوں کے پاس بھیجدیں، جس سے تمام متعلقین مدرسہ کو نہایت اضطراب پیدا ہوا، اس کی بھی اطلاع مکرر حضرت مولینا مدظلہ کی خدمت میں کی گئی، مولانا نے فرمایا، کہ ان کی خاک اوڑانے سے کچھ نہیں ہونے کا، اوّل تو وہ لوگ آئیں گے نہیں، اگر آئیں تو بسم اللہ چشم ما روشن دل ماشاد، اپنے مدرسہ کا حساب وکتاب سمجھیں، جب تک تمھارا تعلق ہے، اوس وقت تک تم اپنے فرض منصبی کو نہایت اطمینان سے پورا کرتے رہو، اس میں غفلت نہ ہونے پائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، کہ کوئی آیا نہیں، وہ لوگ کئی روز تک برابر اسٹیشن استقبال کو جایا کئے، اور جو آئے بھی وہ سیدھے مدرسہ میں آئے، دوچار دن رہکر دیکھ بھال کر چلے گئے،

مولینا گنگوہی پر الزام بغاوت | جب اس سے بھی وہ عاجز ہوئے، تو انھوں نے گورنمنٹ کی خدمت

میں استدعا کی، کہ یہ مدرسہ نہایت خراب اصول پر چل رہا ہے، ان لوگوں کے خیالات بغاوت آمیز ہیں، اسی واسطے مدرسہ میں ولایتی کثرت سے رکھے گئے ہیں، اور ایک زمانہ میں مولوی رشید احمد نے تھانہ بھون کی بغاوت میں شرکت کی تھی[1]، یہ ہمیشہ کے باغی ہیں، ان کی مسل نکالی جاوے، بہتر تو یہ ہے کہ اس مدرسہ کو گورنمنٹ اپنے ہاتھوں میں لے، اور اگر یہ منظور نہ ہو تو حاجی محمد عابد صاحب اس کے سرپرست مقرر کئے جائیں جن کو جشن جوبلی میں شمس العلماء کا خطاب دیا گیا ہے، اس اشتہار کے چھپنے پر ہوا خواہان حضرت مولینا سلمہم اللہ تعالیٰ کو نہایت تشویش پیدا ہوئی لیکن مولینا نے سب کو کمال استقلال کے ساتھ تسلی دی، کہ اب ہمارا پیمانہ عمر لبریز ہو چکا ہے۔ اگر منظور الٰہی یہی ہے، تو بہتر ہے، ہم کیوں مرتے مرتے اس ذمہ داری کے کام کا مواخذہ لیجائیں، اور اصل تو یہ ہے کہ ان کے کرنے سے کچھ نہ ہوگا جب خدا نے اس وقت ہم کو محفوظ رکھا، تو اب بھی محفوظ رکھے گا، اسی طور پر وہ لوگ خاک اڑا رہے ہیں، اب بھی ایک شخص دہلی دوسرے مضمون کا اشتہار چھپوانے گیا ہے۔ اور خدا کی عنایت یہ ہے کہ کسی مسلمان نے ایسے از سرتا پا حیلہ انگیز اشتہار کا چھاپنا پسند نہیں کیا، ایک ہندو منیجر مطبع نے چھاپا ہے، اسی ہفتہ میں کلکٹر ضلع مدرسہ کے معاینہ کو آیا، اور اس نے مدرسہ کے ہر ہر مکان کو ملاحظہ کیا طالب علموں سے ان کی سکونت دریافت کی، بعض نے اپنا اپنا مکان بیان کئے، چلتے وقت معائنہ کی کتاب میں مدرسہ کی نہایت تعریف لکھی، جس کی امید نہ تھی، بہرحال بفضل خدا مدرسہ کی ترقی روز افزوں ہے، اور ان لوگوں کی حالت بھی ترقی پذیر ہے،

ابھی تک ادھر سے کوئی جواب ترکی بترکی نہیں دیا گیا، میری رائے میں اگر اس پمفلٹ پر لائبل کیس کر دیا جائے، تو ان کی حقیقت کھل جائے، مگر چونکہ یہ لوگ نہایت متحمل اور بردبار ہیں اب تک کسی نے خیال نہیں کیا، یہ سب باتیں ہوتی رہیں، اور مینہ لگاتار برستا رہا، وہیں عصر کی نماز

---

[1] ۱۸۵۷ء میں،

پڑھی، نماز کے بعد بارش کا سلسلہ موقوف ہوا، تو ہم نے اجازت چاہی لیکن مولوی محمود حسن صاحب نے نہایت اصرار سے اس بات پر زور دیا کہ اون کے مکان پر ہم اوٹھ آئیں، اور نہایت تعجب کے ساتھ شکایت کی، کہ آپ کا سرائے میں ٹھہرنا محلِ تعجب ہے، مگر چونکہ اسباب ہمارے ساتھ ہے، اور کالے خان نے کھانے وغیرہ کا وہاں انتظام کرلیا ہے، اس وقت بھی تیار ہو رہا ہے، اس وجہ سے وہاں اٹھ جانے کی رائے نہ ہوئی، مولوی صاحب کا اصرار بڑھتا گیا، اور ہماری معذرت، آخر کو رائے اس پر قرار پائی، کہ کل دن کو کھانا مولوی صاحب کے یہاں کھائیں، اسی قرارداد پر ہم رخصت ہوئے، رات بھر سرائے میں رہے، مینہ برستا رہا،

(باقی)

الفاروق

یعنی حضرت فاروق اعظمؓ کی لائف اور طرز حکومت، صحابہ کے فتوحات، طریقۂ حکومت، عراق وشام مصر اور ایران کے فتح کے واقعات، حضرت عمرؓ کی سیاست، اخلاق وزہد، عدل اور اسلام کی عملی تعلیم کا شاندار منظر،

مولینا شبلی کی یہ بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہے، اگرچہ مسخ شدہ صورت میں معمولی کاغذ پر اس گراں پایہ کتاب کے بیسیوں اڈیشن فروخت ہو رہے ہیں، مگر اہلِ نظر کو ہمیشہ اس کے اعلیٰ اڈیشن کی تلاش تھی، مطبع معارف نے نہایت اہتمام اور سعی بلیغ سے اس کا نیا اڈیشن تیار کرایا ہے، جو حرف بحرف نامی پریس کانپور کی نقل ہے، نہایت عمدہ کتابت، اعلیٰ چھپائی، عمدہ کاغذ، دنیائے اسلام کا رنگین نفیس نقشہ، مطلا ٹائٹل، ضخامت ۲۱۲ صفحے قیمت سے ر

"منیجر"

مغالطۂ تحلیل

از

جناب خواجہ عبد الحمید صاحب ایم اے لکچرار فلسفہ، گورنمنٹ کالج، گجرات، پنجاب،

(۲)

(ب) اب کائنات کا وہ حصّہ لیجئے جس کے موجودات ذی حیات ہیں، اور جس کے اجسام آلیہ ہیں۔

اجسام آلیہ، اور غیر آلیہ (یعنی غیر ذی حیات) کا اختلاف اس مثال سے فوراً ذہن نشین ہوجائے گا، میری گھڑی ٹوٹ گئی ہے لیکن اس کا ایک پرزہ بالکل صحیح وسالم ہے تو یہ ٹکڑا آپ کی گھڑی میں، اگر وہ اسی طرز کی ہے جیسی کہ میری تھی، استعمال ہوسکتا ہے، دونوں گھڑیاں موجوداتِ غیر ذی حیات (یعنی غیر آلیہ) ہیں، لیکن اگر میری یا آپ کی ٹانگ خدانخواستہ کٹ جائے، تو کیا ایسے ہی قد وقامت کے کسی ہمسایہ کی ٹانگ مستعار لیجا سکتی ہے،؟ اور اگر وہ دے بھی دے، تو کیا ہمارے جسم کیساتھ اس ہمسایہ کی ٹانگ کا زندہ جوڑ ممکن ہے،؟ اجسام آلیہ اور غیر آلیہ میں یہی اہم فرق حد فاصل ہے، جسم غیر آلیہ کا ایک جزو دوسرے جسم غیر آلیہ میں استعمال ہوسکتا ہے، لیکن جسم آلیہ کا کوئی عضو اگر اس جسم سے علٰحدہ ہوجائے، تو وہ عضو زندہ نہیں رہتا، اور نہ اس کا زندہ جوڑ دوسرے جسم آلیہ کیساتھ ہوسکتا ہے،

اب کیا سائنس کا تحلیلی اور ترکیبی طریق کار جو عالم غیر ذی حیات میں اس قدر مفید ثابت ہوا، اجسام آلیہ (ذی حیات) کی دنیا میں بھی اسی طرح مفید اور سیر حاصل ہے،؟ کیا حیات، ذہن، شعور اور جماعت کے مختلف اور لاتعداد مسائل پر یہ طریق کار اسی طرح روشنی ڈالتا ہے، جیسے کہ اجسام غیر آلیہ کے

فہم و ادراک پیدا؟

اجسام آلیہ میں نہ تو مکمل تحلیل ممکن ہے (کیونکہ حیات کا عنصر تو عمل تحلیل سے مفقود ہو جاتا ہے) اور نہ صحیح و مکمل ترکیب ہی آسان ہے، پھر ان اجسام میں ایک کثیر تعداد ان کی ہے جن میں حیات کے علاوہ ذہنی اور نفسی کیفیتیں بھی موجود ہیں، جن کی کلی تخیلی تحلیل تو کسی حد تک ممکن ہے لیکن جن کی مکمل تخیلی ترکیب (اور ایسی ترکیب کے نتائج کا صحیح اندازہ کرنا) قریباً ناممکن ہے، ایسے موجودات کے مطالعہ کیلئے سائنس کا تحلیلی و ترکیبی طریق کار بہت حد تک ناکام رہا ہے، یہ موجودات ان علوم سے متعلق ہیں جنھیں ہم حیاتیات اور انسانیات[۱] کے وسیع عنوانات دیکھتے ہیں،

غور فرمائیے، علوم طبیعیات اور کیمیا کی محققانہ، دقیق اور صحیح نتائج انکشافات و اختراعات اور ایجادات کے مقابلہ میں حیاتیات اور انسانیات کے نتائج اور تحقیقات کس قدر مشروط اور غیر یقینی ہیں، ان علوم میں تو ابھی علماء کا اجماع ان کے تمام ابتدائی مسائل پر بھی نہیں ہوا ایک ہی علم کے محققین، طریق کار، مسائل اور مقاصد کے معاملہ میں مختلف اور متضاد گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں، مثلاً حیاتیات میں میکانیئین[۲] اور عضویئین[۳] کا باہمی تضاد بظاہر شاید اصولی اور ناقابل حل ہے،

نفسیات میں کئی مذاہب ہیں، اور ہر ایک مذہب دوسرے کو اصحاب مغالطہ بتاتا ہے، کوئی شعور کے معاینہ پر مصر ہے، اور بغیر اس کے نفسیات کو ناممکن قرار دیتا ہے، کوئی عمل[۴] کے معاینہ کو اشد ضروری سمجھتا ہے، اور شعوریئین[۵] کو ایک مصنوعی، بے حقیقت اور خود ساختہ خیالی دنیا کا باشندہ قرار دیتا ہے کوئی

---

[۱] Humanistic SCIENCES [۲] میکانیئین (Mechanists) سے مراد وہ علماے حیاتیات ہیں، جن کا عقیدہ ہے کہ عنصر حیات سفیدہ سلول کے کیمیاوی اور طبیعی اجزاء کے علاوہ کوئی شے نہیں ہے، [۳] عضویئین (Vitalists) سے مراد وہ علماے حیاتیات ہیں جو عنصر حیات کو کیمیاوی اور طبیعی اجزاء سے بالکل مختلف سمجھتے ہیں اور اس عقیدہ پر قائم ہیں کہ سفیدہ سلول کی کیمیاوی تحلیل سے عنصر حیات کا عقدہ حل نہیں ہو سکتا، [۴] Behaviour [۵] INTROSPECTIONIST

نفسی طبیعیات[1] کو نفسیاتی نتائج کی صحت کا واحد ذریعہ سمجھتا ہے، کوئی نفسی تحلیل[2] کو نفسیات کی جان تصور کرتا ہے، کوئی نفسیاتی احصائیہ[3] پر مصر ہے، اور کوئی پیمائش[4] فراست پر، الغرض یہ اصولی اختلافات ہیں جو طالب علم کو اپنی اپنی طرف کھینچ رہے ہیں،

اخلاقیات کی حالت اس سے بھی بری ہے، اس کے متعلق ابھی یہ بھی فیصلہ نہیں ہوا کہ وہ اخلاق کا فلسفہ ہے یا خیر کا علم، اس کا تعلق انسان فاعل سے ہے، یا انسان کے فعل سے، یا اس نتیجہ سے جو اس فعل سے صادر ہوا،

سیاسیات اور معاشیات درحقیقت اس معنی میں علوم ہیں ہی نہیں جس مفہوم میں طبیعیات اور کیمیا علوم ہیں، ان علوم میں مادہ اور اسکی مختلف حالتوں کو کمیت کے نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے، اور نتائج کی صحت کا سب سے بہتر اور صحیح معیار یہ سمجھا جاتا ہے، کہ انھیں دوسرے سائنس داں بھی اپنی اپنی کارگاہوں میں پرکھ سکیں، نتیجہ میں کمیت کی ذرہ برابر کمی بیشی بھی اس نتیجہ کی عدم صحت پر دال ہوتی ہے، لیکن سیاسیات اور معاشیات میں یہ دقتِ نظر اور صحتِ نتائج قریب قریب ناممکن ہے، ان علوم میں تو ابھی نہ طریق کار کے متعلق اتفاق ہے، اور نہ نصب العین اور مبحثِ فکر کے متعلق، آج کل تو ہر قوم، ہر ملک بلکہ ہر ملک و قوم کے ہر سیاسی حزب کا اپنا اپنا مخصوص طریق کار، مبحث فکر اور نصب العین ہے، ہر سیاسی حزب اپنے ان نظریوں کو نہ صرف تشدد سے دوسروں کے سامنے پیش کر رہا ہے، بلکہ وہ اس کوشش میں رہتا ہے، کہ ہو سکے تو بزور شمشیر تمام دنیا کو ان نظریوں پر عمل پیرا کرے، سچ تو یہ ہے کہ سیاسیات اور معاشیات میں (اور ان میں علوم مدنی کی باقی ماندہ مثالیں شامل کر لینی چاہئیں،) منطق کا مشہور

---

[1] Psycho physics [2] Psycho analysis

[3] mental statistics

[4] measurement of Intelligence

مغالطہ دلیل عصائی، برہان قاطع کے طور پر استعمال ہو رہا ہے،[1]

ہم نے سطور بالا میں علوم انسانیات کے مشہور و معروف شعبوں کو درج کر کے عرض کیا ہے کہ ان علوم کی ارتقائی حالت تسلی بخش نہیں ہے، نہ ان میں طریق کار کی یگانگت ہے، نہ نصب العین کی یکسوئی، نہ ان میں کیفیت کے لحاظ سے یکرنگی ہے، نہ کمیت کے لحاظ سے درستی و صحت نتائج، اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے، کہ ان علوم میں کچھ کام نہیں ہو رہا ہے، یا ان علوم کے متوالوں کی تعداد تھوڑی ہے، کام بہت ہو رہا ہے، اور بہترین کارکن کثیر تعداد میں مصروف کار ہیں، لیکن ان کے کام کی اصولی بے مائگی اور بے حاصلی (کمیت کے لحاظ سے یا نتائج کی بے ترتیبی) درحقیقت اس امر کو واضح کر رہی ہیں، کہ یہ علوم اپنی نوعیت اور ساخت میں ان علوم سے بالکل مختلف ہیں، جن کا موضوع بحث و کار مادۂ غیر ذی حیات ہے، وہاں طریقہ تحلیل بہت کام دیتا ہے، لیکن ان علوم میں بجائے فائدہ مند ہونے کے وہ گمراہ کرتا ہے، انسانی نفس دل و دماغ معاشرت، سیاست اور اخلاق، وغیرہ اس قدر پیچیدہ مسائل پیدا کرتے ہیں، کہ ان کی صحیح صحیح تحلیل کر لینا عملی طور پر اگر ناممکن نہیں تو سخت مشکل ضرور ہے، اور اگر صحیح تحلیل ہو بھی جائے، تو بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے، کہ تحلیل نے جو اجزا ہمارے ہاتھ میں دئے ہیں، ان کے جوڑ توڑ سے یا انھیں نئے طریقوں سے ملا کر ہم اپنے ان مسائل کے متعلق کارآمد نظریے اور طریق کار دریافت کر سکیں گے، نفسیات جماعت کی صرف ایک مثال لیجئے، زید اگر طبعاً بزدل ہے، تو اغلب ہے کہ بہادروں کی فوج میں بھرتی ہو کر اور ان کے شجاعانہ کارناموں سے متاثر ہو کر وہ بھی بہادرانہ کام کر ڈالے، بکر اگر طبعاً بہادر ہے، تو اغلب ہو کہ بزدلوں کے گروہ میں شامل ہو کر اور انھیں بھاگتا ہوا دیکھ کر وہ بھی بھاگ جائے، اس سے ظاہر ہوا کہ وہی شخص جو طبعاً ایک طرح کی خاصیت اپنے اندر رکھتا ہے، جب وہ کسی جماعت یا گروہ میں شامل ہوگا، تو اسکی نفسی حالت یا طبیعت میں غیر معمولی فرق

[1] یعنی اگر مخالف یا معترض آپ کا قول نہ مانے تو اس کا سر پھوڑ دیجئے،

آجائیگا، اب کیا ہم زید و بکر کی نفسی تحلیل سے ان نتائج تک پہونچ سکتے ہیں ؟ ہرگز نہیں، ہمیں یہ نتیجہ صرف مشاہدہ سے معلوم ہوسکتا ہے،

اس سے ثابت ہوا کہ علوم انسانیات میں، بلکہ ان تمام علوم میں جن کا موضوع فکر مادۂ ذی حیات ہے طریقہ تحلیل نہ صرف بالعموم بے حاصل ہوتا ہے، بلکہ اکثر اوقات گمراہ کن بھی ہوتا ہے کم ازکم ہم کسی صورت میں بھی ان علوم میں تحلیل کے نتائج پر قانع نہیں رہ سکتے،

۱۰۔ کیا علوم انسانیات میں طریقۂ ترکیب ہماری مشکلات کو حل کر دیتا ہے ؟ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ نہیں، ان علوم میں طریقۂ ترکیب کے استعمال کی بہترین شکل وہ ہے، جسے طریقۂ عملی کہتے ہیں، یعنی اگر ہم کو یہ معلوم کرنا ہے کہ ہمارا فلان فلان نظریہ صحیح ہے، یا نہیں تو ہمیں چاہئے کہ اسے بہترین شکل و حالات میں عمل میں لائیں، اور دیکھیں کہ اس کے عملی نتائج کیا ہیں، اگر یہ عملی نتائج تسلی بخش ہیں، تو نظریہ صحیح ہے اور اگر غیر تسلی بخش ہیں، تو نظریہ غلط ہے، اور اسے بدلنا چاہئے، تسلی بخش اور غیر تسلی بخش ہونے کا معیار کیا ہے، ؟ یہ معیار کوئی مستقل شے نہیں، ہمیں اپنی وقتی ضروریات کی روشنی میں فیصلہ کرنا پڑے گا،

اس طریقۂ عملی میں بہت سے فوائد ہیں، سب سے بہتر فائدہ یہ ہے، کہ ہم اپنے نظریہ کو عملی طور پر پرکھ کر فیصلہ کر سکتے ہیں، کہ وہ صحیح ہے، یا نہیں، اگر نتائج تسلی بخش نہیں ہیں، تو ہم اپنے نظریہ کو بدل سکتے ہیں،

اب ذرا اس طریقۂ کار کو بغور دیکھئے، فرض کیجئے کہ ہمیں اپنی معاشرت میں چند نقائص کو دور کرنا ہے تو ہم پہلے پہل تو حتی المقدور تمام حالات کا مطالعہ کرتے ہیں اور ماحول کا مفصل جائزہ لیتے ہیں اور جن مختلف محرکات کو ملت میں برسرکار دیکھتے ہیں، ان کی پھر (حتی المقدور) تحلیل کرتے ہیں، اس کے بعد ہم اندازہ کرتے ہیں، کہ ان محرکات میں فلان فلان کو اگر گھٹا دیا جائے اور فلاں فلاں کو اگر بڑھا دیا جائے تو امید ہے کہ یہ نقائص دور ہو جائیں گے، چنانچہ ملت کے بہترین دماغ کوئی نظریہ اختراع کرتے ہیں، اور

THE PRAGMATIC METHOD

اسے قانون کی شکل دیکر رائج کرتے ہیں، اگر اس قانون سے (کچھ مدت کے بعد) وہ نقائص دور ہوجائیں تو گویا ہمارا نظریہ صحیح ثابت ہوا، اور نظریہ کی اختراع سے پہلے ہم نے جو تحلیل محرکات کی تھی، وہ بھی صحیح ثابت ہوئی، لیکن اگر اس نئے قانون کے باوجود وہ نقائص دور نہ ہوں، بلکہ چند اور نقائص بھی پیدا ہوجائیں، تو کیا ہوگا؟ کیا ہم صرف یہ کہیں گے، کہ کچھ پرواہ نہیں، دوبارہ محرکات کی تحلیل کرکے بہترین نظریئے و قانون بنائیں، کیا ملت کا فرض صرف اس طرح سے دور ہوجاتا ہے؟ کیا پچھلے ناقص نظریہ اور قانون کی وجہ سے ہم نے ملت میں نئے امراض داخل نہیں کردیئے؟ ان لوگوں کا کیا حشر ہوگا جنھیں ہمارے نظریہ اور قانون کی وجہ سے نقصان اٹھانا پڑا ہے، کیا افراد ملت اب ہمارے نئے قانون کیلئے تختۂ مشق بننے کو تیار ہیں؟

اس مثال سے علوم کیمیا وطبعیات، اور علوم انسانیات میں جو بعد المشرقین ہے ظاہر ہوگیا ہوگا۔ علوم کیمیا وطبعیات میں آپ نظریہ قائم کرتے ہیں، اور اپنی کارگاہ میں مختلف کیمیادی مسالے اور طبعی آلات کی مدد سے تجربے کرتے ہیں، اور اپنے نظریہ کی صحت کے متعلق رائے قائم کرتے ہیں، آپ کا تجربہ اگر نظریہ کو غلط ثابت کرتا ہے، تو آپ فرماتے ہیں، چلو کیا ہوا، نیا نظریہ اختراع کرو، دوبارہ تجربہ کرلو، صرف چند روپیوں کا نقصان ہوا، اور کچھ وقت ضائع ہوا ہے، اور بس، لیکن جب آپ ایک سیاسی یا معاشرتی تجربہ پوری قوم وملت پر کرتے ہیں، تو آپ کے اوپر ایک ایسی ہی ہمت شکن اور صبر آزما آزمایش ڈال دی جاتی ہے جیسی کہ حضرت انسان پر روز ازل میں ڈال دی گئی تھی، جبکہ بڑے بڑے پہاڑوں نے ہمت ہار دی تھی، اب اگر آپ کا وہ نظریہ غلط ثابت ہوجائے، تو آپ نے نہ صرف کروڑوں روپیوں کا نقصان کیا، بلکہ قوم وملک کے لاکھوں کروڑوں افراد کو بھی مصیبت میں مبتلا کردیا،

متذکرۂ بالا بحث سے ظاہر ہوا کہ علوم کیمیا اور طبعیات دونوں یا تو نہیں خوش قسمت

ہیں، ان میں تحلیل بھی آسان ہے اور ترکیب بھی آسان، وہ نت نئے نظریے بناتے ہیں، سیکڑوں نظریوں کو
غلط دیکھ کر پھینک دیتے ہیں، اور نہایت اطمینان قلب سے اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں، ان
علوم کے لئے نظری اور عملی طریقے دونوں موجود ہیں، اور دونوں سے یہ علوم سیر حاصل ہیں لیکن علوم
انسانیات میں (اور ان تمام علوم میں بھی جن کا کسی شکل میں مادہ ذی حیات سے تعلق ہے) تحلیل
مشکل بھی ہوتی ہے، اور بالعموم نا مکمل بھی، اسی طرح ترکیب بھی اکثر اوقات مشکل اور بعض حالتوں میں
ناممکن ہوتی ہے،

۱۱- الغرض طریقۂ تحلیل علوم کیمیا وطبعیات میں تو نہایت کامیاب رہا ہے لیکن علوم حیاتیات
اور انسانیات میں بعض حالتوں میں بالکل ناقابل استعمال اور بالعموم نا مکمل، ناقص اور ناکامیاب رہا ہے
ان علوم کے لئے تحلیل اور ترکیب کی ایک مجموعی صورت کا نام طریقۂ عملی ہے، (جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے
اس طریقہ سے اول تو ان حوادث اور حالات کے ظاہری اور خفیہ محرکات کی حتی المقدور مکمل تحلیل
کیجاتی ہے، (یا کم از کم اس امر کی کوشش کیجاتی ہے) اور پھر اس تحلیل سے حاصل کئے ہوئے اجزا کے
مطالعہ سے نیا نظریہ بنایا جاتا ہے، جس سے ان حیاتی، نفسی، اخلاقی، معاشرتی یا سیاسی حوادث کے
متعلق صحیح رائے قائم کرنے اور ان کے شر سے (اگر وہ شر انگیز ہیں) کسی متنفس کو، یا کسی ذی شعور
انسان کو، یا انسانوں کی کسی جماعت کو بچانے کی امید کیجا سکتی ہے، اگر وہ حادثہ جس کی تحلیل کی
گئی ہے، جماعت سے متعلق ہے، تو اس نظریہ کو جو تحلیل کے بعد بنایا گیا ہے، قانون کی شکل دیکر
کی بہبود کے لئے رائج کیا جاتا ہے، اگر اس کے رائج کرنے کے بعد وہ شر اس جماعت سے دور ہو گئے
تو اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں، کہ محرکات کی تحلیل صحیح تھی، اور جو نظریہ اس تحلیل کے اجزا کو نئی طرح
سے مرکب کر کے ہم نے اختراع کیا تھا، وہ بھی صحیح تھا اور اگر شر دور نہ ہو، بلکہ اسی شدت سے قائم
رہے یا اور نئے نقائص ملت کے اندر پیدا ہو جائیں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ یا تو تحلیل غلط تھی یا

غلط تھا، اور یا دونوں غلط تھے، ایسی حالت میں تحلیل پر نظر ثانی کرنا پڑے گی، اور نئے نظریہ کا انتظار ہوگا، لیکن افسوس یہ ہے کہ علوم انسانیات کے مطالعہ کے لئے اور انسانی جماعتوں کی واقعی بیماریوں کے انسداد کیلئے یہ عملی اور تجربی طریقہ نہ صرف اکثر اوقات کارگر نہیں ہوتا، بلکہ بعض حالتوں میں سخت نقصان دہ بھی ہوتا ہے، اور اس کے وجوہ یہ ہیں:-

ا- انسانی حس، فکر اور فعل مادہ نہیں ہیں، کہ ان کی تحلیل آسانی سے ہو سکے نفسی اور شعوری حالتیں اس قدر نازک، دقیق، حرکی، اور (بعض اوقات) فوری ہوتی ہیں، کہ جہاں تحلیل کا خیال بھی ذہن میں آیا، تو وہ حالت جس کی تحلیل منظور تھی، کافور ہو گئی، مثلاً نفسیات کا ہر متعلم جانتا ہے، کہ اگر وہ غصہ کی حالت میں اپنی نفسی تحلیل کی کوشش کریگا، تو غصہ فوراً دور ہو جائے گا، یہی حال دوسرے جذبات اور محسوسات کا بھی ہے، "فکر" اور فعل کی نفسی تحلیل ہو سکتی ہے، لیکن قدم قدم پر مغالطہ کا خطرہ رہتا ہے، نفسی حالتیں ناقابلِ وزن ہیں، ان کی کیفیت کا اندازہ آسان ہے، لیکن ان کی کمیت اور شدت کا اندازہ ذاتی مشاہدہ پر منحصر ہے، الفاظ اسے پوری طرح بیان کر نہیں سکتے، مثلاً میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے آپ سے ملکر خوشی حاصل ہوتی ہے، لیکن میں یہ کہہ نہیں سکتا کہ یہ خوشی اس خوشی سے پوری دوگنی زیادہ ہے، جو مجھے فلاں شخص کے ملنے سے حاصل ہوئی تھی،

(ب) دوسری وجہ کہ انسانیات میں طریقہ عملی نقصان دہ کیوں ہو سکتا ہے، یہ ہے کہ افراد اور اقوام کی عملی زندگیوں میں جو غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، ان کے نتائج صرف ان افراد تک (یعنی ان اقوام کے ان افراد تک جو اس وقت موجود تھے) محدود نہیں رہتے، بلکہ وہ قدم قدم پر بڑھتے جاتے ہیں، اور اپنی لپیٹ میں ان افراد اور نسلوں کو بھی شامل کر لیتے ہیں، جن کا اس پہلی غلطی سے نہ کوئی واسطہ تھا اور نہ وہ اس کے ذمہ دار تھے، پھر جوں جوں وقت گذرتا جاتا ہے، اس غلطی کے نقصانات کی شدت بھی بڑھتی جاتی ہے، یہ حالت ایسی ہے جیسے کوئی شخص اپنے اعمال کی وجہ سے کسی خطرناک متعدی

بیماری میں مبتلا ہو جائے، اور پھر وہی بیماری اپنی بیوی اور اپنے بچوں کو بطور وراثت دیجائے، اس کے بعد اس کے نیچے اس بیماری کو اپنے بچوں تک پہنچائیں، اور یہ خطرناک سلسلہ برابر بڑھتا جائے اگر اس غلطی کا پہلا نتیجہ ایک تھا، تو دوسرا دوگنا، تیسرا چار گنا، چوتھا آٹھ گنا، پانچواں سولہ گنا ہوگا، اگر نقصان کی رفتار و شدت اسی ہندسی تصاعد[۵] سے جاری رہے، تو بھی غنیمت ہوگا، ورنہ کوئی تعجب نہیں، کہ اگر نقصان کا پہلا درجۂ شدت ایک تھا، تو دوسرا دس گنا زیادہ ہو جائے، اخلاقی معاشرتی اور سیاسی دنیا میں جو شخص گناہ کرتا ہے، وہ خود نقصان میں مبتلا ہوتا ہے، دوسروں کو مبتلا کرتا ہے[۶] اور بعد میں آنے والی نسلوں کے لئے ایک غلط اور بُری راہ نکال جاتا ہے،

ج - اخلاقی سیاسی اور معاشرتی بیماریوں کے لئے جو بہترین نسخہ بھی ان علوم کے ماہرین عملی و تجربی طریقوں سے تیار کریں گے، اسکے متعلق ہم یقینی طور پر صرف یہ کہہ سکیں گے، کہ مستقبل قریب میں اغلب ہے، کہ اس کے استعمال سے وہ نقائص دور ہو جائیں جنھیں دور کرنے کے لئے یہ نسخہ تجویز کیا گیا ہے لیکن "مستقبل بعید" میں اس نسخہ کے استعمال کیا کیا مفید یا مضر حوادث ظاہر ہوں گے، ان کے متعلق کچھ کہا نہیں جا سکتا، اب "مستقبل قریب" تو قوم و نسل کی جماعتی زندگی میں ایک دن کی حیثیت بھی نہیں رکھتا، اسلئے نتیجہ یہی نکلا کہ علوم انسانیات میں طریقۂ عملی و تجربی کا بہترین تیار کردہ نسخہ بھی اپنے اندر "مستقبل قریب" کے متعلق صرف چند مشروط فوائد رکھتا ہے، اور کوئی تعجب نہیں کہ ان فوری فوائد کے بعد اس قوم کے انھی افراد کو اسی نسخہ سے نقصان زیادہ پہونچے اور فائدہ کم، بعد میں آنیوالی نسلوں کے متعلق حکم لگانا ناممکن ہے، کیونکہ ایسا کرنا مغالطہ میں پڑنا ہی،

۱۲۔ فصل نمبر ۲ میں ہم نے جو چار سوال پیش نظر رکھے تھے، ان کا مفصل جواب اوپر گذر چکا ہے

---

[۵] Geometrical progression
[۶] وجہ یہ ہے کہ اگر دنیا میں صرف ایک انسان موجود ہو تو کوئی اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی گناہ (برائی) ہو ہی نہیں سکتی،

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ

۱۔ مغالطۂ تحلیل "مغالطہ" اسلئے ہے کہ اس کا کلیدی قانون (ا = ج + د) بالکل غلط ہے، ہم نے دیکھا ہے، کہ اگر کسی وجود کے خواص یا اجزار کے خارج کر دینے سے وہ وجود معدوم ہو جائے، تو بھی یہ کہنا غلط ہے، کہ وہ وجود محض مجموعہ ہے اپنے اُن خواص یا اجزار کا،

۲۔ تحلیل ہر حالت میں مغالطہ نہیں ہے، مغالطہ وہ صرف اسی وقت بنتی ہے، جب وہ ترکیب کے حقوق کو غصب کرتی ہے،

۳۔ علوم کیمیا و طبعیات میں تحلیل نہایت مفید اور سیر حاصل رہی ہے، ان ہی علوم میں ترکیب بھی آسان ہو، تحلیل و ترکیب کی باہمی کوشش سے یہ علوم اپنے بلند پایہ تک پہونچے ہیں تحلیل محض ان علوم میں ہرگز زیادہ مفید نہ ہوتی ۔

۴۔ حیاتیات اور انسانیات کے جملہ علوم میں تحلیل محض بالکل ناکافی، نامکمل، مضر اور گمراہ کن ہوتی ہے، ان علوم میں عمل ترکیب بھی مشکل ہے اور تحلیل و ترکیب کا اشتراک عمل بھی زیادہ مفید ثابت نہیں ہوتا، یہی وجہ ہو کہ ان علوم میں وہ پختگی ، یک سوئی، صحت نتائج اور سیر حاصلی موجود نہیں ہے جو علم کیمیا و طبعیات کا اچھل طغرائے امتیاز بنی ہوئی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ ان علوم کو تحلیل و ترکیب کے طریقوں کے علاوہ کوئی نیا طریقہ کا اختراع کرنا پڑے گا،

مبادی فلسفہ جلد اوّل

جواہر الاسرار

میں

کبیر کی بات چیت

جالندھر میں ایک دوست (حکیم عبدالعزیز صاحب مشرقی) کے پاس اون کے بزرگوں کی امانت اور وراثت تصوف کی قلمی فارسی کتابون کا ایک اچھا ذخیرہ ہے، اس میں ایک فارسی کتاب جواہر الاسرار نام نظر سے گذری مصنف کا نام اور تصنیف کی تاریخ مذکور نہیں، رسالہ کے ساتھ خلاصۃ العارفین وغیرہ حضرت زکریا ملتانی، حضرت فریدالدین گنج شکر، حضرت جلال بخاری رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ کے ملفوظات ہیں، اسی مجموعہ میں فارسی میں گیتا کا ترجمہ بھی شامل ہے، اس کے آخر میں کتابت کی تاریخ ۲۱ کاتک ۱۸۷۶ء سمت لکھی ہوئی ہے (۱۲۳۵ھ مطابق ۱۸۲۰ء) کاغذ یکسان پرانا اور کشمیری قسم کا ہے،

آج کل سمت ۱۹۹۵ء ہے، اس بنا پر اس رسالہ کی کتابت آج سے ایک سو انیس برس پہلے کی ہے، تصنیف کا زمانہ اس سے خدا جانے کتنے پہلے ہو،

بہرحال اس رسالہ جواہر الاسرار میں مصنف نے چند ہندی، فارسی اور عربی کے صوفیانہ لفظون اور فقرون کی تشریح کی ہے، اس میں پنجابی ہندی یا اردو کے چند شعر بھی کہیں کہیں آگئے ہیں، اور وہی میری دلچسپی کا باعث ہوئے، ایک موقع پر "لفظ موج نیست بر آب دارد، برائے این قلب گویند" یہ دوہرہ نقل کیا ہے،

جل ترنگ جلیں تیں اپجی جلیں راے سمائی، مائی میں مادھو میں مو میں مادھو ہوں توں نیچ نسائی

جملہ لاصلوٰۃ الا بحضور القلب (حدیث مشہور صوفیہ) کی تشریح میں ہے،

"ہمیں ست ہر کہ در عالم یافت او را ہمہ جا است و ہر کہ در عالم نیافت او را شکل حق آسان کند، انشاء اللہ تعالیٰ،

اس کے بعد اس مضمون کا یہ دوہرہ ہے،

جنکو درشن اِت ہے اونکو درشن اُت جنکو درشن اِت نا نہ تنکواُت نہ اُت

الصوفی لامذھب لہٗ کی تشریح میں دو شعر ہیں،

آپس آپ سو بسرا با اِس دوجی بسری پہلے تس
یاد ایکلی رہے سو یاد اس من باقی سب برباد

(ب)
وحدۃ الوجود کی ایک تمثیل کی تشریح میں ہے،

خدا سو بندا ہو دکھلائے، بندے خدا نہ نکھیا جائے،
(بندہ)

کسی فقیر "عبد الفتاح" کا ایک فقرہ نقل کیا ہے،

"اے میاں" تک پیچھے دیکھو"، یعنی اے فلاں اندک پس بیں"،

ایک اور فقرہ کی تشریح کی ہے،

کھوجی جیسے پی بادی مرے" کھوجی یعنی داس بادی یعنی مقابل معنی ہر کہ جوئندہ باشد تلاش دانستن داشتہ باشد او زندگی یابد و ہر کہ یک چیز یافتہ برہمون یک چیز و یک مرتبہ و بر یک عمل ماند، و در لذت ہمون یک عمل گرفتار شود لاف زندا و مردہ برائے آنکہ او پیشتر راہ نیافت،

اس رسالہ میں سب سے دلچسپ چیز مشہور فقیر کبیر اور بیراگیوں کی ایک بات جیت کی بعینہٖ نقل ہے، جو اگر درست ہے، تو ہم کو کبیر کے زمانہ کی زبان کی ہو بہو تصویر نظر آجاتی ہے، نقل کی ہے

"جمعے اتیتاں و بیراگیاں پیش کبیر آمدند، وگفتند کہ اے کبیر توں اتیت اور بیراگی ہے، توں واسطے تیرتھ کے اوراستھان کے کیوں نہیں چلتا، اٹھ تیرتھ کون اوراستھان کو چل، کبیر گفت کہ بابا تم اتیت اور بڑی بیراگی ہو، اور میں اناڑی ہوں تیں جاؤ، میں پڑیا ہوں، بیراگیہا گفتند کہ نہ توں چل ہمارے ساتھ، یا بیراگ چھوڑ، کبیر الحاح کرد، وگفت بیراگیو مجھے چھوڑ دو، بیراگیہا بگذاشتند، باز کبیر گفت کہ بیلاب کی مجھے چھوڑ دو، اینہ تونبرا میرا لیجاؤ، اسے تیرتھ اوراشنان کراؤ، دوسری بار میں چلوں گا، بہزار منت ماندو تونبرا ہمراہ داد، بیراگیاں تونبہ گرفتہ رفتند ہمہ جا تیرتھ واشنان کروند، تونبہ را ہم کنانیدند بعد از مدت آمدند پیش کبیر، کبیر پرسید، کہ تونبرا کہاں ہے، بیرگیاں گفتند کہ ہے، تونبہ را پیش کبیر گذاشتند، کبیر گفت کہ تونبرا کوں تورو، بیراگیہا تونبہ راشکستند، باز کبیر گفت کہ کھاؤ، بیراگیہا خوردند، باز کبیر پرسید کہ کیہا ہے، بیراگیاں گفتند کہ کروا ہے، کبیر گفت کہ اے بیراگیو تیرتھ اوراشنان کیں کیا ہوتا ہے جب تریں میتھا نہووے، یہ جو کروا تھا، تو تیرت اوراشنان سوں میتھا نہوا نہوا جانگہ اصل میتھا نہ ہووی اس کے تئیں سنگت کروی بیل کی تھی تو اسی میتھا کیونکر ہوئے، جو میتھی سنگت ہوتی، تو میتھا ہوتا، پس رفتن وپرسیدن وشنیدن وغوغا کردن چہ کار می آید"۔

کبیر کی وفات کا سال ۱۵۷۵ء سمت مطابق ۱۵۱۸ء مشہور ہے، تو کیا یہ سولھویں عیسوی کی ہندوستانی بولی ہے، ؟ کبیر کی شاعری کی زبان بھی بہت آسان ہے، اور اس میں عربی اور فارسی کے بگڑے ہوئے لفظ بہت ملتے ہیں،

آگے ایک اور شعر نقل کیا ہے، دوہرہ،

نہ دیکھ پرائی چوپڑی ناترسا اپنا جیو   روکھا سوکھا کھاکر ٹھنڈا پانی پیو،

تجھ کن علم سو ہے فی الحال، دی بصارت تجھے کمال

ذوق ہووے نچن کر دیکھ، نہیں بھوت کر تھیں ایسا پھیکہ

پھیکہ کہیں بیدیا نہیں کوئی کھاند کہیں میٹھا نہیں ہو

بیدھے انتر جب جو ئی جوں جھنک کر نہیں بہرنکے ہوئی

دو بہنیں تھیں، بڑی بہن کا جب بیاہ ہوا، تو چھوٹی بہن نے پوچھا :۔

"بوبو بیاہ کیسا ہوتا ہے، اپن گفت کہون گی، جب چھوٹی بہن کا بیاہ ہوگیا، تو اس نے کہا بوبو بیاہ ایسا ہوتا ہے،

جو نہ دیکھے اپنین نین تون تو نہ بیتجی کورکے بین تون

افسوس کہ رسالہ ناتمام ہے،

فتح آباد

از

جناب نفیس الدین احمد صاحب ایم اے علیگ

نومبر ۱۹۳۸ء کے معارف میں سید انوری صاحب کا مضمون "ڈاکٹر بینی پرشاد صاحب کی تاریخی غلطی" شائع ہوا تھا، اس میں ایسی معلومات تھیں، جن کے متعلق امرتسر کے لوگوں کو علم نہ تھا،

موضع فتح آباد امرتسر کی تحصیل ترنتارن سے دس میل کے فاصلہ پر ہے، تین چار میل اس طرف موضع بھیروال ہے جس کا ذکر انوری صاحب کے مضمون میں آیا ہے، اس موضع کے گرد پرانی شہر پناہ اب تک موجود ہے، اور زیادہ آبادی فصیل کے اندر ہے،

ترنتارن سے فتح آباد تک تین فرسخ بھی ہیں، دو اچھی حالت میں ہیں، اور تیسرا خراب ہو گیا ہے، پرانی اینٹیں اور پرانا چونا استعمال کیا گیا ہے،

فتح آباد پہونچتے ہی ایک عالیشان مسجد نظر آتی ہے، صحن کھلا اور فرش لگا ہوا، اندر کی عمارت سادہ ہے، مگر طرز تعمیر بتاتا ہے، کہ مغلیہ عہد کی عمارت ہے، مسجد کے صحن کا فرش خراب ہو چکا تھا، مقامی انجمن اسلامیہ نے ٹایل لگوا دیئے ہیں، اور جہاں کہیں مرمت کی ضرورت تھی کر دی گئی ہے،

اس مسجد کے پاس ایک بہت بڑا کنواں ہے، آگرہ میں قلعہ کے اندر جو کنواں ہے، وہ اس سے کسی قدر بڑا ہے، اس سے فتح آباد کے کنوئیں کا اندازہ ہو سکتا ہے،

مسجد کے شرق میں ایک عالیشان وسیع سرائے ہے، اسکے گرد اونچی دیوار ہے، جس میں بُرج بھی ہیں، اور مورچے بنے ہوئے ہیں، اس سرائے کے دو دروازے ہیں، جن پر نقش و نگار تھے، ان کا رنگ اب اکثر جگہ سے خراب ہوگیا ہے، اس کے اندر محلے آباد ہیں، وسط شہر میں ایک بازار ہے، جو سرائے کے بیچ میں سے گذرتا ہے،

عمارت تمام مغلیہ عہد کی معلوم ہوتی ہے،

شہر کے باہر ایک بڑا قبرستان ہے جس میں بے شمار پرانی مگر پختہ قبریں ہیں،

دریائے بیاس اب اس آبادی سے چار میل کے فاصلہ پر بہتا ہے، جو سڑک جالندھر سے اتر کو جاتی ہے، وہ دس میل ہے، مسجد اور سرائے کے متعلق فتح آباد میں کسی کو یہ معلوم نہیں کہ وہ کب بنیں، اور کس نے بنائیں، عام خیال یہ ہے کہ شیر شاہ سوری نے بنوائی تھیں، مگر جس شخص نے پٹھان خاندان کے بادشاہوں کی تعمیر کردہ عمارتیں دیکھی ہیں وہ فوراً کہدیگا کہ یہ خیال غلط ہے،

بعض لوگوں کا خیال ہو کہ نور جہان نے بنوائی ہیں، اسکی تائید میں یہ بات پیش کیجاتی ہو کہ دریا پار موضع نور محل ہو، جہان کی مشہور سرائے اب تک موجود ہو، چونکہ دہلی سے لاہور جانے کا یہ راستہ تھا اسلئے اپنے قیام کی خاطر دریا کے اس پار یہ عمارتیں بنوائیں،

شہر کے آباد ہونے کے متعلق مسجد یا سرائے میں کوئی کتبہ نہیں، اور نہ یہ پتہ چلتا ہو کہ انکی تاریخ تعمیر کیا ہے،

شہر کے باہر چند کھنڈر ہیں، نہ معلوم کس عمارت کے ہیں،

کیا شہر کی تاریخ تعمیر کے متعلق کوئی صاحب مزید روشنی ڈال سکتے ہیں؟

تلخیص و تبصرہ

مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس

اس دفعہ مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس کا اجلاس گذشتہ ستمبر میں بروسل (بلجیم) میں ہوا اس کے صدر ایم، جین کیپارٹ (ڈائرکٹر، رائل میوزیم) تھے،

کانگریس مشرقیات کے مختلف علوم و فنون پر مشتمل ہوتی ہے، لیکن یہاں ہم صرف اسلامی شعبہ کا ذکر کریں گے، جس کی روداد ڈاکٹر کرنکو نے اسلامک کلچر (جنوری ۳۹ء) میں لکھی ہو،

کانگریس کی زبان انگریزی، فرانسیسی، جرمن یا اطالوی ہے، لیکن اس سال اسلامی شعبہ میں خطبے عربی اور اسپینی زبانوں میں بھی پڑھے گئے، اس شعبہ میں مختلف موضوعوں پر مختلف اہل علم نے حسب ذیل مقالات پڑھے،

اپسالا کے ڈاکٹر لوف گرن نے ہمدانی کی کتاب الاکلیل کے پہلے اور دوسرے حصہ پر ایک مقالہ پڑھا، اس کا نسخہ برلن کے سرکاری کتب خانہ میں پایا گیا ہے، اب تک اس کتاب کے صرف آٹھویں اور نویں حصہ کا پتہ چلا ہے، جن میں ایک تو بغداد سے شائع ہو چکا ہے اور ایک ابھی زیر ترتیب ہے، جو کبھی یمن کے مشہور عالم نشوان الحمیری کی ملکیت تھا،

رباط (مراکش) کے پروفیسر کولن نے ایک ایسی قدیم عربی کتاب پر مقالہ پڑھا جس میں [illegible] اور دواؤں کا حال ہے، یہ کتاب گیارہویں صدی عیسوی کے کسی نامعلوم اندلسی مصنف کی تصنیف

اس کتاب کا حال ابن بیطار جیسے نباتاتی کو بھی معلوم نہ تھا، لیکن غافقی نے اس سے استفادہ کیا تھا، پروفیسر کولن نے وعدہ کیا ہے، کہ یہ کتاب بہت جلد چھپ کر شائع ہو جائے گی،

پروفیسر گوئڈی (روم) نے اپنے ایک خطبہ میں الکندی کی تصانیف کے ان قلمی نسخوں کا ذکر کیا، جو حال میں دستیاب ہوئے ہیں، ان میں سے بعض زیر طبع ہیں،

دی، اے، ہمدانی نے بعض مشہور شہروں اور قصبوں کی تاریخوں پر مقالہ پیش کیا، جو استنبول میں ان کو ملی ہیں، ان میں سے ایک حاکم کی تاریخ نیشاپور ہے، جس میں عبدالغفار الفریسی فی السیاق کے نام سے کچھ اور حالات اضافہ کئے ہیں، دوسری تاریخ مرو ہے، جس کے مصنف کا نام سمعانی ہے،

پروفیسر کریمر (لیڈن) نے عرب جغرافیہ نویسوں کی اہمیت دکھاتے ہوئے کہا، کہ وہ اسلامی تمدن اور دنیا کے لئے ضروری ہیں، پروفیسر موصوف نے ابن حوقل کے جغرافیہ کو از سر نو ترتیب دیا ہے، اور ادریسی کی کتاب کا ایک جدید اڈیشن ان کی نگرانی میں شائع ہوگا، جو سائنٹفک اصولوں پر مرتب کیا جائے گا،

ام، کاہن (پیرس) نے شام اور اناطولیہ میں سلجوقی ترکوں کی حکومت پر ایک مقالہ پڑھا، اس حکومت کے چار دور قائم کئے ہیں، پہلا دور بازنطینی حکومت پر ترکوں کے حملہ سے شروع ہوتا ہے، دوسرا بازنطینی اور فاطمی قوت کے زوال سے، تیسرا ملک شاہ کی حکومت سے، اور چوتھا اس خاندان کے خاتمہ اور اناطولیہ میں سلجوقی سلطنت کے عروج سے شروع ہوتا ہے،

ڈاکٹر کاسکل نے عرب کے ایام جاہلیت کی تاریخ پر روشنی ڈالی، اور بتایا کہ دوسری صدی عیسوی میں نبطیون کی سلطنت کے زوال پر عربوں کی تشکیل کا آغاز ہوا، اسوقت بھی ان میں لسانی اعتبار سے دو قسمیں تھیں، جو اب تک قائم ہیں،

ام۔ مارکس (الجزائر) نے الحمراء (غرناطہ) کے آرٹ کے جمالیاتی پہلو پر ایک مقالہ پڑھا، اور شمالی

افریقہ کی بعض عمارتوں پر اس کے اثرات دکھائے،

پروفیسر گب (آکسفورڈ) نے ایک تقریر میں کہا کہ ماوردی کی تصنیف خلیفہ کے نظریہ کے متعلق قطعی رائے نہیں ہے ہنیوں کا بھی اس کے بارہ میں کوئی خاص نظریہ نہیں، لیکن ان کا خیال یہ ضرور ہے، کہ ایک صاحبِ حکومت و قوت امیر المومنین کا فروں کے مقابلہ میں شریعت کو محفوظ رکھتا ہے،

ام۔ گبریل نے اناطولیہ کے سلجوقیوں کے ان مقبروں پر ایک مقالہ پڑھا، جو مشرقی ایران کے مقبروں سے ملتے جلتے ہیں،

پروفیسر بروکلمن نے مصر میں جدید عربی شاعری پر ایک مضمون پڑھا، اور یہ دکھایا کہ شروع میں یہ قدیم شاعری کے زیر اثر رہی، لیکن بیرونی خصوصاً فرانسیسی اثرات سے اس میں جدید عناصر پیدا ہو گئے ہیں،

پروفیسر ڈینی سن راس نے تیمور اور بایزید پر ایک مقالہ پڑھا، اور فارسی ماخذوں سے اس روایت کی تردید کی، کہ انقرہ کی جنگ کے بعد تیمور نے بایزید کو لوہے کے پنجرے میں مقید کیا تھا،

ڈاکٹر ریزی مانو نے اپنے مضمون میں یہ تجویز پیش کی، کہ قدیم عہد کے غیر معروف عربی شعرا کے دیوان شائع کئے جائیں، تاکہ پہلی صدی ہجری کے معاشرتی حالات معلوم ہو سکیں،

پروفیسر میسے (پیرس) نے جلائری خاندان پر ایک مقالہ پڑھا، جو عراق اور ایران میں مغلوں کی سلطنت کے بعد برسر اقتدار ہوا، اسی سلسلہ میں مقالہ نگار نے کہا کہ اگر اس عہد کی بعض دستاویزیں اور شاہی فرامین جو پیرس اور دوسرے ممالک میں محفوظ ہیں شائع کر دیئے جائیں تو ان سے بہت سے نئے معلومات حاصل ہوں گے،

ام بیشر نے دیوان متنبی کی اس شرح پر روشنی ڈالی، جو العکبری کی جانب منسوب ہے

مقالہ نگار کا خیال ہے کہ یہ شرح العکبری کی نہیں ہو، بلکہ اس کے ایک ہمعصر کی ہو،

پروفیسر کالے (بون) نے ابن دانیال کے ڈراموں کے شائع کرنے پر زور دیا، جو اسکوریال کے کتبخانہ میں محفوظ ہیں، اور ازمنہ وسطیٰ کے عربی ادب میں اپنی نوعیت کی پہلی چیز ہے،

پروفیسر لیوی پرونکل نے ایک ایسی کتاب پر مقالہ پڑھا، جو ان کو فاس میں ملی ہے، اور جو سکون کے اصطلاحات پر ہے، بظاہر یہ کتاب (Islamic Mint) حکومت کے ٹکسال کے کسی افسر کی لکھی ہوئی ہو،

ڈاکٹر او منیٹو (روم) نے تجویز کیا، کہ مشرق کے اطالوی سیاحوں کے سفرنامے شائع کئے جائیں، تاکہ مشرقی ممالک کے حالات معلوم کرنے میں آسانی ہو،

مسٹر جی، گوسٹ (لندن) نے "الازرقی" کے استناد پر ایک عرب نوآبادی دربند کا ذکر کیا جو ایران کے شمال میں واقع تھی،

پروفیسر عطیہ (بون) کا مقالہ مصر کے قبطیوں پر تھا، اس کے بعض حصے مصر کے مسلمانوں کی عہد کی تاریخ سے بھی متعلق تھے،

پروفیسر طٰہٰ حسین (قاہرہ) نے یہ دکھایا کہ جدید طریقہ پر عربی کس طرح پڑھائی جانی چاہئے،

پروفیسر نمیت (بداپست) نے ہنگری میں مشرقی علوم و فنون کی تعلیم کا جو سامان ہو اس پر تبصرہ کیا،

ڈاکٹر میر نے بیت المقدس میں عبرانی یونیورسٹی کے علمی کارناموں پر ایک تقریر کی، اور اعلان کیا، کہ اس کی طرف سے بلاذری کی کتاب الاشراف کی دوسری جلدیں بہت جلد شائع ہوں گی،[1]

---

[1] معارف:- ایک جلد شائع ہو چکی ہے،

الجزائر کے امام ادریس لمارے نے اس صنعت پر مضمون پڑھا، کہ کس میکنک طریقہ سے عثمانی مصحف خطبہ کے وقت ایک طاق سے نکل کر منبر پر چلا آتا تھا، مضمون نگار نے یہ بھی بتایا کہ یہ طریقہ دوسرے اسلامی ممالک میں بھی رائج تھا[۱]

الجزائر کے امام بیرسے نے مصر کے جدید ناولوں پر مقالہ پیش کیا، اس میں یہ بتایا کہ اول اول ۱۸۷۰ء میں ناول سیاسی اغراض کے تحت لکھے گئے، پھر رفتہ رفتہ مصر، شام اور عراق میں زیادہ تر ان کے موضوع معاشرتی مسائل ہونے لگے، "ص، ع"

عصبی المزاجی کا نفسیاتی مطالعہ

ہم میں بعض ایسے اشخاص بھی ہوتے ہیں، جو لوگوں سے ملنے جلنے یا کسی جلسہ میں شریک ہونے سے سخت گھبراتے ہیں، اور پریشان خاطر ہوتے ہیں، خصوصاً جب ان کو کوئی پبلک کام کرنا یا کسی اسٹیج پر تقریر کرنی ہوتی ہے، تو ان کا ذہنی خلجان بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے، بظاہر یہ عصبی المزاج ہونے کا اثر ہے، مگر یہ غور کرنے کی بات ہے، کہ سوسائٹی اور معاشرت میں اس عصبی المزاجی کے اسباب کیا ہیں، ؟ ماہرین نفسیات یہ بتاتے ہیں کہ جس شخص کو اپنی ذات کا احساس جتنا زیادہ ہوگا اتنا ہی وہ عصبی المزاج ہوگا، بعض اشخاص محض اس وجہ سے خوش نہیں رہتے ہیں کہ لوگوں کی تعریف وتحسین سے محروم ہیں، لوگ ان کی ذات سے دلچسپی نہیں لیتے ہیں، اور وہ جو کچھ کرتے یا کہتے ہیں اس کی طرف لوگ توجہ نہیں کرتے، چنانچہ ان کے دل میں یہ خیال بیٹھ جاتا ہے، کہ وہ کسی غیر معمولی صفت کے مالک نہیں ہیں، جو لوگوں کی توجہ کے قابل اور انکی تعریف کی مستحق ہو،

اس قسم کے احساسات اس غلط خیال کا نتیجہ ہیں، کہ معاشرت کی کامیابی لوگوں کی

---

[۱] معارف :- اس آلہ کا پورا حال مولینا شبلی نے رسائل شبلی میں لکھا ہے،

تعریف و توصیف ہی سے حاصل ہو سکتی ہے، اس میں شک نہیں کہ لوگوں کی مدح و ستایش مقبولیت کی دلیل ہے، جو بہت ہی خوشگوار اور خوش آیند پہلو رکھتی ہے، مگر اس کو اپنی خوشی کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا، معاشرت کی کامیابی تو خود افراد ہی پر منحصر ہے کہ وہ زندگی، اور ملنے جلنے والے لوگوں کے متعلق خود ایک خاص نقطۂ نظر سے سوچیں، وہ یہ چاہتے ہیں کہ لوگ ان کو پسند کریں، اور ان کی یہ خواہش اتنی شدید ہو جاتی ہے، کہ وہ اس کو بھول جاتے ہیں، کہ پہلے انہیں خود دوسرون کو پسند کرنا سیکھنا ہے، ان پر یہی خیال چھایا رہتا ہے، کہ فلان بات کے سلسلہ میں انھوں نے لوگون پر کیسا اثر قائم کیا، ؟ ان کی رائے کا وزن کیا رہا، انھوں نے تعریف کی یا نہیں، ؟ بعض اوقات تو وہ محض نکتہ چینی کے خوف سے ان ہی چیزوں کو پسند کرتے ہیں، جن کی طرف عوام کا میلان ہوتا ہے، خواہ انھیں وہ باتیں پسند ہوں یا نہ ہوں نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ وہ فطری طبیعت سے الگ ہو کر شعوری انتشار اور تحت الشعوری بے اطمینانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جو انھیں عصبی المزاج بنا دیتے ہیں،

ہر شخص کی نظروں میں مقبول ہونا ممکن نہیں، اور اگر ممکن ہے، تو پھر ہماری شخصیت مفلس اور قلاش رہے گی، اس میں شک نہیں کہ ایماندار بننا اپنی مقبولیت کو خطرہ میں ڈالنا ہے، لیکن قلبی طمانیت اور ذہنی سکون ایمانداری ہی سے حاصل ہو سکتا ہے،

اپنی ذات کے احساس اور نکتہ چینی کے خوف کی وجہ سے ہماری ساری توجہ اپنی ذات ہی کی طرف منعطف ہو جاتی ہے، جس سے اپنے کردار کا ہر نقص بڑا معلوم ہونے لگتا ہے، یہی وجہ ہے، کہ ہم اپنے کو دنیا کی نسبت سے دیکھنے کے بجائے دنیا کو اپنی نسبت سے دیکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں، اور جب ساری توجہ اپنی ذات، اپنے خیالات اور اپنے تفکرات کی طرف مائل رہتی ہے، تو ہمارا نقطۂ نظر بھی بدل کر گبڑ جاتا ہے، اور پھر ہماری آنکھیں دنیا اور دنیا کے لوگون کی زندگی کو دیکھنے کے بجائے صرف اپنی ذات اور انا کو دیکھتی ہیں،

عام طور سے یہ مرض لڑکپن ہی سے پیدا ہو جاتا ہے، خصوصاً جب لڑکوں پر والدین کی نگاہ سخت رہتی ہے، ان کی ڈانٹ ڈپٹ سے ان کو یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ نسبتہً اور لڑکوں سے گھٹیا اور کمتر ہیں، اور بزرگوں کی شفقت حاصل کرنے کے لئے ان کو خاص جد و جہد کرنی پڑیگی، اس کے لئے وہ ہمیشہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ وہ کوئی ایسی بات یا کام کریں کہ ان کی تعریف ہو، اور ان کے بزرگ ان کو اپنی شفقت اور محبت کا مرکز بنائیں، اگر ان کو اس میں ناکامیابی ہوتی ہے، تو وہ بیٹھے بیٹھے خیالات کی ایسی دلفریب دنیا تعمیر کرتے ہیں، جس میں لوگ ان کے تخیل کے تعمیر کردہ کمالات اور کارناموں پر رطب اللسان ہیں، پھر وہ اسی خیالی دنیا میں مگن رہنا چاہتے ہیں، اور لوگوں سے ملنے جلنے میں ان کو پریشانی ہوتی ہے،

معاشرتی عصبی المزاجی سے بچنے کی آسان صورت صرف یہ ہے کہ ہم کو اپنی ذات کا احساس زیادہ نہ ہو، ہر عمل میں اپنی برتری کی خواہش انسان کو بہت ہی غمگین بنا دیتی ہے، ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں، جو تھوڑی کامیابی سے خوش اور مطمئن نہیں ہوتے، بلکہ وہ غیر معمولی کامیابی اور مقبولیت ہی حاصل کرکے مطمئن ہونا چاہتے ہیں، وہ کھیلتے ہیں تو ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ سب سے اچھا کھیلیں، جب تقریر کرتے ہیں تو یہ چاہتے ہیں کہ ان کی تقریر فصاحت و بلاغت کا نمونہ ہو، اس خبط کی وجہ سے ان کو ذہنی انتشار، مایوسی اور عصبی اختلال و پریشانی کا شکار ہونا پڑتا ہے، جس کے ذمہ دار وہ خود ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ لوگ ان کی ہر کامیابی سے دلچسپی لیتے ہیں اور ان کی ہر ناکامی پر دوسروں کو افسوس ہوتا ہے، حالانکہ لوگ اپنے مشاغل کی الجھنوں میں خود اس قدر پریشان خاطر رہتے ہیں، کہ ان کو دوسروں کی کامیابی اور ناکامیابی سے کوئی غرض نہیں ہوتی ہے،

سلامت روی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ہرگز یہ نہ سوچیں، کہ ہم کو اپنے ہر کھیل اور کام میں

دوسروں سے بازی لیجا کر اور برتر بن کر معاشرت میں کامیابی حاصل کرنا ہے، یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہم اپنی گفتگو میں بہت ہی زیادہ دلچسپ اور ظریف ہوں، گفتگو کو سنجیدگی سے سننا طریقہ اور دلچسپ گفتگو کرنے سے زیادہ اہم اور ضروری ہے، ہماری تقریر مختصر ہی سہی لیکن وہ موضوع کے مطابق ہو، تو وہ ضرور پسند کی جائے گی، بشرطیکہ حاضرین پر ہم اپنی ذات اور اہمیت کا خاطر خواہ اثر ڈالنے کے لئے پریشان نہ ہوں،

کامیابی کا بڑا راز دوسروں کی ذات سے دلچسپی لینے میں ہے، نہ کہ لوگوں کی تعریف اور مذمت کرنے کے خوف میں غلطاں و پیچاں رہنے میں، اگر لوگ ہماری ذات سے دلچسپی نہیں لیتے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم افسردہ اور مغموم ہوں، معاشرت میں کامیابی محض وقت اور موقع سے حاصل ہوتی ہے، ہمارا سابقہ جن لوگوں سے ہو ممکن ہی کہ وہ بہت محتاط، قدامت پسند، اور ہماری ہی طرح عصبی المزاج ہوں، لیکن اگر ہم اپنے ذوق کے اظہار میں سلامتی کو راہ دیں، تو وہ ضرور رفتہ رفتہ ہماری طرف مائل ہوں گے، اگر ہم میں لطف، کرم اور اخلاق کے صفات موجود ہیں، تو ان کا میلان ہماری طرف تیزی سے بڑھ سکتا ہے،

جب ہم کسی اجنبی سے ملیں یا کوئی پبلک کام کریں، یا کسی جلسہ میں شریک ہوں تو ہم کو محض اشتیاق اور دلچسپی سے اس کی طرف متوجہ ہونا چاہئے، ہم کو تازہ واقعات جاننے اور لوگوں سے واقف ہونے کا مشتاق ہونا چاہئے، تاکہ ہماری معلومات میں غیر محدود طریقہ پر اضافہ ہوتا رہے، اور ہم اپنی توجہ کو اپنی ذات اور اپنے خیالات سے ہٹا کر دوسرے لوگوں اور انکے خیالات کی طرف مائل کر سکیں، اسوقت عصبی المزاج ہونا، اور محض اپنی ذات سے دلچسپی لینا بھول جائیں گے، اور یہی عادت آگے چل کر غیر محسوس ذہنی رجحان بن جائے گی، ہمیں چاہئے، کہ لوگوں کی نکتہ چینیوں کیطرف توجہ دینے کے بجائے لوگوں کو پسند کرنا سیکھیں تاکہ ہم

کہ بعض لوگوں کو ہم پسند نہ کرتے ہوں لیکن اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی نہ کریں، ہمارا مقصد صرف یہ ہونا چاہئے، کہ ہم اپنے اور دوسرے لوگوں کے درمیان ایک ہمدردانہ لگاؤ پیدا کریں، اور یہ اسی وقت ممکن ہے، کہ جب ہم کسی سے ملیں، تو اس طرح کہ اس کو یہ احساس ہو کہ ہم کو اس سے مل کر واقعی دلچسپی اور خوشی ہوئی ہے۔

جو لوگ محض لوگوں سے خراج تحسین حاصل کرنے کے کوشاں رہتے ہیں، ان کو وقتی کامیابی تو ہو سکتی ہے، مگر وہ ان کو آگے نہیں لیجا سکتی، اصلی معنوں میں معاشرتی کامیابی وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں، جو دوسروں کو متاثر کرنے کے بجائے خود ان سے اثر پذیر ہوتے ہیں، اور ان سے اچھی اچھی باتوں کو اخذ کرکے کچھ سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، ہم جتنا زیادہ فطری ہوں گے، اتنا ہی کم عصبی المزاج ہوں گے، اور اپنے کاموں اور دلچسپیوں میں اپنی ذات کو بھلا دیں تو پھر معاشرت میں کامیابی حاصل کرنا کوئی مشکل نہیں، "ص ع"

اخبار علمیہ

ولیم میکڈوگل

گذشتہ نومبر میں انگلستان کے مشہور ماہر نفسیات ولیم میکڈوگل کا انتقال ہو گیا، وہ ۱۸۷۱ء میں لنکا شائر میں پیدا ہوا، منچسٹر میں تعلیم پا کر کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوا، اور آخر میں لندن یونیورسٹی سے طب کی ڈگری حاصل کی، لیکن نفسیات میں اس کا مطالعہ اتنا گہرا تھا کہ وہ لندن یونیورسٹی میں اس کا لکچرار مقرر ہوا، اور پھر ذہنی فلسفہ کا پروفیسر ہو کر آکسفورڈ چلا گیا، ۱۹۲۰ء میں وہ ممالک متحدہ بلا لیا گیا، جہاں وہ ہارورڈ اور ڈیوک یونیورسٹی میں معلمی کے فرائض انجام دیتا رہا،

اس نے مندرجۂ ذیل کتابیں لکھی ہیں، جن میں سے ہر ایک کے بہت سے اڈیشن شائع ہو چکے ہیں، (۱) خلاف معمول نفسیات کا ایک خاکہ (۲) ذہین اجتماع (۳) نفسیات کردار کا مطالعہ (۴) مردوں کی قوتیں، (۵) زندگی کا مذہب اور سائنس (۶) بورنیو کے غیر شائستہ قبائل (۷) معاشرتی نفسیات کا مقدمہ (۸) نفسیات کا ایک خاکہ (۹) زندگی کی سیرت اور طور وطریقے، ان میں معاشرتی نفسیات کا مقدمہ" زیادہ مقبول ہے، نفسیات سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ کے لئے نفسیات کا ایک خاکہ بھی مفید اور ضروری کتاب ہے، زندگی کی سیرت اور طور طریقے آسان اور عام پسند ہے،

ولیم میکڈوگل نے نفسیات کے اتنے مختلف نظریئے قائم کئے ہیں، کہ ان پر آئندہ بہت سی کتابیں اور شرحیں لکھی جائیں گی، لیکن اس نے سب سے زیادہ "جبلت" پر لکھا ہے، جبلت کی تعریف اس

نے یہ کی ہے کہ یہ جبلت منشار کام کرنے کی ایک فطری اور پیدائشی صلاحیت کا نام ہے جو انسان کے علاوہ جانوروں پرندوں اور کیڑوں میں بھی پائی جاتی ہے، ولیم میکڈوگل کے خیال کے مطابق چودہ جبلتیں ہوتی ہیں، مثلاً نقل کھیل خوشی محبت نفرت غصہ، رنج لڑائی، فرار، بے چینی، غول بندی جنسی خواہش وغیرہ بعض ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ جبلتیں صرف تین ہی ہوتی ہیں، خود غرضانہ معاشرتی اور جنسی، مگر میکڈوگل نے دکھایا ہے، کہ ان تینوں میں سے ہر ایک کی علحدہ علحدہ قسمیں ہیں جن میں مذکورۂ بالا چودہ جبلتوں کی تطبیق صحیح صحیح ہو جاتی ہے،

ولیم میکڈوگل کا خیال ہے کہ ایک انسان اپنی جبلتوں کا محض تو دہ نہیں ہوتا، اور نہ وہ ایک دوسرے سے بالکل علحدہ رہتی ہیں، بلکہ ان میں باہمی ربط ہوتا ہے، اور یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ انسان جبلت کے تغیر میں مجبور ہے، صحیح تربیت اور نشو و نما سے جبلت جذبہ میں اور جذبہ وجدان میں بدلا جا سکتا ہے، ولیم میکڈوگل نے سارا زور افراد اور اقوام کے وجدان پر دیا ہے جس سے ایک قوم کو دوسری قوم کا مطالعہ کرنے میں بڑی سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں،

روس کا علمی ذوق

۱۹۳۷ء میں سویٹ روس سے ۸۵۲۱ اخبارات شائع ہوئے، جن کی مجموعی اشاعت ۳۶,۱۹۰,۰۰۰ ہے، ۱۹۱۳ء میں زار کے زمانہ میں صرف ۸۵۹ اخبارات شائع ہوتے تھے جن کی کل اشاعت ۲,۷۲۹,۰۰۰ تھی، ان اخباروں کے علاوہ ۱۸۰۰ رسالے نکلتے ہیں، جو ۵۰ ہیئین کی تعداد میں شائع ہوتے ہیں، اخبارات مختلف انہتر زبانوں میں چھپتے ہیں، کتابیں بھی کثرت سے شائع ہوتی ہیں عام طور سے ٹکسالی ناولوں کی مانگ کثرت سے ہے، ۱۹۱۷ء اور ۱۹۳۷ء کے درمیان ٹشکن کی تصنیفات بہتر زبانوں میں شائع ہوئیں اور ان کے ۲۶,۴۲۶,۰۰۰ نسخے فروخت ہوئے،

جن میں صرف ۰۰۰ر۵۲ر۲۳ر۲۳ نسخے روس کے باشندوں نے خریدے، ٹالسٹائی کی کتابیں ۴۵ زبانوں میں شائع ہوئیں، اور ۰۰۰ر۹۲۶ر۱۵ اکیس میکسم گورکی کی تصانیف ۵۰ زبانوں میں شائع ہوکر ۰۰۰ر۹۲۲ر۳۶ نکلیں سوویٹ روس کے باشندوں کو غیر ملکی ادب العالیہ سے بھی بڑی دلچسپی ہے، کوئی کتب خانہ ایسا نہیں ہے جس میں شکسپیر، بائرن، ڈکنس، گیٹے، زولا وغیرہ کی تمام تصانیف موجود نہ ہوں ۱۹۱۷ء سے ۱۹۳۶ء تک میں ڈکنس کی کتابیں سات زبانوں میں شائع ہوئیں، اور ان کے ۰۰۰ر۴۰ر۱ نسخے فروخت ہوئے، شکسپیر کے ڈرامے چودہ زبانوں میں ترجمے کئے گئے اور یہ ۰۰۰ر۳۰ر۷ کی تعداد میں نکلے، ان کے مقابلہ میں ہمارے ملک کا ذوق دیکھئے!

بجلی کی خاموش کوند

۱۸۸۵ء میں واشنگٹن کے مینارہ کو بجلی سے شدید صدمہ پہونچا تھا، لیکن کسی نے بجلی کے گرنے کی آواز نہیں سنی تھی، اس زمانہ میں یہ واقعہ محض درج کرلیا تھا، اب تک اس کا سبب دریافت نہ ہوسکا تھا، حال میں امریکہ کے ایک محقق نے تین سال کی محنت کے بعد اس کی وجہ دریافت کی ہے، اس کی تحقیق ہے، کہ بجلی کی پیدائش کی تیزی سے ہوا میں اچانک وسعت پیدا ہوجاتی ہے، جس کی لہروں پر اتنا دباؤ پڑتا ہے، کہ اس سے کڑک پیدا ہوتی ہے، لیکن بجلی کی ہر ایک چمک سے قوتوں کا اخراج یکساں نہیں ہوتا، بعض بجلی کی لہریں بہت ہی کم اور سست ہوتی ہیں، اون کا اخراج سکنڈ کے ۱/۲ حصے میں ہوتا ہے، حالانکہ عموماً بجلی اپنے اخراج میں سکنڈ کا کروڑواں حصہ لیتی ہے، سست اخراج ہونے والی بجلی میں کڑک نہیں ہوتی،

پرانی ہڈیوں کے بجائے نئی ہڈیاں

برسٹل یونیورسٹی کے مشہور سرجن ڈاکٹر ارنسٹ ولیم گرونے حال ہی میں اپنے طبی تجربات کے سلسلہ میں بعض دلچسپ معلومات فراہم کئے ہیں، مثلاً ۱۹۲۲ء میں ایک لڑکے کی کمر کے نیچے ہڈی ٹوٹ گئی، ڈاکٹر موصوف نے انسان کی ہڈی جوڑکر اس کو درست کرنا چاہا، لیکن اسمیں کامیابی نہیں ہوئی، تو اس نے تجربتہ دریائی گھوڑے کے دانت کو ٹوٹی ہوئی ہڈی میں جوڑ دیا، گذشتہ اکتوبر میں عکسی شعاعوں سے معاینہ کیا گیا، تو ہڈی بالکل جڑی ہوئی پائی گئی اور مریض میں ابتک کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔

ایک دوسرے دس برس کے لڑکے کے بازو کی ہڈی کہیں سے ٹوٹ گئی تھی، ڈاکٹر مذکور نے اوس کو بیل کی ہڈی کے دو ٹکڑاوں کو نیچے اوپر رکھ کر ملا دیا، چھ ہفتے میں لڑکا بالکل ٹھیک ہو گیا، اور آگے چل کر وہ بہت مشہور کھلاڑی ہوا، دس برس کے بعد عکسی شعاعوں سے جوڑ کا معائنہ کیا گیا، تو معلوم ہوا کہ بیل کی ہڈیاں لڑکے کی ہڈیوں میں بالکل پیوست ہو گئی ہیں،

ایک عورت کی ران کی ہڈی ٹوٹ گئی، ڈاکٹر موصوف نے اس کو بارہ سنگھے کے سینگ سے ملا کر درست کیا، اور ایک سال کے بعد وہ ایسا صاف چلنے لگی، کہ اوس کی دونوں ٹانگ میں کوئی فرق نظر نہ آتا تھا، تین سال کے بعد بارہ سنگھے کی ہڈی مریضہ کی ہڈی میں بالکل پیوست ہو گئی،

ض ع

ادبیات

خونِ جگر

از جناب جگر مراد آبادی،

عشق فنا کا نام ہے، عشق میں زندگی نہ دیکھ — جلوۂ آفتاب بن، ذرّہ میں روشنی نہ دیکھ

جلوۂ رنگ رنگ کی دیکھ ہما ہمی نہ دیکھ — ایک جگہ ٹھہر نہ جا، غور سے تو کبھی نہ دیکھ

شوق کا مرثیہ نہ پڑھ، عشق کی بے کسی نہ دیکھ — اُسکی خوشی خوشی سمجھ، اپنی خوشی خوشی نہ دیکھ

شوق کو رہنما بنا، ہو جو چکا کبھی نہ دیکھ — آگ دبی ہوئی نکال، آگ بجھی ہوئی نہ دیکھ

دل کو مٹا کے عشق میں دل کی طرف کبھی نہ دیکھ — ہو کے نثارِ زندگی، حاصلِ زندگی نہ دیکھ

دل کی لگی بجھائے جا، تیز قدم اٹھائے جا — رخصتِ شوق کی قسم فرصتِ زندگی نہ دیکھ

پہلے جہانِ رنگ و بو تا بہ کمال دیکھ جا — رہروِ منزلِ سلوک اپنی طرف ابھی نہ دیکھ

یہ تو نہیں کہ آنکھ کو دعوتِ ماسوا نہ دے — ہاں مگر اس قدر کہ بس ایک ہی رخ کبھی نہ دیکھ

موت و حیات میں ہے صرف ایک قدم کا فاصلہ — اپنے کو زندگی بنا، جلوۂ زندگی نہ دیکھ،

حسنِ مجاز سے گذر، یعنی جو تجھ سے ہو سکے — دیکھ کے ایک بار پھر بارِ دگر کبھی نہ دیکھ

تو ہی کمالِ عشق ہے، تو ہی کمالِ حسن ہے — اپنے سوا کسی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھ

ناصحِ کم نگاہ سے کوئی یہ کہہ کے سر کھپائے — نازِ شکستگی سمجھ، رنگِ شکستگی نہ دیکھ

یہ بھی تری طرح کہیں رُخ سے نقاب الٹ نہ دے حسن پہ اپنے رحم کر عشق کی سادگی نہ دیکھ

ہو کے رہیگا ہم نوا وہ بھی تری ہی ساتھ ساتھ نغمۂ شوق گائے جا حسن کی برہمی نہ دیکھ

ہے یہی عین دوستی اپنی طرف سے اے جگر

دست کرم بڑھائے جا، غیر کی دشمنی نہ دیکھ،

شورِ نشور

از

جناب نشور واحدی،

ہمیں اے کردگار کفر و دیں سب کام آتا ہے مگر تیرے غم توحید پر الزام آتا ہے،

نگاہِ اولیں کا آج تک جب نام آتا ہے وہی رعنائیاں لیکر خیالِ خام آتا ہے،

سرابِ زندگی کو یاد رکھ اے تشنہ عقبیٰ تماشا آج کا دیکھا ہوا کل کام آتا ہے،

کشش اے جذبۂ کامل مدد اے ہمت عالی کہ پھر مجھکو خیالِ کوششِ ناکام آتا ہے،

نہ پوچھو زندگی تارِ نفس پر جینے والوں کی کہ مرگِ ناگہاں کا ہر نفس پیغام آتا ہے،

محبت اور پھر ضبطِ محبت اف معاذ اللہ خدا کا سامنا ہے اور کسی کا نام آتا ہے

تجھے اے حسنِ عالم سوز آخر کب خبر ہوگی کہ بربادِ تمنا کوئی زیرِ بام آتا ہے،

مسلسل شامِ غربت شامِ فرقت شامِ بیماری میرا دل کانپ جاتا ہے جو لفظِ شام آتا ہے،

نشورِ پاک دل کی پاکیٔ انفاس کیا کہنا

صفائے قلب ہوتی ہے، جب اسکا نام آتا ہے

خاتم النبیین، مؤلفہ جناب ابراہیم عمادی صاحب، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۰۳ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مرقوم نہیں، پتہ اسمٰعیل بیگ محمد ہائی اسکول بمبئی نمبر ۲،

اردو میں آئے دن سیرت پاک پر کتابیں نکلتی رہتی ہیں، سیرت کے مضامین و مباحث محدود و متعین ہیں، اسلئے ان میں تو کوئی نیا اضافہ کیا نہیں جاسکتا، عقیدت مند اپنے ذوق ونظر کے مطابق انہی مباحث کی ترتیب وطرز بدل کر نئے نئے انداز سے پیش کرتے ہیں، خاتم النبیین بھی اسی قسم کا ہدیۂ عقیدت ہے، اس کے چار حصے ہیں، پہلے حصہ مین کلام اللہ سے سات اولوالعزم انبیا علیہم السلام کے حالات وتعلیمات کو پیش کیا گیا ہے، دوسرے حصہ میں باستثنا ے غزوات قبل نبوت سے لیکر حجۃ الوداع تک سیرت پاک کے تعمیری حالات ہیں، مثلاً تبلیغی جد وجہد، مخالفین کا نرغہ، تبلیغ اسلام کے نتائج اور اسکی ترقی وغیرہ، تیسرے حصہ میں بڑے بڑے غزوات کے مختصر حالات ہیں، اسمیں ضمناً صحابۂ کرام کے جوشِ جہاد کے واقعات اور جنگ میں اسلام کی اصلاحات کا بھی مختصر ذکر ہے، چوتھے حصہ میں اخلاق وشمائل نبوی کو موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے، واقعات مستند اور زبان صاف اور سادہ ہے، بچوں کے لئے یہ کتاب خصوصیت کیساتھ زیادہ مفید ہے، لیکن بعض واقعات کو ایسے الفاظ میں پیش کیا گیا ہے جن سے انکی صورت بدل گئی ہے، مثلاً حضرت زیدؓ اور حضرت خبیبؓ کے متعلق جنھیں کفار نے دھوکا دیکر گرفتار کر لیا تھا، اور مکہ میں لیجا کر ان کے دشمنوں کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا، لکھتے ہیں کہ "قریش تو مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے، ہی کچھ روز تک بھوکا پیاسا رکھا

اس کے بعد تڑپا تڑپا کر جان سے مار ڈالا"، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار نے انھیں بھوک سے تڑپا تڑپا کر شہید کیا، حالانکہ یہ واقعہ نہیں ہے، نہ انھیں بھوکا رکھا، اور نہ اس طرح سے مارا بلکہ حضرت خبیبؓ کو سولی دیگئی، اور حضرت زیدؓ کو تلوار سے شہید کیا گیا،

ہٹلر اعظم مولفہ جناب پروفیسر جندر سکھ صاحب شاستری تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۲۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت تین روپیہ مجلد، پتہ سیاسی لٹریچر کمپنی نمبر ۱۱۸ مسجد کھجور دہلی،

اس نئے سیاسی دور میں جرمنی اور اٹلی کے آمر دل ہٹلر اور مسولینی نے دنیا کے سامنے نئی طرز حکومت کا کامیاب نمونہ پیش کیا ہے، اس کے بارہ میں دورائیں یا دو گروہ ہیں، ایک گروہ کا خیال ہے کہ اس طرز حکومت نے ترقی یافتہ جمہوریت کو ختم کر کے پھر دیو استبداد کو زندہ کیا ہے دوسرا اسے ملکی اور قومی ترقی کے لئے مفید خیال کرتا ہے، اس اختلاف خیال کی بنا پر ان آمروں کے متعلق بھی متضاد خیالات ہیں، مذکورۂ بالا کتاب آمریت کی تائید و حمایت میں لکھی گئی ہے، اس میں دکھایا گیا ہے کہ ہٹلر جو کچھ کر رہا ہے، وہ ان مظالم کا ردعمل اور لازمی نتیجہ ہے، جو جنگ عظیم کے بعد جرمنی پر توڑے گئے، اگر ہٹلر نہ پیدا ہو گیا ہوتا، تو جرمنی مر کر دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتا تھا، اس کتاب کے شروع میں جرمنی کی قدیم مختصر تاریخ ہے، اس کے بعد ہٹلر کے سوانح حیات ہیں، چونکہ اسکے سارے کارنامے جرمنی کے احیاء سے متعلق ہیں، اس لئے اس کتاب میں جنگ عظیم کے آغاز سے لیکر اس وقت تک کی جرمنی کے زوال و عروج کی پوری تاریخ آگئی ہے، کہ جنگ عظیم میں جرمنی کس طرح شریک ہوا، دوران جنگ میں وہاں کیا کیا انقلابات و حوادث ہوئے، کس طرح قیصریت کا خاتمہ ہوا، اور جنگ عظیم کے بعد کس طرح جرمنی کا خاتمہ کیا گیا، پھر ہٹلر پیدا ہوا، اور اس نے اندرونی و بیرونی مشکلات کا مقابلہ، اور تمام مخالف قوتوں کو مغلو

کرکے جرمنی کو دوبارہ زندہ کیا اس طرح اس کتاب میں ۱۸۱۴ء سے ۱۹۳۱ء تک کی جرمنی کی پوری سیاسی تاریخ آگئی ہے، کتاب نہایت دلچسپ اور مفید ہے،

مبادی سیاسیات مولفہ پروفیسر ہارون خانصاحب شروانی صدر شعبۂ تاریخ و سیاسیات جامعہ عثمانیہ، تقطیع اوسط ضخامت ۵۱۴ صفحے کاغذ کتابت و طباعت اوسط، قیمت تین روپے مجلد، غالباً مصنف سے ملے گی،

سیاسیات یعنی حکومتوں کے سیاسی نظام، ان کے اجزاے ترکیبی، اس کے ارتقا کی تاریخ اور موجودہ حکومتوں کے دستور پر پروفیسر ہارون خانصاحب شروانی نے دو جلدوں میں ایک کتاب لکھی تھی، جس کا پہلا حصہ عرصہ ہوا شائع ہو چکا ہے، یہ کتاب اس کا دوسرا حصہ ہے، اس میں حسب ذیل مباحث ہیں، اعضاے حکومت اور تفریق اختیارات، حکومت کی قسمیں، مفرد و مرکب مملکتیں، مقننہ، جماعت عاملہ، سیاسی فرقہ بندی، محکمہ عدلیہ، مقامی حکومت، توابع و نو آبادیات کی بین الاقوامی حیثیت، اور قانون بین الاقوام کے چند نکات وغیرہ، دستور حکومت کے تمام اجزا پر تفصیل کیساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، ان میں سے جس کی ابتدائی شکلیں قدیم حکومتوں میں ملتی ہیں، ان کو بھی ظاہر کر دیا گیا ہے، ہر بحث کے آخر میں موجودہ حکومتوں کے دستوروں سے اس کی مثالیں دی گئی ہیں، اس طرح اصول کیساتھ ان کی عملی تشریح بھی ہو گئی ہے، اور موجودہ حکومتوں کے دستوروں سے واقفیت بھی ہو جاتی ہے، زبان آسان اور انداز بیان سلجھا ہوا ہے، آخر میں انگریزی اور اردو مصطلحات کا انڈکس بھی دیدیا ہے، آج کل ایسی کتابوں کی بہت ضرورت ہے، ہر پڑھے لکھے ہندوستانی کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے،

بنی اسرائیل کا چاند مترجمہ جناب عبدالمجید صاحب حیرت بی اے علیگ تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۴۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ مکتبہ جامعہ دہلی،

یہ کتاب انگریزی زبان کے مشہور مصنف "رائڈر ہیگرڈ" کی تصنیف ہے، اس میں بنی اسرائیل کی فرعون کی غلامی اور ان کی آزادی کی داستان کو ناول کے پیرایہ میں دکھایا گیا ہے، بنی اسرائیل پر مصریوں کے مظالم فرعون کو اسرائیلی انبیاء کی تنبیہ، فرعونیوں کا تمرد، ان پر مصائب کا نزول حق و باطل کی معرکہ آرائی، فرعون کی غرقابی اور بنی اسرائیل کی آزادی وغیرہ کل واقعات کو نہایت دلچسپ طریقہ سے پیش کیا گیا ہے، ان خشک واقعات کو پرلطف بنانے کے لئے مصنف نے فرعون کے ولی عہد سیٹی اور ایک معصوم اور مظلوم اسرائیلی لڑکی میرا کی داستان عشق و محبت بھی شامل کر دی ہے، شاہزادہ سیٹی اپنے خاندان کے برعکس نہایت منصف مزاج، حق پرست، دنیاوی شان و شکوہ سے بے نیاز اور اپنی قوم کے خلاف مظلوم بنی اسرائیل کا ہمدرد اور ان کی آزادی میں مددگار ہے، اس کی سزا میں اسے بڑی بڑی آزمایشوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، تاج و تخت سے محروم کیا جاتا ہے، چنانچہ فرعون کی موت کے بعد اس کے بجائے شاہی خاندان کا ایک دوسرا رکن عمن میس تخت پر بٹھایا جاتا ہے، لیکن شاہزادہ سیٹی حق کی حمایت سے باز نہیں آتا، یہی فرعون مع خدم و حشم کے غرق ہوتا ہے، اس کے بعد شاہزادہ سیٹی کو تخت ملتا ہے، عین اس وقت اس کی محبوبہ میرا بھی مصریوں کے سحر کے اثر سے مرجاتی ہے، شاہزادہ اس کے مردہ جسم کو تاج پہنا کر تخت نشین کرتا ہے، اور اس کے بعد ہی خود بھی راہی عدم ہوتا ہے، اس ناول میں فراعنہ کے جلال و جبروت، عہد فراعنہ کی ساحری، اور قدیم مصری تمدن کی پوری تصویر آگئی ہے، کوئی واقعہ بغیر آب و رنگ دیئے ہوئے افسانہ نہیں بن سکتا، اسلئے اس میں اصل واقعات پر بہت کچھ اضافے ہیں، لیکن افسانہ نہایت دلچسپ ہے، اور مترجم نے کامیاب ترجمہ کیا ہے،

"م"

دارالمصنفین کی نئی کتابین

تابعینؓ

علم وعمل اور مذہب واخلاق مین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے، اور صحابۂ کرام کے بعد ان ہی کی زندگی مسلمانون کے لئے نمونۂ عمل ہے، اس لئے سیرالصحابہ کی تکمیل کے بعد دارالمصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس مین حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز، حضرت حسنؒ بصری، حضرت اویسؒ قرنی، حضرت امام زین العابدینؒ، حضرت امام باقرؒ، حضرت امام جعفرؒ صادق، حضرت محمد بن حنفیہؒ، حضرت سعید بن مسیبؒ، حضرت سعید بن جبیرؒ، حضرت محمد بن سیرینؒ، حضرت ابن شہاب زہریؒ، امام ربیعہ رائیؒ، امام مکحول شامیؒ، قاضی شریحؒ وغیرہ چھیانوے ۹۶ اکابر تابعینؒ کے سوانح ان کے علمی، مذہبی، اخلاقی اور عملی مجاہدات اور کارنامون کی تفصیل ہے، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی، ضخامت ۵۰۰ صفحے، قیمت: للعہ

مختصر تاریخ ہند

ہمارے اسکولون مین جو تاریخین پڑھائی جاتی ہین ان کا لب ولہجہ ولازمی اور تعصب سے خالی نہین ہوتا، اور اس وجہ سے ہندوستان کی مختلف قومون مین تعصب اور بغض وعناد پیدا ہوتا ہے، مولانا ابوظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسون اور طالب علمون کیلئے اس غرض سے لکھی ہے کہ اس کا طرز بیان قومی جذبات سے متاثر نہ ہو اور ہندو اور مسلمان فرمانروائون نے ہندوستان کے بنانے مین جو کام کئے ہین وہ طالب علمون کو [illegible] ضخامت [illegible] صفحے قیمت [illegible]

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۸۲

اپریل سنہ ۱۹۳۹ء

معارف

مجلس دار المصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

مُرتّبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت پانچ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سیرۃ النبی

رسول اللہ صلعم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جس کا نام سیرۃ النبی عام طور سے مشہور ہے، مسلمانون کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت و اہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے،

ابتک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہین، پہلے مین ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہین، اور ابتدا مین ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہی جسمین فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہی، دوسرے حصہ مین تکمیل دین، تمامی حکومت الٰہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہی، تیسرے حصہ مین آپکے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہے جسمین سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثین کیگئی ہین، پھر ان معجزات کی تفصیل ہی جو بروایات صحیحہ ثابت ہین، اسکے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کیگئی ہے، چوتھے حصہ مین ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپکے ذریعہ مسلمانون کو تعلیم کئے گئے ہین، کوشش کی گئی ہی کہ اس مین قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائین، پانچویں حصہ مین عبادت کی حقیقت، عبادت کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح و حکم کا بیان ہی اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے،

چھٹا حصہ جو اخلاق پر مشتمل ہو [illegible]

قیمت: [illegible] حصہ اول تقطیع خورد [illegible]، حصہ دوم تقطیع کلان [illegible] تقطیع خورد [illegible] حصہ سوم تقطیع کلان [illegible] تقطیع خورد [illegible] حصہ چہارم تقطیع کلان [illegible] تقطیع خورد [illegible] حصہ پنجم تقطیع کلان [illegible]

([illegible])

جلد ۴۳ | ماہ صفر المظفر ۱۳۵۸ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۳۹ء | عدد ۴

مضامین

وسط مارچ مین اڈیٹر معارف کو سفر مین زخم چشم پہنچا، یہ فقرہ حقیقت و مجاز دونون پہلوون سے صحیح ہے، اللہ تعالیٰ کا احسان تھا کہ یہ واقعہ دلی اور لکھنؤ کے مابین پیش آیا جس کی وجہ سے دلی اور لکھنؤ دونون شہرون کے آنکھون کے خاص طبیبون کا علاج فوراً ہی ممکن ہو سکا اور خطرہ کا فوراً انسداد ہوگیا، ع

رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گذشت

آنکھون کی شدید سرخی ہلکی ہو چکی ہے، لیکن ابھی تک لکھنے پڑھنے مین پوری احتیاط برتی جاتی ہے، امید ہے کہ احباب جواب خط نہ ملنے کے اس عذرِ گناہ کو قبول فرمائینگے،

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قدیم طلبہ نے سب سے پہلی دفعہ لکھنؤ سے باہر ایک دوسرے شہر بلکہ دوسرے صوبہ (پھلواری ضلع پٹنہ) میں اس مرتبہ اپنا اجلاس منعقد کیا ہے، ان سطرون کے لکھوانے تک اجلاس کی روداد معلوم نہین ہو سکی، مگر امید ہے کہ ان پرجوش نوجوان بھائیون نے عربی تعلیم و عربی مدرسون اور خاص طور سے ندوہ کی اصلاحی تحریک پر عاقلانہ اور عادلانہ تجویزین منظور کی ہونگی،

افسوس ہے کہ ہماری قوم کے گفتار و کردار میں ابھی تک توازن پیدا نہین ہوا، جس طرف کی کوئی ہوا چلتی ہے اسی طرف سب جھک

ایک نظر جھک پڑتے ہیں، اور یہ نہیں سمجھتے کہ قوم کی مختلف ضرورتیں ہیں اور ہر ضرورت اپنی جگہ پر شدید ہے، اب آجکل سیاسیات کی جو صحیح یا غلط آندھی چل رہی ہے اس میں سب اڑے چلے جا رہے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب صرف یہی ایک چیز ایسی ہے جو قوم کو جلایا مار سکتی ہے حالانکہ جماعت کی حیثیت بالکل ایک فرد کے مانند ہے، جس طرح ایک زندہ آدمی کو اپنے زندہ رہنے کے لئے ہوا، پانی، غذا اور بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے اسی طرح جماعت کو بھی اپنی زندگی کے لئے ایمانی و اخلاقی طاقت، مالی قوت، جہاد کی روح، اور صحیح تعلیمی مقصد بہت سی غذاؤں کی ضرورت ہے، ان میں سے کسی ایک چیز کو لے کر دوسری چیزوں سے غفلت برتنا قومی خودکشی ہے،

ورم اور موٹاپے دونوں میں جسم کا حصہ کچھ بڑھ جاتا ہے لیکن ورم اس کا نام ہے کہ بدن کا کوئی ایک عضو یا اس عضو کا کوئی حصہ بڑھکر بدن میں عیب یا درد پیدا کرے، اور موٹاپے خصوصاً صحت و تندرستی کے موٹاپے میں بدن کے سارے اعضا میں متوازن نشوونما ہوتا ہے، قوموں کا زندگی کے کسی ایک پہلو پر اتنا زور دینا کہ دوسرے پہلو ننگا ہوں سے اوجھل ہو جائیں، قومی صحت کی فربہی نہیں بلکہ بیماری کا ورم ہے،
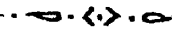
آجکل اسلامی تہذیب و تمدن اور زمانۂ حال کے سب سے ممتاز اور دلپسند لفظ کلچر کی حفاظت کی بڑی دھوم ہے، مگر معلوم ہے کہ اسلامی تہذیب و تمدن اور کلچر کی حفاظت کا کام کہاں انجام پاتا ہے، یونیورسٹیوں، کالجوں، لیگوں، اور کانگرسوں میں نہیں، بلکہ ٹوٹے پھوٹے عربی مدرسوں کی فرسودہ چہار دیواری میں یہی وہ حصار تھے جہاں سے فرنگی تہذیب و تمدن

کے شدید حملون کا مقابلہ کیا گیا، اور اب بھی یہی وہ قلعے ہیں جہان سے اس کی آیندہ حفاظت کا انتظام کیا جاسکتا ہے، اس لئے ان عربی مدرسون کی ظاہری تباہ حالی کو کم نگاہی سے نہ دیکھئے، بلکہ یقین کیجئے کہ ہندوستان کے اسلامی مدرسے ہی ہندوستان میں اسلامی تعلیم و تمدن کے مضبوط مورچے ہیں، جنکو اسلامی کلچر کی تباہی کا رونا ہے، ان کو چاہئے کہ پلیٹ فارمون کی دردبھری تقریرون کو چھوڑکر اپنی بھری جیبوں کو ان قلعوں کی تیاری اور ان کے استحکام پر صرف کرین،

جن لوگون کو عربی مدرسون کے پرانے طرز تعلیم اور نصاب پر شدید اعتراضات ہین، انھین معلوم ہونا چاہئے کہ ہمارا بڑے سے بڑا عربی مدرسہ بھی ہر قسم کی ضروری اصلاح کے لئے تیار ہے، نصاب کی خرابیاں اب دلیلون کی محتاج نہیں رہیں، ندوۃ العلماء نے اسکے متعلق جو لٹریچر پیدا کیا ہے، اس سے بڑھکر وہ لٹریچر ہے جسکو زمانہ کے ہاتھون نے لکھکر پیش کردیا ہے، ضرورت اسکی ہے کہ تمام اہم عربی مدرسون کے ارکان ایک جگہ مل کر بیٹھین اور اس مسئلہ پر غور کریں،

اوپر ہم نے جو مختصر سی فہرست پیش کی ہے ہم کو معلوم ہے کہ اس حالت کو پہنچ جانے پر بھی ان کا قبول ہونا مشکل ہے، کیونکہ سب کچھ ہو جانے پر بھی جماعتی انانیت کی بو ہمارے دماغوں سے نہیں نکلی ہے اور جب تک پوری جماعت مل کر اس مسئلہ کو طے نہ کرے گی، یہ مسئلہ ناطے شدہ رہیگا،

ادھر گرمیون میں دو مہینے مئی اور جون اڈیٹر معارف کا قیام دار المصنفین سے باہر رہیگا، اسلئے معارف کے متعلق جملہ خط وکتابت اڈیٹر کے بجائے دفتر دار المصنفین سے کی جائے، تاکہ جواب میں تاخیر نہ ہو،

شاہانہ التفات نامہ

اتحاد بین المسلمین کی زبردست خواہش

دار المصنفین کے خدمات کی تحسین۔

مارچ ۱۹۳۸ء کے معارف میں "بدعات محرم" پر اعلیحضرت آصف سابع خلد اللہ ملکہ کی ایک تحریر دلپذیر، بصیرت افزائے معارف ہوئی تھی، اور معارف نے اس پر ایک مختصر مقدمہ کے لکھنے کی سعادت پائی تھی، یہ مقدمۂ تحریر جب اعلیحضرت کی نظر اشرف سے گذرا تو پسند فرمایا اور اپنے دست خاص مبارک سے یہ التفات نامہ رقم فرما کر خاکسار اڈیٹر کو اوج اقبال بخشا،

اس التفات نامہ میں جو بات خاص لحاظ کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ اعلیحضرت کے خاطر انور میں مختلف اسلامی طبقوں کے درمیان اتحاد کا کتنا عمیق جذبہ ہے، ساتھ ہی خدام علم کی عزت و توقیر جو مسلمان بادشاہوں کا خاصہ رہی ہے، اس رقیمۂ کریمہ کی سطر سطر سے کس طرح ہویدا ہے،

توقیعِ خسروی

۱۵ رصفر ۱۳۵۸ھ

مولوی سید سلیمان صاحب ندوی،

السلام علیکم ۔ میری نظر سے معارف کا پرچہ گذرا بابت مارچ ۱۹۳۹ء جو کہ ماہانہ اعظم گڈہ سے نکلتا ہے، اس میں میرے مضمون "صحیح عزاداریِ حسینؑ" کو نہ صرف طبع کیا گیا بلکہ چند سطور بطور مقدمہ اس کے متعلق لکھے گئے، اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہوش بلگرامی کے ذریعہ کہ مولوی صاحب میرے دوسرے مضمون زیر عنوان "شانِ ماہ محرم الحرام" کو بھی اپنے پرچہ مین آیندہ جگہ دینے والے ہیں، اور اس کے متعلق اپنی ذاتی راے کا بھی اظہار کرینگے

سبحان اللہ اگر اس قسم کے علماء و فضلا و فقہا طبقۂ اسلام مین دکھائی دیں جو کہ وسعت نظر سے کام لے کر اپنے مذہب و عقائد کے نکتہ و اسرار کو عوام پر ظاہر کرتے رہین تو کیا کہنا کہ ان کی یہ مذہبی خدمت قابل اور منصف مزاج گروہ کے ہان ضرور قدر کی نظر سے دیکھی جائے گی، اور دوسری دنیا مین ان کو کچھ نہ کچھ اس کا اجر ملکر رہے گا کہ

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ

مجھے یہ بھی سنکر افسوس ہوا کہ آجکل مولوی صاحب کی آنکھ خراب ہوگئی ہے جس کی وجہ سے تالیف و تصنیف کے کام مین ہرج واقع ہو رہا ہے، مگر اس کے ساتھ اس قسم کا کام جو اب تک انجام پایا ہے، وہ بھی کچھ کم نہین ہے، بلکہ قوم و ملت کی بہت کچھ خدمت کیگئی ہے، اس سے بحث نہین کہ اس کے قدردان بھی اس زمانہ مین کوئی ہین یا نہین،

"آصف سابع"

مقالات

عرب اور امریکہ

(۲)

ماورائے بحر ظلمات عرب کے بے آب ریگستان سے اسلامی فتوحات کا جو سیلاب چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں اٹھا تھا، وہ ساتویں صدی عیسوی کے وسط میں افریقہ و مغرب اقصیٰ اور اندلس کے صحراؤں اور میدانوں سے گذر کر بحر ظلمات کے ساحل پر آکر رکا، مگر بلند ہمت عرب کشورکشاؤں کی ہمت اب بھی اس فطری روک کے پاس آکر کم نہ ہوئی، مغرب اقصیٰ کے فاتح عقبہ نے بحر ظلمات کے پانی میں گھوڑا کھڑا کرکے کہا کہ "خداوندا اگر مجھے معلوم ہوتا، کہ اس کے بعد بھی تیرا کوئی ملک ہے، تو میں ذوالقرنین کی طرح وہاں بھی تیری توحید کی دعوت لیکر جاتا" (المونس فی اخبار تونس ص۲۸)

اندلس کا فاتح طارق فتح کرتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے، اس کا آقا موسیٰ اس کو روکتا ہے، وہ جواب دیتا ہے، کہ جب تک بحر محیط کی دیوار ہمارے قدم نہ روک لیگی ہم آگے بڑھتے جائینگے[1]

ماورائے بحر ظلمات سفر کا تخیل عربوں اور مغربی وافریقی مسلمانوں میں ذوالقرنین کے قصہ کے سلسلہ میں پیدا ہوا، یہ کہانی اتنی پھیلی کہ علم ہیئت کی کتابوں تک میں درج ہے، کہتے ہیں، کہ ذوالقرنین نے ملک مغرب میں پہونچکر اپنا جہاز بحر ظلمات کی تحقیق حال کے لئے روانہ کیا، وہ اس پاس کے ایک جہاز کو گرفتار کرکے لے آیا، جس پر ماورائے بحر ظلمات کے کچھ باشندے سوار تھے، ذوالقرنین نے ان سے ان کے ملک کا حال دریافت کیا، رصدگاہ مراغہ کا عالم ہیئت، شارح

[1] نفح الطیب ج ۱ ص ۱۱۳ مصر

چینی اس قصہ کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہے،

"یہ ہوسکتا ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان میں بڑے بڑے دریا، اور اونچے اونچے پہاڑ، اور صحاری حائل ہوں، جو ان کی خبر ہم تک نہیں آنے دیتے، ہاں دو جنوبی ربعوں میں سے ایک میں کچھ آبادی بیان کیجاتی ہے، اور وہ جو ذوالقرنین کے زمانہ کا قصہ بیان کیا جاتا ہے تو وہ بظاہر بے اصل معلوم ہوتا ہے"

(مقالہ ثانیہ فی بیان الارض،)

لیکن اس قسم کی کہانیوں کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی چنانچہ اسپین و افریقہ کے سواحل میں مغرورین و مغررین (فریب خوردہ) کے نام سے ایک جماعت ہی قائم ہوگئی، جو اپنے کو مصیبتوں میں ڈال کر اس بحر محیط کے سفر کے لئے روانہ ہوتی تھی، پھر وہ اس میں فنا ہوجاتی تھی، یا کامیاب واپس آتی تھی،

تیسری صدی کے آخر اور چوتھی صدی ہجری کے شروع (نویں صدی عیسوی کے آخر اور دسویں صدی عیسوی کے شروع) میں مسعودی اپنی مروج الذہب میں اس قسم کے واقعات کیلئے اپنی دوسری تصانیف کا حوالہ دیتا ہے،

وقد اتینا علی ذکرھا فی کتابنا	اور ہم نے اپنی کتاب اخبار الزمان
فی اخبار الزمان وفی اخبار	میں اور ان لوگوں کے حالات میں ان
من غرر وخاطر بنفسہ و	واقعات کو بیان کیا ہے جنھوں نے خود
من نجا منھم ومن تلف	آپ کو فریب دیا، اور اپنے آپ کو جوکھوں
وما شاھد وامنہ وما رأوا	میں ڈالا، اور ان میں سے جو بچا اور جو ہلاک
	ہوا، اور انھوں نے جو دیکھا اور مشاہدہ کیا

اس کے بعد کہتا ہے،

واذا منھم رجل من اھل الاندلس	اور ان میں اندلس کے رہنے والوں
یقال لہ خشخاش وکان من	میں سے ایک شخص تھا جس کو خشخاس کہکر
فتیان قرطبۃ واحداثھم فجمع	پکارا جاتا تھا، وہ قرطبہ کے نوجوانوں
جماعۃ من احداثھا ورکب	میں سے تھا، اس نے قرطبہ کے اوندبجوانو
بھم مراکب استعدھا فی ھذا	کی ایک جماعت بنائی، اور ان کو لیکر ان
البحر المحیط فغاب فیہ مدۃ ثم	کشتیوں میں سوار ہوا جن کو اس نے
انثنی بغنائم واسعۃ وخبرہ	بحر محیط میں اس غرض کے لئے تیار رکھا
مشھور عند اھل الاندلس،	تھا، وہ ایک زمانہ تک غائب رہا، پھر
(جلد اصفحہ ۱۵۸ پیرس)	بہت سا مال غنیمت لیکر لوٹا، اوس کا واقعہ

(حاشیہ: اندلس والوں میں مشہور ہے)

ادریسی المتوفی سنہ ۵۶۰ھ نے نزہتہ المشتاق میں اندلس کے جغرافیہ میں تین موقعوں پر ان مغرورین یعنی فریب خوردہ جانبازوں کا ذکر کیا ہے (صفحات ۵۵ - ۱۶۵، ۱۸۴) یہ بھی لکھا ہے کہ امیر المسلمین علی بن یوسف بن تاشفین کے امیر البحر احمد بن عمر معروف بہ رقم الاوز (نقش بط) نے بحر ظلمات کے ایک جزیرہ پر فوج کشی تھی، مگر کامیابی کے پہلے ہی وہ مرگیا، (ص ۵۵)

ادریسی ایک موقع پر بحر ظلمات کے ذکر میں لکھتا ہے،

اس بحر ظلمات کے پیچھے جو کچھ ہے، اس کو کوئی نہیں جانتا، اور نہ کسی آدمی کو صحیح واقفیت ہے، کیونکہ اس کو عبور کرنا سخت مشکل ہے، اس کی فضا میں بڑی تاریکی اور اسکی موجیں نہایت سخت اور اس کے خطرات بہت، اور اس کے جانور خطرناک، اور اسکی ہوائیں ہیجان انگیز ہیں، اس میں بہت سے جزیرے ہیں، کچھ آباد، کچھ سمندر کے اندر اور کوئی

جہاز ران اس کو عرض میں قطع نہیں کرتا، اور نہ اس میں گھستا ہے، البتہ اسکے ساحل کے طول کے کنارے کنارے اس سے لگ کر چلتا ہے" (ص ۱۶۵)

اب بحر ظلمات میں یہ کون سے جزیرے ہیں؛ کیا امریکن جزائر ویسٹ انڈیز، نیو فاونڈ لینڈ، گرین لینڈ وغیرہ ہو سکتے ہیں،

لشبونہ (لسبن ساحل پرتگال) کے ذکر میں ادریسی ان فریب خوردہ جہاز رانوں کا ایک عجیب قصہ سناتا ہے کہتا ہے:۔

"اور اسی شہر لسبن میں فریب خوردہ لوگ اس لئے بحر ظلمات میں سوار ہوئے تھے، تاکہ پتہ لگائیں، کہ اس میں کیا ہے، اور کہاں جاکر ختم ہوتا ہے، شہر لسبن میں ایک پھاٹک یا گلی (درب) ہے، جس کا نام فریب کھانے والوں کا درب ہے، اور ان کا قصہ یہ ہے، کہ آٹھ آدمیوں نے جو آپس میں سب چچا کے بیٹے تھے، بار برداری کا ایک جہاز بنایا، اور اس میں پانی اور توشہ اتنا رکھ لیا، جو مہینوں کے لئے کافی تھا، پھر اس جہاز میں سوار ہو کر ایک مناسب موسم میں روانہ ہوئے، گیارہ دن کے بعد ایک ایسے پانی میں پہونچے، جو سخت موجوں والا تھا، وہاں کی ہوائیں مکدر تھیں، روشنی ماند تھی، تو انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ اب ہلاکت قریب ہے، تو اپنے بادبانوں کو دوسرے ہاتھ کی سمت پلٹ دیا، اور سمندر میں جنوب کی طرف چلتے رہے، تو بکریوں والے ایک جزیرہ میں پہونچ گئے، وہاں بےشمار بکریاں تھیں جن کو کوئی پکڑنے والا یا چرانے والا نہ تھا، تو وہ جزیرہ میں آئے، وہاں چشمہ ملا، اور جنگلی انجیر، انھوں نے ان بکریوں میں سے کچھ کو ذبح کیا، تو ان کا گوشت بہت ہی کڑوا نکلا جس کو وہ نہ کھا سکے، ان کی کھالیں لے لیں، اور جنوب کی سمت میں ۱۲ دن اور چلے، ان کو

ایک جزیرہ ملا جہاں آبادی اور کھیتی تھی، تو وہ اس جزیرہ کو دیکھنے چلے، ابھی کچھ ہی دور چلے تھے، کہ چھوٹی چھوٹی کشتیوں نے ان کو گھیر لیا، اور ان کو پکڑ کر جہاز ایک ساحلی شہر کی طرف لے گئے، وہاں ایک گھر میں جا کر اتارا، وہاں سُرخ رنگ (اشقر) کم لیکن سیدھے بال والے لمبے قد کے آدمی دیکھے، ان کی عورتوں میں عجیب خوبصورتی تھی، تو وہ لوگ تین دن ایک گھر میں قید رہے، چوتھے دن ان کے پاس ایک آدمی آیا، جو عربی میں باتیں کرتا تھا، تو اس نے ان کا حال دریافت کیا، اور یہ کہ کیوں آئے اور کہاں سے آئے، اور تمھارا وطن کہاں ہے، انھوں نے اپنا پورا حال بتایا، اس نے ان سے بھلائی کا وعدہ کیا، اور بتایا کہ وہ بادشاہ کا ترجمان ہے، دوسرے دن ان کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا، اس نے ان کا حال پوچھا، تو وہی بتایا جو کل ترجمان کو بتا چکے تھے، کہ وہ اس سمندر میں اسلئے گھسے تھے، کہ دیکھیں اس میں کیا کیا عجائبات ہیں، اور اس کے حالات کیا ہیں، اور اس کی حد دریافت کریں، یہ سنکر بادشاہ ہنسا، اور ترجمان کے ذریعہ سے ان کو بتایا کہ اس کے باپ نے اپنے غلاموں کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ سمندر کے عرض میں ایک مہینہ تک چلتے رہیں، مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا، اور وہ ناکام واپس آئے، پھر بادشاہ نے ترجمان سے کہا کہ اُن سے بھلائی کا وعدہ کرے، اور بادشاہ کیساتھ حُسنِ ظن پیدا کرے، اس نے ایسا ہی کیا، پھر وہ اس قیدخانہ میں لے آئے گئے، یہاں تک کہ وہ موسم آیا جب پچھوا ہوا چلتی ہے، تو ان کو ایک کشتی میں بٹھا کر، اور آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر ایک مدت تک سمندر میں چلاتے رہے، ان کا گمان ہو کہ تین دن اور تین رات وہ چلے ہوں گے یہاں تک کہ وہ ایک خشکی میں پہنچائے گئے، وہاں ان کی مشکیں کسی گئیں، اور ساحل پر چھوڑ دیئے گئے یہاں تک

کہ دن نکلا، اور روشنی ہوئی، اور ہم بندھے ہونے کے سبب سے سخت تکلیف اور بدحالی میں تھے، پھر ہم نے لوگوں کی آوازیں سنیں، تو چیخے، تو وہ لوگ پاس آئے اور مشکیں کھولیں، اور ہمارا حال دریافت کیا، ہم نے بتایا، یہ لوگ بربر تھے، ان میں سے ایک نے کہا کہ تم جانتے ہو، کہ تمھارے وطن کا یہاں سے کتنا فاصلہ ہے، اونھوں نے کہا نہیں اونھوں نے کہا دو مہینہ کی مسافت، یہ سن کران فریب خوردہ جہازرانوں میں سے ایک کی زبان سے وااسفی (اے میرا افسوس) نکل گیا، تو اس مقام کا نام اسفی پڑگیا اور وہ مغرب اقصی کے بندرگاہ کا نام ہے[1]،

جزئی اغلاط اور دنوں کے اندازہ سے قطع نظر کرکے کیا ہم اس مقام کو جہاں تک فریب خوردہ جہازران پہونچے تھے، شمالی امریکہ کا کوئی گوشہ سمجھیں، اور سُرخ رنگ کے انسان وہی تو نہیں، جن کا نام غلطی سے ریڈانڈینس (لال ہندوستانی) رکھ دیا گیا ہے، جو وہاں کے اصلی باشندے ہیں،

ابن خلدون المتوفی ۸۰۸ھ آٹھویں صدی میں بحرمحیط کے ایک سفر کا حال لکھتا ہے، جس میں اہل فرنگ کے چند جہاز بحرمحیط کے کسی جزیرہ میں اتفاقاً پہنچ گئے تھے، چونکہ بحرمحیط کے اندر یا انتہا پر جزائر خالدات کے علاوہ کوئی اور نام معلوم نہ تھا، اس لئے اس کے اندر کی ہر آبادی کو اور خشکی کو جزائر خالدات کہہ دیتے تھے، چنانچہ وہ مقدمہ میں کہتا ہے،

"بحرمحیط میں بہت سے جزیرے ہیں، جن میں تین بڑے اور مشہور ہیں، اور کہا جاتا ہے کہ وہ آباد ہیں، اور ہم کو خبر معلوم ہوئی ہے کہ اس صدی (آٹھویں صدی ہجری چودھویں صدی عیسوی) کے بیچ میں اہل فرنگ کے چند جہاز ادھر سے گذرے اور انھوں نے

---

[1] نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق صفۃ افریقیۃ والاندلس ص۱۸۴ لائیڈن،

وہاں لوٹ مار کی، اور وہاں کے کچھ باشندوں کو پکڑ کر لائے، اور مراکش کے سواحل پران کو بیچا، اور وہاں سے وہ سلطان کے پاس پہنچے، جب ان لوگون نے عربی سیکھ لی، تو انھوں نے اپنے جزیرہ کا حال بتایا، کہ وہ کاشتکاری کے لئے زمین سینگ سے کھودتے ہیں، اور ان کے یہاں لوہا نہیں ہے، جو کھاتے ہیں، اور ان کے مویشی بھیڑیں ہیں، اور لڑائی میں پتھر کے ہتھیار استعمال کرتے ہیں، اور آفتاب کو پوجتے ہیں"

اس کے بعد ابن خلدون کہتا ہے، اور صحیح کہتا ہے،

ولا یوقف علیٰ مکان ھذہ الجزائر الا بالعثور لا بالقصد الیھا، (ص ۴۵)	ان جزیرون کا ٹھیک پتہ نہیں معلوم اتفاقاً وہ ملجاتے ہیں، بالارادہ نہیں ملتے،

اسکی وجہ یہ بتاتا ہے، کہ جہاز ہوا کا رُخ جاننے، ستاروں کی سمت معلوم کرنے اور سواحل کے بحری نقشوں کی مدد سے چلتے ہیں،

وھذہ کلّہا مفقودٌ فی البحر المحیط، (ص ۴۵)	اور یہ تمام سامان بحر محیط میں مفقود ہیں،

"اسی لئے جہاز اوس کے بیچ میں ہو کر نہیں چلتے، کیونکہ اگر سواحل کا منظر آنکھوں سے دور ہو جائے، تو واپس آنے کی راہ کا بہت کم پتہ چلتا ہے، ساتھ ہی اس سمندر کی فضا میں اور اس کے پانی کی سطح پر اتنے بخارات رہتے ہیں، جو جہازوں کو چلنے نہیں دیتے، اور آفتاب کی روشنی پہونچنے نہیں پاتی، اسی لئے اس میں راہ پانا اور اس کا معلوم ہونا مشکل ہے، (مقدمہ ص ۴۵)

ان تمام قصوں کو ممکن ہے کہ دلچسپ کہانیوں ہی کی صورت میں تسلیم کیا جاتا لیکن

آجکل امریکہ کے کولمبس کی دریافت کی جو تنقیدی تاریخیں لکھی جارہی ہیں، انھوں نے ان کہانیوں کو سنجیدہ تاریخ بنا دینے کی سند پیدا کردی ہے،

نئی تحقیقات | امریکہ کے انکشاف کی جو تنقیدی تاریخیں وقتاً فوقتاً لکھی گئی ہیں اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نئی اور پرانی دنیا میں کولمبس سے پہلے سے تعلقات قائم تھے، ان تعلقات کی تعمیر کون کون قوموں نے حصہ لیا، اسکی دریافت تاریخی اور آثری ذریعوں سے اب تک کی گئی تھی، لیکن ابھی حال میں ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر لیو وینیر (Leo Wiener) کی ایک کتاب تین جلدوں میں شائع ہوئی ہے، اس کا نام "افریقہ اور امریکہ کی دریافت" ہے، اس میں نہایت واضح طور سے یہ ثابت کیا گیا ہے، کہ کولمبس امریکہ کا پہلا دریافت کرنے والا ہرگز نہیں، موصوف نے امریکہ میں پرانی آنیوالی قوموں کی دریافت کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا ہے، انھوں نے امریکہ کے پرانے باشندوں کی اصلی زبان کی فیلالوجیکل تحقیقات کے ذریعہ سے یہ پتہ لگایا ہے، کہ امریکہ کے باشندوں کی پرانی زبان وقتاً فوقتاً کن کن زبانوں سے مانوس و متاثر ہوتی رہی ہے، وینیر صاحب چھبیس انسانی زبانوں میں بآسانی گفتگو کرسکتے ہیں، اور امریکہ کی پرانی زبان کے بڑے ماہر ہیں، اس کتاب کا خلاصہ انگریزی رسالہ "ورلڈ ٹوڈے" کے فروری ۱۹۲۶ء میں چھپا تھا، جس کا عربی ترجمہ المقتطف اگست ۱۹۲۶ء میں اور اردو ترجمہ معارف اگست ۱۹۲۶ء اور پھر اگست ۱۹۲۷ء میں طبع ہوا،

وینیر کی تحقیقات کا حیرت انگیز نتیجہ یہ نکلا ہے کہ امریکہ کی اصلی زبان میں انگریزی، فرانسیسی، ہسپانی، اور پرتگالی زبانوں سے بہت پہلے جس زبان کے الفاظ ہیں، وہ عربی زبان ہے، یہ الفاظ ان کی تحقیق کے مطابق ۱۲۹۰ء کے قریب اس میں داخل ہوئے ہیں، اور کولمبس نے امریکہ کی دریافت کا شور اس کے ٹھیک دو سو برس بعد مچایا ہے، وینیر نے کاغذی دستا...

سے ثابت کیا ہے، کہ کولمبس سے پہلے بحر اوقیانوس میں تجارتی جہاز رانی ہوتی تھی، مگر تاجر و سوداگر بادشاہوں کے ڈر سے اپنی ان بحری مہموں کو چھپاتے تھے،

کولمبس کے خود ذاتی بیانات بھی حقیقت کی پردہ دری کرتے ہیں، وہ امریکہ کے تیسرے سفر سے واپسی کے بعد بیان کرتا ہے، کہ اسے وہاں زنگی سوڈانی باشندوں سے سابقہ پڑا، بلکہ پہلے سفر کے بعد ہی وہ کہتا ہے، کہ وہاں کے اصلی باشندوں نے اسے گنی (یعنی وہی مغربی افریقہ کے طلائی سکے جس کو ایک خاص مقدار میں تانبہ ملاکر بناتے تھے) دکھائی " گونینس" اس وقت کی افریقی کی زبان میں سونے کے ان ٹکڑوں کو کہتے تھے، جن کی شکل میں سونا ساحل گنی (غانہ) سے یورپ میں لایا جاتا تھا قدرتی طور پر سونے کے یہ ٹکڑے دیکھ کر کولمبس متحیر ہوگیا، کیونکہ وہ دراصل اسی سونے، ہاتھی دانت، اور قیمتی سامان کی تلاش میں یہاں تک آیا تھا، اس نے امریکہ کے باشندوں سے دریافت کیا، کہ ادھوں نے وہ سونا کہاں سے پایا، اس کے جواب میں انھوں نے کہا "ہم نے یہ سونا کالے سوداگروں سے لیا ہے، جو جنوب مشرق سے یہاں آئے تھے" کولمبس کو گمان ہوا، کہ وہ سونے کی اصلی کان بتانے سے گریز کرتے ہیں، تیسرے سفر میں اس نے پھر وہی سوال کیا، اور وہی جواب پایا، اور آخر بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا، کہ پرانے امریکیوں کے جواب درست تھے، ابتدائی گونینس" جو فرانسیسی اور پرتگالی گنی کے ساحل سے لاتے تھے، خالص سونے کے نہیں ہوتے تھے، بلکہ غانہ والے اس میں اسی کے برابر تانبہ ملا دیتے تھے، جب کولمبس کی لائی ہوئی گونینس کا کیمیائی امتحان کیا گیا، تو اس میں سونے اور تانبے کا وہی تناسب نکلا جو غانہ (گنی) کے لائے ہوئے گونینس میں تھا،

یہ طلائی ٹکڑے دراصل افریقہ ہی سے آئے تھے، ایسے ہی جو حبشی اسکو وہاں ملے وہ افریقہ ہی سے آئے ہونگے، جہازوں کے کپتانوں کے ہر سفر سے پایا جاتا ہے، کہ ان غلاصی حبشیوں کی

موجودگی ضروری تھی، وہ بطور ترجمان استعمال کئے جاتے تھے، کولمبس بھی ان میں سے چند کو پہلے سفر میں ساتھ لے گیا تھا، امریکہ جاکر اسے معلوم ہوا کہ ایسے حبشی وہاں پہلے سے موجود ہیں یہی وہ لوگ تھے جن کو جنوب مشرق کے سیاہ سوداگر کہا گیا تھا، انہی کیساتھ غانہ کے سکے امریکہ پہونچے تھے، اور انہی کے ساتھ عربی الفاظ، عربی پودے، اور عربی تہذیب وہاں پہنچی،

پہلے آثارِ قدیمہ کے ماہرون کا یہ تنہا بیان تھا، اور اب زبانوں کے محقق بھی ان کے ساتھ مل گئے ہیں، اور دونوں کا متفقہ دعوی ہے کہ امریکہ میں عربی تہذیب کا اثر کولمبس سے بہت پہلے پایا جاتا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نئی دنیا افریقی عربی تمدن سے بہت حد تک متاثر ہو چکی تھی

امریکہ کی پرانی قوموں میں دو ممتاز نام ملتے ہیں، "ازٹ" اور "مایہ" جو افریقہ کی عربی تہذیب کی حامل تھیں، معلوم نہیں، ان کی اصلیت کیا ہے، مگر یہ نام صحیح عربی ناموں کی تحریف معلوم ہوتی ہے، پہلا نام ازد ہے، اور دوسرا نام معاویہ ہے، ازد کی نسبت پہلے ہم لکھ چکے ہیں[1]، کہ یہ لوگ ابتدائے اسلام میں عمان سے افریقہ اور مڈگاسکر کے بحری جہاز ران تھے، اور بہادری سے اپنے جہاز بحر بربرہ میں چلایا کرتے تھے،

بہرحال رسالہ مذکور وینیر کی تحقیق کا خلاصہ آگے ان الفاظ میں دیتا ہے،:-

"ازٹ اور مایہ کی تہذیبیں دراصل امریکہ میں افریقہ کی عربی تہذیب کی نقلیں تھیں، اور ان کا زمانہ ۱۱۵۰ھ سے ۱۲۰۰ء تک قرار دیا جاتا ہے"،

ہم نے مغرورین کے سفر کا جو زمانہ لکھا ہے، وہ اسی کے قریب قریب ہوتا ہے،:-

"عربی تہذیب نویں صدی عیسوی میں اپنے معراج پر تھی، اور ۱۰۰۰ء میں صحرائے اعظم کو عبور کرکے افریقہ کے مغربی منڈینگو (Mandingo) کا تجارتی صوبہ قائم کرچکی

---

[1] عربوں کی جہاز رانی صفحہ ۱۷۶

تھی، اس کے مقابل میں امریکہ کا صوبہ میچوکن¹ (Michoacan) تھا جو خلیج میکسیکو کے ساحل پر واقع تھا، عربی الفاظ کی آمیزش سب سے پہلے میچوکن میں پائی جاتی ہے، اور وہ الفاظ منڈینگو کی زبان میں ملتے ہیں، اور یہ امر خاص طور پر ذکر کے قابل ہے، کہ یہ الفاظ ایسے ہیں، جو ایک تجارتی کارندہ یا سیاح استعمال کرتا ہے، مثلاً جادو، ادویہ، مذہب اور نظام حکومت کے متعلق،

یہ نتیجہ کہ منڈینگو اور میچوکن کے درمیان آمدورفت بھی لابدی ہے، ہر طرح تازہ تحقیقات سے اسکی تائید ہوتی ہے، ازٹ اور مایہ کی تہذیبوں کا یکلخت انحطاط اس کا ایک اور ثبوت ہے، چونکہ یہ ایک طرح کی نوخیز تہذیبیں تھیں جس وقت ان کا اپنے اصلی مرکز سے قطع تعلق ہو گیا، ان میں تنزل آنا شروع ہو گیا، یہ امر کہ یہ تعلق صرف تجارتی تھا، اس بات سے ثابت ہوتا ہے، کہ عربی تہذیب کا اثر میچوکن میں داخل ہو کر صرف تجارتی راستوں کے آس پاس ہی پایا جاتا ہے، اور یہ صرف خالص عربی کا اثر تھا

اگر مسٹر ونیر کی ان لسانی تحقیقات کے نتائج درست ہیں، تو ہم نے انکی تصدیق کیلئے جو مقدمات گذشتہ صفحوں میں فراہم کئے ہیں، وہ بھی قابل قبول ہیں،

پرانے عربوں کی امریکہ میں آبادی،

اس نظریہ کو سن کر لوگوں کا بجا سوال تھا، کہ اگر یہاں کولمبس سے پہلے عربوں کی آمدورفت تھی، تو امریکہ میں ان کے نشانات کیوں نہیں ملتے، اور انکی کسی نوآبادی کا پتہ یہاں کیوں نہیں لگتا، مگر خدا کی قدرت دیکھئے، کہ عین اس وقت جب یہ سطریں زیر تحریر تھیں، امریکہ کے عربی اخبار "الہدیٰ" نے ایک نیا انکشاف دنیا کے سامنے پیش کیا، جسکی صدائے بازگشت سے دنیا گونج گئی، اور خود ہندوستان کے اردو اخبارات نے

---

¹ میکسیکو میں ایک ریاست، بحر الکاہل (پاسفک) سے ملحق،

اس کے اقتباسات دسمبر ۱۹۳۰ء میں شائع کئے، براعظم امریکہ میں وہاں کی مہذب ریاستوں اور متمدن ملکوں کے علاوہ بہت سے ایسے پہاڑی مقامات، جنگل اور گاؤں ہیں، جہاں اس براعظم کے پرانے باشندے آباد ہیں، اور جو ابتک اپنی وہی پرانی قبائلی زندگی بسر کر رہے ہیں، اور جہانتک اب تک کسی یورپین سیاح کے قدم نہیں پہونچے ہیں خصوصیت کیساتھ یہ مقامات مکسیکو کے علاقہ میں زیادہ ہیں، اخبارات راوی ہیں[1]:-

"ایک شامی عرب تاجر مکسیکو کے چاپاس اور بٹاسلا کے صوبوں میں پھیری کرکے سوداگری کا مال بیچتا تھا، حال میں اتفاقاً اس کا گذر ایک کوہستانی علاقہ میں ہوا، جہاں آمد و رفت جاری نہیں تھی، چلتے چلتے وہ ایک جنگل میں پہنچا، وہاں ایک قبیلہ دیکھا، رات ہو چکی تھی، سوداگر نے اپنی زبان میں ان جنگلی باشندوں سے شب بھر رہنے کی درخواست کی، اس کے جواب میں ایک شخص نے عربی میں کہا کہ ہم لوگ تمھاری بولی نہیں سمجھتے، عرب سوداگر اس جنگل میں عربی زبان سن کر حیرت میں آگیا، اس نے ان سے عربی میں گفتگو کی، اور انھوں نے کہا کہ وہ صدیوں سے اس جنگل میں آباد ہیں، اور عربی کے سوا کوئی دوسری زبان نہیں جانتے"

سوداگر مذکور کا بیان ہے، کہ یہ قبیلہ اب تک اپنے عربی رسم و رواج پر قائم ہے، اور خالص عرب ہے، یہ خبر مکسیکو کی حکومت کو معلوم ہوئی، تو اس نے ایک کمیشن اس عرب قبیلہ کی تحقیق حال کے لئے روانہ کیا ہے،

یہ قبیلہ چار سو برس سے زیادہ سے یہاں آباد ہے، اور دوسرے ہمسایہ قبیلوں سے الگ

[1] المقطم دسمبر ۱۹۲۰ء، والمسار مورخہ ۲۰ر شعبان ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۰ر جنوری ۱۹۳۱ء و پیام کلکتہ مورخہ ۲۷ر دسمبر ۱۹۳۰ء،

تنگ زندگی بسر کرتا ہے،

اس خبر سے عرب جغرافیہ نویسوں کے بیانات اندلس اور پرتگال کے عرب "مغرورین" (فریب خوردہ جہاز رانوں) کی کہانیوں کی تصدیق ہوتی ہے،

اس سلسلہ کی اخیر خبر یہ ہے، کہ لبنان کے عیسائی فاضل انطون یوسف بشارہ نے جنھوں نے مکسیکو میں سکونت اختیار کرلی ہے، مصر کے اخباروں میں پچھلے سال یہ اطلاع شائع کی ہے، اور جو الفتح مصر مورخہ ۳۰ رجمادی الاولی ۱۳۵۷ھ ص ۲۲۶ میں چھپی ہے، کہ وہ مکسیکو میں اپنی زمین واقع ریوکرسی (مکسیکو) میں کھدائی کرارہے تھے، کہ ان کو دو معدنی ٹکڑے ملے، جو تحقیق کے بعد عربی سکے ثابت ہوئے، اس دریافت کا وہاں کے علمی حلقوں میں بڑا چرچا ہے،

کولمبس اور امریکہ | یہ تحقیق تو الگ رہی، مشہور یوں ہی ہے کہ کولمبس پہلا شخص ہے جس نے اس نئی دنیا کو پرانی دنیا سے ملایا، مگر اس نے جو کچھ پایا، اتفاقیہ پایا کہ ع

آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے،

کولمبس ہندوستان اور چین کی تلاش میں تھا، کہ امریکہ پہونچ گیا، کسی علمی استدلال سے وہ اس نتیجہ پر نہیں پہونچا، اور بقول ایک اطالوی عالم ہیئت اور مستشرق کرلونلینو کے کہ "کولمبس عربوں کی مقدار مسافت اور میل کے صحیح اندازہ کے نہ جاننے کی مبارک غلطی سے امریکہ پہنچ گیا" فاضل اطالوی عالم کی اصل عبارت عربی کا ترجمہ یہ ہے:-

"لاطینی کتابوں کے عربی ترجموں کے ذریعہ سے مامون نے ایک درجہ فلکی کی پیایش کا جو اندازہ نکالا تھا یعنی ۵۶ ⅔ میل، وہ یورپ میں بھی مشہور ہوا، اور جس طرح یونانی اور سریانی کتابوں کے عربی ترجمہ کے ذریعہ سے یونانی میل کی مقدار نہ جاننے کی وجہ سے اہل عرب نے غلطی کی، اسی طرح چودھویں اور پندرھویں صدی میں عربی میل کی

صحیح مقدار نہ سمجھنے کے سبب سے اہل یوروپ غلطیوں میں مبتلا ہو گئے، انہی میں کرسٹوفر کولمبس امریکہ کا پتہ لگانے والا بھی تھا، اس نے ایک درجہ کے ۵۶ ۲/۳ عربی میل کو لاطینی ۵۶ ۲/۳ میل سمجھ کر مغربی یوروپ اور ایشیا کے شرقی سواحل کی مسافت اس سے بہت کم سمجھی جو حقیقت میں ہے، اگر یہ غلطی نہ ہوتی، تو کبھی ممکن نہ تھا، کہ مغربی یوروپ سے اوقیانوس میں چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں بیٹھکر صرف چند مہینوں کی خوراک لیکر چین پہونچنے کا تخیل کرتا، آخر اس سفر سے رُک کر وہ اس غلطی کی بدولت امریکہ کے جدید براعظم میں پہونچ گیا جس نے ایک نئی انسانی دور ترقی کا آغاز کیا، یہ غلطی کیسی مبارک تھی جس نے دنیا کو عظیم الشان فوائد سے مالا مال کر دیا"[۱]

کولمبس اس وقت ظاہر ہوا، جب اہل اسپین اندلسی عربوں سے آخری لڑائی لڑ رہے تھے اور انکو اپنے ملک سے نکال رہے تھے اسکا زمانہ اسپین اور پرتگال میں گذرا ایک معمولی سیاح سو جہازران تک پہنچا وہ ہیئت جغرافیہ اور سفرنامہ کی کتابیں پڑھا کرتا تھا، ایک اسپینی خاتون سے شادی کی، اس ذریعہ سے اسپین کے ایک عیسائی خانقاہ کے جغرافیہ دان راہب سے ملا، پھر اس کا پیشہ یہ ہو گیا، کہ وہ جہازرانوں کے لئے بحری نقشے تیار کر کے فروخت کرتا تھا، اور بحری مسافروں اور جہازرانوں سے معلومات جمع کرتا تھا، ٹھیک اسی عربی اور اسپینی لڑائی کے زمانہ میں وہ ملکہ اسپین سے نئے جزیرہ اور نئے بحری راستوں کے لئے مدد کا طالب ہوا، اس زمانہ میں اسپین اور پرتگال کی عیسائی موروں، (مسلمان عربوں) کو نہ صرف اسپین، بلکہ تمام سواحل و جزائر سے نکالنے کے لئے بڑے بڑے بحری بیڑے بھیج رہے تھے، سواحل بحر محیط سے لیکر کل سواحل افریقہ سے یہانتک کہ عرب اور ہندوستان کے سواحل تک سے عرب جہازرانوں کو لڑ لڑ کر نکال رہے تھے، اور ان کو

[۱] خطبات علم الفلک عند العرب صفحہ ۲۹۲

بحری نقشے حاصل کرتے تھے، وہ سونے کی کان والے افریقی ساحل تک بھی گیا تھا، جہاں افریقی اور زنگی ملاح بکثرت پرتگالیوں کو ملتے تھے،

بہرحال اس زمانہ میں یوروپ اور خصوصاً اسپین اور پرتگال میں علم ہیئت، ہندسہ، جغرافیہ اور بحری سفر کے معلومات جو کچھ تھے، وہ عربی تصنیفات یا ان کے تراجم کے ذریعے تھے جیسا کہ اس عہد کی تاریخوں میں مورخین نے بیان کیا ہے، اور اس طرح کولمبس اپنے نظریہ کی ترتیب و تکمیل میں تمامتر عربوں ہی کی تحقیقات سے مستفید ہوا،

ارمغانِ احباب

یعنے

دلی اور اسکے اطراف

آج سے پنتالیس برس پہلے

از مولینا حکیم سید عبد الحئی صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء

(۴)

مدرسہ — روز شنبہ ششم شعبان، صبح کو کھل گیا، ہم اطمینان سے حوائجِ ضروری سے فارغ ہوئے اس کے بعد مدرسہ گئے، امتحان ہو رہا تھا، پرچے تقسیم کر دیئے گئے تھے اور طلبہ جوابات لکھ رہے تھے، سب طلبہ الگ الگ بٹھائے گئے تھے، چار دن سے امتحان ہو رہا تھا، ابھی کم سے کم دس بارہ دن تک ہوگا، تقریبًا تین سو طلبہ مدرسہ میں ہیں، اکثر مدرسہ کے مکانوں میں رہتے ہیں اور بعض مسجدوں میں ان میں دو سو سے زیادہ باہر کے ہیں، اور ڈیڑھ سو ان میں وہ ہیں جن کے خورد و نوش کا مدرسہ متکفل ہے، کپڑے اور جوتہ اور فرش و روشنی وغیرہ کا سامان بھی مدرسہ سے دیا جاتا ہے، جاڑے میں جڑاول بھی ملتی ہے، بہرحال تمام ضروریات کا متکفل مدرسہ ہے، اور پچاس وہ ہیں، جو اپنے پاس سے کھاتے ہیں،

مدرسین — اس مدرسہ میں سات مدرس عربی کے ہیں جن کو تنخواہ ملتی ہے اور ایک مدرس بلا تنخواہ بطور اعانت کے پڑھاتے ہیں، مدرسین عربی میں سے مدرس اوّل مولینا محمود حسن صاحب ہیں، یہ بزرگ مولوی

ذو الفقار علی صاحب ادیب مشہور کے صاحبزادے ہیں، اور مولینا قاسم صاحب مرحوم کے عمدہ شاگردوں میں ہیں، ان کی استعداد ہر فن میں خصوصاً دینیات میں اعلیٰ درجہ کی ہے، سب طالب العلم انکی تعریف کرتے ہیں، دوسرے مولوی خلیل احمد صاحب ہیں، جو مدرس دوم ہیں، یہ مولینا مملوک العلی صاحب کے نواسے اور مولینا محمد یعقوب صاحب کے بھانجے ہیں، یہ بھی فاضل مستعد ہیں، تیسرے مولوی غلام رسول ہیں، یہ ولایتی ہیں، عقلیات میں ان کی استعداد بہت اچھی ہے، اور اکثر فلسفہ بھی پڑھاتے ہیں، چوتھے مولوی حافظ احمد صاحب مولینا محمد قاسم صاحب کے صاحبزادے ہیں، پانچویں مولوی عزیز الرحمن صاحب ہیں، یہ مفتی مدرسہ ہیں، کار افتا انہی کے متعلق ہے، اسی طور پر اور مدرسین ہیں، دو مدرس فارسی کے ہیں، اور دو قرآن مجید کے، ایک مہتمم مدرسہ ہے، آجکل مولوی محمد منیر صاحب ہیں، یہ مولینا مظہر صاحب مرحوم و مولوی محمد احسن صاحب نانوتوی کے چھوٹے بھائی ہیں، دفتر انہی کے متعلق ہے، دفتر میں دو محرر ہیں، ایک جلدساز، ایک دربان، ایک خاکروب، ایک حجام، ملازمین کی تنخواہ کی میزان کل [1] دسہزار دوسو چونسٹھ روپیہ ہے،

ارباب شوری | ارباب شوریٰ آٹھ اشخاص ہیں، حضرت مولینا رشید احمد صاحب سرپرست مدرسہ جناب حاجی محمد عابد صاحب، جناب مولوی ذوالفقار علی صاحب، جناب مولوی محمد احسن صاحب نانوتوی، جناب حکیم ضیاء الدین احمد صاحب رامپوری، حاجی شیخ ظہور الدین صاحب دیوبندی، حاجی منشی فضل حق صاحب، جناب مولوی فضل الرحمن صاحب دیوبندی،

کتب خانہ | انتظام مدرسہ کا نہایت معقول ہے، دفتر بہت صاف ہے، کتب خانہ نہایت آراستہ ہے، کتب خانہ میں تقریباً چھ ہزار جلدیں ہیں، اکثر مطبوع کتابیں اور اکثر کتابوں کے نسخے

---

[1] اس موقع پر جو رقم لکھی ہوئی ہے، صاف نہیں چلتی، دسہزار بھی پڑھی جا سکتی ہے، اور بیس ہزار بھی، اس میزان کے ساتھ دوسو چونسٹھ روپے کی رقم صاف لکھی ہوئی ہے، یہ سالانہ خرچ ہوگا،

بہت زائد ہیں، مثلاً بخاری شریف کے نسخے ۲۰ سے زیادہ ہیں، کہ وقت ضرورت کے منگانے کی حاجت نہیں پڑتی،

امتحان | افسوس ہے کہ میں ایسے وقت میں پہونچا کہ امتحان ہو رہا تھا، تدریس کا لطف حاصل نہیں کر سکا، لیکن حال امتحان کے پرچوں کے دیکھنے سے معلوم ہوا، کہ طالب العلم اچھے مستعد ہیں، اور کو دیکھ کر میں دیر تک کتب خانہ میں بیٹھا رہا، وہیں امتحان کے پرچے جانچے جاتے تھے، مولوی محمود حسن صاحب و مولوی خلیل احمد صاحب جانچ رہے تھے، وہاں سے اٹھکر حاجی محمد عابد صاحب کے پاس آیا، تھوڑی دیر بیٹھا رہا، اسی اثنار میں مولوی صاحب کا آدمی بلانے آیا، وہیں سے میں اور بھائی جی اٹھکر مولوی محمود حسن صاحب کے مکان پر آیا،

مولنا محمود حسن صاحب کے یہاں دعوت | مولنا ذوالفقار علی صاحب اور اکثر بزرگانِ دیوبند بیٹھے ہوئے تھے، مولنا ذوالفقار علی صاحب نے نہایت فراخدلی سے ہم لوگوں کا خیر مقدم کیا، اور ملکر صدر مقام میں باوجود ہم لوگوں کی معذرت کے بٹھایا، اس کے بعد فرمایا کہ جس وقت میں نے سنا کہ رائے بریلی سے کوئی صاحب آئے ہیں، تو میں سمجھ گیا تھا کہ صاحبزادے ہوں گے، کیونکہ علم سے ان لوگوں کو ہمیشہ سے مناسبت ہے، پھر انھوں نے ایسی باتیں شروع کیں، جسکو سن سنکر شرم و ندامت سے ہمارے سر جھکے جاتے تھے، اور جتنے وہاں بیٹھے تھے، انھوں نے ایسا اظہارِ عقیدت کیا کہ ہم کو ان بزرگوں کے حسنِ ظن پر حیرت ہے، ہم لوگوں کی مخدومیت اور اپنی خادمیت کا اظہار ہر ہر بات پر فرماتے تھے، سب نے شکایت اس بات کی تھی، کہ آپ سرائے میں کیوں ٹھہرے، کیا آپ ہم کو اپنا خادم نہیں سمجھتے، یہ ہو ہی نہیں سکتا، کہ آپ سرائے میں رہیں، مولوی محمود حسن صاحب نے کہا کہ کل میں نے بہت اصرار کیا، لیکن انھوں نے مانا نہیں، مولنا ذوالفقار علی صاحب نے کہا کہ آپ نے ان کے انکار کو تسلیم ہی کیوں کیا، آخر کو آدمی سرائے بھیجا گیا، اور اسباب

اٹھوا منگایا،

حافظ احمد صاحب کا اصرار | اس عرصہ میں کھانا آیا نہایت اہتمام کیساتھ کھانا پکوایا گیا تھا، کھانے کے بعد مولوی ذوالفقار علی صاحب نے اپنے ہاتھ سے، اور مولوی محمود حسن صاحب نے بستر بچھا کر کہا کہ اب قیلولہ فرمائیں، ارادہ اسی وقت روانگی کا تھا، مگر حافظ احمد صاحب خلف الرشید مولانا محمد قاسم صاحب علیہ الرحمۃ نے نہایت اصرار کیساتھ شب کی دعوت کے نسبت فرمایا، ان کی استدعا ایسے تواضع وانکسار کیساتھ تھی، کہ مجبوراً فسخ عزیمت کرنی پڑی،

اکابر دیوبند کا تواضع | ان سب بزرگوں نے نہایت افسوس کے ساتھ ذکر کیا، کہ آپ دو دن سے آئے ہوئے ہیں، بارش کی وجہ سے ہم لوگوں کو اطلاع نہیں ہوئی، ورنہ ہم سرائے میں حاضر ہوتے، اور آپنے باوجود اس بات کے جاننے کے، کہ دیوبند میں سب ہمارے خادم ہین، یہاں فروکش ہونیسے گریز کیا، وہ یہ باتیں کررہے تھے، اور ہم شرم وغیرت کے مارے عرق عرق ہوئے جاتے تھے، اے اللہ ان بزرگوں کا یہ حسن ظن اور ہماری یہ حالت' ان کی یہ حسن عقیدت اور ہماری یہ شامت اعمال' ان میں وہ مسکنت اور غربت' ہم میں یہ خودداری اور نخوت، ان میں وہ سادگی اور بے تکلفی، ہم میں یہ تکلف اور سیہ مستی، این الثریٰ من الثریا نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا،

اکابر کے پرکیف حالات | اس کے بعد تھوڑی دیر قیلولہ کرکے اوٹھے، اور نماز کو گئے، نماز کے بعد مولوی فضل الرحمٰن صاحب ملنے آئے، عصر تک وہ بیٹھے، حافظ احمد صاحب اور مولوی حبیب الرحمٰن صاحب بیٹھے رہے، بزرگان سلف یعنی خاندان عزیزیہ[1] واحمدیہ[2] کے تذکرے ہوتے رہے، یہ بزرگ حضرت سید نا[2] کے قصص اس شیفتگی سے بیان کرتے تھے، جیسے عاشق اپنے معشوق کے حالات

---

[1] شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی [2] سید احمد صاحب بریلوی،

بیان کرتے وقت مزہ لیتا ہے،

مولینا قاسم صاحب کا مزار

عصر کے بعد حضرت مولینا محمد قاسم صاحب کے مزار پر فاتحہ پڑھنے گئے، شہر کے باہر کسی تکیہ میں ان کا مزار میدان میں کچا بنا ہوا ہی، اثنای راہ میں قاضی کی مسجد کی زیارت کی جسمیں حضرت سید صاحب فروکش ہوئے تھے،

مولینا ذوالفقار علی صاحب

وہان سے آکر مغرب کی نماز پڑہ کر مولوی ذوالفقار علی صاحب کے پاس بیٹھے رہے، ان سے علم ادب کا چرچا رہا، کچھ اپنے اشعار کچھ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب و شاہ عبد العزیز صاحب کے اشعار پڑھتے رہے، ان سے معلوم ہوا کہ مولوی مملوک العلی صاحب، مولینا رشید الدین خان[1] صاحب کے شاگرد تھے، اونھون نے بیان کیا، کہ شیخ احمد شروانی[2] نے شاہ صاحب سے ملنے کے پیشتر حدیقۃ الافراح تصنیف کی تھی، اس میں جہان شاہ صاحب کا لامیہ نقل کیا ہے، دو اعتراض سرقہ کے کئے ہیں، میں نے اسکی شکایت مفتی صدر الدین خان صاحب سے کی، مفتی صاحب نے فرمایا کہ شروانی بیچارہ شاہ صاحب کی قدر کیا جانے، مجھ سے مولینا رشید الدین خانصاحب بیان کرتے تھے، کہ جب شاہ صاحب معذور ہوگئے، اور امراض سخت میں گرفتار ہوگئے، تو مرض کی وجہ سے اکثر مدرسہ میں ٹہلا کرتے تھے، اسی درمیان میں بعض بعض لوگ سبق بھی پڑھا کرتے تھے، چنانچہ میں مقامات حریری پڑھتا تھا، آگے آگے شاہ صاحب اور پیچھے پیچھے میں مقامات لئے ہوئے پڑھتا جاتا تھا، مقامات کی عبارت دو فقری ہے، میں ایک فقرہ پڑھتا تھا، دوسرا شاہ صاحب معاً پڑہ دیتے تھے، یا تو یہ فقرہ وہی ہوتا تھا، جو کتاب کا ہے، یا اونہی کا ہوتا تھا جو کتاب کے فقرہ سے زیادہ چست اور اچھا ہوتا تھا، یہ اوس وقت کا ذکر ہے، جب شاہ صاحب کو چودہ مرض

---

[1] شاگرد شاہ رفیع الدین صاحب ۱۲۴۹ھ میں وفات پائی [2] شاہ عبد العزیز صاحب کے معاصر، ادیب شاعر تھے، یمن کے رہنے والے تھے، نفحۃ الیمن ابتدائی ادب میں ان کی مشہور کتاب ہے،

مہلک عارض ہوگئے تھے، کہ اگر ان میں سے ایک مرض بھی خدانخواستہ دوسرے کو لاحق ہو تو سلب حواس کے واسطے کافی ہے مفتی صاحب یہ بھی فرماتے تھے، کہ ایک مرتبہ قصیدہ سننے سے ان کو یاد ہوجاتا تھا، یہ بھی فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ سفر کلکتہ میں شاہ صاحب نے قاموس کا ایک نسخہ دیکھا تھا، مدتوں کے بعد نابینا ہوجانے پر وہ دہلی فروخت کے واسطے دست بدست شاہ صاحب کے مدرسہ پہونچا، شاہ صاحب نے ہاتھ میں لیکر فرمایا کہ غالباً یہ وہ نسخہ ہے، جس کو میں نے دیکھا ہے، پھر فرمایا کہ دیکھو فلاں صفحہ کے حاشیہ پر یہ عبارت تو نہیں لکھی ہے دیکھا گیا تو وہی تھی، آخر کو معلوم ہوا، کہ یہ وہی نسخہ ہے، مفتی صاحب کی یہ حالت تھی، کہ جب شاہ صاحب کا ذکر آجاتا، تو اس میں ایسے محو ہوجاتے کہ ان کے سب کاروبار چھوٹ جاتے تھے، مولینا محمد اسمٰعیل صاحب کے نسبت فرماتے تھے کہ وہ حضرت شاہ عبد القادر صاحب سے پڑھتے تھے۔ ایکبار مولینا محمد اسمٰعیل صاحب افق المبین[1] کا سبق پڑھ رہے تھے اور اسطور پر کہ دو دو چار چار ورق پڑھتے تھے کہیں خود پوچھ لیتے تھے کہیں شاہ صاحب بتا دیتے تھے، ورنہ یوں ہی پڑھتے جاتے تھے، اس زمانہ میں مولوی فضل امام صاحب[2] خیرآبادی صدر امین ہوکر دہلی آئے ہوئے تھے، اتفاق سے ایک دن وہ بھی بیٹھے ہوئے تھے، اور سبق ہو رہا تھا، وہ اس حیرت انگیز سبق کو دیکھ دیکھ کر متعجب ہو رہے تھے، اتفاقاً شاہ صاحب اثناے سبق میں کسی ضرورت سے اوٹھے، تو انھوں نے کہا صاحبزادے کیوں مصنف کی روح کو تکلیف دیتے ہو، وہ بیچارے دب چپ ہو رہے لیکن شاہ صاحب آگئے، اور انھوں نے سن لیا، فرمایا کہ مولوی صاحب اس لڑکے سے آپ کچھ پوچھئے، تو اس کا حال آپ کو معلوم ہو، پہلے تو مولوی فضل امام صاحب نے گریز کیا، لیکن آخر کو انھوں نے ایک مسئلہ افق المبین کا پوچھا، مولینا محمد اسمٰعیل صاحب نے اس کا نہایت شایستگی کے ساتھ جواب دیا، پھر انھوں نے اس کو رد کیا، پھر اونھوں نے جواب دیا، اس رد و قدح

[1] افق المبین میر باقر داماد کی فلسفہ کی انتہائی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ [2] والد مولینا فضل حق خیرآبادی

کی یہاں تک نوبت پہونچی، کہ مولوی صاحب مولینا محمد اسمٰعیل صاحب کی پیچیدہ تقریر کا غور کرکرکے جواب دینے لگے، اس وقت خاموش ہوئے،

ایک ولایتی طالب العلم صرف خیالی[1] پڑھنے کی غرض سے ہندوستان آیا، یہاں آکر اوس نے پوچھا، کہ کون سب سے زیادہ ذہین و ذکی ہے، معلوم ہوا مولینا محمد اسمٰعیل صاحب ہیں، ان کے پاس آیا، اور استدعا کی، اونھوں نے پیشتر فرصت نہ ہونے کا حیلہ کیا، آخرالامر جب اوس نے زیادہ مجبور کیا، تو فرمایا کہ اچھا فرصت کے وقت اوس نے بغل سے نکال کر ایک کتاب دی، اونھوں نے پوچھا یہ کیا ہے، اوس نے کہا خیالی کا عبد الحکیم[2] ہے، آپ نے کہا یہ کیوں یہاں چھوڑے جاتے ہو، اوس نے کہا کہ بے عبد الحکیم کے خیالی حل نہیں ہوتی، اس پر مولینا نے فرمایا کہ عبد الحکیم بیچارہ کیا ہے، جو میرے خیال میں باتیں آتی ہیں، وہ عبد الحکیم کے خیالوں سے بدرجہا بہتر ہیں، اوس نے کتاب تو اٹھالی، لیکن بہت ہی بددل ہوا، کہ جب ان کی یہ کیفیت ہو، کہ عبد الحکیم کو کچھ نہیں سمجھتے، تو خیالی خاک سمجھتے ہوں گے، لیکن چونکہ صرف خیالی ہی کی غرض سے اس نے اتنی مسافت طے کی تھی، ٹھہر گیا، اور وقتِ مقررہ پر آیا، سبق جب شروع ہوا تو اس کو معلوم ہوا، کہ واقعی ان کی نازک خیالیوں کے سامنے عبد الحکیم کوئی چیز نہیں ہے،

خیر کثیر شاہ ولی اللہ صاحب کی بہت مشکل کتاب ہے، وہ مولینا محمد اسمٰعیل صاحب ایک زمانہ میں پڑھاتے تھے، اور مطالعہ کرکے ایک مرتبہ مطالعہ کر رہے تھے، کوئی مقام سمجھ میں نہیں آیا، دل میں کہا کہ چلو چھوٹے چچا سے اس کو حل کریں، حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کی خدمت میں گئے، دم

---

[1] علم کلام میں درس نظامی کی آخری کتابوں میں ہے، تصنیف ترک مصنف ملا خیالی، [2] خیالی پر ملا عبد الحکیم سیالکوٹی کا حاشیہ،

ان سے پوچھا تو انھوں نے اسکی بہت طویل تقریر کی، لیکن ان کا اشتباہ رفع نہیں ہوا، اس کے بعد حضرت شاہ عبد العزیز صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، شاہ صاحب ٹہل رہے تھے، پوچھا کون ہے، انھوں نے فرمایا اسمٰعیل، پوچھا کہ کیسے آئے، انھوں نے عرض کیا کہ میں خیر کثیر پڑھا کرتا ہوں، ایک مقام میں شبہہ ہے چھوٹے چچا سے پوچھا، مگر تسکین نہیں ہوئی، آپ سے تسکین کرنے کی غرض سے حاضر ہوا ہوں، حضرت شاہ صاحب نے فرمایا، کہ یہ فلانا مقام ہوگا، اور میاں رفیع الدین نے یہ تقریر اسکی کی ہوگی، انھوں نے کہا جی ہاں، فرمایا اس کا یہ مطلب ہے، دو چار جملے ایسے فرمائے جس سے خیر کثیر کا بھی مطلب حل ہوگیا، اور شاہ رفیع الدین صاحب کی تقریر کا ماحصل معلوم ہوگیا۔

بیشتر حضرت مولینا عبد الحئی[۱] صاحب وعظ فرمایا کرتے تھے، اور مولینا محمد اسمٰعیل صاحب ان کے وعظ میں چپ چاپ بیٹھے رہا کرتے تھے، گویا یہ کچھ جانتے ہی نہیں، اتفاق سے مولوی عبد الحئی صاحب بڑھانہ[۲] تشریف لے گئے، لوگوں نے اصرار کیا تو ان کو منبر پر بٹھلا دیا، انھوں نے جو وعظ شروع کیا، تو لوگوں کو یہ تمنا ہوگئی کہ مولوی عبد الحئی صاحب خدا کرے دو چار ہفتہ نہ آئیں۔

ایک مرتبہ مولینا اسمٰعیل صاحب وعظ کہنے بیٹھے ہی تھے، یہ اس زمانہ میں جبکہ سید[۳] صاحب کی کفش برداری کر چکے تھے، ایک کمبخت آیا، اور اس نے مولوی صاحب کو گالیاں دینی شروع کیں، حتی کہ اس نے کہا کہ تم ولد الحرام اور ولد الزنا ہو، مولوی صاحب نے فرمایا، اور نہایت آہستگی سے فرمایا، میاں تم سے جس نے یہ کہا غلط کہا، میری ماں کے نکاح کے اب تک گواہ موجود ہیں، یہ کہکر وعظ شروع کر دیا، ایک مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کہیں جا رہے تھے اور ان کے ساتھ حکیم رستم علی بھی تھے، گو یہ بڑی شوقین داڑھی مونچھ چڑھی ہوئی رکھتے ہیں، لیکن باوجود اس کے مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کے ساتھ ان کو شغف تھا، پیچھے پیچھے یہ بھی تھے، مولوی

[۱] مولینا شاہ عبد الحئی بڑھانوی المتوفی ۱۲۴۳ھ داماد مولانا شاہ عبد العزیز صاحب [۲] بڑھانہ انکا وطن تھا۔ [۳] یعنی سید احمد بریلوی شہید رحمۃ اللہ علیہ سے مرید ہو چکے تھے۔

محمد اسمٰعیل صاحب نے کچھ دور جاکر پیچھے دیکھا تو یہ نہ تھے، لوگوں سے فرمایا دیکھو رستم علی کہاں ہیں کہیں کسی سے لڑنہ پڑے ہوں، لوگوں نے دیکھا تو واقعی ایک آدمی سے لڑ رہے تھے، سمجھا بجھا کر ان کو لائے، مولوی صاحب نے پوچھا تم کہاں رہ گئے تھے، کہنے لگے حضرت مجھ سے سنا جاتا ہے، ایک مردک آپ کو گالیاں دیتا تھا، مولوی صاحب نے فرمایا، بھائی اس کا قصور نہیں ہے، یہ ہمارے علما، کا قصور ہے، کیوں انھوں نے پہلے ہی سے واشگاف بیان نہیں کیا، جس کے سننے سے اب ان کو وحشت ہوتی ہے،

ایک مرتبہ مولوی فضل حق[1] صاحب کے سامنے کسی نے مولینا محمد اسمٰعیل صاحب کو برا کہا، تو مولوی صاحب نے اس کو بہت زجر و تنبیہ کی، اور کہا کہ ہماری ان کی مخالفت ایسی نہیں ہے کہ تم ایسے بازاری ان کو گالیاں دیں، مولوی ذوالفقار علی[2] صاحب فرماتے تھے، کہ مولوی فضل امام صاحب و مولوی فضل حق صاحب باوجود عصبیت کے ناانصاف نہیں تھے، جب حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تشریف آوری کی خبر مشہور ہوئی، تو دیوبند کے بوڑھے بوڑھے لوگ استقبال کو نکلے، شہر کے باہر ایک بزرگ کا مزار ہے، وہاں تک پہونچے، کہ سید صاحب نظر آئے، ایک ٹانگن پر سوار تھے، اور دونوں طرف دو شخص رکاب تھامے ہوئے چلے آتے تھے، ان لوگوں نے آگے بڑھکر ملاقات کی، اس وقت ان دونوں بزرگوں کی ظاہری وضع و ہیئت سے یہ نہ معلوم ہوتا تھا، کہ یہ کون ہیں، سید صاحب نے فرمایا کہ ان سے ملو، یہ مولینا محمد اسمٰعیل اور مولینا عبدالحئی ہیں،

سید صاحب جب نانوتہ[3] تشریف لے گئے، تو پہلے سے میاں وجیہ الدین یعنی مولوی محمد قاسم صاحب کے خسر نے دعوت کا سامان کیا تھا، اونھوں نے یہ خیال کیا تھا کہ سید صاحب کے ساتھ بیس پچیس آدمی ہوں گے، انھی کے واسطے سامان کیا تھا، جب سید صاحب تشریف

---

[1] مولوی فضل حق خیرآبادی [2] مولوی ذوالفقار علی صاحب شیخ الہند کے والد بزرگوار،
[3] نانوتہ سہارنپور جہاں مولینا محمد قاسم صاحب کا وطن تھا،

لے گئے، تو ان کے ساتھ جلال آباد کے پٹھانوں کا ایک گروہ تھا، میاں وجیہ الدین یہ دیکھ کر دنگ ہو گئے
انھوں نے خیال کیا کہ سامان تھوڑے آدمیوں کا کیا ہے، اور ان کے ساتھ ایک انبوہ ہے، کیونکر
کافی ہوگا، خصوصًا اس وجہ سے اور ان کو پریشانی ہوئی، کہ نانوتہ ایسا گاؤں ہے، جہاں دفعتہً
زیادہ سامان کا فراہم ہونا بہت دشوار ہے، آخر شدہ شدہ یہ خبر سید صاحب کو پہونچی، سید صاحب
نے ان کو بلا کر فرمایا کہ آپ گھبرائے نہیں اپنی چادر دیدی، کہ اس کو کھانے پر ڈھانک دو اور اس کے
نیچے سے نکال نکال کر صرف کرو، انھوں نے ایسے ہی کیا، اور وہ کھانا سب کو کافی ہو گیا،

مولینا ذوالفقار علی صاحب فرماتے تھے، کہ سید صاحب اس نواح کے اکثر قصبہ جات میں تشریف
لے گئے ہیں، لیکن جہاں جہاں تشریف لے گئے ہیں، وہاں اب تک خیر و برکت ہے، اور دو ایک گاؤں
اور قصبہ ایسے ہیں، جہاں نہیں گئے، وہاں اب تک وہی نحوست اور شامت باقی ہے، چنانچہ منگلور
میں نہیں گئے، وہاں کے لوگوں میں وہی جہالت اور قساوت ہے، اور ایک مختصر گاؤں ہے، جہاں
مسلمانوں کے دو چار گھر ہیں، اتفاقًا سید صاحب کسی ضرورت سے وہاں بھی گئے ہیں، وہاں بھی خیر و
برکت پائی جاتی ہے، گویا ایک نور مستطیل ہے، کہ جدھر وہ گئے، ادھر وہ پھیل گیا ہے،

اسی قسم کے بہت قصے مولینا نے فرمائے، جو اس روسیاہ کو یاد نہیں رہے، اتنے ہی میں
مولوی احمد[۱] صاحب لالٹین لے کر آگئے، اور کہا کہ کھانا تیار ہے، غریب خانہ تک چلئے، وہاں جا کر
کھانا کھایا، کھانے میں بڑا تکلف اور اہتمام کیا تھا، کھانے کے بعد پھر سید صاحب کا تذکرہ شروع
ہوا، مولوی محمود حسن[۲] صاحب و مولوی حبیب[۳] الرحمن صاحب وغیرہ بھی شریک تھے، یہ لوگ ایسی
شیفتگی سے بیان کر رہے تھے، جس کو دیکھکر حیرت ہوتی تھی، ان بزرگوں نے بالاتفاق بیان کیا

---

[۱] مولوی حافظ احمد صاحب بن مولینا محمد قاسم صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند [۲] حضرت شیخ الہند مولینا محمود حسن صاحب [۳] مولینا حبیب الرحمن صاحب سابق مہتمم دوم دارالعلوم دیوبند،

کہ مولینا محمد قاسم صاحب کو سید صاحب کیسا تو ایسی عقیدت تھی، کہ ان کے ادنی ادنی ہمراہیوں کے ساتھ وہ باادب پیش آتے تھے، اگر سید صاحب کے متعلقین میں سے کوئی شخص ملتا تھا، تو اس سے ایسا ملتے تھے، جیسا کوئی عقیدت مند مرید اپنے پیر و مرشد سے یا خادم اپنے آقا سے،

ایک شخص حاجی شجاعت خان سید صاحب کے قافلہ کے رامپور سے باہر عزلت نشیں ہو چکے تھے، وہ کسی سے نہیں ملتے تھے، جب مولینا محمد قاسم صاحب کا تذکرہ مشہور ہوا تو انھوں نے ان کے نام ایک خط لکھا کہ میں نہایت ضعیف ہوں، کہیں آجا نہیں سکتا، لیکن آپ کے دیکھنے کو ایسا دل چاہتا ہے، کہ بے اختیار جی میں آتا ہے، ڈولی پر بیٹھ کر چلا آؤں، مگر چونکہ آپ سفر میں بھی رہتے ہیں، اسلئے اس خط کے ذریعہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کہاں ہیں، ٹھیک مقام سے اطلاع دیجئے،

مولینا محمد قاسم صاحب کو جب یہ خط پہونچا، تو ان کو بہت تشویش ہوئی، انھوں نے کہا کہ من آنم کہ من دانم، معلوم نہیں کہ اس بزرگ سے میرا حال کس نے کس طور پر بیان کر دیا ہے جس سے وہ میرے ملنے کے مشتاق ہوئے ہیں، ان کو لکھ دیا کہ میں تو اس قابل نہیں ہوں، کہ آپ مجھ سے ملیں لیکن اگر آپ کا دل چاہتا ہے تو میں خود حاضر ہوں گا، جب مولینا صاحب شاہجہاں پور[1] تشریف لے گئے، تو بعد فراغت کے وہاں سے رامپور بھی گئے، اور حاجی شجاعت خاں کے یہاں پہونچے، وہ گھر میں تھے اطلاع ہوئی، فوراً نکل آئے، ملکر بہت خوش ہوئے، آنکھوں سے معذور تھے، پوچھا کوئی ہے تو نہیں، مولوی صاحب نے کہا دو آدمی ہیں، مولوی احمد حسن صاحب[2] امروہی اور ایک اور شخص تھے، ان سے کہا تم باہر چلے جاؤ، جب وہ باہر نکلے تو کواڑ بند کر لئے، دو گھنٹے اندر رہے معلوم نہیں کہ کیا معاملات ہوتے رہے، مولوی احمد حسن صاحب نقل کرتے تھے، کہ ہم نے کواڑوں میں بہت کان لگائے، مگر کچھ معلوم نہیں ہوا،

---

[1] شاید شاہجہاں پور کے مشہور مناظرہ کے وقت [2] مولینا احمد حسن صاحب امروہوی مولینا قاسم صاحب کے شاگرد خاص،

سب نے بالاتفاق بیان کیا کہ سید صاحب کے اکثر دیکھنے والے بیان کرتے تھے، کہ مولوی قاسم صاحب خلقاً و خُلقاً مولینا محمد اسمٰعیل صاحب سے بہت مشابہ ہوئے ہیں، سید صاحب کے دیکھنے والوں نے انقراض صحبت کے بعد پھر کسی کا وعظ نہیں سُنا، البتہ اگر کبھی اتفاق ہوا، تو مولوی صاحب مرحوم کا وعظ سُنا کرتے تھے، اور کہتے تھے، کہ ان کا وعظ مولینا محمد اسمٰعیل صاحب کے وعظ سے بہت ملتا ہے۔ اس کے بعد کچھ حضرت سید صاحب کے غیبوبتہ[1] و ظہور کا ذکر ہوا، ان سب لوگوں نے اس بے بضاعت سے پوچھا، میں نے کہا کہ اس میں تو شک نہیں کہ سید صاحب نے اس قسم کی پیشین گوئیاں فرمائی تھیں لیکن وقوع میں اب تک اشتباہ ہے، مولوی محمود حسن صاحب نے فرمایا، یہی ہمارا اور ہماری بزرگوں کا مسلک ہے، پھر اُنھوں نے نہایت معتبر ذریعہ سے یہ قصہ سنایا، اور سب حاضرین نے اس پر اتفاق کیا، حدثنا الشیخ الصالح محمود حسن والحافظ احمد بن مولینا محمد قاسم والمولوی حبیب الرحمن وکلھم ثقۃ قالوا حدثنا شیخنا الثقۃ الصدوق الحجۃ مولانا رشید احمد الگنگوھی حدثنا الشیخ الزاھد المتقی الاورع الحجۃ مولانا مظفر حسین الکاندھلوی قال سمعت من شیخنا و مولینا السید احمد عشرۃ امور وقعت منھا تسعۃ و بقیت واحدۃ وھو غیبوبتہ و ظھورہ رحمہ اللہ تعالیٰ واللہ اعلم، یعنی حضرت مولینا رشید احمد صاحب کی زبانی سنا وہ فرماتے تھے کہ ہم نے مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی سے سنا، وہ فرماتے تھے، کہ ہم نے سید صاحب کی زبان سے دس پیشینگوئیاں سنیں، نو ان میں سے واقع ہو چکی ہیں، اور ایک باقی ہے، وہ پیشین گوئی آپ کی غیبوبتہ اور ظہور کے بارہ میں ہے، یہ بھی مولوی مظفر حسین صاحب فرماتے تھے، کہ قبل اس واقعہ کے سید صاحب مبہم باتیں کیا کرتے تھے، اس قسم کی کہ بندہ کو مولیٰ کی رضامندی کا خیال رکھنا

[1] حضرت سید احمد صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۲۴۶ھ میں بالاکوٹ (سرحد میں) جب سکھوں کا مقابلہ کیا اور مجاہدین کو شکست ہوئی، اور مولینا اسمٰعیل شہید ہوئے اسوقت سید صاحب کے معتقدوں میں دو گروہ ہو گئے تھے، ایک کا خیال تھا کہ سید صاحب شہید ہو گئے، دوسرے کا خیال تھا کہ وہ مخفی ہو گئے ہیں اور عنقریب انکا ظہور ہوگا۔

چاہئے، جیسا حکم ہو ویسا کرتے، اگر کمل اوڑھنے کا حکم ہو تو کمل اوڑھ لے، اور اگر اور کچھ حکم ہو تو وہ کرے، میں نے کہا حضرت صاف صاف بیان کیجئے جو کچھ بیان کرنا مقصود ہے، لیکن سید صاحب نے اس سے گریز کر کے پھر تھوڑی دیر میں وہی کہنا شروع کیا،

مولوی ذوالفقار علی صاحب یہ بھی بیان کرتے تھے، کہ ان اطراف میں دیکھنے والوں نے یہاں تک بیان کیا ہے کہ شب کے وقت سید صاحب چارپائی پر استراحت فرماتے تھے، اور ایک جانب مولینا عبدالحئی صاحب دوسرے جانب مولینا محمد اسمٰعیل صاحب بیٹھ کر صبح کر دیتے تھے، رات میں جس وقت سید صاحب کی آنکھ کھلتی تھی، فرماتے تھے، مولینا وہ کہتے تھے، حضرت آپ کہتے تھے فرمائے، ان کو جو پوچھنا ہوتا تھا، وہ پوچھتے تھے، سید صاحب مختصر الفاظ میں جواب دیتے پھر سوتے اور یہ دونوں بزرگ اس جواب سے مزہ لیا کرتے، اور اس کے وجد و محویت میں رہتے، پھر جب آنکھ کھلتی، پھر کچھ پوچھتے، یہ بھی کہتے تھے، کہ دیوبند میں ایک مرتبہ کسی وجہ سے صبح کی نماز میں تکبیر اولیٰ سید صاحب سے فوت ہو گئی تھی، اس دن مولینا عبدالحئی صاحب نے اسی کا وعظ فرمایا تھا، یہ بھی فرماتے تھے، اور اکثر علماے دیوبند نے بالاتفاق بیان کیا، کہ یہ مدرسہ سید صاحب کی پیشینگوئی کے موافق بنا ہے، جب وہ یہاں تشریف لائے تھے، تو فرمایا تھا، کہ مجھ کو اس قصبہ سے علم کی شعاعیں یا انوار نکلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، چنانچہ جب یہ مدرسہ اول اول کھلا ہے، قاضی کی مسجد کے پاس کھولا گیا ہے، جہاں سید صاحب رونق افروز ہوئے تھے، پھر اوس کے بعد دوسری جگہ منتقل ہوا، اور اب جہاں ہے، اس کی نسبت حضرت مجدد صاحب نے پیشینگوئی کی تھی، ایک مرتبہ اس جگہ ان کا گذر ہوا تھا، فرمایا کہ مجھ کو یہاں علم کے انوار نظر آتے ہیں، دیر تک وہاں اسی قسم کی باتیں رہیں، اوس کے بعد پھر قیام گاہ پر آئے، عشا کی نماز پڑھ کر سب رخصت ہوئے اور ہم سو رہے،

روز یک شنبہ ہفتم شعبان ۔ صبح کو اٹھکر چلنے کا سامان کیا، مولوی محمود حسن صاحب چونکہ ہفتہ کے دن دوسرے وقت ہمارے پاس بیٹھے رہے، امتحان میں نہیں گئے، اس وجہ سے آج وہ جلد رخصت ہوکر مدرسہ چلے گئے، اور مولینا ذوالفقار علی صاحب سے بھی رخصت ہوئے، مولوی حافظ احمد صاحب و مولوی حبیب الرحمٰن صاحب وغیرہ مشایعت کی غرض سے ہمراہ ہوئے، ہم نے بہت معذرت کی، لیکن انھوں نے نہ مانا، چونگی کی چوکی تک آئے، اور چلتے چلتے وعدہ کرالیا کہ پھر دیوبند واپسی کے وقت آنا، کیونکہ بارش کی وجہ سے و نیز امتحان کی جہت سے لوگوں کو ملنے کی مہلت نہیں ملی، اور بات چیت کرنے کا لطف حاصل نہیں ہوا، اس قدر مبالغہ اور اصرار کے ساتھ اونھوں نے استدعا کی، کہ ہم نے منظور کیا، انشاء اللہ تعالیٰ کے لفظ کیساتھ اگر موقع ملا، تو گنگوہ سے واپسی کے وقت ایک دن کے لئے دیوبند اوترپڑونگا، بھائی جی نے چھ روپیہ سالانہ چندہ مقررہ کیا، اور اس بے بضاعت نے بسبب کم مائگی ایک روپیہ اور ایک روپیہ برادر صاحب مخدوم مکرم مولینا سید ابوالقاسم[1] صاحب کی طرف سے ہرچند کہ ان کی جانب سے زیادہ چندہ دینے کی گنجایش تھی، مگر بے اجازت ان کے میں نے زیادہ چندہ کہنے کی جرأت نہیں کی، وہاں سے روانہ ہوکر اسٹیشن آئے، اور رڑکی کا ٹکٹ لے کر روانہ ہوگئے، ۱۱ر فی کس محصول پڑا، ۸ بجے سہارنپور پہونچے، گاڑی کے آنے میں دیر تھی، کھانا کھایا، اور بیٹھے رہے، دو بجے وہاں نماز پڑھ کر روانہ ہوئے، چار بجے رڑکی پہونچے، سرائے میں آکر ٹھہرے،

رڑکی | رڑکی اسٹیشن سے بہت دور ہے، مگر نہایت آباد اور پررونق شہر ہے، چھاونی اور گودام اور کالج یہاں کے مشہور مقام ہیں، رڑکی مدرسۂ حرب ہے، سفرمینا کی دو پلٹنیں اور چار توپخانے یہاں رہتے ہیں، ایک کے بعد دوسرے کی بدلی ہوتی رہتی ہے، جب وہ کام سیکھ لیتے ہیں، تو دوسرے

---

[1] مولینا سید ابوالقاسم صاحب ہسوی،

آتے ہیں، حافظ نور اللہ صاحب ایک کارخانہ دار ہیں، اون سے دہلی میں بھائی جی سے ملاقات ہوئی تھی، جب اونھوں نے ان کے آنے کی خبر سنی تو فوراً سرا ے میں آئے اور بمبالغہ واصرار اسباب اٹھوا ے گئے، اور بہت دھوم دھام کے ساتھ دعوت کا سامان کیا، رات بھر وہیں آسایش کیساتھ رہے

رڑکی کالج | روز دوشنبہ ہشتم شعبان، صبح کو اٹھکر حوائجِ ضروری سے فارغ ہو کر کھانا کھایا، کھا نا کھانے کے بعد کالج دیکھنے کو گئے، عجیب وغریب عمارت ہے، اور اس سے قطع نظر اوس کے طرز تعلیم میں عملی تربیت مشروط ہے، اس کے متعدد درجے ہیں، اور دونوں طرف کمروں میں بانی کالج مسٹر طامسن کی تصویر سنگی یادگار کے طور پر نصب ہے، بڑے کلاس اس میں دو ہیں، ایک اپر کلاس دوسرا لور کلاس اور ہر ایک میں دو دو درجے ہیں، اپر کلاس میں پہلا درجہ انجینیری کا ہے، اور دوسرا اور سیری کا امید وار کیلئے امتحان داخلہ مقرر ہے، کسی مدرسہ یا کالج کا سارٹیفکٹ یہاں بکار آمد نہیں ہے، امتحان داخلہ بہت سخت ہے، اس میں کامیاب ہونے کے بعد امید وار کالج میں داخل کر لیا جاتا ہے، بشرطیکہ تعداد معین سے زیادہ امید وار نہ ہوں، ورنہ بعد کامیابی امتحان کے بھی داخل نہیں ہوسکتا، پھر سال آیندہ میں امتحان کی ضرورت ہے، وہ امتحان بکار آمد نہیں ہوتا، داخل ہونے کے دو برس کے بعد اگر کسی کلاس میں کامیاب ہوگیا، تو اس کو جگہ ملتی ہے، ورنہ وہ مدرسے نکال دیا جاتا ہے، پھر وہ امتحان نہیں دیسکتا، اٹھارہ سے بائیس سال تک کی عمر مشروط ہے اور دس سے پچاس روپیہ تک اسکالرشپ ملتی ہے، مدرسہ کے گرد طلبہ کے رہنے کے لئے بورڈنگ ہاؤس اور افسروں کے لئے کوٹھیاں بنی ہوئی ہیں، ماسٹر اکثر ہندستانی اور انگریز ہیں کئی ماسٹر مسلمان ہیں طلبا اکثر مسلمان ہیں[1] ہندو اور انگریز بھی ہیں، پنجابی زیادہ ہیں، مدرسہ کے متعلق پریس کا بھی کارخانہ ہے اس میں نقشے اور مدرسہ کے زیادہ تر کاغذات چھپتے ہیں، ٹائپ کے پریس بہت اچھے ہیں ہر رنگ

---

[1] یہ اس وقت کا حال تھا، اب کیا ہے ؟

کے کاغذات چھپتے ہیں، پتھر کے پریس بھی ہیں، لیکن کوئی کاتب خوش نویس نہیں، اسکو ہم نے اچھے طور پر دیکھا، اس کے بعد کمروں میں گئے، جس میں حروف جوڑے جاتے ہیں، یا دستی نقشہ کشی وتصویر کشی ہوتی ہے، بڑے بڑے دستکار لوگ ہیں، اس میں ان کو بڑی مہارت ہے، کالج کے ہر ہر کمرہ میں جاکر اچھی طور پر اس کو دیکھا، ہندوستان کی نامور عمارتوں کے نقشے دیواروں پر آویزاں تھے، ان کی خوب سیر کی، اس کے بعد حافظ نوساللہ صاحب کارخانہ دار کے مکان پر آئے

پیران کلیر ظہر کی نماز پڑھ کر پیران کلیر دیکھنے کو روانہ ہوئے، یہاں سے پیران کلیر تین میل ہے نہر گنگ جو ہردوار سے نکلی ہے، اور کانپور میں آکر گری ہے، وہ اسی شہر میں ہو کر گئی ہے، اور پیران کلیر بھی اس کے کنارے ہے، پیران کلیر کے قریب تک نہر کے دونوں جانب زینے اور دیوار نہایت عمدہ بنی ہے، زینہ زینہ میں پیادہ پا روانہ ہوا، نہر کے کنارے کنارہ جانے میں عجیب لطف تھا، جس کو زبان وقلم ادا نہیں کر سکتے، رڑکی سے ایک میل کے فاصلہ پر ایک عجیب وجیب جگہ ہے وہ یہ کہ نہر شمال سے جنوب کو آئی ہے، اور چونکہ اس کا منبع یہاں سے بہت قریب ہے اس واسطے اس کی جگہ بہت عریض ہے، اس کا عرض گومتی سے زیادہ ہی ہے، کم نہیں ہے، اور ایک دریا مغرب سے مشرق کو بہتا ہوا اس جگہ متقاطع ہوا ہے، اس کی صورت یہ نکالی ہے، کہ دریا کا پل بہت بڑا جو پندرہ کوٹھیوں کا ہے، باندھا ہے، اس کے اوپر نہر کا عبور ہوا ہے، اس پل پر بیچ میں نہر جاری ہے، اور اس کے دونوں جانب سڑکیں ہیں، جن پر گھی اچھے طور عبور کر سکتی ہے، اب آپ اس پل کے عرض وطول کی وسعت کو خیال کر سکتے ہیں، اور یہ بھی قیاس کر سکتے ہیں، کہ پل کس قدر مستحکم بنایا گیا ہے جس پر گومتی سا بڑا دریا زور وشور سے بہتا ہے، اور اس کے دور دیہ آمد ورفت ہوتی ہے، اللہ اللہ خدا نے انسان ضعیف البنیان کو کیا قدرت عطا فرمائی ہے، بقول احمد ؎

اولوالعزمان دانشمند جب کرنے پہ آتے ہیں سمندر پاٹتے ہیں کوہ سے دریا بہاتے ہیں،

اس کی خوب سیر کرکے آگے بڑھا، راستہ میں کئی پل ملے، ان پر سے عبور کرتا ہوا پیران کلیر کے قریب پہنچا، داہنے جانب نہر کے پیران کلیر کی بستی ہے، اس میں ایک بہت بڑی درگاہ ہے، اور اس کے محاذی دوسرے جانب غیر آباد جگہ میں دوسری درگاہ ہے، یہ درگاہ اس درگاہ سے عمارت کی حیثیت سے بہت خوش منظر ہے، اس درگاہ میں جاکر فقیر فاتحہ و ایصال ثواب سے مشرف ہوا اس کے بعد وہاں سے واپس آیا، عشا کے قریب گھر پہنچا،

فقیر نے فی زعمہ یہ سمجھا تھا، کہ جہاں اس نے فاتحہ پڑھا ہے، وہ درگاہ حضرت علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، لیکن یہاں پہونچکر معلوم ہوا، کہ یہ درگاہ حضرت صابر علی کی ہے، اور حضرت علاء الدین کی درگاہ بستی میں ہے، جہاں یہ فقیر بسبب ماندگی کے حاضر نہیں ہوسکا، اور حضرت صابر علی حضرت علاء الدین کے بھانجے ہیں، مجھ کو اس بات کے سننے سے بہت افسوس ہوا گو کہ اس بات پر پورا اطمینان نہیں ہوا، لیکن زیادہ تر اس بات پر افسوس ہوا کہ میں دونوں جگہ کیوں حاضر نہیں ہوا، اب اسکی تلافی یوں ہی ہوسکتی ہے، کہ دوبارہ حاضر ہوں، اور لطف یہ ہے، کہ چونکہ فی زعمی میں اوس درگاہ کو حضرت علی احمد صابر رحمہ اللہ تعالیٰ کی درگاہ سمجھتا تھا، اس واسطے وقت ایصال ثواب اور جمعیت قلب کے اونہی کا نام لیا تھا، اور ان ہی کی طرف توجہ تھی، واللہ اعلم بحقیقۃ الحال شب کو میں باسائش تمام کارخانہ دار صاحب کے یہاں رہا،

سہارنپور | روز سہ شنبہ نہم شعبان صبح کو ارادہ روانگی کا تھا، مگر بھائی جی جس غرض سے یہاں تک آئے، وہ اب تک حاصل نہیں ہوئی تھی، اس واسطے فسخ عزیمت کی گئی، اور دوسرے وقت پانچ بجے وہاں سے سہارنپور روانہ ہوئے، بعد مغرب کے سہارنپور پہونچے، وہاں سے سیدھے محلہ چوک میں ملا عنایت اللہ خان صاحب کے مکان پر آئے، یہ بزرگ مولینا محمد قاسم صاحب کے مرید حضرت

لے مقصود تکیہ شاہ علم اللہ صاحب رائے بریلی ہے جہاں حضرت سید صاحب شہید کا وطن تھا،

کے بہت بڑے معتقد ہیں، خاص سہارنپور کے رہنے والے ہیں، اور مدت تک راسے بریلی میں تھانہ دار رہ چکے ہیں، ہمیشہ بالالتزام جمعہ کی نماز تکیہ میں پڑھتے تھے، بہت بڑے صالح اور نیک بخت ہیں کبھی رشوت نہیں لی، اور کسی قسم کی اپنے دانست میں بددیانتی نہیں کی، رات بھر یہیں رہنے کا قصد ہے، صبح کو ارادہ ہے، کہ اگر سواری کا انتظام ہوگیا، تو بشرط خیریت انشاء اللہ تعالیٰ گنگوہ روانہ ہونگے، اور بعد واپسی کے یہاں کے مدارس دیکھیں گے،

روز چہار شنبہ دہم شعبان، آج ارادہ روانگی تھا، مگر افسوس ہو کہ دس بجے گئے ہیں، اور اب تک گاڑی نہیں ملی، اسی وجہ سے ارادہ آج کا فسخ کیا گیا، ۱۱ بجے کھانا کھایا، اس کے بعد جامع مسجد کی سیر کو چلے، اور یہ بھی قصد تھا کہ حافظ قمر الدین صاحب جو پیش امام ہیں، اون سے ملئے، ان کی بڑی تعریف مولوی عبد الحی صاحب نے دہلی میں فرمائی تھی، جامع مسجد گیا، تو معلوم ہوا کہ وہ اس بے بضاعت سے ملنے گئے ہیں، ان کے انتظار میں وہاں ٹھہر گیا تھا، یہان تک کہ ظہر کے وقت وہ آگئے، نماز کے بعد اون سے ملاقات ہوئی، بڑے خلق و مروت سے پیش آئے، اسی اثنا میں مولوی احمد علی[1] صاحب تشریف لائے، اور اس خبر کے سننے سے کہ یہ روسیاہ حضرت سیدنا کے خاندان کا بدنام کنندہ ہے، نہایت خلوص و ارادت سے ملے، اور بہت دیر تک بیٹھے رہے، ان سے معلوم ہوا کہ حضرت سید صاحب کے خلفاء میں ایک بزرگ بگھرہ ضلع مظفر نگر میں اب تک بقید حیات ہیں، اور ان کے مریدون میں بھی ایک شخص سہارنپور میں موجود ہیں، وہان سے اٹھکر خاکسار مدرسہ مظاہر العلوم کی سیر کو گیا، امتحان کی وجہ سے مدرسہ آج کل بند ہے، مکان اور کتب خانہ سرسری نگاہ سے دیکھکر وہان سے قیام گاہ پر واپس آیا،

مولوی حبیب الرحمن صاحب سہارنپوری — عصر کی نماز پڑھکر مولوی حبیب الرحمن صاحب خلف

[1] مولینا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری محشی صحیح بخاری،

مولینا احمد علی صاحب مرحوم سے ملنے کو ان کے مکان پر گیا، مردانہ مکان میں سے تھے، میں وہاں جو گیا تو وہ خود کمرہ سے برآمد ہو کر باہر ہی بیٹھے، کمرہ میں جتیں پڑی ہوئی تھیں، کچھ لوگ اندر تھے، وہ بھی پیشتر اندر بیٹھے تھے، مجھ کو حیرت ہوئی، کہ یہ باہر کیوں بیٹھے، لیکن یہ حیرت جلد تر زائل ہو گئی، جب یہ معلوم ہوا کہ اندر لوگ شطرنج کھیل رہے تھے، اس کے بعد مولوی صاحب نے پان کی تواضع کی، اور مجھ سے کل کے قیام کی نسبت کہا، لیکن میں نے معذرت کی، کہ مجھکو گنگوہ بہت جلد جانا ہے، اس کے بعد مولوی صاحب نے دفع دخل کے طور پر کہا، کہ یہ میرا مکان نہیں ہے، میرے چھوٹے بھائی کا ہے، میرا مکان دوسرا ہے، اسی وقت میں مدرسہ سے آیا ہوں، ابھی ابھی یہاں آگیا، میں نے پوچھا کہ آج کل آپ کیا کیا پڑھاتے ہیں، فرمایا کہ چار برس سے اہل شہر کے اصرار سے میں نے مظاہر العلوم میں تعلق کر لیا ہے، اب آج کل صحاح ستہ و توضیح تلویح و ہدایہ و بیضاوی وغیرہ پڑھاتا ہوں، مولوی صاحب صورت شکل کے بہت وجیہ قد و قامت میں درست، مہذب، متین، خوش پوشاک اور شوقین ہیں، پانچ چھ روپیہ کا ایک پنجابی جوتہ پہنے ہوئے گھڑی ہاتھ میں باندھے ہوئے پان رکھنے کی تین تین ڈبیاں جیب میں ایک جرمن سلور کی جس میں پان، دوسری ربڑ کی جس میں چھالیا ہے، تیسری بلور کی یا کسی اور پتھر کی، جس میں بنارس کی بسی ہوئی تمباکو کی گولیاں رکھی ہیں، تھوڑی دیر بیٹھکر میں اٹھ آیا،

مولینا محمد حسین قیام گاہ پر آیا ہی تھا، کہ مولوی نظام الدین ملنے آئے، یہی صاحب بکمرہ کے مولینا کے مرید ہیں، ان سے مفصل حال معلوم ہوا انھوں نے بیان کیا، کہ ان کا نام حضرت مولینا محمد حسین ہے، عمر ایک سو گیارہ برس کی ان کی عمر ہے، بدن مرتعش ہو گیا ہے، نگینہ اور بجنور اور نجیب آباد میں ان کا بہت رشد ہے، سید صاحب کے خلفا میں ہیں، اور حضرت سیدنا کے ظہور کے منتظر ہیں، اکثر اپنے مریدوں کے یہاں چلے جاتے ہیں، چنانچہ آج کل بھی شاید اسی طرف گئے ہوئے ہیں، میں نے کہا کہ ایک خط لکھکر دریافت کر دیجئے، جواب دیا انشاء اللہ تعالیٰ گنگوہ سے واپس آنے پر مل جائے گا، انھوں

نے کہا کہ آج ہی میں لکھ دوں گا، یہ عشا تک میرے پاس بیٹھے رہے، ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سید صاحب ابو بنی کی مسجد میں مقیم ہوئے تھے، جب سہارنپور تشریف لائے تھے، چونکہ رات کا وقت ہے، اس وجہ سے میں اس مسجد کی زیارت کو نہیں جا سکا، بعد واپسی کے ارادہ ہے، گاڑی ہو گئی ہے، تین روپیہ کرایہ اور ایک روپیہ خوراک جملہ چار روپیہ آمد و رفت کے لئے، کل علی الصباح روانگی کا ارادہ ہے، انشاء اللہ تعالیٰ بشرط عدم موانع،

سید صاحب کے چند اور مرید مولوی نظام الدین نے بیان کیا کہ حضرت امیر المومنین کے مریدوں میں سہارنپور کے رہنے والے حکیم مغیث الدین صاحب تھے، ان کا انتقال ہو گیا، ان کے صاحبزادے حکیم مشتاق احمد صاحب ہیں، ان کو آپ کے آنے کی اطلاع نہیں ہے، ورنہ حاضر ہوتے، فرمایئے تو اطلاع کر دوں، میں نے کہا کہ میں علی الصباح روانہ ہونے کو ہوں، اور یہ شب کا وقت ہے، ان کو آنے میں تکلیف ہو گی، بعد واپسی کے انشاء اللہ تعالیٰ میں ان سے خود ملوں گا، ایک حضرت سیدنا کے مریدوں میں اور سُنے گئے جو ست بیجا کرتے ہیں، میرا ارادہ خود ان کے پاس جانے کا تھا مگر حافظ قمر الدین صاحب خود ان کو بلا لائے، یہ بھی بہت معمر ہیں، صغر سنی میں حضرت امیر المومنین کی اونھوں نے زیارت کی ہے، دیر تک بیٹھے رہے،

(باقی)

سیرۃ النبی جلد ششم

جس کا موضوع اخلاقی تعلیمات ہے چھپ کر تیار ہے، شائقین جلد درخواستیں بھیجیں، قیمت قسم اول صہ، قسم دوم للعہ، بڑا سائز حجم ۶۱۲ صفحے،

"منیجر"

بقائے انسانی

کے

خلاف دو مفروضہ اعتراضوں کا جواب

از

جناب خواجہ عبد الحمید صاحب ایم اے لکچرار گورنمنٹ کالج گجرات پنجاب

ولیم جیمز امریکہ کا مشہور نفسی اور مفکر گذرا ہے ۱۸۹۸ء میں اوس نے ہارورڈ یونیورسٹی میں یہ لکچر وقف انگرسول کے سلسلے میں دیا تھا، اسی سال یہ لکچر چھپ گیا، اور اس کے بعد کئی بار چھپا، میں نے ۱۹۱۷ء کے اڈیشن سے یہ ترجمہ کیا ہے، مصنف نے لکچر کے ساتھ جو نوٹ لکھے تھے، ان کا ترجمہ میں نے ضروری نہیں سمجھا، ان کے علاوہ چند نوٹ جو نفس مضمون سمجھنے میں معاون ہوں، شامل کر دیئے ہیں، ولیم جیمز کا انتقال ۱۹۱۰ء میں ہوا یہ شخص ان مفکروں میں تھا جن کی تصانیف میں سائنس، فلسفہ اور ادبیات کا نہایت اچھا اتصال ہوا ہے،

"مترجم"

تاریخ کی ورق گردانی کیجئے، تو یہ افسوسناک حقیقت آپ کے سامنے آئے گی، کہ جب نوع انسان کی کوئی اشد اور زندہ ضرورت رسمی طور پر کسی ادارہ کی صورت میں مرتب اور محفوظ ہوتی ہے تو ایک کام جو وہ ادارہ کرنا شروع کر دیتا ہے، یہ ہوتا ہے، کہ خود اس "ضرورت" کی فطری

تشنی میں وہ حائل ہو جاتا ہے، یہ منظر اس قدر عام ہے کہ ہمیں اس کے متعلق کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں، قوانین اور عدالتوں میں کلیسائیات میں فنون لطیفہ کی انجمنوں میں طبؔ۱ اور دوسرے پیشوں میں خود یونیورسٹیوں میں غرض ہر جگہ ہمیں اس حقیقت سے دوچار ہونا پڑتا ہے،

یہ بات کس قدر عام اور کتنی افسوسناک ہے کہ ان انجمنوں اور اداروں کے کارکن خود ان روحانی مقاصد کی شکست میں مصروف نظر آتے ہیں، جن مقاصد کی تکمیل کے لئے ان کا ادارہ یا ان کی انجمن معرض وجود میں آئی تھی، اُن کی فنی اصطلاحی روشنی (اور اس روشنی کے سوا کوئی دوسری روشنی انکی نظر میں نہیں آتی) انھیں اندھیرے میں ڈال دیتی ہے، اور ان کی تنگ نظری انکی پیشوا بنتی ہے، اور انھیں ان کے مجوزہ روحانی مقاصد کی خدمت سے ہٹا دیتی ہے،

گذشتہ موسم بہار میں جب مجھے ہماری یونیورسٹی کی مجلس انتظامیہ کی طرف سے اس انگرسول لکچر کی دعوت ملی، تو مثلاً یہ خیال میرے دل میں آیا، کہ خواہشِ بقا انسان کی اہم روحانی ضروریات میں سے ایک ہے، کلیساؤں نے اپنے آپ کو اس ضرورت کا امانت دار قرار دے رکھا ہے، اس اجارہ داری کا نتیجہ یہ ہوا ہے، کہ بعض کلیسا اپنے رسمی اور مذہبی شعائر کی روشنی میں ایک شخص کو تو نہایت مہربانی سے یہ "بقا" عنایت فرما دیتے ہیں، اور دوسرے شخص کو محرومیٔ محض کا فتویٰ دے دیتے ہیں، اور اگر اُسے بقا عطا کرتے بھی ہیں، تو صرف ایسی صورت میں کہ اُسے ایسی بقا کی خواہش ہی نہ رہے، اب اس انگرسول لکچر ہی کو لیجئے، غالباً وقف انگرسول کے بلند خیال بانی

۱؎ مثلاً علم طب کا یہ کام ہے کہ بیماریوں کے علاج تجویز کرے، لیکن ہم دیکھتے ہیں، کہ علم طب کے مختلف فرقے، مثلاً یونانی، ویدک، ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی، جراحی، وغیرہ ایک دوسرے کے اس قدر مخالف ہیں، کہ اگر ایک فرقہ نے کسی اچھے علاج کا انکشاف کیا ہے، تو دوسرے اسکے خلاف ہی رہیں گے محض اس وجہ سے کہ یہ علاج ان کے اپنے فرقہ کا تجویز کردہ نہیں ہے، (مترجم)

کی خواہش یہ تھی کہ ہماری یونیورسٹی اس مقصد کو جو ہر وقت ان کے پیش نظر تھا، کلیساؤں سے بہتر طریقہ پر اور زیادہ فراخ دلی سے پورا کرے، کیونکہ یونیورسٹی ایک ادارہ ہے جسکے لئے نہ تو روایات سلاسل بنی چاہئیں، اور نہ لکچراروں کے انتخاب میں ناممکنات اس کے لئے موانع بننے چاہئیں، لیکن آپ اس وقت دیکھ رہے ہیں، کہ اس یونیورسٹی نے ایک ایسا شخص اس لکچر کے لئے آپکے سامنے لا کھڑا کر دیا ہے، جو یونیورسٹی کے کارکنوں میں تو ضرور شامل ہے[1] لیکن اس کے لئے ہرگز مشہور نہیں ہے کہ وہ بقاے انسانی کا ایسا پُرجوش پیغامبر ہے کہ جب تک وہ اس خوشخبری کو اپنے ہمعصروں تک نہ پہنچا دے، اُسے چین ہی نہ آئے گا،

ان خیالات نے مجھے مجبور کرنا شروع کیا کہ اس تقریر سے انکار کر دوں، مسئلۂ بقاے روح کا انحصار تمامتر انسان کی اپنی ذاتی خواہش اور حس پر ہے، مجھے اس بات کے تسلیم کرنے میں ہرگز کوئی باک نہیں کہ نہ تو میرے اندر بقا کی خواہش ہی غیر معمولی طور پر تیز ہے، اور نہ اس مسئلہ کے متعلق میرا اشتیاق اس قدر زیادہ ہے، کہ اسے حل کیے بغیر مجھے نیند نہ آئے، اس وقت دنیا میں ایسے افراد موجود ہیں جن کا اشتیاق اس مسئلہ کے متعلق مجھ سے بہت زیادہ ہے، ایسے مرد اور ایسی عورتیں موجود ہیں جن کے دل میں بقا کی آرزو کی شدت جنون کے درجہ تک پہونچ چکی ہے، اشتیاق کی شدت نے ایسے اشخاص کے وجدان کو اس قدر باریک بین بنا دیا ہے، کہ اس مسئلہ کے وہ پہلو جو میرے جیسے کم اشتیاق لوگوں کی نظر میں آتے ہی نہیں، ان کے لئے نمایاں حقیقت بنے ہوئے ہیں، بعض ایسے اشخاص سے میرا تعارف بھی ہے، جو یونیورسٹی کے کارکن نہیں، وہ فقیہوں کی زبان نہیں بولتے، بلکہ اہل خانہ کی جیسی زبان بولتے ہیں، پچ پوچھئے، تو آج کل کے زمانہ میں اگر کہیں اسکی ضرورت ہے کہ کوئی

---

[1] ولیم جیمز ہارورڈ یونیورسٹی میں پہلے نفسیات کا اور پھر فلسفہ کا پروفیسر تھا،
(مترجم)

پوستین پوش بنی، کسی مجمع میں آکر لوگوں کو الہام و البقا کی تعلیم سے اطمینانِ قلب بخشے، تو وہ موقع آج ہے، اور یہاں ہے، میری منصب داری نے خاصانِ حق کو کیوں اپنے حق سے محروم کر دیا!

لیکن ان خیالات اور اپنی منصب داری اور نااہلی کے باوجود میں آج آپ صاحبوں کے سامنے کھڑا ہوں، مجھے پوری امید ہے کہ آیندہ پوستین پوش نبی بھی، یا استعارہ چھوڑ کر صاف الفاظ میں ایسے عام اشخاص بھی اس آنگرسول کے لئے بلوائے جائیں گے جنھیں اپنے جذبات سے القا ہوتا ہے اسی طرح مجھے یہ امید بھی ہے، کہ اس وقف کے منتظمین میرے جیسے اور مختلف شعبوں کے منصبداروں کی باری بھی مقرر کریں گے، اور مزید غور و خوض کے بعد اس بات سے نہ ڈریں گے، کہ مجھ ایسا پیشہ ور نفسی غالبا اپنے خیالات کے اظہار میں، سخت بے حس اور سلبی ثابت ہوگا، بات یہ ہے، کہ یہ مضمون نہایت وسیع ہے، مثلاً آلگر صاحب[ل] نے اپنی کتاب "نظریۂ حیات بعد الموت کی ناقدانہ تاریخ" کے اخیر میں پانچہزار سے زیادہ کتابوں کے نام گنائے ہیں جن میں اس مسئلہ پر بحث ہوئی ہے یا اس کا ذکر ہوا ہے، ہماری یونیورسٹی کی مجلس کو صرف ایک ہی لکچر کا خیال نہ رکھنا چاہیئے، ان تمام لکچروں کا خیال بھی ضروری ہے، جو آیندہ سلسلہ وار اس موضوع پر ہوں گے، ایک لکچر خواہ وہ کتنا ہی الہامی جذبات سے پر ہو کافی نہیں ہو سکتا، مختلف لکچر ایک دوسرے کے نقائص اور خامیوں کو دور کریں گے، اور اس طرح ان لکچروں کے سلسلہ سے نوشتوں کا ایسا جامع ذخیرہ ہاتھ آئیگا جو اس عظیم الشان موضوع کے شایان شان ہوگا، مجھے یقین ہے کہ بانی وقف کے دل میں یہ خیال موجود تھا، ان کی خواہش تھی کہ اس مضمون کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے تاکہ سب کے نتائج مل کر ایک خاص، موزوں اور صحیح رجحان کی صورت میں ظاہر ہوں، اگر صحیح نظر کے

ل Critical History of the Doctrine OF A FUTURE LIFE BY ALGER

دیکھا جائے، تو وقت انگرسول کا سب سے ضروری کام یہ ہے کہ تقسیم کار باریک بینی سے کی جائے اور فصیح البیان مقرروں، روحانیت کے پیامبروں اور مجھ ایسے تنگ نظر مگر باریک بین مخصین اور ہر طرح کے لوگوں کو ان لکچروں کا موقع ملنا چاہئے، ان کے علاوہ ہر فرقہ کے الہیین انسانیات اور مابعد الطبیعیات کے مفکرین نفسین طبیین، حیاتین، اور علم الارواح کے سراغ رسانوں، بلکہ ریاضی دانوں کو بھی بلانا چاہئے، اگر ان مختلف مفکرین میں سے کوئی ایک شخص بھی اپنے نقطۂ نظر سے سچائی کا ایک ایسا ذرہ بھی پیش کر دے، جو دوسرے ایسے ذرات سے (جو دوسری مفکروں کی تحقیقات سے منتج ہوں گے) ملحق اور متفق ہو جائے، تو ایسا مفکر اپنے تقرر کو صحیح ثابت کریگا

اس ایک گھنٹہ میں جو مجھے ملا ہے، میں کوشش کروں گا، کہ اپنے تقرر کو صحیح ثابت کروں میں آپ صاحبوں کی خدمت میں دو ایسی باتیں، یا سچائی کے دو ایسے ذرے پیش کرونگا جن کے متعلق مجھے یقین ہے کہ میرے بعد جو مقرر بھی آئے گا، اسی کے خیالات سے میرے ان ذرات کا صحیح الحاق ہو جائے گا،

یہ دو باتیں جو میں پیش کرنا چاہتا ہوں، درحقیقت جواب ہیں دو اعتراضات کے، یہ دو اعتراض کیا ہیں، ؟ یہ دو رکاوٹیں ہیں، جو ہماری موجودہ تہذیب کے حیات بعد الموت کے تصور میں باقی ہے، ان ذہنی رکاوٹوں کی وجہ سے اس نظریہ میں وہ کشش و جذب نہیں رہا جس سے وہ ایسے سائنس دان گروہ کو اپنی طرف کھینچ سکے، جس میں آپ حضرات شامل ہیں،

پہلی رکاوٹ اس قطعی انحصار سے متعلق ہے، جو انسان کی روحانی زندگی کا مغز انسانی پر ہے، محققین عضویات[۱] کہتے ہیں، اور یہی بات آپ آئے دن ان لوگوں سے بھی سنتے رہتے ہیں، جو سائنس کے رسالوں اور کتابوں کو پڑھتے رہتے ہیں، کہ ہم حیات بعد الموت کے

[۱] Physiology

قائل کیسے ہو سکتے ہیں، جب کہ سائنس نے یہ بات بلاشک وریب ثابت کر دی ہے کہ ہماری (شعوری اور) روحانی زندگی درحقیقت ماموریت[1] ہے، اس مٹیالے رنگ والے مادے کی جس سے ہمارے جرم مغزی کے تیج بنے ہیں، جب یہ مٹیالے رنگ والا عضو (یعنی مغز) ہی موت کی وجہ سے گل سڑ جائے گا، تو اس عضو کی ماموریت کیسے باقی رہے گی؟"

اسی طرح خیال کیا جاتا ہے، کہ جدید "نفسیات عضویہ[2]" ہمیں حیات بعد الموت کے پرانے عقیدہ سے باز رکھتی ہے، چنانچہ اس وقت میں جدید سائنس کے ایک مفکر کی حیثیت سے آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آئیے اور اس اعتراض کو ذرا غور سے دیکھئے،

یہ صحیح ہے کہ علم عضویات اسی نتیجہ تک پہنچا ہے، اور یہ بھی صحیح ہے، کہ اس نتیجہ پر پہنچ کر اس علم نے نوع انسانی کے اعتقاد مشترک کو ذرا اور ترک پہنچا دیا ہے، مثلاً ہر شخص جانتا ہے، کہ کسی انسان کے مغز کا ارتقا اگر رک جائے تو وہ کودن کہلاتا ہے، جب کسی شخص کے سر پر سخت چوٹ آتی ہے تو اس کا حافظہ بلکہ اس کا شعور بھی معطل ہو جاتا ہے، اور وہ بے ہوش ہو جاتا ہے، جب کسی شخص کو کوئی محرک دماغی دوا یا زہر دیا جاتا ہے، تو اس کے خیالات کی کیفیت بالکل بدل جاتی ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری شعوری زندگی کا انحصار ہمارے دماغ پر ہے، علم عضویات، علم تشریح اور علم امراض کے محققین نے اس عام عقیدہ کو تفصیل اور باریک بینی سے بیان کر دیا ہے، سائنس کی کارگاہوں نے اور اسپتالوں نے پچھلے دنوں میں صرف یہی نہیں بتایا کہ عام فکر مغز کی ماموریتوں میں سے ایک

---

[1] کسی عضو کے مخصوص کام کو اس کی ماموریت کہتے ہیں، مثلاً پھیپھڑوں سے ہم سانس لیتے ہیں، تو سانس لینا ماموریت ہوئی پھیپھڑوں کی، اسی طرح صفرا پیدا کرنا ماموریت ہے جگر کی، مترجم،

[2] Physiological Psychology

ماموریت ہے، ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے، کہ فکر کی مختلف حالتیں مغز کے خاص خاص حصوں کی ماموریتیں ہیں، مثلاً جب ہمارا فکر اشیا کے دیکھنے میں مصروف ہے، تو ہمارے مغز کا پس پشت حصہ مصروف کار ہے، جب ہم کچھ سننے میں مصروف ہیں، تو مغز کے صدغی قطعے کام کر رہے اور جب ہمارا فکر بولنے میں یا الفاظ میں ظاہر ہو رہا ہے، تو مغز کے پیشانی والے حصے مصروف کار ہیں، پروفیسر فلخ سیگ کا جو لائپزک یونیورسٹی جرمنی میں علم کے اس شعبہ کے امام مانے جاتے ہیں خیال ہے کہ مغز کے دوسرے خاص خاص قطعوں اور پیچوں کی وجہ سے ذہنی ترکیب کے وہ اہم کام ہوتے ہیں، جن پر فکر کے نظری عملوں کا انحصار ہے، اس وقت میرے پاس مغز انسانی کا نقشہ موجود نہیں، ورنہ آپ کو یہ تمام قطعات دکھاتا، پروفیسر موصوف کا خیال ہے، کہ ہماری جذباتی زندگی کی رنگ آمیزی کا انحصار اور ان باتوں کا انحصار کہ کوئی خاص شخص سنگدل مجرم ہوگا، یا وحشی ہوگا، یا اس قدر رقیق القلب ہوگا، جس میں جذبات کا توازن سرے سے غائب ہی ہو جائے، یا ایسا صحیح القلب انسان ہوگا، جس کے اخلاق میں جذبات کو بھی دخل ہو، لیکن اخلاقی وقار بھی قائم رہے، وغیرہ تمام تر مغز انسانی کے ان ہی حصوں کی (جنھیں یہ مصنف حسیات کے مغزی حصے کہتا ہے) باہمی ملاوٹوں اور رشتوں کی افراط و تفریط پر منحصر ہے ممکن ہے یہ رائے بعد میں قابل تصحیح ثابت ہو، لیکن موجودہ ماہرین تشریح امراض و عضویات کے نتائج اس قدر پختہ معلوم ہوتے ہیں، کہ ہمارے نوجوان طلبا کو یہ باتیں بلا تکلف طبی درسوں میں پڑھائی جاتی ہیں، اس وقت ان علوم میں جو تحقیق و تجسس جاری ہے، اس کا جذبۂ محرک یہی یقین ہے، کہ متذکرہ بالا تعلق (مغز اور شعور کے درمیان) ایک غیر متزلزل حقیقت ہے، کسی نوجوان نفسی سے پوچھ لیجئے، وہ آپ سے یہی کہے گا، کہ چند فرسودہ دماغ متشکلین بمجبورا اس تفیوسیوفی حق

Professor Flechsig Leipzig. ۵۱ ۵۲ تفیوسوفی سے مراد علم تصوف

محققین علم الارواح کے سوا کوئی شخص بھی آج کل یہ دعوی نہیں کریگا کہ ذہنی یا نفسی حالتیں دنیا میں رقم متغیر کی طرح خود مختارانہ حیثیت رکھتی ہیں،

میں بھی اس نظریۂ انحصار ذہن بر مغز کو اپنے استدلال کے لئے بے چون وچرا اور بلا کم و کاست تسلیم کر لیتا ہوں، اور آپ حضرات سے بھی درخواست کرتا ہوں کہ اس تعلق کو ایک کلیہ مسلمہ کی طرح مان لیں،

مان لیجئے کہ فکر مغز کی ایک ماموریت ہے، اب سوال یہ ہے کیا اس نظریہ کو صحیح مان لینے سے ہمارے لئے حیات بعد الموت کا حق تسلیم کرنا ناممکن ہو جاتا ہے، اگر کوئی صحیح العقل مفکر اس نظریہ کو ایک کلیہ مسلمہ مان لے تو کیا اُسے حیات بعد الموت کے متعلق اپنی تمام امیدیں قربان کر دینا پڑیں گی؟

جن لوگوں میں سائنس کی عصبیت حد سے زیادہ سخت گیر ہے، وہ تو بے چون وچرا کہہ دینگے کہ ہاں البتہ اگر کوئی نوجوان طبیب یا نفسی اپنی علمی تربیت کے باوجود بھی حیات بعد الموت پر یقین قائم رکھنا چاہتا ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے، کہ خوش قسمتی سے انسان کو منطقی ربط کے علاوہ ڈل کی بے ربطی سے بھی سرفراز کیا گیا ہے، وہی شخص جو ابھی ابھی سائنس دان کی حیثیت سے مشغول فکر تھا، فوراً ہی ایک عامی یا ایک عیسائی کی زبان سے بولنے اور سوچنے لگتا ہے، ایک عامی کی حیثیت سے اس کے دل میں بقا کی لو لگی ہوتی ہے، اور اُسے یہ خیال نہیں آتا، کہ ابھی ابھی تو میں اس بقا کو

(بقیہ حاشیہ ص ۲۸۶) ہے، اتھیو سوفی وہ عارف ہے، جو خدا کے دیدار کا دعویدار ہے اسلام میں ابن عربی مشہور صوفی تھے، مترجم، سلہ رقم متغیر ریاضیات کی اصلاح ہے، مثلاً اگر کہا جائے، کہ تمام ک فانی ہیں، تو اگر ک کے بجائے انسان، مینڈ، گدھے الخ میں تو قضیہ صحیح رہے گا، ک رقم متغیر کہلائے گا، (مترجم)

سائنس سے غلط ثابت کر چکا ہو تو، ہاں جو شخص سائنس کی عصبیت میں اس قدر ڈوبا جا چکا ہے کہ سوائے اس ایک نقطۂ نظر کے اسے کچھ سوجھتا ہی نہیں، وہ بلا تامل حیات بعد الموت کی خواہش اور لذت کو خوشی یا ناخوشی سے قربان کر دے گا،

یہ ہے پہلا اعتراض حیات بعد الموت کے عقیدہ کے خلاف، اب میرا فرض یہ ہے کہ میں آپ صاحبوں کے سامنے واضح کر دوں کہ استدلالی حیثیت سے یہ اعتراض صحیح نہیں، میں دکھاؤں گا کہ اس اعتراض سے حیات بعد الموت کی عدمیت لازم نہیں آتی، بلکہ اگر ہم نظریۂ "انحصار فکر بر مغز" کو حرف حرف بھی صحیح مان لیں، تب بھی یہ بات ناممکن نہیں، بلکہ ممکن ہے، کہ مغز کے گل سڑ جانے کے بعد بھی ہماری حیات باقی و جاری رہے،

جو لوگ مغز کی عدم موجودگی میں حیات کے بقا کو ناممکن سمجھتے ہیں، انھوں نے متذکرہ بالا نظریۂ انحصار ماموری کو بہت سرسری نظر سے دیکھا ہے، اب ذرا اس انحصار ماموری کو غور سے دیکھئے، اور پھر یہ سوال کیجئے کہ انحصار ماموری کی کتنی قسمیں ہیں، آپ کو معلوم ہو جائے گا، کہ کم از کم اس قسم کا انحصار تو ایسا ضرور موجود ہے، جو حیات بعد الموت کو مانع نہیں، منکر عضویات ایک اور قسم کے انحصار کو دیکھتا ہے، اور اس کو بلا وجہ ممکن اور صحیح سمجھ کر حیات بعد الموت کا انکار کر دیتا ہے، جب یہ منکر عضویات دعویٰ کرتا ہے، کہ فکر مغز کی ایک ماموریت ہے، اور اس لئے مغز کی عدم موجودگی میں فکر باقی نہ رہے گا، تو اُس کے ذہن میں ایک غلط تمثیل ہوتی ہے، وہ اپنے اس دعویٰ کو اُسی قسم کا سمجھتا ہے، جس قسم کے یہ دعوے ہیں، کہ بھاپ کیتلی کی ماموریت ہے، یا روشنی برقی رو کی ماموریت ہے، یا قوت گرتے آبشار کی ماموریت ہے، وغیرہ ان تینوں مثالوں میں مختلف مادی اشیاء کی ماموریت یہ ہے، کہ وہ (اپنی ہر طرح کی) مادی اشیا (یا نتائج) پیدا کریں ایسی ماموریت کو ماموریت تولیدی کہنا چاہئے، پس منکر عضویات مغز کے متعلق بھی یہی حکم لگا دیتا ہے اور سمجھتا ہے

کہ جس طرح مغز کاربولک ایسڈ[1] پیدا کرتا ہے یا جوہر لحم[2] اور کلسٹرین[3] کی مادی رطوبتیں پیدا کرتا ہے، اور یہ بلا شبہہ ماموریت تولیدی ہے،) اسی طرح مغز فکر کو بھی پیدا کرتا ہے، اگر ہم اس منکر کا یہ خیال صحیح مان لیں، کہ مغز کا فکر کو پیدا کرنا، درحقیقت ماموریت تولیدی ہے، تو مغز کی فنا کے بعد روح کی فنا بھی لازم آئے گی، کہ جب پیدا کرنے والا عضو ہی نہ رہے گا، تو وہ شے کیسے رہے گی، جو اس عضو سے پیدا ہوتی ہے، تولیدی ماموریت سے یہی نتیجہ نکلتا ہے،

لیکن مادی دنیا میں صرف تولیدی ماموریت ہی دکھائی نہیں دیتی، دو اور طرح کی ماموریتیں بھی ہیں جنھیں اذنی (اختیاری) اور انتقالی کہا جاسکتا ہے،

مثلاً کمان زنبورک کے گھوڑے کی ماموریت کیسی ہے،؟ اذنی ہے، کیونکہ یہ گھوڑا اس رکاوٹ کو دور کر دیتا ہے، جو کمان کی رسی کو روکے رکھتی ہے، جب ہم گھوڑے کو کھینچتے ہیں، تو گویا وہ اجازت دے دیتا ہے، کہ کمان اپنی اصلی حالت وصورت میں آجائے، یہی ماموریت ہمیں اس وقت نظر آتی ہے، جب ہتھوڑا (یا بندوق کا گھوڑا) کسی پھٹنے والے مرکب (مثلاً بارود) پر گرتا ہے، یہ ہتھوڑا بارود کی مشتعل گیسوں کی ذراتی رکاوٹوں کو ہٹا دیتا ہے، اور اجازت دیتا ہے کہ یہ گیس اپنا اصلی حجم اختیار کرلیں، بھک سے اڑ جانا اسی کو کہتے ہیں،

اب کسی رنگدار شیشے کا مثلاً منشور مثلثی[4] یا انتشاری شیشہ[5] کو لیجئے، ان کی ماموریت انتقالی ہے، اس شیشہ کی ماموریت یہ ہے، کہ نور کی قوت کو، خواہ وہ نور کیسے ہی پیدا ہوا ہو، رنگ میں محدود کرکے اسے چھان چھان کر ایک خاص راستے میں اور ایک خاص صورت میں محصور کردے اسی طرح ارگن باجے کے پردوں کی ماموریت بھی انتقالی ہے، ان کے یکے بعد دیگرے دبائے

---

[1] Carbolic acid [2] Createni [3] Cholesterin [4] Prism [5] Lens.

جانے سے باجہ کی نلیاں کھل جاتی ہیں، اور صندوق کی ہوا ان راستوں سے باہر نکلتی ہے ہر نالی کی آواز کیا ہے؟ ہوا کی ایک لہر ہے جو ستون نما ہو کر لرزتی ہوئی اس نالی میں سے نکلتی ہے، کیا باجہ ہوا پیدا کر رہا ہے، ؟ ہرگز نہیں، ہوا صندوق میں موجود تھی، اور باجہ صرف ایک ساز ہے، جس کی چھوٹی بڑی نالیاں اس صندوق کی ہوا کے نکلنے کے لئے راستوں کا کام دیتی ہیں،

اب میرا دعویٰ یہ ہے کہ جب ہم اس کلیہ کا تصور کرتے ہیں، کہ فکر مغز کی ایک ماموریت ہے، تو ہمارے لئے ضروری نہیں کہ ہم صرف تولیدی ماموریت ہی کو مانیں ہمیں حق ہے کہ اس کے علاوہ اذنی اور انتقالی ماموریتوں پر بھی نظر کریں، عام نفسی عضوئیں اس پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں،

فرض کیجئے کہ عالم کائنات کا یہ پورا مادی نظام تحت الثریٰ سے بام ثریا تک، حوادث قدرت کی محض ایک سطحی نقاب ہے، جو اس عالم کی اشیائے واقعی کو ہماری نظروں سے چھپا رہی ہے، ایسے مفروضے سے عوام اور فلسفی ناآشنا نہیں ہیں، عوام تو اس خیال کے کہ ظاہری حوادث نے اشیائے واقعی کو چھپا رکھا ہے، اس درجہ قایل ہیں، کہ اوہام باطلہ تک نوبت جا پہنچی ہے، فلسفہ عینیت دعویٰ کرتا ہے کہ مشاہدات فطری کا وہ سارا نظام جو ہم دیکھ رہے ہیں درحقیقت ایک نقاب زمانی ہے، جو پس پردہ فکر بے کران کو ان لاتعداد لیکن محدود شعوری حالتوں میں پراگندہ کر دیتا ہے، جنھیں ہم اپنی اپنی شخصیت سے تعبیر کرتے ہیں شاعر نے کہا ہے؛

"حیات مختلف رنگوں والے شیشہ کے گنبد کی طرح ابدیت کے سفید نور کو رنگین،
کر دیتی ہے"،

اب فرض کیجئے کہ شاعر نے سچ کہا ہے، یہ بھی فرض کر لیجئے، کہ یہ گنبد جو عام حالتوں میں اور عام اوقات میں تو اس فوق الشمس نور کے لئے کثیف ہے، لیکن بعض اوقات اور بعض جگہوں

میں اپنی کثافت کو کم کر دیتا ہے، اور اس ابدیت کے نور کی چند کرنوں کو ہماری تحت الفکر دنیا
میں گذر جانے کی اجازت دیتا ہے، تو یہ کرنیں کیا ہونگی؟ یہ کرنیں ہوں گی شعور کی محدود شعاعیں
جس تناسب سے اس گنبد کی کثافت بڑھتی یا گھٹتی جائے گی، اسی تناسب سے ان شعاعوں کی کیفیت
وکمیت بھی کم وبیش ہوگی، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ خاص خاص مواقع اور خاص خاص حالات
میں فطرت کی یہ نقاب اس قدر باریک ہوجاتی ہے، کہ عالم بالا کی یہ کرنیں اس میں سے راستہ
پیدا کرکے نکل آتی ہیں، یہی وہ جگہیں، اور وہ مواقع ہیں، جہاں ہمیں عالم بالا کی قائم بالذات زندگی
کی کچھ شعاعیں بخشی جاتی ہیں، خواہ ان شعاعوں کا پر تو ہمیں محدود اور غیر تشفی بخش ہی کیوں نہ دکھائی
دے، ایسی حالتوں میں ہماری محدود دنیا کو کبھی تو تابش جذبات عطا ہوتی ہے، اور کبھی عرفان کی
جھلک کبھی ورک مستقیم ملتا ہے، اور کبھی علم کی بارش،

اب اگر آپ اس بات کو تسلیم کر لیجئے، کہ ہمارا مغز پردہ گنبد میں اسی قسم کی ایک باریک
اور نیم شفاف جگہ ہے، تو اس سے کیا نتیجہ نکلے گا؟ یہی نتیجہ نکلے گا کہ جس طرح سفید نور مختلف رنگوں
والے شیشوں سے رنگ آمیز اور کچھ آمیز ہو کر گنبد کے اندر چھن چھن کر داخل ہوتا ہے، یا جس طرح
اس وقت ہوا میرے حلق کے صوتی تاروں اور پٹھوں کی وجہ سے اپنے تموّج کی تندی اور کیفیت
میں محدود اور محصور ہو کر میری آواز کی صورت میں نکل رہی ہے، اسی طرح حقیقت کا مواد صالح
یعنی روحوں کی وہ پر کیف زندگی جو ان کا حق ہے، ہمارے مختلف دماغی پردوں کو چیرتی ہوئی
اس دنیا میں ظاہر ہوتی ہے، لیکن کس حالت میں؟ نقائص سے ملوث ہو کر، بوالعجبیوں سے
پر ہو کر اور صورتوں میں محدود ہو کر، ! ان محدود اور ناقص صورتوں کا کیا نام ہے؟ یہ ہیں
ہماری شخصیتیں،!!

شیشہ گنبد کی یہ کثافت مغز انسانی کی حالت کے مطابق کم وبیش ہوتی رہتی ہے، جب مغز

اپنی پوری قوت سے کام کرتا ہے، تو یہ رکاوٹ اس قدر کم ہوجاتی ہے، کہ روحانی قوت کا ایک سیلاب آجاتا ہے، دوسری حالتوں میں فکر کی صرف وہ لہریں آپہونچتی ہیں، جنھیں گہری نیند کے وقت آنے کا موقع ملتا ہے، اخیر میں جب مغز اپنا کام بالکل چھوڑ دیتا ہے، یا بالکل فنا ہوجاتا ہے، تو شعور کی وہ ندی جو اس مغز کے راستے سے جاری تھی، ہماری اس طبیعی دنیا سے بالکل غائب ہوجاتی ہے، لیکن ہستی کا وہ ذخیرہ جو اس چشمہ کا منبع تھا، اب بھی موجود رہے گا، کیا تعجب ہے، کہ یہ چشمہ اس حقیقی دنیا میں اب بھی جاری ہو، اگرچہ اس وقت ہم اس کے انداز و رفتار سے ناآشنا ہیں،

آپ نے دیکھ لیا کہ انسان کی روحانی زندگی کے متعلق جو مفروضہ میں نے ابھی ابھی پیش کیا ہے، اس کے مطابق بھی یہ زندگی بالکل صحیح معنوں میں "مغز کی ماموریت" ہے، مغز تو متغیر بلا واسطہ ہوگا، اور نفس و ذہن کا تغیر اس سے بالواسطہ ہوگا[1] لیکن اگر اس طبیعی دنیا میں ہماری ذہنی زندگی مغز پر منحصر ہے، تو اس سے حیات بعد الموت کا ناممکن ہونا لازم نہیں آتا، مغز کی فنا کے بعد بھی حیات اس پس پردہ اور فوق الطبیعی منبعِ حیات کے ساتھ تھی اور جاری رہ سکتی ہے جس سے اس کا اس فانی دنیا میں تعلق تھا،

میں پہلے بھی عرض کرچکا ہوں کہ مادیت نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے، وہ لابدی نہیں ہے، یہ نتیجہ صرف اسلئے نکلا، کہ مادیت نے ماموریت کی صرف ایک صورت کو لیا ہے، ہمارا فرض ہے کہ ناقدانہ حیثیت سے ہم مادیت کے اس طرزِ عمل کے خلاف احتجاج کریں، کہ وہ ایک صاف اور اہم نقطۂ نظر کو بلاوجہ نظر انداز کررہی ہے، یہ احتجاج ہمارا فرض ہے، خواہ ہمیں مسئلہ بقا سے دلچسپی ہو یا نہ ہو، جب ہم یہ سوچتے ہیں، کہ سچائی کا اقتضا کا بھی یہی ہے پھر جب مادیت جان بوجھ کر نوع انسانی کی اہم ترین آرزو کی تنقیص کررہی ہے، تو ہمارا یہ فرض اور موکد ہوجاتا ہے،

[1] یعنی نفس و ذہن کا انحصار مغز پر ہوگا، لیکن مغز کا انحصار ذہن و نفس پر نہ ہوگا،

مختصر یہ کہ منطقی حیثیت سے تو ہم نے مادیت مغزی کے زہریلے دانت نکال لئے، اب میں چاہتا ہوں کہ میرے یہ الفاظ آپ کی خواہشات کے لئے "ادنیٰ ماموریت" کا کام دین، اور آپ کا فرض یہ ہے، کہ حیات بعد الموت پر یقین رکھین، البتہ یہ آپ کی مرضی ہے، کہ آپ اس حق سے مستفید ہون، یا نہ ہون، بہرحال چونکہ مذکورہ بالا بحث قدرے روکھی پھیکی تھی، اس لئے میں چاہتا ہون کہ اس مسئلہ کے بعض زیادہ محسوس پہلوؤن کے متعلق بھی کچھ کہوں،

خیالی مفروضے بہت بے حقیقت معلوم ہوتے ہیں، مثلاً یہ خیال کس قدر عجیب معلوم ہوتا ہے، کہ "ہمارا مغز فطرت کی دیوار میں ایک رنگ دار شیشہ ہے جس میں سے ایک فوق الشمس منبع سے نکلا ہوا نور محدود اور رنگ آمیز ہو کر داخل ہو رہا ہے" آپ کہیں گے یہ تو محض ایک لایعنی سا استعارہ ہے، ہم اپنے ذہن میں ایسی ماموریت کا اندازہ ہی کیسے کر سکتے ہیں؟ کیا عام مادیت کا مفروضہ (کہ ذہن ماموریت ہے مغز کی) اس سے زیادہ صاف اور عام فہم نہیں ہے؟ کیا ہمارا شعور درحقیقت بھاپ یا برقی رو یا اعصابی رو کی طرح نہیں ہے جنھیں انکے مخصوص ظرف یا عضو ہی پیدا کرتے ہیں؟ کیا علمی ربط کی حیثیت سے یہ زیادہ صحیح نہیں ہے کہ ہم مغز کی ماموریت کو بھی تولیدی ماموریت تصور کریں؟

ان اعتراضات کا فوری جواب یہ ہے، کہ اگر آپ سائنس کی واقعی حیثیت کے متعلق بات چیت کر رہے ہیں، تو یاد رکھئے کہ سائنس میں ماموریت سے مراد ہے، باہمی تغیر، یعنی جب مغز میں ایک طرح کا تغیر واقع ہوتا ہے تو شعور (یا ذہن) میں بھی ایک قسم کا تغیر ہوتا ہے، مثلاً جب اعصابی رو مغز کے پشتکے حصہ میں دوڑتی ہے تو شعور کی حالت وہ ہوتی ہے جسے دیکھنا کہتے ہیں، جب یہ رو پیشانی والے حصہ میں دوڑتی ہے تو شعور کی حالت وہ ہوتی ہے جسے بولنا کہتے ہیں اور جب یہ مختلف رویں بند ہو جاتی ہیں، تو شعور کی حالت نیند کی ہوتی ہے، سائنس ہمیں صرف یہ اجازت دیتی ہے کہ ہم اس تبدل باہمی کو بطور امر واقع کے بیان کر دیں۔ باقی رہی یہ بحث کہ جو کچھ اس باہمی تبدل کے ذریعہ

سے ہو رہا ہے، وہ تولیدی ہے یا انتقالی، یہ محض مفروضے ہیں، جو سائنس داں اپنی طرف سے بڑھا دیتا ہے، اور پھر یہ مفروضے بھی (طبیعی نہیں ہیں بلکہ) مابعد الطبیعی ہیں، کیونکہ خواہ ہم ماموریت کی ایک قسم کو لیں، یا کسی اور قسم کو ہم اسکی تفصیل کے تصور سے عاجز رہتے ہیں، سائنس سے پوچھئے کہ یہ تولید یا یہ انتقال ہوتا کیسے ہے تو آپ کو سوائے خاموشی کے کوئی کا جواب نہ ملے گا، اس دقت سائنس سے آپ کو اس مسئلہ کا حل تو کیا ملے گا، وہاں تو اٹکل یا قیاس محض کی ایک جھلک تک موجود نہیں، کوئی ادنیٰ سا استعارہ تک نہیں، کوئی جگت تک نہیں، جس کی مدد سے ان مختلف طوریوں کے متعلق کچھ تفصیل سے کہنے کی جرات کی جا سکے، لاعلمی اور محض لاعلمی یہ ہوگا جواب ماہرین عضویات کا ایک ماہر نے سچ سچ یہی الفاظ استعمال کئے ہیں، جیسا کہ برلن کے پچھلے استاذ عضویات نے کہا ہے، کہ مغز میں شعور ایسی حالت کا پیدا ہونا دنیا کا سب سے بڑا معمہ ہے، یہ معمہ اس قدر بعید از قیاس اور غیر معمولی ہے کہ اسکی حیثیت قدرت کے قوانین کے سمجھنے میں ایک عیب سنگ راہ کی سی ہے، معمہ کیا ہے قریب قریب ایک تضاد لفظی ہے، جب چائے کی کیتلی میں بھاپ پیدا ہوتی ہے، تو ہمیں کم از کم عرفان قیاسی تو ہوتا ہے، کیونکہ اس میں تغیر پذیر رقمیں مادی حیثیت سے بالکل ہم جنس ہیں[1]، اسلئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ تغیر درحقیقت ذروں کی حرکت کا تغیر ہے، اور بس لیکن جب یہ کہا جاتا ہے کہ مغز نے شعور پیدا کیا، تو رقوم متغیر بالکل مختلف الجنس ہوتی ہیں، (یعنی ایک مادی اور دوسری غیر مادی) اسلئے جہاں تک عقل و فہم کا تعلق ہے، یہ کہنا کہ شعور مغز سے پیدا ہوا ہے، اسی طرح ایک معجزہ ہے، جیسے ہم یہ کہیں کہ شعور خود رو ہے، یا شعور نیست سے ہست ہوا ہے،

---

[1] یعنی آگ، پانی، اور کیتلی، تینوں مادی اشیا ہیں یعنی مادی علت نے مادی معلول پیدا کیا، لیکن جب مغز سے (جو مادی ہے) (جو روحانی ہے) شعور پیدا ہوا تو مادی علت نے غیر مادی معلول پیدا کیا

الغرض نظریہ تولیدی (یعنی مادیت کا نظریہ) بذات خود کسی دوسرے نظریہ سے ذرہ برابر بھی زیادہ صاف یا زیادہ عام فہم نہیں ہے، ہاں یہ ضرور ہے، کہ آج کل یہ نظریہ زیادہ مرغوب ہورہا ہے، اگر مادیین میں سے کوئی صاحب ہم پر یہ اعتراض وارد کریں، کہ فرمائیے، مغز حد بندی اور تقیید کرنے والا عضو بن کیسے سکتا ہے، ایک ایسے شعور کے لئے جس کا منبع کسی دوسرے عالم میں ہے، تو ہمیں اُسے یہ دنداں شکن جواب دینا چاہئے، کہ آپ ہی فرمائیے، کہ مغز سے شعور کیسے پیدا ہو جاتا ہے، ؟ جہاں تک بحث و استدلال و فہم کا تعلق ہے، دونوں نظریے برابر کی اہمیت رکھتے ہیں،

لیکن جب آپ ہمارے نظریہ ماموریت انتقالی کو ذرا زیادہ واضح کرکے دیکھیں گے تو اس میں آپ کو (مسئلۂ بقا سے قطع نظر کرکے بھی) چند ایسی ایجابی خوبیاں ملیں گی جو اس کے مقابل کے نظریہ میں نہیں مل سکتیں،

یہ ہمیں نہیں معلوم کہ ماموریت انتقالی کام کیسے کرتی ہے، لیکن اس عمل کے ظاہری تعلقات سے ہمارے نظریہ کو تقویت پہونچتی ہے، مثلاً ہمارے اس نظریہ کے مطابق یہ مسئلہ باقی ہی نہیں رہتا کہ شعور اس قدر زیادہ اور مختلف مقامات میں رقم نو کی طرح پیدا کیسے ہو جاتا ہے ہم کہہ سکتے ہیں، کہ یہ شعور پس پردہ اسی وقت سے موجود ہے، جب سے دنیا موجود ہے، اسی طرح ہمارے نظریہ انتقالی کے لئے یہ سوال بھی باقی نہیں رہتا کہ پیدائش شعور کی معجزانہ نمود اس قدر زیادہ جگہوں میں کیونکر ہوئی، ساتھ ہی یہ فائدہ بھی ہمارے ہاتھ آتا ہے کہ مادیت کی تولیدی نظریہ کے برعکس یہ نظریہ عام فلسفۂ عینیت سے قریب تر ہوتا جاتا ہے، اگر کسی مسئلہ میں سائنس اور فلسفہ متفق ہو جائیں، تو غنیمت سمجھنا چاہئے،

(باقی)

تلخیص و تبصرہ

ڈاکٹر کریمر اور اسلام

عیسائیوں کی بین الاقوامی تبلیغی مجلس کی فرمایش پر ڈاکٹر کریمر نے ایک کتاب موسوم بہ "عیسائیوں کا پیام غیر عیسائی دنیا میں" لکھی ہے، اس کے اقتباسات رسالہ مسلم ورلڈ میں شائع ہوئے ہیں، ذیل میں ان کی تلخیص دیجاتی ہے، کہ اس سے اسلام کے خلاف عیسائیوں کی منظم تبلیغی کوششوں کا اندازہ ہو سکے، اور یہ معلوم ہو سکے کہ اس آزادی اور روشن خیالی کے دور میں بھی متعصب عیسائی اسلام کے متعلق کیسے خیالات ظاہر کرتے ہیں،

مذہب اسلام اسلام یہودی اور عیسوی مذہب کی ایک شاخ ہے، اس لئے اس کی حیثیت فطری مذاہب سے جداگانہ ہے، لیکن یہ اپنی خود شعوری کی وجہ سے ان دونوں قدیم مذاہب سے بالکل آزاد اور علیحدہ رہا ہے، اس کے عقائد سادہ اور مختصر ہیں، اور مذہبی مسائل تو بہت ہی سطحی ہیں، لیکن اس کے باوجود اس کے پیرو اپنے عقائد میں اسقدر راسخ اور سخت ہوتے ہیں، کہ ان کے لئے وہ اپنی جانیں گنوا سکتے ہیں،

اسلام نے مذہب و اخلاق کے سارے مسائل کو غیر تشفی بخش طریقہ سے حل کرنے کی کوشش کی ہے، اس کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک الہامی مذہب ہے، لیکن اس کا الہام محض قرآن کا مکینکل الہام ہے، جس کو قدیم، غیر مخلوق اور آسمانی سمجھا جاتا ہے،

اسلام میں گناہ اور نجات کا تخیل بھی اطمینان بخش نہیں، اللہ کی قدرت کاملہ کے سامنے تسلیم و رضا کے سوا کوئی اور چارہ نہیں، اخلاقی حیثیت سے نجات کو اہمیت زیادہ نہیں دی گئی، پھر بھی

ایسے او کھلے او سطحی مذہب کے پیرو اپنے عقائد میں دوسرے تمام مذاہب کے پیرووں سے زیادہ سخت ہیں، اس کے دو وجوہ ہیں، ایک تو یہ کہ اسلام میں اللہ کی قدرت کاملہ اور جباری پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے، دوسرے یہ کہ پیروان اسلام کو ایک متحدہ قوم قرار دیکر اللہ اور اسکے رسول کی شریعت کے ماتحت کر دیا گیا ہے، چنانچہ اسلام ایک حکومت الٰہی ہے، جس میں اللہ ہی ہر چیز ہے، اللہ اور بندوں میں کوئی لگاؤ نہیں، بلکہ بندہ کا وجود محض اللہ کا حکم بجالانے کے لئے ہے، اس تخیل کے ساتھ اسلام نے جو قوم پیدا کی، وہ ایک ہی وقت میں مذہبی بھی ہے سیاسی بھی، اور معاشرتی بھی، اور ان سب کا محور اسلامی شریعت ہے، اسی لئے اسلام جدید طرز اختیار نہیں کرسکتا، اسلام کی پوزیشن کو مستحکم کرنے کے لئے محمدؐ نے یہ دعویٰ کیا کہ صرف یہی ایک مذہب ہے، جو احکام الٰہی کی رو سے دنیا کے مذہبی اور غیر مذہبی معاملات میں حکمرانی کرسکتا ہے، گویا اسلام شروع میں مذہبی شہنشاہیت کا نمونہ تھا،

اسلام ایک تمدن ہے، دوسرے مذاہب کی طرح اس کا تاریخی نشو و نما بھی ہوا ہے، اسلئے اسکے دوسرے اجزا مثلاً اس کے اخلاق کا نظام اور تصوف کی آمیزش بھی قابل غور ہیں، اسلام غیر صوفیانہ مذہب بلکہ تصوف کا مخالف ہے لیکن نومسلم عیسائیوں کے اثرات سے اس میں تصوف کا رنگ پیدا ہو گیا ہے، عیسائی خدا کی ذات سے محبت اور حظ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن مسلمان خدا کی ہیبت سے متاثر ہونے پر زور دیتے ہیں، الغزالی نے شریعت علم کلام اور تصوف میں امتیازات قائم کئے، اور تصوف کو قلب کے ایسے تاثرات بتائے، جو مذہبی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں لیکن قرآن کے الفاظ و احکام کی پابندی کو بہرحال ضروری اور لازمی قرار دیا،

اسلام کی موجودہ حالت

اسلام وحشی قبائل میں تیزی سے بڑھ رہا ہے، افریقیا اور نیدر لینڈ کے قبائل اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ کر اسلام یا عیسوی مذہب کی طرف مائل ہو رہے ہیں، ان تمام ملک

میں اسلام کی تبلیغ ازمنۂ وسطیٰ ہی سے شروع ہو گئی تھی خصوصاً جب اس کو یہاں سیاسی اقتدار بھی حاصل تھا،

موجودہ دور میں اسلام کے فروغ کے تین اسباب ہیں (۱) مغرب کے باہمی تصادم سے قبائلی مذاہب میں انتشار پیدا ہو رہا ہے، اور لوگ ایک نئے روحانی ماحول کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، (۲) مسلمانوں کی تبلیغی سرگرمی سے وہ لوگ اسلام کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، جو اپنے قبائلی مذہب سے بالکل مطمئن نہیں، (۳) ان وحشی لوگوں کی اخلاقی اور مذہبی زندگی میں اسلام بہت زیادہ تغیر پیدا نہیں کرتا،

یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے، کہ اسلام صرف ایک شرعی نظام نہیں، بلکہ ایک مکمل تمدن اور سیاسی مذہب ہے، اسلئے موجودہ دور میں دو مسائل قابلِ توجہ ہیں، اسلام کی سیاسی حالت اور اسلام کے یکسان تمدن کا جدید تمدن سے تصادم، اسلام میں کمتری کا احساس نہیں ہے، اسلئے جب یہ مغربی تمدن سے متصادم ہوا، تو تلخ تجربے حاصل ہوئے، اور جب اسلام کا سیاسی اقتدار کم ہوا، تو دو ردِ عمل ہوئے، (۱) اسلام کے قدامت پسند عناصر نے یورپین کلچر کو ناقابلِ قبول سمجھا، (۲) اعتدال پسند طبقہ کو اسلام کا رجعت پسندانہ رویہ پسند نہ تھا، لیکن ان کا خیال تھا، کہ اگر اس کی اصلاح کر دی جائے تو اسلام اور یورپ کے خیالات میں کچھ فرق نہ رہ جائے گا، اس خیال کے ماتحت اصلاح کی کوشش شروع ہوئیں، چنانچہ ترکی میں روس کے ذلت آمیز صلحنامہ (۱۷۷۴ء) کے بعد اسی قسم کی کوشش کا آغاز ہوا، مصر میں محمد علی نے بھی اسکی تقلید کی، مگر خلاف توقع وہاں مغربی تمدن پھیل گیا،

جنگ عظیم کے بعد حالات بدل گئے ہیں، عربی بولنے والی قوموں نے اپنا سیاسی اقتدار حاصل کر لیا ہے، ترکی اور ایران بھی اب بالکل آزاد ہیں، ان انقلابات سے یورپ کی سیاسی قوت کو سخت صدمہ پہنچا ہے، اور اس کے تمدن پر آج غیر معمولی دباؤ پڑ رہا ہے،

اجنبی حکومت کے ماتحت رہنے والے مسلمانوں کے حالات اس سے مختلف ہیں، گو انھوں نے بھی جدید تمدن کو قبول کیا ہے، لیکن مذہبی معاملات میں وہ آزاد ممالک کے مسلمانوں سے زیادہ قدامت پسند ہیں، ہندوستان میں قومیت ہندوؤں میں زیادہ ہے، یہاں کے مسلمان اسلام کو ہندوستانی قومیت سے مقدم سمجھتے ہیں، اور پبلک زندگی میں اپنی جماعت بندی کے لئے اسلام ہی کو طرۂ امتیاز بنانا چاہتے ہیں،

مصر میں وفدی جماعت کا رجحان زیادہ تر مغرب کی طرف ہے، اور وہ ملک کو جدید دنیا کے مطابق بنانا چاہتے ہیں، لیکن وہاں کا قدامت پسند طبقہ یورپین خیالات کو مطلق پسند نہیں کرتا ہے، اور اسلام کو اپنی اصلی مذہبی اور تمدنی حالت پر واپس لانا چاہتا ہے، چنانچہ مصر کو تمام اسلامی دنیا کا مرکز بنانے کی کوشش کیجارہی ہے،

ترکی میں اسلام لوگوں کی زندگی کا جزو کل نہیں رہا، بلکہ قومیت کی بڑھتی ہوئی رو میں کی حیثیت ثانوی قرار پاگئی ہے، لیکن پھر بھی اس کو اہمیت حاصل ہے، کیونکہ اسی کے ذریعہ سے سلطنت میں اتحاد کی قوت پیدا کیجاسکتی ہے، چنانچہ اسلام یہاں ایک مذہبی تمدن کے بجائے محض ایک مذہب کی حیثیت سے باقی ہے،

ایران میں مذہبی انقلاب ترکی کی طرح دفعۃً تو نہیں مگر آہستہ آہستہ ہو رہا ہے، یہاں مذہبی گروہ کا اثر ترکی سے زیادہ تھا، ۱۹۲۵ء میں جب ایران میں جمہوریت قائم کرنے کی کوشش کی گئی، تو مذہبی گروہ درمیان میں حائل ہوا، لیکن دس برس کے اندر شاہ ایران نے مجتہدوں کے اقتدار کو بڑی حد تک کم کردیا، اسلام ایران میں اب تک سرکاری مذہب ہے، علماء کی جماعت سرکاری حیثیت رکھتی ہے، لیکن بعض قوانین کے نفاذ، اور عورتوں کی آزادی سے اسلام کو سخت صدمہ پہونچا ہے،

اسلام اور عیسائی مبلغین

عیسائی مبلغوں کیلئے ایک بڑی مشکل یہ ہے، کہ مسلمان اپنے لئے جماعت بندی مذہب کا ایک ضروری جزو سمجھتے ہیں، اسلئے ان میں تبلیغ کی اولین شرط یہ ہونی چاہئے کہ ہمارے مبلغین مسلمانوں سے غیر معمولی عقیدت، اخلاق اور محبت سے پیش آئیں اور امید اور اعتماد میں استوار رہیں،

حضرت مسیح کی تعلیم پر روشنی ڈالنا اور قرآن کی غلط بیانیوں کو دکھانا مسلمانوں کے درمیان کام کرنے کا صحیح طریقہ نہیں، بلکہ قرآن میں انجیل سے جو واقعات لئے گئے ہیں، ان ہی کے اصلی معانی اور مطالب کو بیان کرنا چاہئے، مسلمان ان چیزوں کو توجہ سے سن سکتا ہے، اس کے علاوہ ان سے ذاتی تعلقات پیدا کرکے ان کو انجیل پڑھنے کی ترغیب دلائی جائے اور ان پر یہ ظاہر کیا جائے کہ وہ عیسائیوں ہی کی طرح بنی نوع انسان ہیں، اور دونوں کی ضرورتیں اور خواہشیں یکساں ہیں،

عیسائی مذہب کو عقائد کا مجموعہ بنا کر پیش کرنا بھی صحیح نہیں، کیونکہ اسلام خود عقائد کا ایک مجموعہ ہے، اس کے علاوہ مشرقی گرجاؤں میں مسلمانوں کے سامنے عقائد و رسوم کی بہت ہی ہیبت ناک مثالیں رہی ہیں، اس لئے عیسائی مبلغ ان کو بظاہر یہ تعلیم دیکر کہ عقائد کی پابندی کا نام مذہب نہیں، انھیں انجیل کے حقیقی رموز کے مطالعہ کے لئے آمادہ کریں، لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ مسلمانوں کے طرزِ خیال بود و ماند اور مذہبی لغت سے اچھی طرح واقف ہوں ورنہ اسکے بغیر ان کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی،

تصوف بھی عیسائی مبلغوں کی کامیابی کا ایک ذریعہ ہوسکتا ہے، مسلمانوں اور عیسائیوں کے تصوف میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں، اسکے علاوہ مسلمان صوفیوں کی جماعت میں ایسے افراد ملیں گے، جن سے مذہبی اختلاط آسانی سے کیا جاسکتا ہے، کیونکہ اسلامی تصوف کے بعض اجزا مسلمانوں کی مذہبی راسخ العقیدگی اور سختی کو بڑی حد تک کم کر دیتے ہیں، لیکن اس موقع

پر اس احتیاط کی ضرورت ہے کہ ان کو یہ تو بتایا جائے کہ تصوف کا عام رنگ یکسان ہے لیکن اسلام اور عیسوی مذہب کے تصوف کے اساسی خیالات کی وضاحت اور تفریق نہ کیجائے، اس سے پیچیدگی پیدا ہونے کا احتمال ہے،

موجودہ حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ نہیں کہا جاسکتا ہے، کہ عیسائی مبلغوں کی کوشش گذشتہ زمانہ کے مقابلہ میں زیادہ بارآور ہون گی، یا نہیں، کیونکہ اب تک تبلیغ کا کام سیاسی قوتوں کی پناہ میں ہوتا رہا تھا، لیکن آج جہان عیسائی طاقتیں برسر اقتدار ہیں، وہاں ان کے خلاف شورش ہے، اور اسلام کی مدافعت میں عیسوی مذہب پر جارحانہ حملے ہورہے ہیں، ٹرکی اور ایران میں تو تبلیغی کام بالکل ممنوع ہے، لیکن وہاں عیسائی مذہب کے آسمانی صحیفہ کے مطالعہ کو رائج کرنا مشکل نہیں،

مشرق میں گرجاؤں کے باہمی عناد اور مبلغوں کے اختلاف سے بھی تبلیغ کو نقصان پہونچ رہا ہے، اس لئے اسے جلد از جلد مٹانے کی ضرورت ہے، ایسا تبلیغی لٹریچر زیادہ سے زیادہ فراہم کرنا ضروری ہے جسمیں مذہبی اصطلاحات اور خیالات نہایت واضح طریقے سے ادا ہوں،

وہ زمانہ قریب آرہا ہے، جب عیسوی مذہب کو کھل کر اسلام سے مقابلہ کرنا ہوگا، افریقہ اور نیدرلینڈ میں وحشی قبائل کے مذاہب ختم ہورہے ہیں، اور بہت جلد وہاں دو ہی مذہب ہون گے حبشی اسلام کی طرف آسانی سے مائل ہوسکتے ہیں، کیونکہ اس مذہب میں قومیت کا کوئی جھگڑا نہیں اسکے علاوہ ان حبشیوں کے معیار زندگی، رسم ورواج اور تعدد ازدواج کے ساتھ اس مذہب کا رویہ ہمدردانہ ہے، لیکن عیسائی مذہب ترقی پسند ہے، اور اسکی بنیاد اخلاق پر ہے، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ انسان اسی جانب راغب ہو، جو اسکے لئے سب سے بہتر ہو،

تبلیغی کاموں میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کرنے کے لئے اس وقت عیسائی گرجاؤں میں

اتحاد کی سخت ضرورت ہے، اور یہ اتحاد و یکجہتی یوروپین قوموں کی حیثیت سے نہیں بلکہ عیسائیوں کی حیثیت سے ہونی چاہئے، جن کو یہ تعلیم دی گئی ہے، کہ قوم و نسل کی تفریق و امتیاز کے بغیر تمام انسان حضرت عیسیٰ کی نظروں میں مساوی ہیں،

احساس کمتری

کاہلی، شرمندگی، رنج و غم، غلط بیانی، فضول گوئی وغیرہ اپنی کمتری کے احساس کے نتائج ہوتے ہیں، بعض اوقات خود رائی، غیر ذمہ دارانہ حرکت یا کسی کام کو انجام دینے میں کوتاہی بھی اسی سے پیدا ہوتی ہے، بچے عموماً اپنے والدین سے غیر معمولی محبت و شفقت کے خواہشمند ہوتے ہیں، اور جب ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوتی ہے، تو ان میں عدول حکمی، نافرمانی، اور بداخلاقی جیسے بُرے خصائل پیدا ہوجاتے ہیں، اور وہ سن بلوغ کو پہونچکر بھی نفسیاتی نقطۂ نظر سے نابالغ رہتے ہیں، اور ان کو اپنی کمتری کا احساس اتنا زیادہ ہوتا ہے، کہ ان کی انفرادیت باقی نہیں رہتی، ان کے خیال اور عمل کی راہیں بالکل غلط ہوجاتی ہیں، وہ اپنے کو جذبات اور معاشرت کی دنیا میں علٰحدہ پاتے ہیں، اور اپنی زندگی کو منطقی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی عادی ہوجاتے ہیں، جس سے وہ نہ اپنی سوسائٹی میں کسی مسرت کا اضافہ کرسکتے ہیں اور نہ اپنے ملک کے لئے مفید ہوسکتے ہیں، وہ خود اپنی زندگی کو خوش اور قانع نہیں بناسکتے،

اس کمتری کے احساس کو پیدا ہونے سے روکنا یا سن بلوغ میں دور کرنا کوئی مشکل کام نہیں، صرف احتیاط شرط ہے،

بچوں کی تربیت میں یہ خیال رکھا جائے کہ ان کے دل میں یہ احساس پیدا نہ ہو کہ وہ اپنے والدین اور بزرگوں کی نظروں میں محبوب اور مقبول نہیں ہیں، اگر بچے گھر میں اپنے بزرگوں سے

ہم آہنگ نہیں ہیں، تو ان کے دلوں سے سکون اور اطاعت گذاری مفقود ہو جاتی ہے، جس کے بعد ممکن ہے، کہ وہ جھوٹ بولنے لگیں، کام سے جی چرانے لگیں، اور بزرگوں کی ڈانٹ ڈپٹ سے بچنے کے لئے حیلے اور بہانے ڈھونڈھنے لگیں، بچون کو ان برے خصائل سے محفوظ رکھنے کیلئے ضروری ہے، کہ گھر کے ماحول میں بچون اور بزرگوں کے باہمی ارتباط کا توازن کسی حال میں بگڑنے نہ پائے،

بڑے بچوں میں کمتری کا احساس محض اسلئے پیدا ہو جاتا ہے، کہ ان کو اپنی ذات سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے اور اس کا خیال ان پر اتنا غالب رہتا ہے کہ وہ صرف اپنی ذات اور اس کے متعلقات کو سوچتے رہتے ہیں، ایسے بچوں کے بزرگوں کو چاہئے کہ ان کو ایسی تربیت دین، کہ وہ اپنی ذات کے بجائے لوگوں کی ذات سے دلچسپی لیں، اور ان سے اخلاق اور مہربانی سے پیش آئیں،

مذکورۂ بالا صورتیں تو بچوں سے اس احساس کے انسداد کی تدبیرین ہیں، لیکن سن بلوغ کو پہنچکر بھی اس احساس کے دور کرنے کی کوشش کیجا سکتی ہے، اس کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے، کہ ہم بغور مطالعہ کرکے یہ معلوم کرین کہ ہم اپنے کو زندگی سے تطبیق دینے میں کہاں کہاں غلطیاں کرتے ہیں، اور ہماری زندگی اور ماحول میں کون ایسے اجزا ہیں، جن میں ترمیم ہو سکتی ہے، اس ترمیم کی صورت یہ ہے کہ ہم اپنے کو ہمیشہ ایک ذہنی آئینہ کے سامنے رکھین تاکہ ہماری خوبیاں اور برائیاں بالکل سامنے رہیں، پھر اپنی خوبیوں کو حتی الامکان بڑھاتے، اور برائیوں کی اصلاح کرتے رہیں،

اپنی ذات سے حقیقی محبت کا تقاضا یہ ہے، کہ ہم میں جو کمزوریاں ہوں ان کو اعتراف اور تسلیم کرنے مین کسی قسم کا پس وپیش نہ کرین، اور نہ ہم اپنے لئے کوئی ایسا معیار قائم کرین جو ہمارے

محدود صلاحیتوں سے بہت زیادہ بلند اور اعلیٰ ہو، ورنہ ایک بلند معیار کی تکمیل کی خواہش میں ہم کو عموماً ایسے ذرائع اختیار کرنے پڑتے ہیں جن سے ہماری ذات کو نقصان پہنچتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ یا تو ہم دھوکے اور فریب سے اپنا کام نکالنا چاہتے ہیں، یا خوشامد اور چاپلوسی کو اپنے اغراض کی تکمیل کا ذریعہ بناتے ہیں، یا غرور اور گھمنڈ میں خوامخواہ مبتلا ہو جاتے ہیں، یا دوسروں کی تضحیک اور نکتہ چینی کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں،

ہم کو جب اپنی کمتری کے احساس کی تمام برائیوں سے واقفیت ہو جائے، تو ان کو دور نہ کرنا محض بزدلی ہے، جو کسی حال میں دوسروں کے رحم و کرم کی مستحق نہیں ہو سکتی،

"ص ع"

سوانح مولینا روم

اسلام کے مشہور صوفی متکلم مولینا جلال الدین رومی کی مفصل سوانحعمری، فضائل و مناقب ان کے تصوف کے اسرار، علم کلام کے رموز اور مثنوی شریف پر مبسوط تبصرہ، اور اس کے منتخب مضامین پر تبصرہ قیمت :- عہ/ ضخامت ۱۸۰ صفحے، (مطبوعہ معارف پریس)

سیرتِ عائشہ

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کے حالاتِ زندگی اور ان کے مناقب و فضائل و اخلاق اور ان کے علمی کارنامے، اور ان کے اجتہادات، اور صنفِ نسوانی پر ان کے احسانات، اسلام کے متعلق ان کی نکتہ سنجیاں، اور معترضین کے جوابات، کاغذ اور لکھائی چھپائی اعلیٰ، ضخامت ۲۵۰ صفحے قیمت :- عہ/

"منیجر"

اخبار علمیّہ

چاند کی سیر

انگلستان کے سو آدمیوں کی جماعت ہوائی جہاز کے ذریعہ سے چاند تک پہونچنے کا ارادہ رکھتی ہے، اس سفر میں ۲۵۰۰۰ ڈالر خرچ ہوں گے جب یہ رقم فراہم ہوجائے گی، تو یہ جماعت فوراً روانہ ہوجائے گی، اس نے اس مجوزہ سفر کی مندرجۂ ذیل تفصیلات شائع کی ہیں،

ہوائی جہاز میں نہانے دھونے کے لئے پانی نہ ہوگا اور نہ استرے ساتھ ہوں گے، سگرٹ پینا قطعی ممنوع ہوگا، کیونکہ جہاز پر آکسیجن کا ایک ایک انچ انسانی ضروریات کے لئے نہایت بیش قیمت ہوگا پانی اور ہوا، ہائڈروجن پروکسائڈ کی مرکب شکل میں ساتھ ہوگی، ہائڈروجن پروکسائڈ کے ایک سالمہ سے پانی کا ایک اور آکسیجن کا آدھا سالمہ تیار کر لیا جائے گا، پینے کی چیزوں میں صرف کوکو کے استعمال کی اجازت ہوگی، ہاں جب سیاحوں میں سے کسی پر نیند کا غلبہ زیادہ ہوگا، تو تھوڑا سا قہوہ بھی استعمال کرسکیں گے، شراب محض دوا کے لئے ساتھ ہوگی، باورچی خانہ کے برتنوں میں صرف دو ہلکی کڑاہیاں ہوں گی، ایک میں پانی گرم ہوگا، اور دوسرے میں گوشت بھونا جائے گا، ہر آدمی کے ساتھ صرف ایک پیالہ، ایک پلیٹ اور ایک چمچہ ہوگا، ایک چھری اور کانٹا بھی ساتھ لیا جاسکتا ہے، جو باری باری سے ہر شخص کے کام آئے گا، صفائی کا پورا انتظام ہوگا، غلاظت کے لئے ایسی جگہ ہوگی جس میں ہوا بھری ہوگی اس کے اوپر کے حصّہ کو کھولنے سے ہوا غلاظت کو اڑالیجائے گی، تفریح کے لئے ہلکے تاش کے پتوں کا

ایک جوڑا بھی رکھ لیا جاسکے گا، سردی سے حفاظت کا پورا سامان ہوگا،

آفتاب سے متعلق ایک نیا نظریہ

ہم میں سے اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ ایک دن آفتاب ہمیشہ کے لئے بجھ جائیگا، ماہرین طبیعیات کی تحقیقات کے مطابق یہ کروروں برس سے روشن ہے، اور ابھی کروروں برس تک روشن رہیگا، مگر وہ اب تک اس عقدہ کو حل نہیں کر سکے ہیں، کہ اس میں گرمی اور روشنی کیسے پیدا ہوتی ہے، عام طور سے کہا جاتا ہے کہ اس میں ہائڈروجن جلا کرتا ہے، اور ہائڈروجن کے ذرات کے ٹکڑے شعاعوں میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں لیکن ابتک یہ واضح نہ ہوسکا کہ یہ تبدیلی کس طرح واقع ہوتی ہے، گذشتہ فروری میں فلیڈلفیا کی ایک سوسائٹی میں ڈاکٹر کارنل بیتھے نے اس پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے، ڈاکٹر موصوف کا نظریہ یہ ہے کہ ۰۰۰،۰۰۰،۲۰ ڈگری کی حرارت میں ہائڈروجن کے ذرات اپنا اثر کاربن پر ڈالتے ہیں جس سے یہ کاربن غائب ہو جاتے ہیں لیکن ہائڈروجن کے دو تین رد عمل کے بعد ظاہر ہوکر پھر اپنا اثر دکھاتے ہیں، اس طرح کاربن بظاہر غائب ہو جاتا ہے، لیکن دراصل ہائڈروجن کو ختم کر کے قوت پیدا کرتا ہے، اور اسی کی خاکستر سے ہیلیم گیس تیار ہوتی ہے،

کاربن کے ذرات کو غائب اور پھر ظاہر ہونے میں ۰۰۰،۰۰۰،۵ سال لگتے ہیں، لیکن یہ چکر اس قدر متواتر اور مسلسل ہے کہ آفتاب میں ہمیشہ گرمی پہونچتی رہتی ہے،

ڈاکٹر بیتھے کے اس نظریہ کی جانب کافی توجہ کیجا رہی ہے، ڈاکٹر مذکور اگرچہ اب جرمنی سے جلاوطن ہوکر فلیڈلفیا پہونچا ہے لیکن وہاں کے سائنٹفک رسالوں میں پرانے نظریوں اور مسائل پر جدید معلومات بہم پہونچانے کی وجہ سے بہت ہی مقبول ہو رہا ہے،

امریکہ کے معلمین

ممالک متحدہ میں ۰۰۰،۰۰۰،۲۰ طلبہ مختلف اسکولوں میں تعلیم پارہے ہیں، اور ان کے لئے ۰۰۰، ۰۰۰،۱ اساتذہ مقرر ہیں، لیکن عام طور سے والدین ان کی تعلیم اور تربیت سے مطمئن نہیں ہیں، ان کی بے اطمینانی پر راک فیلر تعلیمی بورڈ نے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا ہے، جس پر ۰۰۰، ۵۰ ڈالر خرچ کئے جائیں گے،

اساتذہ کے خلاف یہ شکایتیں ہیں، کہ وہ مضامین ایسے پڑھاتے ہیں، جن سے خود اچھی طرح واقف نہیں ہوتے، وہ معاشرتی حالات کو پیش نظر نہیں رکھتے، وہ نہ لڑکوں کی فطرت کا مطالعہ کرتے ہیں، اور نہ ان سے محبت رکھتے ہیں،

عام طور سے اس پیشہ میں جو لوگ ہیں، وہ اور پیشوں کے لوگوں کے مقابلہ میں معمولی ہیں، ان میں زیادہ تر اعصابی امراض اور ذہنی خلجان کے شکار ہوتے ہیں، اس کے اسباب یہ ہیں، (۱) ان کی تنخواہیں بہت ہی قلیل ہیں، عام طور سے ان کی تنخواہ ۰۰۰، ۱۲ ڈالر سالانہ ہوتی ہے، گانوں کے اساتذہ ۶۰۰ ڈالر سالانہ پاتے ہیں، (۲) ان کو ذہنی اطمینان نصیب نہیں ہوتا ہے، وہ ملازمت میں آٹھ کر ۱۲ سال تک ٹکتے ہیں، (۳) ان کو جنسی سکون بھی حاصل نہیں ہوتا ہے، اس پیشہ کی عورتوں کو شادی کی اجازت نہیں ہوتی ہے، اس حیثیت سے مرد بھی زیادہ خوش نہیں ہیں،

پھر بھی معلمی کا پیشہ باعزت سمجھا جاتا ہے، اور ہر سال ایک لاکھ اساتذہ تیار کئے جاتے ہیں، ان کے لئے بارہ سو مختلف ادارے ہیں، عام طور سے اس پیشہ میں وہ گریجویٹ داخل ہوجاتے تھے، جو کالج سے لبرل تعلیم پاکر نکلتے تھے، اس میں شک نہیں کہ وہ معلمی کی تعلیم پاتے تھے، لیکن یہ تعلیم

بالکل ناکافی تھی، چنانچہ اب ان کو پانچ سال کی تعلیم الگ دیجائیگی جس میں کالج کی تعلیم کے ساتھ وہ لڑکوں کے نفسیات کا مطالعہ زیادہ کرینگے، اور اس مدت میں ان کے ذہنی رجحانات اور قلبی جذبات کی نگرانی ہوتی رہیگی، اگر ان کے رجحانات اور جذبات معیار کے مطابق ہوئے، تو اس پیشہ کے لئے موزون قرار دیئے جائینگے، ورنہ ان کو اپنی تعلیم کے سلسلہ کو منقطع کرنے پر مجبور کیا جائیگا،

دمہ کا نفسیاتی علاج

ہارورڈ یونیورسٹی کے ایک ماہر تحلیل نفسی نے دمہ کے ایک سو مریضوں کا کامیاب نفسیاتی علاج کیا ہے، اس کا خیال ہے، کہ بعض اوقات دمہ نفسیاتی صدمہ کی وجہ سے بھی ہوتا ہے، چنانچہ جب اس کو دمہ کے مریضوں کی نفسیاتی تشخیص میں کسی صدمہ کا پتہ چلتا ہے، تو اس کا نفسیاتی علاج کرتا ہے، اور اس کو اس میں برابر کامیابی حاصل ہوتی جارہی ہے، اسی یونیورسٹی کے ایک دوسرے ڈاکٹر نے دمہ کی ایک نوجوان مریضہ کا علاج مصنوعی نیند سے کیا ہے، مگر اسکے تجربات ابھی مکمل نہین ہوئے ہیں،

"ص ع"

مختصر تاریخ ہند

ہمارے اسکولوں میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں، ان کا لب ولہجہ دلآزاری اور تعصب سے خالی نہیں رہتا اور اس وجہ سے ہندوستان کی مختلف قوموں میں تعصب اور بغض و عناد پیدا ہوجاتا ہے، مولینا ابوظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسوں اور طالب علموں کے لئے اس غرض سے لکھی ہے کہ اس کا طرز بیان قومی جذبات سے متاثر نہ ہو، اور ہندو اور مسلمان فرمانرواؤں میں ہندوستان کے بنانے میں جو کام کئے ہیں، وہ طالب علم کو بلاتفریق مذہب و ملت معلوم ہوجائیں، ضخامت ۲۰۰ صفحے، قیمت :- ۱۲؍

"مینجر"

تابشِ سہیل

از جناب مولوی اقبال احمد صاحب سہیل ایم اے ایل ایل بی

یا برقِ قضا گرکے نشیمن کو جلا دے　　یا شعلۂ گل اٹھ کے اُسے درسِ فنا دے
کوئی تو جگر سوزیٔ بلبل کا صلہ دے　　کوئی تو اسے پھونک کے اکسیر بنا دے

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

معلوم ہے صیاد کے کلچیں کے ارادے　　کیا تاب جو کوئی مجھے مقصد سے ہٹا دے
ہمت مری بگڑی ہوئی ہر بات بنا دے　　بازو میں اگر قوتِ پرواز خدا دے

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

کب فکرِ نشیمن سے ہے مقصد مرا آرام　　کوشش میں جو لذت ہے وہ خود اسکا ہے انعام
ہمت کیلئے ننگ ہے اندیشۂ انجام　　اسکی مجھے پروا نہیں، اے گردشِ ایام

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

صیادِ ستمگر نے کبھی دادِ جفا دی،　　شعلوں کو کبھی شاخِ نشیمن نے ہوا دی
خود اپنے ہی نغمون نے کبھی آگ لگا دی　　بلبل اسی انجام کی مدت سے ہے عادی

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

ڈرتے ہیں مصائب سے کہیں طائرِ آزاد　　پڑتی ہی رہا کرتی ہے افتاد پہ افتاد

شعلوں سے بھڑکتے نہیں مرغانِ چمن زاد   اپنا ہو کہ بیگانہ نہو، الجھیں ہو کہ صیاد

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے،

ہر طائرِ آزاد ہے اس راز کا محرم   کرنی ہو غلامی تو ہے جنت بھی جہنم

دو تنکے کسی طرح سے کریں گے فراہم   یہ جوشِ عمل اپنا سلامت ہے تو کیا غم

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

صیاد کا بھی خوف ہے بجلی کا بھی کھٹکا   بلبل ہے کہ تنکے ہی لئے جاتی ہے یکجا

جس کام کو چھیڑا اُسے کیوں چھوڑ کے اُٹھو   تکمیل پہ جو حشر ہو، اس کی نہیں پروا

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

مانا کہ قفس میں ہے بہت چین میسر   نے برقِ چمن سوز نہ صیادِ ستمگر

ہے زیست غلامی کی مگر موت سے بدتر   قابو میں رہے اپنے پر و بال تو کیا ڈر

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

گائیں گے ہم آزادیٔ گلشن کا ترانہ   بیکار ہے اے برقِ بلا ہم کو ڈرانا

کافی ہے بہت وسعتِ صحرائے زمانہ   ہم اور کہیں ڈھونڈ نکالیں گے ٹھکانا

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

ترکہ میں ملا ہے ہمیں ایمانِ براہیمؑ   کب آگ سے ڈرتے ہیں غلامانِ براہیمؑ

دنیا کو دکھا دینی ہے پھر شانِ براہیمؑ   ہر شعلہ کھلائیگا گلستانِ براہیمؑ

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

ہے گوشۂ دل رشکِ صد وادیٔ ایمن   بجلی سے ڈریں کیا کہ ہے پروردۂ دامن

اس راکھ کے ہر ذرہ سے کھل جائینگے گلشن   بیکار نہ جائے گی مری خاکِ نشیمن

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

ہے بازوؤں میں قوتِ پروازِ خداداد — کیوں جھیلئے پھر ننگِ نمک خواری صیاد
سب کچھ ہے اگر اپنے پر و بال ہیں آزاد — مشتِ خس و خاشاک کو کر دے کوئی برباد

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

سو پشت سے جو باغِ کہن دیس ہے میرا — ہر سو سے اسے غم کی گھٹاؤں نے ہے گھیرا
میں اور کسی شاخ پہ کر لونگا بسیرا — ہو دور کسی طرح تو گلشن کا اندھیرا

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

آدم نے نہیں خلد سے کی آ کے اقامت — خواجہ نے دکھائی نہیں باطن کی کرامت
اللہ رہے یہ چمنِ کہنہ سلامت — ہر چند مری جان پہ آ جائے قیامت

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

جان اس وطن خواجہ و چیپال پہ صدقے — دل اس چمنِ حشمت و اجلال پہ صدقے
سر شہدِ آزادی و اقبال پہ صدقے، — کر دیں گے اسے اپنے پر و بال پہ صدقے

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے،

ہر معرکہ ہر چند ہیں تیغ اہل جفا سے، — جانبازِ وطن ڈرتے ہیں کب دشتِ فنا سے
ہٹنے کے نہیں مسلکِ تسلیم و رضا سے — جو کچھ بھی گذرنی ہو گذر جائے بلا سے

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

مانا کہ نشیمن کا مخالف ہے زمانہ — مانا کہ یہی ایک ہے بجلی کا ٹھکانا
اس راز سے واقف ہے مگر طائرِ دانا — ہو جائیں گے محنت سے پر و بال توانا۔

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

باب التقریظ والانتقاد

مسلمانوں کا روشن مستقبل[1]

از

جناب مولوی سید طفیل احمد صاحب منگلوری علیگ

سید طفیل احمد صاحب ہماری قوم کے ان باقیات صالحات میں ہیں جنھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاست کے تمام نشیب و فراز اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں، اور ہماری جدید قومی تاریخ کی زندہ کتاب ہیں، اور عمر کی اس قدامت کیساتھ سیاسی خیالات اور قومی خدمت کے ولولہ کے اعتبار سے جوانوں سے زیادہ باہمت ہیں، یہ کتاب اسی جذبہ کا نتیجہ ہے،

عام طور سے یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ اسلامی حکومت کے خاتمہ کے بعد سے ہندوستان کے مسلمانوں پر جو جمود اور انحطاط طاری ہوا، وہ اب تک قائم ہے، اور وہ ہر میدان میں اپنی ہمسایہ قوم سے پیچھے ہیں، اس زبون حالی کا رونا سنتے سنتے اب خود مسلمانوں کو بھی اپنی درماندگی کا یقین ہو گیا ہے، دوسری غلط شہرت یہ ہو کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے ملک سے کوئی دلچسپی نہیں، اور وہ ملکی آزادی کی جدوجہد میں کوئی حصہ نہیں لیتے، تیسرا خوف بعض جماعتوں میں یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی انفرادی قومیت اور ان کے حقوق محفوظ نہیں،

[1] ضخامت ۶۰۰ صفحے قیمت مجلد ۴؎ علاوہ محصول ڈاک، پتہ:۔ نظامی پریس بدایوں،

سید طفیل احمد صاحب نے ان تینوں امور کی تردید اور مسلمانوں میں اپنی برتری کا احساس اور جوش عمل پیدا کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی ہے، اس میں دکھایا ہے، کہ کسی دور میں مسلمانوں میں جمود اور غفلت نہیں رہی، ہر زمانہ میں ان کے مصلحین اور مجاہدین ان کی صلاح و فلاح کے لئے سرگرم عمل رہے، اور ملکی سیاست میں مسلمانوں کا قدم کسی قوم سے پیچھے نہیں رہا، اور ہندوستان میں ان کے حقوق بالکل محفوظ اور ان کا مستقبل روشن ہے،

اس کے ثبوت کے لئے انھوں نے حکومت پر رعایا کے دس حقوق قرار دیئے ہیں،

۱۔ روٹی کا مسئلہ، (۲) حفاظت جان و مال (۳) عدل و انصاف (۴) مذہب کی حفاظت (۵) تہذیب و زبان کا تحفظ (۶) تعلیم (۷) ملازمت کے حقوق (۸) شہری حقوق میں مساوات (۹) حقوق ملکیت میں آزادی (۱۰) سیاسیات،

پھر ان دسوں حقوق کی حالت کو اسلامی عہد، ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور اور خالص برطانوی شہنشاہی کے زمانہ میں دکھا کر موجودہ دستور کی رو سے دکھایا ہے، کہ مسلمانوں نے اپنے دور میں یہ حقوق کس عدل و انصاف سے پورے کئے، اور ہندو اور مسلمان دونوں ان سے یکساں متمتع ہوئے پھر ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں کس ظالمانہ طریقہ سے انھیں پامال کیا گیا، اس سلسلہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مظالم کی پوری تاریخ آگئی ہے، پھر خالص تاج برطانیہ کے دور میں جو آزادی اور مساوات کا دور کہلاتا ہے، کس طرح مسلمانوں کے حقوق کو نظر انداز کیا گیا، اور ابتدار میں انھیں ہر طرح سے پامال کرنے کی کوشش کی گئی، پھر رفتہ رفتہ پالیسی بدلی، اور مسلمانوں کے حال زار پر بھی توجہ ہونے لگی، اس بحث میں ہندو اور مسلمانوں کے ساتھ حکومت کے طرز عمل کے تغیرات کی پوری تاریخ آگئی ہے، آخر میں جدید دستور میں مسلمانوں کے حقوق دکھائے گئے ہیں،

ہندو اور مسلمانوں کی اس مشترکہ تاریخ کے ساتھ ہر دور کی خاص مسلمانوں کی مذہبی اصلاحی

اور تعلیمی تحریکوں اور اس کے نتائج پر روشنی ڈالی گئی ہے، خصوصاً سرسید احمد خان کے تعلیمی اور اصلاحی خدمات کو تفصیل کیساتھ دکھایا گیا ہے، اور اس کے مضر اور تاریک پہلوؤں سے بھی پردہ اٹھایا گیا ہے، کہ ابتدا میں ان کے سیاسی خیالات کیا تھے، پھر ان میں کس طرح تغیر پیدا ہوا، اور رفتہ رفتہ کس طرح مسلمانوں کی سیاسی باگ، علی گڈھ کالج کے انگریز پرنسپلوں کے ہاتھ میں آگئی، یہ بحث خصوصیت کیساتھ پڑھنے کے لائق ہے، جسکے سید صاحب عینی شاہد ہیں،

سیاسی جدوجہد کے سلسلہ میں ہندوستانیوں کے سیاسی شعور سے لیکر اسوقت تک ہندو مسلمانوں کی مشترک سیاسی اور خاص مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی تحریکوں اور مجلسوں کی تاریخ کیساتھ سیاسی جدوجہد میں مسلمانوں کا حصہ دکھایا گیا ہے، اس میں علماے کرام کے سیاسی اور دینی مجاہدات کی تفصیل بھی آگئی ہی غرض مسلمانوں کی قومی مذہبی اور سیاسی زندگی کا کوئی مسئلہ اور کوئی پہلو چھوٹنے نہیں پایا ہے، اس لحاظ سے یہ کتاب ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کی تین سو سال کی مذہبی سیاسی تعلیمی، اور اقتصادی تاریخ پر نہایت جامع تبصرہ ہے، اور اس موضوع پر اردو میں ابتک ایسی جامع کتاب نہیں لکھی گئی ہے،

لیکن مصنف نے ایک خاص مقصد اور نقطۂ نظر سے یہ کتاب لکھی ہے، اس لئے اس کی حمایت میں کتاب کے مباحث میں اعتدال اور توازن قائم نہیں رہ سکا ہے، کتاب کے تمام مباحث اور آخری ابواب میں تناسب نہیں ہے، تاریخی معلومات اور دوسرے پہلوؤں کے لحاظ سے یہ کتاب جتنی جامع اور مکمل ہے، نتائج کے اعتبار سے اتنی تشفی بخش نہیں ہے، آخری ابواب جو اس ساری داستان کا خلاصہ اور نتیجہ ہیں، جنھیں سب سے زیادہ پرزور اور مدلل ہونے چاہئیں تھے، گر ذہن ایک مخالف کہہ سکتا ہے کہ سوال مسلمانوں کے دستوری اور قانونی حقوق کا نہیں، بلکہ اس کے ثمرات و نتائج اور عمل کا ہے، اصولاً تو انگریز بھی ہندوستان کی آزادی کو مانتے ہیں لیکن عمل کیا ہے؟

ایسی حالت میں محض دستور کے عطا کردہ اختیارات مسلمانوں کے حقوق کی ضمانت نہیں ہوسکتے، اور تعلیم و زبان کے مسائل میں بعض اربابِ حکومت کے طرزِ عمل سے یہ شبہہ کچھ غلط نہیں معلوم ہوتا،

کتاب کے آخری حصہ کے معلومات میں بھی احتیاط نہیں برتی گئی ہے، جزوی واقعات اور اخباری اطلاعوں پر کلیے قائم کرلئے گئے ہیں، کاش یہ کتاب نتائج کے اعتبار سے بھی ایسی مضبوط ہوتی کہ نکتہ چینوں کے لئے حرف گیری کی گنجایش باقی نہ رہتی، لیکن یہ چیز مؤلف کے بس ہی کی نہ تھی جس حد تک ان کے اختیار کو دخل تھا، اس حد تک انھوں نے اسی بہتر سے بہتر شکل میں پیش کیا ہے، لیکن اس خامی کی وجہ سے کتاب کی اہمیت اور خوبی میں کوئی فرق نہیں آتا، اس خامی کو چھوڑ کر اور حیثیتوں سے اس قابل ہے کہ ہر ہندوستانی کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے،

"م"

انڈیا آفس لائبریری
کی
فارسی قلمی کتابوں کی فہرست جلد دوم

انڈیا آفس لائبریری کی قلمی کتابوں کی فہرست جلد اول ۱۹۰۳ء میں مشہور فاضل ڈاکٹر ایتھے نے مرتب کی تھی، اب دو برس ہوئے کہ اسکی دوسری جلد ۱۹۳۷ء میں چھپ کر نکلی ہے، اس دوسری جلد کو ڈاکٹر ایتھے نے ناتمام چھوڑا تھا، اسکی تکمیل اور نظرِ ثانی کا کام ایڈورڈ ایڈورڈس صاحب ایم اے نے کیا ہے، اور آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے چھاپا ہے قیمت للعہ ہے،

اس دوسری جلد کے شروع میں چند صفحوں میں مختلف علموں کی بعض چھوٹی ہوئی یا بعد کو ملی ہوئی قلمی کتابوں کی تفصیل ہے، ان کتابوں میں سب سے نادر اور کمیاب جس نسخہ کو بتایا گیا ہے وہ مولینا رومی کی فیہ مافیہ نمبر ۳۰۹۲ ہے مگر خوش قسمتی سے یہ کتاب ہمارے دوست مولینا عبدالماجد صاحب دریابادی کی ہمت اور محنت سے ۱۹۲۸ء میں دارالمصنفین کے مطبع معارف سے چھپ کر نکل چکی ہے،

سب سے قابل قدر کتاب اس میں جامع التواریخ رشید الدین نمبر ۳۰۰۲ کا وہ حصہ ہی جو ہندوستان کی تاریخ سے متعلق ہی اور جس کا عنوان "تاریخ ہند و سند و کشمیر" ہے،

گفتہ جعفر زٹلی نمبر ۳۰۰۵ کے نام سے جعفر زٹلی کے "خرافات" کا مجموعہ ہی جس میں فارسی اور اردو میں جعفر زٹلی کے ہجویات محفوظ ہیں جعفر زٹلی شاہ عالمگیر کا معاصر تھا، اس مجموعہ میں ایک ہجو شہزادہ کام بخش بن عالمگیر کی، دوسری خود عالمگیر کی، تیسری خان جہاں کی چوتھی ذوالفقار خان کی ایک مرثیہ عالمگیر کا مذکور ہے،

ایک خاص قابل ذکر کتاب عطریہ نورس شاہی نمبر ۳۰۰۶ ہے، اس کا موضوع عطر سازی ہے جس میں مختلف قسم کی خوشبو بنانے کی ترکیبیں لکھی ہیں، مصنف کا نام نظام الدین محمود ترسان بن مولینا حبیب اللہ شریفی ہے، یہ سلطان عادل شاہ ثانی کے زمانہ میں لکھی گئی ہے، اور بادشاہ کی خدمت میں پیش کی گئی،

نمبر ۳۰۰۵ پر نعما باخوان یغما کے نام سے عربی فارسی اور ہندوستانی بلکہ دکھنی کا ایک لغت نصاب الصبیان کے طور پر ہے،

آخری مغل سلطنت کے بوقلموں تمدن کی دو یادگارین ذکر کے قابل ہیں، ایک خلاصۃ العیش عالم شاہی نمبر ۳۰۰۱ جو عالم شاہ کے زمانہ میں معالجات طب جنسی کے موضوع پر لکھی گئی ہی اور دوسری تائید بصارت نمبر ۳۰۰۵ شمشیر شناسی اور شمشیر بازی کے فن پر تالیف ہوئی ہے، مصنف کا نام مرزا لطف اللہ تھا جو محمد شاہ کی خدمت میں رہتے تھے،

اسکے بعد اس فہرست کے اصلی مضامین ہین، جو تین حصوں میں ہیں، پہلے حصہ میں کتابون کے نمبرون کی تفصیل ہی، دوسرے حصہ میں کتابون کے نام حروف تہجی کی ترتیب پر ہیں، اور تیسرے حصہ میں انہی کتابوں کے نام تاریخی ترتیب سے درج ہیں، یہ گویا فہرست کی فہرست ہی، اس سے ہر کتاب کا پتہ مختلف ذریعوں سے بآسانی معلوم ہوسکتا ہی، حق یہ ہے کہ ڈاکٹر ایتھے نے اپنی فہرست کی تالیف میں جو محنت اٹھائی ہے اور کدوکاوش کی ہے، وہ ہر صاحب علم کے شکریہ کی مستحق ہے،

"س"

فاتحہ تفسیر نظام القرآن و تاویل الفرقان بالفرقان (عربی) از مولینا حمید الدینؒ تقطیع بڑی ضخامت ۶۴ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۲ر پتہ:- دائرۂ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اعظم گڈھ

مولینا حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ نے آیاتِ قرآنی کے ربط و نظم اور ترتیب اور تفسیر القرآن بالقرآن کے پہلو سے کلام پاک کی جو تفسیر لکھی ہے، یہ رسالہ اس کا فاتحہ ہے، اس میں ان دونوں پہلوؤں سے کلام اللہ پر غور و فکر اور اس کی تفسیر و تاویل کے اصول و طریقے بتائے گئے ہیں اور جن جن پہلوؤں سے ان پر غور کرنے کی ضرورت ہے، ان کی تشریح کی گئی ہے، یہ سترہ پہلو یا سترہ مقدمات ہیں، شانِ نزول کی حقیقت، اور اس سے مراد، تفسیر کے اخباری ماخذ، لغوی اور لسانی پہلو، مختلف آسمانی صحیفوں کی زبان اور اسلوب بیان کی ایک دوسرے سے تشریح، قرآن کی دلالتیں قطعی ہیں، آیات میں مناسبت و ترتیب، ہر سورہ کا ایک مستقل نظام ہے، قرآن اور دوسرے آسمانی صحیفوں کے حقائق اور احکام کا تقابل، سورتوں کی مقدار، تعلیمات قرآن کے موضوع، معروف و منکرات، ہر آیت کی ایک خاص دلالت ہے، نظامِ قرآنی کے اجزاء، سورتوں کے ناموں کا تعلق عمود سورۃ سے، محتمل الوجوہ خطاباتِ قرآنی کی تعیین، نزولِ قرآن کی کیفیت، قرآن کی تفسیر حدیث سے ان تمام مقدمات کی پوری تشریح و تفصیل کی گئی ہے، جس کا اندازہ پڑھنے ہی سے ہو سکتا ہے، ان میں سے بیشتر مقدمات مفسرین

کے معمول بہا ہیں، بعض مصنف کے وجدان اور برسوں کے غور و فکر کا نتیجہ ہیں، یہ رسالہ ہر صاحب علم خصوصاً ان لوگوں کے مطالعہ کے لائق ہے، جنھیں تفسیر قرآن سے ذوق ہے، اس کے آخر میں "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" اور سورہ فاتحہ کی تفسیر ہے، یہ دونوں تفسیریں مصنف کے وجدانی لطائف و نکات، اور اسرار و حکم سے مملو ہیں، جو اس کا مخصوص حصہ ہے،

طلسم حیات از جناب ماہر القادری، تقطیع اوسط، ضخامت ۲۲۱ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ مجلد، پتہ ملک دین محمد اینڈ سنز، تاجران کتب کشمیری بازار ریل روڈ لاہور،

طلسم حیات جناب ماہر القادری کے تیرہ افسانوں کا مجموعہ ہے، یہ افسانے حسن و عشق کی عام اور پامال شاہراہ سے الگ ہیں، جن کا عموماً کوئی مقصد نہیں ہوتا، بیشتر افسانوں میں قادری صاحب نے سوسائٹی یا فرد کے قابل اصلاح پہلوؤں پر دلچسپ تنقید کی ہے، یا کسی اخلاق سبق کو پیش کیا ہے، اس خشک مقصد کے باوجود کل افسانے دلچسپ ہیں، بعض محض تفریحی ہیں لیکن وہ بھی لطف سے خالی نہیں، ممکن ہے فنی نقطہ نظر سے ان میں خامیاں ہوں، لیکن مقصد کے لحاظ کر بہتر اور حسن مذاق کے اعتبار سے کامیاب ہیں،

شہری آزادی مصنفہ جناب ڈاکٹر رام منوہر صاحب لوہیا، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۴ر، پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی، لاہور، لکھنؤ،

سیاسی دنیا میں شہری آزادی یا حقوق شہریت بہت اہم شے ہے، حاکم و محکوم کی کشمکش زیادہ تر حقوق شہریت کے تحفظ ہی کے لئے ہوتی ہے، ہندوستان میں بھی یہ مسئلہ نہایت اہم ہے لیکن اس کی اہمیت کے باوجود عام طور پر لوگ اسکے مفہوم و مقصود سے واقف نہیں ہیں، اس رسالہ میں مولف نے اس کے حدود اور مفہوم و منشار کو بتایا ہے، اور امریکہ، فرانس اور انگلستان میں اسکی تاریخ کے

حصول و تحفظ کی جد و جہد اور اسکی موجودہ حالت پر روشنی ڈالی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہی کہ ان آزاد ملکون
میں بھی اب تک حقوق شہریت کے حدود کی تعیین میں حاکم و محکوم میں کشمکش جاری ہے، آخر میں ہندوستان
میں ان حقوق کی حالت دکھائی گئی ہی،

کیون اور کیسے مؤلفہ جناب عظیم بیگ صاحب چغتائی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۲ صفحے،
کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸؍ مجلد، پتہ:- نظامی پریس بدایون،

اس مفید کتاب میں مؤلف نے بچوں کے لئے روزانہ کے واقعات و مشاہدات میں سائنس
کے ابتدائی مسائل بتائے ہیں، بچوں کی اخلاقی تعلیم کے لئے بعض مفید سبق اور مختلف قسم کے دلچسپ
اور مفید معلومات ہیں، انداز بیان سادہ و آسان اور دلچسپ ہی، یہ کتاب بچوں کیلئے بہت مفید ہے،

سخنورانِ دکن مؤلفہ جناب تسکین عابدی صاحب، تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۴۳ صفحے، کاغذ
کتابت و طباعت اوسط قیمت ہے، پتے:- (۱) مکتبہ ابراہیمیہ (۲) احمد حسین جعفر علی تاجر کتب
چار مینار، (۳) مکتبۂ علیہ چار مینار، حیدرآباد دکن،

جناب تسکین عابدی نے عہد عثمانی کے دکن کے شعراء کے حالات میں یہ تذکرہ مرتب کیا ہے،
اس میں ان غیر دکنی شعراء کو بھی جگہ دی گئی ہے، جو کسی سلسلہ میں حیدرآباد میں مقیم ہیں، اسلئے شمالی ہند کے
شعراء کی بھی خاصی تعداد آگئی ہے، اس میں چھ سو شعراء کے مختصر حالات، اور ان کے کلام کے نمونے ہیں،
شاعرات کی بھی معتدبہ تعداد ہے، ظاہر ہے کہ ایک مختصر تذکرہ میں چھ سو شعراء کے حالات اور نمونۂ
کلام کی گنجایش کہاں تک ہو سکتی ہی، اس لئے بیشتر حالات اور کلام کے نمونے محض برائے نام ہین، تاہم اس
سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا، کہ اس دور کے تمام دکنی شعراء کے حالات قلمبند ہو گئے ہیں جو آیندہ تذکرہ نگارون
کیلئے کارآمد ہوں گے،

ٹیگور اور ان کی شاعری، مؤلفہ جناب مخدوم محی الدین صاحب بی اے،

عثمانیہ تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ پتہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن،

جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے، اس میں مؤلف نے رابندر ناتھ ٹیگور کے حالات زندگی اور ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو دکھایا ہے، ان کی شاعری کے طبعی اسباب و محرکات، اس کے تدریجی ارتقار، اس کے مختلف پہلوؤں اور دوروں کی خصوصیات پر تبصرہ ہے اور مذہب، سیاست، قومیت، وطنیت، تہذیب و معاشرت اور تعلیم وغیرہ تمدن کے جملہ اجزار کے متعلق ٹیگور کے خیالات اور ان کی تعلیمات کو پیش کیا ہے، اور ان کی مشن پر روشنی ڈالی ہے ہر دور کی شاعری اور اہم تصانیف پر مختصر ریویو ہے،

قطرات شبنم از جناب گوردھن داس صاحب بی اے، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۴۰ صفحے، کاغذ کتابت، و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ، پتہ :- گوردھن داس بی اے میڈن روڈ لاہور،

آج کل کے نوجوانوں میں ادب لطیف یعنی شاعرانہ نثر میں تخیلی مضامین کا بڑا ذوق ہے لیکن اس صنف ادب کیلئے بڑے لطیف ذوق شاعرانہ نگاہ اور فلسفیانہ تفکر کی ضرورت ہے، ورنہ وہ بالکل مضحکہ خیز ہو جاتے ہیں، جس کے نمونوں سے آج کل کے رسالے بھرے رہتے ہیں قطرات شبنم" جناب گوردھن صاحب کے مختصر شاعرانہ اور تخیلی مضامین کا مجموعہ ہے، اور آج کل کے بے معنی ادب لطیف کو دیکھتے ہوئے بہت غنیمت ہے، مصنف کا ذوق ستھرا ہے، اور ان میں ترقی کی کافی صلاحیت ہے،

"م"

دار المصنفین کی نئی کتابیں

تابعینؒ

علم وعمل اور مذہب و اخلاق میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے اور صحابۂ کرام کے بعد ان ہی کی زندگی مسلمانوں کے لئے نمونۂ عمل ہے اس لئے سیر الصحابہ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس میں حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز، حضرت حسنؒ بصری، حضرت اویسؒ قرنی، حضرت امام زین العابدینؒ، حضرت امام باقرؒ، حضرت امام جعفرؒ صادق، حضرت محمد بن حنفیہؒ، حضرت سعید بن مسیبؒ، حضرت سعید بن جبیرؒ، حضرت محمد بن سیرینؒ، حضرت ابن شہاب زہریؒ، امام ربیعہ رائیؒ، امام مکحولؒ دمشقی، قاضی شریحؒ وغیرہ چھیانوے اکابر تابعینؒ کے سوانح ان کے علمی، مذہبی، اخلاقی اور عملی مجاہدات و کارناموں کی تفصیل ہے، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی، ضخامت ۵۲۰ صفحے، قیمت: للعہ

مختصر تاریخ ہند

ہمارے اسکولوں میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں ان کا لب و لہجہ دلآزاری اور تعصب سے خالی نہیں ہوتا، اور اس وجہ سے ہندوستان کی مختلف قوموں میں تعصب اور بغض و عناد پیدا ہو جاتا ہے، مولانا ابو ظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسوں اور طالب علموں کیلئے اس غرض سے لکھی ہے، اس کا طرز بیان قومی جذبات سے متاثر نہ ہو اور ہندو و مسلمان فرمانرواؤں نے ہندوستان کے بنانے میں جو کام کئے ہیں وہ طالب علموں کو بلا تفریق مذہب و ملت معلوم ہو جائیں، ضخامت ۔۔۔ صفحے، قیمت: عمہ

ہندوستان کی کہانی

اس کتاب میں مولوی ابوالاسلام صاحب ندوی موظف ہماری پادشاہی نے مکتب اور ابتدائی مدرسوں کیلئے نہایت سادہ اور آسان زبان میں ہندوستان کی تمام اسلامی حکومتوں اور انگریزی زمانہ کی پوری کہانی بیان کردی ہے واقعات میں بچوں کے دلوں میں باہمی الفت و محبت کے پیدا ہونے کا خاص خیال کیا گیا ہے ضخامت ۰۰ صفحے قیمت ۱۲

اسلامی نظام تعلیم

مؤلف نے اس کتاب میں بڑی محنت سے واقعات کو تلاش کیا ہے اور انہیں اصولوں کا استنباط اور مسائل کی چھان بین کرکے اسلامی نظام تعلیم کے ہر پہلو کو پوری تفصیل کیساتھ دکھایا ہے اس لحاظ سے یہ کتاب اسلامی نظام تعلیم کا آئینہ ہے اہل علم کو اس کی قدر دانی کرنی چاہئے اور اہل تعلیم کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے (از مولوی سید ریاست علی صاحب ندوی) ضخامت ۳۰۰ صفحے قیمت

فہم انسانی

یعنی ڈیوڈ ہیوم کی مشہور کتاب ہیومن انڈرسٹینڈنگ کا ترجمہ اور اسکے مختصر حالات کے ساتھ اس کے خیالات فلسفہ پر بحث و تبصرہ، حجم ۲۰۰ صفحے، قیمت: ۱عہ

مقالات شبلی جلد ہفتم

یہ حصہ مولانا شبلی کے فلسفیانہ مضامین پر مشتمل ہے جس میں فلسفۂ یونان اور اسلام، مذہب یا کشش، مسئلہ ارتقاء، مسئلہ دوروں جیسے اہم مضامین شامل ہیں، ضخامت ۱۰۰ صفحے، قیمت: ۱۲ر

مقالات شبلی جلد ہشتم

مولانا شبلی مرحوم کے مضامین کا یہ مجموعہ انکے متفرق مضامین، مختلف تجاویز اور منصوبوں پر مشتمل ہے، اس مجموعہ پر نظر ڈالنے سے مصنف کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ایک ساتھ نظر پڑجاتی ہے، ضخامت ۱۰۰ صفحے، قیمت: ۱عہ

مسعود علی ندوی، منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

مطبع معارف میں محمد دین ولی نے چھاپکر شائع کیا

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۲۶   مئی سنہ ۱۹۳۹ء

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت پانچ روپیہ سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ

سیرۃ النبی

رسول اللہ صلعم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جس کا نام **سیرۃ النبی** عام طور سے مشہور ہے، مسلمانوں کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت و اہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے،

ابتک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہیں، پہلے میں ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں، اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جس میں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے، دوسرے حصہ میں تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے، تیسرے حصہ میں آپ کے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہے اس میں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کی گئی ہیں، پھر ان معجزات کی تفصیل کی ہے جو بروایات صحیحہ ثابت ہیں، اسکے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپ کے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ اس میں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں، پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادات کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح و حکم کا بیان ہے اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے،

چھٹا حصہ جو اخلاق پر مشتمل ہے قریباً چھپ گیا ہے، جو انشاء اللہ شروع میں ... تک پہنچ جائیگا،

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول تقطیع خورد [illegible] حصہ دوم تقطیع کلاں [illegible] تقطیع خورد [illegible] حصہ سوم تقطیع کلاں [illegible] تقطیع خورد [illegible] حصہ چہارم تقطیع کلاں [illegible] تقطیع خورد [illegible] حصہ پنجم تقطیع کلاں [illegible]

(منیجر دار المصنفین)

جلد ۴۳	ماہ ربیع الاول ۱۳۵۸ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۳۹ء	عدد ۵

مضامین

شذرات

ایک مجاہد کا ماتم

مولنا محمد عرفان صاحب معتمد خلافت بمبئی کی ناگہانی وفات کی خبر اخبارون کے ذریعہ آپ تک پہنچی ہوگی، مرحوم ہزارہ سرحد کے رہنے والے تھے، اور سلسلۂ خیرآباد کے عالم معقولات اور مدرس تھے، سنہ ۱۹۲۰ء کی قومی تحریکات نے درس و تدریس کی مسند سے اٹھا کر قوم و ملت کے عملی کامون سے ان کو وابستہ کردیا، ان کی سب سے مخلصانہ خدمت سنہ ۱۹۲۳ء اور سنہ ۱۹۲۴ء مین ملکانون کے فتنۂ ارتداد کے موقع پر ان کی جانبازی، ایثار اور محنت سے ان کے علاقون مین بیسیون میل پیادہ اور بھوکے پیاسے سفر کرنا اور ایک گاؤن سے دوسرے گاؤن مین مارے مارے پھرنا ان کی زندگی کا اہم کارنامہ ہے، اس کے بعد انھون نے جمعیۃ العلماء دہلی سے وابستہ ہوکر جمعیۃ کے کامون کو کچھ زمانہ تک انجام دیا، اور شریف حجاز اور ابن سعود کی لڑائی کے زمانہ مین حجاز جاکر معاملات کی تحقیقات کے لئے نامزد ہوے، پھر سنہ ۱۹۲۶ء مین موتمر اسلام کی شرکت کے لئے گئے اور وہان سے واپسی پر وہ بمبئی کی مجلس خلافت کے کامون مین مصروف ہوگئے، اور اسی مصروفیت مین ان کی زندگی کے آخر سال بسر ہوے، ان کی عمر اس وقت پچاس سے زیادہ نہ ہوگی، بلند و بالا، مضبوط اور قوی تھے، ایک دفعہ وہ قومی تحریکون کے سلسلہ مین قید بھی ہوے تھے، اور اسی قید مین انھون نے یہ سعادت پائی کہ

حافظ قرآن ہوئے،

مرحوم نہایت دوست پرور، ہنس مکھ، ظریف اور فیاض تھے، صوبہ سرحد سے وہ مدتون جلاوطن رہے، جلاوطنی کا دورختم ہوا تب بھی وطن جاکر اپنی خدمات کی وسعت کو انھون نے محدود کرنا پسند نہین کیا، تمام عمر مجرد رہے، اور اسی طرح پوری عمر گذار دی، ایک طرف وہ فقیر بے نوا تھے، دوسری طرف حد درجہ غیور اور شریف، غالب کا مصرع آج ہی صادق آیا ہے،

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

سیرۃ النبیؐ کی چھٹی جلد جو ابھی شائع ہوئی ہے، اخلاق پر مشتمل ہے، اس مین پہلے تفصیل کے ساتھ اسلام کے فلسفۂ اخلاق کی تشریح کی گئی ہے، پھر حقوق، فضائل، رذائل اور آداب کی ایک ایک کرکے تفصیل ہے، اس کتاب کے ایک باب مین آنحضرت صلعم کے اخلاقی تعلیم کی دلچسپ و دلپذیر تشریح ہے، اور پوری کتاب اس لائق ہے کہ مسلمان آج جب وہ انقلاب کے دروازہ پر کھڑے ہین، اس کا مطالعہ کرین، اور سمجھین کہ قومون کی ترقی منزل مین ان کے قومی اخلاق کو کہان تک دخل ہے،

یہ بات بے خطر کہی جاسکتی ہے کہ دنیا مین کوئی قوم سلطنت و حکومت کی اہل ثابت نہین ہوئی جبتک اس قوم کے اکثر افراد اخلاق عالیہ سے متصف نہ ہون، عزم و استقلال انصاف و امانت وغیرہ وہ صفتین ہین جن کے بغیر سلطنت و حکومت کا تخیل کرنا بھی مضحکہ خیز ہے، اگر ہماری قومی حکومت ناکام ثابت ہوئی تو دیکھیگا کہ اس کی ناکامی کے وجوہ ان اوصاف سے معرا ہونا ہونگے،

امسال سیرت کی اس جلد کے علاوہ چند اور کتابین دار المصنفین سے چھپکر شائع ہورہی ہین تاریخ اسلام

کی پہلی جلد جس مین آغاز اسلام سے خلافت راشدہ تک کے تفصیلی واقعات ہین (اس کی ذیل جلدین انشاءاللہ بہ ترتیب شائع ہونگی) تاریخ دولت عثمانیہ دو جلدوں مین (شروع سے اس وقت تک کے تفصیلی حالات) تاریخ اخلاق اسلام کی پہلی جلد جس مین اسلامی اخلاق کی پوری تاریخ، قرآن پاک اور احادیث کی اخلاقی تعلیمات، اور پھر اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر مختلف حیثیتون سے نقد و نظر ہے،
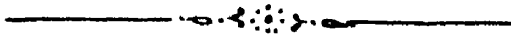
ایک اور کتاب **نقوش سلیمانی** کے نام سے زیر طبع ہے، اس مین اڈیٹر معارف کی وہ تمام تقریرین اور تحریرین اور مقدمے یکجا ہونگے جو ہندوستانی ادب و زبان کے متعلق وقتاً فوقتاً اس کے قلم اور زبان سے نکلے، امید ہے کہ یہ پچھلی چوتھائی صدی کی ادبی تحریکون کا کامیاب مرقع ہوگا، ضخامت ۴۰۰ صفحون کے قریب ہوگی،

۱۸۵۷ء کے مشہور ہنگامہ سے کچھ پہلے ہندوستان مین مولانا اسمٰعیل شہید اور حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہما کی تحریک سے مجاہدین کا جو گروہ پیدا ہوا تھا، اور اس گروہ نے ہندوستان میں اسلامی عقائد و اعمال کی اصلاح کا جو کام کیا تھا اسکی پوری تاریخ اب تک نہین لکھی گئی تھی، اور جو لکھی بھی گئی تھی وہ زمانۂ حال کے مذاق سے بہت دور تھی، اس کمی کو محسوس کرکے ہمارے نوجوان ندوی فاضل مولوی سید ابوالحسن علی صاحب مدرس دارالعلوم ندوہ لکھنؤ نے جو اسی خاندان کے چشم و چراغ ہیں بڑی تحقیق اور محنت سے سیرت احمد شہید کے نام سے ایک نہایت دلچسپ روح افزا اور ایمان پرور کتاب لکھی ہے جو چھپکر شائع ہو چکی ہے، ضرورت ہے کہ وہ لوگ جو مسلمانون کے سیاسی ذوق کو سمجھنا چاہتے ہیں اس کتاب کو پڑھیں، اور ماضی کی یاد سے مستقبل کا فائدہ اٹھائیں، کتاب میں مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی اور اڈیٹر معارف کے مقدمے اور دیباچے بھی شامل ہیں،[1]

---

[1] پتہ:- معین الدین صاحب کتب خانہ محمد علی لین، لکھنؤ۔ قیمت ۲ عام

مقالات

بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق

اس مضمون کا پہلا نمبر[1] سیاسیات کی الجھنوں میں پڑ کر خطرناک ہو رہا تھا، اسلئے جیسے بھی بنا اس کو وہیں ختم کر دیا گیا تھا، لیکن اتنے دنوں میں غور سے دیکھا تو معلوم ہوا، کہ اب سیاسیات وہ پہلے کے سیاسیات نہیں رہے، اب یہ سننے میں آتا ہے کہ سیاسیات کا اصلی میدان لاکھوں مربع میل کا وہ میدان نہیں ہے، جس کو اگلے لوگ سلطنت و حکومت کہتے تھے، بلکہ یہ دو بالشت کا پیٹ ہے، اسی کی خاطر سب کچھ ہے، اگلے زمانہ کے بھولے بھالے بزرگ کہا کرتے تھے "خوردن برائے زیستن است، نہ زیستن برائے خوردن" یعنی کھانا جینے کے لئے ہے، نہ جینا کھانے کیلئے" حضرت مسیح کہتے تھے "کہ آدمی روٹی ہی سے نہیں جیتا" لیکن آجکل کی سیاسیات نے یہ دونوں مقولے جھٹلا دیئے، اب یہ ہے کہ "جینا کھانے کے لئے ہے، نہ کھانا جینے کے لئے" اور یہ کہ آدمی روٹی ہی سے جیتا ہے، چنانچہ آج کل کے بولشوزم، کمیونزم، سوشلزم وغیرہ کی بنیاد زمین پر نہیں پیٹ پر ہے،

پیٹ کیلئے کھانوں میں سب سے زیادہ ضروری کھانا کون سا ہے، لوگ اپنے اپنے تجربہ اور عادت کے مطابق اسکے کئی جواب دے سکتے ہیں، لیکن میں سمجھا ہوں کہ جو میرا خیال ہے، وہی اکثروں کا ہوگا، یعنی یہ کہ کھانوں میں سب سے زیادہ ضروری کھانا "ناشتہ" ہے، صبح سویرے اٹھکر منہ میں کچھ پڑ جانے

سے سارے دن کے لئے ڈھارس ہو جاتی ہے،

یہ عجیب بات ہے کہ "ناشتہ" کے لئے اکثر زبانوں میں بھوک توڑنے کی اصطلاح بن گئی ہے، میں دو زبانیں جانتا ہوں ایک پورب کی اور ایک پچھم کی یعنی عربی اور انگریزی، دونوں میں یہی بات ہے، اس سے سمجھتا ہوں کہ اور زبانوں میں بھی کچھ ایسا ہی حال ہوگا، عربی میں اس کو "فطور" کہتے ہیں، اسی سے مسلمانوں کا افطار نکلا ہے، اور جس سے افطار کریں اوس کو افطاری کہتے ہیں فطور کے معنی توڑنے کے ہیں، یعنی روزہ کی بھوک کو توڑنا، ہمارا ناشتہ بھی اسی قسم کا لفظ ہے، فارسی میں اس کے معنی اس "بھوکے" کے ہیں جس نے صبح سے کچھ نہ کھایا ہو، (مؤید الفضلا و برہان قاطع) اب دیکھئے کہ یہ نام تو اس آدمی کا تھا، جس کے منہ میں صبح سے کچھ نہ پڑا ہو، اور اب ہم اس چیز کو کہتے ہیں، جو صبح سویرے ایسے آدمی کو کھلا دی جائے یعنی شخص کے بجائے چیز کا نام ہو گیا

اسی معنی میں ایک اور لفظ "نہار" آپ بولتے ہیں، "نہار منہ" یہ بھی فارسی ہے، مگر دیکھئے کہ یہ فارسی ہندوستانی سے ایسا مل گیا ہے، کہ گویا ہندوستانی ہی ہے، اسکی اصلیت "ناآہار" کہ "نا" نفی کے لئے ہے، اور "آہار" کے معنی غذا کے ہیں، "ناہار" یعنی نہیں کھایا ہوا (برہان قاطع) اب اس سے ناہاری یعنی "نہاری" تیار ہوئی، جو صبح کو نہار منہ کھائی جائے، اور لکھنو اور دلی میں یہ خاص چیز ہے، جو بازاروں میں پکی پکائی بہت چٹپٹی ملتی ہے،

"ناہار" سے "آہار" یاد آیا، آہار آٹے کی اس لیئی کو کہتے ہیں، جو کا غذ اور کپڑے پر اسلئے چڑھائی جاتی ہے کہ وہ مضبوط ہو جائے، آپ سن چکے کہ آہار غذا کو کہتے ہیں، جو بدن کی تقویت کا باعث ہوتی ہے، اس سے اس لیئی کو بھی کہنے لگے، جو کاغذ اور کپڑے کی قوت کو بڑھا دیتی ہے (برہان قاطع)

ناشتہ کے طور پر جلدی جلدی جو کھانا پہلے تیار کر کے مہمان کے سامنے رکھ دیا جائے وہی

میں اسکو "سلفہ" کہتے ہیں، اسی سے "سلف" (اگلے لوگ) کا لفظ نکلا ہے، عربی کا یہ سلفہ ہمارے ملک میں کھانے کے دسترخوان پر تو بار نہ پاسکا، مگر پینے کی یارانہ محفل میں ایک ہزار برس کے بعد اس کو جگہ مل گئی، نورالدین جہانگیر کے زمانہ میں تمباکو امریکہ سے ہندوستان آیا، اور حکیم گیلانی کی پرحکمت ترکیبوں سے چلم، تو احقہ اور نے کی شکل پیدا ہوئی، یہ تو امیروں کی باتیں تھیں، اس حقہ کی تیاری کے لئے بڑا وقت، بڑا سامان، اور ایک دو ملازم چاہئیں، اور غریبوں کے پاس نہ اتنا وقت، نہ اتنا سامان، نہ ملازم، انھوں نے اپنے ہاتھ سے بھر کر سلفہ جلدی جلدی تیار کرلیا، اور دم لگا کر اپنے کام پر روانہ ہوگئے،

تکلف کے کھانوں کو قابوں میں نکالتے ہیں، عربی میں لفظ "قعب" ہے، اس کے معنی لکڑی کے پیالہ کے ہیں، جو لکڑی کو بیچ میں کھود کر بنایا جائے (لسان) لیکن ترکی میں اور اس سے فارسی میں "قاب" کے معنی مطلق ظرف یا خانہ کے ہیں، اسی لئے عینک کے خانہ کو اور قلمدان کو قاب کہتے ہیں، اور پھر اسی سے کھانے کے بڑے برتن کو بھی ہمارے ملک میں قاب کہنے لگے،

یہی حال "رکابی" کا بھی ہے، "رکاب" فارسی میں ہشت پہل پیالہ کو کہتے ہیں، اس سے "رکابی" بنی، اور اب وہ پھیلے ہوئے چوڑے ظرف کو کہتے ہیں، اور اسی سے ہندوستانی امراء میں رکابدار پیدا ہوئے، جو کھانے کا انتظام کرتے تھے، یا عمدہ عمدہ کھانے تیار کرتے تھے،

روزمرہ کے کھانوں میں قلیہ قورمہ بہت عام چیزیں ہیں، قلیہ کی شکل عربی ہے، مگر معنی عربی نہیں، قلیہ کی عربی شکل قلیۃ ہوسکتی ہے، عربی میں "قلی" بھوننے کو کہتے ہیں، اس سے قلیۃ بن سکتا ہے، اور بھونے ہوئے گوشت کو کہہ سکتے ہیں، ہماری زبان میں قلیہ اس شوربہ دار گوشت کو کہتے ہیں جس میں کوئی ترکاری پڑی ہو، بلکہ اسی ترکاری کو قلیہ کہنے لگے ہیں، قورمہ تو ترکی معلوم ہوتا ہے،

شوربا تو صاف عربی کا شربہ ہے، مگر معنی بدل گئے ہیں، عربی میں شربۃ اوس کو کہتے

ہیں، جتنا ایک دفعہ پی لیا جائے، اس سے ایرانیوں نے شوربا بنا لیا، اور گوشت کے پانی کو کہنے لگے، اونھوں نے شوربا کو پھر شوربا ج بنا لیا، مگر ہماری ہندوستانی میں شوربا ہی رہا، بگڑا تو شوروا ہوگیا،

اسی عربی شرب بینا سے ایرانیوں نے شراب اور شربت تیار کیا، اور ہم ہندوستانیوں نے قبول کرلیا، شراب کے عربی معنی ہیں جو چیز پی جائے، یہان تک کہ قرآن میں دودھ کو بھی کہا ہے، مگر ایرانیوں نے جسکو شراب کہا اس سے متوالی شراب مراد لی، اسی سیرپ یوروپی زبانون مین "سیرپ" تیار ہوا، جو شکر پڑکر میٹھا ہوگیا،

لیکن ایرانیوں کے اثر سے ہم نے پانی میں شکر گھول کر جو چیز تیار کی، اسکو شربت کا نام دیا، لفظ عربی ہے، اور معنی عجمی، عربی میں اسکے معنی فقط پینے کے ہیں،

میٹھے کے بعد نمکین چیز یاد آئی، کباب، صورت عربی ہے، معنی عربی نہیں، کبّ عربی میں اوندھے کرنے کو کہتے ہیں، اب جس گوشت کو اوندھا کرکے آگ پر رکھئے، اس کو کباب کہئے،

کھانے کے بعد تکلفات کی دوسری قسم فرش فروش ہیں،

قالین سے بڑھ کر خوشنما خوبصورت اور مضبوط فرش شاید ہی کوئی دوسرا ہو، جو زمین کے فرش پر نہیں بیٹھتے، وہ بھی کرسیوں کے نیچے اسکو بچھاتے اور اس سے لطف اٹھاتے ہیں، مگر یہ کوئی نہیں بتاتا، کہ یہ آیا کہان سے ہے؟ ہندوستان میں تو اسکو مسلمان لائے، مگر مسلمانوں کو یہ ملا کہان؟ تاریخ کا یہ بھید خود اسی لفظ کے اندر چھپا ہے۔

ایشیاے کوچک میں آرمینیہ کے علاقہ میں ایک شہر کا نام قالیقلا ہے، جو چوتھی صدی ہجری میں یہ اسلامی حکومت کا آخری شہر تھا، اسکی طرف جب نسبت کی جاتی تھی، تو قالی کہتے تھے، عربی زبان کا ایک مشہور ادیب اور لغوی اسی نسبت سے "ابوعلی قالی" کہلاتا ہے، یہ فرش قالین اسی

شہر کی صنعت اور کاریگری ہے، اسی لئے اس کو "فرشِ قالی" پہلے نسبت کے ساتھ کہا گیا پھر استعمال کی کثرت سے اس کا نام ہی قالی پڑ گیا، یاقوت رومی متوفی ۶۲۶ھ اپنے جغرافیہ معجم البلدان میں قالیقلا کے نیچے لکھتا ہے،

وتعمل بقالیقلا هذه البسط	یہ فرش جس کا نام قالی ہے، قالیقلا
المسماة بالقالی اختصروا فی	میں بنایا جاتا ہے، لفظ میں ہلکے پن کیلئے
النسبة الی بعض اسمه لثقله	نسبت میں اختصار مدِنظر رکھا ہے، یعنی
(ج، ص۱۱ مصر)	قالیقلائی کی جگہ صرف قالی کہا ہے)

مؤیدالفضلاء میں جو فارسی کا قدیم لغت ہے، اس کو "قالی" لکھا ہے، اور ایک شعر نقل کیا ہے، فارسی شعراء نے بھی قالی ہی باندھا ہے، اور جس چیز کو ہم غالیچہ کہتے ہیں، عجب نہیں کہ وہ قالیچہ یعنی چھوٹا قالی، اب آخر کا نون "جو قالین میں ہے، وہ "ین" ہے، جو نسبت کے معنی بخشتا ہو، جیسے رنگ سے رنگین، قالین کے معنی وہ فرش جو قالی کی طرح ہو لیکن "ی" چونکہ پہلے سے موجود تھی اسلئے دوسری "ی" نہیں لگی، یہ تحقیق میری ایجاد ہے معلوم نہیں صحیح ہے یا غلط،

تکلفات کی تیسری قسم مکانات ہیں، پہلے بڑے بڑے محلوں اور ایوانوں میں اور اب بڑی بڑی کوٹھیوں میں اس حصہ کو جو نوکروں کے رہنے کے لئے بنائے جاتے ہیں، ہماری زبان میں شاگرد پیشہ کہتے ہیں، بیچارہ مولوی نورالحسن صاحب نیر مرحوم (نوراللغات کے مؤلف) نے ایک دفعہ مجھ سے استفسار فرمایا کہ اس کو شاگرد پیشہ کیوں کہتے ہیں، میں نے ظرافت سے کہا کہ مغل درباروں میں جب بادشاہ پیری مریدی کرنے لگے، تو نوکر چاکر چیلے کہلانے لگے، جس کی شہادت تاریخوں کے علاوہ دہلی کا کوچۂ چیلان دے رہا ہے، اسی چیلہ کی فارسی شاگرد بنائی گئی اور شاگرد پیشہ اس گروہ خدام کا نام پڑا، اور اس سے ان کے رہنے کے حصہ کو بھی شاگرد پیشہ کہنے لگے،

کچھ دنوں کے بعد میں اپنی بڑی بچی شمیمہ بانو کو گلستاں پڑھا رہا تھا، اور وہ حکایت آئی جس میں پردہ اور علم کا مناظرہ ہے،

این حکایت شنو کہ در بغداد　　رایت و پردہ را خلاف افتاد

علم شاہی نے جھک کر پردۂ شاہی سے شکایت کی، کہ سفر میں اور لڑائیوں میں تو مارا مارا میں پھرتا ہوں، اور قرب سلطانی تم کو حاصل ہے، تم نازنین کنیزوں کے ہاتھوں میں رہتے ہو اور

من فتادہ بدستِ شاگرداں،

اس سے خیال آیا کہ شاہی ملازمین اور خدم وحشم کے معنوں میں یہ پرانا لفظ ہے، اور اسی سے شاگرد پیشہ ہے، اور ہماری زبان میں محلوں کے اس حصہ کو کہنے لگے، جو خاص طور سے ان کے لئے بنائے جاتے ہیں،

ایک ہندوستانی لفظ کی اصلیت پر مجھے بڑا تعجب آیا، ایک دفعہ میں عربی کا مشہور لغت تاج العروس دیکھ رہا تھا، کہ لفظ "راز" پر نظر پڑی، اس کے معنی اس میں استاد اور ماہر کے لکھے تھے دفعۃً میرا دھیان اپنے ہندی لفظ راج اور راجگیر (معمار) کی طرف گیا، لیکن یقین نہیں آتا تھا، کہ عربی کا ایسا لفظ جو عربی میں بھی کتابوں اور تحریروں میں برتا نہ گیا ہو، وہ ہماری ہندوستانی میں کیسے آگیا ہوگا، لیکن دل یہی کہتا تھا، کتابیں الٹیں پلٹیں، دیکھیں، مگر سراغ نہ لگا، اس سال کی گرمیوں کی تعطیل میں برادر عزیز پروفیسر نجیب اشرف ندوی سے پٹنہ میں نصاب الصبیان کی طرح کا ایک قلمی رسالہ فارسی عربی ہندی کا ملا جس میں فارسی اور عربی الفاظ کے مقابل ہندی الفاظ جمع کئے گئے ہیں اور شاید کسی ایرانی یا پارسی کی تصنیف ہو، مصنف کا نام اور زمانہ نہیں دیا ہو، رسالہ کا نام لسان فارسیا لکھا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے ہندوستان کے کسی نو وارد ایرانی کے لئے لکھا گیا ہو، تصنیف کا مقام گجرات ہے، اس میں پیشہ وروں کا باب دیکھ رہا تھا کہ لفظ راجگیر پر نظر پڑی، جس کے معنی

س نے کَرَیا یعنی کرنے والے" کے لکھے تھے، دل نے کہا مدت کا کانٹا آج نکل گیا، اور معلوم
ہوا کہ صحیح لفظ راجگر ہے، پھر بھی پوری تشفی نہ ہوئی، خدابخش خاں کے کتب خانہ میں چلا گیا، فارسی
لغت کی کئی کتابیں نکلوا کر دیکھیں، مطلب کا پتہ نہ پایا، آخر فرہنگ رشیدی عبدالرشید ٹھٹوی میں یہ
عبارت نکلی،

راز معمار و سرداران گلکاراں ہندی راج گویند لیکن بدیں معنی عربی است عسجدی گوید

بیکے تیر ہمہ فاش کند ستر حصار در برو کردہ بود قیر گل کار راز

اس عبارت نے پوری تشفی کر دی، واپس آکر برہان قاطع میں دیکھا، تو یہ لکھا پایا،
"و بنا، و گل کار را نیز گویند و بعزنی طیان خوانند و بعضے گفتہ اند راز در عربی کلانتر و
بزرگ بنایان باشند"۔

یعنی جس معنی میں ہم مستری کا لفظ بولتے ہیں،

اچھا تو پھر مستری کیا لفظ ہے، خیال جاتا ہے، کہ یہ اصل میں مسطری ہے، مسطر اوس
آلہ کو کہتے ہیں جس سے سطر سیدھی کیجاتی ہے، پرانے زمانہ میں ایک موٹے کاغذ پر موٹے تاگہ کو
سیدھ سے ناپ کر آج کل کے رولدار کاغذ کی طرح سی دیتے تھے اور اس پر لکھنے کے کاغذ
کو دبا کر سطروں کو ابھارتے تھے، تاکہ لکھنے میں سطریں سیدھی ہوں، یہ تو کاغذ کی بات چیت
ہوئی، عمارتوں میں دیواروں کی سیدھ قائم کرنے کے لئے جس آلہ سے کام لیا جاتا تھا، وہ بھی مسطر
ہوا اور اوس مسطر سے جو ماہر فن دیکھ بھال اور ناپ جوکھ کر عمارات کی دیواروں کی سیدھ درست کرتا
تھا وہ مسطری کہلایا، اور پھر جب وہ ہندوستانی زبانوں سے ادا ہوا تو مسطری کا مستری ہو گیا
اور اب وہ ہماری زبان کا لفظ ہے، اور ماہر کاریگر کے معنی میں بولا جاتا ہے،

بڑھیوں کی بول چال میں ایک لفظ "خراد" اور "خرادنا" ہے، میز کرسی یا پلنگ وغیرہ کے

پاؤں کو چھیل کر کہیں موٹا، کہیں پتلا، کہیں گاؤ دم وغیرہ مختلف شکلیں دیتے ہیں، یہ خالص عربی لفظ خرط ہے، عربی میں اس کے معنی لکڑی کے اس طرح چھیلنے کے ہیں، کہ اسکی اوپری پرت اتر جائے اس سے خرّاط بنا، یعنی وہ آلہ جس سے لکڑی کو اس طرح چھیلا جائے، وہ خرّاط ہمارے ہاں خراد ہوا، اور اس سے خراد پر چڑھانا محاورہ اور خرادنا مصدر بنا، یہ لفظ اس حقیقت کا پتہ دیتا ہے، کہ لکڑی کی یہ صنعت کاری مسلمانوں کے ذریعہ ہندوستان میں آئی اور پھیلی،

معماروں کے ایک ضروری آلہ کا نام ہماری زبان میں ساہول ہے، لمبے تاگہ میں ایک وزنی لوہے یا دھات کا گول لٹو سا بندھا ہوتا ہے، اسکو نیچے لٹکا کر اونچائی سے دیوار کی سیدھ دیکھتے ہیں، خوارزمی نے مفاتیح العلوم میں ایک آلہ کا نام شاقول لکھا ہے، اور اسکی تشریح یہ کی ہے هوثقل يشد به فى طرف حبل يمده سفلا يحتاج اليه النجارون والبناؤن (ليڈن ص ۲۵۵) یعنی وہ ایک بوجھل چیز جو رسّی کے کنارے باندھ کر نیچے لٹکائیں، اسکی ضرورت بڑھیوں اور معماروں کو ہوتی ہے، اس تشریح سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ ہندی ساہول کی عربی صورت شاقول ہی ہے، ادر عربی میں شقل کے معنی وزن کے لکھے ہیں، مگر کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شاقول ش سے نہیں بلکہ ثاقول ث سے ہو، یعنی ثقل اور بوجھ کے معنی میں، مگر ہیئت کی کتابوں میں بھی شاقول ہی دیکھا گیا ہے، کیا وہاں بھی تصحیف ہوئی ہے،

اسی کتاب میں بڑھیوں کے ایک اوزار کا نام "الکونیا" بتایا گیا ہے، اور اسکی تشریح یہ کی ہے کہ يقدرون بها الزاوية القائمة، (ص ۲۵۵) یعنی اوس سے زاویہ قائمہ نکالتے ہیں، کوئی کچھ کہے ہو نہ ہو یہ لفظ کونیا ہے، جس کو آج بھی ہمارے کاریگر بولتے اور برتتے ہیں، اب اس کا تلفظ "گُنیا" ہو یعنی وہ آلہ جس سے کونہ (زاویہ) ناپیں، یہ ہاتھ ڈیڑھ ہاتھ کی ۲ دو لکڑیاں ہوتی ہیں، جن کو بالکل مستقیم جوڑ کر کونہ (زاویہ قائمہ) نکالتے ہیں، اور اسکی صورت یہ ہوتی ہے، ⊿

یہ کتاب چوتھی صدی ہجری میں لکھی گئی ہے، تعجب ہوتا ہے کہ یہ لفظ اتنے پرانے زمانہ میں ہندوستان سے غزنویوں کے زمانہ میں وسط ایشیا تک کیسے چلا گیا،

اس کے بالمقابل ایک دوسرا لفظ ہے، جو وسط ایشیا سے ہندوستان آیا ہے، یہ جہاز کا لفظ ہے، جہاز دیکھنے میں تو عربی ہے، مگر جس معنی میں یہ ہماری زبان میں بولا جاتا ہے، وہ لفظاً ہندوستانی یا ہندوستانی فارسی ہے، اصل میں اسکے لفظی معنی تو سامان کرنے کے ہیں، اس سے تجہیز بنا، جسکے جہازیوں میں یہ معنی پیدا ہوئے، کہ کشتی میں سامان رکھ کر کہیں بھیجنا، یہ اصطلاح تیسری صدی ہجری میں بن چکی تھی، بزرگ بن شہریار کے سفرنامہ میں ہے،

إِنَّهُ جَهَّزَ مَرْكَباً لَهُ الى الزانج — اس نے اپنا ایک جہاز سامان لادکر جادہ بھیجا، (صفحہ)

یہ تو دریائی اصطلاح ہوئی لیکن اس کے سو برس بعد یہ لفظ وسط ایشیا میں خشکی کے سامان تجارت کے معنوں میں سننے میں آتا ہے، حدود العالم میں جو ۳۷۲ھ کی تصنیف ہے، یہ لفظ ان معنوں میں بار بار آیا ہے، شروع شروع میں تو مجھے تعجب ہوا کہ یہ جہاز خشکی میں کیسے چلا، بعد کو سمجھ میں آیا کہ اب یہ لفظ سامان کرنے کے معنی سے قطع مسافت کرکے لفظ "سامان" کی منزل میں پہنچا ہے؛

"وجہازہائے ہندوستان بدیں شہر کہا افتد...... وآنجا بردۂ ہندو جہاز ہندوستان افتد، صفحہ ۴۴ (ایران)

اس سے یہ بات سمجھ میں آگئی کہ یہی جہاز بعد کو خشکی سے تری میں آگیا، اور سامان تجارت کے بجائے سامان تجارت لے جانے والے جہازوں کو خود جہاز کہنے لگے، ہندوستان میں اکبر کے زمانہ میں فرشتہ نے اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کیا ہے،

دگفتہ رفرنگیاں جہازات متردد ساختند، (جلد ۱ صفحہ ۳۷۱ نولکشور)

اب ہماری زبان میں یہ لفظ مطلق جہاز کے معنی میں بولا جانے لگا، اور سامان تجارت اس سے رخصت ہوگیا،

اسی سے ہماری زبان میں خوشی اور غم کے دو لفظ نکلے ہیں، ایک "جہیز" اور دوسرا "تجہیز" جہیز اس سامان کو کہتے ہیں جو شادی میں باپ کی طرف سے لڑکی کو ملتا ہے، اس معنی میں یہ لفظ بھی خالص ہندوستانی ہے، اسکی اصل جہاز ہے "سامان دینا" یا "سامان کرنا" فارسی کے قاعدہ سے الف میں امالہ ہو کر جہاز سے جہیز ہو گیا ہے، اور اس جہیز پر اب کسی عرب یا ایرانی کا قبضہ نہیں رہا،

جہاز مردہ کے کفن دفن کے سامان کو بھی عربی میں کہتے ہیں، جس سے مصدر "تجہیز" بنا یعنی سامان کرنا اس سے ہماری زبان میں "تجہیز و تکفین" کا لفظ پیدا ہوگیا،

ذرا ذرا سی مناسبت سے دیکھئے تو کیسے کیسے لفظ بنتا اور معنی بدلتا ہے، ذرا اسی "ذرا" پر غور کیجئے کہ کیا یہ عربی کا "ذرہ" نہیں جسکو آپ "ذرۂ بے مقدار" کی صورت میں اچھی طرح پہچانتے ہیں مگر استعمال کی کثرت سے مخفف ہو کر ذرا بہت ہی تھوڑے کے معنی میں آگیا، اور ایسا ہوگیا، کہ اب اسکو ذرہ سے ذرا بھی تعلق نہیں رہا،

ہماری زبان میں ایک لفظ مضمون کی "سرخی" یعنی عنوان ہے، دیکھئے تو یہ سیاہی سے سرخی کیسے بن گیا، بات یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں قلمی کتابوں میں باب اور عنوان کو امتیاز کے لئے سرخی سے لکھا کرتے تھے، اب ہمارے زمانہ میں جب چھاپا ایجاد ہوا، تو خود باب کے یا مضمون کے عنوان کو سرخی کہنے لگے، چاہے آپ اسکو سیاہی سے ہی لکھیں، اس لفظ کی یہ توجیہ تو پہلے ہی سے ذہن میں آرہی تھی، مگر اتفاق سے ایک پرانی قلمی کتاب سے سند بھی ہاتھ آگئی، تو اپنے ذہنی الہام پر تصدیق کی مہر لگ گئی، شیخ نصیر محمود چراغ دہلی کے مرید سید محمد حسنی اپنے مکتوبات میں ایک جگہ لکھتے ہیں، :-

"کیفیت دیباچہ کہ بقلم مبارک آن محبوب نشستہ بودند، برائے سرخی نشستن آن سپیدی نشستہ عین فرستادہ شدہ است دردیباچہ بنویسند...... ذات نقطہ صلوٰۃ سرخی بنویسند،" (کتبخانہ حکیم عبدالعزیز مشرقی جالندھر شہر)

کاغذات کی مسل (م۔ س۔ ل،) ایک عام دفتری اصطلاح ہے، اسکی اصل عربی لفظ مثال ہے، سرکاری شاہی کاغذات کی اصل تو دفتر میں رہتی تھی، اور اسکی بعینہ نقل (مثال) لوگوں کے پاس بھیجی جاتی تھی، اس سے مثال کے دوسرے معنی فارسی میں شاہی فرمان کے پیدا ہوے، اور اسکی جمع "امثلہ" اور "مُثُل" ہیں۔ مثال اور مُثُل نے مسل کی ہندی شکل اختیار کی، مثال اور امثلہ کا استعمال غالباً سلجوقیوں کے زمانہ سے رواج پایا، تاریخوں میں کثرت سے یہ لفظ آتا ہے،

نستعلیق، ایک خاص فارسی خط کا نام ہے، یہ اصل میں "نسخ" اور "تعلیق" کی ہندی ترکیب ہے، ہندی ترکیب کا خاصہ ہے کہ جب دو لفظ ملا کر ایک بنائے جاتے ہیں، تو بیچ کا ایک دو حرف لفظ کو ہلکا کرنے کے لئے گرا دیتے ہیں، اس طرح نسخ و تعلیق مل کر نستعلیق بنا، عربی میں نسخ لکھنے اور نقل کرنے کو کہتے ہیں، اس مناسبت سے اہل عجم نے عربی خط کا نام نسخ رکھا، تعلیق اور تعلیقہ کے نام سے اس نے فارسی شکل اختیار کی، اور ان دونوں سے مل کر نستعلیق خط بابر کے زمانہ میں بنا، یہ وہی خط ہے جس میں آج کل اردو لکھی جاتی ہے، یہ خط دوسرے شکستہ وغیرہ خطوں کے مقابلہ میں بہت بنا کر نہایت تکلف سے ٹھہر ٹھہر کر لکھا جاتا ہے، اس سے نستعلیق آدمی اور نستعلیق بول چال کی شکلیں پیدا ہوئیں،

چراغ ہدایت میں ہے:۔

"نستعلیق گوئی حرفہا را ساختہ گفتن، و عبارت ما بتکلف ادا ساختن اشرف گویدؔ،

ز نستعلیق گویا قوت لب، ریحان خط دا غم،

اس سے ہماری زبان میں یہ وسعت پیدا ہوئی، کہ نستعلیق لباس نستعلیق چال، اور نستعلیق

بول چال کہنے لگے"

بعض لفظوں کی ظاہری شکل وصورت کیسا دھوکا دیتی ہے، کتنے ہندوستانی ایسے گورے چٹے ہوتے ہیں، کہ ولایتی معلوم ہوتے ہیں، اور بعض سونلے رنگ کے ایرانی بھی دیکھے ہیں، ہماری زبان کا ایک بہت ہی خوبصورت لفظ "چُبلا" ہے، جو غزلگو شاعروں کے ہاں خوب خوب کام آتا ہے، اسکی شکل تو ہندی ہے، مگر ہے ایرانی برہان قاطع میں ہے،

"چُبلہ بضم اول وبائے ابجد بر وزن سنبلہ شتاب واضطراب راگویند"

ہم سمجھتے تھے کہ اس کا تعلق ہمارے ہندی لفظ "چھل بل" سے ہے، اب غور کرنا پڑے گا،

لفظ بھی کیا کیا صورت بدلتے ہیں، موٹے کپڑے کو ہم "گفش" کہتے ہیں، مگر یہ آیا کہاں سے فارسی میں اسکی صورت "گبز" ہے، (بفتح اول وسکون ثانی وزائے نقطہ دار، ہرچیز گندہ وقوی وسطبر اگویند" (برہان قاطع) اس کی دوسری شکل "غفص" کی ہے، صورت تو عربی ہے، مگر عربی نہیں،

"احدی" کے معنی ہماری زبان میں سست اور کاہل کے ہیں، مگر ان سست کاہلوں کی پیداوار تاریخی ہے، اَحَدی، اَحَدی، ہی، اَحَد کے معنی عربی میں ایک ہیں، وہ سپاہی جو فوج سے الگ اکیلا ڈیوڑھی کی خدمت پر مامور رہتا تھا، اکبر نے اس کو احدی (اکیلا) کا لقب بخشا، یہ احدی کہلاتے تھے، اور ڈیوڑھی پر پڑے رہتے تھے، کوئی کام کاج ان سے متعلق نہ تھا، اسلئے زبانِ خلق نے اسکو سست وکاہل کے معنوں میں کہکر پکارا، زبان خلق کو کون روک سکتا ہو،

ہماری زبان میں ایک لفظ "قلعی" ہے، آئیے اسکی بھی قلعی کھولیں، ہم لکھتے گو "قلعی" ہیں مگر وہ قلعی نہیں، ہماری زبان میں اس کے معنی سپیدی اور صفائی کے ہیں، برتنوں پر قلعی کی جاتی ہے، اور مکانوں پر قلعی پھیری جاتی ہے،

یہ لفظ گو پرانی عربی کا نہیں، مگر پھر بھی عربی لغتوں میں ملتا ہے "قَلَعیّ" عربی میں (لسان) اور انگ

اس سے فارسی میں (مؤید الفضلاء) رانگے کو کہتے ہیں، مگر رانگے کو قلعی کیوں کہتے ہیں، لسان العرب کا بیان ہے، کہ قلع ایک کان کا نام ہے جس سے رانگے کی بہترین قسم نکلتی تھی، اسلئے اس کی طرف نسبت کرکے اچھے رانگے کو قلعی کہتے ہیں، اور چونکہ اسی رانگے سے تانبے کے برتنوں پر سپیدی کی جاتی ہے، اسلئے اس کو قلعی کرنا کہنے لگے، پھر چونے سے بھی اگر مکانوں پر سپیدی کی جائے تو اس کو بھی قلعی کرنا کہدیا، ہماری زبان میں ان استعمالوں سے یہ معنی پیدا ہوئے، کہ کسی داغ دھبے یا کسی کے عیب کو اگر چھپایا جائے، تو وہ اس پر قلعی کرنا ہوا، اور اگر اس داغ دھبے اور عیب کو ظاہر کرکے سب کو دکھایا جاتا ہے، تو وہ قلعی کھولنا ہوا،

تماشا بھی عجیب تماشے کا لفظ ہے، لفظ تو عربی ہے، لیکن معنی عجمی ہیں" یہ مشی "سے بنا ہے جس کے معنی چلنے کے ہیں، اس کو باب تفاعل میں لے گئے، تو تماشی ہوا، اور معنی باہم مل کر چلنا ہوئے عجمیوں نے تماشی کو اپنے قاعدہ سے تماشا بنالیا، جیسے تمنی کو تمنا بنادیا، چونکہ سیر و تفریح کے لئے چند احباب ساتھ مل کر چلتے ہیں، اسلئے خود سیر و تفریح کو تماشا کہنے لگے، اس کے بعد آگے بڑھے تو سیر و تفریح کے سامان کا بھی تماشا نام رکھا،

بجرم عشق تو مارا کشند غوغائیست
تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشائیست

ارمغانِ احباب

یعنی

دلّی اور اسکے اطراف

آج سے پنتالیس برس پہلے

از مولینا حکیم سید عبد الحیؒ صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماؒ

(۵)

انبہٹہ | روز پنجشنبہ یازدہم شعبان، علی الصباح گاڑی آگئی، اور ہم لوگ حوائج ضروری سے فارغ ہوکر روانہ ہوئے قارا(؟) سہارنپور تک ملا عنایت اللہ خاں صاحب تھانہ دار پنشنر و مولوی نظام الدین صاحب بطریق مشایعت کے ساتھ آئے، پھر ہم نے ان کو باصرار واپس کیا، تقریباً ایک بجے ہم انبہٹہ پہونچے، اور ترکر جماعت کیساتھ ظہر کی نماز ادا کی، اس کے بعد حضرت شاہ ابوالمعالیؒ کے درگاہ پر حاضر ہوکر فاتحہ پڑھا، پھر سوار ہوئے عصر کے وقت گنگوہ پہونچے،

گنگوہ | شہر سے باہر ایک محلہ ہے سرائے پیرزادگان، اس میں حضرت مولینا رشید احمد صاحب کا دولتخانہ ہے، شہر مثل اور قصبوں کے نہایت پر رونق اور آباد ہے، بلکہ اس طرف کے جس قدر قصبے دیکھے گئے، نہایت ہی آباد ہیں، اودھ کے اکثر شہروں سے زیادہ ان میں رونق ہے، اور اکثر قصبوں میں میونسپلٹی کا انتظام ہے، پانی پت اور دیوبند اور گنگوہ اس بارہ میں خاصکر ذکر کے قابل ہیں، بہرحال ہم سرائے پیرزادگان میں آئے، پہلے خانقاہ کے باہر ایک نشست کے مکان میں جو نہایت آراستہ تھا مولینا کے صاحبزادہ حکیم مسعود احمد صاحب ملے، ترکی ٹوپی اور قمیص پہنے ہو

بیٹھے تھے، میں سمجھا کوئی طالبین ہیں، انھوں نے فرمایا کہ خانقاہ تشریف لے چلئے مولینا وہیں ہیں، ہم خانقاہ آئے، حضرت مولوی صاحب استنجا کر رہے تھے، فرمایا کہ کمرہ میں چلو، ہم گئے، تھوڑی ہی دیر کے بعد نکل کر مسجد آئے، نماز پڑھی، پھر کمرہ میں مولینا کی خدمت میں حاضر ہوئے، بھائی جی مسجد ہی میں رہے،

مولینا شاہ رشید احمد صاحب گنگوہی مجھ سے پوچھا کہاں سے آئے ہو، میں نے کہا رائے بریلی سے، پوچھا کیوں آئے ہو، میں نے کہا حضور کی زیارت کے واسطے،

کہنے لگے، مطلب کہو، بے مطلب کوئی کسی کی زیارت کرتا ہے، میں نے کہا مطلب کچھ بھی نہیں یہی مطلب ہے کہ ہم زیارت کو آئے ہیں، کہا دوسرے کون ہیں، میں نے کہا میرے بھائی ہیں، کہا بڑے بھائی ہیں، میں نے کہا پھوپھی زاد بھائی، میں نے کہا مولوی ابوالقاسم صاحب[1] نے آپ کو سلام عرض کیا ہے، کہا مولوی صاحب اچھے ہیں، میں نے کہا جی ہاں، پوچھا کہ وہ رائے بریلی گئے ہیں، میں نے کہا ارادہ تو تھا، مگر میرے سامنے تک نہیں گئے تھے، کہا وہ تمھارے کون ہیں، میں نے کہا بھائی، کہا سگے بھائی ہیں، میں نے کہا ماموں زاد، کہا سگے ماموں زاد، میں نے کہا جی ہاں، کہا ان کی کیا عمر ہے، میں نے کہا پینتیس چھتیس برس کی، کہا ابھی نو عمر ہیں، اس کے بعد میں نے کہا شیخ عبد الخالق صاحب[2] نے آپ کو سلام کہا ہے، کہا شیخ صاحب اچھے ہیں، میں نے کہا جی ہاں، میں نے کہا کہ مولوی عبد الحکیم صاحب و مولوی رحمت علی صاحب وغیرہ نے بھی سلام عرض کیا ہے، کہا سب اچھے ہیں، میں نے کہا سب اچھے ہیں، اس کے بعد میں نے کہا کہ میں مسلسل بالاولیہ سننا چاہتا ہوں، کہنے لگے کہ اس کی سند خود مجھ کو نہیں ہے، شاہ صاحب کے یہاں جا کر سبق میں شریک ہو گیا تھا، نہ مسلسل بالاولیہ کی سند ہے، نہ مسلسل بالتمر و مسلسل بالمصافحہ کی، تبرک کے واسطے لوگ سند لیتے ہیں، ورنہ یہ گڑیوں

---

[1] ہنسوی [2] مولینا عارف ہنسوی کے والد بزرگوار مرحوم،

کا کھولنا ہے، مجھ کو کبھی ان کا خیال نہیں ہوا، اصل مقصود کی طرف توجہ رہے، اصل مقصود یہ ہے کہ اشکال حدیث کا حل کیا جائے، تعارض دفع کیا جائے، مسئلہ ثابت کیا جائے، تفقہ حاصل ہو اسی کی طرف میرا خیال رہا حنفی شافعی جو ہوں اپنا مسئلہ ثابت کریں، مولوی عبدالقیوم صاحب کی زیارت ہوئی، سو ان سے بھی میں نے نہیں عرض کیا ایک استاد نے میرے کسی کو اجازت دی تھی مجھ کو بھی بلایا، میں نے ان سے عذر کردیا کہ مجھ کو اس سے کیا حاصل، جو بکار آمد چیز ہے، وہ حاصل ہونی چاہیئے، اگر تم کہو تو جیسی کچھ ناقص ہے، سنادوں، میں نے کچھ جواب نہیں دیا، اسکے بعد کہا تم نے کس سے کس سے پڑھا ہے، میں نے سب حال بیان کیا، اس کے بعد کہا کہ اب آرام کرو تھکے ماندہ ہو، میں اٹھکر باہر آیا۔

مولوی صاحب بہت ضعیف و نحیف ہیں، عمر کی حیثیت سے یہ ضعف نہیں ملتا، کیونکہ عمر غالبًا ساٹھ سے کچھ ہی متجاوز ہوگی، بڑھاپے کے ایسے آثار نمودار نہیں ہیں، بلکہ بیماری کا ضعف ہے، چہرہ سے نحافت معلوم ہوتی ہے، قد بالا، اور گورے چٹے آدمی ہیں، داڑھی بھری ہوئی لانبی کھچڑی بال، مزاج میں کسی قدر تند معلوم ہوتے ہیں، یا شاید بیماری کی وجہ سے ہوگئے ہوں۔ وقار و ہیبت غالب ہے، سکوت و وقار کے ساتھ ہر وقت رہتے ہیں، کسی کو زیادہ مجال گفتگو کی نہیں ہے سب چپ چاپ ہر وقت سامنے بیٹھے رہتے ہیں، بیماری کی وجہ سے مسجد نہیں آسکتے تھے، مرض نے پھر اعادہ کیا تھا، کل سے مسجد تشریف لیجاتے ہیں، نماز پنجوقتہ خود ہی پڑھاتے ہیں، قرأت کی معلوم ہوتا ہے کہ تجوید و قرأت میں دخل رکھتے ہیں، بہت صاف اور سیدھی آواز میں پانی پت کے لہجہ میں پڑھتے ہیں، مغرب اور عشا کی نماز حسب معمول خود پڑھائی، جس وقت وہ تشریف لاتے ہیں، اسی وقت تکبیر ہوتی ہے، لوگ پہلے سے منتظر رہتے ہیں، مولوی صاحب کے لباس و مکان میں بہت تجمل ہے، سب چیزیں آراستہ قرینہ سے رکھی ہوئی ہیں، دو دو دیوار گھڑی آئینہ

ی جانماز اوس پر اونی چوتھی چوپرت بچھی ہوئی، چھوٹے چھوٹے تکیہ رکھے ہوئے ایک عمدہ پلنگڑی، اس پر گدہ، گدہ پر سفید چاندنی دولائی نہایت عمدہ، الماری میں قرینہ سے کتابیں چنی ہوئیں چٹائی کا کمرہ میں فرش نہایت صاف شفاف، بہر حال نہایت تجمل کیساتھ، مگر سادگی کے انداز میں رہتے ہیں، اوسی کمرہ کے سامنے جو حجرہ ہے، اس میں میرے رہنے کا حکم ہوا،

بروز جمعہ دوازدہم شعبان۔ صبح کو اٹھکر حوائج ضروری سے فارغ ہوکر خاکسار مولوی صاحب کی خدمت میں گیا، مولوی صاحب اندر کے کمرے میں پلنگڑی پر لیٹے ہوئے تھے، ایک صاحب اور بیٹھے تھے، کچھ لوگ باہر کے کمرہ میں ادب سے سر جھکائے ہوئے بیٹھے تھے، میں بھی باہر ہی بیٹھنے لگا آواز دیکر کہا اندر آجاؤ، میں اور بھائی جی اندر گئے، فرمایا معاف کرنا، معذور ہون، میں نے کہا آپ آرام سے لیٹے رہئے، یہ کہکر فرش پر میں بیٹھ گیا، مجھ سے فرمایا کہ کل مسلسل کے نسبت آپ نے کہا تھا خیر جیسی ہے، ناقص ہے یا کامل سنائے دیتا ہون، الرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰن اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ يَرْحَمُكُمْ مَنْ فِی السَّمَاءِ اسکی سند یہ ہے کہ میں نے مولوی محمد قاسم صاحب سے سنا میں جب شاہ صاحب کی خدمت میں گیا، تو پہلے سے وہ ان کے یہاں پڑھتے تھے، مجھ کو یاد نہیں کہ پہلے بھی ان سے حدیث کا مذاکرہ مجھ سے ہوا ہے یا نہیں، اونھون نے شاہ عبد الغنی صاحب سے سنا اور شاہ صاحب نے مولینا محمد اسحاق صاحب سے اور مولینا محمد اسحٰق صاحب نے شاہ عبد العزیز صاحب سے اور شاہ عبد العزیز صاحب نے شاہ ولی اللہ صاحب سے، اور ان کی سند سب کہین مشہور ہے،

اوسکے بعد مجھ سے کچھ بھوپال کا حال پوچھتے رہے، پھر فرمایا کہ بھوپال سے کب آئے، میں نے کہا چار پانچ مہینے ہوئے، فرمایا، کچھ درس تدریس ہوتی ہے، میں نے کہا اب تک اتفاق نہیں ہوا لیکن اب ارادہ ہے، فرمایا کہ رائے بریلی میں طلبہ ہیں، میں نے کہا نہیں، وہ چھوٹا شہر ہے، لکھنؤ میں ہیں، فرمایا کہ لکھنؤ بیس کوس ہے، دو گھنٹہ کا راستہ ہے، اور ریل بھی ہے، پھر میں نے کہا کہ

رائے بریلی ایک چھوٹا شہر ہے، اور غریب خانہ خاص شہر میں بھی نہیں ہے، بلکہ ایک مقام ہے تکیہ ایک میل کے فاصلہ پر اس میں ہی، کہنے لگے، آپ تکیہ کے رہنے والے ہیں، میں نے عرض کیا جی ہاں کہنے لگے وہ ایک محلہ ہے، میں نے کہا سواد شہر میں ہے، محلہ کے طور پر نہیں ہے، کہنے لگے بڑی بستی ہے، میں نے کہا نہیں، ہمیں لوگوں کے کچھ مکانات ہیں، کہنے لگے پچاس ساٹھ آدمی ہوں گے، میں نے کہا کل برادری غالبًا اتنی ہوگی، لیکن اب جو تکیہ پر رہتے ہیں، وہ دس بارہ سے زیادہ نہ ہوں گے، کہنے لگے ایک صاحب پہلے آئے تھے میاں عرفان حضرت سید صاحب کے بھائی کے نواسے، میں نے عرض کیا وہ سید صاحب کے نواسہ ہیں، اور ان کے بھائی کے پوتے، فرمایا کہ حضرت کی اولاد صلبی بھی ہے، میں نے کہا جی ہاں دو صاحبزادیاں تھیں، بڑی صاحبزادی کے جو بیٹے تھے، وہ میرے پھوپھا تھے، ان کا انتقال ہو گیا، دوسری صاحبزادی کے تین بیٹے ہیں، مولوی عرفان صاحب اور ان کے بھائی، اسی طور پر کچھ دیر خاندان کے نسبت کچھ باتیں کرتے رہے، پھر اٹھکر گھر تشریف لے گئے، تھوڑی دیر کے بعد پھر تشریف لائے کھانا آیا، ہم سب نے کھانا کھایا، پھر نماز کی تیاریاں ہوئیں، مسجد گئے، مولوی صاحب کے صاحبزادے بھی آئے، ایک صوف کا سیاہ چوغا در ترکی ٹوپی پہنے ہوئے، پھر مولوی صاحب تشریف لائے، ایک شامی سیاہ عمامہ باندھے ہوئے اور دوہرا کہ انگرکھے کے اوپر ایک فاختئی رنگ کا بانات کا کوٹ پہنے ہوئے، جس کے اطراف طلائی لیس دو انگل کی ہوئی اور لیس کے اوپر انگریزی کلابتو کا نہایت عمدہ کام اور آستینوں میں ترنج بنے ہوئے، جب مسجد آئے تو لوگ کھڑے ہونے لگے، فرمایا بیٹھے رہو، آکر اول صف میں ایک جگہ جانماز پر جو بچھی ہوئی تھی بیٹھ گئے، سنت پڑھ کر خود ہی خطبہ پڑھا، مولینا محمد اسمٰعیل کا جمع کیا ہوا، اوس کے بعد وہی جوتی نیزہ علم کے مصلے پر بچھا دی گئی، اوس پر نماز پڑھائی، اوس کے بعد سنتیں پڑھکر کمرہ میں آئے، باہر کے کمرہ میں چارپائی بچھا دی گئی تھی، اوس پر لیٹ گئے، اور ملنے والے اس کے گرد فرش پر بیٹھ گئے، ہم بھی جا کر

بیٹھے، لوگ اپنی اپنی عرض معروض کرتے رہے، وہ لیٹے ہوئے تسبیح پڑھتے جاتے تھے بھائی جی نے بیعت کی استدعا کی سلسلہ احمدیہ میں، فرمایا، شاہ عبدالخالق صاحب آپ کے قریب ہیں، ان سے بیعت کیجئے، وہ سلسلہ احمدیہ میں بیعت لیں گے، میں سلسلہ چشت میں بیعت لیتا ہوں، اور میرے یہاں کچھ ہے نہیں، آپ کو کچھ فائدہ نہ ہوگا، بھائی جی نے کہا میں دخول سلسلہ چاہتا ہوں، فرمایا کہ لوگ بیعت کرنے کے بعد پھر کچھ اور آرزو کرتے ہیں، تو مجھ کو شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے، شاہ عبدالحق صاحب شاہ احمد سعید صاحب کے سلسلۂ احمدیہ میں ہیں، ان سے بیعت کیجئے، بھائی جی نے کہا میں سلسلۂ احمدیہ میں حضرت سید صاحب کے سلسلہ میں شریک ہونا چاہتا ہوں، فرمایا کہ البتہ ان کے سلسلہ میں داخل کرسکتا ہوں، ہمارے بڑے میاں صاحب سید صاحب کے مرید تھے، اس کا میں ذمہ دار ہوں، کہ اس سلسلہ میں آپ داخل ہوجائیں گے، لیکن اور کچھ فائدہ نہ ہوگا، میرا کام پڑھنا پڑھانا ہے، اگر آپ کو صرف دخول سلسلہ مقصود ہو تو بہتر ہے، بعد نماز عصر کے لیکن استخارہ کرلیجئے، بھائی جی نے کہا میں استخارہ کرچکا ہوں، فرمایا کہ پھر دو رکعت نماز پڑھکر دعاے استخارہ پڑھئے، اسکے بعد میں اٹھ آیا، عصر کے بعد پھر حاضر ہوا، خود بدولت اندر کے کمرہ میں تھے، میں اور بھائی جی باہر کے کمرہ میں، مجھ کو دیکھ کر بھائی جی کو اشارہ کیا، آئیے، وہ اندر گئے، اور مجھ سے کہا آپ وہیں بیٹھے، میں بیٹھا رہا، لیکن بسبب قرب گفتگو سب سنتا جاتا تھا، پہلے بیعت کے مسئلہ پر گفتگو کی، اس کے اقسام اور احکام کا نہایت تفصیل کیساتھ بیان کیا، اور غرض وغایت اسکی بیان کی، پھر خانوادوں کا ذکر کیا، ان کے اختلاف کا بیان کیا، پھر خطبہ مسنونہ پڑھکر بیعت مسنونہ لی اور توبہ کرائی، اسکے بعد ذکر تلقین کیا، جب سب مراتب طے ہوگئے، تو مجھ کو بلایا، میں اندر گیا تو فرمایا کہ سب مشائخ طبیب امت ہیں، اپنے اپنے زمانہ کے لوگوں کے اعتبار سے طرق انھوں نے رکھے ہیں، سب کا مآل ایک ہے، اور سب کا خلاصہ اتباع سنت ہے، بعد کے لوگوں نے بدعتیں داخل کردی تھیں، ان کے مجدد حضرت سید صاحب

ہوئے جس سے جس کو عقیدت ہو، اسکے طریقہ میں وہ داخل ہوجائے فائدہ ہوگا، پھر فرمایا کہ مجھکو حضرت سید صاحب کے ساتھ محبت و عقیدت اعلیٰ درجہ کی ہے، میں یہ جانتا ہوں کہ وہ اپنے پیر شاہ عبدالعزیز صاحب سے بڑھ کر ہیں، باقی خدا جانے کون بڑھکر ہے، لیکن میرے دل میں ہمیشہ یہی آتا ہے، میں اپنے قلب کا مختار نہیں ہوں، یہ کچھ خدا کی طرف سے ہے، پھر میں کہتا ہوں، اللہ تو ہی جانے میں مجبور ہوں شاہ صاحب کے پہلے سے اس خاندان میں اتباع سنت تھا، مگر حضرت نے نہایت درجہ کو اتباع کیا، ہندوستان میں نور پھیلادیا، علما کہتے ہیں کہ وہی کتابیں پہلے تھیں، وہی اب بھی ہیں، لیکن اب خدا جانے کیا بات ہوگئی ہے، جو ان کی صحبت میں ایک گھڑی بیٹھا، اس میں وہی رنگ آگیا، جس میں زیادہ اتباع سنت ہو وہی ولی کامل ہے، میرا تو عقیدہ یہی ہے، کہ سید صاحب اپنے پیر سے بڑھکر ہیں، ان کے دیکھنے والوں میں سے بہت کم لوگوں سے ملا ہوں لیکن اٹیٹھ میں ایک حاجی صاحب تھے، تھے تو کم استعداد لیکن ان کی عجیب حالت تھی، ان کی صحبت میں بہت رہا ہوں، میرے دادا پیر میانجی نور محمد صاحب حضرت کے مرید تھے، اور ان کے پیر حضرت حاجی عبدالرحیم صاحب بھی سید صاحب کے مرید تھے یہ دو طریقے حضرت کے سلسلے کے ہیں، مجھ کو سب سے زیادہ حضرت سے محبت و عقیدت ہے، میں اپنے قلب سے مجبور ہوں، یہ اللہ ہی کی طرف سے کوئی بات ہے، اس کے بعد اور لوگ آگئے، اور اپنی اپنی عرض و معروض کرنے لگے، ہم اٹھ آئے،

مولوی مسعود احمد صاحب وہاں سے اٹھکر مولوی مسعود احمد صاحب سے ملنے گئے، انھوں نے نہایت اعزاز و اکرام سے بٹھایا، حالات پوچھتے رہے، فرمایا کہ مولوی ابوالقاسم صاحب سے آپ سے کیا قرابت ہے، کل حضرت نے بعد مغرب مجھ سے فرمایا تھا، کہ مولوی ابوالقاسم صاحب کے بھائی آئے ہیں اسکے بعد بھائی جی نے کچھ اپنی علالتوں کا حال بیان کیا، یہاں تک کہ مغرب کی اذان ہوئی، اب اوٹھ گئے،

معمولات مغرب کی نماز کے بعد پھر مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ اندر کے کمرہ میں تھے، کچھ
لوگ باہر بیٹھے تھے، وہیں بیٹھ گیا، کچھ دیر کے بعد کھانا آیا، کھانا کھاکر قیام گاہ پر واپس آیا، یہاں تک کہ عشا
کی اذان ہوئی، نماز کے واسطے مسجد گیا، نماز کے بعد پھر واپس آیا، مولوی صاحب بھی نماز پڑھاکر پیچھے
آئے، اب اندر کمرہ کے ہیں، مولوی صاحب کے اوقات جن کے ہمیشہ وہ پابند ہیں یہ ہیں، کہ بعد نماز
صبح کے حجرہ میں چلے جاتے ہیں، اشراق کے بعد خطوط ملاحظہ فرماتے ہیں، خطوط کے دو حصہ کئے
جاتے ہیں، ایک وہ جو احباب کے ہیں جن میں خیر و عافیت ہوتی ہے، یا خیریت دریافت کیجاتی
ہے، ان کے جواب اسی وقت تحریر فرماتے ہیں، آٹھ بجے کے بعد درس شروع ہوتا ہے، ۱۱ بجے
تک اس میں مصروف رہتے ہیں، اس کے بعد کھانا تناول کرکے قیلولہ کرتے ہیں، پھر ظہر کی نماز
پڑھتے ہیں، نماز کے بعد خطوط کا دوسرا حصہ یعنی وہ خطوط جو بطور استفتاء کے ہوتے ہیں ملاحظہ فرماتے
ہیں، اور ان کے جوابات لکھتے ہیں، دو بجے تک، دو بجے کے بعد پھر درس شروع ہوتا ہے،
اس میں چار بجے تک مصروف رہتے ہیں، چار بجے عصر کی نماز پڑھتے ہیں، پھر باہر نشست فرماتے
ہیں، اور عام طور پر لوگوں سے ملتے ہیں، جس کو جو کہنا سننا ہوتا ہے وہ کہتا ہے، اور خود بدولت
سنتے ہیں، مغرب تک مغرب کی نماز کے بعد پھر اندر بیٹھتے ہیں، خاص خاص لوگ اس وقت بھی حاضر
رہ سکتے ہیں مولوی صاحب کا یہ بھی دستور ہے، کہ اوقات درس میں کسی سے گفتگو نہیں فرماتے،
جب آج کل بیماری کی وجہ سے درس موقوف ہے، اس میں شک نہیں کہ مولوی صاحب بقیۃ
السلف ہیں، ان کا وجود مغتنمات میں سے ہے، اس تورع و استقامت کا دوسرا شیخ ان کے
اس زمانہ عالم آشوب میں نظر نہیں آتا، علم الٰہی میں جو کوئی ہو، اسکی خبر نہیں، مولوی صاحب کے
صفات میں سب سے بڑا وصف تورع ہے، جو تمام اوصاف کو شامل ہے، کف لسان اور
قلت گفتار میں مولوی صاحب ضرب المثل ہیں، اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کے صدقہ میں اس دنیا

کے حال پر رحم فرمائے، اس کے دل کی تاریکی دور ہو، اور کسی قدر چاشنی احسان کی عطا فرمائی جائے؛

الٰہی عبدک العاصی اتاکا　　　مقراً بالذنوب وقد دعاکا

ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا، وترحمنا لنکونن من الخاسرین،

شاہا ز کرم بر من درویش نگر　　　بر حال من خستہ دلریش نگر

ہر چند نیم لایق بخشایش تو　　　بر من منگر بر کرم خویش نگر

روز یکشنبہ سیزدہم شعبان، آج بہت سویرے آنکھ کھلی، کیواڑے کھول کر جو دیکھا، تو ابھی بہت رات باقی تھی، اور پڑھنے کی آواز آرہی تھی، خیال جو کیا تو معلوم ہوا کہ حضرت تلاوت فرمارہے ہیں یا تہجد میں قرآن پڑھتے ہوں، یہ قاصر الہمت پھر آکر لیٹ رہا، کچھ دیر کے بعد اذان ہوئی، اٹھکر پاخانہ گیا وہاں سے آکر وضو کرکے جماعت میں شریک ہوا بعد نماز کے حضرت مولوی صاحب کے کمرہ میں گیا وہ اندر تھے کچھ لوگ باہر تھے، یہ روسیاہ باہر ہی بیٹھ گیا، اور اپنی شامت اعمال اور خبث باطنی کے انجام کی فکر کرنے لگا، افسوس وصد ہزار افسوس عمر طبعی کا ایک ربع اس بطالت اور بیہودگی میں گذرا، کہ باوجود مسلمانوں کے بدنام کرنے کے اب تک ایمان خالص اور اسلام کامل کا ایک حصہ بھی نصیب نہیں ہوا، بوالہوسی حد سے زیادہ ہے، اور کام کچھ ہو نہیں سکتا حب جاہ و پراگندگی باطن ہر وقت مستطار ہتی ہے، دیکھئے انجام کیا ہو، ع:-

سالیکہ نکوست از بہارش پیداست

جس کی ابتدا بگڑگئی ہو، اس کے انجام کا خدا حافظ ہے، یہ بھی ایک شامت ہے، کہ ان بزرگوں کی خدمت میں پہونچکر اپنی بے استعدادی کی وجہ سے فیض سے محروم رہے، ع

زمین شور سنبل برنیارد،

جب قلب کی صلاحیت ہی نہ ہو تو کیا تاثیر ہوسکتی ہے، یہ بھی ایک شامت ہے، کہ ان بزرگوں کی خدمت

میں پہونچکر پھر صحبت سے محروم رہ جائے، اے اللہ، اے ہادی، اے مرشد، تو ہی اس بے بہرہ کی دستگیری فرما، اللھم لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت ولا راد لما قضیت استغفر اللہ ربی من کل ذنب واتوب الیہ،

سید صاحب کی صحبت کے اثرات

تھوڑی دیر کے بعد حضرت مولینا سلمہ اللہ تعالیٰ برآمد ہوئے، اور گھر تشریف لے گئے، بھائی جی کا ارادہ آج ہی روانگی کا ہے اور یہ روسیاہ بھی اون کی رفاقت میں آج ہی جانے والا ہے، اس وجہ سے بڑھ کر عرض کیا کہ میں رخصت ہونا چاہتا ہوں، فرمایا کھانا کھا کر جانا، پھر دوبارہ عرض کرنا داخل گستاخی سمجھکر چپ ہو گیا، اس کے بعد بعض بزرگ وہیں بیٹھ گئے، یہ خاکسار بھی بیٹھ گیا، سید صاحب کے فضائل وخصائص بیان کرنے لگے، ان میں سے ایک نے کہا کہ سب فضیلتیں ایک طرف اور یہ فضیلت ایک طرف ہے، کہ سید صاحب کے مریدوں میں ان کا رنگ ایسا جم جاتا تھا کہ کسی طرح اس میں تغیر نہیں آتا تھا، بلا کی تاثیر تھی، ایک مرتبہ جس نے ان کی صحبت حاصل کرلی وہ پھر انہی کا دم بھرنے لگتا تھا، مرد تو مرد عورتیں تک جھوں نے سوا ایک بار کے کبھی ان کی زیارت نہیں کی، وہ ایسی پختہ ہو جاتی تھیں، کہ پھر کسی طرح اپنے خیالات سے نہیں ہلتی تھیں، وہ کہتے تھے کہ میری والدہ سید صاحب کی مرید تھیں، لیکن اس طور پر کہ نانوتہ جب سید صاحب تشریف لے گئے اور عورتوں نے مرید ہونا چاہا، تو ایک مکان میں وہ سب جمع کر دی گئیں، سید صاحب تشریف لائے دروازے سے پگڑی پھینک دی، سبھوں نے اس کو پکڑ لیا، اور توبہ کر لی، ان عورتوں پر اچھی طرح وعظ وپند کا اثر نہیں پڑ سکا، لیکن باوجود اس کے میری والدہ عقائد صحیحہ پر ایسی پختہ تھیں، کہ ان پر کسی کا جادو نہ چل سکا، پیرزادوں میں ان کی شادی ہوئی، اور گنگوہ کے پیرزادہ نہایت سخت سب ایک طرف، بلکہ والد ایک طرف تھے، اور وہ ایک طرف، لیکن اگر اثر پڑا ہے، تو ان ہی کا دوسروں پر پڑا ہے، ان پر کسی کا اثر نہیں پڑا، یہ بھی بیان کیا کہ جب سید صاحب کاندھلہ تشریف لے گئے، تو

اس وقت مولوی ابوالحسن صاحب سن رسیدہ تھے، ان کے صاحبزادہ مولوی نورالحسن آٹھ دس برس کے تھے، اور زیور پہنے ہوئے تھے، جب سید صاحب تشریف لائے، تو صاحبزادہ صاحب آکر بیٹھ گئے، سید صاحب نے فرمایا مولینا یہ کون ہیں، انھوں نے کہا بندہ زادہ فرمایا یہ کیا پہنے ہوئے ہیں کیا یہ جائز ہے، کچھ ایسی تقریر فرمائی، کہ وہ شرمندہ ہوئے، اور اسی وقت انھوں نے اس کو اتروا ڈالا، عورتوں نے بہت ونڈ مچایا، کہ یہ نئے مولوی کہاں سے آئے ہیں، ہمارے مولویوں نے کبھی نہیں منع کیا، اب نئی کتابیں بنی ہیں، جو پہلے تھیں وہی اب بھی ہیں، مولوی صاحب نے فرمایا، کہ واقعی کتابیں تو وہی ہیں جو پہلے تھیں، لیکن ہم نہیں جانتے، کہ ہم کو کیا ہو گیا تھا، اس قسم کے اور بھی قصص بیان کرتے رہے،

اس کے بعد مولوی رشید احمد صاحب کا ذکر سب نے بیان کیا، کہ اس شدت مرض کی حالت میں بھی مولینا نے کبھی رخصت پر عمل نہیں کیا، مرض کی یہ حالت تھی کہ ذرا سی نقل و حرکت میں دست آجاتا تھا، کسی نے پیر چھوا، اور حاجت ہوئی، کھڑے ہوئے اور دست آیا، دن بھر میں ستر ستر دست آتے تھے، مگر باوجود اس کے کبھی چارپائی یا کپڑے میں نہیں کیا، ہمیشہ چوکی پر تشریف لیجاتے تھے، حالانکہ اوٹھ بیٹھ نہیں سکتے تھے، لوگوں نے ہرچند سمجھایا، مگر نہیں مانا، دوسرے کبھی بیٹھ کر نماز نہیں پڑھی، فرض ہمیشہ کھڑے ہو کر پڑھتے تھے، جب لوگ زیادہ سمجھاتے تھے تو کہتے تھے، کہ جب تک کھڑا ہوا جاتا ہے، بیٹھکر نہ پڑھوں گا، چاہے گر ہی کیوں نہ پڑوں مرض سے ادھر افاقہ ہوا، اور مسجد جانے لگے، تھوڑی دیر کے بعد مولینا گھر سے تشریف لائے، ہم لوگ جاکر پاس بیٹھے، نو بجے تک بیٹھے رہے، نو بجے کے بعد کھانا آیا، فرمایا کہ کھانا کھالو، کھانا کھا کر رخصت ہوئے،

سہارنپور مغرب کے بعد سہارنپور پہونچے، یہاں کے حساب سے سہارنپور اٹھارہ کوس ہے

لیکن ہمارے یہاں کے کوسوں سے دس کوس یہاں کے اور وہاں کے کوسوں میں ڈیوڑھے کا فرق ہے، یہاں آئے، تو پہلے سے ملا عنایت اللہ صاحب نے کھانا تیار کر رکھا تھا اثنای طعام میں ان سے معلوم ہوا کہ ایک صاحب یہاں ہیں، جنھوں نے حال میں سید صاحب سے بیعت کی ہے، میں نے ان کا نام بہت پوچھا، مگر ملا صاحب نے کہا میں یہ بتا نہیں سکتا،

روز یکشنبہ چہاردہم شعبان صبح کو ٹھکر میں نے مولوی نظام الدین سے اپنی آمد کی اطلاع کرائی، تھوڑی ہی دیر میں وہ اور حاجی فدا حسین صاحب ملنے کو آئے، آخر الذکر مولینا ولایت علی صاحب عظیم آبادی کے مرید ہیں، مولوی نظام الدین سے معلوم ہوا کہ خط کا جواب ابھی نہیں آیا، لیکن بتحقیق معلوم ہوا، کہ مولوی محمد حسین صاحب نگینہ میں ہیں، مجھ کو طولِ مسافت پر نہایت ہی افسوس ہوا، اور نیز اس وجہ سے کہ خرچ بھی چک گیا ہے، مگر چونکہ یہ سفر خاص مردانِ خدا کی تلاش میں کیا گیا ہے، اس واسطے ضرور ہے، کہ ان سے بھی ملاقات کیجائے، خداوند عالم کارساز ہے اس واسطے مصمم ارادہ ہے کہ ایک دو روز کے واسطے نگینہ چلا جاؤں، بھائی جی سے بھی آج مفارقت ہوئی، وہ آگرہ گئے، آگرہ سے گوالیار، اور وہاں سے اٹاوہ، اور وہاں سے نسوہ جائیں گے،

دس بجے مولینا احمد علی صاحب ملنے کو تشریف لائے، یہ بزرگ حضرت سید نا روحی فداہ کے بڑے ارادتمندوں میں ہیں، ان سے مل کر بہت طبیعت خوش ہوئی، بڑے صالح، اور بے تکلف ہیں، اس رو سیاہ کے حال پر بڑی نوازش فرمائی،

بارہ بجے نگینہ کے ارادہ سے اسٹیشن آیا، اور مشایعت میں مولوی نظام الدین صاحب بھی آئے، معلوم ہوا کہ دو بجے گاڑی جائے گی، اسلئے اسٹیشن سے مولوی نظام الدین صاحب کو میں نے رخصت کیا، اور میں نے مسجد پر جا کر ظہر کی نماز پڑھی، اور دو خط لکھکر نسوہ اور رماسے بریلی

روانہ کئے، اس کے بعد ٹکٹ لیا، [۱] نگینہ تک کرایہ ہوا، جس وقت گاڑی پر سوار ہونے کو چلا، تو ایک صاحب گاڑی پر بیٹھے تھے، انھوں نے آواز دی کہ یہاں آکر بیٹھئے، میں نے دیکھا تو معلوم ہوا، کہ کوئی طالب العلم ہیں، اس رفاقت سے میری طبیعت بہت محظوظ ہوئی، وہیں جاکر بیٹھا، اور راستہ نہایت لطف کیساتھ کٹا، یہ مدرسہ دیوبند میں پڑھتے ہیں، اس مرتبہ صحاح ختم کرکے جاتے ہیں، نام ان کا مولوی مشیت اللہ رام پور کے سواد میں رہتے ہیں، ان سے بھی میں نے دیوبند کی کیفیت پوچھی،

دیوبند کے مدرسین | پہلا میرا سوال یہ تھا، کہ اب اساتذہ میں کون کون کس کس استعداد کے ہیں، اور کتابیں کیسی پڑھاتے ہیں، اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ سب میرے استاد ہیں، اور آدمی اپنے استاد کی تعریف کرتا ہی ہے، لیکن انصاف یہ ہے کہ سارے مدرسہ میں ایک مولوی محمود حسن [۱] صاحب تو ایسے ہیں، کہ سب کتابیں اچھی طرح پڑھا سکتے ہیں خصوصاً دینیات میں تو ان کا ایسا پایۂ عالی ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں کم لوگ ہونگے، باقی مدرسین برائے نام ہیں مجبوراً طلبہ اُن کے سامنے کتاب کھولتے ہیں، میں نے پھر خاصةً مولوی خلیل احمد صاحب [۲] کے نسبت سوال کیا، انھوں نے کہا میں کیا کہوں، وہ کیسے ہیں، بڑے متقی بڑے زاہد ہیں، میں نے کہا یہ سب سہی پڑھانے میں کیسے ہیں، انھوں نے کہا کہ میں نے کہدیا، کہ مولوی محمود حسن صاحب کے سوا دہاں اس کام کا کوئی نہیں، تاہم مولوی خلیل احمد ہوں، یا حافظ احمد [۳] دینیات پڑھا لیتے ہیں معقولات سے بالکل واسطہ نہیں، مولوی غلام رسول ولایتی معقولات پڑھاتے ہیں، لیکن اجنبیت زبان کی وجہ سے طلبہ کو معتد بہ فائدہ نہیں ہوتا، میرے خیال میں معقولات اس مدرسہ میں پڑھانے کا رائے اکثر یہی ہوتا ہے کہ دوبارہ پڑھنی پڑتی ہے، میں نے کہا علم ادب میں کسی کو مہارت ہے کہئے

---

[۱] شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ، [۲] مولینا خلیل احمد صاحب مرحوم سہارنپوری، [۳] مولانا حافظ احمد صاحب مرحوم ابن مولینا قاسم رحمۃ اللہ علیہ۔

گئے، مدرسہ سے باہر مولینا ذوالفقار علی صاحب بڑے ماہر ادیب ہیں، اور مولوی حبیب[1] الرحمن صاحب کو بھی بہت شوق ہے، وہ اکثر خارج از مدرسہ ادب ہی پڑھایا کرتے ہیں، اور مدرسین میں جو کچھ ہیں مولوی محمود حسن صاحب ہیں، محدث ہیں، تو وہ ہیں، فقیہ ہیں، تو وہ ہیں، بہرحال اب آج مدرسہ کی کائنات وہی ہیں،

مدرسہ دیوبند کے بعض اختلافات

دوسرا میرا سوال یہ تھا کہ مدرسہ کے بارہ میں نزاع اہل شہر کی کیا وجہ ہے، انھوں نے کہا کہ اسکی وجہ بجائے خود لوگوں نے جو کچھ خیال کی ہو، مگر اصل یہ ہے کہ حاجی محمد عابد صاحب کی راے یہ ہے کہ مدرسہ کی حالت درست کیجائے، دس بارہ مدرس جو موقت ہیں، ان سب کو چھانٹ کر دو تین لائق فائق مدرس بلاکر رکھے جائیں، جتنا بار مدرسہ پر ان لوگوں کی تنخواہوں کا ہے، اس میں دو بڑے لائق فائق مدرس مل سکتے ہیں، اور مولوی محمود حسن صاحب بجائے خود رہیں، لیکن مولوی محمود حسن کہتے ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی موقوف کیا گیا تو پہلے میرا استعفا ہے، گو حاجی محمد عابد صاحب ارباب شوری میں داخل ہیں، مگر ایک نہیں چلتی، اس واسطے اہل شہر نے در پردہ منشی فضل حق کی شورش مچار کھی ہے، بلکہ طالب علموں میں خود شورش ہو رہی ہے، اسی امتحان میں دو طالب العلم مدرسہ سے نکالے گئے ہیں، ایک اس جرم میں کہ اس نے کچھ گستاخی کی تھی، مہتمم جس وقت پرچوں کی نگرانی کے واسطے اس کی طرف کئی بار آئے گئے، تو اس نے کہا امتحان کے وقت تو یہ نگرانی کرتے ہو، پڑھاتے وقت کبھی نگرانی کو نہیں آتے، کہ مدرسین کیسا پڑھا رہے ہیں، دوسرے نے پرچہ امتحان میں بڑی بیہودہ گوئی کی تھی، بہرحال اس قسم کی شورشیں ہیں، حالانکہ اب جو بنا ے فساد قرار دی گئی ہے یعنی منشی فضل حق کی حمایت وہ بڑی پوچ ہے اور پھر ہے منشی فضل حق مہتمم سابق نہایت خائن تھا، ایک

[1] مولینا حبیب الرحمن صاحب ابن مولینا احمد علی صاحب مرحوم محدث سہارنپوری،

باون روپیہ کئی آنے (وس) کے نیچے دبے ہوئے ہیں، مگر ع

حیلہ جو را بہانۂ بسیار

شورش تو پہلے ہی سے تھی، قابو کے منتظر تھے، موقع بھی ہاتھ آگیا،

قاضی محمد اسمٰعیل صاحب ننڈھورہ کے اسٹیشن پر جب ہم پہونچے، تو انھوں نے کہا کہ منگلور یہاں سے تین میل ہے، وہاں قاضی محمد اسمٰعیل صاحب بہت بڑے درویش گذرے ہیں، دو چار ان کی کرامتیں بھی بیان کیں، میں نے کہا کہ ان کے صاحبزادے کی کیا کیفیت ہے، انھوں نے کہا کہ اپنے والد کے زمانہ میں نہایت خراب حالت میں تھے، بڑے شوقین تھے، ان کے والد ہمیشہ انسے ناخوش رہتے تھے، لوگوں نے انتقال کے وقت خلافت کے بارہ میں کہا بھی، کہ کس کو آپ خلیفہ کرتے ہیں، اس کے جواب میں کہا کہ جس کو اللہ چاہے گا، وہ خود ہو رہے گا، ان کے انتقال فرماتے ہی ان کا ایسا رنگ بدل گیا، کہ ایسا بدلتے کہیں نہیں دیکھا، اب بڑے اچھے اوقات ہیں، ریاضت شاقہ کرتے ہیں، لذت طعام و طعام کے بڑے متعاد ہیں، مجھ کو یقین نہ ہوتا، مگر میں نے خود تجربہ کیا ہے، کھانا بالکل چھوڑ دیا ہے عجیب حالت ہے، امید ہے کہ یہ بہت جلد کچھ ہو جائیں گے، قصہ مختصر برم پور کے اسٹیشن پر وہ رفیق سفر اتر گئے، اور فقیر دو اسٹیشن آگے بڑھ کر نگینہ کے اسٹیشن پر اترا، اور سرائے میں آکر ٹھہر گیا،

(باقی)

سیرۃ النبی جلد ششم

مشتمل بر تعلیمات اخلاقی

اس میں پہلے اسلام میں اخلاق کی اہمیت بتائی گئی، اور اسلامی فلسفۂ اخلاق کی تشریح کی گئی ہے، پھر اسلامی اخلاقی تعلیمات اور فضائل و رذائل، اور اسلامی آداب کو تفصیل کیساتھ بیان کیا گیا ہے، اور دکھایا گیا ہی کہ اخلاقی معلم کی حیثیت سے بھی رسول اسلام علیہ السلام کا پایہ کتنا اونچا ہے، قیمت قسم اول عہ قسم دوم للعہ

علی مردان خان

از

ڈاکٹر محمد عبداللہ صاحب چغتائی، ایم، اے، ڈی لٹ

مجھے اپنی تالیف "تاج محل آگرہ" کی تحقیق و تلاش کے سلسلہ میں بہت سی کتابیں اور مسودات دیکھنے کا اتفاق ہوا، چنانچہ ہندوستانی فن تعمیر کی تاریخ مصنفہ فرگسن میں جہاں تاج محل کا ذکر ہے، وہاں مسٹر فرگسن کے جانشین ڈاکٹر برگیس نے ایک حاشیہ میں لکھا ہے، :-

"........اغلب ہے کہ تاج محل کا نقشہ علی مرداں خان ایک ایرانی تاجر نے بنایا ہے،"[1]

اسی طرح علی مردان کی بنائی ہوئی ایک تصویر قلعۂ دہلی اور عجائب گھر میں ہے، جو فنی حیثیت سے معاصر معلوم ہوتی ہے، اسکے نیچے انگریزی میں لکھا ہے، :-

"........اس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے ہندوستانی فن تعمیر میں امرود نما تاتاری گنبد رائج کیا، جس کی مثالیں جامع مسجد دہلی اور تاج محل آگرہ میں دیکھی جاسکتی ہیں"[2]

۱؎ تاریخ فن تعمیر ہند ص ۳۰۷ جلد دوم مطبوعہ ۱۹۱۰ء ۲؎ فہرست دہلی میوزیم ص ۲۵ ۳؎ آل انڈیا اورینٹل کانفرنس منعقدہ لاہور ۱۹۲۸ عیسوی میں میں نے ایک مضمون اس عنوان پر پیش کیا تھا، جو اس وقت تک مکمل تھا، یہ امرود کی تمثیل بصل نما گنبد کیلئے عمل صالح میں مذکور ہے، ص ۲۳ میرے خیال میں اس سے بہتر کوئی اور لفظ اس کیلئے نہیں ہو سکتا تھا، انگریزی میں اسے (Bulbous.) لکھا ہے،

تاریخی اعتبار سے دونوں امر بے بنیاد ہیں، کیونکہ علی مردان خاں کے ہندوستان میں آنے سے قبل ۱۰۴۷ھ تاج کا نی سے زیادہ تعمیر ہو چکا تھا اور دو ہرا گنبد اس سے بھی قبل مغل اپنی عمارتوں میں استعمال کر رہے تھے جس کی اکثر مثالیں موجود ہیں، بہرحال اس سے علی مردان خان کی شخصیت فن تعمیر میں ممیز ضرور نظر آتی ہے، اسلئے ضرورت ہے کہ اسکے متعلق تحقیق سے کام لیا جائے، ذیل کے صفحات میں اسکی شخصیت اور بحیثیت ماہر فن اسکی قابلیت اور اس سے متعلق دوسرے امور پر روشنی ڈالی جاتی ہے،

ابتدائی خاندانی حالات: علی مردان خان کا والد گنج علی خاں ازبک قبائل کا کرد، اور شاہ عباس کا ملازم تھا، در ایام طفولیت ہی سے اس نے ازبکیہ خراسان اور گرد و نواح کی لڑائیوں میں بہادرانہ خدمات انجام دی تھیں، اسلئے بادشاہ نے خوش ہو کر اس کو ارجمند بابا کا لقب عطا کیا تھا[1]، تقریباً تیس سال تک کرمان کو سنبھالا ۱۰۳۴ھ میں اسکے انتقال کے بعد اس کا لڑکا علی مردان خان اس کا جانشین ہوا، بادشاہ نے اس کو بھی بابا ثانی کے لقب سے ملقب کیا، ادھر ۱۰۳۷ھ میں جب ہندوستان میں شاہجہاں سریر آرائے سلطنت ہوا، تو اسکی آنکھیں حصار قندھار پر لگ رہی تھیں، وہ چاہتا تھا کہ وہاں کسی شہزادہ کو فتح کی غرض سے بھیجے،

قندھار پر شاہجہاں کا تسلط: چنانچہ شاہجہاں نے دکن اور بندیلوں کی مہم سے فراغت کے بعد ذوالقدر خان کو خفیہ علی مردان خاں کے پاس بھیجا، اس نے اپنے بادشاہ کے معمور خزانوں اور اسکی فوجی قوت کا حال علی مردان خان سے بیان کیا، اور اس کے الطاف و اکرام کی امید دلا کر کہا کہ شاہجہاں کی اطاعت قبول کر کے حصار قندھار کو حوالے کر دو، جو پہلے بھی اسی کے خاندان کے قبضہ میں تھا، اور تم خود شاہجہاں کے پاس چلو ورنہ بہت جلد لشکر شاہی سارے زابلستان کو تسخیر کر لیگا

[1] عالم آرائے عباسی مطبوعہ ایران صفحہ ۷۳۳،

علی مردان خان نے ذو القدر کی بڑی خاطر تواضع کی، اور یہ وعدہ کرکے رخصت کر دیا، کہ اس کا جواب کسی معتمد کے ہاتھ بھیج دیا جائے گا،

شاہجہان سیاسی حیثیت سے قندھار کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کا اس قدر خواہاں تھا، کہ جب اس نے علی مردان خان کو اپنی طرف کسی قدر مائل دیکھا، تو اسے یارِ وفادار کے نام سے خطوط لکھے، چنانچہ مولینا جان محمد قدسی شاعر دربار کا نظم کیا ہوا مکتوب شاہجہان نامہ میں موجود ہے جس کا عنوان "نامہ بادشاہ بہ علی مردان خان" ہے،

شاہجہان نے جو فرمان ارسال کیا تھا، اسکے ابتدائی الفاظ اور چند اشعار اور قدسی کا منظوم نامہ نقل کیا جاتا ہے۔ دونوں کے اشعار میں کچھ فرق ہے، ممکن ہے قدسی نے بعد میں اس میں کچھ ترمیم کی ہو،

نقل فرمان شاہجہان کہ بہ علی مردان خان نوشتہ

"مدار دولت پادشاہی باعث امن وامان ممالک شہنشاہی شیر صفدر معرکہ آرائی روز جنگ ملک کشائی بیدرنگ زبردست نامدار بخت اورنگ قاتل کفار کشور فرنگ باج ستان روم وزنگ یار وفادار بے ریب زیب علی مردان خان بہادر فیروز جنگ"

بروا اے صبا پیک گلزار ما	خبر بر بیار وفادار ما
کہ خود را بدرگاہ والا رساں	ز سر چشمہ کشتی بدریا رساں
عنان گرم گرداں بر چوں صبا	بداں گونہ کز کوہ آید صدا،
دعا چوں سود جانب آسماں	بسرعت چناں باید آمد چناں،
ز شوق ایں قدر بود گفت و شنود	سخن مختصر بود و بشتاب زود!

نامۂ منظوم[1]

بروای صبا پیک گلزار ما — خبر دہ بہ یار وفادار ما

کہ خود را بدرگاہ والا رسان — ز سرچشمہ کشتی بدریا رسان

عنان گرم گردان برو چون صبا — بدانسان کہ از کوہ آید صدا

بزور آمدن برفروزان چراغ — کہ طی مکان گردد آن تنگ دماغ

چنان پای سرعت برآور ز گل — کہ زود آمدن ہم بود زان خجل

چنان زود باید بمنزل رسی — کہ پیش اوفتد خجلت از واپسی

بسرعت برانگیز توسن چنان — کہ پا گیریم اول آخر عنان

نیاید ز تعجیل ہم شوق کام — ز سرعت قدم پیشتر نہ دو گام

عنان را بہ تعجیل کن روشناس — ز اخلاص خود شوق ما کن قیاس

دعا چون رود جانب آسمان — بسرعت چنان باید آمد چنان

تو این رہ کز اخلاص پیمودہ — ز ما شوق بر شوق افزودہ

چو کشتی بہ لنگر بہ پیمای راہ — کہ خالیست جایت درین بارگاہ

چنان باید آمد براہ از شتاب — کہ لب تشنہ خود را رساند بہ آب

گرت باشد از خواہش ما خبر — ز پیش آمدن ہم رسی پیشتر

بسرعت چنان باید آمد چنان — کہ آواز آید بگوش از دہان

قدم نہ ز پیش آمدن ہم ز پیش — کہ شد شوق دید از اندازہ بیش

[1] کلیات قدسی کتبخانہ خدا بخش مرحوم پٹنہ، میں ان اشعار کیلئے خان بہادر عبد المقتدر خان کا ممنون ہوں،

رہ شوق باید چنان کرد سر | کہ اول خود آئی و آخر خبر
چنان پائے نہ در رکاب از شتاب | کہ حیرت فزاید بچشم رکاب
شتابندہ شو اے نسیم سحر | بیار و فادار ما دہ خبر
کہ نزدیک چوں شد زمان وصال | بغز و دن شوق باشد محال

بدیدارت از ہر چہ آید بیاد
بود رغبت طبع اشرف زیاد

۱۰۳۸ھ میں شاہ عباس کی وفات پر دولت ایران خطہ میں نظر آتی تھی، شاہ عباس کے جانشین شاہ صفی کو علی مردان خان سے اندیشہ پیدا ہو گیا تھا اسلئے دونوں کے تعلقات اور کشیدہ ہو گئے، علی مردان خاں چونکہ اعلیٰ حضرت شاہجہاں کے ارادوں سے واقف ہو چکا تھا، اس نے سعید خان صوبہ دار کابل کی وساطت سے خط لکھا کہ شاہ صفی میری جان کے درپے ہے، چنانچہ ۱۰۴۷ھ میں سعید خان اور قلیچ خان صوبہ دار لاہور شاہی حکم کے مطابق قندھار روانہ ہوئے، بعض حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہان کے اہل کار بھی قندھار کے سلسلہ میں علی مردان خاں سے غائبانہ خط و کتابت کرتے رہے تھے، قلیچ خاں کا ایک خط بنام علی مردان خاں محمد صالح کی بہار سخن سے لیکر ذیل میں درج کیا جاتا ہے،

"تقدیم مراسم محبت و یگانگی غائبانہ از جانب عمدہ امرائے سموالمکان قلیچ خان بمسند آرائے حکومت قندھار خانِ عالی شان علی مردان خان،

ایزد تقدس و تعالیٰ ذات فائض البرکات آن گوہر معدن مردی مروت اختر سمائے عزت و دولت خلاصۂ دودمان عظمت و ایالت نقاوہ خاندان حشمت و جلالت

۱؎ بہار سخن ورق نمبر ۳ لاہور پبلک لائبریری نمبر ۲۰ ذاتی نسخہ،

ما از جمیع مکارم روزگار بجز وش داشته معزز و کامیاب صورت و معنی دار داز بس که جمیع مکارم اخلاق سنیه و محامد و اوضاع رضیه از افواه السنهٔ خلائق بگوش معنی نیوش رسیده طبیعت مہر سرشت را با شمائل حسنه آن قدر مراتب آشنائی پدید آمده، که گویا سالہاے دراز دیدہ حق بیں از انوار جمال چہرہ نورگین منور گردیده بارہا صحبت لازم المسرت راه یافته است الحق ذات بزرگان والا صفات که آئینه خاطر شان از مصقله عنایت الٰہی صفا یافته، و شاہد طبیعت شان بزیور فضائل متجلی گردیده حکم آفتاب دارد، و صیت مکارم و محاسن ایشان مانند پرتو خورشید ہمہ جا میرسد و دقیقه سنجان کارگاه معنی که پرتو اندوزی انوار ایزدی چشم بینا یافته، از پرده صنعت جمال صانع را مشاہده کرده اند بمناسبت اختلاط عالم امرائے ایتلاف روحانی را ملاقاتے حقیقی اعتبار کرده اصلا متوجه باتصال ابدانی نمی کردند، پس بدین اعتبار ایں خیر خواه خلق الله خود را از بہره مندان دیدار فائض النور دانسته باحسن وجوه حجاب بیگانگی را از میان مرتفع گردانند توقع ازاں گوہر گرامی بحر آشنائی آنست که ابنا ے را که ایں نیاز مند درگاه الٰہی بر سطح دوستی گذاشته آن عالیجاه در استحکامش بدل جہد فرموده ہمت را بر اتمام تعمیرش گمارند و با علام مقاصدے که دریں ضلع روے دہد بے حجابانه مرہون منت می گردانیده باشند، تا مراتب دوستی خاص بر عوام کوتاه بیں بدرجه تحقیق پیوندد ایام دولت بختیاری مساعد باد"،

سعید خان نے پہلے ہی وہاں پہونچکر معلوم کر لیا تھا، کہ جب تک سیاوش قللر آقائی جسے شاہ صفوی نے علی مردان خاں پر متعین کر دیا تھا، قندھار کے قرب وجوار میں ہے، اس وقت تک یہاں کی رعایا پوری اطاعت قبول نہیں کر سکتی، اسلئے سعید خان نے علی مردان خان کو ساتھ لیکر

سیاوش سے قلعہ کے ایک میل کے فاصلے پر جنگ کی، قزل باش بھاگ نکلے، اور فاتح ان کا ساز و سامان لیکر قندھار پہونچے، اور تسبیح خان قندھار کا والی مقرر ہوا،

علی مردان خان کا ورود لاہور اسکے بعد علی مردان خان نے لاہور کا رُخ کیا، اور ۱۰۴۸ھ یعنی بارہویں سنہ جلوس کو شاہجہان عازم لاہور ہوا[۵]، اور آگرہ اور کانگڑہ وغیرہ کی سیر کرتا ہوا لاہور پہونچا، تمام صوبداروں نے حسب حیثیت نذرانے اور تحائف پیش کئے، اور بادشاہ بڑی دھوم دھام سے سکہ بچھاور کرتا ہوا قلعہ لاہور میں داخل ہوا، شاہی فرمان کے مطابق معتمدخان میر بخشی تربیت خان اور بخشی ثانی نے علی مردان کا دیوان عام کے دروازہ تک خیر مقدم کیا، اور حاضرین سے اس کا تعارف کرایا،

علی مردان خان نے دربار ایران کے دستور کے مطابق بادشاہ کی خدمت میں آداب بجالا کر ایک ہزار اشرفی نذر پیش کی، خان کو خدمت شاہانہ سے مرصع دستار تلوار اور ڈھال مع خلعت اور امیر کا لقب عطا ہوا چھ ہزاری منصب ملا، اسکے علاوہ بیس گھوڑے، چار ہاتھی، اور دوسرے ساز و سامان سے عزت افزائی کی گئی، اور خاص شاہی خزانہ سے قندھار سے لاہور تک کے اخراجات سفر دس لاکھ دیے گئے، اور لاہور کی بہترین عمارات میں سے اعتماد الدولہ کی حویلی قیام کیلئے ملی اسکے ہمراہی اور خدمت گار بھی شاہی جود و کرم سے محروم نہ رہے[۶]

کشمیر کی صوبہ داری چونکہ علی مردان خان سرد ملک سے آیا تھا، اسلئے بادشاہ نے اسے کشمیر کا صوبہ دار مقرر کیا، اور اس کے اعزہ علی بیگ عبداللہ بیگ اسمٰعیل بیگ وغیرہ کو بھی اعلیٰ مناصب پر سرفراز کیا، پھر جب بادشاہ کابل کی طرف روانہ ہوا، تو علی مردان خان کو کشمیر جانے کی اجازت ملی پھر کابل سے واپسی کے بعد ۱۰۴۹ھ میں علی مردان خان لاہور میں طلب کیا گیا، اور منصب

---

۵ عمل صالح ۲ ۶ ایضاً جلد ۲ ص ۲۵۰

ہفت ہزاری ذات اسوار پر فائز ہوا، اور کشمیر ولاہور کا نائب السلطنت مقرر کیا گیا، تاکہ گرمی اور سردی کسی موسم میں اسکو تکلیف نہ ہو،

علی مردان خاں منتظم کی حیثیت سے

سنہ ۱۳ جلوس مطابق ۱۰۴۹ھ میں حسب دستور بادشاہ کی اجازت سے علی مردان خان کے ملازموں نے شب برات کے موقع پر قلعہ لاہور کو جھاڑ فانوس اور دوسرے چراغان کے سامانوں سے مزین کیا، اور جو آتشبازی ایرانی طریقہ پر بنائی گئی تھی حسن انتظام کے ساتھ بادشاہ کے سامنے چھوڑی گئی، بادشاہ نے جھروکہ میں بیٹھ کر اس کا لطف اٹھایا[۱]،

علی مردان خاں عرصہ تک کشمیر ولاہور میں رہا، اور وہاں اپنے حسن انتظام سے بہت سے کار خیر کئے، جس کی وجہ سے آج تک وہ احترام کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے،

ایک دفعہ کشمیر میں سخت قحط پڑا، لوگ بہت سراسیمہ ہوئے، علی مردان خاں نے فوراً پنجاب خصوصاً جالندھر وغیرہ سے بہت بڑی مقدار میں غلہ منگا کر لوگوں کی جان بچائی، یہ وہ انتظام تھا جسے اس کے پیشرو نہ کر سکے تھے[۲]، اس کے ان اوصاف کی وجہ سے شاہجہاں اس سے بہت خوش تھا،

سنہ ۱۴ جلوس مطابق ۱۰۵۰ھ میں بادشاہ نے سعید خاں کو والی کابل مقرر کیا، اور سنہ ۱۶ جلوس میں جب اکبرآباد میں رونق افروز ہوا تو علی مردان خان کو حضور میں طلب کر کے امیر الامراء کا خطاب اور ایک کرور دام نقد عطا کیا، اور اعتقاد خاں کی حویلی جو جمنا کے کنارے امراء کی بہترین حویلیوں میں سے تھی (یہ حویلی اعتقاد خاں نے بادشاہ کو بطور تحفہ دی تھی) رہایش کے لئے مرحمت ہوئی، پھر علی مردان خاں صوبہ کابل بھیجا گیا[۳]،

پابندی مذہب

علی مردان خاں میں مذہبی جذبہ بھی تھا، چنانچہ وہ ہمیشہ لوگوں کو مذہب کی پابندی

---

[۱] تاریخ لاہور عبد اللطیف ص ۵۵، [۲] اسلامک کلچر ان کشمیر مصنفہ صوفی محی الدین،
[۳] بادشاہ نامہ عبد الحمید لاہوری،

کی تلقین کرتا رہتا تھا، رمضان میں خاص طور سے لوگوں کو صوم وصلوۃ کی پابندی کی تاکید کرتا تھا، ایک دو مرتبہ اسے لاہور میں رمضان کرنے کا اتفاق ہوا یہاں لوگوں کو تارک صوم اور آوارہ گرد دیکھا انھیں نمایش کی، جب وہ راہ راست پر نہ آئے، تو سب کو بکار کر کابل بھیجدیا،

علی مرداں خان کی تعمیرات

ہندوستان کی قدیم عمارتوں کو دیکھکر ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں، کہ وہ مختلف دوروں میں مختلف سلطنتوں کا آئینہ دار رہا ہے، جسکے آثار ونشان ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں ہر ایک نے اپنے اپنے عہد میں اپنے اپنے ذوق کی خصوصیات تعمیر کو مدنظر رکھا ہے جو مقامی حالات، طبائع اور ذوق کے اختلاف کا پتہ دیتے ہیں، اس پہلو سے جب ہم تحقیق کی نگاہ ڈالتے ہیں، تو عہد مغلیہ میں بھی اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی تعمیرات بالکل مختلف نظر آتی ہیں، خاصکر وہ عمارتیں جو شاہجہانی عہد میں علی مرداں خاں کے اہتمام میں تعمیر ہوئیں جن میں کاشی کاری کے علاوہ بہت سی وسط ایشیائی فن کی خصوصیات پائی جاتی ہیں، اس ضمن میں پنجاب زیادہ ممنون احسان ہے معلوم ہوتا ہے کہ علی مردان خان نے تعمیر کا فن وراثت میں پایا تھا، قندھار میں اب تک ایک باغ اس کے والد گنج علی خان کے نام سے منسوب ہے، ممکن ہے قندھار اور کابل میں اور عمارتیں بھی اس خاندان کی یادگار ہوں،

مختلف کتابوں میں ایسے متفرق حالات ملتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ علی مردان خان نے ہندوستان میں بہت سی عمارتیں بنائی تھیں، ان میں سے بعض کے تو محض نام ملتے ہیں، اور بعض کے کسی قدر تفصیلی حالات، چنیوٹ میں شاہ برہان کا مقبرہ ابھی تک موجود ہے، دکھنی سرائے ضلع جالندھر جن نور محل قریب قریب ۱۰۵۰ھ میں تعمیر ہوا جس پر کاشی کاری اعلیٰ درجہ کی ہے، ضلع گوجرانوالہ موضع سودھرہ میں مردان خاں نے شاہجہاں کے حکم سے اپنے لڑکے ابراہیم کے نام پر ابراہیم آباد بسایا، جو اب مٹ چکا ہے، میں نے اس مقام کو دیکھا ہے، اب محض ایک

ٹیلہ سارہ کیا ہے جس پر جدید سودھرہ آباد ہے جس زمانہ میں وہ کابل کا صوبہ دار تھا، اس زمانہ میں اس نے پشاور کے قریب ایک باغ تعمیر کیا، اور کابل میں ایک منڈی بنوائی، جو آج تک فن تعمیر کا عمدہ نمونہ تصور کی جاتی ہے، پشاور میں اصفہان کے نمونہ پر ایک مسقف بازار تعمیر کیا، او اس کے کونوں پر مثمن برج بنوائے اس کا ایک نقشہ اس نے مکرمت خاں شیرازی کو دہلی روانہ کیا تھا جب کہ دہلی کا قلعہ اور دوسری عمارتیں اسکی نگرانی میں تعمیر ہو رہی تھیں، تاکہ مکرمت خان اس نقشہ سے ان عمارتوں میں فائدہ اٹھا سکے، اس سے ہم مکرمت خان شیرازی اور علی مردان خان کی تعمیری قابلیت کا اندازہ کر سکتے ہیں (یاد الذکر کی نگرانی میں تاج محل آگرہ اور دہلی کی عمارتیں تعمیر ہوئیں) دہلی کی عمارتوں کی بنیاد ۱۰۴۸ھ یعنی اس زمانہ میں پڑی تھی جب کہ علی مردان خان ہندوستان میں وارد ہوا تھا پھر جب وہ بحیثیت صوبہ دار پنجاب کشمیر گیا، تو وہاں اکثر عمارتیں بنوائیں چنانچہ شہر میں ایک ایسی سنگین پاکیزہ اور خوش منظر حویلی تعمیر کرائی، جو رہ گذار کے لئے اسکی ایک مثال یادگار ہے، اس میں نہایت قرینہ سے جا بجا آبشار اور فوارے ہیں، پرگنہ بھاگ موضع تیل بل میں ایک باغ مع پختہ چہار دیواری تیار کرایا، اور اسکی سیرابی کے لئے پہاڑ سے نہر کاٹ کر لائی گئی، اور اس میں بہت بڑے بڑے حوض بنوائے، ایسے حوض کشمیر کے کسی باغ میں نہیں پائے جاتے تھے، تھوڑے ہی عرصہ میں اس باغ کو میوہ دار درختوں سے بھر دیا،

ط ۱۹۳۱ء میں میرا ایک مضمون تاج محل پر معارف میں شائع ہوا تھا جو میں نے عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے ایک جلسہ میں پڑھا تھا، اس میں میں نے اس مسقف بازار کا ذکر کیا تھا جسے پڑھکر مہتمم صاحب مسلم (؟) پشاور نے معارف مارچ ۱۹۳۱ء میں ایک مکتوب میں بتایا تھا، کہ یہ بازار کابل میں تعمیر کرایا گیا تھا اور آج تک موجود ہے اس کا نام چہتہ بازار ہے، کابل میں ایک محلہ بھی آباد ہے جسکا نام "باغ علی مردان خان" ہے یہ خوافی خان کا بیان ہے (منتخب التواریخ ص صفحہ ۱۲۱/۲)

اس باغ کی آمدنی علی مرداں خاں نے مشہد مقدس روضۂ حضرت امام رضا کے لئے وقف کردی تھی (علی مرداں خاں شیعہ تھا) اسکو معلوم ہوا کہ مسافر اکثر ایسی جگہ پیدل سفر کرتے ہیں، جہاں کوئی قیام گاہ نہیں ہوتی، اور راستہ سخت دشوار ہوتا ہے، اسلئے اس نے کوہ پنجال میں ایک سرائے بنوائی' دربارہ مولا کے راستہ میں حضرت علیؓ کے نام پر دو موضع علی آباد آباد کئے، کشمیر کے ان راستوں کو جن پر مسافر ہلاکت کے خوف سے مشکل سے سفر کرتے تھے، درست کرایا، غرض کشمیر کے دشوار گذار راستوں کو مسافروں کے لئے بہت آرام دہ بنادیا،

ضلع شاہجہاں پور میں جہاں نورجہاں کے نام سے ابتک نور نگر موجود ہے، علی مرداں خاں نے شاہجہاں کے حکم سے ایک شکارگاہ بنوائی، جہاں بادشاہ سلامت بیٹھکر شکار کھیلا کرتے تھے، یہ شکارگاہ غالباً ابھی تک موجود ہے،

شالامار باغ لاہور جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۰۴۷ھ میں تعمیر ہوا، جیسا کہ اس کی تاریخ گفتا کہ گو نمونہ خلد بریں سے معلوم ہوتا ہے، لیکن اسکی سیرابی اور شادابی کا مسئلہ جو دراصل اس باغ کی جان ہے، علی مرداں خاں نے حل کیا تھا، اسکی نکالی ہوئی نہر ابتک موجود ہے، جو اس باغ کو سیراب کرتی ہے، عالمگیر نے ایک مکتوب[۱] میں جس میں اس نے اپنے کرنال سے چل کر باغ آغر آباد دہلی میں ٹھہرنے کا ذکر کیا ہے، اس باغ کو فاضل خاں کے نام سے منسوب کیا ہے، جو علی مرداں خاں کے ماتحت کام کرتا تھا، مگر اس باغ کے قریب جو نہر ہے، وہ غالباً وہی ہے جو قلعہ کی قدیم نہر سے لائی گئی تھی، اس پر ایک پل اسی کے مشورہ سے بنوایا گیا تھا، پل کی ایک اور عمدہ مثال ہم کو کابل میں ملتی ہے، یہ سرخ پل کے نام سے موسوم ہے اور کابل سے جلال آباد جاتے ہوئے پانچویں منزل پر واقع ہے، یہ پل علی مرداں خاں کی تعمیر ہے، جیسا کہ اسکی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے۔

درزمانِ ثانیِ صاحبقراں شاہجہاں | بادشاہِ دادگسترظلِ وہابِ وحید
خانِ عالیشاں علی مرداں شد از بہرِ خدا | بانیِ ایں پل بفالِ خرم وبختِ سعید
سالِ تاریخش چو جستم از خرد داد ایں جواب
بانیِ ایں پل علی مرداں شد از لطفِ مجید

انکی تعمیرات میں ایک خود اس کا مقبرہ ہے، جسے اس نے اپنی والدہ کے لئے بنوایا تھا لیکن خود بھی اسی میں مدفون ہوا، اور اب یہ مقبرہ اسی کے نام سے مشہور ہے، اس مقبرہ کا ذکر اس کی وفات کے حالات میں آئیگا،

ایک مخطوطہ میں جس میں علی مرداں خاں اور اسکے خاندان کا پورا شجرہ نسب ہے، یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے قلعہ، نہر، شہر پناہ اور جامع مسجد دہلی تعمیر کی، غرض کہ شاہجہاں خود بہت بڑا ماہر تعمیر تھا، اور اس کے دربار میں بھی ایسے ہی لوگ جمع ہو گئے تھے،

یہ علی مرداں خاں کی فنی قابلیتوں کا مختصر سا خاکہ ہے۔ (باقی)

---

[1] ان تعمیرات کے حالات میں حسب ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے:۔

[1] تاریخ کشمیر مصنفہ محمد عظیم فارسی صفحہ ۲۱۱، صفحہ ۲۱۱، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۶ء [2] امپیریل گزٹ جلد نمبر ۱ صفحہ ۹۳ وجلد نمبر ۲۱، صفحہ ۲۶۹، وجلد نمبر ۲۲ صفحہ ۳۲۸، جلد نمبر ۸، صفحہ ۱۶ [3] آثار تاریخ دہلی مصنفہ بشیرالدین جلد ۲ صفحہ ۲۵۰ [4] ماثر الامرار صفحہ ۲۹۵، [5] وانڈین آرٹ جرنل نمبر ۹ ۱۸۸۹ء صفحہ ۳۰ ونمبر ۱ صفحہ ۳، [6] خلاصۃ التواریخ سبحان رائے صفحہ ۳۰ و [7] تاریخ لاہور سید محمد لطیف ص ۵۴ و ۵۵،

بقاے انسانی

کے

خلاف دو اعتراضوں کا جواب

از

جناب خواجہ عبد الحمید صاحب ایم اے لکچرار گورنمنٹ کالج گجرات

(۲)

اسی طرح اس انتقالی نظریہ کی وجہ سے ہم تصور دہلیز[۵] سے بھی متفق ہو جاتے ہیں، یہ وہ تصور ہے، جسے فکنر نے اپنی کتاب "طبیعیات نفسی" میں پیش کیا تھا، اور آج نفسیات جدید کا ہر اس کا ورد کر رہا ہے، فکنر کا خیال ہے، کہ شعور ظاہر ہو ہی نہیں ہو سکتا، جب تک کہ ایک خاص کیت کی نفسی طبیعی حرکت پیدا نہ ہو جائے، یہ حرکت جب ایک خاص درجہ تک پہونچ جاتی ہے، تو شعور ظاہر ہوتا ہے، حرکت کے اس درجہ کو وہ دہلیز کہتا ہے، اس دہلیز کی اونچائی

---

[۵] اگر میرے منہ کے اندر ایک چھوٹا سا ذرہ شکر کا ڈالا جائے، تو میں مٹھاس محسوس نہ کرونگا لیکن اگر ایک ایک کرکے چند ذرات اور ڈالے جائیں، تو ایک وقت آئے گا کہ میں کہدوں کہ ہاں اب مٹھاس معلوم ہوتی ہے، یہ ہوگی مٹھاس کے احساس کی دہلیز، فرض کیا کہ تین ذروں کے بعد مٹھاس کا احساس ہوا، تو ہم کہیں گے، کہ اگر محرک کی مقدار تین ذرات سے کم ہو تو احساس مٹھاس دہلیز کے ادھر نہ آئے گا، یعنی کوئی مٹھاس محسوس نہ ہوگی، (مترجم)

مختلف حالات میں مختلف ہوتی ہے، کبھی وہ چڑھتی ہے، کبھی گرتی ہے، جب یہ دہلیز گرتی ہے
مثلاً جب ہم پر عرفان کی خاص کیفیت طاری ہوتی ہے، تو ہمیں ایسی اشیاء کا شعور ہو جاتا ہے
جن کا عام حالت میں ہمیں وہم و گمان بھی نہیں ہوتا، جب یہ دہلیز چڑھ جاتی ہے، مثلاً نیم خوابی
کے وقت، تو شعور نیچے کے درجہ تک گر جاتا ہے، اب کیا دہلیز کا اس طرح چڑھنا اور گرنا دوسرے
الفاظ میں وہی بات نہیں ہے جسے ہم نے پیش کیا ہے، کہ مغز ایک پردہ یا رکاوٹ ہے جس
سے گذر کر شعور اس دنیا میں پہنچتا ہے، اور یہ پردہ کبھی زیادہ کثیف ہو جاتا ہے اور کبھی کم،
یہ نظریۂ انتقالی ہمیں مشاہدات انسانی کی ایک ایسی شق سے قریب تر کر دیتا ہے، جو
نظریۂ تولیدی کے زاویۂ نگاہ سے قریب قریب ناقابل فہم ہے، یہاں میں ان مبہم اور غیر معمولی
مشاہدات کی طرف اشارہ کر رہا ہوں، جو تاریخ انسانی کے ہر دور میں بیان ہوئے ہیں، اور
جن کی حقیقت کو آج کل مسٹر فریڈرک[1] مائر محققین علم الارواح[2] کی ایک جماعت کی مدد سے علمی دنیا
کے سامنے واضح کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، مثلاً ایسے حوادث اور مشاہدات، مذہبی لحاظ
سے تغیر قلب، دعا کے جواب میں فضل الٰہی سے ہدایات، فوری شفا، پیشین گوئیاں، موت کے
وقت روحوں یا صورتوں کا مشاہدہ، غیبی حوادث کا عینی[3] مکاشفہ، عاملانہ استعداد[4] کی مختلف حالتیں
اور کیفیتیں، اور بہتیرے ایسے حوادث جو ان سے بھی زیادہ غیر معمولی اور ناقابل فہم ہیں، اگر یہ صحیح
ہے، کہ ہمارا فکر یا شعور ہمارے مغز کی ایک ماموریت ہے، اور یہ حوادث جن کا ابھی ذکر کیا گیا ہے

---

[1] Mr. Frederic Myers
[2] Psychical Researches
[3] Clairvoyance
[4] Mediumistic capacities

امور واقعہ ہیں (میرا عقیدہ ہے کہ ان میں سے بعض تو یقیناً امور واقعہ ہیں) تو ہمیں ماننا پڑے گا، کہ یہ
حوادث ہرگز بغیر کسی تمہیدی مغزی حرکت کے ظہور پذیر ہو نہیں سکتے، لیکن ظہور شعور کے متعلق جو
عام تولیدی نظریہ رائج ہے، وہ حرکتِ مغزی کے اس خاص مفروضے کے ساتھ جکڑ دیا گیا ہے،
کہ ہر قسم کی مغزی حرکت معلول ہوتی ہے جسم انسانی کے اعضاے حس کی کسی ایسی ماقبل حرکت
کی، (خواہ وہ حرکت فوراً پہلے ہوئی ہو یا کافی عرصہ پہلے) جو مغز پر اثر کر چکی ہو، اس عمل کا نتیجہ ہوتا
ہے، کہ مغز احساسات اور شبیہوں کو پیدا کرتا ہے، پھر ان احساسات اور شبیہوں سے فکر و عرفان
کی اعلیٰ حالتیں درجہ بدرجہ منتج ہیں، انتقالی نظریہ کے مطابق ہمیں بھی یہ ماننا پڑتا ہے، کہ عام فکر
اسی طرح بنتا ہے، اور عمل حاسّہ سے مغزی رکاوٹ کی دہلیز گر جاتی ہے، مثلاً اس وقت میری
آواز اور میری صورت آپ کی آنکھوں اور کانوں پر اثر کر رہی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ
کا مغز زیادہ اثر پذیر ہو گیا ہے، اور اسی وجہ سے پس پردہ عالم سے میری شخصیت اور میرے کلام
کا عرفان آپ کے ذہن میں اتر آیا ہے، لیکن سمجھ میں نہیں آتا، کہ اُن بعید از فہم و قیاس اور
مہم حوادث میں جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، ہمارے اعضاے حس کیا کام دے سکتے
ہیں، مثلاً ایک عامل اپنے سائل کو ذاتی اور مخفی حالات کی اطلاع دیتا ہے، حالانکہ بظاہر
نا ممکن معلوم ہوتا ہے، کہ اس عامل نے یہ علم اپنی آنکھوں یا کانوں سے حاصل کیا ہو، یا ان ذرائع
سے اخذ کیا ہو، یا فرض کیجئے، کہ آپ کو ایک ایسے شخص کی صورت نظر آ رہی ہے، جو اس وقت
ہزاروں میل کے فاصلہ پر دم توڑ رہا ہے، نظریہ تولیدی ہمیں ہرگز نہیں بتاتا کہ کن احساسات
اور سے ہمیں علم و عرفان کے یہ بے تعلق اجزا ریکایک مل جاتے ہیں، لیکن انتقالی نظریہ کے سامنے
دشواری نہیں ہے، وہ تو کہتا ہے کہ یہاں پیدا ہونے کا سوال ہی نہیں، عرفان کے یہ اجزا عالم فوق التجربہ

Sensations & Images

میں موجود ہیں، جونہی ہمارے مغز کی دہلیز یا رکاوٹ نیچے گری، یہ اجزا ہمارے ذہن میں داخل ہوگئے، مثلاً جن لوگوں پر تغیر قلب[1] ہدایاتِ ایزدی، فوری روحانی شفا وغیرہ کی حالتیں گذری ہیں، وہ کہتے ہیں، کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک خارجی یا غیبی طاقت جو معمولی حواس کی زندگی سے بالکل مختلف ہوتی ہے، ہم میں ساری ہوجاتی ہے، اور ہمیں اُس فوق الفطرت زندگی تک پہونچا دیتی ہے، جہاں خود اس کا سرچشمہ ہے، سویڈن بورگ[2] کے مرید حلقے اس حالت کیلئے دخول یا سرایت کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں، یہ الفاظ اس عجیب عرفان کو اور اس نئی حالت و کیفیت کو جو ہم پر دریا کی موج کی تیزی سے طاری ہوجاتی ہے، بخوبی ادا کرتے ہیں، اب یہ مشاہدات جو تولیدی نقطۂ نظر سے بالکل بے معنی اور ناقابلِ فہم ہیں، ہمارے اس انتقالی نظریہ سے بالکل صاف اور واضح ہوجاتے ہیں، اور ہمیں صرف یہ کہنا پڑتا ہے، کہ ہمارا شعور ایک فوق الفطرت سمندر سے متصل و ملحق، اور اثر پذیر ہے اور اس سمندر کی لہریں خاص خاص حالتوں میں ہمارے مغزی پشتوں کو پار کرکے ذہن میں اتر آتی ہیں، البتہ ہمیں نہیں معلوم کہ مغز انسانی کی یہ رکاوٹی دہلیز خاص خاص اوقات میں کیوں گر جاتی ہے، اس سوال کا جواب نہ ہمارے پاس ہے، نہ فریقِ مقابل کے پاس،

اب آپ انتقالی نظریہ کی خوبیوں میں ایک فائدہ اور بھی بڑھا لیجئے میں جانتا ہوں، کہ آپ میں سے بعض اصحاب اس فائدے کو کوئی خاص اہمیت نہ دیں گے لیکن جب ہم یہ بھی دیکھتے ہیں، کہ یہ انتقالی نظریہ حیات بعد الموت کے نظریہ سے بھی متفق ہے، تو آپ کو ماننا پڑے گا، کہ اس کے فوائد عام تولیدی نظریہ کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہیں، ایسے مسائل کی

---

[1] Conversion [2] یہ شخص Swedenborg جزیرہ نمائے سویڈن کا مشہور صوفی گذرا ہے، اور اسکی صوفیانہ تصانیف یورپ کے صوفی منش طبقوں میں بہت رائج ہیں،
(مترجم)

تاریخ کو اگر دیکھا جائے، تو معلوم ہوگا، کہ یہ نقطۂ نظر کلی طور پر کبھی نظر انداز نہیں کیا گیا تھا لیکن پوری وضاحت سے اُسے کسی نے پیش بھی نہیں کیا، فلسفہ کے مروجہ مذہب عینیت[1] نے جسم کو اس عالم رنگ و بو میں حیات روح کے لئے ایک ضروری شرط تصور کیا ہے، لیکن اس نے یہ بھی تسلیم کیا ہے، کہ جسم کی موت کے بعد یہ روح آزاد ہو جاتی ہے، اور خالص فکری اور غیر اشتہائی حالت اختیار کر لیتی ہے کانٹ[2] اس خیال کو ایسے الفاظ میں بیان کرتا ہے، جو ہمارے نظریہ انتقالی کے بالکل مشابہ ہیں، وہ کہتا ہے، بلا شبہہ جسم کی موت ہمارے نفس کی حیاتی زندگی کے لئے خاتمہ کا حکم رکھتی ہے لیکن نفس کی فکری زندگی کی ابتدا اس جسمانی موت سے ہو سکتی ہے، اس نقطۂ نظر سے ہمارا جسم ہمارے فکر کی علت نہیں ہے، بلکہ وہ اس فکر کے لئے ایک رکاوٹ کا کام دیتی ہے، یہ رکاوٹ ہمارے حیاتی اور حیوانی شعور کے لئے ضروری ہو سکتی ہے لیکن ہماری خالص روحانی زندگی کے لئے وہ محض ایک رکاوٹ ہے، اور بس، مسٹر شیلر نے (جو پہلے امریکہ کی کارنل یونیورسٹی میں تھے، اور آج کل آکسفورڈ میں ہیں) پچھلے دنوں اپنی ایک نہایت معرکۃ الآرا تصنیف میں جس کا نام سفنکس کی پہیلیاں[3] ہو، اور جس کے متعلق مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے، کہ اسے وہ مقبولیت نہیں ملی جو اس کا حق ہے) اس نظریہ انتقالی کو وضاحت سے پیش کیا ہے۔

---

[1] ولیم جیمز کے زمانہ میں اور اس سے دو صدی پہلے عینیت یا Idealism کسی نہ کسی شکل میں یورپ کے مشہور فلاسفہ کی تصانیف میں پائی جاتی تھی، آج کل یہ کیفیت نہیں ہے، (مترجم)

[2] (Immanuel Kant) جرمنی کا مشہور ترین فلسفی (۱۸ ویں صدی) جس کا شمار یورپ جدید کے بہترین مفکروں میں ہے، (مترجم)

[3] Riddles of The sphinx by f. C. S. Schiller شیلر کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے، (مترجم)

لیکن ابھی آپ کی تشفی نہیں ہوئی، آپ مجھ سے دریافت کریں گے، کہ ہم اس نظریہ کی مدد سے اپنے ذہن میں اپنی بقا کا تصور کیسے قائم کرسکتے ہیں؟ ہمیں ضرورت ہے ایسی بقا کی جس میں وہی خاصیتیں، وہی خصوصیتیں، اور وہی ذاتی حد بندیاں قائم ہوں، جن کی وجہ سے ہم اس دنیا میں ایک دوسرے سے مختلف اور ممیز ہیں، اور جن پر ہماری شخصیتوں کا انحصار ہے، ہماری ذات کا انحصار ان ہی قیود اور ان ہی حد بندیوں پر ہے، ہمارا سوال یہ ہے کہ جب حد بندی کرنے والا آلہ (یعنی جسم یا مغز) گل سڑ جائے گا، اور ہماری روحیں "فرد افرد آ" اپنے اصلی منبع میں پہونچ کر تمام قیود سے آزاد ہوجائیں گی، تو کیا حیات کی یہ خوش آیند حد بندیاں جنھیں ہم اس دنیا میں اپنی اپنی شخصیت کا لقب دیتے ہیں، وہاں (یعنی اس عالم بالا میں) بھی اپنی ذاتی انفرادیت اور یگانگت اسی طرح قائم رکھیں گی، جیسی کہ وہ اس دنیا میں رکھتی ہیں، جہاں ہمارے اپنے اپنے دماغ (یا مغز) ہمارے لطف و فائدہ کے لئے اس فوق الطبیعی منبع سے اثر پذیر ہو رہے ہیں؟ یہ وہ اہم سوالات ہیں جن کا حل اس انگرسول رتعت کے لکچراروں کے لئے ضروری ہے، مجھے امید ہے کہ بعض مقرر ایسے آئیں گے، جو ہماری بقا کے شرائط کو نہایت غور سے دیکھیں گے، اور ہمیں بتائیں گے، کہ جب موت کے بعد ہماری قیدین اور حد بندیاں کٹ جائیں گی، تو ہماری شخصیت میں سے کیا کیا کیفیتیں کم ہوجائیں گی، اور کون کونسی خاصیتوں کا اضافہ ہوجائے گا، اگر فلاسفہ کا یہ مقولہ صحیح ہے، کہ حد بندی ہمیشہ سلبی ہوتی ہے تو کوئی تعجب نہ ہوگا، اگر یہ دریافت ہو جائے کہ ہمارے مغز کی قائم کردہ قیود میں سے بعض کا (موت کے بعد) معدوم ہو جانا اس قدر برا نہیں ہے، جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔

بہرحال اس وقت میرا یہ ارادہ ہرگز نہیں ہے، کہ ایسے پیچیدہ مسائل میں الجھوں میں اپنا باقی ماندہ وقت دوسرے مقام کی تشریح میں صرف کروں گا، یہ مقام بھی ایسا ہی سلبی اور تشنہ ہے جیسا کہ پچھلا تھا، لیکن اگر دونوں کو ملا کر دیکھا جائے تو امید بقا کے لئے پرواز کی قوت قدرے زیادہ

ہو جاتی ہے،

زمانۂ حال میں ہماری قوتِ تخیلہ بہت زیادہ وسیع ہو گئی ہے، اس وسیع قوتِ متخیلہ کے مطابق ہمیں (اگر ہم حیات بعد الموت کے قائل ہو جائیں) اتنی زیادہ ہستیوں کی بقا تسلیم کرنا پڑے گی، کہ یہ خیال ہی ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے، میرا خیال ہے کہ اس مجلس کے حاضرین میں سے بعض اصحاب کیلئے یہ تعداد بھی سدِّ راہ بن رہی ہے، اور میری خواہش ہے، کہ اس سد کو کلی اور مستقل طور پر آپ کی راہ سے ہٹا دوں،

میرا خیال ہے کہ یہ ذہنی رکاوٹ بالکل زمانۂ حال کی پیداوار ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ سائنس نے اپنے نظریوں میں کمیت پر بہت زیادہ زور دیا ہے، اور اس کمیتی نقطۂ نگاہ کا اثر ہمارے اخلاقی احساس پر بھی بہت ہوا ہے،

ہمارے اسلاف کے لئے یہ دنیا بالکل چھوٹی سی تھی، اور اگر زمانۂ حال کے تصورات سے اس کا موازنہ کیا جائے تو وہ چھوٹی کیا بالکل ننھی منی سی تھی، اس کے اعتبار سے دنیا کی عمر زیادہ سے زیادہ چھ ہزار سال ہو گی، اور اس میں بس چند بڑے بڑے انسان گذرے، مثلاً بادشاہ، علمائے دین، اولیاے کرام وغیرہ، یہ اکابر اپنی خصوصیات اور بزرگی کی وجہ سے ذہنِ انسانی پر حاوی تھے، چنانچہ اپنی اس فضیلت کی وجہ سے نہ صرف وہ، بلکہ ان کے حالی موالی بھی خداوند کریم کی کائنات میں ایک خاص عزت اور درجہ پا گئے، بقا کے صحیح حقدار یہی اکابر اوران کے حالی موالی ہیں، ان کے بعد نسبۃً چھوٹے درجہ کے انسانوں اور معمولی فرقوں کے اولیا، کی باری آتی ہے، اس کے بعد ہما شما کا نمبر ہے، جو اس فردوس تصوّر کے لئے پس منظر کا کام دیتے ہیں، الغرض اسلاف کے ذہن میں ابد کا جو نقشہ تھا، اس میں مومنین صالحین کے لئے بھیڑ بھاڑ ہرگز نہ تھی (یہاں ابد کے اس نچلے اور آتشیں طبقہ کا ذکر نہیں ہے، جسے جہنم کہتے ہیں) اسلاف کی اس ذہنی تصویر کو

آپ بقا کا اشراقی نظریہ کہہ سکتے ہیں، بہشت کے مستحقین یہ چند گنے چنے انسان تھے، یہاں بھیڑ بھاڑ کا احتمال ہی نہ تھا، البتہ ابدیت جہنم کی بھیڑ بھاڑ کو نظر انداز کر دیجئے،

اب آپ مغربی دنیا کے اس کمیتی نقطۂ نگاہ کو دیکھئے، جو حال میں سب پر چھا گیا تھا، نظریۂ ارتقار کے مطابق ہمیں اپنے ذہن میں کونی عمل کے لئے مکان و زمان و انواع کے ایسے وسیع پیمانہ کا تصور کرنا پڑتا ہے، جو ہمارے اسلاف کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتا تھا ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی تاریخ بتدریج حیوان سے نکلتی ہے، اور یہ تاریخ حیوانی ارضیات کے دورِ ثالث[1] سے جاملتی ہے، اس ارتقائی طریق خیال نے آہستہ آہستہ ایک جمہوری نظریۂ بقا پیدا کر دیا ہے، جو پچھلے اشراقی نظریہ سے مختلف ہے، جہاں اس ارتقائی ذہنیت نے ہمیں بعض باتوں میں قدرے بدبین بنا دیا ہے، وہاں بعض اور باتوں میں اس نے ہمیں ہمدردی کی صفت بھی عطا کی ہے، ہم سوچتے ہیں کہ ہمارے یہ نیم وحشی اور قدیم بھائی جن کا نظریۂ ارتقار ذکر کرتا ہے، ہمارے ہی گوشت و پوست سے اور ہمارے ہی خون سے بنے تھے، فطرت کا یہ جبر تکدر اپنی ظلمت میں انھیں بھی اسی طرح گھیرے ہوئے تھا، جیسے کہ وہ ہمیں گھیرے ہوئے ہے، کبھی ان سے بھی سنگین جرائم کا ارتکاب ہوتا تھا، اور کبھی وہ اپنے ہی جوش جنون کے شکار ہوتے تھے، جہالت کی بدترین ظلمت میں ان کی گذر ہوتی تھی، اور ان کے دل طرح طرح کے خوفناک اور مکروہ اوہام سے پُر ہوتے تھے، لیکن نور کی ایک کرن اور روشنی کا ایک شعلہ ان کے دلوں کو ہر وقت منور کرتا رہتا تھا، ان کے دل میں ہر وقت یہ یقین تھا کہ زندگی خواہ کیسی بھی ہو، موت سے بہتر ہے، اس ایمان کی بدولت وہ زندگی کی مشعل کو تباہی کے دائمی تند جھونکوں سے بچانے

---

[1] دورِ ثالث سے مراد تکوین ارض کا وہ زمانہ ہے، جس میں بڑے بڑے پہاڑوں مثلاً ہمالہ کی داغ بیل پڑی، جانوروں کی موجودہ انواع کا ارتقار بھی اسی دور میں ہوا،

تھے انھی کی کوششوں کی بدولت یہ مشعل آج ہمارے لئے شمع راہ بنی ہوئی ہے، جب ہم ان قدیم اور نیم وحشی انسانوں کا جو جہالت کے اس ہمت آزما بوجھ کو اٹھائے ہوئے زندگی کی منزلیں طے کر گئے، اپنے ذہن میں تصور کرتے ہیں، تو ہمیں اپنی شخصی فضیلتیں کس قدر بے حقیقت معلوم ہوتی ہیں اور پھر خدا کی نظروں میں کسی شخص واحد کی ذاتی فضیلت کے ایک دو ذرے کس قدر بے ضرورت معلوم ہوں گے جب اس فضیلت کو نوع انسانی کی اس عام فضیلت کے مقابل میں رکھا جائے کہ خاموشی اور شجاعت سے اٹھتے بیٹھتے یہ نوع اپنا بنیادی فرض ادا کر رہی ہے، اور شجاعانہ زندگی بسر کر رہی ہے، جب ہم اس پر شکوہ اور ہیبت ناک منظر کا ذہن میں تصور کرتے ہیں، تو انکسار کا جذبہ ہمیں جھکا دیتا ہے اور ہم سوچتے ہیں، کہ پروردگار عالم کی نظروں میں ہمارے باہمی اختلافات اور ہمارے ذاتی فضائل اس قدر پسندیدہ نہیں ہیں، جس قدر کہ ہماری یہ عام حیوانی خاصیت پسند ہے یعنی ابتلا میں صبر اور کوشش پیہم اس خیال سے ہمارے دل ہمدردی اور برادرانہ شفقت کے جذبات سے پر ہو جاتے ہیں، ہم سوچتے ہیں، کہ اس بقا کا کیا فائدہ جس میں ان گنت لوگوں کے لئے جگہ نہ ہو، جو اسی طرح کوشاں رہے، جیسے کہ ہم ہیں، ہماری طبیعت اس بات کے خیال ہی سے متنفر ہو جاتی ہے، کہ ہماری ذاتی شایستگی، اور ہماری مذہبی فضیلت ہمیں اپنے ان بھائیوں سے (جو خوان حیات میں ہمارے برابر کے شریک تھے) اس قدر برتر کر دے، کہ ہمارے لئے تو ابدی رحمت کے دروازے کھل جائیں، اور ان کے لئے تو جہنم کی ابدی زحمت رہ جائے، اور یا عام جانوروں کی طرح موت ان کا مکمل اور مستقل خاتمہ کر دے، دل تو ایک قدم اور آگے بڑھنا چاہتا ہے، جانور کیوں موت کے بعد ختم ہو جائیں، ؟ کیا وحوش کی زندگی شجاعانہ زندگی نہیں ہے، ؟ اسی طرح زمانہ حال کے انسان کا دل یعنی وہ دل جو نظریۂ ارتقاء کے پیدا کردہ جذبۂ کونی سے پر ہے، حیوانوں کو بھی بقا سے محروم کرنا نہیں

چاہتا، بلکہ یہ پوچھتا ہے، کہ اگر کسی ایک ہستی کے لئے بقا ہے، تو پھر سب کے لئے کیوں نہیں ان طایر و وحوش کے لئے کیوں نہیں؟ مختصر یہ ہے کہ اگر آپ بقا چاہتے ہیں، تو بقا کا یہ پیمانہ اس قدر وسیع نظر آتا ہے، کہ ہماری قوت متخیلہ اس کے تصور سے گھبرا جاتی ہے، اور ہمارے ذاتی احساسات شل ہو کر رہ جاتے ہیں، ہم سوچتے ہیں کہ بقا کا یہ منظر اس قدر وسیع ہے، کہ ہم اسے تسلیم کر نہیں سکتے، اسلئے بہتر یہ ہے کہ ہم خود اپنی بقا کا خیال بھی ترک کر دیں، کیونکہ اسی خیال کی وجہ سے ہمیں یہ وسیع منظر ذہن میں لانا پڑا، چنانچہ ہم اپنے لئے بقا کی خواہش تک کو ترک کر دیتے ہیں، لیکن اس بات کے لئے تیار نہیں ہیں، کہ افریقہ اور آسٹریلیا کے جس قدر وحشی انسان آج تک ہوئے ہیں، ان کو بھی اپنا شریک بقا کریں، ذہن کہتا ہے کہ حیات بہت اچھی شے ہے، اگر اس کی وسعت معقول ہو، لیکن جب ہم نے دنیا بھر کو شریک بقا کر لیا، تو آسمان و زمین کی ساری وسعت اس لامحدود اور ہر دم بڑھتے ہوئے سیلاب کو سمیٹ نہ سکے گی،

موجودہ سائنس سے چونکہ میں بھی متاثر ہوا ہوں، اور یہ کیفیت جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے، مجھ پر بھی گذر چکی ہے، اسلئے میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ آپ میں سے بہت صاحبوں پر بھی یہی حالت گذری ہو گی، لیکن میں نے یہ بھی جان لیا ہے کہ یہ خیالات از سر تا پا غلط ہیں، اس مغالطہ کی دریافت نے میرے ذہن کو نئے سرے سے آزادی بخشی ہے، اور میں سوچتا ہوں کہ ایک خدمت جو اس وقت میں آپ حضرات کی کر سکتا ہوں، یہ ہے، کہ آپ کو بھی بتا دوں کہ مغالطہ چھپا کہاں ہے،

یہ مغالطہ اس قدر کھلا ہوا ہے کہ لوگوں کے اُسے نہ جان لینے پر حیرت ہوتی ہے، یہ مغالطہ نتیجہ ہے اس تباہ کن کور چشمی کا جس میں ہم سب مبتلا ہیں، ہم لوگ دوسروں کی زندگی کی اندرونی اہمیت سے بالکل بے حس اور ناواقف ہیں، ایک تو یہ ناواقفیت، پھر یہ تعصب کہ ہم اپنی کور چشمی کو

اس وسیع نظام عالم کا پیمانہ بناتے ہیں، اور اپنی بے حقیقت ضرورتوں کو ہستی مطلق کی ضروریات کا معیار سمجھتے ہیں، ہمارے عیسائی اسلاف اپنے نقطۂ نگاہ سے اس مسئلہ کو ہم سے زیادہ آسانی سے حل کر لیتے تھے، ہمارا نقص یہ ہے کہ ہم میں ہمدردی پوری طرح موجزن نہیں ہے، ان کی حالت اس کے برعکس تھی، انھیں ہر اس انسان سے نفرت تھی، جو ان کے محدود حلقہ میں شامل نہ تھا، اور وہ اپنی سادگی سے یہ سمجھتے تھے، کہ جس طرح انھیں غیر عیسائی لوگوں سے نفرت ہے، اسی طرح خدا کو بھی ان سے نفرت ہے، وہ ان کے خیال میں کافر تھے، اسلئے ہمارے اسلاف اس خیال سے خوش ہوتے تھے، کہ ان سب کو اللہ میاں نے جہنم کی آگ کا ایندھن بنانے کے لئے پیدا کیا، ہماری تہذیب ہمیں ایسے عقیدے کی اجازت نہیں دیتی لیکن ہم اس کے لئے بھی تیار نہیں ہیں، کہ انھیں فردوس کے خوانِ نعمت میں اپنا شریک بنائیں، ہم اپنے خیال میں کہتے ہیں کہ ہمارا ان سے کیا سروکار؟ پھر ہم سوچتے ہیں کہ اگر سروکار نہیں تو وہ بقا کیوں پائیں؟ مثلاً چینیوں کے متعلق اپنے ذہن کا جائزہ لیجئے، کیا آپ میں سے کسی صاحب کو بھی یہ خیال بھلا معلوم ہوتا ہے، کہ یہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسی طرح تعداد میں بڑھتے چلے جائیں؟ غالباً ایک صاحب بھی ایسے نہ ہوں گے، زیادہ سے زیادہ آپ یہ فرمائیں گے، کہ یہ قوم بہت عجیب و غریب ہے اسلئے آٹھ دس نمونے باقی رکھ لو، ان کے علاوہ جو کروڑوں چینی موجود ہیں، اور جن کے متعلق آپ نے ایک عام ذہنی تصور یعنی چینی قائم کر رکھا ہے، وہ فرداً فرداً آپ کی نظروں میں ہیچ ہیں یا نہیں؟ آپ کا ذہن کہتا ہے، کہ خود خدا کو بھی اتنے چینیوں کی کیا ضرورت ہے؟ ہر ایک چینی کو ہستی بخشنا (آپ کے خیال میں) خواہ مخواہ خدا کو اور دنیا کو تنگ کرنا ہے، اس طرح مسئلۂ بقا آپ کے ذہن میں کچھ دردِ سر اور کچھ روحانی متلی پیدا کر دیتا ہے، چنانچہ پہلے تو آپ کو شک ہوتا ہے کہ یہ سب لوگ بقا کیسے پا سکتے ہیں، اور پھر آپ کو خود اپنی بقا پر بھی شک گذرتا ہے، حالانکہ

آپ کا دل قدم قدم پر آپ کو خود اپنی بقا کی اہمیت اور ضرورت سمجھا رہا ہے، مجھے یقین ہے کہ جو صاحب اس وقت میرے سامنے بیٹھے ہیں، ان میں سے بہتوں کا یہی حال ہے،

لیکن کیا آپ نے اس بات پر بھی غور کیا کہ یہ طرز استدلال آپ کی اپنی قوت تخیلہ کی کوتاہی اور نقص کو ظاہر کر رہا ہے، آپ اجنبی انسانوں کے ان گروہوں کو اس حیثیت میں لے رہے ہیں جس حیثیت سے وہ آپ کے سامنے آتے ہیں، یعنی آپ کی آنکھوں کے پردہ چشم پر ایک خارجی تصویر کی حیثیت سے، یہ تصویر اپنی وسعت اور بے ترتیبی کی وجہ سے آپ کو گھبرا دیتی ہے آپ استدلال کرتے ہیں، کہ جو کیفیت ان لوگوں کی میری نظر میں ہے، وہی کیفیت اور حالت ان کی اپنی اصلی حالت ہے اور چونکہ مجھے ان لوگوں کی کوئی ضرورت نہیں، اسلئے درحقیقت (کسی کو بھی) ان کی ضرورت نہیں" لیکن جس طرح آپ خارجی حیثیت سے ان سے آگاہ ہیں، اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ شدت سے وہ اپنی حیات کی اندرونی آگہی اپنے اندر پاتے ہیں، وہ مردہ اور ہیچ نہیں ہیں، آپ ہیچ اور مردہ اور کور چشم ہیں، کہ اس غلط طریقہ سے آپ ان کا تصور کرتے ہیں، آپ کی آنکھیں ایک ایسے منظر پر کھلتی ہیں، جس کے مفہوم سے آپ قطعاً ناواقف ہیں، آپ اپنے دل میں لذت حیات و زیست کی تابش پاتے ہیں، یاد رکھئے کہ وہی تابش اسی تیزی اور سوز سے، بلکہ اس سے زیادہ گرمی اور زیادہ شدت سے ان اجنبی اور مکروہ صورتوں کے دلوں میں بھی موجزن ہے، اور اس اجنبی کے لئے بھی خورشید طلوع ہوتا ہے، اور حسن اپنی کرنوں سے اس کا راستہ صاف کرتا ہے، اسٹیفنسن[۵] نے سچ کہا ہے، کہ اگر آپ میں اس اجنبی کے ذوق اندرون کا احساس نہیں ہے، تو آپ نے اُسے بالکل نہیں سمجھا" اُس ان گنت گروہ میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے، جس کے دل و شعور میں بقا کی خواہش پوری تیزی سے شعلہ زن نہ ہو

۵؎ The Lantern bearers by R. L. Stevenson

یہ خیال کہ آپ کو اس شعلہ کا یا اس کی ضرورت اور اہمیت کا احساس نہیں ہے، بالکل غیر متعلق ہے
اگر آپ کی دلچسپی کسی خاص مقام پر پہونچکر بالکل خاموش اور سرد پڑ جاتی ہے، تو اس سے یہ ثابت
نہیں ہوتا، کہ اور دلچسپیاں سرے سے ہی نہیں ہیں، نظامِ عالم جب اپنے وسیع خزانوں سے
کوئی زندہ ہستی پیدا کرتا ہے، تو ساتھ ہی اس ہستی کے بقا کی ضرورت اور اس بقا کی خواہش بھی
پیدا کر دیتا ہے، اگر کسی دوسرے کو اس خواہش اور ضرورت کا احساس نہ ہو، تو نہ ہو، لیکن خود
اس زندہ ہستی کو ضرور ہوگا، اسلئے اگر ہم میں سے کسی شخص کے دل میں دوسرے جانداروں کے
ساتھ ہمدردانہ جذبہ کا احساس جلد ختم ہو گیا ہے، تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مطلق اور لامحدود ہستی
کے دل کے اندر بھی یہ احساس موجود نہیں ہے، عجب مضحکہ انگیز ہوگا، آپ اپنے ذہن سے
یہ خیال نکال دیجئے، کہ عالمِ کائنات ایک محدود مکان ہے، اور جتنی مخلوق اس کے اندر آتی
جائے گی، اسی تناسب سے مکان کی وسعت تنگ ہوتی جائے گی، یہ خیال غلط ہے، جو ذہن پیدا
ہوتا ہے، وہ اپنا مکان و محل اپنے ساتھ لیکر آتا ہے، اور ذہن و مکان اور محل کی یہ فراوانی مخلوق
کے لئے جگہ تنگ نہیں کرتی، کیا میرے تخیل کا مکان، آپکے تخیل کے مکان کا نقیض ہے؟ ہرگز
نہیں، شعور کے امکان کی کوئی حد نہیں، اور نہ اس عالمِ شعور میں کوئی ایسا قانون عمل پیرا ہے جیسا
حفظ قوت کا مشہور قانون مادی دنیا میں جاری سمجھا جاتا ہے، جب ایک انسان پیدا ہوتا ہے

٭ یہ طبعیات جدید کا ایک مشہور قانون ہے کہ جب کاغذ کے ٹکڑے کو آپ جلا دیتے ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے
جو قوت یا energy اس ٹکڑے میں موجود تھی، وہ ضائع ہو گئی؟ طبیعی کہتا ہے کہ کوئی
قوت ضائع نہیں ہوئی، صرف شکل و حالت بدلتی ہے، اس کاغذ کی قوت نئی صورتیں پا گئی ہے مثلاً جلنے
سے روشنی گرمی اور دھواں ظاہر ہوا اور کچھ راکھ رہ گئی، کاغذ کی قوت ان اشیا میں منتقل ہو گئی، مادی دنیا کی
قوت نہ بڑھتی ہے نہ گھٹتی، یہ ہے قانون تحفظ، (مترجم)

یا جاگ اٹھتا ہے، تو یہ ضروری نہیں ہے کہ کائنات کی شعوری مقدار کا توازن قائم رکھنے کیلئے کوئی دوسرا انسان سوجائے یا مرجائے، پروفیسر وونڈٹ[1] نے تو اس کے برعکس اپنی کتاب نظام فلسفہ میں ایک قانون پیش کیا ہے، جسے وہ قانون ترقی قوت روحانی کا نام دیتے ہیں، اس قانون کو وہ مادی دنیا کے قانون تحفظ قوت کا مقابل سمجھتے ہیں، روحانی معاملات میں ہستی کی ترقی کی کوئی حد مقرر نہیں ہے، جب کوئی روحانی ہستی پیدا ہوتی ہے، تو وہ اپنا اثبات واقرار کرتی ہے، پھلتی پھولتی ہے، اور اپنی بقا چاہتی ہے، اس لئے ہم یہ کہنے کے مجاز ہیں، (اور ہمیں اپنی ذاتی ہمدردی کے نقص کو نظر انداز کر دینا چاہیئے) کہ نظام عالم میں حیات افراد کی رسد خواہ یہ رسد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو) کبھی ضرورت سے زیادہ نہیں ہوسکتی، جب ایک ہستی پیدا ہوتی ہے، تو اس کی ضرورت اس کے ساتھ پیدا ہو جاتی ہے، یعنی جو پیدا ہوتا ہے، وہ اپنی بقا کی ضرورت کو اپنے ساتھ لاتا ہے،

آپ نے سمجھ لیا ہوگا، کہ میں اس وقت ان تمام ہستیوں کی طرف سے وکالت کر رہا ہوں جو ہیں تو مجھ سے مختلف لیکن میری طرح اپنے اندر حیات کا جوش و خروش موجزن رکھتی ہیں، اگر ہمارا مذہب وحدت[2] وجود کا مذہب ہے، تو ہم یہیں ٹھہر سکتے ہیں، اور یہ کہہ کر قصہ ختم کر سکتے ہیں، کہ کائنات کی ازلی اور ابدی روح ان مختلف ہستیوں کے ذریعہ سے اپنی ہی ابدیت کا اقرار و اثبات کر رہی[3] ہے، لیکن اگر ہمارا مذہب الوہیت کا مذہب[4] ہے، تو ہم کو

---

[1] W. Wundt's System of Philosophy

[2] یعنی "ہمہ اوست" کا مذہب، [3] یہ خیال بالکل ویسا ہے، جیسا کہ اس مشہور حدیث میں ہے کنت کنزاً مخفیاً الخ (یعنی خدا فرماتا ہے میں چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے ظاہر ہونا پسند کیا، اسلئے خلقت کو پیدا کیا معاف یہ حدیث موضوع ہی، [4] یعنی یہ عقیدہ کہ خدا موجود ہے، اور اسکی طرف سے بندوں کی ہدایت

نتیجہ کو بدلے بغیر آگے بڑھ سکتے ہیں، ہم کہہ سکتے ہیں، کہ خدا کی رحمت کا خزانہ اس قدر لاانتہا ہی کہ اُسے اس کی خواہش اور ضرورت ہی کہ مخلوق کا ایک نہ ختم ہونے والا دریا ہر وقت جاری رکھے اس مرلحہ بڑھنے والے دریا کی سیرابی سے وہ (ہماری طرح) نہ تھک سکتا ہی، اور نہ اکتا سکتا ہے، ہر کام میں اس کا پیمانہ غیر محدود ہے، اس کا جذبۂ رحمت اپنی ہمہ گیری میں کبھی سیر نہیں ہوتا،

مجھے امید ہے کہ اب آپ میرے ساتھ اس امر میں متفق ہوں گے، کہ فردوس کی بھیڑ بھاڑ کا تھکا دینے والا تصور حقیقت پر مبنی نہیں ہے، بلکہ وہ محض ہمارا ایک شخصی اور ذاتی مغالطہ ہے جس کی علت انسان کی اپنی تنگ نظری ہے، یہ تنگ نظری اس تنگ دل اشراقی نظریۂ بقا سے پیدا ہوتی ہے، جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، میرے دوستو اپنے پروردگار کے سامنے جھک جاؤ، اور اپنی نظر کو اس کے اس شاہانہ جلال کی طرف اٹھاؤ، جو آسمان کے ستارون میں نودار ہے، پھر تم دیکھ لوگے، کہ یہ عالم ایک جمہوری عالم ہے، اپنی تنگ دلی اور کم ظرفی کو آب کائنات کا پیمانہ نہ بناؤ، جب پروردگار نے اس کرۂ ارض کو بسایا تھا، تو کیا آپ کی رضامندی کا پروانہ حاصل کیا تھا، ؟ اگر نہیں تو حیات بعد الموت کی وسیع مملکت کی آبادی کیلئے اُسے آپ کی پسندیدگی کا اجازت نامہ حاصل کرنا کیوں ضروری ہے، ؟ (حضرت) ایوب (علیہ السلام) کی طرح اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیجئے، اور شکر کیجئے کہ با این ہمہ کم مائگی آپ کو بھی اس وسیع ملک میں بسنے کی اجازت مل گئی ہی، جو پروردگار ہم کو اور آپکو اس میں بسنے کی اجازت دیتا ہی، وہ اور ہستیوں کو بھی دیسکتا ہی، خواہ ہم اپنی جگہ پر ان ہستیوں کو کتنی ہی عجیب و غریب و مکروہ تصور کریں،

الغرض جہاں تک منطقیانہ ربط و استدلال کا تعلق ہے ہیں بالکل اسکے لئے تیار ہون کہ اس دنیا کے جنگلون کا ہر تنکہ جو ہوا میں اڑتا اور گرتا ہی، بقا پا جائے، اب سوال صرف یہ ہی کہ

(بقیہ حاشیہ ص ۳۷۸) کیلئے وحی نازل ہوتی ہی، الوہیت میں یہودیت نصرانیت اور اسلام شامل ہیں، (مترجم)

امر واقعہ کیا ہے، ؟ کیا پتے کو بقا مل سکتی ہے، یا نہیں ؟ ایسے فرضی اعتراضات کہ اس سے تعداد بہت بڑھ جائے گی یا اس عالم حادث کو موت کے بعد اسی طرح دوبارہ پیدا کرنے یا جاری رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے، ؟ درحقیقت غیر متعلق ہیں، کیت کی کمی بیشی یا قبل موت، اور بعد موت کی دنیا کی مخلوق کی نوعی ہم آہنگی، یہ محض حالتیں ہیں ہمارے اپنے محدود طرز فکر کی، اگر ہم اس فکر سے قطع نظر کرکے دیکھیں، تو عالم کی وسعت کا ایک پیمانہ کسی دوسری قسم کے پیمانہ سے ذرہ برابر بھی زیادہ بعید از فہم یا معجزانہ نہیں ہے، ہستی اسی طرح ممکن ہے جس طرح کہ نیستی جب ایک بار ہستی معرض وجود میں آئی، تو اس کا پیمانہ بھی (خواہ وہ کسی قسم کا ہو) ممکن ہو گیا،

ہستی کا دل ایسا کم ظرف نہیں ہے جیسا کہ ہمارے قلب محدود ہیں، ہمارا ادراک اور ہماری ہمدردی ان زندہ ہستیوں کی اندرونی اہمیت کا اندازہ کر نہیں سکتی، جو ہم سے مختلف ہیں اگر ہم اپنی اندرونی (روحانی) زندگی کی ایسی اہمیت پاتے ہیں جس سے معاً ہمارے دل میں اپنی بقا کے استحقاق کا خیال پیدا ہوتا ہے، تو رواداری کا تقاضا یہ ہے کہ دوسری ہستیوں کی خواہش بقا کو بھی ہم ویسی ہی اہمیت دیں، خواہ یہ ہستیاں ہماری نظروں میں کتنی ہی کثیر التعداد اور ناپسندیدہ کیوں نہ ہوں، اگر ہم دوسروں کی بقا کی اہمیت کے تصور سے بالکل ہی معذور ہیں یا ان کے بقا کو ناقابل اعتنا سمجھتے ہیں، تو کم از کم ہمیں اپنی بقا کے تصور و خواہش سے دست بردار نہ ہو جانا چاہیے، اگر ہم نے ایسا کیا، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا، کہ ہماری کور چشمی نے بصیرت پر غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے،

نٹشے

مشہور جرمن فلاسفر فریڈریک نٹشے کی سوانحعمری اور اسکے افکار و خیالات، اور تصانیف پر بحث و تبصرہ ہی، مصنفہ پروفیسر مظفر الدین، ندوی ایم اے، حجم ۱۰۲ صفحے قیمت ۱۲ر "مینجر"

تلخیص و تبصرہ

تاریخ کی بین الاقوامی کانگریس

اس سال تاریخ کی بین الاقوامی کانگریس کا آٹھواں اجلاس گذشتہ اگست اور ستمبر میں زیورچ میں منعقد ہوا، اسمیں چپن مختلف قوموں کے ۱۲۰۰ مورخین جمع ہوئے تھے، ہندوستان کی طرف سے پادری ہراس پرنسپل سینٹ زیویر کالج بمبئی، اور پروفیسر ہارون خان شیروانی عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سرکاری نمایندے تھے، مشرقی اور اسلامی ممالک میں سے افغانستان، البانیہ، الجیریا، چین، مصر، ایران، فلسطین، شام، اور ترکی کے نمایندے آئے تھے، الجیریا کی نمایندگی فرانسیسیوں نے کی، افغانستان کی طرف سے مجلس اقوام کے افغانی نمایندہ نے شرکت کی، شام سے ہزاکسلنسی امیر شکیب ارسلان تھے، فلسطین کی جانب سے یہودیوں کی یونیورسٹی کا ایک پروفیسر شریک ہوا، ترکی کے نمایندے ڈاکٹر فواد کوپرلی اور ڈاکٹر حامد زبیر کوسے تھے، اول الذکر انگورہ میں تاریخ کے پروفیسر اور آخر الذکر میوزیم کے ڈائرکٹر جنرل ہیں، ہندوستان سے مذکورہ بالا دو سرکاری نمایندوں کے علاوہ کلکتہ یونیورسٹی، برامر ریسرچ سوسائٹی بمبئی اور پنجاب یونیورسٹی کے نمایندے بھی شریک تھے،

کانگریس مختلف شعبوں پر مشتمل تھی، مشرقی شعبوں کے ارکان میں فادر ہراس اور پروفیسر شیروانی بھی تھے، پروفیسر شیروانی نے ایک مہینہ پیشتر یہ تجویز بھیجی تھی، کہ اسلام کے تمدنی اثرات کو مغرب کے مورخوں نے نظر انداز کر رکھا ہے، اسلئے اس کانگریس کو اسکی طرف خاص توجہ کرنے کی ضرورت ہے

اس تجویز پر غور کرنے کیلئے مشرقی شعبہ کا ایک جلسہ کانگریس کے کھلے اجلاس سے ایک روز پہلے منعقد ہوا، اس میں کانگریس کے صدر ڈاکٹر ٹمپرلی کے علاوہ انگلستان، چین، جرمنی اور سیدرلینڈ کے نمایندے بھی شریک تھے، پروفیسر شیروانی کی تجویز اور اسلامی کلچر کی اہمیت پر دیر تک بحث ہوتی رہی، آخر میں متفقہ طور پر طے پایا کہ آیندہ کانگریس میں ہندوستان اور مشرق میں جو اسلامی اثرات پیدا ہوئے ہیں، ان کے لئے ایک شعبہ کا اضافہ کیا جائے۔ اور مشرقی زبانوں کی کتابیں کانگریس کی کتابیات میں لاطینی حروف میں شامل کر لیجائیں،

۲۸ اگست کو ڈاکٹر ٹمپرلی (کیمبرج یونیورسٹی) کی صدارت میں کانگریس کا اجلاس شروع ہوا، کانگریس کی سرکاری زبانیں فرانسیسی، جرمن، اطالوی اور انگریزی ہیں، ان ہی چار زبانوں میں تقریریں ہوئیں، اور مقالات پڑھے گئے، مقالات کی تعداد ۵۰۲ تھی، اسلامیات اور مشرقیات سے متعلق مندرجۂ ذیل مضامین پڑھے گئے،

۱۔ بازرلی کا فری جیانی شہر از ڈاکٹر زبیر کو سے (انگورہ) فرانسیسی زبان میں،

۲۔ صلیبی جنگ کے زمانہ میں شام میں مغربی یورپ کی قوموں کی ریاست (Frankish Regions) کا زوال از پروفیسر لامانتے (سن سانی) انگریزی زبان میں،

۳۔ "صلاح الدین اعظم کی سیرت" از امیر شکیب ارسلان (شام) فرانسیسی زبان میں،

۴۔ "سلطان محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ کی تاریخی اہمیت" از ڈاکٹر اے اچ لی بیر (اربانا) انگریزی زبان میں،

۵۔ "چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں مغربی یورپ اور مشرقی سوال" از ڈاکٹر جے ڈابرو واکی (کراکو) جرمن زبان میں

۶۔ "ازمنۂ وسطی میں ترکی اسلامی جاگیرداری" از ڈاکٹر فواد کوپرلی (انگورہ) فرانسیسی زبان میں

(۷) "بحر روم کے مسائل، ولیم ثالث سے ۱۹۱۲ء تک" از پروفیسر پی سلوا، (روم) اطالوی زبان میں،

۸۔ "انیسوی صدی عیسوی میں بحر روم"، از ڈاکٹر وائی، ام، گویلے، (پیرس) فرانسیسی زبان میں،

۹۔ "تجدید عیسائیت کی مخالفت کے زمانہ میں ترکی کے مسائل" از ڈاکٹر ماٹوسک (پریگ) فرانسیسی زبان میں

۱۰۔ "پامرسٹن سے ڈس رائیلی کے زمانہ تک انگلستان اور ترکی کی آزادی"، از ڈاکٹر اچ ٹمپرلی، (کیمبرج) انگریزی زبان میں،

۱۱۔ "انقلاب فرانس اور یونانیوں کی آزادی"، از ڈاکٹر ڈاس کالاکس (ایتھنس)

۱۲۔ "والاچیا اور مولدیویا، کے دیوان (وزیر) کے انتخاب (۱۸۵۷-۱۸۵۸ء) میں دوسری قوموں کا حصہ" از پروفیسر اوٹے لی (جیسی) فرانسیسی زبان میں،

۱۳۔ "کمبوڈیا میں ہندوستانی مندر کا ایک کمیاب طرز"، از ڈاکٹر گھوشال (کلکتہ) انگریزی زبان میں،

۱۴۔ "موریا خاندان کے ماتحت سلطنت ختن"، از پروفیسر اچ، سی سیٹھ، (ناگپور) انگریزی زبان میں،

۱۵۔ "سندھ کے تالپور فرمانرواؤن کے زمانہ میں جرم اور سزا" از مسٹر اے، بی، ادوانی (کراچی) انگریزی زبان میں،

۱۶۔ "مینا تور کی داستان موہنجو دارو کے کتبوں کی روشنی میں" از فادر ہراس (بمبئی) انگریزی زبان میں،

۱۷۔ "مشرقی عیسویت اس کا طرز زندگی اور عمل اور اسکے مقابلہ میں اسلام اور مذہب مانی" از پروفیسر گونڈی (روم) اطالوی زبان میں،

۱۸۔ "اسلامی سیاسی خیالات اور پولیٹیکل سائنس میں اسکی اہمیت" از پروفیسر ہارون خان شیروانی (عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد) انگریزی زبان میں،

۱۹۔ "اٹھارہویں صدی عیسوی میں موریا کی آبادی" از پروفیسر جون لپاس (کلیج) فرانسیسی زبان میں،

ہر مقالہ کے خاتمہ پر بحث ہوتی تھی جس میں نقد و تبصرہ اور سوال و جواب کی پوری آزادی تھی، اس کانگریس کا آیندہ اجلاس ۱۹۴۳ء میں روم میں ڈاکٹر لالینڈ (واشنگٹن ممالک متحدہ) کی صدارت میں ہوگا، (اسلامک کلچر) "ص ع"

تقریر کی تیاری

تقریر کی تیاری میں حسب ذیل چیزوں کو ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے، ان سے فائدہ اٹھاکر مقرر اپنی قابلیت اور موثر آواز سے تقریر کو بہت کامیاب بنا سکتا ہے، اور اسے نظر انداز کر دینے سے تقریر ناکام رہتی ہے،

۱۔ تقریر تیار کرتے وقت مقرر کو اپنے آپ کو سامعین میں کا ایک فرد سمجھنا چاہئے، جب وہ کسی موضوع پر بولے، تو یہ کبھی تصور نہ کرے کہ حاضرین اس کے موضوع سے اسی کی طرح دلچسپی رکھتے ہیں، بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سامعین میں سے بہت سے اشخاص تقریر کے موضوع سے بالکل ناواقف اور نابلد ہوتے ہیں، اسلئے مقرر کو اپنے مضمون کو بہت ہی دلچسپ پیرایہ میں پیش کرنا چاہئے، تاکہ حاضرین کم سے کم یہ محسوس کریں کہ جلسہ میں انکی شرکت رائگاں نہیں گئی، اس

کے لئے حاضرین کے ذہن کا اندازہ لگانا ضروری ہے، ان میں بعض اشخاص ایسے ہوتے ہیں جو دن بھر کی مشغولیتوں سے تھکے ماندے ہوتے ہیں بعض گھریلو زندگی کے تردد و فکر سے پراگندہ خاطر ہوتے ہیں، اور بعض بے کاری اور کاہلی کے باعث دماغی حیثیت سے معطل اور جامد رہتے ہیں، ایک مقرر کے لئے ان تمام ذہنی کیفیتوں کا تجربہ کرنا اور ان کو سامنے رکھنا ضرور ہے تاکہ وہ اپنی تقریر میں تنوع پیدا کرکے ہر قسم کے اشخاص کو مطمئن کرسکے، تقریر کو دلچسپ بنانے کے لئے تنوع بہت ہی ضروری جزء ہے۔

۲- تقریر کرتے وقت تقریر کے مقصد کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے، اکثر مقرر اس لئے ناکام رہتے ہیں، کہ ان کی تقریر کے ختم ہونے کے بعد حاضرین کو سوچنا پڑتا ہے، کہ ان کی تقریر کا مدعا کیا تھا جب تک تقریر کا کوئی مقصد نہیں ہوتا، اس وقت تک مقرر کے خیالات میں ترتیب اور اسکے اظہار میں اثر ہونے نہیں پاتا، مقرر جتنے رموز و نکات بھی بیان کرنا چاہے، ان کو مدرجاً ایک خاص مقصد کے ماتحت بیان کرنا چاہئے، وہ اپنی تقریر میں خواہ کچھ بھی کہے لیکن اس سے تقریر کا مقصد عیاں اور ظاہر ہوتا رہے، ڈسرائلی کا قول ہے کہ کامیابی کا راز مقصد کی استقامت ہی میں ہے تقریر بھی بغیر مقصد کے بالکل ناکام ہے،

۳- تقریر کا آغاز ہمیشہ دلچسپ ہونا چاہئے، ابتدا ہی میں رنج، افسوس، غم اور ملال کے اظہار سے حاضرین کے جذبات پژمردہ ہوجاتے ہیں، اس کے بعد مقرر کی شگفتہ بیانی مشکل سے کوئی اثر پیدا کرسکتی ہے ایک مقرر کو جب یہ معلوم ہوجائے، کہ جلسہ کی فضا اس کے موافق نہیں ہے، اور حاضرین اسکی باتوں کو قبول اور تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں، تو اس کو تقریر کی ابتدا بہت ہی خوشگوار اور لطیف پیرایہ میں کرنی چاہئے، یا جب وہ پرجوش اور پرکیف تقریر کے ذریعہ سے حاضرین کے جذبات کو منتہائے کمال تک پہونچانا چاہے، تو اسکو ابتدا ہی سے اپنے اور حاضرین کے درمیان

ہمدردانہ اور محبت آمیز ربط اور تعلق پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے،

۴۔ تقریر میں سادگی اور اخلاص کا پہلو زیادہ نمایاں ہونا چاہیے، مقرر کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ حاضرین اس کے موضوع سے بالکل ناآشنا ہیں، اس سے تقریر کے الفاظ بالکل سادہ اور اصطلاحات بہت ہی آسان ہونے چاہئیں، تاکہ حاضرین کو سمجھنے میں کسی قسم کی دقت نہ ہو، خیالات کیسے ہی ادق، مشکل، نازک اور باریک ہوں، اگر ان کو سادہ اور آسان الفاظ میں پیش کیا جائے تو تقریر زیادہ موثر اور کامیاب ہو سکتی ہے، خیالات خواہ مشکل اور پیچیدہ ہوں لیکن الفاظ مغلق اور پریشان کن نہ ہوں،

ایک مقرر کو الفاظ اور اصطلاحات کی سادگی پر اسی وقت قابو ہو سکتا ہے جب وہ اپنے موضوع پر غیر معمولی طور سے تیار ہو، جب تک موضوع پر پوری تیاری نہ ہو، جلسہ میں آکر بولنا مناسب نہیں، اور جب وہ تیار ہو جائے تو جلسہ میں سیدھا کھڑا ہو کر بولتے بولتے وقت سر کو اونچا رکھے، جو کچھ کہنا چاہتا ہو صاف آواز میں کہے، زیادہ نہ چلائے اور نہ اپنے بازو کو حرکت دے، اور جو کچھ کہے اس میں اخلاص کی بو ہو، حاضرین کو جب تک یہ محسوس نہ ہوگا کہ جو کچھ کہہ رہا ہے، اس کے دل کی آواز ہے، اسوقت تک اسکی تقریر کامیاب اور اس کا پیام موثر نہ ہوگا،

۵۔ تقریر کے حقائق کی وضاحت اور واقعات کی خشکی دور کرنیکے لئے مثالیں اور قصے بہت ہی معاون ثابت ہوتے ہیں، اسلئے تقریر میں ان کا حوالہ بھی ضروری ہے، ذاتی تجربے اور مشاہدے کی مثالیں اور قصے زیادہ موثر ہوں گے، مگر کوئی مثال یا قصہ نفس موضوع سے دور اور الگ نہ ہونے پائے،

۶۔ تقریر محض تقریر کرنیکی خاطر نہیں کرنی چاہیے، جب تک کوئی بات واقعی کہنے کی نہ ہو اسوقت تک نہ کی جائے، محض اپنی آواز سنانے کیلئے تقریر کرنا ایک فعل عبث ہے، تقریر کا کوئی خاص مقصد ہونا چاہئے، اور تقریر کے خاتمہ میں عمل و حرکت کی بھی دعوت دینی چاہئے، اور موضوع کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے بعد کچھ عملی مشورے بھی دینے چاہئیں اگر حاضرین اس مشورے پر عمل کرنیکے لئے تیار ہو گئے تو مقرر کی تقریر بلاشبہہ کامیاب اور موثر ہوگی،

کامیاب زندگی کیلئے ضروری صفات

ہم میں سے ہر شخص کامیاب زندگی بسر کرنا چاہتا ہے لیکن اس کامیاب زندگی کی توضیح اور تشریح کرنا مشکل ہے کیونکہ ہر شخص کا معیار اور نقطۂ نظر جدا ہوتا ہے، تاہم معیار خواہ کتنا ہی بلند ہو، اور نقطۂ نظر کتنا ہی جداگانہ کیوں نہ ہو، زندگی کو کامیاب بنانے کیلئے مندرجۂ ذیل اوصاف ضروری ہیں،

تجسس کا شوق، بچوں میں تجسس اور تلاش کا غیر معمولی شوق ہوتا ہے، وہ پیہم اتنے سوالات کیا کرتے ہیں ، کہ بعض اوقات ان کے بزرگوں کو سخت تکلیف ہوتی ہے، لیکن بچوں کا زیادہ سے زیادہ سوالات کرنا بہت ہی حوصلہ افزا ہے، جو بچے جتنے زیادہ متجسس اور تلاش و تحقیق کے مشتاق ہونگے اتنا ہی زیادہ سوالات کریں گے، اور اسی سے ان کی اندرونی قوت کا اندازہ ہوتا ہے، تجسس کا شوق ایک غیر معمولی قوت ہے جس سے اگر فائدہ اٹھایا جائے، تو دنیا کی ہر بڑی کامیابی آسانی سے حاصل ہو سکتی ہے، سائنس داں تجسس ہی سے کائنات اور فطرت کے رموز دریافت کرنے میں کامیاب ہوتا ہے، ایک مورخ تجسس ہی سے تحقیق و تدقیق کا بہتر سے بہتر نمونہ پیش کرتا ہے، اہل حرفہ کی ساری کامیابی کا انحصار اسی تجسس پر ہے، غرض تجسس میں کامیابی کا اصلی راز ہے،

۲- لطف اندوزی، زندگی کی جس کامیابی میں لطف حاصل نہ ہو ، وہ بیکار اور فضول ہے، اسلئے کسی کامیابی کے حصول میں وقت کو ضائع نہیں کرنا چاہئے جس میں لطف و مسرت کی توقع نہ ہو، لطف و مسرت کی توقع اندرونی قوت کو عمل میں لانیکی سب سے بڑی محرک ہے، اگر یہ توقع نہ ہو تو عملی قوتیں جبری اور مصنوعی ہو جاتی ہیں،

۳- ولولہ۔ لطف اندوزی کی توقع ہی سے ولولہ پیدا ہوتا ہے، زندگی کی کوئی کامیابی بغیر ولولہ کے حاصل نہیں ہو سکتی، دنیا کے تمام کارنامے ولولے ہی سے انجام پاتے ہیں، دلوں کی شدت اور فراوانی ہی

سے کامیابی قدم لیتی ہی،

۴ ۔ افضلیت کی خواہش، مگر ولولے سے کامیابی اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے، جب وہ اصلی اور عملی ہو، دنیا میں کوئی شخص بغیر ولولے کے کامیاب نہیں ہوسکتا، لیکن یہ بہت ممکن ہی کہ ایک شخص ولولوں کی شدت کے باوجود کامیاب نہ ہو، اسکے لئے سبقت کا جذبہ ضروری ہے، افضلیت کی خواہش اور تفوق برتری کے جذبہ ہی سے ولولوں میں گرمی پیدا ہوتی ہے،

لیکن سبقت لیجانے کی کوشش میں احتیاط ضروری ہی، ہمکو اسی کام میں سبقت لیجانیکی کوشش کرنی چاہئے جس میں ہم کو یہ یقین ہو کہ ہماری صلاحیت کی اعانت ہم کو منزل مقصود تک ضرور پہونچائیگی، اسلئے ہم جس کام میں امتیاز حاصل کرنا چاہتے ہوں، اسکو خوب اچھی طرح سوچ اور سمجھ کر شروع کرنا چاہئے، ورنہ محض خیالات کی دنیا میں رہنے اور خواہشوں کے گہوارہ میں جھولنے سے نہ ولولے میں سرگرمی اور نہ افضلیت کی تکمیل ہوسکتی ہی،

۵ ۔ اعتماد ذات، ہم کو جب تک اپنی ذات پر پورا بھروسہ نہ ہو، ہم کوئی کامیابی حاصل نہیں کرسکتے، زندگی کی رنگینی اور خوشی کا انحصار اعتماد ذات ہی پر ہے، بعض اشخاص ایسے ہیں جنھوں نے اعتماد ذات کے بغیر کامیابی حاصل کی ہے، لیکن ان کی کامیابیوں میں ذہنی انتشار و اختلال کے عناصر زیادہ ہوتے ہیں، اعتماد ذات ذہن و ادراک کی تربیت، عزم و استقلال اور اپنی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ لگانے سے پیدا ہوتا ہے،

۶ ۔ اگر مندرجہ بالا تمام اوصاف موجود ہوں لیکن ہم صبر کے خوگر نہیں ہیں، تو کامیابی کی شاہراہ پر گامزن ہونا مشکل ہے، ہم جب کوئی کام شروع کریں گے، تو بہت ممکن ہی کہ اس میں دقتیں حائل ہوں اسکی تکمیل میں تاخیر ہو، یا آخر میں ناکامی ہو، مگر یہ ساری مشکلات صبر و سکون سے دور ہوسکتی ہیں، اور اگر یہ اوصاف موجود نہیں تو ہماری تمام کوششیں بے مدعا ہو کر رہجائیں گی،

"ص ع"

اخبار علمیہ
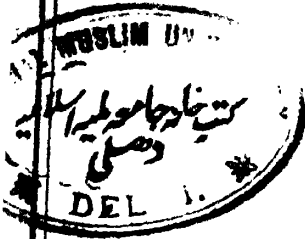
مصر میں آثار قدیمہ

دریائے نیل کے دہانے کے قریب سینل ہاگر (San-el Hagar) میں آج کل کھدائی کا کام جاری ہے، یہاں ایک مقبرہ سے ایک لاش بالکل محفوظ نکلی ہے، یہ لاش سر سے پاؤں تک سونے سے ڈھکی ہوئی ہے، چہرہ پر سونے کی ایک نقاب ہے، جسکی شکل باز کے سر سے ملتی ہے، اسکے ساتھ خستہ حالت میں دو اور ڈھچر نکلے ہیں، ان میں سے ایک کے گلے میں عقیق کا ہار ہے جس سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ دونوں ملازم تھے، لاش چاندی کے کفن میں لپٹی ہوئی ہے، فراعنہ کے مقبروں سے اب تک جتنی لاشیں برآمد ہوئی ہیں ان میں سے کسی کا کفن چاندی کا نہیں تھا، مصر قدیم میں چاندی سفید سونا کہلاتی تھی، جو بہت کمیاب اور سونے سے زیادہ قیمتی ہوتی تھی،

ڈاکوؤں نے مصر کے اکثر مقبروں کو شدید نقصان پہنچایا ہے، لیکن یہ مقبرہ بالکل صحیح و سالم ہے، مقبرہ کی دیواروں پر سوسن نس (Pou-sen-nes) کا نام لکھا ہوا تھا، کھودنے والوں نے سمجھا کہ یہ لاش اس بادشاہ کی ہے جو حضرت سلیمان کے سینکڑوں دامادوں میں سے ایک تھا لیکن اسکے زیورات پر شی شونک لکھا ہوا پایا گیا، اور یہی اصلی نام قرار پایا، اس میں سے کچھ ظروف بھی نکلے ہیں، مصر کے حکمران شاہ فاروق کے سامنے تین ظروف کھولے گئے، ان میں سے ہر ایک میں لاش کی شکل کا ایک کبس نکلا، مقبرہ کے ایک گوشہ میں ایک گھڑا بھی پایا گیا ہے، جو مٹی سے بالکل بند ہے، اسکو ابتک نہیں کھولا گیا ہے، گمان کیا جاتا ہے کہ اس میں اسلحہ ہوں گے،

مصر کے بائیسویں شاہی خاندان (۹۵۰ سنہ قبل مسیح) میں پانچ شی شونگ گذرے ہیں، مذکورۂ بالا لاش اگر شی شونگ اول کی ہے، تو یہ وہی ظالم اور فاتح شی شونگ ہے، جس کا ذکر انجیل میں ان الفاظ میں آیا ہے، کہ شاہ ری ہویوم کی حکومت پانچویں سال میں مصر کے بادشاہ شی شنک نے بیت المقدس پر چڑھائی کی، خدا اور بادشاہ کے گھروں کے خزانے لے گیا، اور وہ سونے کی ڈھالیں بھی جن کو حضرت سلیمان نے بنایا تھا، لے گیا" اگر یہ لاش واقعی اسی شی شنک کی ہے تو یہ اکتشاف تاریخی حیثیت سے بہت اہم ہوگا۔

سمندر میں ریڈیم کی تلاش

آج کل ڈاکٹر چارلس پیگوٹ (کارنیجی انسٹیٹیوشن، امریکہ) سمندر کی تہ سے ریڈیم نکالنے کی فکر میں ہے، ریڈیم سب سے قیمتی دھات ہے، ایک پونڈ کی قیمت ایک کروڑ ڈالر ہے، شروع میں تھوڑا سا ریڈیم کولوراڈو اور یوٹاہ کی کانوں سے نکلا تھا، جو اب تک سرطان کے علاج اور گھڑیوں میں استعمال کیا جاتا ہے، اسکے بعد بلجین کانگو میں کچھ زیادہ مقدار میں دستیاب ہوا، پھر کنیڈا کے شمالی مغربی علاقہ میں اس دھات کی بہتر قسم ملی۔

اب امید کیجاتی ہے کہ چارلس پیگوٹ کی کوشش سے یہ دھات سمندر کی تہ سے بہت زیادہ مقدار میں برآمد ہوگی، پیگوٹ سمندر کے نچلے طبقات کا ماہر ہے، اتفاق سے بحری تار کے ٹکڑوں کے ذریعہ سے اسکو سمندر کی تہ کی کچھ گاد مل گئی، اس نے اس کا کیمیاوی تجزیہ کیا، تو پتہ چلا کہ اس میں زمین کی تمام دھاتوں سے زیادہ شعاع زنی کے اجزا ہیں، پیگوٹ نے زمین کی تہ سے کیچڑ نکالنے کی غرض سے ایک عجیب و غریب آلہ ایجاد کیا ہے، اس نے ایک آبدوز بندوق تیار کی ہے جس میں بہت سی نلکیاں ہیں، بارود بھر کر اسکو سمندر میں ڈالدیا جاتا ہے، نیچے پہونچکر بارود مشتعل ہوجاتا ہے، نلکیاں پھٹ جاتی ہیں اور سمندر کی تہ کی کیچڑ نلکی میں بھر جاتی ہے، اب تک یہ نلکیاں سمندر کے اندر تین میل تک جا سکی ہیں، لیکن پیگوٹ سات میل اندر کی کیچڑ نکالنا چاہتا ہے، اسکے لئے اس نے لوہے کی ایک سکری بنائی ہے جو نیچے ۳ انچ اوپر ۱/۲ ۲ انچ موٹی ہے، اس کا وزن پانچ ٹن ہے، یہ ایک پہیہ دار مشین میں لپٹی ہوئی ہے، جو

ایک سو گھوڑوں کی طاقت سے کے انجن سے چلتی ہے اب اسی کے ذریعہ سے بیگوٹ اپنی ملکیوں کو اتمار دیگا بیگوٹ کی رائے ہے کہ نہ صرف ریڈیم بلکہ لوہا، تانبا، اور ٹین وغیرہ دوسری دھاتیں بھی سمندر کی تہ سے برآمد ہونگی اگر بیگوٹ کو اس میں واقعی کامیابی ہوگئی، تو دنیا میں بہت سی بیش قیمتی دھاتوں کا بڑا اضافہ ہو جائے گا، اور ایسے زمانہ میں یہ اضافہ بہت مفید ہوگا، جبکہ ماہرین ارضیات کا خیال ہے کہ مستقبل قریب میں بہت سی دھاتیں بہت جلد ختم ہو جائیں گی، کیونکہ یورپ میں ۱۸۵۰ء اور امریکہ میں ۱۹۱۰ء کے بعد سے تیل کے سوا کسی اور دھات کی کوئی کان معلوم نہیں ہو سکی ہے، مثلاً امریکہ میں ۱۲ ارب ٹین کے پیپے استعمال ہوتے ہیں، اگر اسکی مزید کانیں دریافت نہ ہوئیں، تو ٹین کی کمی بہت جلد محسوس ہونے لگے گی، اگر بیگوٹ کی کوشش سے مختلف قسم کی دھاتیں سمندر سے برآمد ہوگئیں، تو پھر آئندہ کی ایک بڑی مشکل حل ہو جائیگی، اس سے بین الاقوامی سیاست کی بھی صورت بدل جائیگی، بڑے بڑے سمندروں پر قبضہ حاصل کرنے کیلئے معلوم نہیں کتنی خونریزیاں ہونگی،

جانور اور آکسیجن

ڈنمارک کا مشہور سائنس دان اوگست اسٹین برگ کرگ آجکل ممالک متحدہ میں "جانور اور آکسیجن" پر مختلف یونیورسٹیوں میں لکچر دے رہا ہے کرگ کو ۱۹۲۰ء میں نوبل پرائز مل چکا ہے، اسکی تحقیق تھی کہ پٹھے کے عروق شعریہ ایک ساتھ مل کر کام کرتے ہیں، اور جب پٹھے ساکت رہتے ہیں، تو ان میں سے اکثر عروق شعریہ بند ہو جاتے ہیں ۱۹۱۶ء میں اسکی ایک اہم کتاب تنفس پر شائع ہوئی جسمیں یہ دکھایا ہے کہ پھیپھڑوں میں سانس کے بجائے گیس بھی پہونچائی جا سکتی ہے،

اس سفر میں کرگ امریکہ کے لوگوں کے سامنے یہ تحقیق پیش کر رہا ہے کہ آکسیجن کی کمی اور زیادتی سے جانوروں پر کیا اثر پڑتا ہے، اسکا مشاہدہ ہے کہ جس پانی میں آکسیجن کی کمی رہتی ہے اس کے مینڈک خلاف معمول بہت بڑے ہوتے ہیں، اور جسمیں زیادتی ہوتی ہے اسکے مینڈک بہت چھوٹے ہوتے ہیں جنوبی امریکہ کی

سنش دار مچھلیاں جب انڈے سینے کیلئے پانی کے نیچے چلی جاتی ہیں، تو آکسیجن کی کمی کے سبب سے انکے گچھے بہت بڑھ جاتے ہیں، وہیل مچھلی جب غوطہ لگاتی ہے تو آکسیجن صرف ان کے دماغ تک پہنچا ہے جس سے انکے دل کی حرکت کم ہو کر ہر منٹ میں ۶۰ کے بجائے ۴ یا پانچ ہو جاتی ہے،

گرگ نے یہ بھی معلوم کیا ہے کہ جانور کو آکسیجن کی کتنی ضرورت ہوتی ہے، سیب کے ایک کیڑے (Meal) کو ایک منٹ میں ۲۲ کیوبک سینٹی میٹر اور شہد کی مکھیوں کو سترہ ہزار کیوبک سینٹی میٹر آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے، انسان ۲۰۰ سے ۳۰۰۰ سینٹی میٹر تک آکسیجن استعمال کرتا ہے،

خوردن برائے زیستن

گذشتہ گرمیوں میں سیلاب کی وجہ سے ہزاروں چینی بھوک سے مرگئے، اسپین کی جنگ میں میڈرڈ کے محاصرہ کے موقع پر ہر ہفتہ ۱۰۰۰ آدمی فاقہ سے مرتے تھے، ان واقعات سے متاثر ہو کر مجلس اقوام نے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا تھا، اس نے یہ معلوم کیا ہے کہ ایک آدمی کی زندگی بچانے کیلئے کم سے کم کیا اور کتنی غذا ہو سکتی ہے، اس کی رائے میں بالغ آدمیوں کیلئے ۱۸ اونس گیہوں کا آٹا ہونا چاہئے تاکہ جسم میں کاربوہائڈریٹ پہنچا رہے، ۲ اونس نمک چاہئے تاکہ جسم میں پانی کا توازن قائم رہے، حیاتین ب کے لئے ½ اونس شراب کا خمیر، حیاتین الف کیلئے ½ اونس مچھلی کا تیل، اور حیاتین ج کے لئے ہفتہ میں دو لیموں چاہئیں، اگر دو اونس خشک بالائی کا سفوف مل جائے تو شراب کے خمیر کا بدل ہو سکتا ہے، بچوں کو مچھلی کا تیل اور بالائی کا سفوف نسبۃً زیادہ چاہئے، ان کو نمک کم دیا جائے، تو کوئی حرج نہیں، اگر لیموں اور نارنگیاں نہ میسر ہوں تو درخت کی سبز پتیاں پانی میں جوش دیکر چاے کی طرح استعمال کیجا سکتی ہیں،

یہ تمام چیزیں پیٹ بھرنے اور ذائقہ کیلئے تو نہیں ہیں، لیکن ان سے زندگی محفوظ رہ سکتی ہے اور فاقہ زدگی کے بہت سے امراض مثلاً خون کی کمی، خون کا فساد، جلد کی خرابی، اور سوکھے کی بیماری وغیرہ کو روکا جا سکتا ہے،

ص، ع

حکمت سلیمانی

از مولینا کیفی چریاکوٹی

"ذیل کی نظم میرے فاضل دوست استاد بھائی اور استادزادہ کی ہے، وہ استاذی مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی کے صاحبزادہ اور میرے بچپن کے دوست اور ہم سبق ہیں انھوں نے بے وجہ میری "مدح" کا یہ ننگ گوارا کیا ہے، اور اس پر ان کا اصرار ہے کہ یہ معارف میں شائع کی جائے، میں اپنی بے بضاعتی کے اعتراف کے ساتھ اپنے مفروضہ محاسن کے اعلان کیلئے نہیں، بلکہ شاعر کی شاعرانہ قوتِ بیان کے اظہار کے لئے اس کی اشاعت کو جائز رکھ رہا ہوں، اللّٰھم اغفر لی،

"س"

مشرق کی تابش خورشید تابان	مغرب کا شہرہ ماہ درخشان
ہندوستان میں ندوے[۱] کا حاصل	ندوۂ علما، نازِ مسلمان
پٹنہ کا گلبن، دسنہ[۲] کا گلشن	یعنی بہاری، موج بہاران

[۱] دارالعلوم ندوۃ العلماء، "م"

[۲] ممدوح کا وطن، "م"

نورِ چراغِ فاروقؒ[1] یکتا | شاگردِ شبلیؒ استادِ دوراں

شمعِ وطن میں تنویرِ اعظم[2] | صوبے کا مرکز، بھارت کا یونان[3]

تحریر میں ہے ثانیِ شبلیؒ | تقریر رازِ جادو بیانان

تاریخ دانی حجت کی حد میں | علمِ ادب میں کامل زباندان

حکمت کے فن میں حکمِ خرد ہے | منطق میں فاضل تا حدّ امکان

...ل آیات اقوالِ برحق | اسکی زبان پر تفسیرِ قرآن

تحدیثِ سنت، شکلِ محدث | تجدیدِ مسلک، تقلیدِ نعمانؒ[4]

جزئی مسائل میں شانِ تفقہ | شانِ تفقہ میں تکمیلِ ایمان

فکرِ کمالِ علمِ سیاست | علمی مجالس، اس پر ہیں نازاں

اردو ادب میں اردو زباں میں | ہر قول فیصل، ہر قول برہان

بزمِ سخن میں مسند نشیں ہے | صدر نشیں کل نکتہ دانان

نقد و نظر میں اسلوبِ محکم | رائے سدید و امرا میران

حکمِ شریعت میں احتسابی | رنگِ طریقت ساقیِ عرفان

ذوقِ معارفؒ[5] حسنِ معارف | شانِ ادارت تسخیرِ دوران

طرزِ سخن میں بے مثل شاعر | نثر نگاری، سحر نمایان

تصنیف دیکھو، بہتر سے بہتر | "سیرت نبیؐ" کی اور "ارضِ قرآں"[6]

---

[1] مولینا فاروق چریاکوٹی مرحوم ممدوح کے استاذ اور استاذ الاستاذ، "م" [2] اعظم گڈھ کی طرف اشارہ ہے [3] قصبہ چریاکوٹ کسی زمانہ میں اپنے علمار کی وجہ سے یونانِ ہند کہلاتا تھا، "م" [4] حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ "م" [5] رسالہ معارف "م" [6] ممدوح کی مشہور تصنیف ارض القرآن، "م"

چین جبیں میں، برقِ متانت | خوش ذوقیاں بھی ہیں دل میں پنہاں
سید گھرانا، مشہور عالم، | صورت بھی بالکل سیرت کی شایاں
اغیار ہوں تو تصویرِ غنچہ | احباب ہوں تو گلزارِ خنداں
کل وضعداری، کل پاسداری | اخلاق جادو، تسخیر، احسان
خودداریوں میں دلداریاں ہیں | پھر خاکساری، لطفِ نمایاں
کارے بجائے یارے بجائے | دستِ بزرگاں، بر فرقِ خرداں
ہر گام راہے، ہر راہ گامے | تائید یزداں، تائید یزداں
بر جائے شبلی آن خوش نشینے | محسودِ اعدا، محبوبِ یاراں
آن رہ نوردِ اقصائے عالم | از شہر لندن تا ملک افغاں[1]
حبرٌ جوادٌ، اخٌ کریمٌ | فضلٌ لعصرٍ عونٌ لاخوان
الحمد للہ! الحمد للہ | کیفی کے بھائی سید سلیمان

یا ذا الجلال یا ذا الکمال

احفظہ دوماً من کل خسران

---

[1] ممدوح کے سفر یورپ اور افغانستان کی طرف اشارہ ہے ۱۹۱۹ء میں وفد خلافت کے سلسلہ میں لندن کا سفر کیا، اور ۱۹۳۳ء میں نادر شاہ مرحوم کی دعوت پر وہاں کے نصاب تعلیم میں صلاح و مشورہ کے لئے افغانستان کا سفر کیا، "م"

مطبوعات جدیدہ

تراجم علماے حدیث ہند، مولفہ مولوی ابویحییٰ امام خان صاحب نوشہروی تقطیع چھوٹی، ضخامت ۵۰۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ/ پتہ :- عبدالحئی والاخوان مقام سوہدرہ گوجرانوالہ پنجاب،

مولوی امام خان صاحب جماعت اہلحدیث کی مفید علمی خدمات انجام دیتے رہتے ہیں اب سے چند سال پہلے وہ ہندوستان کے اہلحدیث کی علمی خدمات پر ایک کتاب لکھ کر شائع کر چکے ہیں، اب اونھون نے اہلحدیث علمار کے حالات میں یہ مفید کتاب تالیف کی ہے، لیکن جیسا کہ استاذ معظم مولینا سید سلیمان ندوی نے اس کتاب کے دیباچہ میں تحریر فرمایا ہے کہ " ان (مولف) کے موضوع کا دائرہ جتنا تنگ ہے، ان کے عمل کا دائرہ اتنا تنگ نہیں ہے" یعنی اس میں تنہا جماعت اہلحدیث کے علمار کے حالات نہیں ہیں، بلکہ مقلد علمار کے علاوہ ان عامل بالحدیث اور متبع سنت علمار کو بھی شامل کر لیا گیا ہے، جو موجودہ اصطلاحی معنوں میں جماعت اہل حدیث کے زمرہ میں نہیں آتے، عرصہ ہوا، حضرۃ الاستاذ نے ہندوستان میں علم حدیث کے عنوان سے معارف میں ایک مسلسل مضمون لکھا تھا، جو ناتمام رہ گیا تھا، مذکورۂ بالا کتاب ایک پہلو سے اس کا تکملہ ہے، اگر اس میں متعدد اساطین حدیث کو بھی شامل کر لیا جاتا تو پورا تکملہ ہو جاتا، بہرحال اس کتاب میں علحدہ علحدہ دہلی اور صوبہ متحدہ کے تمام بڑے بڑے شہروں اور مقامات کے قدیم اور موجودہ علماے حدیث اور مشہور محدث خانوادوں کے حالات ہیں، اس کا آغاز ہندوستان کے سرچشمۂ حدیث

دوران ولی اللٰہی سے کیا گیا ہو، اور اس سلسلہ کے کسی قدر تفصیلی حالات ہیں، اس کے بعد دوسرے خانوادوں اور علماء کا تذکرہ ہے، ہر ترجمہ میں صاحب ترجمہ کے مختصر سوانح اور تعلیم و تدریس شیوخ تلامذہ علمی و دینی خدمات اور تصانیف کا اجمالی ذکر ہے، مصنف نے بڑی محنت اور

کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ۶ ر، پتہ:- ادارہ ادبیات اردو خیریت آباد حیدر آباد دکن،

ہماری معاشرتی خرابیوں میں عورتوں اور مردوں کے بیجا اسراف، لغو رسم ورواج، بیجا نمود و نمایش، ظاہری شان و شوکت، تن آسانی اور جدید تمدن کی غلط نقالی نے متوسط الحال سپید پوش گھرانوں کے امن و سکون کا خاتمہ کر دیا ہے، اس کی اصلاح کا دار و مدار بڑی حد تک ہماری خواتین کے سدھار، ان کی صحیح و صالح تعلیم و تربیت، پاکیزہ خیالی اور ان کی سادگی و جفاکشی پر ہے، محترمہ لطیف النسأ صاحبہ جدید تعلیم کے باوجود ان اوصاف سے آراستہ اور صحیح نسوانی تعلیم کا اچھا نمونہ ہیں، انھوں نے مذکورۂ بالا کتاب میں ان تمام معاشرتی خرابیوں اور اسکے اسباب کو دکھا کر ان کی اصلاح کے طریقے بتائے ہیں، اگر ہماری عورتوں میں اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ایسی صحیح روشنی اور پاکیزہ خیالات پیدا ہو جائیں، تو ہماری زندگی منور جائے، یہ کتاب اس قابل ہو کہ اسے لڑکیوں کے نصاب میں داخل کیا جائے،

اندھی دنیا، مصنفہ جناب اختر انصاری صاحب بی اے، تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۵۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱ر ۸ر مجلد، پتہ:- مکتبہ جہاں نما اردو، بازار جامع مسجد دہلی،

اختر انصاری صاحب ہونہار نوجوان ادیبوں میں ہیں، نظم و نثر دونوں میں ان کا مذاق ستھرا ہے، اندھی دنیا ان کے چوبیس افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں اکثر یا شاید کل رسالوں میں شائع ہو چکے

کے حالات حکومت کے نظام پر تنقید حج کے کوائف اور اس قسم کی دوسری باتیں بھی ہیں
اس سفرنامہ میں ہیں آخر میں مناسک حج، اس سے متعلق مسائل، دعائیں، اور مدینہ طیبہ کے آثار کا ذکر
اور حجاج کی سہولت کے لئے مفید ہدایات ہیں، اور اخراجات سفر کی تفصیل بھی دیدی ہے،

— ض —

تراجم علماے حدیث ہند، مولفہ مولوی ابویحیٰ امام خان صاحب نوشہروی تقطیع چھوٹی،
ضخامت ۵۰۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ، پتہ:- عبدالحیٰ والاخوان مقام
سوہدرہ گوجرانوالہ پنجاب،

مولوی امام خان صاحب جماعت اہلحدیث کی مفید علمی خدمات انجام دیتے رہتے ہیں اب
سے چند سال پہلے وہ ہندوستان کے اہلحدیث کی علمی خدمات پر ایک کتاب لکھ کر شائع کر چکے
ہیں، اب اونھوں نے اہلحدیث علمار کے حالات میں یہ مفید کتاب تالیف کی ہے، لیکن جیسا کہ
استاذ معظم مولینا سید سلیمان ندوی نے اس کتاب کے دیباچہ میں تحریر فرمایا ہے کہ " ان
(مولف) کے موضوع کا دائرہ جتنا تنگ ہے، ان کے عمل کا دائرہ اتنا تنگ نہیں رہا ہے"، یعنی اس میں تنہا جماعت
اہلحدیث کے علمار کے حالات نہیں ہیں، بلکہ مقلد علمار کے علاوہ ان عامل بالحدیث اور متبع سنت
علمار کو بھی شامل کر لیا گیا ہے، جو موجودہ اصطلاحی معنوں میں جماعت اہل حدیث کے زمرہ
میں نہیں آتے، عرصہ ہوا، حضرۃ الاستاذ نے ہندوستان میں علم حدیث کے عنوان
سے معارف میں ایک مسلسل مضمون لکھا تھا، جو ناتمام رہ گیا تھا، مذکورۂ بالا کتاب ایک پہلو سے اس کا
تکملہ ہے، اگر اس میں مقلد اساطین حدیث کو بھی شامل کر لیا جاتا تو پورا تکملہ ہو جاتا، بہرحال اس
کتاب میں علحدہ علحدہ دہلی اور صوبہ متحدہ کے تمام بڑے بڑے شہروں اور مقامات کے قدیم اور موجودہ
علماے حدیث اور مشہور محدث خانوادوں کے حالات ہیں، اس کا آغاز ہندوستان کے سرچشمۂ حدیث

المصنفہ جدید کا نیا کتب خانہ

من کی بٹیا، مؤلفہ لطیف النسا بیگم صاحبہ بی اے، تقطیع چھوٹی ضخامت ... صفحے

کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد ۲ روپیہ: ادارہ ادبیات اردو خیریت آباد

حیدرآباد دکن،

ہماری معاشرتی خرابیوں میں عورتوں اور مردوں کے بیجا اسراف، لغو رسم ورواج،

بیجا نمود و نمایش، ظاہری شان وشوکت، تن آسانی اور جدید تمدن کی غلط نقالی نے متوسط الحال

سفید پوش گھرانوں کے امن وسکون کا خاتمہ کر دیا ہے، اس کی اصلاح کا دار و مدار بڑی حد تک

ہماری خواتین کے سدھار، ان کی صحیح وصالح تعلیم وتربیت، پاکیزہ خیالی اور ان کی سادگی وجفاکشی

پر ہے، محترمہ لطیف النسا صاحبہ جدید تعلیم کے باوجود ان اوصاف سے آراستہ اور صحیح نسوانی تعلیم

کا اچھا نمونہ ہیں، انھوں نے مذکورۂ بالا کتاب میں ان تمام معاشرتی خرابیوں اور اسکے اسباب کو

دکھا کر ان کی اصلاح کے طریقے بتائے ہیں، اگر ہماری عورتوں میں اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ایسی صحیح

روشنی اور پاکیزہ خیالات پیدا ہو جائیں، تو ہماری زندگی سنور جائے، یہ کتاب اس قابل ہے کہ اسے

لڑکیوں کے نصاب میں داخل کیا جائے،

اندھی دنیا، مصنفہ جناب اختر انصاری صاحب بی اے، تقطیع چھوٹی ضخامت

۱۵۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت: عہ، مجلد، پتہ: مکتبہ جہاں نما اردو،

بازار جامع مسجد دہلی،

اختر انصاری صاحب ہونہار نوجوان ادیبوں میں ہیں، نظم ونثر دونوں میں ان کا مذاق ستھرا

ہے، اندھی دنیا ان کے چوبیس افسانوں کا مجموعہ ہے، جن میں اکثر یا شاید کل رسالوں میں شائع ہو چکے

کے حالات، حکومت کے نظام پر تنقید، حج کے کوائف اور اس قسم کی دوسری باتیں بھی ہیں، اس سفرنامہ میں ہیں، آخر میں مناسک حج، اس سے متعلق مسائل، دعائیں، اور مدینہ طیبہ کے آثار کا ذکر

کے قابلِ اصلاح پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں، یہ سب افسانے اسی رنگ کے ہیں، لیکن اس خشک مقصد کے باوجود ان کے لطف و دلچسپی میں کوئی کمی نہیں، زبان نہایت ستھری ہے، ان کی ایک قابلِ ذکر خوبی یہ ہے کہ آج کل کے بعض گم کردہ راہ انقلابی نوجوانون کی طرح ان افسانون میں محض بے معنی انقلاب کی دعوت اور اپنی تہذیب و معاشرت، اپنے نظام اور اپنی چیزوں سے بیزاری نہیں ہے، بلکہ صرف قابلِ اصلاح پہلوؤں کو متانت و تہذیب سے پیش کیا گیا ہے،

خیابانِ نسوان مولفہ جناب نصیرالدین صاحب ہاشمی، حیدرآبادی، تقطیع اوسط، ضخامت ۱۱۸ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۱۲۰، پتہ دفتر عصمت بک ڈپو دہلی،

یہ کتاب مولف کے ان اٹھارہ متفرق مضامین کا مجموعہ ہے، جو اونھوں نے مختلف نسوانی موضوعون پر مختلف رسائل میں لکھے تھے، ان میں تاریخی، تعلیمی، اخلاقی اصلاحی اور مختلف قسم کے مضامین و مفید معلومات ہیں، لیکن ان سب کا تعلق نسوانی مسائل سے ہے، عورتوں کے لئے ان مین بہت سے مفید معلومات ہیں،

تذکرۂ حالی، جناب ابواللیث صاحب صدیقی ایم اے، تقطیع بڑی ضخامت ۴۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مرقوم نہیں، غالباً مولف سے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے پتہ پر ملیگی،

ابواللیث صاحب ایم اے بدایونی نے مولنا حالی پر غالباً یہ مقالہ لکھا تھا جسے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے، اس میں مولنا کے مختصر سوانح حیات ہیں، اور ان کی نظم و نثر اور تصانیف کا خوش مذاقی کیساتھ جامع اور مختصر تبصرہ کیا گیا ہے،

"م"

دار المصنفین کی نئی کتابیں

تابعینؒ

علم و عمل اور مذہب و اخلاق میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ
تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے اور صحابۂ کرام کے بعد ان ہی کی زندگی مسلمانوں کے لئے نمونۂ عمل ہے
اس لئے سیر الصحابہ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب
کیا ہے، اس میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ، حضرت حسن بصریؒ، حضرت اویس قرنیؒ، حضرت امام زین العابدینؒ
حضرت امام باقرؒ، حضرت امام جعفر صادقؒ، حضرت محمد بن حنفیہؒ، حضرت سعید بن مسیبؒ، حضرت
سعید بن جبیرؒ، حضرت محمد بن سیرینؒ، حضرت ابن شہاب زہریؒ، امام ربیعۃ الرائیؒ، امام مکحول شامیؒ
قاضی شریحؒ وغیرہ جیسا نوے اکابر تابعینؒ کے سوانح ان کے علمی، مذہبی، اخلاقی اور عملی مجاہدات اور
کارناموں کی تفصیل ہے، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی، ضخامت ۵۶۰ صفحے قیمت: للعہ

مختصر تاریخ ہند

ہمارے اسکولوں میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں ان کا لب و لہجہ دلآزاری اور تعصب سے
خالی نہیں ہوتا، اور اس وجہ سے ہندوستان کی مختلف قوموں میں تعصب و بغض و عناد پیدا ہو جاتا
ہے، مولانا ابو ظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسوں اور طالب علموں کیلئے اس غرض سے لکھی ہے
کہ اس کا طرز بیان قومی جذبات سے متاثر نہ ہو اور ہندو و مسلمان فرمانرواؤں نے ہندوستان کے
بنانے میں جو کام کئے ہیں وہ طالب علموں کو بلا تفریق مذہب و ملت معلوم ہو جائیں، ضخامت ۔۔ صفحے قیمت ۔۔

سیرۃ النبی

رسول اللہ صلعم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جس کا نام **سیرۃ النبی** عام طور سے مشہور ہے، مسلمانوں کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت و اہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے،

ابتک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہیں، پہلے میں ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں، اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جسمیں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے، دوسرے حصہ میں تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے، تیسرے حصہ میں آپکے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہے، اسمیں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کیگئی ہیں، پھر ان معجزات کی تفصیل ہے جو بروایات صحیحہ ثابت ہیں، اسکے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کیگئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپکے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ اس میں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں، پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادات کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح و حکم کا بیان ہے اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے، چھٹے حصہ میں حقوق، فضائل اور آداب کے عنوان اور اسکی ذیلی سرخیوں کے تحت اخلاقی تعلیمات کی تفصیل ہے، حجم [illegible] صفحے قیمت قسم اول [illegible] قسم دوم [illegible]

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول تقطیع خورد [illegible]، حصہ دوم تقطیع کلاں [illegible] تقطیع خورد [illegible]
حصہ سوم تقطیع کلاں [illegible] تقطیع خورد [illegible] حصہ چہارم تقطیع کلاں [illegible] تقطیع خورد [illegible]
حصہ پنجم تقطیع کلاں [illegible]

(منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ)

جلد ۴۳ | ماہ ربیع الاول ۱۳۵۸ھ مطابق ماہ جون ۱۹۳۹ء | عدد ۶

مضامین

چار سلیمانوں کی رباعی قاضی محمد سلیمان صاحب مصنف رحمۃ للعالمین کی وفات سے مثلث ہوگئی تھی، شاہ سلیمان صاحب پھلواروی کی رحلت سے وہ فرد بنگئی تھی، اب اخیر اپریل ۱۹۳۹ء میں مولانا سلیمان اشرف صاحب (استاذ دینیات مسلم یونیورسٹی) کی موت سے مصرع ہوکر رہ گئی، دیکھنا یہ ہے کہ یہ مصرع بھی دنیا کی زبان پر کبتک رہتا ہے،

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہین

مولنا سید محمد سلیمان اشرف صاحب مرحوم بہار کے ایک مردم خیز دیہات کے رہنے والے اور شرفاے سادات کے خاندان سے تھے، ان کے والد مرحوم حکیم عبداللہ صاحب، اور ان کے اعمام محترم مولانا عبدالقادر صاحب، مولوی عبدالرزاق صاحب، مولوی عبدالغنی صاحب و مولنا عبیداللہ صاحب اہل علم و فقر تھے، مولانا مرحوم نے درس کا بڑا حصہ مولانا محمد احسن صاحب استھانوی بہاری سے حاصل کیا تھا اور کچھ دن دارالعلوم ندوہ مین بسر کئے تھے، اور آخر مین منطق و فلسفہ کی آخری کتابین مولانا ہدایت اللہ خانصاحب رامپوری ثم الجونپوری سے پڑھی تھین، جو پورب مین خیرآبادی سلسلہ کے خاتم تھے، مولنا سید سلیمان اشرف صاحب مرحوم کو حقیقت یہ ہے کہ اپنے استاد کے ساتھ عقیدت ہی نہیں، بلکہ عشق تھا، ان کے حالات وہ جب کبھی سناتے تھے، تو ان کے طرز ادا اور زبان گفتار کی ہر ادا سے ان کی والہانہ عقیدت تراوش کرتی تھی،

مرحوم خوش اندام، خوش لباس، خوش طبع، نظافت پسند سادہ مزاج اور بے تکلف تھے، ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی خودداری اور اپنی عزتِ نفس کا احساس تھا، ان کی ساری عمر علیگڈہ میں گذری جہاں امرا اور اربابِ جاہ کا تانتا لگا رہتا تھا، مگر انھوں نے کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی، اور نہ ان میں سے کسی سے دب کر یا جھک کر ملے، جس سے ملے برابری سے ملے، اور اپنے عالمانہ وقار کو پوری طرح ملحوظ رکھکر، علی گڈہ کے سیاسی انقلابات کی آندھیاں بھی ان کو اپنی جگہ سے ہلا نہ سکین، علی گڈہ کے عشرت خانہ مین ان کی قیامگاہ ایک درویش کی خانقاہ تھی، یہاں جو آتا جھک کر آتا، اگر مجلس سازگار ہوئی تو دعائین لے کر گیا، ورنہ اُلٹے پاؤن ایسا واپس آیا کہ پھر ادھر کا رخ نہ کیا،

وہ نہایت فیاض، کشادہ دست اور سیر چشم تھے، دو تین سال کے علاوہ انکی ساری عمر تجرد کی حالت میں گذری، کوئی اولاد نہ تھی، خاندان کے عزیزون سے طبیعت کو چنداں مناسبت نہ تھی، کچھ جو تھا احباب کے نذر تھا، استادزادون اور دوستون اور دوستوں کی اولادون کے ساتھ وہ کچھ کیا جسکو اس زمانہ مین مشکل سے کوئی دوسرا کر سکتا ہے، انتہا یہ ہے کہ مرتے دم جو کچھ چھوڑا وہ بھی نذر احباب ہوا،

ان کی مجلس سدا بہار تھی، وہ خود سدا بہار تھے، فکر و غم کا ان کے ہان گذر نہ تھا، اپنی ضعیف والدہ کی اطاعت اور اپنے ایک دیوانہ بھائی کی رفاقت اور خدمت میں عمر اس طرح گذاری کہ اسکی نظیر مشکل ہے، انکی مجلس میں پچھلے علمار کے حالات اور ان کی خوبیوں کے تذکرے اکثر رہا کرتے، کبھی کبھی کسی علمی مسئلہ پر اظہار خیال ہوتا، ان کی تقریر و وعظ میں بڑی دلچسپی اور گرویدگی تھی، ادھر برسوں سے تقریر چھوڑ دی تھی، ایک دو جگہیں مخصوص تھیں جہاں وہ سال میں ایک دفعہ میلاد پڑھا کرتے تھے، ان کے مذہبی خیالات علمائے بریلی کے مطابق تھے اور ان کے بڑے مداح تھے، پھر بھی ان کی ملاقات اور میل جول ہر خیال کے لوگوں سے تھا، وہ کسی سے مناظرہ نہیں کرتے تھے اور جب کرتے تھے

تو گنتہ جاتے تھے، طبیعت مین ظرافت اور لطافت تھی، غصہ بھی جلد آجاتا تھا، اپنے مزاج کے خلاف ایک حرف سن نہین سکتے تھے،

تحریر و تالیف کا بھی ذوق تھا، خسرو کی ایک مثنوی پر مقدمہ لکھا ہے، حج کے مسائل اور عربی کے فضائل پر دو رسالے لکھے ہیں، ایک کتاب بہین نام عربی فیلالوجی پر لکھی تھی، جس پر ہندوستانی اکاڈیمی نے پانچ سو کا انعام دیا تھا، اور بھی متفرق مضامین لکھے تھے، یونیورسٹی مین علوم اسلامیہ کے درس کے علاوہ عصر کے بعد قرآن پاک کی تفسیر پڑھایا کرتے تھے، خاص خاص شوقین طالب علم اس میں شریک ہوتے،

ان کی وفات سے دو تین ہفتے پہلے ان سے علی گڈہ میں ملاقات ہوئی تھی، کمزور و نحیف تھے، مسلسل بخار نے ان کو نیم جان کر دیا تھا، پھر بھی حسب دستور بعد عصر اپنی قیامگاہ کے برآمدہ میں مونڈھے پر بیٹھے تھے، احباب آس پاس حلقہ باندھے تھے اور وہ مصروف خوش کلامی تھے، میں نے عمر پوچھی تو ٹال گئے، مین نے اپنی عمر کے اندازہ سے ان کا اندازہ لگا کر عرض کیا کہ عجب نہین کہ آپ کی پیدایش ۱۸۸۰ء کی ہو، ہنسکر بولے، مجھے تو اپنی عمر آپ معلوم نہین، اور آپکو معلوم ہے، یہانتک کہ سنہ بھی بتا دیا، اس انکار پر بھی میرا قیاس یہی ہے کہ ان کی پیدایش کا سال قریب قریب یہی ہوگا، اور اس وقت ان کی عمر ساٹھ پینسٹھ کے بیچ مین ہوگی، دیکھنے مین تنومند اور صحیح معلوم ہوتے تھے، مگر اندر سے کھوکھلے ہو چکے تھے، اخیر ملاقاتون مین اپنے وطن کے بعض دوستون کی بے وقت موت اور عزیزون کی محبت کی محرومی سے بے حد متاثر تھے، رحمۃ اللہ علیہ،

مقالات

تہنید

"تہنید" کے اگر ہم ٹھیٹ معنی کریں تو "ہندیانا" کہہ سکتے ہیں، یہ اصطلاح اصل میں عربوں سے ہے، وہ جب کسی دوسری زبان کے لفظ کو اپنی زبان کے اصول پر خراد کر اس کو عربی بنا ڈالتے تھے، تو اپنے اس عمل کو "تعریب" کہتے تھے، یہی قاعدہ فارسیوں نے اپنی زبان میں جاری کیا تو اسکو تفریس کہا یعنی فارسی بنا لینا، اب جب اہل ہند یہی کریں یعنی وہ کسی دوسری زبان کے لفظ کو اپنی زبان کے اصول پر تراش خراش کرکے اپنی زبان میں ملالیں، تو اسکو "تہنید" کہیں گے،

یہ اصول زبانون کے بڑھنے اور پھیلنے کے لئے بہت ہی مفید ہے، یہ اصول قریب قریب دنیا کی سبھی زبانوں میں چلتا ہے، اور اسکے مانے بغیر ممکن ہی نہیں، کہ زبان ترقی پاسکے،

بات یہ ہے کہ زبان کوئی جامد چیز نہیں، وہ ہمیشہ بڑھتی پھیلتی، اور ادلتی بدلتی رہتی ہے، جو زبان بڑھنا چاہے گی، اسکو دنیا کی دوسری زبانوں سے سروکار رکھنا پڑے گا، اور قوموں کے میل جول کیساتھ ان کی بولیون اور لفظون کی آمد و رفت بھی لگی رہے گی، اس کا اثر یہ ہوگا، کہ اس میں دوسری زبانوں کے لفظ ملتے رہیں گے، اور بدلتے رہیں گے،

ہر زبان کے لفظوں میں حرفون کی خاص ترتیب اور اس ترتیب سے خاص شکل پیدا ہوتی ہے جس طرح انسان انسان سب برابر ہیں، پھر بھی فرنگی، حبشی، ہندی، چینی، ترکی سب کی شکلیں

ایک نہیں ہوتیں، ہر ایک کا رنگ روپ اور ناک نقشہ ایک نہیں ہوتا، یہی مختلف بولیوں اور ان کے لفظوں کا حال ہے، اسی لئے ایک قوم کا آدمی جب کسی دوسری قوم کی بولی کا کوئی لفظ لیتا ہے، تو اس کی زبان کی فطرت مجبور کرتی ہے، کہ ارادہ اور احساس کے بغیر اس کی شکل بدل دے، ہندوستان کے باہر کا آدمی خواہ کچھ ہی کرے، مگر وہ ہمارے ہندی حرفوں کو کبھی نہ بول سکے گا، وہ اسکو کچھ نہ کچھ بدل دے گا، اور نہ ہمارے لہجہ سے ہمارے لفظوں کو نکالے گا، وہ اس میں بھی کچھ ہیر پھیر کریگا،

یہی حال ہندیوں کا بھی ہے، عربی کے خاص حرف وہ ادا نہیں کر سکتے، ع، ء، اور الف میں اور ث، ص، اور س میں اور ت اور ط میں وہ فرق نہیں کر سکتے، اسلئے دوسری زبان کا جو لفظ ہمارے یہاں آئے گا، وہ جب تک اپنی بیگانگی چھوڑ کر بالکل گھریلو نہ بنجائے گا، وہ ہمارے دیس میں رہ نہیں سکتا، یہی وجہ ہے، کہ عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی وغیرہ کے جو ہزاروں لفظ ہماری زبان میں آگئے ہیں، وہ ہماری زبان کے قاعدوں پر چڑھ کر ہماری زبان کی شکل و صورت اختیار کرنے پر مجبور ہیں،

معمار کے معنوں میں راج کی اصل عربی اور فارسی میں راز ہے، مگر ہمارا ہندوستانی لفظ راج ہی ہوگا، عربی کا صحیح لفظ تمنّی ہے، مگر فارس والوں نے اس کو لیا تو تمنا کر دیا، اور ہم نے بھی اسی کو قبول کیا، عربی تماشی کو ایرانیوں نے تماشا کیا، اور ہم کو بھی یہی تماشا پسند آیا، لالٹین کی اصل لینٹرن ہے، مگر ہم کو لالٹین ہی کی روشنی پسند ہے ٹین انگریزی ہو تو ہو، مگر ہمارا لفظ تو تام ہے، جو ٹِن کی بگڑی ہوئی شکل ہے،

لفظ تبادلہ عربی کے لحاظ سے غلط ہی کیوں نہ ہو، لیکن ہماری زبان میں یہ صحیح ہے، اسکو چھوڑ کر مبادلہ یا تبادُل بلوانے کی کوشش زبردستی ہے،

محاذ کی عربی اصل محاذی، اور ہندوستانی ورتے (دلّی میں بولا جاتا ہے) کی اصل عربی ورائے ہے، مگر اب محاذ اور ورتے کو چھوڑ کر ان معنوں میں محاذی اور ورا نہیں بولا جائیگا تبدیل کے مقابلہ میں تبدیلی تو غلط ہی ہو، مگر وہ ہمارے ہاں صحیح ہے، خود صحیح کو بھی ہم نے کر دیا ہی، اور اس سے ایک نئے معنی پیدا کر لئے ہیں، احوال عربی میں جمع ہی کیوں نہ ہو، مگر وہ ہماری زبان میں واحد کے طور پر بولا جاتا ہے، متنی کا لفظ عربی میں واحد ہے، مگر اردو والے اسکو جمع بولتے ہیں، "ماتحت" عربی کے لحاظ سے بے معنی ہے، مگر ہماری زبان کا وہ نہایت صحیح و فصیح اور با معنی لفظ ہے، آشنا ہندی کا چاہے کھرا لفظ ہو، مگر ہماری زبان میں وہ آس بنکر آیا ہے، اور وہی صحیح ہے، ہندی میں وچار ہو تو ہو، مگر وہ ہمارے ہاں بچار ہے،

اسی طرح عربی، فارسی، اسنسکرت، ہندی، اور یورپ کی زبانوں کے ہزاروں لفظ اپنی اپنی صورت بدل کر ہماری زبان میں ایسے رُل مل گئے ہیں، کہ ان کو پہچان پہچان کر اگر ہم ان کی اصلی شکلوں میں لکھنے اور بولنے لگیں، تو خود ہماری زبان کی حکومت ہمارے ملک سے اٹھ جائے گی، اور ایسے بدیسیوں کی بھیڑ ہر جگہ دکھائی دے گی، جو ہمارے دیس کے قانون کو نہیں مانتی، اسلئے ان بدیسیوں کو اس دیس میں رہنے سہنے کی اجازت اسی وقت ملسکتی ہے جب وہ ہمارے دیسی قانون کو قبول کرکے دیسی بنجائیں،

لفظی شکل و صورت کے تغیر سے بڑھ کر معنوی تغیرات ہیں، ہزاروں عربی اور فارسی کے ایسے لفظ ہیں، جن کے معنی خالص ہندوستانی ہیں جن کو عربی، اور فارسی والے جانتے بھی نہیں، ور وہ اسی قاعدہ کے مطابق بنے ہیں،

اسی سے کسی زبان کی خود مختارانہ حکومت کا پتہ چلتا ہے، لفظ خواہ کسی قوم اور ملک کے ہوں، مگر جب وہ دوسری قوم اور ملک کی زبان میں چلے جاتے ہیں، تو ان کی مثال ان لوگوں

کی سی ہے، جو پیدا کہیں ہوتے ہوں، لیکن جب کسی دوسرے ملک کی رعایا بنجاتے ہیں، تو اسی دوسرے ملک کے قاعدے اور قانون ان پر چلا کرتے ہیں، اس وقت یہ نہیں دیکھا جاتا، کہ ان کی پیدائش کہاں کی ہے، اور یہ پہلے کس کی رعایا تھے،

کسی لفظ کو ہندوستانی بنا لینے کے بعد ہم کو حق ہے، کہ ہم اسکے وہ معنی سمجھیں، جو اصل معنی سے مجاز کے طور پر یا اس کے قریب ہونے یا کسی اور لگاؤ کی وجہ سے ہماری زبان میں پیدا ہو گئے ہیں،

اسی فقرہ میں دیکھئے کہ "وجہ" عربی لفظ ہے، عربی میں اسکے معنی منھ کے ہیں، اس سے رُخ کے معنی پیدا ہوئے، اور اس سے سبب کے معنی پیدا ہو گئے، خود سبب کیا ہے؟ عربی میں اسکے معنی رسی اور ڈوری کے ہیں، جس سے کسی کو باندھا جائے، اس سے عربی میں ذریعہ کے معنی پیدا ہو گئے اس سے اہل فلسفہ اور فارسی، اور اردو والوں نے اس کو علت اور وجہ کے معنی میں بول دیا، اور لیجئے، اسکی جمع اسباب بنائی، اور اسکے دو معنی قرار دیئے، جب اسکو مفرد کے طور پر بولیں تو سامان سمجھیں، اور جب جمع بولیں تو وہ سبب کی جمع ہے،

اسباب کے معنی سامان کے نہ عربی میں ہیں نہ فارسی میں بلکہ خاص ہندوستانی میں ہیں،

میں نے معارف میں ایک دفعہ اثر کی جمع اثرات لکھدی تھی، میرے مخدوم دوست سید مقبول احمد صاحب صمدنی نے جو بڑے نستعلیق انشا پرداز اور نفاست پسند اہل قلم ہیں، خط لکھ کر مجھے فوراً ٹوکا کہ عربی میں اثر کی جمع آثار ہے، اثرات نہیں" میں نے مذاقاً جواب دیا، کہ میں نے وہ لفظ اردو میں لکھا ہے عربی میں نہیں،

لیکن یہ مذاق میں ٹالنے کی بات نہیں، خدا جانے اور کتنے فضلا اس قسم کی بالارادہ غلطیوں کو لکھنے والوں کی جہالت سمجھتے ہونگے، مگر بات یہ نہیں، عربی میں "اثر" کے معنی زمین پر قدم کے نشان کے ہیں، قرآن میں ان ہی معنوں میں یہ لفظ آیا ہے، اہل فلسفہ کو اپنے لئے لفظوں کی ضرورت پڑی

انھوں نے اسکو لیا اور اس سے تاثیر اور تاثر اور اثر معنی نتیجہ کے لفظ بنا لیئے، اس سے فارسی اور اردو میں اثر نتیجہ کے معنی میں آگیا یعنی جس طرح قدم اٹھ جانے کے بعد قدم کا نشان رہ جاتا ہے اسی طرح کسی شے کے ہٹ جانے یا مٹ جانے کے بعد اس کا جو نشان رہ جائے، اس کو اس کا اثر کہنے لگے، اب اس کے بعد اثر خاصیت کے معنی دینے لگا، جیسے فلان دوا کا اثر یہ ہے، میری بات کا اثر یہ ہے، ملک میں ان کا اثر ہے،

اب جمع میں آیئے، اسکی عربی جمع آثار بنی، لیکن اردو میں اس کے معنی "قرینہ" کے ہوں گے جیسے آثار سے یہ معلوم ہوتا ہے، یا پھر دیوار کا آثار ہے، یا پرانی یادگاروں کے معنی میں ہے، جیسے آثار قدیمہ اسی لئے اثر نتیجہ یا تاثیر کے معنی میں جب بولیں گے، تو اس کی جمع اثرات بنائی جائے گی، خواہ وہ عربی کے لحاظ سے کتنی ہی بے قاعدہ ہو،

قرینہ ہی کا لفظ دیکھئے، عربی میں قرن کے معنی ملانے کے ہیں، قرین، ان دو جانوروں میں سے ہر ایک کو کہتے ہیں، جن کے پاؤں ایک رسّی میں ملا کر باندھ دیئے جائیں، اس سے قرین کے معنی عربی میں ہمسر کے، اور قرینہ کے معنی بیوی کے ہوگئے، لیکن اردو میں قرین کے معنی قریب، نزدیک اور پاس کے ہیں، اور قرینہ کسی شے کے ہونے کے قیاسی لوازم، جیسے قرینہ یہ کہتا ہے، قرینہ سے یہ معلوم ہوتا ہے

اب لوازم کو دیکھئے، عربی لزم اور لزوم سے نکلا ہے، لازمہ کی جمع ہے، کسی شے سے چپک جانے کو لزوم کہتے ہیں، اس سے اہلِ منطق نے ایسے مفہوم و معنی میں جس کا کسی دوسری شے سے چپکا رہنا ضروری ہے، یا وہ اس سے الگ نہیں ہوسکتا، اسکو استعمال کیا، اسی سے ہماری اردو میں لازم کے معنی ضروری کے ہوگئے، اسکی جمع کسی طرح لوازم بنی اب اردو میں اس کی جمع لوازمات بنائی گئی، اور اس کے معنی کسی شے کے ضروری سامان و اسباب کے ہوگئے، لوازمات کے اس معنی کا اردو والوں نے لوازمہ اجسکو عربی سے ادنی تعلق نہیں،

جنس کا لفظ کون نہیں جانتا، مگر یہ جنس عرب کی نہیں، یونان کی ہے، عربی میں منطق والے لائے، اور اسکی تعریب کرکے اس سے تجنیس، مجانست، تجانس وغیرہ مصدر بنائے، جنس منطق کی اصطلاح میں اس کلی (عام چیز) کو کہتے ہیں، جس کے تحت میں کئی مختلف حقیقتوں کی اشیاء داخل ہوں جیسے حیوان، کہ یہ انسان اور گھوڑے گدہے، گائے بھینس، بکری وغیرہ ہر جاندار کو کہتے ہیں، اب اس سے ادبی جنس پیدا ہوئی یعنی کسی حقیقت مشترکہ کے مختلف افراد، اس سے ابنائے جنس بنایا، (ایک جنس کے بیٹے) یعنی ایک حقیقت کے سارے شریک، جیسے سارے انسان آپس میں ابنائے جنس ہیں، اب اس سے بھی خاص ہوکر ہم جنس بنا،

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

کبوتر با کبوتر باز با باز

اب اس سے آگے بڑھ کر ہندوستان میں جنس کے معنی قسم ہوگئے، اور خاص طور سے غلہ کی قسم کے ہوگئے، کہتے ہیں "نقد و جنس" نقد کے معنی روپیہ پیسے کے، اور جنس غلہ یا سامان، اسکی جمع اجناس جو بنی تو یہ غلوں کے اقسام پر مشتمل ہوگئی، اور "نرخ اجناس" کی صورت میں اسکی جنس ہی بدل گئی،

لفظ نقد کو تو دیکھئے کہ یہ کیا ہے، نقد کے عربی معنی پرکھنے کے ہیں، اس سے ریویو کے معنوں میں آج کل نقد یا تنقید کہتے ہیں، چونکہ پرکھے سکے جاتے ہیں، اس سے فارسی میں نقد کے معنی سکے کے ہوگئے، اور دام کی صورت میں سکے دیئے جاتے ہیں، اسلئے اردو میں نقد دام کے معنی اس دام کے ہوئے جو فوراً دیئے جائیں، اور نقد اور ادھار دو متقابل کے اردو لفظ ہوگئے،

خیر عربی کا لفظ ہے، اسکے معنی بھلے اور نیک کے ہیں، ہماری زبان میں یہ لفظ ایک تکیۂ کلام کی صورت میں ہے، اور اکثر ذرا وقفہ کے طور پر یہ بول دیا جاتا ہے، پھر ہم نے اسمیں "ی" اور "ت" لگاکر اسکو خیریت بنا دیا، اور اسکے معنی اچھی خبر کے ہوگئے "یّات" لگاکر اسکی بے قاعدہ جمع

خیرات بنادی تو صدقہ کے معنی ہو گئے،

عربی میں مونث لفظوں کی جمع سالم بنانے کا طریقہ یہ ہے، کہ ان کے آخر میں ات لگا دیئے جائیں جیسے مُسلمہ سے مسلمات مگر پہلے فارسی والوں نے اور ان کی دیکھا دیکھی ہندوستانیوں نے اس میں ایسی آزادی برتی کہ فارسی اور ہندی لفظوں تک کی جمع اس طرح بنانے لگے، جیسے کاغذات، دستاویزات، دیہات، اس سے زیادہ لطف کی بات یہ ہو کہ جس لفظ کے آخر میں ہ دیکھا اسمیں جات لگا دیا، جیسے صوبہ جات، میوہ جات، علاقہ جات،

علاقہ ہندوستانی میں زمینداری کے گاؤں کو کہتے ہیں، عربی میں اس کے معنی لگاؤ کے ہیں، اسی لگاؤ سے ہر چیز جس سے آپ کو لگاؤ ہے، آپ کا علاقہ ہے، غدر کے معنی عربی میں بے وفائی کرنے کے ہیں، اس سے اُس بے وفائی کو کہنے لگے، جو فوج اپنے عہد کو توڑ کر اپنے افسروں سے کرے، اس فوجی بے وفائی کا نتیجہ بدامنی ہے، یہ دونوں معنی ہندوستان میں پیدا ہوئے، بڑے شہروں میں بدامنی کے واقعے زیادہ پیش آتے ہیں، تو بڑے شہر کو ہم نے غدار شہر کہدیا،

ایک جائداد کی فروخت کا ذکر ہو رہا تھا، اس پر ہمارے گاؤں کے ان پڑھ ہندو پٹواری نے کہا "دیکھ لیا جائے کہیں جداد مبوس تو نہیں ہے" جداد تو میں سمجھا کہ جائداد ہے، مگر مبوس نہیں سمجھا، مگر سوچتا رہا، کچھ دنوں کے بعد خیال آیا کہ یہ عربی محبوس ہے جس کے معنی "قیدی" کے ہیں اسی سے حبس اور محبوس عربی میں وقف کے معنی میں ہیں اب معلوم ہوا کہ وہ پرانے شاہی کاغذات کی اصطلاح بولا، مقصود یہ تھا، کہ یہ دیکھ لیا جائے کہ یہ جائداد کہیں قید تو نہیں، یعنی کسی کے رہن یا بیع میں تو نہیں ہے،

تقریب کے معنی نزدیک کرنا پھر جو کسی مقصد سے قریب کرنے کا ذریعہ ہو، اسکو تقریب کہا، اب ہندوستانی ملاقات کے ذریعہ کو تقریب کہنے لگے ہے

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے،

ملنے ملانے کا سب سے عمدہ موقع کسی شادی او رخوشی کے مراسم کا موقع ہے، اسلئے ہم شادی وخوشی کے موقعوں کو تقریب کہنے لگے،

جناب کے معنی چوکھٹ کے ہیں، بادشاہوں سے براہ راست مخاطب نہیں ہوا جاتا تھا، اسلئے ان کے آستانہ اور چوکھٹ کی طرف نسبت کرکے بات کہی جاتی تھی، اس سے جناب تعظیمی خطاب کا لفظ ہوگیا،

حضرت بھی بڑے حضرت ہیں، حضرت کے اصلی معنی حاضر ہونے کے ہیں، اس سے حضرۃ کے معنی عربی میں بادشاہ کے حضور اور پیشگاہ کے ہوئے، ہمارے ہندوستان میں اب یہ بھی تعظیمی لفظ ہوگیا، مگر معلوم ہوتا ہو کہ یہ لفظ مغلوں کے زمانہ میں بنا، اس سے پہلے بندگی اور خدمت کے لفظ تھے، ان دونوں کے ایک ہی معنی ہیں،

حضرت ہی کی دوسری صورت حضور ہو، اسکے بھی وہی معنی اور وہی روداد ہے، حضرت کے ساتھ صاحب کا بھی خیال آیا، صاحب کے عربی معنی ساتھی کے ہیں، اس سے عربی میں والا کے معنی پیدا ہوئے جیسے صاحب علم (علم والا) اسکے بعد وزیروں کو جو بادشاہوں کے ساتھی اور مصاحب ہوتے تھے صاحب کہنے لگے، جیسے صاحب ابن عباد وغیرہ، اب صاحب کے معنی آقا کے ہوئے، اور ہر نام کے آخر میں تعظیم کے لئے لگنے لگا، انگریز آئے تو وہ سارے ہندوستانیوں کے آقا ٹھہرے اسلئے وہ صاحب ہوئے،

ایک بادشاہ کی جگہ پر جب دوسرا بادشاہ تخت پر بیٹھتا تھا، تو اس کے لئے عربی کا لفظ جلوس غیر عربوں نے استعمال کیا، جس کے معنی بیٹھنے کے ہیں، اور سال جلوس تخت نشینی کے سال کی اصطلاح بنی، اور چونکہ جب نیا بادشاہ پہلی دفعہ تخت پر بیٹھتا تھا تو تزک واحتشام

لاؤ لشکر کے ساتھ نکلتا تھا، تو ہم ہندوستانی تزک و احتشام کے ساتھ کسی مجمع کے نکلنے کو جلوس کہنے لگے اسکو عربی سے کوئی تعلق نہیں، اور جب بادشاہ اور حاکم دربار میں بیٹھے، تو ہم نے جلوس سے اجلاس بنا لیا جس کے معنی بٹھانے کے ہیں، اور اب نئے زمانہ میں انجمنوں اور جلسوں کے بھی اجلاس ہونے لگے،

جس جگہ بیٹھیں عربی میں اس کو مجلس کہتے ہیں، بعض علما، اور صوفیہ نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ خاص دنوں میں بیٹھکر لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے یا درس دیتے، اس سے اس قسم کی نشست کو اور پھر اس نشست کی تقریبوں کو مجلس کہنے لگے مجلس ہندوستان میں ایسی نشستوں کو کہتے ہیں جن میں لوگ مذہبی اور علمی تقریریں کریں، یا مرثیے پڑھیں اور اس سے ہم نے علم مجلس بنایا، جس میں تہذیب و شایستگی کے ساتھ مجلسوں میں اٹھنے بیٹھنے اور سلیقہ اور دلچسپی کی باتیں کرنے کے ڈھنگ سکھائے گئے،

جلوس سے قعود دیا آیا، قعود کے معنی بھی عربی میں بیٹھنے کے ہیں، اس سے عربی میں لفظ قاعدہ بنا، اور اس کے معنی بنیاد کے ہوئے، یعنی دیوار کا وہ حصہ جو زمین کے اندر بیٹھے، چونکہ بنیاد ہی کے اوپر ساری عمارت کھڑی ہوتی ہے، اسلئے اہل علم نے اپنی اصطلاح میں ان اصول کو جن پر بہت سے مسئلوں کی بنیاد ہو، قاعدہ کہا، اور اب ہماری زبان میں قاعدہ قانون کے معنی دینے لگا، اور کی جمع قواعد بنائی، اور اسکو جمع مذکر کے طور پر استعمال کیا، تو اس کے معنی جزئی قانون کے ہوئے، لیکن ہم نے فوج کے نظم و ضبط اور ترتیب کے ساتھ چلنے، آگے بڑھنے، پیچھے ہٹنے کے قاعدے بنائے تو ان کا نام بھی قواعد رکھا، اور وہ ان معنوں میں واحد مونث ہے اور خالص ہندوستانی ہے،

قاعدہ کے ساتھ اصول پر نظر رہے، یہ عربی میں اصل کی جمع ہے، اصل کے معنی عربی میں جڑ کے ہیں اسلئے جب ایک بات کی جڑ پر مسئلوں کے بہت سے تنے کھڑے ہوں تو اس بات کو اصل کہنے

لگے، اور اسکی جمع اصول بنائی، مگر جب ہم ہندوستانیون نے اس کا استعمال کیا، تو واحد کی صورت میں تواصل کے معنی حقیقی اور واقعی کے کر دیئے، اور جمع کی صورت میں اصول کے معنی قاعدوں کے کر دئے اور اس جمع کو واحد بنالیا، اور کہنے لگے، ایک اصول یہ ہے، دوسرا اصول یہ ہے، اور جب اس کی جمع کی ضرورت ہوئی، تو اردو کے قاعدہ سے اصولوں کر دیا، اور کہا کہ ان اصولوں سے ہم کو انکار نہیں،

مادہ، مدسے اسم فاعل مؤنث ہے، اس کے معنی پھیلنے پھیلانے کے ہیں، اور مادہ کے معنی پھیلنے والے کے ہیئے یونانی زبان سے فلسفہ کا ترجمہ جب عربی میں ہوا تو جسم کی صورت میں جو چیز پھیلی ہوئی ہے، اس کا نام مادہ گھڑ کر رکھا، اور اس کی جمع مواد بنائی، ہماری زبان میں یہ لفظ مواد واحد کی صورت میں زخم کے اندر جو چیز بھری ہوتی ہے، اس کے لئے بولا جانے لگا، انگریزی میں مادہ کو میٹر کہتے ہیں، اور کسی مضمون کے معلومات کو بھی میٹر کہتے ہیں، اسلئے ہماری زبان میں میٹر کا ترجمہ بھی مواد ہوا، اور بولا جانے لگا،

حکیم برہم مرحوم (مشرق گورکھپور کے اڈیٹر) نے مجھ سے کہا تھا، کہ اصول اور مواد ان دونوں لفظوں کو سب سے پہلے مولینا شبلی مرحوم نے اردو میں ان نئے معنون میں استعمال کیا،

دولت عربی لفظ ہے، معنی ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جانا، عربی میں جب مختلف سلطنتیں یکے بادیگرے بنیں اور مٹیں، تو سلطنت کو دولت کا نام دیا گیا، اور جمع دُوَل بنائی گئی، ان معنون میں آج بھی دولتِ برطانیہ اور دول یورپ ہم بولتے ہیں، سلطنت اور بادشاہی خوش قسمتی سے ہاتھ آتی ہے، اسلئے ایرانی دولت کو خوش قسمتی کے معنوں میں بولنے لگے، جس کی یادگار فارسی کے بدولت ہماری ہندوستانی میں بھی لفظ بدولت بولا جاتا ہے، جیسے کہتے ہیں، آپ کی بدولت یہ ملا، اور پھر بدولت ذریعہ کے معنی میں ہو گیا، خوش قسمتی کی بڑی نشانی زرومال ہے، اسلئے یا اسلئے

کہ یہ زر و مال بھی ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جاتا ہے، اسکو بھی دولت کہنے لگے، اور اس سے دَولت، دَولتمند، اور دولتمندی کے لفظ ہندوستانی کو ہاتھ آئے،

عربی میں غصّہ کے معنی حلق میں کسی چیز کے اچھو ہو جانے یا اٹک جانے کے ہیں، ہندوستانی میں اسکے معنی غیظ و غضب کے ہو گئے، خَفا فارسی میں خفہ ہے، اور معنی وہی گلے میں اٹکنے اور پھنسنے کے ہیں، ہندوستانی میں خفا ہونا، ناراض ہونے کے معنی میں ہے،

بعض لفظ خیالات کے بدولت ہاتھ آئے ہیں، عربی میں فلک آسمان کو کہتے ہیں، چونکہ نجوم اور جوتش نے ہم کو یہ یقین دلایا ہو کہ ہماری ساری مصیبتیں آسمان کی گردش کا نتیجہ ہیں، اسلئے ہم نے فلک سے فلاکت بنایا، اور اس سے فارسی کی ترکیب دے کر فلاکت زدہ (فلاکت کا مارا) کیا، اور پھر اس کو عربی لفظ سمجھ کر اس کا مفعول مفلوک بنا لیا، اور عربی اضافت دیکر مفلوک الحال کہدیا، حالانکہ اسکے ان معنوں کو عرب جانتا بھی نہیں،

ہر لفظ پر اس تفصیل سے لکھنا پوری تصنیف کے برابر ہے، اس لئے ہم ذیل میں کچھ اور ایسے عربی لفظ لکھ دیتے ہیں، جن کے معنی ٹھیٹ ہندی ہیں، یا فارسی کے اثر یا اہل فلسفہ کی اصطلاحوں سے ایسے معنوں میں بولے جاتے ہیں، جو عربی قطعاً نہیں،

عربی	عربی معنی	اردو معنی
قطعاً	کاٹکر (یعنی ہر شک کو کاٹ کر)	یقینی طور سے
لفافہ	لپیٹ	خول، لفافہ
غارت	لوٹ	بربادی
اعتراض	آگے آجانا، سامنے پھیل جانا،	اعتراض کرنا
عرض	پھیلانا	پیش کرنا

عربی	عربی معنی	اردو معنی
مقدمہ	آگے کیا ہوا،	جو جھگڑا عدالت میں پیش ہو،
متانت	بھاری ہونا	مہذب ہونا،
متین	بھاری	مہذب
میزان	تول، ترازو	جمع
مذاق	چکھنا	ظرافت
اہتمام	غم کھانا	اہتمام کرنا
مہتمم (صحیح مہتم)	غم کھانے والا	مہتمم
انتظام	دھاگے میں پرویا جانا،	انتظام کرنا
منتظم	دھاگے میں پرویا جانے والا	انتظام کرنے والا
غلام	لڑکا	غلام، بندہ
فرض	واجب کرنا	ذمہ داری
ولی	دوست ہتولی	سرپرست، خدارسیدہ (خدا کا دوست)
محاذ	مقابل	لڑائی کا میدان
فوج	گروہ، جھنڈ	لڑائی کا لشکر
محنت	رنج و تکلیف	محنت یعنی پوری کوشش
شکل	مثل، مشابہ	صورت
شکیل	ہم شکل	خوبصورت
نقل	کسی چیز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانا	ایک جگہ کی خبر کو دوسری جگہ بیان کرنا

عربی	عربی معنی	اردو معنی
منظور	دیکھا گیا	قبول
دماغ	دماغ	دماغ، غرور
مدمّغ	×	مغرور
غرور	دھوکا	غرور
مغرور	دھوکا کھایا ہوا	مغرور
انکسار	ٹوٹنا	خاکساری
استقلال	کم سمجھنا	مضبوطی، ثابت قدمی
عمارت	آبادی	بڑا مکان
تعمیر	آباد کرنا	بڑی عمارت بنانا
کسر	توڑنا	(اردو کسر) عیب، کمی،
اجلاس	بٹھانا	عدالت یا انجمن کی نشست
ضبط	نگاہ رکھنا	ضبط کر لینا، کسی چیز کو حاکم کا چھین لینا
ضابطہ	نگاہ رکھنے والا	قاعدہ
تقریر	ثابت کرنا	تقریر کرنا
مقرر	ثابت کرنے والا	تقریر کرنے والا
اقبال	سامنے آنا	خوش قسمتی
ادبار	پیچھے ہونا	تنزل
اقبال	× (بے معنی)	اقبال کرنا، قبول کرنا

عربی	عربی معنی	اردو معنی
رقم	لکھنا	تعداد، چیزوں کی قسم
خراب	ویران	بُرا، مست
دقت	باریکی	مشکل
غلیظ	موٹا	نجس
امیر	حاکم	دولت مند
غریب	مسافر	مفلس
تربت	مٹی	قبر
نفسانیت	جان ہونا	خودغرضی
غرض	نشانہ	مقصد
غایت	گھوڑ دوڑ کی اخیر حد	غرض، آخری حد
عرصہ	میدان	مدت
مدت	درازی	زمانہ
محصول	جس کا حصول ہو	ٹیکس
موضع	رکھنے کی جگہ	گاؤں
مکان	ہونے کی جگہ	گھر
بخار	بھاپ	بخار (تپ)
احاطہ	گھیرنا	گھیرا
خاطر	دل میں کھٹکنے والا	مہمان کی عزت کرنا

عربی	عربی معنی	اردو معنی
منت	احسان	عاجزانہ خوشامد
حلوا	میٹھا	حلوا
دہشت	تعجب و حیرانی	خوف
شہوۃ	کسی قسم کی خواہش	جنسی خواہش
اشتہا	؍؍	کھانے کی خواہش
مبلغ	کسی حد تک پہنچا ہوا	روپیوں کی تعداد
ماتم	میت پر غم کرنے کے لئے جمع ہونیکی جگہ	میت کا غم،
حقہ	ڈبیا	حقہ

اس قسم کے ہزاروں عربی لفظ ہیں، جو اپنے خاص معنوں میں ہماری ہندوستانی کے خاص لفظ ہوگئے ہیں، یہی حال فارسی کا بھی ہے، فارسی کے بہت سے لفظ اور ترکیبیں ہیں، جن کو ہم نے اپنے ہندوستانی معنوں کے لئے ہندوستانی لفظ بنا لیا ہے، فارسی میں خانہ لگا کر ظرف اور مقام کے معنی کے لفظ بنائے گئے ہیں جن کی صورت تو فارسی کی ہے، مگر معنی اور استعمال سراسر ہندی ہیں جیسے پاخانہ، غسلخانہ، باورچی خانہ، بندی خانہ اسی طرح فارسی میں دان لگا کر بھی ظرف بنتا ہے جیسے خاکدان یعنی زمین، ہندوستانی نے اس سے اپنے بیسیوں لفظ بنائے، جیسے پاندان، اگالدان خاصدان، عطردان، گلدان، جزدان، چادان، دودھ دان، شکردان، روشندان، نابدان، سنگاردان شمعدان،

تصغیر کے لئے دان کو ہم نے کبھی دانی کر دیا، جیسے سرمہ دانی، گوند دانی، مچھر دانی، تیلے دانی (سوئی تاگا رکھنے کے لئے)

گیر (لینے والا) لگا کر فارسی میں اسم مرکب بنائے جاتے ہیں، جیسے دلگیر، جہانگیر، ہم نے اس سے لفظ بنا کر بہت سی چیزون کے نام رکھدیئے، جیسے خوگیر (خو کے معنی فارسی میں پسینہ کے ہیں،) عرق گیر، کفگیر، نمگیر، پھر اس سے نمگیرا (نم یعنی شبنم چونکہ اس قسم کے خیمون سے شبنم سے بچاؤ مقصود ہے، اسلئے نمگیر کہدیا) دیوار گیر (پہلے اس کپڑے کو کہتے تھے، جو دیوار پر آرایش کیلئے لگاتے تھے، تا کہ دیوار سے پیٹھ ٹیکنے میں کپڑا خراب نہ ہو، اب اس لیمپ کو کہتے ہیں جو دیوار میں لٹکایا جائے)

اس سلسلہ میں جاگیر تازکی لفظ ہے، جاگیر کے لغوی معنی تو جگہ لینے والا ہے، بادشاہ اپنے امیرون کو منصب کیساتھ جو گاؤں دیتے تھے، جہان جاکر امرا اکثر قیام کرتے تھے، اس کو جاگیر کہنے لگے، رفتہ رفتہ جاگیر کے خاص معنی ہو گئے، یہانتک کہ غریب طالب علموں کے کھانے کے ٹھکانے کو بھی جاگیر کہنے لگے،

اسی سے ملا ہوا جاداد کا لفظ ہے، فارسی لفظ کی اصل صورت جاداد ہے، معنی "دی ہوئی جگہ" بادشاہ کی طرف سے امیروں کو جو گاؤں ملتے تھے، وہ جاے داد تھی، رفتہ رفتہ جاداد نے زمینداری اور ملکیت کے معنی پیدا کرلئے، زمیندار اور زمینداری بھی لفظوں میں فارسی ہیں، اور معنی میں سراسر ہندی،

تنخواہ کے لفظی معنی "بدن کا چاہنے والا" معنی یوں پیدا ہوئے کہ مغلوں کے زمانہ میں لشکر کی امیروں کو خوراک وغیرہ کے لئے جو معاوضہ ملتا تھا، اس کا نام تنخواہ رکھا گیا، اب تنخواہ کے معنی مشاہرہ کے ہیں، ایرانی اس تنخواہ کے حرف سے بھی واقف نہ ہونگے،

ہندوستانی نے یہی عمل ہندی اور سنسکرت لفظوں کے ساتھ کیا ہے، ہندی اور سنسکرت لفظون کو اپنانے کیلئے انکی شکلیں بدلی ہیں، انکو ہلکا کیا ہے، ان کی ترکیبوں سے نئے نئے لفظ بنائے ہین،

ٹونٹال، منہ ہندی ہے، نال، نالی، اور نلی لمبی سوراخ دار چیز کو کہتے ہیں، جیسے بندوق کی نال، ویسی ہی نیچہ کی نالی کے منہ پر جو لگایا جائے، وہ ٹونٹال ہے، گنگا اور جمنا دو دریاؤں کے نام ہیں، سونے چاندی کے ملان سے جو نقاشی کیجائے، وہ گنگا جمنی ہے، لفظ برہمن تھا جو ذرا بھاری تھا، اسکو ہماری زبان نے برہمن کر دیا، اسی طرح گنٹر کو گن کر کے ہلکا کر دیا، برکھارت نے برسات کی شکل اختیار کی، وچار، بچار ہو گیا، اور سو پنج بچار کے ساتھ بولا جانے لگا، آشا نے آس ہو کر یہ مثل کہوائی، کہ جب تک سانس ہے، تب تک آس ہے، اسی طرح ہندی اور سنسکرت کے لاتعداد لفظوں کو ہندوستانی نے ذرا ذرا ہیر پھیر سے اپنے رنگ میں رنگ کر ان پر زمانہ کے تغیر کا نیا رنگ چڑھا دیا ہی،

غرض عربی اور فارسی اور سنسکرت نسل کے ان ہندوستانی بچوں کی تعداد بے شمار ہے، یہاں ان سب لفظوں کو پہچنوانا، اور بتانا مقصود نہیں ہو، بلکہ مقصد یہ ہے، کہ آج ہمارے سنسکرت دوست ہندو دوستوں کو جو یہ کد ہے، کہ ہندوستانی زبان کے ہر ہندی یا سنسکرت لفظ کو اصل صحیح ہندی اور صحیح سنسکرت رنگ روپ میں دیکھیں، اور اسی صحیح ہندی اور سنسکرت نام سے ان کو پکاریں، ان کو تسلی رہے، کہ ہندوستانی نے عربی اور فارسی لفظوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا ہے، اور ہر خود مختار زبان کو اس کا حق ہو، کہ وہ دوسری بانوں کے لفظوں کو اپنی رعایا بنانے کے لئے ان کے ساتھ یہ سلوک کرے، یہ ہر خود مختار زبان کا حق ہے، اور کسی کی قدرت میں نہیں کہ وہ اس سے اس کے اس حق کو چھین سکے،

خلافت اور ہندوستان

علی مردان خان

از

جناب عبداللہ صاحب چغتائی ام اے ڈی لٹ،

(۲)

علی مردان خاں کا نظام انہار

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں زراعت کی آب پاشی مختلف طریقوں سے کی جاتی ہے، بعض مقامات پر قدرتی آبپاشی کے لئے دریا ہیں، بعض پہاڑی مقامون پر کافی مقدار میں پانی جمع رہتا ہے، بعض مقاموں پر نہروں کے ذریعہ سیرابی کیجاتی ہے، اور یہ وہیں ممکن ہے جہاں پہاڑ نہ ہون اور زمین ہموار ہو، شمالی ہند کا خطہ جغرافی اعتبار سے اس قابل ہے کہ یہاں نہرون کے ذریعہ آب رسانی کیجائے جسے ابتدا سے محسوس کیا گیا ہے، چنانچہ جب یہاں اسلامی حکومت قائم ہوئی تو اس طرف خاص توجہ کی گئی، اور اس کے لئے محکمۂ انہار قائم کیا گیا، اس سلسلہ میں بہت سی نوآبادیاں بس گئیں، اور ان نہروں اور دریاؤن سے سامان کی بہم رسانی کا کام بھی لیا گیا، یہی وجہ ہے کہ مغلوں نے عام طور پر دو وجوں سے اپنی تمام تاریخی اور اعلیٰ عمارتیں دریاؤں کے کنارے تعمیر کیں، ایک تو اپنے حسن ذوق اور قدرتی مناظر سے لگاؤ کی وجہ سے، دوسرے دریاؤں کے ذریعہ سامان کی بہم رسانی آسان تھی،

اس سلسلہ میں سب سے پہلے فیروز شاہ تغلق کا نام آتا ہے جس نے ۷۵۳ھ میں بنگال کی چھوڑ کر تمام ہندوستان کی عنانِ حکومت سنبھالنے کے بعد اس طرف خاص توجہ کی اور شہر حصار کو جو عرصہ سے

خشک پڑا تھا آباد کیا، اور دور دراز کے سوداگروں اور رعایا کو پانی کی قلت کی وجہ سے جو تکلیف ہوتی تھی وہ جاتی رہی، تاریخ فیروز شاہی میں ہے کہ پہلے اس نے یہاں ایک قلعہ بنام حصار فیروزہ تعمیر کرایا، اور اس کے ارد گرد ایک خندق کھدائی، اور قلعہ کے اندر ایک تالاب بنوایا، اور ان دونوں کو پانی سے لبریز کرنے کے لئے ایک نہر کوہستان سے نکال کر ہانسی و کرنال کے راستہ سے حصار تک لایا، یہ نہر اس زمانہ میں ۲۰۰ میل لمبی تھی،

ایک اور نہر دریائے ستلج سے نکالی جس کا نام "الغ خانی" رکھا، یہ دونوں نہریں رفاہ عام کے لئے شاہی خزانہ سے تیار ہوئیں اور اس کا کوئی بار رعایا پر نہیں ڈالا گیا، اور نہر کے گرد و نواح کی آراضی زراعت پیشہ لوگوں کو عطا کی گئی، فیروز شاہ نے اس قسم کے اور بہت سے کار خیر کئے،

اس کشمکش میں مغلوں کا زمانہ آگیا، جس میں علوم و فنون پر خاص توجہ کی گئی، اور سارے ملک میں ایک روح پھونک دی گئی، بالاتفاق عہد مغلیہ کا شباب شاہجہان کا زمانہ کہلاتا ہے، جو ہمارے اس وقت پیش نظر ہے، علی مردان خاں کے جیسے ماہرین فن اس کے عہد حکومت میں موجود تھے، جنھوں نے شاہی حکم سے ہند کو خلد بریں بنا دیا تھا،

اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آج سے پچاس سال قبل جتنی نہریں بھی موجود تھیں سب اسی عہد کی یادگار تھیں جنمیں سے کچھ اب تک قائم ہیں، اور نظام انہار میں جو ترقیاں ہوئیں وہ سب انھی کی بدولت، ذیل میں ان چند نہروں کی مختصر کیفیت درج کیجاتی ہے جنھیں علی مردان خاں نے رفاہ عام کیلئے شاہی خزانہ کے مصارف اور اپنی سعی بلیغ سے بصرف کثیر جاری کیا،

نہر دہلی | یہ نہر شالامار باغ کی بنیاد کہی جا سکتی ہے، اسے علی مردان خاں نے دو لاکھ روپیہ کے صرف سے بنوایا، اس کی تعمیر کی تاریخ یہ ہے کہ علی مردان خاں نے بادشاہ سے عرض کیا کہ

فدوی کے ہمراہ ایک شخص ہے جو نہر کے بنانے میں مہارت رکھتا ہے، وہ کہتا ہے کہ دریائے راوی کے دہانہ سے جہاں سے وہ کوہستان سے نکل کر ہموار زمین میں بہتا ہے، ایک نہر نکال کر دارالسلطنت لائی جائے جس کے ذریعہ کھیتوں اور باغوں کی آسانی سے آبپاشی ہوسکے، بادشاہ کو یہ تجویز پسند آئی، اس کو شاہی خزانہ سے ایک لاکھ روپیہ دیا گیا، چنانچہ لاہور سے ۴۹ جریب کی مسافت پر یعنی راج پورہ موضع نورپورہ کے قریب نہر کی کھدائی شروع ہوئی، لیکن یہ رقم ناکافی تھی، ایک لاکھ مزید صرف سے یہ نہر مکمل ہوئی، اس نہر سے پنجاب کو اتنا بڑا فائدہ پہنچا کہ تمام ضلع گورداسپور وغیرہ زرخیز ہوگئے، اور غیر آباد جگہیں آباد ہوگئیں[1]،

نہر جمنا علی مردان خان کی دوسری یادگار نہر جمنا ہے، گوہانہ کے راستے سے ہوتی ہوئی قدرتی نشیب کے ساتھ ساتھ جس جگہ اب بڑی نہر بہتی ہے، یہ نہر کھودی گئی تھی، یہ نہر پانی پت اور سونی پت کے راستہ سے ایک مرتبہ ناکامیاب ہوچکی تھی، اس نہر کو دہلی تک لایا گیا تھا، اس پر شاہی خزانہ کا بیشمار روپیہ صرف ہوا، اور اس کی تعمیر میں انجینرنگ کا کمال دکھا گیا، اس میں جمنا کا پانی اس کے داہنے کنارے کے نیچے سے آتا تھا، ہر سال داؤد پور کے قریب فتح پور میں تاجپور سے قریبًا ۴ میل پر پشتہ بندی کی جاتی تھی، اس کے لئے جو راستہ اختیار کیا گیا تھا، وہ ایک نالی کی صورت میں تھا، جو نہر دہلی کے چاندنی چوک و قلعہ تک آتی تھی وہ اسی کی شاخ تھی، اور دائیں کنارے کے نیچے بہتی تھی[2]،

نہر چناؔ دوآب مغلوں کے زمانہ میں سیالکوٹ سرکار لاہور میں شمار ہوتا تھا، اور علی مردان خان صوبہ لاہور کا گورنر تھا، اس نے ایک نہر دریائے چناب سے نکال کر ادھر کے تمام

---

[1] امپیریل گزٹ ص ۱۶ و ۷، [2] ایضاً و گانہ قلعہ دہلی وغیرہ ص ۴۰،

خشک اطراف کو سیراب کیا[1]،

رہتک کی نہر بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۶۴۳ء میں نواب علی مردان خاں نے رہتک کی نہر بنوائی جس میں فیروز شاہ کی پرانی نہر سے پانی لایا گیا[2]،

کار خیر میں مسلمانوں کا مطمح نظر اس بیان کے آخر میں ایک الزامی اعتراض کا جواب دینا چاہتا ہوں، پنجاب ایجوکیشنل جرنل فروری ۱۹۳۵ء میں جناب لالہ سوہن لال صاحب معلم جغرافیہ ٹریننگ کالج لاہور کا ایک مضمون "پنجاب میں آبپاشی کے ذریعے" میری نظر سے گذرا، اس میں وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ "شاہانِ مغلیہ نے جو نہریں بنائیں، وہ رفاہ عام کی غرض سے نہیں تھیں بلکہ اپنے ذاتی مفاد کو مد نظر رکھکر بنائی گئی تھیں"، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان الفاظ سے ان کا مقصود کیا ہے، لالہ صاحب جیسے باخبر شخص سے یہ توقع ہرگز نہیں تھی، تاریخی حیثیت سے ان کے بیان کی حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں فیروز شاہ تغلق و شاہجہاں دو مسلمان بادشاہ ایسے گذرے ہیں، جنھوں نے انہار کے ذریعہ رفاہِ عام کی کوشش کی جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، مزید ثبوت کے لئے دونوں کے عہد کی ہمعصر تاریخوں سے چند مختصر اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں، جو اسکی تردید کیلئے کافی ہیں:

تاریخ فیروز شاہی ضیاء الدین برنی کا بیان،

(۱) مقدمۂ ششم در بیان کافتن جوئیہا کہ بہ نفع عام تعلق دارد و ریگستا نہا و بیابانہا کہ خلقی در آں زمین از بے آبی و تشنگی ہلاک می شدہ وحوش وطیور از تشنگی می مردند در عصر ہمایوں فیروز شاہی مثل جون و مانند گنگ جوئیہا دور از قیاس پنجاہ جگہاں

---

[1] امپیریل گزٹ ص ۳۲۸/۲۲ [2] امپیریل گزٹ صفحہ ۳۶۹/۲۱ بادشاہ نامہ عبد الحمید و عمل صالح میں لاہور کی نہر کی مفصل کیفیت دی ہے، صفحہ ۳۱/۲،

شصت گان کردہ کا قند۔[۱]

(۲) تاریخ فیروز شاہی شمس الدین عفیف میں ہے،

"سلطان فیروز شاہ ہمدان را محل فرمود کہ از حضرت رب العالمین امید دارم چوں من بندہ امیدوار بامید حضرت پروردگار دریں دیار برائے منافع مسلمانان نیکو کار شہرے بناکنم، خدائے تعالیٰ بقدرت اعلیٰ دریں زمین آب نیز پیدا آرد۔"[۲]

بادشاہ نامہ ملا عبد الحمید لاہوری میں نہر ہنسلی کے متعلق جو راجپورہ سے لائی گئی تھی، مذکور ہے، کہ

"آب راوی از کوہستان بر آمدہ برزمین ہموار میرود نہرے کہ آب آن برمزارع و بساتین بنشیند جدا کردہ تا حوالی دار السلطنت لاہور بیارد، از آنجا کہ توجہ ملک پیرای عمارت افزا بر تہیۂ اسباب آبادی بلاد و تعبیہ مصالح و رفاہیت عباد مصروف است"[۳]

ان تحریروں سے جو مختصر کی جاسکتی ہیں، اور واقعی ہیں بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے اپنے مفاد کے لئے کہاں تک یہ کام کئے، یہ بھی ملحوظ رہے کہ ان کاموں کے لئے انھوں نے کوئی نیا ٹیکس وصول نہیں کیا، اور نہ اس کا بار رعایا پر ڈالا، بلکہ تمام مصارف شاہی خزانہ سے ادا ہوئے،

جنگی خدمات[۱] چونکہ علی مردان خان کابل اور قندھار سے اچھی طرح واقف تھا اس لئے جب

---

[۱] ضیاء الدین برنی، ص ۲۲۳ و [۲] شمس الدین عفیف ص ۱۲۶، [۳] بادشاہ نامہ ص ۱۶۸،

[۲] ان تمام واقعات کی مفصل کیفیت بادشاہ نامہ و عمل صالح اور مآثر الامراء میں دی ہوئی ہے، مگر یہاں محض اختصار دیا جاتا ہی،

کبھی ادھر کسی مہم کا موقع پیش آیا تو اعلیٰ حضرت نے اس کے تجربہ و مشاہدہ سے ضرور فائدہ اٹھایا، چنانچہ ۱۸ سنہ جلوس میں جب نذر محمد خان کے فرزند سبحان قلی خاں نے اپنی ناعاقبت اندیشی سے بلوچ زمینداروں کے علاقوں اور بعض دوسرے قبائل ہزارا وغیرہ پر جو لب دریا آباد تھے حملہ کیا اور لوٹ مار کرکے بامیان سے بیس کوس کے فاصلہ پر اس ارادہ سے رُک گیا کہ موقع پاکر پھر دست درازی شروع کردے تو علی مردان خان نے فریدوں اور فرخ کو جو اس کے معتبر غلام تھے، ایک جماعت کے ساتھ اس کی سرکوبی کیلئے مقرر کیا انھوں نے پہنچ کر ازبکی خیموں پر حملہ کرکے غنیم کو بھگادیا، اس کے بعد ۱۹ سنہ جلوس میں علی مردان خاں نے فوج کا ایک دستہ کابل سے کہمرد روانہ کیا، چونکہ غنیم کے ساتھ فوج کم تھی اس لئے وہ بغیر لڑے بھاگ گیا، اور قلعہ پر قبضہ ہوگیا، اور خود فوج کے ہمراہ کابل واپس آگیا، مگر اس کے بعد پھر پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں جسے اس نے کسی اور موقع کے لئے ملتوی کردیا، اور بدخشان کی فتح کے لئے بڑھا، مگر یہ بڑی نازک مہم تھی، اس لئے اعلیٰ حضرت کو یہ اقدام پسند نہ آیا، اور اس نے ۱۰۵۶ھ میں شہزادے مرادبخش کو علی مردان خان کے ہمراہ پچاس ہزار فوج دے کر بلخ و بدخشاں کی فتح کے لئے بھیجا، ان سیاسی جنگوں سے علی مرداں خاں کا یہ مقصد بھی تھا، کہ وہ اپنے لڑکے کو جسے شاہ صفوی نے یرغمال کے طور پر روک رکھا تھا طلب کرے بعد میں شاہ عباس ثانی نے اسے روانہ کردیا،

چند دنوں کے بعد نذر محمد خاں کے دوسرے لڑکے سلطان خسرو نے علم بغاوت بلند کیا اس سے سرحد کے حالات دن بدن ابتر ہوتے گئے، اس وقت شاہزادہ مراد وہاں موجود تھا، لیکن بجائے اسکے کہ وہ اس کا سدباب کرکے اس تازہ مفتوحہ علاقہ کا قرار واقعی انتظام کرتا، واپسی کا ارادہ کرلیا اور شاہی امتناعی حکم کے باوجود نہ رکا، ورنہ اس ملک کا نظام

درہم برہم نہ ہوتا، اس عدول حکمی کی سزا میں اعلیحضرت نے شہزادہ کو منصب وجاگیر سے محروم کردیا، اور اس کی جگہ وزیر اعظم سعد اللہ خاں کو مقرر کیا، اور علی مردان خان کو کندی کے سرکشوں کو قرار واقعی سزا دینے کا حکم ملا، اور یہ حکم بھی ہوا کہ بدخشان کے حاکم کے پہنچنے کے بعد وہ کابل کی صوبہ داری پر لوٹ آئے،

اسکے بعد ۱۰۵۶ھ میں شہزادہ اورنگ زیب بہادر کو بلخ وبدخشان کی ولایت پر مامور کرکے علی مردان خاں کو اس کے ہمراہ کیا گیا، جب وہ بلخ پہنچا تو معلوم ہوا کہ عبد العزیز خان والی بخارا اور نذر محمد کے فرزند نے جیحوں کی سمت اوغلی بیگ کو تورانی فوج کے ساتھ پہلے ہی روانہ کردیا ہے، اور وہ اپنے باغچہ میں خیمہ زن ہے، چنانچہ جب اورنگ زیب بلخ میں داخل ہوا تو ازبکوں اور مغلوں میں بڑی جنگ ہوئی، عبد العزیز ایک ہی دن میں جیحون کے پار ہوگیا اس کے بہت سے ہمراہی ڈوب گئے، لیکن بلخ اور بدخشان نذر محمد خاں کے قبضہ میں آگئے،

اورنگزیب اور علی مردان خاں مجموعۂ مکتوبات عالمگیر اعظم "آداب عالمگیری" میں اس کے سریر آرا ہونے کے قبل کے آٹھ خطوط علی مردان کے نام ہیں، ان میں علی مردان خاں کی خیریت دریافت کیگئی ہے، اور بعض تاریخی امور کی طرف اشارہ ہے، جنکا تعلق اورنگزیب سے ہے، انکا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے

(۱) شہزادہ محمد سلطان نے خلوص وعقیدت کا یقین دلایا، جس سے خوشی ہوئی، امید ہے کہ آپ اپنے حالات سے آگاہ کرتے رہیں گے، (۲) کشمیر کا آپ کا ارادہ مبارک ہو، یاد کرتے رہئے گا، (۳) راجور (کشمیر) کا زمیندار حیات سیہ (؟) جس کی زمینداری آپ کی جاگیر میں ہے میں اس کی سفارش کرتا ہوں کہ راجور کی زمینداری اسی کے پاس رہنے دیجائے تاکہ وہ اپنے وطن میں اطمینان کے ساتھ رہے، (۴) آپ کا خط پہنچا بہت خوشی ہوئی امید ہے کہ آپ اسی طرح اخلاص وعقیدتمندی کے خطوط ارسال کرتے رہینگے، (۵) حیات سیہ ہمارے خانہ زاد

اور پروردوں میں سے ہے، جب تک پرگنہ راجور ہماری جاگیر میں رہا وہ امن کے ساتھ رہا، اور اس سے پہلے عاملوں کی وجہ سے وہ وہاں ترک وطن کرکے ہمارے ہاں آگیا تھا، آب اس کا پھر ارادہ ہے کہ وہ موروثی زمینداری کی غرض سے پھر واپس جائے، ہماری خواہش ہے کہ آپ اس کی رعایت و مدارات میں پوری پوری کوشش کرینگے، (۶) عرصہ سے آپ کا خط نہیں آیا، ہمیں اپنے وکیل دربار سے معلوم ہوا ہے کہ آپ دربار میں آنے والے ہیں، اس محبت کی بنا پر جو مجھ کو آپ سے ہے میں امید کرتا ہوں کہ آپ خیر و عافیت سے مطلع کرتے رہیں گے (۷) آپ کی بیماری کی خبر سنکر بہت متفکر ہوں، عرصہ سے آپ کا کوئی خط نہیں آیا، ہماری خوشی اسی میں ہے، کہ آپ کی خیر و عافیت اور عقیدتمندی کے حالات معلوم ہوتے رہیں، اس لئے امید ہے کہ حسب دستور قدیم عریضہ نگاری کرتے رہیں گے، (۸) عین انتظار میں جبکہ ہم آپ کی صحت اور تندرستی کی خبر سننے کے منتظر تھے، آپ کا خط پہنچا، خیریت معلوم کرکے پورا اطمینان ہوا، امید ہے کہ بہت جلد کامل شفا ہو جائے گی، ہم نے بیجاپور پہنچکر قلعہ بیدر کا محاصرہ کرکے اس کو بہت جلد فتح کرلیا، اور زنگیوں کے لشکر کو شکست دے کر بیدر[1] کے قلعہ کو جس کی نظیر دکن میں نہیں ہے، ایک دن کے اندر اندر فتح کرلیا، گویا ایک مہینہ کے اندر اندر ولایت بیجاپور پر قبضہ ہوگیا، یہ سب خدا کی مہربانی ہے آپ اپنے حالات سے اطلاع دیجئے،

اسی طرح ایک خط بنام علی مردان خان انشار مادھورام میں ہے اس کے مضمون سے

---

[1] اس خط میں تاریخ ۲۲ جمادی الآخر لکھی ہے، مگر سنہ نہیں لکھا، قرائن سے ۱۰۶۶ھ معلوم ہوتا ہے کیونکہ اسی زمانہ سے قلعہ داروں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، میں نے حال ہی میں بیدر کی سیر کی ہے اسکے قلعہ کے دروازوں کی آہنی چادر پر اورنگزیب کے کتبے لگے ہوئے ہیں جو بعد کے ہیں مثلاً شہرزہ دروازہ پر چہار شنبہ ۲۹ رجب ۲۹ سنہ جلوس اورنگ زیب ۱۰۹۴ھ ہے،

معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس وقت اورنگزیب نے لکھا تھا جب وہ دکن کی مہم میں مصروف تھا

منم کہ بے توفیقش نزنم زہے محنت ؟ گر تو کنی ورنہ چیست عذر گناہ

" آپ کی صحت کی خوشی مجھے اس حد تک ہے کہ خیال اور قیاس کے پیمانے میں نہیں سما سکتی،
اس لئے اس کی تشریح چھوڑ کر مطلب کی طرف رجوع کرتا ہون، خدا کی مدد سے بد بخت
باغی کی تباہی اور اخراج کے متعلق اس سے پہلے تحریر کیا جا چکا ہے، چونکہ قلعہ دیوگڈہ ایک
اونچے پہاڑ پر واقع ہے، نقب اور بے خطر راستے سے وہاں نہیں جا سکتے، اس لئے تمام معاملہ
حضور پر نور کی خدمت میں گذار کر منتظر جواب ہون، بالفعل رسد کے راستے کو بند کرکے حملہ
کیا ہے قلعہ کے اوپر مورچے قائم کرکے لڑنا ہے، قلعہ میں بڑا ذخیرہ ہے، اس محاصرہ کا توڑنا
استقلال چاہتا ہے، اگر ایک بڑی فوج توپخانے سمیت مدد کے لئے بھیجدیجائے تو دشمن
کی فال انجام کار مستحقان ملک پر پوری ہو گی، مین نے جو تدبیر سوچی ہے اگر اسے بارگاہ
عالی مین عرض کر دیا جائے، تو سلطنت کے لئے بہت مفید ہوگا، زیادہ خیر باد "

تصاویر متعلقہ علی مردان خاں	علی مردان خانؒ کی مغل قلم کی دو بہترین تصویرین ڈاکٹر کمارا

سوامی نے عرصہ ہوا شائع کی تھیں، یہ تصویریں بابو سیتا رام بنارسی کے مجموعہ کی ہیں، ان میں
سے ایک تصویر کے متعلق ڈاکٹر کمارا نے لکھا ہے کہ وہ بادی النظر مین کسی بڑی تصویر کا نصف
حصہ معلوم ہوتا ہے، کیونکہ ایک طرف امراء اور نوبت خانہ کی تصویر ہے، اور دوسری طرف بالکل
خالی ہے، اس کے جواب میں دوسری طرف بھی کوئی تصویر ضرور ہو گی، لیکن میرا خیال
ہے کہ یہ تصویر مکمل ہے، اور اس وقت کی ہے جب علی مردان خان نے پہلی مرتبہ

ڈ THE YEAR BOOK OF ORIENTAL ART 1924-25

دو مغل تصاویر علی مردان خاں، از ڈاکٹر کمارا سوامی، صفحہ ۹۹،

بطور تعارف شاہجہان کا لاہور کے دروازہ پر استقبال کیا تھا اور اس کے ہمراہ قلیچ خان اور دوسرے امرا تھے، تصویر کے نیچے تمام گھوڑے دکھائے گئے ہیں، ان میں سے دو سوار کی تصویروں پر کچھ لکھا ہوا ہے، ایک پر قلیچ خان معلوم ہوتا ہے، جسے کمار اسوامی نے گنج علی خان پڑھا ہے، کیونکہ علی مردان خان کے والد گنج علی خان کا اس تصویر مین کوئی امکان نہیں ہوسکتا، اور وہ اس سے بہت پہلے فوت ہو چکا تھا، کمار اسوامی کا خیال ہے کہ یہ قندھار کی فتح کی تصویر ہے جب گنج علی خان کو کرمان سے تبدیل کر کے یہاں کا حاکم مقرر کیا گیا تھا، اس صورت میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ممتاز شخصیت جو اس تصویر میں دکھائی گئی ہے وہ علی مردان خان کی ہے جو کسی قدر خم ہو کر ایران کے طریقہ پر سلام بجا لا رہا ہے، اور اس کے چوغہ پر صاف علی مردان خان لکھا ہے، پھر والد کی موجودگی میں لڑکے کا امتیازی درجہ ناممکن سا معلوم ہوتا ہے،

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ شاہجہان نے علی مردان خان کو جو گھوڑے اور ہاتھی عنایت کئے تھے وہ بھی اس تصویر میں دکھائے گئے ہیں، اور موتیون سے مرصع دستار اور دوسرے ساز و سامان بھی اس میں نمایاں ہیں، جو علی مردان خاں ہی کو مرحمت ہوئے تھے، اس لئے میرے نزدیک یہ شاہجہاں سے پہلی ملاقات کی تصویر ہے، اس میں قلیچ خان اور سعید خاں کی تصویریں بھی ہیں، جن کی کوشش سے علی مردان خان ہندوستان آیا تھا،

دوسری تصویر میں کہیں علی مرداں خاں کا نام نہیں ہے، اسے علی مردان خاں کی تصویر قرار دینا کمار سوامی کا محض قیاس ہے، یہ تصویر دراصل ہاتھیوں کی جنگ کی ہے، جو میرے خیال میں علی مردان خان کے ہندوستان آنے سے پہلے قلعہ آگرہ کے باہر میدان

میں ہوئی تھی اور شاہجہان اور امراے دربار نے دیوان خاص میں بیٹھکر تماشہ دیکھا تھا، جیسا کہ اس تصویر سے ظاہر ہوتا ہے، اس تصویر پر مصور کا نام "خانہ زاد بلاقی" ملتا ہے[1]، اور ہاتھیون کے نام بھی لکھے ہین، جو صاف نہین ہین،

اسی طرح ایک تصویر کلکتہ میوزیم میں ہے جس کی اصل میں نے دیکھی ہے، اس کا عکس مسٹر براون نے اپنی کتاب مین شائع کیا ہے[2]، اس میں علی مردان خان ایک گھوڑے پر سوار ہے، اور گھوڑے کے پیٹ پر سوار کا نام علی مردان خان لکھا ہے، اور دو ملزم جن کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، اس کے سامنے پیش کئے جا رہے ہین، اس کے علاوہ چند سوار بھی دکھائے گئے ہین، میرے خیال میں یہ اس موقع کی تصویر ہے جب علی مردان خان کو تسخیر قندھار کے لئے اورنگ زیب کے ہمراہ بھیجا گیا تھا، میدان کے نشیب و فراز سے اس کا اندازہ ہوتا ہے، اس کی ایک اور تصویر دہلی میوزیم میں اور ایک حیدرآباد میوزیم مین ہے،

ان تصویروں کے علاوہ اور بہت ایسی تصویرین ملتی ہین جنکے متعلق شبہہ ہوتا ہے کہ علی مردان خاں کی تصاویر ہونگی، مگر جب تک کوئی واضح ثبوت نہ ہو کچھ نہیں کہا جا سکتا،

علی مردان خاں کا علمی ذوق

علی مردان خاں ایک اعلیٰ علمی خاندان سے تعلق رکھتا تھا، اس لئے قدرۃً وہ علمی مذاق رکھتا تھا، چنانچہ وہ اکثر مراسلت میں شعر و سخن سے کام لیتا تھا، اس کے علمی ذوق کا اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ جب وہ ہندوستان میں شاہجہان کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے شاہ نامہ فردوسی کا ایک مصور نسخہ جو ایرانی قلم کا بہترین

---

[1] بعض تصاویر میں اس مصور کے دستخط یوں بھی ملتے ہیں، "خانہ زاد بلاقی بن ہوشنگ"۔

[2] INDIAN PAINTING UNDER THE MUGHOLS 1924-P.136 PLATE XLV(I)

نمونہ تھا، اور فخر الدین علی موسیٰ شیرازی مذاہب کا تیار کردہ اور مرشد شیرازی (۹۶۲ھ) کے قلم کا لکھا ہوا تھا، شاہجہان کی نذر کیا، میں نے پٹنہ میں خدا بخش کے کتبخانہ میں یہ نسخہ دیکھا ہے[1]،

قلعہ دہلی کے عجائب خانہ میں علی مردان خان کی ایک تلوار اب تک موجود ہے، جس پر ذیل کی تحریر ہے[2]:-

این شمشیر خاص از حضور عباس خلد اللہ ملکہ وسلطانہ علی مردان خاں سرفرازی یافت

اس کے دوسرے رخ پر یہ تحریر ہے،

"یا علی العلی، وزیر الملک نواب سعادت علی خاں بہادر ۱۲۱۴ھ"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں یہ تلوار نواب سعادت علی خاں کے قبضہ میں آئی، جنہوں نے اس پر اپنا نام کندہ کروا لیا، ان باقیماندہ نشانوں سے ہم ان لوگوں کے ذوق و رجحان طبیعت کا اندازہ لگا سکتے ہیں،

علی مردان خان کی وفات اور اسکا مقبرہ ۱۰۶۶ھ مطابق ۱۶۵۶ء جلوس شاہجہانی میں علی مردان خان کو اسہال کا مرض ہوگیا شاہجہان نے اسے کشمیر جانے کی اجازت دی لیکن ابھی وہ قاچھی واڑ کی منزل میں پہنچا تھا کہ داعی اجل کو لبیک کہا، اسکا لڑکا ابراہیم لاش کو کشتی کے ذریعہ لاہور لایا اور اس کی والدہ کے مقبرے میں ماں کے پہلو میں دفن کیا گیا، یہ مقبرہ علی مردان خان نے اپنی ماں کے لئے ایرانی طرز پر تعمیر کرایا تھا، آجتک یہ مقبرہ اسی کے نام سے مشہور ہے، اس مقبرہ کی عمارت کے متعلق تاریخ لاہور سے بعض حالات پیش کئے جاتے ہیں، جن سے اندازہ ہوگا کہ یہ عمارت کیا تھی اور کیا رہ گئی ہے، یہ واضح رہے کہ تاریخ لاہور کا مصنف خود بھی اپنے زمانہ میں لاہور کا ہندسی تھا،

---

[1] کتبخانہ بانکی پور خدا بخش نمبر ۳۵، [2] فہرست عجائب خانہ دہلی ۵۸، تلوار کے متعلق اطلاع مجھے ذاتی نہیں بلکہ ایک دوسرے شخص کے ذریعہ سے ملی ہے، جو ناقص معلوم ہوتی ہے، لیکن تلوار موجود ہے،

۔۔ مکان کے ذکر سے پہلے صاحب مقبرہ کا ذکر مقدم سمجھ کر لکھا جاتا ہے، علی مردان خاں عمارات کے کام میں ایسا استاد تھا کہ کروروں روپیے اس کے ہاتھ سے تعمیرات پر صرف ہوئے، علی مردان خاں کا باغ معروف بہ نولکھہ باغ لاہور میں اسکی یادگار تھا، جس کی اب صرف ڈیوڑھی باقی ہے، باقی عمارت سب برباد ہو چکی ہے[1]، دہلی کی نہر جو عین شہر میں بہتی ہے اسی شخص نے نکالی تھی[2]، نہر ہنسلی تا نور پور اسی نے کھدوائی تھی، اور اسکے ذریعہ باغ شالامار کو سیراب کیا، بڑی نہر فیروز پور جو دہلی سے ہانسی حصار کو جاتی ہے، اس نے دوبارہ درست کرائی، اس طرح اس نے ہزاروں عمارتیں بنوائیں، جنکا حد وحساب نہین، آخر ۱۰۶۶ھ میں فوت ہوا، اور اس جگہ مدفون ہوا جہاں اب مقبرہ بنا ہوا ہے"

اس کی وفات کا قطعۂ تاریخ جو کتاب گنجینۂ سروری المعروف بہ گنج تاج میں مندرج ہے، یہ ہے،

امیرے صاحب دولت مشیرے صاحب حشمت ... تمنا گوے علی مرد حق آگاہ مردان خاں
سفر چوں کرد زیں دنیائے دوں سوئے بقا (؟) ... ندا آمد بتاریخش کہ حق آگاہ مردان خاں
۱۰۶۶ھ

اسلامی حکومت کے زمانہ میں اس کے ساتھ کی خشتی عمارت مسجد وزیر خاں کے سوا دوسری نہ تھی، مگر شہر کی بربادی کے وقت یہ عالیشان مکان خاک میں مل گیا، اس کی چار دیواری کی اینٹیں لاہور کے کشمیری خشت فروش اکھاڑ کرلے گئے، باقی ماندہ عمارتیں سردار گلاب سنگھ بھوڑ نڈیہ نے گراکر اس کی اینٹیں چھاؤنی میں

[1] اب یہ بھی باقی نہیں ہے، محض نولکھا بازار کے نام سے ایک بازار موجود ہے، اور بس،
[2] اب دہلی کی یہ نہر بھی باقی نہیں ہے،

لگا دیں، اس چھاؤنی کا نام ونشان بھی اب باقی نہیں رہا، مکان مقبرہ سے شمال کی سمت میں ہے، اس کی عمارت نہایت عمدہ مقطع کاشی کاری کی بنی ہوئی ہے، سب عمارت خشتی ہے، محرابی چھتیں ہیں، اوپر کی منزل پر جانے کے لئے دو زینے ہیں، سکھوں کے زمانہ میں گوردت سنگھ کرنیل افسر پلٹن مصران والی نے اس ڈیوڑھی کو اپنا مسکن بنایا تھا، نواب علی مردان خاں کا اصل مقبرہ تین منزلہ ہے، ایک منزل تو زمین کے اندر بطور تہ خانہ کے ہے، یہ تہ خانہ نہایت وسیع ہے، اس میں تین قبریں ہیں، اس کی چھت قالبوتی گنبد نما ہے، اس تہ خانہ سے اوپر کی منزل میں ایک پختہ عالیشان مثمن چبوترہ پر گنبد کی عمارت ہے، اس کی شکل ہشت پہل ہے، اس کے آٹھ اطراف ہیں اور آٹھ عالیشان محرابیں ہیں[1] مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں اس عالیشان مقبرہ میں میگزین تھا جو گلاب سنگھ کی ماتحت فوج سے متعلق تھا، اس مقبرہ کی پہلی منزل میں سنگ سرخ اور سنگ ابری کی بڑی بڑی سلیں نصب تھیں جنھیں سکھوں نے سنگدلی سے اکھاڑ دیا تھا، پہلی منزل کے زینے سے جب آدمی اوپر جائے تو گنبد کی چاروں سمت پھر سکتا ہے، ہر ایک پہلو میں دریچہ دار عالیشان نشستیں بنی ہوئی ہیں، اور بیچ میں عالیشان گنبد ہے، یہاں جب کہ آخری چھت پر آدمی جاتا ہے تو ہر ایک گوشہ پر چھوٹے ہشت درے خوشنما گنبد سے نظر آتے ہیں، اور درمیان میں بڑا عالیشان گنبد ہے،

[1] لاہور میں یہ مقبرہ غالباً سنہ ۱۰۵۰ھ اور سنہ ۱۰۵۲ھ کے درمیان تعمیر ہوا، مگر اس کے بعد لاہور ہی میں آصف خان کا مقبرہ جہانگیر کے مقبرہ سے ملحق سنہ ۱۰۵۱ھ میں تعمیر ہوا، جو ہشت پہلو ہے ان دونوں مقبروں کی سطح کی پیمائش اور طرز ایک ہے،

اس مقبرہ کی عظمت وشان کا کچھ حد وحساب نہیں، اتنا بلند مقبرہ لاہور میں اور کوئی نہیں ہے، اب سرکار انگریزی نے براہ قدردانی مؤلف کتاب کی معرفت اس مقبرہ کی مرمت کرائی ہے، تاکہ کسی بھونچال کے صدمہ سے گر نہ جائے، سیڑھیاں بھی بنائی گئی ہیں، تہ خانہ بھی صاف کرادیا گیا ہے"[۱]

میں نے بارہا اس مقبرہ کو دیکھا اور جب دیکھا ایک نرالی شان پائی، اسکی کاشی کاری ایک خاص امتیاز رکھتی ہے، علی مردان خاں کی تمام عمارتوں کا خاص اہم پہلو یہی تھا، ابتک یہ مقبرہ محکمۂ آثار قدیمہ کے تحت میں ہے، اس نے اس کی حفاظت کے لئے نگران مقرر کردیئے ہیں، یہ ریلوے ورکشاپ کے حدود میں ہے، لیکن اس سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، اس کے لئے الگ راستہ بنا دیا گیا ہے،

اس مقبرہ کی عظمت وشان دیکھ کر عبرت ہوتی ہے کہ علی مردان نے اسے اپنی والدہ کے لئے بنوایا تھا، لیکن خود بھی اسی میں مدفون ہوا، یہ لاہور میں شالامار کی سڑک پر اس سے ایک میل کے فاصلہ پر گلابی باغ کے بالمقابل ہے، میں نے کنھیا لال کا بیان اس لئے نقل کیا ہے، کہ اس سے اندازہ ہوسکے کہ سکھ گردی نے لاہور کی کتنی اعلیٰ عمارتوں کو نقصان پہنچایا۔

شاہجہان اور اورنگزیب دونوں نے علی مردان خاں کی اولاد پر لطف وکرم کی نظر رکھی، انھیں اعلیٰ مناصب عطا کئے اور یہ خاندان نمایاں اور ممتاز رہا،

خاتمہ مصنف مآثر الامرا لکھتا ہے کہ علی مردان خاں نے اگرچہ خاندان صفویہ کے ملازم کی حیثیت سے نمک حرامی کی اور اس سے بے وفائی کرکے اپنے آپ کو مطعون کیا، لیکن ہندستان میں وہ اپنے حسن اخلاق قابلیت عقیدت کیشی، بہادری اور عقلمندی کی بدولت امرائے

---

[۱] تاریخ لاہور ص ۲۵، [۲] مآثر الامرا ص ۸۰۰ - ۹۵ ج ۲،

شاہجہانی سے بہت بلند مرتبہ کو پہنچا، اور بادشاہ کے مزاج میں بڑا رسوخ حاصل کر لیا، شاہجہان خطوط میں اس کو یار وفادار لکھتا تھا،

ہندوستان میں علی مردان خان کے کارنامے شاہجہانی عہد کی تاریخ کا نہایت روشن پہلو ہیں جو ہمیشہ یادگار رہیں گے،

علی مردان خان کا خاندان اور اسکے حالات میں ایک نادر قلمی نسخہ

مآثر الامراء میں امیر الامراء علی مردان خان کے چار لڑکوں کا ذکر ملتا ہے، ابراہیم یہ صوبہ دار بنگالہ تھا، عبد اللہ بیگ عہد عالمگیری میں گنج علیخان کے خطاب سے ممتاز ہوا، اسحاق بیگ و اسمٰعیل بیگ ایک ہزار و پانصدی منصب و ہشتصد سوار سے سرفراز ہوئے، یہ دونوں بادشاہ کے ہمراہ سموگڈہ کی جنگ میں شریک تھے،

مجھے اپنے مکرم و محترم فاضل بزرگ پروفیسر حافظ محمود شیرانی کے کتبخانہ سے ایک قلمی نسخہ ملا ہے جس میں علی مردان خاں کے کچھ حالات اور اس کے بعد کے خاندان کا پورا شجرہ موجود ہے، یہ رسالہ تاریخی حیثیت سے بہت اہم ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاندان ابتک ہندوستان میں کہاں کہاں آباد ہے، لیکن یہ کتاب بہت ناقص ہے، اور اس میں بہت سی غلطیاں ہیں، اس لئے اس کی تصحیح کے بعد کسی موقع پر اس کو شائع کیا جاے گا،

خیام

خیام کے سوانح، تصنیفات اور فلسفہ پر تبصرہ اور فارسی رباعی کی تاریخ اور رباعیات خیام پر مفصل مباحث اور آخر میں خیام کے چھ عربی و فارسی رسالوں کا ضمیمہ اور اس کے قلمی رباعیات کے ایک نسخہ کی نقل شامل ہے، خیام کے مباحث پر اس سے زیادہ مفصل، مکمل اور محققانہ کتاب ابتک نہیں لکھی گئی، قیمت مجلد للعہ، غیر مجلد عہ،

"منیجر"

ارمغانِ احباب

یعنی

دلی اور اس کے اطراف

آج سے پینتالیس برس پہلے

از مولینا حکیم سید عبدالحیٔ صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء

(۶)

روز دوشنبہ یازدہم شعبان، سہارنپور میں مولوی نظام الدین نے یہ کہدیا تھا، کہ حضرت میاں صاحب نگینہ میں حافظ عبدالکریم صاحب کے مکان پر فروکش ہونگے، مگر کل رات ہو جانے کی وجہ سے میں نے حافظ صاحب کا مکان تلاش نہیں کیا، آج صبح اٹھکر میں پوچھتا ہوا حافظ صاحب کے مکان پر آیا، آتے ہی معلوم ہوا کہ میاں صاحب پرسوں یہان سے بگلہ تشریف لے گئے ہیں، اور بگلہ یہان سے اٹھارہ کوس ہی، اور غالبًا اب بگلہ میں بھی نہ ہونگے، ارانگر گنج گئے ہونگے، کیونکہ فرماتے تھے، کہ بگلہ میں دو روز سے زیادہ ہم نہ ٹھیریں گے، اور دارانگر یہان سے بیس کوس ہے، راستہ بھی صاف ہے بجنور تک تشرم جاتی ہے، دہان سے پانچ کوس دارانگر ہے یکے برابر چلے جاتے ہیں، مجھ کو اب نہایت تشویش ہے، کہ اب کیا کرنا چاہئے، سفر کی طوالت کی یہ حالت اور خرچ کی تنگی کی وہ کیفیت، رمضان المبارک کو صرف پندرہ روز باقی ہیں، سفر کے جلد ختم کرنے کا مصمم عزم ہے، لیکن بغیر ملاقات کئے ہوئے جانا اور بھی قابلِ افسوس ہے، کہ اس قدر صعوبت بھی برداشت کی، اور ملاقات حاصل

نہ ہوئی، بہرحال اون سے اب مل ہی لینا ضرور ہے، حافظ عبد الکریم صاحب گو مصر اس بات پر ہیں
کہ میں نگینہ کچھ دن قیام کروں، لیکن یہ ان کی حسن ارادت کی بات ہے، قطعی رائے ان کی یہ ہے
کہ دو چار دن کے بعد دارانگر جانا چاہئے، امید ہے کہ میاں صاحب وہاں ضرور مل جائیں گے،
میرا دل سفر سے ایسا برداشتہ ہے کہ میں چاہتا ہوں آج ہی دارانگر چلا جاؤں، مگر حافظ صاحب نے
آدمی کو بھیجکر اسباب اٹھوا منگوایا، اور بطریق تنزل مصر اس پر ہیں کہ آج کسی طرح نہ جاؤ، خاطر
میزبان عزیز ہے، میں نے بھی ارادہ فسخ کیا، خدا کو منظور ہے تو کل علی الصباح شکرم پر بجنور
اور بجنور سے یکہ پر دارانگر جاؤں گا، پھر جو کچھ اللہ کو منظور ہو،

سید صاحبؒ کا فیض: حافظ عبد الکریم صاحب بہت نیک سن رسیدہ آدمی ہیں پچیس برس ہوئے انھوں نے میانصاحب کے ہاتھ پر بیعت
کی ہے، کہتے ہیں کہ ایکدن میاں صاحب فرماتے تھے، کہ حضرت امیر المومنین میں ایسا تصرف تھا کہ ایک صحبت میں
اندرونی کیفیت متغیر ہو جاتی تھی، چنانچہ جس وقت میں نے بیعت کی، اسی وقت مجھ پر اپنا
وجود منکشف ہو گیا، میں نے اپنے وجود کو دیکھ لیا، اور دو چار دن کے بعد جس وقت دل میں
نظر ڈالتا تھا سید صاحب ہی سید صاحب نظر آتے تھے حافظ صاحب کہتے ہیں کہ میں نے میاں صاحب
سے جب سے بیعت کی ہے، کبھی شرک و بدعت میں مبتلا ہونے کا اتفاق نہیں ہوا کبھی ایسا نہیں ہوا کہ
کوئی کام دھوکہ سے بدعت کا کر لیا ہو، پھر بعد کو معلوم ہوا ہو، کہ بدعت ہے، اور ندامت اٹھانی
پڑی ہو، پہلے میں مجلس مولد میں احیاناً شریک ہو جاتا تھا، مگر قیام نہیں کرتا تھا، ایک مرتبہ میں اپنے مکان
کے بالاخانہ پر سو رہا تھا، اس زمانہ میں آٹھ پنجابی آئے ہوئے تھے، وہ مولود پڑھتے تھے، اور سب ملکر
نعتیہ غزلیں اور قصائد پڑھتے تھے، دو بجے شب کو میری آنکھ کھل گئی، اس وقت وہ لوگ محلہ میں مولوی
امیر خسرو کی غزل پڑھ رہے تھے، مجھ کو اس وقت اس کے سننے سے نہایت رقت ہوئی، اور دل
میں میں نے خیال کیا کہ جس چیز سے قلب کی ایسی حالت پیدا ہو، اسکے کرنے میں بظاہر بہتری معلوم

ہوتی ہے، اسی فکر میں آنکھ لگ گئی، دیکھتا کیا ہوں کہ میں مدینہ طیبہ پہونچا ہوں، اور روضہ منورہ کے گرد لوگوں کا ہجوم اندر جانے کی فکر میں سب کھڑے ہیں میں روضۂ منورہ کے دروازہ پر حاضر ہوکر دستک دی، ایک شخص نے کواڑے کھولے، مگر نیم باز، اور مجھ کو اندر لے لیا، ان سب لوگوں نے گھسنے کا ارادہ کیا، مگر اس بزرگ نے دروازہ جلد بند کر لیا، میں نے ان سے کہا کہ ان کو بھی اندر لے لو، کہا ان کے آنے کا حکم نہیں ہے، یہ لوگ مبتدع ہیں، حضرت کی مرضی مولد میں نہیں ہے، اس کے بعد مجھ سے کہا، اس دریچہ میں جاکر ہاتھ بڑھاؤ مصافحہ ہوجائے گا، مجھ پر اس وقت عجیب حالت طاری تھی، میں روتا جاتا تھا، اور آگے بڑھتا جاتا تھا، آگے بڑھ کر ہاتھ بڑھایا تو مجھ کو مصافحہ نصیب ہوا، میں اس وقت سلام پڑھتا جاتا تھا، اور آگے، کہا حضرت کچھ ارشاد فرمائیے، فرمایا توحید پر قائم رہو اور اتباعِ سنت جہاں تک ہو سکے کرتے رہو، میں نے کہا حضرت کچھ لوگ باہر کھڑے ہیں اندر آنے کے مشتاق ہیں، فرمایا کہ ہم ان سے ناخوش ہیں، یہ لوگ مبتدع ہیں، مجلس مولد کرتے ہیں، گو اظہارِ عشق کرتے ہیں، مگر ہماری مرضی مجلس مولد کی نہیں ہے، اس وقت میرے دل میں آیا، کہ جب ایسے شخص سے کوئی ملتا ہے، تو کچھ نذر کرتا ہے، جیب میں جو ہاتھ ڈالا تو ایک چونی ملی، میں نے چاہا کہ اس کو وہیں رکھ دوں، لیکن پھر دل میں خیال آیا کہ یہ صورت چڑھاوے کی ہے اس واسطے میں آتے وقت اون بزرگ سے جنھوں نے دروازہ کھولا تھا، کہا کہ یہ آپ قبول کریں، انھوں نے انکار کیا، اور کہا مجھے اسکی حاجت نہیں میں نے کہا مجھ سے لے لیجئے، پھر آپ چاہیں کسی کو دیدیں، میرے اصرار سے انھوں نے لے لیا، اور میں باہر آیا، اس کے بعد حالت مجھ پر ایسی طاری ہوئی، کہ آنکھ کھل گئی، حافظ صاحب اس فقیر سے قسمیہ بیان کرتے تھے، کہ رات کو جو چونی میرے جیب میں تھی، صبح کو جو دیکھا، تو نہیں تھی، میں نے اپنے گھر میں دریافت کیا، انھوں نے قسم کھائی، کہ میں نے نہیں نکالی،

اس کے بعد کچھ سید صاحب کے ظہور وحیات کا ذکر ہوا، اس پر انھوں نے ایک عجیب و غریب قصہ بیان کیا، وہ کہتے تھے، کہ یہیں نگینہ میں ایک خانصاحب رہتے تھے، بڑے آزاد مزاج مگر نہایت سچے اور اپنی کمائی کا کھانا کھاتے تھے، ساٹھ ستر برس کی ان کی عمر تھی، ایک دن میں مسجد میں تھا، وہ بھی تھے، اکیلے مجھ سے کہتے تھے، کہ تم سچ سچ بتاؤ، کس سلسلہ میں ہو، میں نے کہا کہ میں سید احمد صاحب قدس اللہ سرہٗ کے طریقہ میں مرید ہوں، یہ سنتے ہی کھڑے ہو گئے، مجھ سے نہایت محبت کیساتھ معانقہ کیا، اور کہا کہ تم کو دیکھ کر پہلے ہی میری طبیعت راغب ہوتی تھی، میں نے کہا حضرت آپ کس کے مرید ہیں، کہنے لگے، حضرت سید صاحب کے، میں نے کہا، کہ آپ کی عمر ایسی نہیں ہے جس پر ایسا گمان ہو، کہنے لگے، کہ میری بیعت کا عجیب قصہ ہے، میں ٹونک گیا ہوا تھا، ایک دن طبیعت گھبرائی، شہر کے باہر نکل گیا، مغرب کے وقت ندی کے پاس تھا، میں نماز کے واسطے وضو کرنے لگا، اتنے میں پانچ آدمی اور آئے، اور انھوں نے بھی وضو کیا، وضو کرکے نماز پڑھنے لگے، میں بھی شریک ہو گیا، اس نماز میں مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہوئی جس کو میں ہرگز بیان ہی نہیں کر سکتا، میں نہیں جانتا کہ اس محویت میں میں نے رکوع اور سجدہ کس طور پر ادا کیا، جب نماز ہو چکی، تو میں نے پیش امام سے آگے بڑھکر پوچھا، کہ حضرت آپ کہاں کے رہنے والے ہیں، فرمایا کہ رائے بریلی کے، میں نے پوچھا کہ آپ کا اسم شریف، کہنے لگے کہ تم کو اس سے کچھ مطلب ہے، میں نے کہا حضرت فرمائیے تو سہی فرمایا سید احمد، میں نے کہا کہ میں بیعت کرنا چاہتا ہوں، فرمایا ٹونک میں محمد یعقوب کے ہاتھ پر بیعت کرو،

مولینا محمد یعقوب صاحب میں وہاں سے چلا آیا، اور پوچھتا ہوا میاں محمد یعقوب[ل] صاحب کی خدمت میں گیا، اس وقت تک میں سید صاحب کے حالات نہیں جانتا تھا، نہ میاں محمد یعقوب صاحب سے مجھ کو نیاز

[ل] شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کے نواسہ،

حاصل تھا مجھکو اُس زمانہ تک بیعت کا بھی کبھی خیال نہیں ہوتا تھا، نماز تو البتہ پڑھ لیتا تھا، جب میں نے میان صاحب کے پاس آکر بیعت کی استدعا کی تو انھوں نے فرمایا کہ تم یہان تک کیونکر آئے، اور مجھ سے کیونکر واقف ہوئے، اس وقت یہ قصہ مفصل بیان کیا، اس وقت وہ سن کر نہایت بے تاب ہو گئے، اور فرمایا کہ وہ حضرت امیر المومنین سید احمد ہیں اور ان کے حالات شرح و بسط سے بیان کئے اور کہا تم نے بڑی غلطی کی، جو ان سے بیعت نہ کی، اب اگر ایسا اتفاق ہو تو ان سے فوراً بیعت کر لینا اگر تمھاری قسمت نے یاوری نہ کی تو خیر تمھیں اختیار ہے، یہیں آکر مرید ہو جانا، میں ان کے حالات سنکر بہت پچتایا، اور پھر اسی جگہ اسی وقت آنے لگا حسنِ اتفاق سے اگلے دن کی طرح پھر مجھ کو ملاقات نصیب ہو گئی، اس وقت میں ان کے قدموں پر گر پڑا، میں نے کہا کہ اب مجھ کو بیعت کر ہی لیجئے آپ مسکرائے، اور مجھ کو مرید کیا، اور فرمایا کہ ایک ضرورت سے ہم یہان آئے تھے، وہ ہو گئی اب دوسری جگہ جاتے ہیں،

حافظ صاحب اس قصہ کو بیان کر کے کہنے لگے، کہ ناقل اس قصہ کے بہت سچے آدمی تھے، کبھی ان کی عادت جھوٹ بولنے کی نہ تھی، لیکن کہنے لگے، کہ ایک صاحب مولوی عبد اللہ صاحب مرحوم نامی یہان سے تین کوس کے فاصلہ پر رہتے تھے، اسی برس کی عمر تھی بڑے بزرگ تھے، جمعہ کے دن پیادہ پا نماز کے واسطے شہر آتے تھے، حضرت سید صاحب کے مرید تھے، اور غزا میں آخر تک شریک رہے تھے، وہ مجھ سے کہتے تھے، کہ سید صاحب شہید ہوئے ہیں، میں نے ان سے کہا کہ آپ نے شہید ہوتے دیکھا ہے، انھوں نے کہا نہیں لیکن اختتام جنگ کے دوسرے دن عام طور پر یہ خبر مشہور ہوئی تھی کہ حضرت امیر المومنین بھی شہید ہو گئے، اور بسیار میں دفن کئے گئے، اتنا مجھ کو خوب معلوم ہے، کہ سید صاحب کی ران مبارک میں گولی لگی تھی، لوگ آپ کو اٹھا کر ایک ٹیکرے پر لائے، اور پتھر پر بٹھا دیا،

حضرت مولینا سید احمد اور مولینا اسمٰعیل شہید کی شہادت کے متعلق بعض بیانات

اس کے بعد مولوی محمد اسمٰعیل صاحب نے میدان جنگ میں جانے کی اجازت چاہی، حضرت نے فرمایا کہ مولینا اس لڑائی میں ہماری فتح نہیں ہے، آپ نہ جائیے، آپ کے جہادِ لسانی سے انشاء اللہ تعالیٰ بندگانِ خدا کو بہت فائدہ پہنچیگا مولوی صاحب نے ہاتھ جوڑکر فرمایا کہ یہ سر تصدق کرنے کو لایا ہون، آپ مجھ کو اجازت ہی دیجئے سید صاحب خاموش ہوگئے، اور مولینا میدان میں گئے، ایک گولی آپ کے انگوٹھے میں لگی انگوٹھا کٹ گیا، آپ پھر تشریف لائے، سید صاحب نے پھر منع فرمایا، مگر مولانا نے پھر الحاح وزاری سے اجازت مانگی، اور تشریف لے گئے، مجھے یاد ہے کہ تین مرتبہ سید صاحب نے روکا، آخر کو مولینا اسمٰعیل صاحب کی پیشانی پر ایک زخم کاری لگا، اور آپ شہید ہوئے، اس وقت میدان کارزار ایسا گرم تھا کہ کوئی کسی کو نہیں پوچھتا تھا، سب لوگ منتشر ہو چلے، اس ٹیکرے پر سے ہمارا جب گذر ہوا، تو سید صاحب نہیں تھے، دوسرے دن معلوم ہوا کہ آپ شہید ہوئے، اور پسیار ین دفن کئے گئے کسی لڑکے نے آپ کی نعش مبارک پہچانی تھی،

حافظ صاحب کہتے ہیں کہ سوارہ میں مولوی محمد حسین صاحب ایک بزرگ سید صاحب کے مریدوں میں تھے تھوڑے دنوں میں ان کا انتقال ہوا ہے، وہ بھی غزا میں شریک تھے، ان سے ہیں ایک صاحب سے اس بارہ میں گفتگو ہوئی، انھوں نے کہا کہ میرے ہاتھ پر قرآن شریف رکھدو، سید صاحب شہید نہیں ہوئے غائب ہوگئے ہیں، اور پھر تشریف لائیں گے،

آج سارے دن ہم نگینہ میں رہے، اور حافظ صاحب سے اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں، ان سے میں نے پوچھا کہ میاں صاحب کے سلوک کا کیا طریقہ ہے، کہا کہ صرف ذکر لسانی کے طور پر بارہ تسبیح کی تلقین فرماتے ہیں لیکن اس کے استعمال اور مداومت سے خود بخود انوار و برکات نمایان ہوتے، توجہ ڈالنے کی ان کی عادت نہیں ہے، وہ خود فرماتے ہیں کہ یہ مجھ کو نہیں آتا، اتباعِ سنت

اور ہضم نفس پر دار و مدار طریقہ کا ہے، جب جاہ سے گھبراتے ہیں، مشیخت کی باتوں کو ناپسند کرتے ہیں، بے تکلفی سے جو دعوت کرتا ہے، اسکو قبول فرماتے ہیں،

ایک مرتبہ دعوت تھی، آپ کے ساتھ کچھ مریدین بھی تھے، ان میں سے ایک نے ایک ٹکڑا روٹی کا کتے کے سامنے ڈال دیا، حضرت بہت ناخوش ہوئے، اور فرمایا کہ اوس نے تمھاری دعوت کی تھی، یہ تم نے کس کی اجازت سے ٹکڑا اس کے سامنے ڈالدیا، تم دعوت کرنے والے سے معافی مانگو، اسی طور مریدوں کی بھیڑ بھاڑ میں آگے آگے چلنے سے منع کرتے ہیں، اندھیری رات میں چپکے اٹھے اور مسجد چلے گئے، لالٹین ساتھ ہونے اور مریدوں کے پیچھے چلنے سے بہت گھبراتے ہیں، نگینہ میں ان کے مرید بہت ہیں، اور قاضی محمد اسمعیل صاحب کے مرید بہت ہیں، ان بزرگوں نے اس روسیاہ کے آنے کی جب جب خبر سنی تو ملنے کو آئے اور قیام کے بارہ میں اصرار کرتے رہے، مگر عجلت کی وجہ سے قیام میرا نہیں ہوسکتا، کل ارادہ انشاء اللہ تعالیٰ روانگی کا ہے،

قاضی محمد اسمعیل صاحب قاضی محمد اسمعیل صاحب کا اس طرف بہت چرچا ہے، وہ مولوی شیخ محمد صاحب تھانوی مصنف انوار محمدی کے مرید تھے، اور انھوں نے سات برس کی عمر میں حضرت امیر المومنین سے بیعت کی تھی، بعد نشو و نما پانے کے پھر حضرت میاںجی نور محمد صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی، اور ذکر و شغل کی تعلیم پائی، اس وقت تک سہارنپور کے جس قدر قصبوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے وہاں ہر فرد بشر کو سید صاحب کا دم بھرتے پایا، جو ہے، ان کی محبت میں چور ہے، اور سب باتفاق کہتے ہیں، کہ ہم کو ایمان و اسلام کی سیدھی راہ انہی سے ملی ہے ورنہ برائے نام ہم مسلمان تھے، جتنے مشائخ ہیں، وہ سب اسی سلسلہ کو مقدم جانتے ہیں، میں نے اپنی عمر میں سید صاحب کا اتنا چرچا کہیں نہیں دیکھا، اس طرف کی مساجد عموماً آباد ہیں، ہر مسجد میں حمام گرم ہو رہے ہیں، ہر مسلمان کم از کم نماز و تلاوت کا

ضرور شائق ہے، میرے گمان میں ضلع سہارنپور کے اشرار ہماری طرف کے اخیار سے اچھے ہیں، اور اخیار کا کیا پوچھنا ہے، ان کی تو نظیر اس طرف نہیں ملتی، کسی رنگ میں ہیں، مگر خدا کی لو لگی ہوئی ہے، بے تکلف اور سچے دیندار مسلمان ہیں، مجلس وعظ معمور رہتی ہے، ابتدا سے انتہا تک نہایت شوق و رغبت کے ساتھ سنتے ہیں، ہماری طرف کے مسلمانوں کی طرح نہیں ہیں، کہ سو میں ایک مجلس وعظ میں بیٹھا ہے، اور دل میں ہی خیال رہتا ہے کہ اب اٹھوں تب اٹھوں، اگر موقع پایا کھسک گئے، اور اگر واعظ کی مروت سے بیٹھے رہے، تو دل میں دعائیں کر رہے ہیں کہ وعظ جلد ختم ہو، اکثر جھوٹا تکلف خمیر میں سما گیا ہے، بہرحال اللہ اپنے فضل سے ان کی ہدایت کرے اور توفیق نیک بخشے، حافظ صاحب نے فقیر سے بعض اعمال خاندانی کی اجازت حاصل کی، مثل "قول الجمیل" "ذخیر المسالک" کی، اور بھی اکثر لوگ مستفید ہوئے، ہر چند کہ یہ روسیاہ افادہ کے قابل نہیں ہے، شب کو نہایت آرام سے رہا،

روز سہ شنبہ شانزدہم شعبان صبح کو اٹھکر جلد جلد حافظ صاحب نے سوئیاں بھنوائیں، اور چاء کا سامان کیا، اوس سے فارغ ہو کر وہ اور بہت سے مخلصین شکرم تک آئے، مگر افسوس ہے کہ سواریاں جا چکی تھیں، اور ۸ بجے کی گاڑی پر میں جا نہ سکا، لیکن یہ معلوم ہوا کہ ایک شکرم بارہ بجے بھی چھوٹتی ہے، اسکے انتظار میں وہیں میں ٹھہر گیا، کیونکہ فی الجملہ یہاں سے شہر دور ہے، شہر واپس جا کر پھر آنا تکان سے خالی نہ تھا، حافظ صاحب کو میں نے اس حیلہ سے رخصت کیا، کہ آپ شہر جائیے اگر کوئی خاص دار انگریز تک ٹھہر جائے، تو بھیجدیجئے، حافظ صاحب گئے، ایک شخص غلام مولیٰ نامی میرے پاس رہ گئے، یہ عطر پھولیل وغیرہ کے دوکاندار ہیں، بیچارہ بارہ بجے تک میرے پاس بیٹھے رہے، میں نے کتنا کہا کہ آپ جا کر دوکان کھولئے، مگر حسن عقیدت کی وجہ سے نہ گئے، اور گئے تو ایک چھوٹے کنستر میں پھولیل اور ایک شیشی میں عطر لا کر پیش کیا، میں نے ہر چند انکار کیا مگر نہ مانے،

میں سمجھتا تھا کہ اس سفر میں یہ سلامت نہیں رہ سکتی، ان کا بھی نقصان ہے، اور میرے کام نہ آئیگا، مگر انھون نے ایک بھی نہ سنی، مجبور ہو کر مجھے لینا پڑا، بارہ بجے جب شکرم روانہ ہوئی، تو وہ رخصت ہوئے، بجنور تک شکرم کے چھ آنے پڑے،

تین بجے بجنور پہونچے، نگینہ سے بجنور پندرہ کوس ہی، وہان سے یکہ بارہ آنہ پر دارانگر تک گیا، چلتے وقت حافظ صاحب نے نہایت اصرار کیا تھا کہ آپ میرے مکان پر ٹھہرئیے گا، ایک خط اپنے بھائی اور والد کے نام لکھدیا تھا، ان کے والد خواجہ عبدالرحیم ابھی تک بقید حیات ہیں، بڑے بزرگ ہیں شاہ احسان علی صاحب کے مرید ہیں، اور شاہ صاحب مولینا عبدالحی صاحب[1] کے خلیفہ تھے،

دارانگر مغرب کے وقت دارانگر پہونچا، میرا قاعدہ ہے کہ اجنبی جگہ میں ہمیشہ سرائے میں ٹھہرتا ہون اس مرتبہ شامت جو آئی، تو مین نے خیال کیا، کہ حافظ صاحب نے بہت اصرار کیا ہے، اور ان کے والد ماجد بہت بزرگ آدمی ہیں، انھی کے یہان ٹھہر جاؤں اور نیز میں نے دارانگر کی جو حالت دیکھی، تو مجھکو گمان ہوا کہ اس ویران کدہ میں سرائے کیا ہوگی، اور نیز اتفاق سے معلوم ہوا کہ خواجہ صاحب یہان کھڑے ہوئے ہیں، میں نے انکو وہان روک لیا، وہ خدا جانے کسی فکر و خیال میں تھے، کہنے لگے کہ مجھ سے آپ کا کیا مطلب ہے، میں نے کہا کہ میں میان صاحب سے ملنے آیا ہون، کہنے لگے پھر میں کیا کرون، وہ یہان ہیں نہیں، جب آویں مل لینا، میں نے کہا یہ خط آپ کے صاحبزادے نے دیا ہے، اسکو تو لے لیجئے، کہنے لگے میں ضعیف البصر ہون خط لیکر کیا کرونگا، میں نے کہا پڑھوا کر سن لیجئے، کہنے لگے ان باتون سے کیا حاصل، تم اپنا مطلب کہو، میرے یہان ٹھہرنے کی جگہ کہان ہے، مجھ کو اس پریشان تقریر سے اتنی ذلت و خفت ہوئی، جو میں بیان نہین کر سکتا، نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا، دو چار گنوار کھڑے

[1] خلیفہ مولانا سید احمد بریلوی؟

ہو گئے تھے، ایک کی زبان سے نکل گیا، یہاں سرا سے بھی ہے، میں نے اس کو غنیمت کبری سمجھا، اور فوراً اکہ سے اتر کر سرا سے میں جا داخل ہوا، پھر خواجہ صاحب کی طرف توجہ بھی نہیں کی،

سرا سے کی حالت ناگفتہ بہ، ایسی ویران ایسی وحشت ناک جس کا پایان نہیں، چند جھونپڑیوں کا نام سرا سے رکھدیا گیا ہے، مگر یہ سچ ہے کہ اگر مصیبت خوشی سے برداشت کر لیجائے، تو وہ مصیبت نہیں رہتی، اور ناخوشی اگر ظاہر کیجائے تو وہ اس سے ٹل نہیں جاتی، میں نے خوشی سے خیر مقدم کیا، اور اکیلا تاریکی میں ماندگی کی وجہ سے پڑ رہا، وہ حافظ صاحب کا خط جیب میں تھا، دل مین آتا تھا کہ اب یہ خط ان کو نہ دون، نہ اپنے نام و نسب کا اظہار کرون، نہ انکے معذرت مانگنے سے ان کے مکان پر جاؤن مگر مجبور ہوں اپنے اس کمبخت رقیق دل سے،

عشا کے قریب خواجہ صاحب کے دوسرے صاجزادے سرا سے میں آئے، اور خواجہ صاحب کی طرف سے معذرت کرنے لگے، کہ ان کے ہوش و حواس کبر سنی کی وجہ سے بجا نہیں رہے، اور ابھی بیماری سے اٹھے ہیں، طبیعت قابو میں نہیں ہے، آپ معاف کیجئے، میں نے کہا کہ درحقیقت انکی خطا نہیں ہے، یہ واقعی قصور میرا ہے، خط آپکے نام تھا، میں ان کو کیوں دیتا تھا، میں نے یہ نہیں کہا کہ یہ میرا قصور ہے، کہ میں بے وقت ان کے مکان پر کیوں گیا تھا، بہرحال میں نے کہا یہ خط آپ لے لیجئے، اور مجھ کو از راہ عنایت یہیں رہنے دیجئے، مجھ کو یہیں آرام ہے، اور ایک عرض یہ بھی ہے کہ اس خط کے مضمون کا اظہار نہ فرمائیے گا، وہ اس تاریکی میں خط کیا دیکھتے، لیکر چلے گئے، تھوڑی دیر میں میں عشا کی نماز کو مسجد گیا، خواجہ صاحب بھی آگئے، میرا دل کانپ اٹھا جب اس واجب التعظیم پیر مرد نے روندھی آواز میں کہا، مولوی صاحب میری گستاخی معاف کیجئے، میں نے فوراً اٹھکر مصافحہ کیا، اور نماز کے بعد ان کے ساتھ انکے گھر گیا، وہ کھانا اور چائے لائے میں نے قبول کیا، اور لطف یہ کہ سوا ان دو چار قاشق سویئوں کے میں نے اب تک کھانا نہ کھایا تھا

اور کھانا کھانا بھی چاہتے تو اس ویران کدہ میں کیا مل سکتا تھا، کھانا کھاکر پھر میں سرائے واپس آیا، اور اس تاریکی میں تنہا رات بسر کی نہیں تنہا کیوں اختلاج خفقان مفارقۂ احباب تاریکی رفیق و مونس رہے ہے، نعوذ باللہ من ذلک بڑا رفیق خدا ہے، اللہ معنا حیث ما کنا،

روز چہارشنبہ ہفتہ ہم شعبان کل تو مجھ کو اپنی تنہائی و پریشانی کی وجہ سے کچھ اس بات کا خیال نہیں ہوا، آج مجھ کو بڑا صدمہ اس بات کا ہے، کہ جس سے ملنے آیا تھا، وہ یہاں بھی نہیں ہیں، سہارنپور سے نگینہ آیا، اور نگینہ سے بجنور، بجنور سے دارانگر اور سوء اتفاق یہ ہے کہ وہ بگلہ میں بیٹھے ہوئے ہیں، جو یہاں سے آٹھ کوس ہے، سہارنپور سے پانچ روپیہ لیکر آیا تھا، تین خرچ ہو چکے ہیں، دو باقی ہیں، وہ صرف اسقدر ہیں کہ میں بدقت پھر سہارنپور پہونچ جاؤں، اب ارادہ یہی ہے کہ آج کا دن یہاں قیام کروں، شام تک اگر آگئے تو فبہا ورنہ جیسا آیا تھا ویسا ہی سہارنپور لوٹ جاؤں، اگر خرچ ہوتا تو خیر آنے کی لاج ہوتی، کہ بگلہ تک چلا جاتا، مگر اب مجبوری ہے، اگر وہ نہ آئے تو واپسی کے وقت جیسا کچھ صدمہ ہوگا وہ ظاہر ہے،

دوپہر کو خواجہ صاحب سرائے آئے میں دریا کنارہ چلا گیا تھا واپس گئے، کئی مرتبہ اپنے بیٹے کو بھیجا میں جو گیا، تو پھر کھانا لاکر حاضر کیا، اور میں نے اس کو نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر قبول کیا، ورنہ اس ویران کدہ میں سوا بھوکے رہنے کے اور کیا ہو سکتا ہے، یہاں کے لوگوں کی جسقدر ضروریات ہیں، دو گنج میں جاکر پوری کرتے ہیں، جو یہاں سے کسی قدر قریب ہے، پھر خواجہ صاحب نے مکرر سہ کرر عفو تقصیر چاہی، اور مجھ کو نہایت دانشمندانہ نصیحتیں کیں، اور اپنے تجربہ کی باتیں بتائیں کچھ اقبالِ کے مقدمہ کا ذکر کرکے زمانہ کے نشیب و فراز سمجھائے، اس کا میں بہت شکر گذار ہوں، کھانا کھاکر میاں صاحب کا حال دریافت کرنے میں گنج چلا گیا، ان کے مریدوں نے جب سنا تو بڑی آؤ بھگت کی، سب بیچارے دہاتی اور کسان ہیں، وہ اس پر مصر ہوئے کہ آپ یہاں اٹھ آئیے میں نے کہا شام تک رہنے دو،

اسکے بعد تمہیں اختیار ہے، لیکن اتنی مہربانی کرنا کہ جس وقت میاں صاحب آجائیں، اسی وقت اطلاع کرنا، آب و دانہ کی کشش دیکھئے، کہ دن بھر ہم دارانگر میں رہے شام کا وقت ہے ہم مغرب کی نماز پڑھکر آئے معلوم ہوا کہ گنج کے لوگ تم کو لینے آئے ہیں، ہر چند کہ خواجہ صاحب کے صاحبزادہ نے اس وقت کی بھی دعوت کی تھی، مگر رات کی تنہائی سے میں گنج کے جانے پر راضی ہوگیا، تاہم قطع حجت کے واسطے میں نے ان لوگوں سے کہا کہ تم خواجہ صاحب کے صاحبزادہ سے اجازت لے آؤ تو میں چلوں، وہ جب پوچھ آئے تو میں ان کے ساتھ گنج آیا، شب کو میاں نظام الدین صاحب جو مجھ کو سہارنپور میں ملے تھے، ان کے بھائی علاء الدین نے اپنے یہاں مہمان رکھا، شب بہت آرام سے بسر ہوئی،

روز پنجشنبہ ہیجدہم شعبان　　صبح کی نماز میں عبداللہ جھوجی نے مجھ سے کہا کہ میرا تانگہ مکرپور تک جاتا ہے، وہاں سے بگلہ تین کوس ہے، آپ کا جی چاہے تو چلے جائیے، میں نے بھی مناسب سمجھا اور مکرپور تک اس تانگہ پر آیا، وہاں سے تین کوس بگلہ پیادہ پا دس بجے تک پہونچ گیا، بگلہ رئیس مقام ہے یہاں کے رئیس شیخ جلال الدین ہیں، انکی کئی کوٹھیاں اور محل سرا بہت اچھی بنی ہوئی ہیں،

میاں محمد حسین　　ان کے یہاں میاں محمد حسین[۱] صاحب مہمان تھے، میں جس وقت پہونچا تو وہ لیٹے ہوئے تھے، تحیہ مسنونہ کے بعد میں نے ان ہاتھوں سے مصافحہ کیا، جس نے بلا واسطہ ہمارے حضرت امیر المومنین سیدنا روح اللہ روحہ کے ہاتھوں سے مصافحہ کیا تھا، تعارف کے بعد مجھ سے فرمایا کہ آپ یہاں کیونکر آئے، میں نے سب قصہ بیان کیا، بہت خوش ہوئے، کہنے لگے، اچھا ہوا میں نے بھی آپ کو دیکھ لیا، میں نے پوچھا کہ آپ کی کیا عمر ہے، کہا ایک سو دس برس کی ہو چکی ہو یہ گیارھواں سال ہے، میں نے کہا حضرت سید صاحب سے کہاں نیاز حاصل کیا تھا، فرمایا بگمرہ میں میرے بھائی مولوی علاء الدین صاحب

[۱] میاں محمد حسین صاحب مرحوم نواح سہارنپور کے باشندہ اور سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔

کے پاس تشریف لائے تھے، میں نے کہا، کے دن رہے تھے، فرمایا مجھے یاد نہیں، کے دن رہے تھے، خاص غریب خانہ پر فروکش تھے، میں نے کہا، کہ آپ کتنے دن ہمراہ رہے، کہا بہت دنوں جنگ میں شریک تھا، بعد اختتام جنگ کے واپس آیا، سلطان محمد خان[1] نے جب دغا کی تھی، میں وہیں تھا، لوگوں نے حضرت امیر المومنین کو بہت سمجھایا تھا، کہ سلطان محمد خان کو پشاور کا حاکم نہ کیجئے، یہ افغان ہیں دغا کرینگے مگر سید صاحب نے اسی کو حاکم کر دیا، اس نے آخر دغا کی،

میں نے کہا کہ حضرت سید صاحب کے ظہور و حیات کے بارہ میں آپ کو کیا تحقیق ہے، فرمایا میرے خیال میں حضرت رحلت فرما چکے ہیں ورنہ اب تک ٹھہرتے نہیں، لیکن وہ شہید نہیں ہوئے، اگر شہید ہوتے تو ہم ضرور دیکھتے، ہم کو معلوم ہوتا، اور یہ ہم نے اپنے کانوں سے حضرت کو فرماتے ہوئے سُنا ہے، کہ سب لوگ کہیں گے احمد انتقال کر گیا لیکن احمد انشاء اللہ تعالیٰ پھر نکلے گا، اور کفار سے اس ملک کو پاک و صاف کریگا، اسی وجہ سے کوئی سو آدمی پہاڑ پر منتظر ہیں، میں نے کہا کہ سید صاحب کے بیعت لینے کا کیا دستور تھا، فرمایا کہ خطبہ پڑھتے تھے، اسکے بعد توبہ کراتے تھے اور چاروں خاندانوں کا نام لیتے تھے، میں نے کہا کہ تلقین ذکر کا کیا دستور تھا، کہا کہ مجھ کو کبرسنی کی وجہ سے اب کچھ یاد نہیں رہا، میں نے کہا کہ حضرت میں بہت دور سے اس غرض سے حاضر ہوا ہوں کہ جو کچھ آپ نے ہمارے حضرت سے حاصل کیا ہو، وہ مجھ کو عنایت فرمائیے، فرمایا، کہ میں نے کچھ حاصل نہیں کیا، اور مجھے کچھ نہیں آتا، میں نے کہا کہ آپ حضرت کے خلیفہ ہیں، کہنے لگے، کہ مجھ کو خلافت نہیں دی، خلیفہ مولینا عبد الحئی صاحب مرحوم تھے، میں نے کہا کہ آپ سلسلہ میں لوگوں کو داخل کرتے ہیں، فرمایا کہ صرف مجھ کو اسی قدر اجازت ہے، کہ میں مرید کر لوں اور خدا کا نام سکھاؤں، میں نے اپنے مافی الضمیر کو کئی بار عرض کیا، مگر ہر بار مجھ کو ناکامی ہوئی، ظاہری خاطرداری بہت کی،

[1] سلطان محمد خان حاکم پشاور جس نے پہلے حضرت سید صاحب کے ہاتھوں بیعت کی، پھر عین موقع پر سکھوں سے مل گیا،

کی گھر میں کہلا بھیجا کہ ہمارے پیر کے صاحبزادے آئے ہیں، کھانا جلد آئے، افسوس ہے، کہ اب کبرسنی کی وجہ سے بہت ہی مغلوب النسیان ہو گئے ہیں، دم بھر میں بات بھول جاتے ہیں، نقل و حرکت سے بھی معذور ہیں، چارپائی پر تیمم کے ساتھ بیٹھے بیٹھے نماز پڑھ لیتے ہیں، مگر سماعت و بینائی میں کچھ فرق نہیں ہے، بہت سچے اور مخلص آدمی ہیں، اپنے پیر کا دم بھرتے ہیں، کہنے لگے کہ میں نے پچاس ہزار آدمی ایک جگہ دیکھے، مگر اس شان کا آدمی نہیں دیکھا، جیسے حضرت تھے، اور کہنے لگے کہ دہلی میں مولینا شاہ عبد العزیز صاحب رحمہ اللہ نے فرمادیا تھا، کہ جس کو جو کچھ حاصل کرنا ہو وہ ان سے حاصل کرے، میرے پاس جو نعمت تھی، وہ اونھوں نے لے لی، مولینا محمد اسمٰعیل صاحب نے جب سنا تو وہ حاضر ہوئے، اور شکار بند اس وقت سے جو تھاما ہے، تو مرتے مرتے نہیں چھوڑا، راستہ میں حضرت فرماتے، مولانا خدا نے سواری دی ہے، سوار ہو لو بس جاکر سوار ہو جاتے ہیں قدم چل کر پھر اوتر پڑتے، اور شکار بند آکر پکڑ لیتے، پھر حضرت فرماتے، مولینا منزل تک سوار چلو ہاتھ باندھ کر عرض کرتے حضرت اسمٰعیل کو اتنی بھی مفارقت گوارا نہیں، میاں صاحب کہنے لگے کہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نبی تھے بے وحی کے، ایک شخص نے کہا حضرت آپ کی عمر اور سید صاحب کی ایک ہے، فرمایا کہ عمر سید صاحب کی ہے میری کیا عمر، میں ان کا غلام ہوں، اس لفظ کو مکرر کہتے رہے، دن بھر میں انہی کی خدمت میں رہا، شب کو انہی کے قریب سویا، دو بجے شب کو میری آنکھ کھلی دیکھا تو تہجد پڑھ رہے تھے،

روز جمعہ نوزدہم شعبان، صبح سے واپسی کی فکر تھی، میاں محمد حسین صاحب بھی گنج آنے کو تھے، کھانا کھا کر تانگہ پر سوار ہوئے، میں نے اسباب تانگہ پر رکھدیا، اور خیال کیا کہ اگر میں بھی سوار ہونگا تو ان کو تکلیف ہو گی تانگہ چھوٹا ہے، اور اسباب بہت ہے اسلئے کچھ دور تک اسکے ساتھ ساتھ پیادہ پا چلا، اس کے بعد میں نے خیال کیا، کہ تانگہ بہت سست رفتار ہے، اس وجہ سے آگے بڑھ گیا، اور عصر کے بعد گنج بفضلہ تعالیٰ پہونچ گیا، پیر میں چھالے پڑ گئے، آٹھ کوس

کتنے ہی ہلکے ہون، پھر بھی آٹھ کوس ہیں، سواری کے واسطے اسی وقت لوگوں سے کہدیا ہی، اگر خدا کو منظور ہے، تو کل انشاء اللہ تعالیٰ پھلت جاؤں گا،

روز شنبہ بستم شعبان رات ہی سے لوگ مصر تھے، کہ کل نہ جاؤ، ہر شخص چاہتا تھا، کہ وہ دعوت کرے، یہ سیدھے سادے لوگ دعوت کو فرض عین سے کم نہیں سمجھتے، میں نے رات ہی سے سواری کا انتظام کیا، مگر ان لوگوں کی سازش سے سویرے سواری نہ آئی، اور خواہ مخواہ مجھے رہنا پڑا، صبح کو مولوی نظام الدین کے بڑے بھائی غلام محی الدین صاحب کے یہاں دعوت ہوئی، آج تمام دن تعویذ لکھتے گذرا، شام کو بعد مغرب کے میں نے وعظ کہا اوس کے بعد عشا پڑھ کر کھانا کھایا، اس وقت بھی انھی بزرگ کے یہان دعوت تھی، ایک شخص گنگوہ کے جوان صالح قاضی زادہ یہان پولس میں ملازم ہیں نہایت نیک بخت، اونھوں نے نہایت اخلاص کے ساتھ استدعا کی کہ اسی وقت ان کی دعوت قبول کروں، مجھ کو ایسے بادیانت کی دعوت قبول کرنے میں کیا عذر تھا، لیکن مجبوری صبح کو دوسرے صاحب کہہ چکے تھے، تاہم میں نے کہا کہ آپ اُن سے اجازت لیں، اگر ان کو منظور ہو تو بہتر ہے لیکن وہ صاحب راضی نہیں ہوئے، آخر اس بات پر رائے قرار پائی، کہ صبح کو وہ ناشتہ دین،

میان محمد حسین کی زبانی سید صاحب کے بعض حالات

رات کو میان صاحب کی طبیعت درست تھی، سید صاحب کا ذکر کرنے لگے، کہا کہ میری بعیت کا یوں سامان ہوا کہ میری چچی نے خواب میں دیکھا کہ بحر ذخار میں کشتی چلی جارہی ہے، اور آتے آتے ان کے مکان کے پاس ٹھہر گئی، اس میں دو شخص بیٹھے ہوئے تھے، ایک ان میں سے اترے، اور دوسرے کشتی کو لیکر واپس گئے، صبح کو اپنے بیٹے مولوی علاء الدین صاحب سے انھوں نے یہ خواب بیان کیا، مولوی صاحب نے کہا اسکی تعبیر یہ ہے، کہ ایک شخص ظاہر ہوگا، جو سردار ہوگا، اور وہ یہاں بھی آئے گا، چند ہی روز

میں سید صاحب کا شہرہ ہوا، اور وہ دہلی سے اترے، مولوی علاء الدین صاحب نے اپنی والدہ سے کہا لو اب تعبیر ظاہر ہی ہوتی ہے، وہ سردار آتے ہیں، ان سے یہ کہکر خود پیشقدمی کے طور پر آگے آگے گئے، راستہ میں جا کر ملے، اور حضرت کو لیکر گھرہ آئے، کچھ زیادہ آدمی اس وقت ساتھ نہیں تھے، سو سوا سو کے قریب ہونگے، سید صاحب میرے بالاخانہ پر ٹھہرے اور شاید آٹھ دن رہے، وہاں سے پھر بڑھانہ تشریف لے گئے، اب تک اس مکان میں برکت ہی، ایک جن میرے پاس آیا کرتا ہے، اس کا نام ہے محمد یوسف، اسی بالاخانہ پر دراز کے راستہ گھس آیا تھا، کہنے لگا آپ کا غلام ہوں، میں نے کہا تم چلے جاؤ، مجھے ڈر معلوم ہوتا ہی، اس نے کہا آپ ڈرئے نہیں، میں تو آپ کا غلام ہوں، میں نے کہا کہ میں غلام نہیں رکھتا، تم جاؤ، یہ سب حضرت کی برکت ہے، جہاں جہاں حضرت کے قدم گئے ہیں، وہاں وہاں برکت کے آثار پائے جاتے ہیں، ایک جگہ حضرت تشریف لے گئے، اس قصبہ میں نو مسلموں کا محلہ پہلے ملتا تھا، انھوں نے حضرت کو روک لیا قاضی کے محلہ تک نہ جانے دیا، اب خدا کی قدرت دیکھئے، نو مسلموں کا محلہ نہایت سرسبز ہے، اور وہ لوگ بہت خوشحال ہیں، اور قاضیوں کا محلہ ویران پڑا ہوا ہے،

خواجہ شاہ محمد سلیمان ایک مرتبہ سفر میں حضور تونسہ خواجہ شاہ محمد سلیمان[1] صاحب کے پاس جانے لگے اثنائے راہ میں دو راہہ ملتا تھا، ایک راستہ تونسہ کو جاتا تھا، دوسرا عبد الغفور کو، حضرت سفید ٹانگھن پر سوار تھے، آپنے تونسہ کی طرف ٹانگھن کا منہ پھیرا، اوس نے دوسرے راستہ کو اختیار کیا، پھر آپ نے تونسہ کے راستہ پر لگایا بیس قدم چل کر پھر دوسرے راستہ پر ہو گیا، آپنے فرمایا مولینا مولوی محمد اسمٰعیل صاحب نے کہا، حضور! فرمایا کہ شاہ سلیمان میں کچھ کجی ہے، میرا ٹانگھن ادھر رخ نہیں کرتا، لہٰذا عبد الغفور کی طرف روانہ ہوئے، شاہ سلیمان صاحب کو اسکی اطلاع ہوئی، تو اسی وقت وہ

[1] خلیفہ مولانا نور محمد مہاروی آپ کے ذریعہ سرحد میں بڑی تبلیغ اسلام ہوئی،

عبدالغفور کی طرف چل کھڑے ہوئے، حضور جیسے ہی ناگھن سے اوتر کر خیمہ میں گئے تھے، کہ شاہ خواجہ محمد سلیمان صاحب پہونچے، ان کے مریدون نے حضرت کے مریدوں سے اطلاع کی کہ شاہ صاحب سلام کو حاضر ہیں، حضرت نے سنکر فرمایا کہ ہم سلام نہیں قبول کرینگے تھوڑی دیر میں پھر شاہ صاحب نے اطلاع کرائی کہ جس وجہ سے سلام نہیں قبول نہیں ہوتا اس سے توبہ کرکے حاضر ہوا ہوں، حضرت خیمہ سے باہر نکل آئے، اور بغلگیر ہوکر اندر گئے، وجہ بھی یہ تھی، کہ شاہ صاحب روشن چوکی سنا کرتے تھے،

حضرت سید صاحب کی ایک کرامت

ایک مرتبہ مولینا خیرالدین[1] صاحب نے آکر حضور سے اطلاع کی، کہ اب رسد نہیں ہے اور خزانہ میں بھی روپیہ نہیں ہے، حضور نے فرمایا، مولانا روپیہ آتا ہوگا، پھر فرمایا کہ میری ماٹھ سے تقسیم کرو، مولینا خیرالدین سن کر چپ ہو گئے، کہ ماٹھ میں کتنا ہوگا جس کی تقسیم کا حکم ہوا ہے، پھر فرمایا مولینا کیا دیر ہے، وہ چپ رہے، پھر آپ خود اٹھے، فرمایا کیل لاؤ، اور چادر ماٹھ کے منہ پر ڈھک دی، اور تقسیم شروع کی، چار دن برابر تقسیم جاری رہی، ایک کیل پکے سوا سیر کا تھا، چوتھے دن ماٹھ میں غلہ باقی تھا، اور قبل تقسیم کے بھی صرف آدھی ماٹھ غلہ تیار تھا، میری ساکا اٹھو

ایک مرتبہ جال کے درخت کے نیچے پیال پر ہم اور الٰہی بخش بڑھئی بکھرہ کا اور مولینا محمد اسمٰعیل صاحب بیٹھے گھنگنیاں چبا رہے تھے، اتنے میں ایک شخص نے آکر کہا حضور نے حکم دیا ہے کہ بالا کوٹ جلد توپ خانہ بھیجا جائے، مولینا محمد اسمٰعیل صاحب مدار المہام تھے یہ سنتے ہی جلد اٹھے، اور اٹھ کر جھک کے ایک مٹھی گھنگنیاں لیکر کھڑے ہونے لگے، جلدی کی وجہ سے گرے، ان کا گھٹنا زمین پر ٹک گیا، ہنسکر کہنے لگے، کھسر کر چاہے مسر کر یار لوگ تو تجھ کو چھوڑیں گے نہیں، اور کھاتے ہوئے آگے چلے، ادھر سے مولوی عبداللہ صاحب آرہے تھے، ان کے ساتھ پانچ چھ اور آدمی تھے، کہا یہ کون جاتا ہے، لوگوں نے کہا مولینا محمد اسمٰعیل ہیں، کہنے لگے کیسے بے ادب ہیں، راستہ میں

[1] مولوی خیرالدین صاحب شیرکوٹی سید صاحب کی فوج کے ممتاز مجاہد،

کھاتے ہوئے جاتے ہیں، مولینا نے ہنسکر فرمایا، کہ مولوی صاحب اچھا ہے، گواہی میں بندھے بندھے نہ پھریں گے، جب لوٹ کر آئے تو یاد نہیں ہم نے یا الٰہی بخش نے کہا مولینا آپ پر مولوی صاحب نے اعتراض کیا، آپ چپ ہو رہے، فرمایا کہ جاہلوں سے کون بھڑے، میں نے کہا حضرت یہ تو مولوی ہیں، فرمایا کہ گدھے پر کتابیں لاد دو، وہ مولوی تھوڑے ہو جاتا ہے،

سید صاحب کی زہر خورانی کا واقعہ

جب پشاور فتح ہوا، تو پہلے تھانہ اور تحصیل قائم کر دی گئی، اسکے بعد حضرت کی رائے یہ ہوئی، کہ سلطان محمد خان کو وہان کا حاکم کر دیا جائے، جن کی یہان پہلے حکومت تھی، افغان سرداروں نے عرض کیا، کہ ان لوگوں کا کچھ اعتبار نہیں ہے، یہ لوگ دغا کرینگے، مگر حضرت نے اسی کو پشاور کی حکومت عنایت فرمائی، اس دغاباز نے قبضہ پاکر حضرت کو مدعو کیا، اور جو پیالہ حضرت کے سامنے آیا اس میں زہر ملا دیا، مگر حضرت نے حسب معمول اپنے پیالہ سے ایک ایک قاشق سب کو تقسیم کر دیا، اور اس زہر کا اثر نہیں ہوسکا، دوسری بار گنڈیریوں میں زہر ہلاہل ملا کر دیا، تین گنڈیریاں کھائی ہونگی، کہ حالت متغیر ہوگئی، اس وقت افغانوں نے میان سے تلوارین نکال لیں، حضرت کے ساتھ اس وقت تین سو آدمی تھے، وہ سب سرفروشی کرنے لگے، ایک فیلبان کے دل میں خدا نے ڈال دیا، اوس نے مولوی محمد اسمٰعیل صاحب سے کہا کہ آپ کی شکست ہوگئی، مولوی صاحب کو بہت ناگوار ہوا، اس نے پھر دوبارہ کہا مولوی صاحب آپ کی شکست ہوگئی، سید صاحب کہاں ہیں، ان کو جلدی لے چلئے، مولوی صاحب یہ سُن کر بہت برہم ہوے، اس نے کہا آپ صاحبزادے ہیں، سید صاحب کو جلدی لائیے، یہ کہکر اس نے ہاتھی آگے بڑھایا، اور کہا کہ سید صاحب کو اٹھا دو، انھون نے کہا مجھ سے نہیں اٹھ سکتے، آخر کو ایک چادر بچھائی اس میں حضرت کو بٹھا کر اوپر سے چادر کے گوشے برابر کرکے گرہ دیدی، اور فیلبان نے ہاتھی کو ہولا دیا، اوس نے سونڈ پر اس کو اٹھایا، اور فیلبان نے جھٹ عماری میں بٹھا لیا، اور لیکر ہاتھی کو بھگایا، یہان تک کہ پشاور سے باہر نکل آئے، اب خدا کی قدرت

دیکھئے کہ سلطان محمد خان کا خاندان نیست و نابود ہو گیا ہے، اور اس فیلبان کی اولاد سر سبز بر سر عروج ہے، اسکے بعد کہنے لگے کہ ہمارے حضرت کے ہاتھ پر جس نے بیعت کی وہ ولی ہے، اور جو ان کی صحبت میں بھی رہا ہے، اس کا درجہ کسی طرح افراد و ابدال سے کم نہیں ہے، حضرت کا ایسا تصرف تھا، کہ جس نے ان کے دستِ مبارک پر بیعت کی، اسی وقت فنا فی الوجود کا مرتبہ اس کو حاصل ہو جاتا تھا، اور تھوڑی دیر یا دو چار دن کے بعد استعداد کے موافق فنا فی الشیخ ہو جاتا تھا،

روز یک شنبہ بست و یکم شعبان، آج بھی کل کی طرح سواری منگانے میں لوگوں نے تعویق کی، اور میری طبیعت ایسی برداشتہ ہے، کہ ایک دن کا قیام ایک سال معلوم ہوتا ہے، میں نے ہر چند سمجھایا مگر کچھ خیال میں لوگوں کے نہیں آیا، کہتے ہیں، کہ رمضان المبارک یہیں کرو، دو قاضی زادہ گنگوہ کے رہنے والے ہیں جنھوں نے ناشتہ کی دعوت کی ہے، اتفاق سے ناشتہ لیکر آ گئے، اور مجھ کو مضطر دیکھ کر سواری لے آئے، وہاں سے آٹھ بجے میں روانہ ہوا، بہت دور تک لوگ مشایعت میں آئے،

نگینہ دس بجے میں بجنور پہونچا، اور ۱۱ بجے وہاں سے روانہ ہو کر پانچ بجے نگینہ میں داخل ہوا، جس وقت حافظ صاحب کے مکان پر آیا، دیکھا تو مجمع کثیر تھا، اکثر اہل علم بیٹھے ہیں، مجھ کو دیکھتے ہی کسی نے حافظ صاحب سے کہا کہ وہ واپس آ گئے، یہ سن کر حافظ صاحب اور تمام حاضرین سر و قد کھڑے ہو گئے، مجھکو نہایت ہی ندامت ہوئی، اس کے بعد حافظ صاحب نے مجھ سے کہا کہ آپ مولانا احمد حسن[1] صاحب امروہی ہیں،

مولینا احمد حسن صاحب مجھ کو اس اتفاقیہ ملاقات پر عجب مسرت ہوئی، اور مولانا احمد حسن صاحب نے بھی نہایت ہی اظہار مسرت کیا، اور اپنی اولوالعزمی کی وجہ سے اس انکسار و تواضع سے ملے، کہ مجھ کو ویسے ہی شرمندگی ہوئی، جیسے دیوبند میں ہوئی تھی، مولوی صاحب نہایت ہی وسیع الاخلاق، خندہ پیشانی، خوش رو و خوش پوشاک ہیں، چائے جب مولوی صاحب کے سامنے آئی، تو انھوں نے میرے سامنے

[1] مولینا احمد حسن صاحب امروہی مولینا قاسم صاحب کے خاص تلامذہ میں تھے اور امروہہ کے مدرسہ میں مدرس اول تھے

بڑھائی، میں نے معذرت کی، آخرالامر انکار و اصرار کی یہان تک نوبت پہونچی، کہ مولوی صاحب نے اس بات پر مجبور کر دیا، کہ صرف ایک قاشق اس میں سے میں پی لون، اس روسیاہ سیہ کار نے پینے کو تو پی لیا لیکن از بس شرمندگی و ندامت کی وجہ سے سرگرانی ہوگئی، یہ کچھ دیر تک صحبت رہی، اس کے بعد مولوی صاحب رخصت ہوئے، یہ حضرت مدرسہ میں امتحان لینے کی غرض سے تشریف لائے ہیں امتحان ہو چکا ہے کل تشریف لیجائیں گے، اگر خیریت رہی تو کل ارادہ ہے کہ میں انشاء اللہ تعالیٰ ان سے ملنے ان کی قیام گاہ پر جاؤں گا، رات کو کھانا حافظ صاحب کے یہاں کھایا،

روز دوشنبہ بست و دوم شعبان صبح کو حوائج ضروری سے جب فارغ ہوا تو مخلصین نے وعظ کی فرمایش کی، میں نے بھی مناسب سمجھا کہ شاید کسی کو عمل کی توفیق ہو جاوے تو اس دنیا کے واسطے وسیلہ نجات ہوگا، وعظ سے فارغ ہو کر بازدید کی غرض سے مولینا احمد حسن صاحب کی قیام گاہ پر گیا، مولینا نے اپنے اخلاق عمیمہ و علوئے حوصلہ کی وجہ سے اس روسیاہ کی ایسی توقیر فرمائی جس کے قابل یہ ناقابل نہ تھا، وہان سے واپس آکر تھوڑی دیر قیام گاہ پر بیٹھا، اکثر ارادتمند ملنے کو آتے رہے،

میان بنوحجام | ایک بزرگ میاں بنو حجام سید صاحب کے دیکھنے والوں میں بقید حیات ہیں وہ بھی سنکر آئے، ان سے معلوم ہوا، کہ جب حضرت سیدنا روح اللہ روحہٗ ولایت میں فروکش تھے، اس وقت ان کا ذکر خیر سن کر یہ حضرت وہاں پہونچے، اور مرید ہوے، ان کے بھائی بھی اگئے تھے، وہ وہیں شہید ہوئے، تین برس یہ جہاد میں شریک رہے، اس کے بعد گھر واپس آئے تھوڑی دیر یہ بیٹھے رہے، مجھ کو آئینہ دکھایا اور کسب میں خدمت کو حاضر ہوا ہون، مجھ سے خط بنوا لیجیے مگر افسوس ہے کہ میں کل ہی خط بنوا چکا تھا، اس وجہ سے اس سعادت سے محروم رہا، میں نے کہا کہ آپ مجاہد و غازی ہین میرے واسطے دعا کیجئے، اور میرے تمام اعزہ کے واسطے انھون

نے دعائیں دیں، پھر میں نے کہا کہ خاص خاص وقتوں میں دعائیں کرتے رہئے، اس کا وعدہ کیا اور رخصت ہوئے، اس کے بعد یکے بعد دیگرے لوگ آتے رہے، سارا دن ملنے میں صرف ہوا، لوگوں کا از حد اصرار ہے، کہ میں کچھ دن قیام کروں، مگر طبیعت میری ایسی برداشتہ ہے، کہ باوجود ان کے اصرار اور اظہار محبت کے میں مجبور ہوں، دعوتوں کی یہ صورت ہے، کہ اگر عرصہ تک میں قیام کروں، تب بھی فارغ نہیں ہو سکتا، مجبور ہو کر میں نے کہدیا ہے کہ باخود ہا فیصلہ کر لیا جائے، چنانچہ صبح کو میاں عبد القیوم صاحب نے دعوت کی اور شام کو حافظ محمد ذکریا صاحب نے کی ہے،

نگینہ کی صنعت | بعد نماز عصر کے اس شہر کی سیر کو نکلا، نہایت آباد اور پر رونق شہر ہے، یہاں کی دستکاری تمام ہندوستان میں مشہور ہے، آبنوس، صندل، ہاتھی دانت کا کام خوب ہوتا ہے، خصوصاً آبنوس کا کام یہاں سے مخصوص ہے، ایک صندوقچہ دو دو سو تک کا یہاں بنتا ہے، بعض بعض قلمدان، عطردان، سنگاردان، کتاب دان دیکھ کر حیرت ہو گئی، کنگھیاں مختلف قسموں کی یہاں بنتی ہیں، کچھ سامان تحفہ تحائف کے واسطے میں نے خرید کر لیا، اور مغرب کی نماز جامع مسجد میں پڑھکر واپس آیا،

روز سہ شنبہ بست و سیوم شعبان، آج دعوت میں عجیب جھگڑا ہوا، کہ دو شخص متدعی ا[ور] مجھکو بارہ بجے کی گاڑی سے روانہ ہوتا ہے، اور وہ کسی طرح طے نہیں ہوتا، آخر کو میں نے دونو[ں] جگہ تناول کیا، یہاں کے لوگوں نے جس کشادہ دلی سے میرا خیر مقدم کیا ہے، میں اس کو بیان نہیں کر سکتا، ہر وقت انبوہ رہتا ہے، اور ہر شخص واسطہ دلاتا ہے، کہ کچھ دن قیام کرو، اور اگر رمضان یہیں کرو تو بہت ہی بہتر ہے، اور میری طبیعت نہایت برداشتہ ہے، بہر حال ۱۲ بجے سب کو مصر چھوڑ کر میں اسٹیشن آیا، یہاں تک مشایعت میں حافظ عبد الکریم صاحب میرے میزبان کے بیٹے او[ر] حافظ محمد ذکریا صاحب اور ڈاکٹر مکارم حسین صاحب اور میاں غلام مولی صاحب آئے میں نے

ٹکٹ کا روپیہ حافظ محمد ذکریا صاحب کو دیا، کہ سہارنپور تک ٹکٹ لے لو، ان بزرگ نے عجیب چالاکی کی، کہ صرف نجیب آباد تک کا ٹکٹ لیا، جب گاڑی پر ہم بیٹھ گئے، تو وہ اور ڈاکٹر صاحب بھی آکر بیٹھ گئے، اور کہا کہ ہم بھی نجیب آباد تک مشایعت میں چلتے ہیں، پھر یہ صحبت خدا جانے کب نصیب ہو گی، راستہ میں مجھ کو معلوم ہوا، کہ میرا ٹکٹ بھی نجیب آباد تک کا ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دوستوں میں ہیں مولوی نہال الدین صاحب اکبرآبادی اسسٹنٹ سرجن نجیب آباد؛ ان کے پاس مجھ کو لے جانا منظور ہے، کیونکہ میری روانگی کے بعد ان کو سُن کر میرے نہ ملنے کا نہایت رنج ہوتا، اور ان لوگوں سے شکایت کرتے، مجھ سے اس قدر ان لوگوں نے اصرار کیا، کہ میں مجبور ہو کر راضی ہو گیا، نجیب آباد پہونچکر ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی، بہت سنجیدہ متواضع وسیع الاخلاق ہیں، شفاخانہ ان کے قیام گاہ پر میں ٹھہرا ہوں، لوگ مصر ہیں کہ بعد نماز عشا کے وعظ بیان کیا جائے میں نے بھی قبول کر لیا ہے، چنانچہ حسب قرار داد بعد نماز عشا کے میں نے بیان کیا، وہاں سے آکر کھانا کھایا، اور شب کو ڈاکٹر صاحب کے یہاں قیام کیا،

نجیب آباد یہ شہر نواب نجیب الدولہ کا آباد کیا ہوا ہے، بہت آباد شہر ہے، مسلمانوں کی آبادی کم ہے، ہندوؤں کی کثرت ہے، اور زیادہ سیٹھ اور مہاجن رہتے ہیں،

وطن کی واپسی روز چہارشنبہ بست وچہارم شعبان، چھ بجے کی گاڑی پر سہارنپور روانہ ہوا، اور بارہ بجے سہارنپور پہونچا، ابتدائے سفر سے مصمم قصد تھا، کہ واپسی کے وقت پھلت اور علی گڈھ میں ضرور دو ایک روز قیام کروں گا، مگر نگینہ کے سفر میں اتنا وقت صرف ہوا، اور ماہ مبارک اس قدر قریب ہے کہ مجبوراً نہایت افسوس کے ساتھ وہ ارادہ ملتوی کیا گیا ہے، سہارنپور میں ملا عنایت اللہ صاحب تھانہ دار کے مکان پر چار بجے تک قیام کیا، وہاں سے اسٹیشن آیا، اور غازی آباد تک ٹکٹ لیا، پھر کو ملا، غازی آباد دس بجے رات کو پہونچا، یہاں پہونچکر معلوم ہوا، کہ گاڑی دوسرے دن دس بجے

روانہ ہوگئی، اس وجہ سے سرائے میں جاکر رات بھر رہا،

روز پنجشنبہ بست و پنجم شعبان دس بجے غازی آباد سے روانہ ہوا، اور چھ بجے شام کو اٹاوہ پہنچا، چونکہ بھائی صاحب سے پیشتر اقرار کیا تھا، کہ موقع ہوگا، تو اٹاوہ میں ایک دو روز ضرور قیام کرونگا، اس وجہ سے اسٹیشن سے اکہ کرکے ان کی فرودگاہ پر پہونچا، اتفاق سے بھائی جی بھی یہاں مل گئے، اور لطف یہ کہ جس گاڑی سے میں اترا ہوں، اسی پر ان کا ارادہ روانگی کا تھا، اتفاق سے رکگئے تھے، اب کیا عجب ہی کہ پھر مکان تک میرا ان کا ساتھ ہوجائے،

مسلمان اور آب رسانی

مس سی۔ شو ونزر (MISS C. SCHWEITZER) نے مندرجۂ بالا عنوان سے حیدرآباد کے اسلامک کلچر ۳۹ء میں ایک مقالہ لکھا تھا، اسکی تلخیص ذیل میں درج ہے۔

مسلمانون نے جب کوئی محل، باغ یا مقبرہ بنوایا تو اس میں پانی کی نمایش ضرور کی، ان کو پانی، خصوصاً آب روان سے بڑی شیفتگی تھی، اور اس فن کا انھون نے بہت ہی گہرا مطالعہ کیا تھا، ایسے مخطوطات اب بھی موجود ہین جن مین پانی کی چرخی، پانی کی کل اور پانی کی گھڑی وغیرہ کی تصویرین، اور پانی کو بلندی پر لیجانے اور پانی کے توازن کو قائم رکھنے کی تفصیل پائی جاتی ہے، اس سلسلہ کا قدیم ترین نسخہ (کتاب العنقۃ (؟)) ہے جس کو موسیٰ بن شاکر کے دو لڑکون محمد احمد اور حسن نے ۸۶۰ء مین لکھا تھا اس مین پانی سے متعلق سو سے زیادہ فنی ترکیبیں بتائی گئی ہین، مثلاً گرمابہ اور سردابہ اور مسطح کنوین بنانے کے طریقہ کا مفصل بیان ہے، اس مین پانی پینے کے بعض ایسے ظروف کا بھی ذکر ہے جن سے ترنم پیدا ہوتا تھا،

ہندوستان مین جب مسلمان آئے تو پانی سے زینت و آرایش کا مظاہرہ انھون نے ہر جگہ کیا، فتوحات کی مشکلات ختم ہونے کے بعد اس ذوق کی تکمیل میں انھون نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، قلعہ محل اور مسجد کی تعمیر کے ساتھ انھون نے باغ بھی بنوائے جن مین

پانی کے بہتر سے بہتر مناظر دکھائے گئے، اس سے تفریح کا بڑا روح پرور سامان پیدا ہوگیا،

مسلمانوں کے باغوں مین آب رواں کا چشمہ بہت ہی ضروری جز تھا، اس سے اسلامی تعمیرات مین نہ صرف ایک خوشگوار پہلو پیدا ہوگیا تھا، بلکہ باغ کا حسن منتہاے کمال کو پہنچ گیا تھا، بابر کہا کرتا تھا کہ انسان کی سب سے بڑی مسرت باغ ہے، چنانچہ ہندوستان کی گرم اور تیز دھوپ مین وہ دور دراز کی منزلین طے کرکے باغ کی تعمیر کے معائنہ کے لئے آتا تھا، اسکے نزدیک ہندوستان کی ایک بڑی خرابی یہ تھی کہ یہاں مصنوعی نہرین نہ تھین، اس لئے اس نے جابجا پانی کی چرخیاں بناکر مصنوعی چشمے جاری کئے اور خوشگوار اور متناسب تفریح گاہین بنوائین،

باغ مین پانی لانے کے مختلف طریقے تھے کبھی وہ لمبے نالہ کے ذریعہ سے لایا جاتا تھا، جو کئی حصون مین تقسیم ہوتا تھا اوس سے پانی باغ کے ہر گوشہ مین پھیل جاتا تھا، کبھی بہتے ہوے چشمہ مین بند باندھ کر باغ میں پانی رواں کیا جاتا تھا، جو صرف درختوں اور پودون کو سینچنے ہی کے کام میں نہیں آتا تھا، بلکہ باغ کی فضا اور اردگرد کے کمرون کو ٹھنڈا کرنے کے مصرف مین بھی لایا جاتا تھا،

مسلمانون کے باغون میں پھول ہوتے یا نہ ہوتے لیکن ان میں عمارت، درخت، سبزہ اور چشمہ کا ہونا ضروری تھا، ان کے بغیر باغ کی تعمیر فنی حیثیت سے مکمل نہیں ہوتی تھی، چشمے پتھر کی نہرون مین بہتے تھے، اور ان کے بیچ مین جابجا سبزہ اگا ہوتا تھا، اس نظام و ترتیب سے ہندوستان کی خشک اور سوکھی زمین مین ایک خوشگوار اور دلفریب نخلستان پیدا ہوگیا تھا،

ہندوون کی طرح مسلمانون کو محض تالاب کھود دینے سے تسکین نہ ہوتی تھی بلکہ

ان کے ذوق کی تشنگی فواروں کی ہلکی پھواروں، نہروں کی ترنم ریز موجوں اور چشموں کی چمکتی لہروں سے بجھتی تھی، جھرنوں کی تعمیر میں وہ اپنے حسنِ تخئیل سے کام لیتے تھے، گو مقامی مجبوریوں کی وجہ سے بعض اوقات ان کے ذوق کا مکمل مظاہرہ نہیں ہوتا تھا، لیکن عام طور سے باغوں میں خوبصورت اور ہلکے پھلکے فوارے ضرور ہوتے تھے، جن کا پانی پتھر کے بنے ہوئے نازک اور سبک آفتابہ میں گرتا تھا، یہ فوارے نہروں اور چمن کی روشوں کے بیچ میں یا کمروں کے فرش پر ہوا کرتے تھے، جس سے باغ کی زینت و آرایش کا مقصد بھی حاصل ہو جاتا اور پانی بھی استعمال میں رہتا تھا، دونوں صورتوں میں معمار اور سنگ تراش اپنی جدتِ تخئیل سے کام لے کر سنگ تراشی، مینا کاری، کاشی کاری، اور نقاشی کا بہترین نمونہ پیش کرتے تھے،

چشمہ کی سطح کثیر الاضلاع بنائی جاتی تھی تاکہ اس میں روشنی کے عکس سے تڑپ پیدا ہو، اس میں چمک ہو، اس کے لئے نہر کی تہ میں ماہی پشت جال ہوتا تھا، جس کے چھوٹے چھوٹے خانوں سے پانی ٹکراتا تھا، کبھی چشمہ کی تہ میں سیاہ پتھر کے پرپیچ و پرخم ٹکڑے پیوست کر دیئے جاتے تھے، جس سے بظاہر دھوکہ ہوتا تھا کہ پانی میں لہریں پیدا ہو رہی ہیں، کبھی ان پتھروں پر مچھلی کی شکلیں بنا دی جاتی تھیں، جو پانی کی لہر میں زندہ مچھلیوں کی طرح تیرتی نظر آتی تھیں، اس قسم کی صنعت دہلی، آگرہ، دکن اور خصوصاً اورنگ آباد میں "بی بی کے مقبرہ" میں دیکھی جا سکتی ہے،

قلعہ دہلی کی نہر رہائشی حصوں سے گذرتی ہوئی دیوان خاص میں پہنچتی تھی، اس میں پانی ایک حوض سے آتا تھا جو شاہی حمام کے اوپر واقع تھا، یہاں سے پانی ایک خمیدہ نل کے ذریعہ سنگ مرمر کے فرش پر بہتا تھا، نہر کے پانی سے آس پاس کا حصہ بہت ہی

سرور رہتا تھا، اور اس کی متحرک چمک ایک خوشگوار منظر پیش کرتی تھی اور اس کی دھیمی مترنم اور شیرین آواز سے فضا مین ایک روح پرور نغمہ گونجتا رہتا تھا، تفریح کے لئے شاہی خاندان کے افراد رنگین مچھلیون کی گردنون میں زیورات ڈال کر اس شفاف چشمہ مین چھوڑ دیتے تھے جن مین وہ تیرتی اور کھیلتی ہوئی بہت ہی بھلی معلوم ہوتی تھین،

مسلمانون نے پانی سے متعلق بعض عظیم الشان کارنامے بھی انجام دیئے ہین، اجمیر مین ایک جھرنا چشمۂ نور کے نام سے اب تک مشہور ہے، جہانگیر نے اس مقام پر ایک باغ بنوایا تھا، اس باغ سے وہ ایک جھرنا تارا گڈہ کی بلندی پر لے جانا چاہتا تھا، جو اگر مکمل ہو جاتا تو ہر زمانہ کے لئے ایک عجیب و غریب کارنامہ ہوتا، گولکنڈہ کے قلعہ مین مٹی کا ایک نل اب تک موجود ہے، اس کے ذریعہ سے پانی محل، باغ اور حوض مین ۴۰۰ فیٹ کی بلندی تک پہنچایا جاتا تھا،

پانی کی انجنیرنگ کے کمال کی مثالین بیجاپور مین بکثرت دیکھی جاسکتی ہین، بیجاپور ایک خشک مقام ہے، مگر مسلمانون کے عہد مین یہان دون اور بھیم دریا سے پانی لاکر اس کو ایک خوشگوار جگہ بنا دیا گیا تھا، تور دو نہر کے ذریعہ سے یہان پانی چار میل کے فاصلہ سے آتا تھا، جو انجنیرنگ کی ایک بہت بڑی کامیابی تھی،

مسلمان کاریگرون کی ایک عمدہ صنعت بیجاپور کی ست منزل میں بھی پائی جاتی ہے، اس کی ہر منزل کے غسلخانہ اور حوض میں پانی نل کے ذریعہ پہنچایا جاتا تھا، وہان ایک دوسری عمارت مبارک خان کا محل تھا، اس میں بھی پانی کی بہترین نمایش کی گئی تھی، محل مین تین منزلین تھین، اور اس کے ہر حصہ مین نل کی بھول بھلیان تھی، عمارت کی کرسی کے ارد گرد مور کی شکل کے بریکٹ بنے ہوئے تھے، جو اوپر جاکر نل کی صورت

مین تبدیل ہو جاتے تھے، اور نل کے ذریعہ پانی چڑیون کی چونچ اور کلغی میں سے ہو کر گرتا تھا، دوسری منزل کی کارنس پر بھی اسی طرح نہر روان تھی، اور اس کے قبہ پر بھی پانی کا نل تھا، تیسری منزل پر ایک فوارہ تھا، جس وقت تمام فوارے کھول دیئے جاتے ہونگے اور نہر کا پانی بہ کر نیچے کے ایک تالاب مین گرتا ہوگا تو کتنا پر کیف اور دلفریب منظر آنکھوں کے سامنے ہوتا ہوگا،

مسلمانون نے حوض کے بیچ مین بھی پر تکلف عمارتین بنوائین، ان عمارتون کے چھوٹے چھوٹے سوراخون اور نلون سے پانی فوارون میں آتا تھا، جہان سے ہیرون کے ریزے کی طرح ہوا میں بلند ہو کر تالاب میں گرتا تھا، بیجاپور کے پاس کمالگی مین شاہی خاندان کے لئے ایک شکار گاہ تھی، یہان جھیل کے بغل مین بہت سے بنگلے تعمیر کرائے گئے تھے، جن مین پانی کی فراہمی کا پورا سامان تھا، موسم گرما مین شاہی خاندان کے افراد یہان تفریح کے لئے آتے تھے، اور شکار کھیلتے تھے، ان عمارتون میں کثرت سے حوض اور فوارے تھے، عمارت کی اندرونی چھت مین پتھر کے مشک گلاب کے پھول بنے ہوئے تھے، جن مین اوپر کی چھت کے حوض سے پانی آتا تھا، ان سے پانی کی پھوارین اس طرح اڑتی تھین جیسے آسمان سے واقعی بارش ہو رہی ہے،

مسلمانون کی عمارتون مین پانی کی بھول بھلیان بھی عجیب و غریب ہوتی تھی، ایک پتلی نہر پتھر کے فرش سے نکالی جاتی تھی، جو ہر سمت سے ہو کر گذرتی تھی، اور علیحدہ علیحدہ حصون مین تقسیم ہوتی تھی، مگر جس وقت اس مین پانی روان ہوتا تھا تو یہ ایک متحرک معما معلوم ہوتی تھی، پانی کبھی مخالف سمتون مین کبھی متصل نہرون مین، کبھی ادھر ادھر اور کبھی پیچ و خم کھا کر بہتا رہتا تھا،

مسلمان پانی کے دلفریب اور جمالیاتی پہلو سے اچھی طرح واقف تھے، انھوں نے شالامار کے پرتکلف دربار اور مزین چشمے میں زندگی کا اصلی لطف اٹھایا، مرنے کے بعد باغ کو اپنی آرامگاہ بنایا، جہاں کی زینت و آرایش سے ان کی روح کو سکون اور اطمینان حاصل ہے، زمانہ کے انقلاب و تغیر کے باوجود ان کی خوابگاہیں حوادث روزگار سے محفوظ ہین، اور آج بھی ان کی آرامگاہون کے فوارون سے جس وقت آفتاب کی سنہری کرنون اور ماہتاب کی سیمیں شعاعوں میں پھوارین بلند ہوتی ہین تو بے ساختہ باغ عدن کے صناع کے الفاظ زبان پر آتے ہیں کہ " یہ کس قدر بھلے ہین"۔

" ص ع "

اعصابی فساد کا علاج

ہم مین سے بعض اشخاص ایسے ہیں جن کو دنیا کی کوئی فکر لاحق نہین ہوتی ہے، وہ کسی فکر، خوف اور خطرہ سے مطلق نہین گھبراتے، یہ ان کی جسمانی صحت کی دلیل نہین بلکہ ان کی طبیعت ہی کچھ ایسی مضبوط واقع ہوتی ہے کہ ان کے ذہنی سکون مین انتشار پیدا ہی نہین ہوتا ہے، لیکن بعض اشخاص ایسے بھی ہین، جو معمولی سی فکر اور خطرہ سے بالکل منتشر اور پراگندہ خاطر ہو جاتے ہین، یہ ان کی صحت کی کمزوری کی علامت نہیں بلکہ اس کا تعلق ان کے اعصاب کے فساد سے ہوتا ہے،

اعصاب کا فساد فطری نہین، بلکہ ماحول کے اثرات سے پیدا ہوتا ہے، بچون کا ماحول جتنا زیادہ خوشگوار رہیگا، اتنا ہی زیادہ وہ اعصابی فساد سے محفوظ رہین گے اسلئے والدین کو اپنے بچون کی تربیت اور پرورش میں بہت زیادہ احتیاط رکھنے کی ضرورت ہے، عام طور سے والدین اپنے بچون سے یا تو غیر معتدل محبت کرتے ہین یا غیر معمولی

درشتی سے پیش آتے ہیں، دونون صورتیں بچوں کے لئے مہلک ہیں، بچوں کی نہ حد سے زیادہ
نازبرداری کیجائے، اور نہ ہروقت ڈانٹ ڈپٹ، بلکہ ان کی تربیت ایسی ہونی چاہئے
کہ وہ خود حالات کا اندازہ لگائین، اپنی زندگی کی پیچیدگیوں کو سلجھائیں، اور خودداری اور
عزتِ نفس کا احساس انین پیدا ہو، ان کی مدح وستایش کیجائے، لیکن یہ اعتدال سے نہ بڑھنے
پائے، طنز وتشنیع سے ان کو انکی حماقت اور کمتری کا احساس نہ دلایا جائے، بلکہ والدین
کا رویہ ایسا ہو کہ وہ یہ سمجھیں کہ ان کے والدین ان کے حاکم جابر نہین ہیں، بلکہ ان کے مہربان
دوست ہیں، جو ان کے قصور کو نظر انداز تو نہیں کرینگے، لیکن ان کی ہر حرکت پر خفا بھی
بھی نہ ہون گے، اگر والدین شروع سے اس قسم کی احتیاط رکھیں تو وہ اپنے بچون کو اعصابی
فساد سے محفوظ رکھنے مین ضرور کامیاب ہونگے،

یہ تو حفظ ما تقدم کی صورتین ہیں لیکن سن بلوغ میں بھی اعصابی فساد کا علاج ہوسکتا ہے
اگر کسی کو بات بات پر غصہ آتا ہو یا معمولی خطرہ سے اس پر غیر معمولی ہیبت طاری ہوجاتی
ہو، یا تھوڑی سی الجھن سے اس کے سر میں درد اور معدہ میں خرابی پیدا ہوجاتی ہو تو یہ کوئی
لاعلاج مرض نہیں، یہ تمام باتین مندرجہ ذیل نفسیاتی تدبیرون سے دور ہوسکتی ہین

(۱) جن اشخاص میں اعصابی فساد ہو ان کو وہ بلا تامل اس مرض کا اقرار کرلینا چاہئے
اس اعتراف میں کوئی ہرج نہین، کیونکہ ان کی طرح بہت سے اشخاص اس مرض کے شکار
ہوتے ہین،

(۲) وہ اس کا صاف صاف اظہار کرتے رہین کہ وہ غیر معمولی زود رنج، حساس اور
عصبی المزاج ہین، وہ اپنے اندیشہ، خوف اور ڈر کو ظاہر کرنے میں مطلق نہ شرمائیں، مثلاً اگر
وہ ریل کی سواری سے گھبراتے ہون تو سفر کرتے وقت مسافرون سے اپنی گھبراہٹ کو

چھپانے کی کوشش نہ کریں، بلکہ اگر ان میں ان کو کوئی ہمدرد نظر آئے تو اس سے اپنی حالت بیان کردینا چاہئے کہ "ہم کو ریل کے سفر سے ڈر معلوم ہوتا ہے، ہم جانتے ہیں کہ یہ ڈر مضحکہ انگیز ہے، لیکن پھر بھی ڈرتے ہیں" مگر اس اعتراف اور اقرار میں ایک احتیاط ضروری ہے، بعض اعصابی مریض ایسے ہوتے ہیں جو ہر وقت صرف اپنے اعصابی فساد کے متعلق گفتگو کرنا چاہتے ہیں، یہ چیز ان کے لئے مفید ہونے کے بجائے اور بھی مہلک ہے،

(۳) بعض اعصابی مریض اپنے مرض کے خلاف جنگ کرنے میں اپنی ساری قوتیں ختم کردیتے ہیں، جنگ کرنا دانشمندی نہیں، یہ امر واقعہ ہے کہ اس کے خلاف جنگ نہیں کیجاسکتی ہے جنگ کی کشاکش اور دباؤ سے مرض کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، اس لئے اعصابی فساد سے جنگ کرنے کے بجائے وہ اپنے ذہن کو مرتب، عمل کو منضبط، خیالات کو پر امن، اور اعتماد ذات کو مستحکم بنانے کی کوشش کریں،

(۴) انھیں اپنی ذات کو فراموش کرکے دوسروں کے متعلق زیادہ سوچنا چاہئے، اعصابی فساد کے مریض عموماً اپنے سارے خیالات کا مرکز اپنی ذات کو بناتے ہیں، وہ دنیا اور دنیا کے تمام لوگوں سے غافل ہوکر صرف اپنی ذات اور اپنے مرض کے متعلق سوچتے رہتے ہیں، جو ان کے لئے بہت ہی مہلک ہوتا ہے، اس لئے وہ اپنی ذات کے بجائے دوسرے لوگوں کی ذات سے دلچسپی لینے کی کوشش کریں، مثلاً جب وہ کسی صحبت میں شریک ہوں، تو وہ کوئی ایسا کام کریں، یا ایسی گفتگو کا سلسلہ چھیڑیں جس سے دوسرے لوگ محظوظ ہوں، یا کسی ایسے آدمی سے دوستی پیدا کرلیں جس کو معاشرت میں لوگوں نے نظرانداز کردیا ہو، تاکہ اس کی ذات سے دلچسپی و تعلق پیدا کرکے اپنی ذات کو بھول جائیں،

(۵) ان کو اپنا کام محنت اور ایمانداری سے کرنا چاہئے، اعصابی مریض اپنے کام

کی ذمہ داری، زیادتی اور سختی کا مبالغہ آمیز ذکر کرتے ہیں، جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ کام سے جان چرانا چاہتے ہیں، جو صحیح نہیں ہے، جو کام بھی ہو اس کو ہنسی خوشی سے انجام دینا چاہئے، تردد، رنج اور افسوس سے نہ صرف کام ادھورا اور نامکمل رہتا ہے، بلکہ اعصابی فساد بھی بڑھکر خطرناک صورت اختیار کر لیتا ہے،

(۶) ان کو کھیل اور تفریح میں ضرور حصہ لینا چاہئے، خصوصاً وہ ظرافت سے پورا لطف اٹھانے کی کوشش کریں، ذہنی مرض اور تکدر کو دور کرنے کی بہترین صورت ظرافت ہے، اس کے علاوہ اپنی کمزوریوں کے احساس، غلطیوں کے اعتراف، اور عاجزی وانکساری کی مزاولت سے اعصابی فساد خود بخود دور ہو سکتا ہے، یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اعصابی فساد مدتوں کا مرض ہوتا ہے، لہذا اس کے ازالہ کیلئے بھی ایک مدت درکار ہوگی، اگر مندرجۂ بالا نفسیاتی ترکیبوں پر صبر، سکون، اور استقلال سے عمل کیا جائے تو اعصابی فساد کی ناگواریاں اور عصبی المزاجی کی تلخیاں ضرور دور ہو جائینگی، "ص ع"

مختصر تاریخ ہند

ہمارے اسکولوں میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں، ان کا لب ولہجہ دلآزاری اور تعصب سے خالی نہیں ہوتا، اور اس وجہ سے ہندوستان کی مختلف قوموں میں تعصب اور بغض وعناد پیدا ہو جاتا ہے، مولینا ابوظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسوں اور طالب علموں کیلئے اس غرض سے لکھی ہے کہ اس کا طرز بیان قومی جذبات سے متاثر نہ ہو، اور ہندو اور مسلمان فرمانرواؤں نے ہندوستان کے بنانے میں جو کام کئے ہیں، وہ طالب علموں کو بلا تفریق مذہب و ملت معلوم ہو جائیں،

ضخامت ۲۰۰ صفحے، قیمت :- ۱۲ر "منیجر"

اخبار علمیہ

برقی انسان

واشنگٹن کی ایک بجلی کی کمپنی نے ایک برقی انسان بنایا ہے جس کی شبیہ سینما کے مشہور اداکار جون بیری مور کی سی ہے، وہ سات فیٹ لمبا، اور ۲۰۰ پونڈ وزنی ہے، اس کے جسم پر المونیم کا لباس ہے، اس کا بایاں گھٹنا جھکا ہوا ہے، اور اس کے پانوں میں پہیے لگے ہوئے ہیں آدمیوں کی طرح چلتا پھرتا اور کھڑا رہتا ہے، سلام کرتا ہے، انگلیوں کو خم کرکے دس تک گنتا ہے سرخ اور سبز رنگ میں تمیز کرلیتا ہے، بولتا اور گاتا ہے، اور اگر اس کے منہ میں سگریٹ لگا دیا جاتا ہے تو کش لگا کر ناک سے دھواں نکالتا ہے، جب اسے کوئی حکم دیا جاتا ہے، تو اسکی تعمیل کرتا ہے یہ سارا کرشمہ بجلی کا ہے،

مگر ابھی اس میں بعض نقائص باقی ہیں، جب اس سے کچھ کرنے کے لئے کہا جاتا ہے، تو وہ الفاظ کو نہیں سمجھتا ہے، لیکن مخارج کی صحت کے ساتھ حروف تہجی کو سن کر متحرک ہوجاتا ہے اگر الفاظ صحیح طور سے ادا نہیں کئے جاتے، تو یا تو وہ حکم کی تعمیل کرنے ہی سے قاصر رہتا ہے یا اس کو غلط طریقہ سے کرتا ہے، ایک بار جب پٹسبرہ میں اس کی نمایش کیجارہی تھی، تو اسکے موجد جے۔ ام۔ بارنٹ نے اسے ہاتھ اٹھانے کے لئے کہا مگر وہ خلاف توقع پیچھے کی طرف چلنے لگا، بارنٹ بہت خفیف ہوا، اور اس کو ٹھہر جانے کا حکم دیا، لیکن وہ پیچھے ہی ہٹتا

گیا، آخر بارنٹ نے بجلی کا تعلق منقطع کر دیا، اور وہ رک گیا، بارنٹ کو بعد میں معلوم ہوا، کہ اس نے حکم دیتے وقت الفاظ صحیح طور سے ادا نہیں کئے تھے،

ممالک متحدہ امریکہ کے گریجویٹ

ممالک متحدہ کی ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۵ء تک کے گریجویٹوں کا جائزہ لیا گیا، تو معلوم ہوا کہ ۹۵ فی صدی مستقل یا عارضی طور سے برسرروزگار ہیں، اور دو فیصدی مرد اور ایک فی صدی عورتیں بیکار رہتی ہیں، ہر تین عورت اور ہر چار مرد گریجویٹ میں سے ایک کو حسب منشاء ملازمت مل جاتی ہے، لیکن مردوں میں سے ۱/۲ اور عورتوں میں سے ۱/۳ کو ان کے ذوق کے خلاف نوکریاں ملتی ہیں، یہ نوکریاں ۱/۳ کو تلاش و جستجو، ۱/۵ کو کالج کے دفتر کے ذریعہ ۱/۴ کو کالج کی زندگی کے تجربات ۱/۲ کو خاندانی اثرات اور دو فی صدی کو دوستانہ تعلقات سے ملتی ہیں، ۱/۴ تجارت یا کوئی آزاد پیشہ اختیار کرتے ہیں، ان میں سے ۱/۳ آٹھویں سال اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر خود مالک بن جاتے ہیں، ایک گریجویٹ کو پہلے سال ۱۳۱۴ ڈالر آمدنی ہوتی ہے لیکن آٹھ سال کے بعد ۲۳۰۳ ڈالر تک پہونچ جاتی ہے، گریجویٹ عورتوں کی اوسط آمدنی پہلے سال ۱۰۹۲، اور آٹھ سال بعد ۱۴۰۰ ڈالر ہوتی ہے، مردوں میں سب سے زیادہ آمدنی (یعنی ۲۵۰۰ ڈالر سے زیادہ) ڈنداں سازوں، ڈاکٹروں، معماروں، انشیورنس کے ایجنٹوں، اور وکیلوں کو ہوتی ہے، اخبار نویسوں اور مذہبی پیشواؤں کی آمدنی سب سے کم ہے، ۱۷ فی صدی گریجویٹ تعلیمی شعبہ میں جاتے ہیں، جن کی آمدنی آٹھ سال کے بعد ۲۰۰۰ ڈالر تک پہونچ جاتی ہے، عورتوں کو سب سے بڑی آمدنی نرسنگ اور معلمی کے پیشہ سے ہوتی ہے،

مرد گریجویٹ میں سے ۳/۴ اور عورتوں میں سے ۱/۲ متاہل ہوتے ہیں، گریجویٹ ہونے کے آٹھ سال بعد تک ۱/۴ مرد کنوارے اور ۱/۲ عورتیں کنواری رہتی ہیں، ازدواجی زندگی میں داخل

ہو جانے کے بعد ان میں طلاق کے واقعات عام آبادی سے نسبتہً کم ہوتے ہیں، ایک ہزار میں ۱۹ اسے زیادہ طلاق کی مثال نہیں ملتی، ۴۵ مرد گریجویٹ اور اس سے زیادہ عورتوں کو کوئی اولاد نہیں ہوتی،

ممالک متحدہ امریکہ کے اسکول

ممالک متحدہ امریکہ میں بچوں کی تعلیم جبری اور لازمی ہے، لیکن ۱۹۳۰ء میں آٹھ لاکھ بچے ایسے تھے، جن کے لئے کوئی اسکول نہ تھا، وہ ایسے نادار علاقوں میں رہتے تھے، کہ وہاں اسکول کا قائم ہونا مشکل تھا، ملک کی اقتصادی کسادبازاری، اور حکومت کی مالی حالت کی خرابی کے باعث اسکول سے محروم رہنے والے بچوں کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی، لیکن گذشتہ تین برسوں سے حالت کچھ سدھرنے لگی تھی، کہ اس سال ملک کے اسکولوں کی مالی حالت پھر خراب ہوگئی، اوہیو کے بہت سے شہروں میں اسکولوں کا قیام مشکل ہو گیا ہے، جارجیا کے اسکولوں پر پچاس لاکھ ڈالر قرض ہے، اس کے دو سو اسکول جن میں بیس ہزار لڑکے تعلیم پا رہے تھے بند کر دیئے گئے ہیں، لاما میں اسکول سال میں صرف آٹھ مہینے کھلے رہتے ہیں، اور باقی چار مہینوں میں مالی مشکلات کی وجہ سے بند ہو جاتے ہیں، اس علاقہ میں حبشیوں کے بچوں کے اسکول بالکل بند کر دیئے گئے ہیں، پن سیلوینیا کے ⅓ اسکول اساتذہ کی تنخواہ نہیں دیسکتے ہیں، چنانچہ یہاں کے چھ ہزار اساتذہ کو دس مہینے سے تنخواہ نہیں ملی ہے، اسلئے وہ مجبوراً اسکول کے اوقات کے علاوہ دربانی اور کلرکی کے ذریعہ روزی کما رہے ہیں، حکومت سے امداد مانگی جاتی ہے، تو اسکی طرف سے کوئی خاطر خواہ جواب نہیں ملتا، گذشتہ اپریل میں، ۱۲ اسکولوں کے اساتذہ نے ہڑتال کے ذریعہ تنخواہوں کا مطالبہ کیا، عام طور سے یہ خیال ہے کہ ممالک متحدہ کے تعلیمی نظام میں وہ جمہوری روایات باقی نہیں رہی ہیں، جو آج سے سو برس پیشتر تھیں،

"ص ع"

غزل

از جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے ایل ایل بی

گلستاں میں فقط اک عندلیب زار ہوتی ہو ۔۔۔ چمن کی روح جس کی آہ سے بیدار ہوتی ہو
طبیعت آشنائے لذتِ آزار ہوتی ہو ۔۔۔ مری تقدیر قلب و روح کیا بیدار ہوتی ہو؟
محبت میں فقط دیوانگی درکار ہوتی ہو ۔۔۔ یہاں تمکینِ عقل و ہوش سب بیکار ہوتی ہو
نظر جب انبساطِ عشق سے سرشار ہوتی ہے ۔۔۔ تو بڑھکر فرشِ گل سے وادیِ پرخار ہوتی ہو
مری فریادِ غم میں ہے نہاں وہ شورشِ مستی ۔۔۔ کہ جس سے عالمِ جان کی فضا بیدار ہوتی ہو
نظر رکھتے ہوں جو آکر ہجومِ درد میں دیکھیں ۔۔۔ ان آنکھوں سے مری کیا ریزشِ انوار ہوتی ہو
مرے اس پردۂ دل میں ہے وہ اک آتشیں نغمہ ۔۔۔ کہ گرمِ رقص جس سے محفلِ اسرار ہوتی ہو
تلاش انکی نہیں دشوار گو لیکن یہ مشکل ہو ۔۔۔ کہ لذتِ جستجو کی مانعِ دیدار ہوتی ہو
نہ کچھ پروائے منزل ہو نہ فکر سود حاصل ہو ۔۔۔ عجب اہلِ جنون کی مستیِ رفتار ہوتی ہو!
نہ ان کی دید ہو آسان نہ ترک آرزو ممکن ۔۔۔ عجب مشکل میں دیوانوں کی جانِ زار ہوتی ہو
یہ مجھ سے پوچھئے اس درد میں کیا کیفِ لذت ہو ۔۔۔ کہ اسکی چوٹ سے رگ رگ مری ہشیار ہوتی ہو
تجھے معلوم پھر ان کی نوازش ہائے پنہاں کیا ۔۔۔ جفا تیرے لئے جب موجبِ آزار ہوتی ہو

خیراب تک نہیں ہو شکوہ سنج ہجر کو شاؔد ۔۔۔ یہ وہ غم ہو نہ ہو تو زندگی دشوار ہوتی ہو

یہ شغل جام کیا، وہ جرأت رندانہ پیدا کر ۔۔۔ کہ جس سے وادی کونین دم میں پار ہوتی ہو

نکل لیکر متاعِ جان و دل راہ محبت میں

کہ مغزا بڑی مشکل سے چشمِ یار ہوتی ہو

شورِ نشور

از

جناب نشور واحدی

میں محو طوف بھیم تھا لئے پیمانہ کعبہ میں ۔۔۔ معاذ اللہ وہ میری لغزش مستانہ کعبہ میں

جماعت کی نمازیں اور درو دیوار کی بو سے ۔۔۔ ملا رکھی ہو رسم مسجد و بتخانہ کعبہ میں

قسم ہو نرگس ساقی کو مستانہ اشاروں کی ۔۔۔ بہت یاد آئی مجھکو گردش پیمانہ کعبہ میں

بجائے دست ساقی چومتے ہیں سنگ اسود کو ۔۔۔ عجب ہو حسن کا معیار مخصوصانہ کعبہ میں

حدود شرع میں بھی دیکھنا پابندی الفت ۔۔۔ طواف شمع ہی کرتا رہا پروانہ کعبہ میں

اگر سجدہ نہ کرتا میں تو کیا کرتا کہاں جاتا ۔۔۔ خدا بن بن کے آیا جلوۂ جانانہ کعبہ میں

نشور آخر وہاں بھی رشتۂ ساقی نہیں ٹوٹا

تجلی بن کے آیا شاہد میخانہ کعبہ میں

رباعی

حکیم الشعراء امجد حیدرآبادی

از عقل تباہ کار نادانی بہ ۔۔۔ از خلعت پرغرور عریانی بہ

از سامانی کہ نخوت آرد در سر ۔۔۔ صد بار مرا بے سروسامانی بہ

مطبوعات جدیدہ

سیرت شہید کربلا (حصہ اول) مترجمہ مولینا محمد ایوب صاحب عثمانی تقطیع بڑی' ضخامت، ۲۵۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت:- عہ؍ پتہ:- مدرسہ معارف القرآن اورنگ آباد ضلع گیا،

مصر کے ایک اہل قلم علی جلال حسینی نے حضرت امام حسین علیہ السلام کی سیرت دو جلدوں میں لکھی ہے، پہلے حصہ میں آپ کی سیرت کے تفصیلی حالات ہیں، اور دوسرے میں واقعہ شہادت کا ذکر ہے، مولینا محمد ایوب صاحب نے ان دونوں جلدوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، اس کا دوسرا حصہ عرصہ ہوا شائع کر چکے ہیں، معارف میں اس پر ریویو بھی ہوا تھا، اب انھوں نے دوسرا حصہ شائع کیا ہے، اس کتاب کی دو حیثیتیں ہیں، ایک نفس کتاب کا پایہ، دوسرے ترجمہ کی حیثیت جہاں تک معلومات کا تعلق ہے، مصنف نے بہت سی کتابوں کی ورق گردانی کرکے بڑی محنت سے جزئی حالات کا استقصار کیا ہے، حضرت امام حسینؑ کی سیرت پر اردو میں مشکل سے کسی ایک کتاب میں اتنے حالات مل سکیں گے، لیکن اس کے ماخذوں اور واقعات کے انتخاب میں احتیاط نہیں کی گئی ہے، ہر قسم کی معتبر و غیر معتبر کتابوں سے رطب و یابس واقعات لیلئے گئے ہیں، ادبیات محاضرات، لغت و جغرافیہ حال کی تصانیف ہر طرح کی معتبر و غیر معتبر کتابوں جہاں جہاں سے حالات مل سکے ہیں، بے تکلف لے لئے گئے ہیں، حتی کہ شیعوں کی کتابوں سے بھی لینے میں تامل نہیں کیا

گیا ہے عقد الفرید اغانی، نوادر قیلوبی، زہرۃ الآداب حصری مغربی نہایۃ الارب، عجائب المخلوقات ابن فارس قزوینی، اسرار الحکم یاقوت مستعصمی کتاب الامامۃ والسیاستہ مجمع الامثال میدانی، لسان العرب لواعج الاشجان حسینی عاملی متوفی ۱۳۲۲ھ اسعاف الراغبین محمد بن احمد الصباغ، کافی، نہج البلاغہ، مقاتل الطالبین ریاض الجنان اور کتاب الاذکیاء وغیرہ، یہ صرف چند نام بطور نمونہ لکھدئے گئے ہیں، ورنہ اس قبیل کی اور بہت سی کتابیں ہیں شیعوں کی روایات کی وجہ سے اس میں بہت سے غیر معتبر واقعات داخل ہو گئے ہیں، لیکن ترجمہ برا نہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ مترجم نے الفاظ کی پابندی کا لحاظ رکھا ہے، اسلئے ترجمہ میں سلاست و روانی نہ پیدا ہو سکی، جابجا زبان کی غلطیاں نظر آتی ہیں، بہار کی مقامی زبان کا اثر نمایاں ہے لیکن ان خامیوں کو چھوڑ کر معلومات کے لحاظ سے یہ کتاب بہت جامع اور ان سیرتوں سے بہت بہتر ہے، جو عام طور سے اردو میں رائج ہیں۔

مدراس میں اردو مولفہ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۹۰ صفحے، کاغذ اچھا، کتابت وطباعت معمولی، قیمت ا۔ مجلد عہ، پتہ:- ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد دکن،

مدراس سے مسلمانوں کا تعلق نہایت قدیم ہے، جو کسی نہ کسی شکل میں ہر دور میں قائم رہا ہندوستان میں فاتح مسلمانوں کے آنے سے مدتوں پہلے عرب تاجر مالابار کے سواحل پر پہونچ چکے تھے، پھر دکن کی اسلامی حکومتوں سے پہلے معبر اور مالابار میں اسلامی ریاستیں قائم ہو چکی تھیں دکن میں اسلامی حکومتوں کے قیام کے بعد یہ تعلق اور زیادہ گہرا ہو گیا، پھر دور آخر میں خاص مدراس کے علاقہ ارکاٹ اور میسور میں نوابیاں قائم ہو گئیں، اسلئے اردو زبان کا تعلق بھی مدراس سے بہت قدیم ہے، خصوصاً دکنی حکومتوں کے زمانہ میں جن کے دامن میں اس زبان نے جنم لیا، یہ تعلق زیادہ گہرا ہو گیا تھا، آج بھی وہاں کے پڑھے لکھے مسلمانوں کی زبان اردو ہے، اور ادب و شاعری کا

خاصہ چرچا ہے، مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی نے اپنی مشہور تصنیف "دکن میں اردو" میں ایک مستقل باب "مدراس میں اردو" کا رکھا تھا، اسے اب انھوں نے مستقل کتاب بنا دیا ہے، اس کتاب میں آٹھ ابواب ہیں، پہلے چار بابوں میں خاص مدراسی اور وہاں کے متوطن اردو شعراء کے مختصر حالات ان کی تصانیف نظم و نثر کا ذکر اور ان کے نمونے دیئے ہیں جن جن تصانیف کے نسخوں کا پتہ چل سکا ہے، ان کا حوالہ دیدیا ہے، بعض بعض دوروں کی نظم و نثر پر الگ الگ تبصرہ ہے، پانچواں باب مستقل مراثی پر ہے، چھٹے باب میں مدراس کے اردو اخبارات و رسائل اور یہاں کی ادبی انجمنوں کے حالات ہیں، ساتویں باب میں قلعدار ان سدھوٹ کی مختصر تاریخ اور ان کے عہد کے شعرا کا ذکر ہے، آٹھویں باب میں نواب حیدر علی اور سلطان ٹیپو کے زمانہ سے لیکر اس وقت تک خاص ریاست میسور میں اردو کی سرگذشت ہے،

ہندوستان کا دیہی قرض، مرتبہ جناب پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم اے تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۳ صفحے، کاغذ کتابت، و طباعت بہتر، قیمت: ۴ر، پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

ہندوستان کے معاشی مسائل میں کاشتکاروں کے قرضوں کا مسئلہ بہت اہم ہے، اب اسکی جانب کافی توجہ ہونے لگی ہے، پروفیسر محمد عاقل صاحب نے ۳۰-۱۹۲۹ء میں علی گڈھ کے ایک گاؤں کے قرض کا تفصیلی جائزہ لیا تھا، مذکورہ بالا رسالہ انکی تحقیقات کی رپورٹ ہے، اس میں کاشتکاروں کے قرض کے تمام پہلوؤں قرضخواہوں کی قسمیں، قرض کے اسباب، ان کی شکلیں، اس کی تمیں سود کا نرخ اس کے حساب کا طریقہ، ضمانتوں کے اقسام قرض کے نتائج وغیرہ کے متعلق مع اعداد و شمار معلومات جمع کر دیئے ہیں، اور ان کا نقشہ بھی دیدیا ہے، اور ساہوکارہ کمیٹی کی رپورٹ کی روشنی میں اس کے نتائج پر بحث کی ہے، یہ بحث بہت مفید اور پر از معلومات ہے، آخر میں ہندستان

سکے ساہوکاری کے نظام اور اس کے اچھے اور برے پہلوؤں پر تبصرہ ہے، گو یہ ایک گاؤں کے قرض کا جائزہ ہے، لیکن اس ایک مثال سے عام حالات کا کسی قدر اندازہ ہو جاتا ہے،

کاشانۂ نادر، مصنفہ جناب عطاء الرحمن صاحب بی اے تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۰ صفحے، کاغذ کتابت، وطباعت بہتر، قیمت:- ۸/ پتہ:- سید عبدالرزاق تاجر کتب عابد روڈ حیدرآباد دکن،

اس افسانہ میں سرزمین علی گڈھ کی ایک دلچسپ داستان بیان کی گئی ہے، وہاں چند نوجوان تعلیم یافتہ زندہ دل، خوش مذاق عورتوں کا ایک تفریحی خفیہ کلب ہے، کلب کے مکان سے متصل ایک دوسرا کرایہ کا مکان اس کا تماشا گاہ ہے، اس کے کرایہ دار اس تفریحی کلب کا شکار ہوتے رہتے ہیں، ان دونوں مکانوں کے درمیان پر پیچ میکانیکی طریقہ سے ایسا مخفی ربط قائم کیا گیا ہے، کہ کلب کے مکان میں بیٹھ کر نگاہوں سے مخفی دوسرے مکان میں رہنے والوں کے ساتھ ہر قسم کا مذاق کیا جا سکتا ہے، اور کسی کو اس کا سراغ نہیں ملتا، یہ مذاق اسی طرح کا ہوتا ہے، جیسے آسیب زدہ مکان میں واقعات پیش آتے ہیں، اس لئے لوگ اُسے جنات وغیرہ پر محمول کرتے ہیں، اور چند دنوں کے تجربہ کے بعد مکان چھوڑ دیتے ہیں، آخر میں ایک طالب علم شمس الحسن اس گھر کو لیتا ہے، اس کے ساتھ بھی اس قسم کے واقعات پیش آتے ہیں لیکن ان واقعات سے کسی کو کوئی ضرر نہیں پہونچتا، شمس الحسن کے ایک ذہین دوست مرزا کو شک ہوتا ہے، وہ ایک دن کلب والے گھر کو خالی پاکر اس کا جائزہ لیتا ہے، تو اس پر حقیقت منکشف ہوتی ہے، ممبران کلب کو اس افشائے راز کا بڑا افسوس ہوتا ہے، اور وہ مرزا صاحب سے اسکے اخفار کا عہد لیتے ہیں، اس افسانہ میں ممبران کلب کے اخلاق کی پاکیزگی کا خاص طور سے خیال رکھا گیا ہے، اس افسانہ کا تخیل بہت دلچسپ ہے، لیکن مولف اسکو پوری طرح سنبھال نہ سکے، بعض

واقعات غیر فطری معلوم ہوتے ہیں، پرپیچ میکانیکی آلات کا ربط کچھ دلنشیں نہیں ہے، زبان میں بھی ناہمواری ہے، لیکن فسانہ دلچسپ ہے،

تمثیلی مشاعرہ از پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۱۲ صفحے کاغذ کتابت وطباعت نفیس، قیمت مجلد عہ، پتہ انجمن ارباب ذوق لائل پور، اس کے علاوہ اردو کے تمام مشہور کتب فروشوں سے مل سکتی ہے،

پہلی مرتبہ مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی مرحوم نے دہلی کی آخری "بزم ادب" کا سماں دکھایا تھا، اور اپنی جادو نگاری سے خیالی پیکروں میں ایسی جان ڈال دی تھی، کہ پڑھنے والے کی نگاہ میں آج بھی وہی سماں پھر جاتا ہے، لیکن وہ تحریری بزم آرائی تھی، اس کی نقل میں غالباً گورنمنٹ کالج لائل پور میں پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کے زیر اہتمام ایک تمثیلی مشاعرہ ہوا تھا، یہ اس کی قلمی تصویر ہے، مختلف دوروں کے ممتاز اساتذہ سودا، میر درد، میر تقی، جرأت، مصحفی، انشاء، آتش نسیم، ناسخ، ذوق، مومن اور غالب کی روحیں اس میں شریک تھیں، انہی کی وضع و لباس میں ان کی غزلیں پڑھی گئیں، محض اس حد تک تو اس میں کوئی ندرت نہ تھی، لیکن پنڈت جی کے حسن مذاق اور استادانہ نظر نے بزم مشاعرہ کی داد میں بعض خصوصیتیں پیدا کرکے اسے ادبی حیثیت سے ایک قابل یادگار چیز بنا دیا، ایک یہ کہ ان مختلف عمروں اور مختلف دوروں کے اساتذہ میں باہم حفظ مراتب اور پاس ادب کا لحاظ، اور داد کی نوعیت پر اس کا اثر، دوسرے ہر شاعر کی داد سے اس کے ذوق رجحان اور رنگ شاعری کا اظہار، تیسرے ان اساتذہ کی زبان سے ان غزلوں کے لفظی و معنوی محاسن اور شاعرانہ نکات کی طرف اشارہ، اس لحاظ سے یہ مشاعرہ شعراء کے لئے ادبی نصاب ہے، داد کے سلسلہ میں مختلف شعراء کے متعلق تلمیحات بھی ہیں، جن کی شرح آخر میں کر دی گئی ہے، مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم کے مشاعرہ کے بعد یہ مشاعرہ بھی ایک یادگار چیز ہے، دلچسپی کے لئے

مشاعرہ کا فوٹو بھی شامل کر دیا گیا ہے،

بنگاری بابو، مولفہ جناب حبیب احمد صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت :- ۸ر مجلد، پتہ :- سید عبدالقادر اینڈ سنس چار مینار وسید عبدالرزاق عابد روڈ، حیدرآباد دکن،

یہ جناب مؤلف کے پانچ افسانوں کا مجموعہ ہے، "بنگاری بابو" "انتقال ذہن" "ریڈیم کی چوری" "انسانی ترسیل" اور "ناکامی" اوّل الذکر چار افسانے نفسیاتی اور سائنسی ہیں، اور بہت دلچسپ ہیں، خصوصاً "ترسیل" بہت خوب ہی، "ریڈیم کی چوری" غالباً ترجمہ ہی، اسلئے کہ ایک سے زیادہ مرتبہ یہ شائع ہو چکا ہے، سب سے پہلے تمدن مرحوم میں نکلا تھا،

انقلابِ دہلی، مرتبہ جناب نظامی بدایونی تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۱۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت اوسط قیمت مرقوم نہیں، پتہ نظامی پریس بدایوں،

دہلی مرحوم ہندوستان کی اسلامی تہذیب کی آخری بہار تھی، اس لئے اس کی تباہی پر ویسے ہی پرسوز مرثیے اور شہر آشوب لکھے گئے جیسے بغداد کی تباہی پر سعدی نے اور اسلامی اندلس کی بربادی پر ابن بدرون نے لکھے تھے، اس دور کے اکثر بڑے بڑے شعرا نے اس کی سوگواری کا فرض ادا کیا تھا، ان میں کے بشیتر مراثی تو مطبوعہ موجود ہیں لیکن بعض نایاب تھے، جناب نظامی بدایونی نے انھیں کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے، اس میں چھتیس شعراء کے چودہ نسخے مرثیے، اور شہر آشوب ہیں نظامی صاحب نے انھیں شائع کرکے ایک قابلِ یادگار ادب کو محفوظ کر دیا،

"م"

دارالمصنفین کی نئی کتابیں

تابعینؒ

علم وعمل اور مذہب و اخلاق مین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے اور صحابۂ کرام کے بعد ان ہی کی زندگی مسلمانون کے لئے نمونۂ عمل ہے، اس لئے سیر الصحابہ کی تکمیل کے بعد دارالمصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس مین حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز، حضرت حسنؒ بصری، حضرت اویسؒ قرنی، حضرت امام زین العابدینؒ حضرت امام باقرؒ، حضرت امام جعفرؒ صادق، حضرت محمد بن حنفیہؒ، حضرت سعید بن مسیبؒ، حضرت سعید بن جبیرؒ، حضرت محمد بن سیرینؒ، حضرت ابن شہاب زہریؒ، امام ربیعہ رائیؒ، امام مکحولؒ شامی، قاضی شریحؒ وغیرہ چھیانوے اکابر تابعینؒ کے سوانح ان کے علمی، مذہبی، اخلاقی اور عملی مجاہدات اور کارنامون کی تفصیل ہے، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی، ضخامت ۵۶۰ صفحے، قیمت: للعہ

مختصر تاریخ ہند

ہمارے اسکولون مین جو تاریخین پڑھائی جاتی ہین ان کا لب لہجہ دلآزاری اور تعصب سے خالی نہین ہوتا، اور اس وجہ سے ہندوستان کی مختلف قومون مین تعصب اور بغض و عناد پیدا ہوجاتا ہے، مولانا ابوظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسون اور طالب علمون کیلئے اس غرض سے لکھی ہے کہ اس کا طرز بیان قومی جذبات سے متاثر نہ ہو اور ہندو اور مسلمان فرمانروا‌ؤن نے ہندوستان کے بنانے مین جو کام کئے ہین وہ طالب علمون کو بلا تفریق مذہب و ملت معلوم ہوجائین، ضخامت .. صفحے قیمت [illegible]

رجسٹرڈ نمبر اے ۷۵۱ جولائی ۱۹۳۹ء

معارف

مجلسِ دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

مُرتّبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت پانچ روپیہ سالانہ

دارالمصنفین اعظم گڑھ

سیرۃ النبی

رسول اللہ صلعم کے حالات وغزوات، اخلاق وعادات اور تعلیم وارشاد کا یہ عظیم الشان
کتابی ذخیرہ جس کا نام **سیرۃ النبی** عام طور سے مشہور ہے، مسلمانون کے موجودہ ضروریات
کو سامنے رکھکر صحت واہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے،

ابتک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہین، پہلے مین ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات
اور غزوات ہین، اور ابتدا مین ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جسمین فن سیرت کی تنقید و تاریخ
ہے، دوسرے حصہ مین تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات اور
اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے، تیسرے حصہ مین آپکے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہے
اسمین سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثین کیگئی ہین، پھر ان معجزات کی تفصیل
ہے جو بروایات صحیحہ ثابت ہین، اسکے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کیگئی
ہے چوتھے حصہ مین ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپکے ذریعہ مسلمانون کو تعلیم کئے گئے ہین
کوشش کی گئی ہے کہ اس مین قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائین، پانچوین
حصہ مین عبادت کی حقیقت، عبادت کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح و حکم کا بیان ہے
اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے، چھٹے حصہ مین [illegible] فضائل اور آداب کے عنوان
اور اسکی ذیلی سرخیون کے تحت اخلاقی تعلیمات کی تفصیل ہے، ضخامت [illegible] صفحے قیمت قسم اول [illegible] قسم دوم [illegible]
قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول تقطیع خورد [illegible] حصہ دوم تقطیع کلان [illegible] تقطیع خورد [illegible]
حصہ سوم تقطیع کلان [illegible] تقطیع خورد [illegible] حصہ چہارم تقطیع کلان [illegible] تقطیع خورد [illegible]
حصہ پنجم تقطیع کلان [illegible]

(منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ)

جلد ۴۴ ماہ جمادی الاول ۱۳۵۸ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۳۹ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

مئی اور جون ۳۹ئہ کے معارف مین "بعض پرانے نقطون کی نئی تحقیق" اور "تمہید" پر جو دو مضمون نکلے ہین، بحمداللہ کہ انھون نے اہل علم کی نظر مین اعتبار پایا، نواب صدر یار جنگ مولنٰا شروانی اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے اپنے کرم نامون مین اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے، اور ڈاکٹر صاحب نے مزید کرم یہ کیا ہے، کہ استدراک کے طور پر پہلے مضمون پر بہت کچھ اضافہ کیا ہے، یہ تحریرین اگلے معارف مین ناظرین کے سامنے آئینگی

سیرۃ النبیؐ کی چھٹی جلد پر جو ابھی نکلی ہے جن دوستون نے اظہار خیال کیا ہے، ان میں سے سب سے اہم ہمارے دوست مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی کا بیان ہے، وہ ایک خط مین لکھتے ہین کہ "اسلام کے فلسفۂ اخلاق پر اتنا جامع بیان، اردو کیا عربی مین بھی نہین"، اسی لئے موصوف نے یہ ارادہ کیا ہے کہ سیرت کی اس جلد پر ایک تبصرہ لکھکر تالیف اور مؤلف دونون کو ممنون کریں، خدا کرے یہ وعدہ جلد وفا ہو، تاکہ غالب کی طرح ہمیں اپنے جینے کو اس کی بے اعتباری کی دلیل نہ ٹھہرانی پڑے،

لکھنؤ میں شیعہ سنی بحث نے جو خطرناک صورتِ حال پیدا کی ہے اس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے، لکھنؤ شیعہ اصحاب کی راجدھانی تھی، وہان صدیون سے علانیہ مدحِ صحابہ جرم تھی، اور یہ جرم وراثۃً حکومت برطانیہ کے عہد تک ممنوع ہوتا چلا آتا رہا، سنیون نے غالبًا ۱۹۰۵ئہ سے اس کے خلاف احتجاج شروع کیا، اور آخر چونتیس پینتیس ۳۴، ۳۵ برس کی جد وجہد کے بعد اب کامیاب ہوے، اور اتنا حق ملا کہ سال میں ایک دن وہ علانیہ مدحِ صحابہ کر سکین، گو کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی بر سر بازار مدح

مدح خوانی اور اس کے لئے سڑکوں اور بازاروں میں جلوس نکالنا بدعات میں ایک اور نئی بدعت کا اضافہ ہے، تاہم ہم اس لئے اس کی مخالفت نہیں کرتے کہ پچھلی شیعہ حکومت کے ایک ناجائز اور ظالمانہ سرکاری حکم کا منسوخ ہونا شیعہ سنی اتحاد کی راہ کے عوائق و موانع کو کم کرنا ہے کیونکہ اباحت پر قدغن لگاکر اس کو فقہا کی نظر میں واجب العمل بنادیا گیا تھا،

شیعہ اصحاب نے اس کے جواب میں "تبرا" کی دل آزار تحریک جاری کر رکھی ہے، اور لطف یہ کہ اس کی اتنی عظمت بڑھائی ہے کہ اس کو کلام الٰہی کا ہم پایہ بنایا ہے یعنی وہ تبرا نہیں کہتے، بلکہ تبرا **شریف کی تلاوت** کرتے ہیں، اس کے جواز کا استدلال ان آیتوں سے ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے کفار پر لعنت فرمائی ہے، لیکن شاید سارے احکام الٰہی مین یہی ایک حکم ہے (اگر یہ حکم ہے) جس پر سادات بنی فاطمہ رضی اللہ عنہم سے پہلے سلاطین بنی امیہ نے عمل کیا، اور شیعون مین سلاطین آل بویہ دیلمی نے اپنے عہد میں ان کی تقلید کی، کیا عجیب بات ہے کہ آج محبان اہلبیت کرام کو سنت اہلبیت کی پیروی پر نہین، بلکہ دشمنان اہلبیت کی پیروی پر اصرار ہے! کیا اچھا ہوا اگر دونون گروہ اپنی اپنی بدعتون سے از خود احتراز کرین، اور ہر قسم کے ایسے جلسون اور جلوسوں کو یک قلم موقوف کردین جن کی اصل شریعت محمدیہ میں نہین، کہ یہ اختلاف فی الدین نہیں، اختلاف فی البدعات ہے،

مسلمان اخبارون میں اسلام اور مسلمانون کی حفاظت کی غرض سے ہندوستان مین اسلامی تمدنی دائرے (اسلامک کلچرل زون) قائم کئے جانے کی تحریک جاری ہے، ہم نے اب تک اس کو اس قابل بھی نہین سمجھا تھا کہ اس پر اظہار خیال کیا جائے، مگر دیکھا جا رہا ہے کہ اس دائرہ کے تمام نقطوں پر غور کئے بغیر اس کو واقعی اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کا تعویذ سمجھا جا رہا ہے، حالانکہ اس سے زیادہ اسلام اور مسلمانون کے اعتراف شکست کی کوئی اور تجویز نہیں ہوسکتی، اس سے ہزار درجہ بہتر پاکستان

کی تحریک ہے، جس کے کوئی معنی تو ہین،

اسلامی تمدنی منطقہ کی تحریک کے معنی یہ ہین کہ ہندوستان میں اسلام اور مسلمانون کا قدم جہانتک آگے بڑھا ہے، اس کو پیچھے لوٹا لیا جائے اور کسی ایک جگہ ٹھہر کر قدم جمایا جائے، یہ سطرین بہار کے ایک گاؤن میں بیٹھکر لکھی جارہی ہین، اس لئے یہی صوبہ اس وقت مثال مین پیش ہے، اس صوبہ میں مسلمان ۱۴ فیصدی کے قریب ہیں، ان کی پوری آبادی ۴۲ لاکھ کے قریب ہے، اور اس کی بڑی تعداد پورنیہ میں، اور اس کے بعد دربھنگہ مین ہے، اور کم سے کم پٹنہ، مونگیر اور گیا مین ہے حالانکہ اس صوبہ کے اسلامی تمدن کے مرکز یہی تینون اضلاع ہین، اور پورنیہ اور دربھنگہ میں مسلمان زیادہ تر کاشتکار اور زمیندار ہیں، اب کیا پورنیہ اور دربھنگہ کے مسلمان پٹنہ اور مونگیر اور گیا مین آجائیں، ایسی حالت میں کیا یہاں کے ہندو، ان مہاجر مسلمانون کے بسنے کے لئے زمین اور کھانے کمانے کے لئے جائداد دینگے، اور ان اضلاع کے ہندو یہان سے نکل کر پورنیہ کی خراب آب وہوا میں رہنا پسند کرین گے، اور اگر پورے صوبہ کے مسلمان بنگال یا یوپی کو ہجرت کرائے جائین تو کیا یہ صوبے ان کو جگہ دے سکتے ہین، اور اگر دیں بھی تو اسلام کا قدم جہانتک آگے بڑھ چکا ہے، اس سے پیچھے ہٹنے کی کوئی معقول وجہ ہوسکتی ہے، کیا یہ اسی غلطی کا اعادہ نہ ہوگا، جو مسلمانوں نے سسلی، جنوبی فرانس، اسپین، مالٹا اور کریٹ وغیرہ رومی جزیرون میں کی ہے، کہ جہان سے ان کی سیاسی طاقت کم ہوگئی وہان سے انھون نے ہجرت اختیار کرلی، اور اسلام کے قدم کو آگے بڑھا بڑھا کر پیچھے ہٹاتے رہے، جس کا نتیجہ آج آنکھون کے سامنے ہے!

مقالات

دنیا میں اسلام

(تلخیص، تحشیہ، تعلیق)

از

(مولانا مسعود عالم ندوی)

"دنیا میں اسلام" (Islam in the world)[1] ڈاکٹر زکی علی مصری کی ایک نئی تصنیف کا نام ہے، جس میں عالم اسلام کے تمام مسائل پر بحث کی گئی ہے، اور مسلمانانِ عالم کی مختلف دینی، اجتماعی و سیاسی تحریکوں پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے، کتاب کا موضوع گو عہد حاضر کا اسلام اور مسلمانوں کی حالت ہے، لیکن منطقی تسلسل قائم رکھنے کے لئے تاریخی پس منظر بھی سامنے لاکر رکھدیا گیا ہے، اور اس سلسلہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، اسلام اور قرآن مجید کی تعلیمات، اسلام کا نظامِ اجتماعی، خلافت وغیرہ پر مختصر لیکن جامع اور پر مغز گفتگو کی گئی ہے،

ہر چند کہ ہندوستان اور دوسرے اسلامی ملکون کے باشندے، عالم اسلام اور مسلمانانِ عالم کے فقرے اپنی سیاسی و اجتماعی زندگی میں بہ کثرت استعمال کرتے ہیں، لیکن اب تک بہت کم لوگوں

---

[1] Islam in the world، مولفہ ڈاکٹر زکی علی مصری، صفحات ۴۲۰، تقطیع متوسط، کتابت و طباعت دیدہ زیب، کاغذ نفیس، قیمت للعہ ملنے کا پتہ:- شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور، شائع شدہ ۱۹۳۸ء

نے اسلامی دنیا کے موجودہ سیاسی واجتماعی حالات کا غائر مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے، کتاب
تالیف کا تو خیر کوئی ذکر ہی نہیں، البتہ یورپ کی مختلف استعماری طاقتیں اپنے اغراض کے ماتحت اس
قسم کی کوششوں کی حوصلہ افزائی کرتی رہی ہیں، اور اسی بنا پر انگریزی، فرنچ، جرمن اور دوسری
زبانوں میں اسلامی ممالک پر کتابوں کا ایک ذخیرہ فراہم ہو چکا ہے، اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے،
لیکن یورپین مصنفین کی کتابیں بڑی حد تک انصاف وصداقت سے معرا ہوتی ہیں، اور وہ واقعات
کو اس درجہ مسخ کرنے کے عادی ہیں کہ صحیح نتیجہ تک پہونچنا دشوار ہو جاتا ہے، اسلئے ضرورت تھی
کہ کوئی مسلمان صاحبِ نظر وصاحبِ قلم اس ذمہ داری کو اپنے سر لے اور شرعی اصطلاح میں
سب کی طرف سے "فرض کفایہ" ادا ہو جائے، ان وجوہ کے ماتحت ہم ڈاکٹر زکی علی مصری کی اس
نئی اور مفید کتاب کا تہ دل سے خیر مقدم کرتے ہیں، اور آج کی صحبت میں اس پر ذرا تفصیل سے
کچھ کہنا چاہتے ہیں خصوصیت کے ساتھ اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ ایک مسلمان کے قلم
سے یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے، (جہان تک عاجز کی حقیر معلومات کا تعلق ہے) عربی میں
ایک کوشش بلکہ بلیغ کوشش اس قسم کی ہوئی ہے لیکن اس کی ضمنی حیثیت ایک جامع کتاب
کی تیاری میں مانع ہوگئی، اس کوشش سے میری مراد امیر البیان علامہ شکیب ارسلان
مدظلہ کے ان "حواشی" (فٹ نوٹس) سے ہے، جو انھوں نے اسٹاڈرڈ (Stoddard)
امریکہ کی کتاب (دی نیو ورلڈ آف اسلام) کے عربی ترجمہ (حاضر العالم الاسلامی) پر سپرد قلم فرمائے
ہیں، یہ حواشی معنوی برتری، اور معلومات کی فراوانی کو چھوڑ کر، صرف ضخامت میں بھی اصل کتاب
سے تین گونہ زیادہ ہیں، رہی ان حواشی کی معنوی قیمت، سو اس کے متعلق اس قدر کہنا کافی ہے
یہ امیر شکیب ارسلان مدظلہ کے پنجاہ سالہ مطالعہ اور مشاہدہ کا نتیجہ ہیں، اور اب تک عالم اسلام
اسیاسی واجتماعی زندگی پر ایسی پرمعلومات کتاب کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی، ......

......لیکن جیسا کہ ہم نے ابھی کہا، اسکی ضمنی حیثیت نے کتاب کی قیمت کم کر دی، اور معلومات کا ایسا نایاب ذخیرہ ایک مستقل تصنیف کی صورت اختیار نہ کر سکا، "میر البیان" کے حواشی صرف ان مقامات اور ملکوں تک محدود ہیں، جن کے حالات عام طور پر کہیں نہیں ملتے، مصر، شام، عراق، اور اسی طرح ہندوستان کی بعض عظیم الشان تحریکوں کا تذکرہ ان حواشی میں نہیں ملتا، اس کے برعکس ڈاکٹر زکی علی کی "دنیا میں اسلام" گو مختصر لیکن مستقل اور جامع تصنیف ہے، اس لئے وہ بجا طور پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب کہی جا سکتی ہے،

ڈاکٹر زکی علی مصر کے رہنے والے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ، ڈاکٹر (طبیب اور سرجن) ہیں، عربی کے علاوہ جرمن، فرنچ اور انگریزی میں بھی اعلیٰ دستگاہ حاصل ہے، ۱۹۳۱ء تک وہ قاہرہ کے سرکاری ہسپتال (قصر العینی) میں سرجن تھے، اس کے علاوہ ان کے دو ذاتی شفاخانے (ڈسپنسری) قاہرہ اور زقازیق (مصر کا ایک شہر) میں کامیابی کے ساتھ چل رہے تھے، ۱۹۳۱ء میں مزید فنی مہارت حاصل کرنے کے لئے انھیں سرکاری وظیفہ ملا، اور وہ یورپ روانہ ہو گئے، عام طور پر ان کا قیام لندن پیرس اور وائنا میں رہا کرتا تھا، اسی دوران میں انھیں عالم اسلام کے حالات سے دلچسپی ہوئی اور وہ مختلف اخبارات اور رسالوں میں، متنوع عنوانات پر مضامین لکھنے لگے، "الفتح" (مصر) "الہدایۃ" (عراق) "البلاغ" (مصر) "مسلم ریویو" لکھنؤ، Genuine Islam، سنگاپور میں ان کے مضامین خود راقم الحروف کی نظر سے اکثر گذرتے رہے ہیں، ابھی ڈاکٹر زکی علی کی یہ نئی دلچسپی شروع ہی ہوئی تھی، کہ انھیں حکومت مصر (؟؟) کی نگاہ عتاب کا شکار ہونا پڑا، "کارکنان قضا و قدر" (!!) کو ان کی یہ مشغولیت ایک آنکھ نہ بھا سکی، ۱۹۳۲ء میں ان کا سرکاری وظیفہ بند کرا دیا گیا، اور اس طرح پر ان کی (قصر العینی) کی ملازمت بھی گئی، نیز دونوں ذاتی شفاخانے کس مپرسی کی نذر ہو گئے، اور ان بیچارہ کو اپنی اسلام دوستی کا مزا چکھنے کے لئے یکہ و تنہا چھوڑ

دیا گیا[1] لیکن ذاتی پریشانیوں سے ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ ہوئی، اور یہ برابر عالم اسلام کے متعلق مضامین لکھتے رہے، اور ساتھ ساتھ مطالعہ بھی وسیع ہوتا رہا تاآنکہ آج یہ مفید و جامع کتاب ہمارے سامنے رکھی ہوئی دعوتِ ذوق وعمل دے رہی ہے،

کتاب کل ۲۲۰ صفحوں پر دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے، پہلے حصہ میں حسب ذیل ابواب ہیں،

پہلے باب میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مختصر لیکن جامع طور پر بیان کی گئی ہے جس میں کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں، البتہ مغربی مصنفین کے اقوال بہ کثرت درج کئے گئے ہیں، جو ایک انگریزی تالیف میں معیوب نہیں کہے جا سکتے، خصوصیت کے ساتھ اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر ہمارا نوجوان طبقہ اب تک اپنی باتیں بھی غیروں ہی کی زبان سے سننا چاہتا ہے،

[1] یہ شبہہ نہ ہو کہ ڈاکٹر ز کی علی نے یہ روداد کہیں اپنے قلم سے لکھی ہے، راقم الحروف کو یہ تفصیلات عزائی اخبارات سے معلوم ہوئیں،

دوسرے باب (اسلام: ایک مذہب اور نظام اجتماعی) میں اسلام کی بنیادی تعلیمات مؤثر پیرایہ میں بیان کی گئی ہیں، مساوات اور "پاپائیت" کے متعلق مندرجۂ ذیل اقتباس سے مصنف کے خیالات کا کچھ اندازہ ہوگا:۔

"مکمل اجتماعی مساوات کی بنا پر، اسلامی سوسائٹی میں ذات پات کی گنجایش نہیں جو موروثی طور پر کسی امتیاز یا فوقیت کی مستحق ہو سکے،

اسلام میں دینی پیشواؤں کا کوئی فرقہ نہیں، نہ کلیسا کی طرح دین کے خدمت گذاروں کی کوئی مخصوص تنظیم ہے، پاپائیت کی اسلام میں مطلق گنجایش نہیں، وہ تمام لوگ "علمائے دین" میں شامل ہیں، جو دینیات پر عبور رکھتے ہیں، مولویوں کی کوئی ذات نہیں، جو بے لکھے پڑھے موروثی طور پر اس امتیاز کی حقدار ہو جائے۔ (ص۲۱")

اس میں کوئی شک نہیں، کہ اسلام میں مولویوں کی کوئی ذات نہیں، صرف کتاب وسنت کا علم "عالم دین" بننے کی شرط ہے، لیکن افسوس کہ آج کل عام لوگوں کی غفلت اور تعلیم یافتہ حضرات کی دینی علوم سے نفرت نے خود بخود "علماء" کا ایک طبقہ بنا کر لا کھڑا کر دیا ہے،

مصنف نے اس باب میں اسلامی تعلیمات کو نچوڑ کر رکھ دیا ہے، اور بیان کا قالب ایسا ہے جو نئی طبیعتوں کے لئے قابل قبول ہو سکے، ہمیں مصنف کی صرف ایک تشریح سے اختلاف ہے جو انھوں نے "جہاد" کے سلسلہ میں کی ہے فرماتے ہیں:۔

"جہاد یا مذہبی جنگ (لغوی معنی کوشش اور جد وجہد کے ہیں) اصل میں دفاعی تھا، اور مخصوص حالات میں اس کی اجازت دی گئی ہے: جب مسلمانوں پر زیادتیاں ہو رہی ہوں، یا جب انھیں مذہبی عداوت کی بنا پر بے رحمی کے ساتھ گھروں سے نکالا جاتا ہو، یا پھر جب کوئی قوم اسلامی علاقہ پر حملہ آور ہو، اور ملک و وطن کی بے حرمتی پر اتر آئے، یا جب

باغی اور غدار مسلمانوں کو ان کے ملک سے نکالنے کی سازش کریں، (ص۳۳)

یہ تمام صورتیں وہ ہیں جن میں جہاد مشروع بلکہ فرض ہو جاتا ہے، لیکن ان کے علاوہ بھی جہاد کی مشروعیت ہے، جسے سرسید، علامہ شبلیؒ، شیخ محمد عبدہ، اور پچھلی صدی کے تمام اکابر نظرانداز کرتے آئے ہیں، اسلام یعنی امن و سلامتی کے پیغام کی راہ میں جو کانٹے حائل ہوں، انھیں ہٹا دینا بھی فرض عین ہے، پورے جسم کی تندرستی کی غرض سے اطبا ر فاسد اعضار کے کاٹنے میں مطلق تامل نہیں کرتے، اسی طرح انسانیت کاملہ کی دعوت و تبلیغ اور قانون ربانی کے نفاذ کی خاطر بھی تلوار اٹھانا مشروع کیا گیا ہے، سورہ توبہ اور انفال کی آیتیں اس باب میں بالکل صاف ہیں، یہ موقع اس پر تفصیلی بحث کا نہیں، سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی کتاب (الجہاد فی الاسلام) اس بحث پر اب تک آخری چیز ہے، اور بہت کافی، خلاصہ یہ کہ جہاد کو خواہ مخواہ دفاعی تک محدود رکھنا، یورپ سے مرعوبیت کا نتیجہ ہے پچھلی صدی کے بزرگ معذور تھے، اب تو صداقت کو برملا کہنے میں تامل نہ ہونا چاہئے،

تیسرے باب میں (قرآن مجید اور اسلامی قانون) کی بحث آتی ہے، قرآن کریم کے اعجاز پر مختصر روشنی ڈالنے کے بعد، اسلامی قانون کے سرچشموں (حدیث، قیاس، اجماع) سے روشناس کرایا گیا ہے، مصنف نے اس بات پر خاص زور دیا ہے، کہ اسلامی قانون زمانہ کی تبدیلیوں کا ساتھ دے سکتا ہے، ہم بھی اس سے متفق ہیں، کہ اسلامی نظام حکومت اور اسلام کے معاشی قوانین آج بھی دنیا کی رہبری کر سکتے ہیں لیکن اس طرح پر نہیں کہ ان محکم قوانین کو توڑ مروڑ کر زمانہ کے تابع کریں، بلکہ ہم یہ یقین رکھتے ہیں، کہ موجودہ معاشی پیچیدگیوں کا واحد حل اسلامی قانون پر عمل کرنا ہے، مصنف نے ترکی اور ایران کی نئی تبدیلیوں کی مثالیں دی ہیں (ص۴۸) لیکن اس تمثیل سے مسئلہ اور الجھ جاتا ہے، ترکی کی نئی تبدیلیوں میں اسلامی قانون میراث کی

منسوخ بھی ہے، تو کیا ہم اسے جائز قرار دیں گے، ؟ البتہ یوگوسلاویا کی طرح تعداد ازدواج پر پابندیاں عائد کی جا سکتی ہیں، مصر کے نمونہ پر ایک مسلم حکومت ازدواج کی عمر کی تحدید کر سکتی ہے لیکن البانوی پارلیمنٹ کی طرح پردہ اور تعداد ازدواج کو ہم بالکل ممنوع قرار نہیں دے سکتے، ڈاکٹر عبد الرزاق سنہوری (صدر شعبۂ قانون، جامعہ مصریہ) کی یہ رائے بالکل صحیح ہے، کہ شریعت میں زمانہ کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت موجود ہے، لیکن اس میں اعتدال اور حزم کی ضرورت ہے،

ڈاکٹر زکی علی بھی بہت معتدل اور سلجھے ہوئے خیالات رکھتے ہیں، لیکن وقت یہ ہے کہ وہ ترکی اور البانیہ کے صریح مخالف شریعت قوانین کے خلاف بھی لب کشائی کرنا نہیں چاہتے،

چوتھا باب، (اسلامی نظام حکومت) پر ہے، اسمیں مصنف نے اسلامی حکومت کا صحیح خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، خصوصیت کے ساتھ ریاست وکلیسا، یا مذہب وسیاست پر ان کی مختصر بحث بہت کافی وشافی ہے، ہم ذیل میں اس کا ایک حصہ درج کرتے ہیں، :-

" اسلام میں ریاست وکلیسا (مذہب وسیاست) کے متعلق بہت غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے، مغربی مورخین اور نقاد سمجھتے ہیں، کہ مسیحیت کی طرح اسلام میں بھی یہ دو چیزیں الگ الگ ہیں، لیکن یہ ایک وہم ہے، اگر اسلام میں مذہب وحکومت کی کوئی تفریق ہو سکتی ہے، تو وہ صرف برتنے اور عملی جامہ پہنانے میں، اس کے برعکس مغرب میں یہ تقسیم بنیادی (Organic) حیثیت رکھتی ہے، اسلامی تخیل کے مطابق مذہب اور سیاسیات کے درمیان ایک خط فاصل کھینچنا ناممکن ہے، خاص کر یہ حقیقت پیش نظر رکھتے ہوئے کہ اسلامی زندگی میں مذہب افراد کے تمام روحانی ومادی افعال و اعمال میں یکساں موثر رہتا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے، کہ اسلام میں مذہب اور سیاست دونوں کی باہمی آمیزش سے ایک چیز وجود میں آتی ہے، اس لئے

ہم نہایت صفائی کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں، کہ کم از کم مغربی تخیل کے مطابق کلیسا
(church) کا وجود اسلام میں نہیں پایا جاتا، اور اسی طرح ہم یہ بھی کہہ سکتے
ہیں کہ اسلام حکومت ہے اور حکومت اسلام، (ص ۵۶-۵۷)

یہ تو نظریہ تھا، عملی تطابق میں بھی مصنف کا تخیل صاف ہے:-

"اگر بعض اسلامی ملکوں میں جن کا دستور مغربی طرز پر بنایا گیا ہے، اسلام سرکاری مذہب قرار دیا گیا ہے، تو اس کی حیثیت ایک ضابطہ سے زیادہ نہیں، اور یہ بالکل ایک سطحی بات ہے، اسلامی حکومت میں سیاست مذہب سے مل کر ایک مجموعہ (entity) بنتا ہے،

چودہ سو سال کی طویل مدت میں چشم گیتی نے صرف ایک بار صحیح اسلامی حکومت کا نقشہ دیکھا ہے ...... ہمارے زمانہ میں جہاں خالص دینی اسلامی حکومت کامیابی کیساتھ چلائی جا رہی ہے، وہ ابن سعود کے زیر نگیں عربی علاقہ ہے، (ص ۵)

موجودہ عہد میں مصنف اسلامی حکومتوں کی ایک مجلس یا "کامن ولتھ آف اسلامک سٹیٹس" کا خواب دیکھتا ہے، یقینی اس عہد میں نگاہ تصور اس سے آگے نہیں اٹھ سکتی، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اسلامی نظام حکومت مختلف نوابیوں یا حکومتوں کے وفاق کی حوصلہ افزائی کرتا ہے [1]

---

[1] جامعہ اکتوبر ۳۸ئ میں ڈاکٹر عبدالحمید صاحب زبیری نے بھی انہی خیالات کا اظہار کیا ہے، انکے الفاظ یہ ہیں:،

"بین الاقوامی سیاست میں جدید حالات میں اسلام صرف ایک بین الاقوامی وفاق کا ہی قائل ہو سکتا ہے، اقوام آزاد ہوں لیکن وہ انسانیت کی خدمت کیلئے باہم متحد ہوں، اسلام کا سیاسی نصب العین تو دراصل تمام دنیا میں ایک عالمگیر حکومت کا قیام ہے، لیکن جب تک انسانیت کا شعور عام نہ ہو جائے، اسوقت تک صرف یہی درمیانی راہ ممکن ہو سکتی ہے۔"

اسلامی نظام میں امیر مطاع ایک ہی ہو سکتا ہے، جس کی حیثیت احکام خداوندی کے نافذ کرنے والے کی ہوگی، اور اس امیر المومنین کے ہاتھوں میں قوت ہونا چاہئے، کہ اسلامی نظام کی بنیاد حکومت پر قائم ہے، اور قوت کے بغیر حکومت کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی،

اسلامی نظام حکومت میں قانون الٰہی کی اہمیت و برتری کا مصنف کو پورا احساس ہے، اسی لئے وہ "کمالی اصلاحات" کو صحیح اسلامی اصلاح کا نمونہ نہیں قرار دیتا، ترکی، بلکہ کمالی اصلاح کی غیر شرعی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے مصنف نے ایک کمالی" (فالح رفقی) کا یہ فقرہ نقل کیا ہے، جس سے کمالی اصلاحات" کی اسپرٹ کا اندازہ ہوگا:۔

"عیسائیت کا "قرون وسطے" پندرھویں صدی میں ختم ہو گیا، . . . .

. . . . . لیکن اسلام کا "قرون وسطی" اب تک ختم نہیں ہوا، البتہ کمالی اصلاحات نے ترکی میں اس کا قلع قمع کر دیا ہے"، (ص ۸۹)

یہ اقتباس فالح رفقی کی کتاب *La Turquie Kamaliste* سے ماخوذ ہے، جس پر کسی حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی،

مصنف کے خیال کے مطابق ترکوں کی اس بے راہ روی کی وجہ یہ ہوئی، کہ انھوں نے عثمانی حکومت کو اسلامی حکومت کا نمونہ سمجھا، اور جو خرابیاں انھیں اس طرز حکومت میں نظر آئیں، وہ اسلام کے سر منڈھ دی گئیں، کمالی عہد میں ترکی میں دوہرا انقلاب ہوا ایک یونان اور خلفا کی چیرہ دستیوں کے خلاف، دوسرا ملک کی موجودہ سیاسی و اجتماعی صورت حال کے خلاف رونما ہوا، چونکہ ۱۹۲۲ء و ۱۹۲۳ء کی ترکی پر کسی نہ کسی رنگ میں اسلامی اثر باقی تھا، اسلئے پرجوش انقلابیون نے خود اسلامی نظام کو ترقی کی راہ کا روڑا قرار دیا، وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ موجودہ طرز حکومت کو اسلامی نظام سے دور کا تعلق بھی نہیں، (خلاصہ ص ۹۰)

"اہل یورپ کی طرح وہ بھی اسلام کو عثمانی طرزِ حکومت کے آئینہ میں دیکھنے لگے، جسے متعدد لحاظ سے اسلام کی روح، اصول اور خلافتِ راشدہ کے نظام سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا، اسلام کو بعض مسلمانوں، یا مسلم حکومتوں کے عمل سے جانچنا خطرناک ہے۔ (ص ۱۶)

مصنف کو ترکوں کی اس بے راہ روی سے دوستانہ گلہ ہے، لیکن راقم الحروف کو بالکل شکوہ نہیں، ترکی جہان ہے طبعی حالات کے موافق اسے وہیں ہونا چاہئے، حالات کی رفتار اور علماء کے جمود کا نتیجہ یہی ہونا تھا، البتہ ہم ترکوں کے اسلامی مستقبل سے مایوس نہیں بقول حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے،

حالات ایسے ہیں کہ ترک اسلامی برادری سے الگ رہ کر نہیں پنپ سکتے، ایک ترکی جنرل کے بیان کے مطابق یہ آندھی آئی ہے، اور نکل جائے گی"،

ہمیں ترکوں سے گلہ نہیں لیکن ان کے جا و بیجا حرکات کی مدح سرائی بھی ہمارا شیوہ نہیں، غلط کو غلط ہی کہا جائے گا، خواہ مخواہ اسکی تصحیح و تحسین کی ضرورت نہیں،

"اسلامی نظامِ حکومت" کے بعد مصنف نے (خلافت) پر بحث کی ہے، جہاں تک خلفاء کی تاریخ اور عہد بعہد کی تبدیلیوں پر تبصرہ کا تعلق ہے، اس میں کوئی نئی بات نہیں، خلیفہ اور خلافت کی حیثیت اور وظائف کے متعلق البتہ اختلافِ رائے کی گنجایش ہے، مسرت کی بات ہے کہ مصنف کا تخیل اس باب میں بہت واضح ہے، محکمۂ قضاء (عدالت اور قوتِ نافذہ (Executive)) کی علیحدگی موجودہ طرزِ حکومت کی نمایاں خصوصیت ہے، خلافت میں قانون (شریعت) اور قوت نافذہ کے باہمی تعلق کی کیا حیثیت ہے؟ اس کی تشریح ملاحظہ ہو:-

"شریعت، عدالت اور قوت نافذہ میں تفریق نہیں کرتی، یہ عدالت کو قوتِ نافذہ کے تابع

کرتی ہے لیکن یہ تابعیت اور ماتحتی عملی طور پر اثر انداز نہیں ہوتی، اسلئے کہ خلیفہ (قوت نافذہ) اور قاضی (عدالت) دونوں قانون (شریعت) کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہیں، عدالت اور قوتِ نافذہ ایک جانب، اور قوتِ قانون ساز دوسری جانب، ان دونوں میں مکمل تفریق ہے، موجودہ قانون سے بھی زیادہ اسلامی قانون میں یہ تفریق نمایاں طور پر نظر آتی ہے"۔ (ص ۲)

مصنف کا خیال صحیح ہے، اصل سوال قوتِ قانون سازی کا ہے، اسلام میں قانون سازی کا اختیار صرف شارع کو ہے، خلیفہ کا کام قانونِ الٰہی کا نافذ کرنا ہے، اور بس،

خلافتِ راشدہ یا صحیح اسلامی حکومت صرف تیس سال رہی، اس کے بعد ملوکیت کا دور دورہ شروع ہو گیا، پھر بھی اسے کسی نہ کسی درجہ میں "خلافت" کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے؛

"ایک خالص دینی نظام سے شروع ہو کر مدینہ میں اسلام کی حیثیت اصل میں مذہبی اور ضمنی طور پر ایک سیاسی نظام کی ہو گئی، خلافت راشدہ کے دور میں دونوں حیثیتیں برابر ہو گئیں، بعد کی غیر قانونی (Illegitimate) خلافتوں میں اس کی حیثیت سیاسی اور ضمنی طور پر مذہبی نظام کی رہ گئی، .... پھر بھی یہ "غیر قانونی" خلافت محض ثانوی چیز نہیں کہی جا سکتی، اس لحاظ سے اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ یہ نظام تیرہ سو سال تک چلتا رہا ہے"۔ (ص ۵)

خلافت کا منصب خلفاے راشدین سے لیکر ۱۹۲۴ء تک کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا، اس طویل مدت میں صرف ایک مرتبہ مستعصم عباسی کے انتقال کے بعد عالمِ اسلام کا کوئی نگران یا خلیفہ نہ تھا، یہ صورت ساڑھے تین سال سے زیادہ نہ رہی (ص ۸)

مصنف کے نزدیک موجودہ حالات میں ایک مرکزی حکومت کا بقا و استحکام بہت دشوار ہے

اور عثمانی حکومت کے زوال کا باعث بھی یہی کمزوری تھی، (ص۶۸) ترکوں کے الغائے خلافت کی مصنف نے مختلف توجیہیں کی ہیں، اور اپنے کو غیر جانبدار رکھنے کی پوری کوشش کی ہے (۹۲-۸۹) اصل یہ ہے کہ جمہوریت کے اعلان، اور سلطان کا منصب ختم کرنے کے بعد (اکتوبر ۱۹۲۲ء) خلافت اور خلیفہ کی کوئی گنجایش ہی نہیں رہ گئی تھی، مسلمان خلیفہ پوپ نہیں ہوتا، اور اکتوبر ۱۹۲۲ء سے مارچ ۱۹۲۴ء (الغائے خلافت اور سلطان کی جلاوطنی کی تاریخ) تک سلطان عبد المجید کی حیثیت پوپ سے زیادہ نہیں تھی، اسلئے بعض مفکرین کا کہنا بھی صحیح ہے، کہ اس نام نہاد منصب سے اس کا نہ ہونا ہی بہتر تھا، دوسری طرف اسلامی وحدت اور احیائے خلافت کا خواب دیکھنے والوں کو اہل انگورہ کی یہ حرکت طبعی طور پر[۱] بہت ناگوار گذری کہ ان کی رہی سہی امیدوں کا بھی خاتمہ ہو گیا، آج چودہ سال ہو گئے لیکن اس منصب کا کوئی لائق دعویدار نہیں ملتا، سنتے ہیں، لوگ مصر کے نوجوان فرمانروا شاہ فاروق کو یہ اعزاز عطا کرنا چاہتے ہیں، لیکن اس کے لئے قوت درکار ہے جس سے ابھی مصری حکومت محروم ہے،

"اسلامی تمدن" (۹۵-۱۵۰) پر مصنف کا فاضلانہ مضمون پر مغز اور معلومات سے لبریز ہے علم وعمل کے تمام مدنی (Culture) شعبوں پر مسلمانوں کے احسانات جامعیت کے ساتھ شمار کرائے گئے ہیں، ڈاکٹر ز کی علی کا مطالعہ وسیع ہے، اور حقائق کی گرفت کی صلاحیت انھوں نے بہت اچھی پائی ہے، یوں تو علم کی تمام شاخوں میں مسلمانوں کی خدمات بیان کی گئی ہیں، لیکن خصوصیت کیساتھ طب اور سرجری کے متعلق معلومات نہایت قیمتی ہیں، اپنے فن اور پیشہ کے لحاظ سے اتنا امتیاز ہونا بھی چاہئے تھا، اس پرمغز اور مفصل بحث کی تمہید کا ترجمہ شاید مصنف

[۱] ہندوستان، مصر، اور شام وعراق نے الغائے خلافت کے خلاف اظہار برہمی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، مصر کے امیر الشعراء مرحوم احمد شوقی نے ایک دلدوز مرثیہ بھی لکھا تھا،

کے زاویۂ نظر اور طریقۂ فکر کا اندازہ لگانے کے لئے کافی ہو:

اسلام صرف ایک عقیدہ اور سیاسی تخیل نہیں، بلکہ ایک تمدن بھی ہے جو متضاد اجزا سے مرکب ہونے کے باوجود ایک مخصوص وحدت کا مالک ہے، مذہب ان اجزا کے درمیان رشتۂ وحدت کا کام دیتا ہے، اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، کہ سیاست اور تمدن دونوں کی نشو ونما مذہب کی مرہون منت ہے، ایک متحدہ اسلامی تمدن کی تشکیل کا سہرا اہم مذہب کے سر اسلئے باندھتے ہیں، کہ مسلمانوں کی زندگی میں مذہب ہی سب سے زیادہ موثر اور کارفرما عنصر ہے، نیز اسلام کی تمام تاریخی ترقیاں، رسول کریم (ص) کی تعلیمات کا براہ راست نتیجہ ہیں

(ص ۹۵)

کتاب کی ساتویں فصل اسلام کے حلقۂ اثر کی وسعت کے لئے مخصوص ہے، جس میں آغاز اسلام سے آج تک کی تبلیغی کوششوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور اسلامی طریق دعوت کو اجاگر کیا گیا ہے، اس موضوع پر اردو میں بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، آرنلڈ کی دعوتِ اسلام کے بعد استاذ محترم حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ کا مقالہ (ہندوستان میں اسلام کیونکر پھیلا؟) بہت کافی ہے، نیز (عرب وہند کے تعلقات) میں بھی کافی مسالہ موجود ہے، البتہ جو کچھ اردو میں ترجمہ ہوا یا لکھا گیا ہے وہ زیادہ تر ہندوستان سے متعلق ہے، ڈاکٹر زکی علی نے دنیاے اسلام پر نگاہ ڈالنے کی کوشش کی ہے، اور یورپ میں اسلام کی توسیع پر اچھا خاصہ مواد فراہم کر دیا ہے، افریقہ میں اسلام کی کامیابیوں کا بھی تذکرہ ہے، لیکن اس سے بہت زیادہ جامع ذکر (حاضر العالم الاسلامی) کے حواشی میں ہے، (ملاحظہ ہو، جلد سوم ص ۱۰۰) بااینہمہ کتاب میں جسقدر بھی تذکرہ ہے، اردو میں شاید اب تک نہیں آیا،

بنو امیہ کے بارے میں مصنف کو ایک غلط فہمی ہو گئی ہے، مغربی مصنفین اور جرجی زیدان کے

پروپیگنڈے سے وہ بھی یقین کر بیٹھے، کہ بنوامیہ غیر عربون کو حقیر سمجھتے تھے، اور دل سے اسلام کی تبلیغ بھی ان کے پیش نظر نہیں تھی، استاذ الاستاذ حضرت علامہ شبلی نعمانیؒ نے الانتقاد میں اسکی حقیقت اچھی طرح واضح کردی ہے، بنوامیہ کی "عربیت" کی اصلیت صرف اتنی ہے، کہ عباسیون کی طرح ان کے عہد میں ایرانی اور ترکی عناصر کا حکومت میں کوئی دخل نہیں تھا، اور ابن خلدون کی رائے کے بموجب قومی عصبیت سلطنت کے استحکام و بقا کے لئے ضروری ہے، "عرب نیشنلزم" یا اس قسم کا اور کوئی خیال ان کے ذہن میں قطعاً نہیں تھا،

مصنف کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ اگر روس مسلمان ہوتا، تو وہاں "اشتراکیت" کیلئے کوئی گنجایش نہیں باقی رہتی" (ص ۱۶۳)

"ایک قوم مسلمان ہو جانے کے بعد، پھر اپنا مذہب ترک نہیں کرتی، ترکی جو حکومت کا تعلق مذہب سے علی الاعلان قطع کرچکی ہے، اس (ترکی) میں بھی اشتراکیت کی تبلیغ نہیں کی جاسکتی، اور ترکی حکومت میں بالشویزم کا مبلغ سزا کا مستوجب ہوتا ہے"

(ص ۱۶۴)

ہمارے بعض کمیونسٹ دوستون کو یہ غلط فہمی ہے، کہ ترکی کا کمالی انقلاب بھی مارکس کے نظریہ کے مطابق "بورژوا جمہوری انقلاب" کی ایک شکل تھا، اور اس طرح پر یہ اصلی پولتاری (Proletariat) انقلاب کا پیش خیمہ ہے، انھیں شاید معلوم نہیں کہ انگورہ کا انقلاب اغیار کی چیرہ دستیوں اور ملک کی اندرونی کمزوریوں کے مقابل ظہور پذیر ہوا تھا، اور اس لحاظ سے یہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا، حالات ایسے ہیں کہ اسلامی ملکون اور حکومتوں میں اشتراکیت کے پھولنے پھیلنے کا امکان بہت کم ہے، اسکو سمجھنے کے لئے وہان کے حالات پر غائر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے، ورنہ یہ حقیقت ذہن نشین نہیں ہوسکتی، موقع ملا تو ہم اس پر کبھی تفصیل سے لکھیں گے،

یوگوسلاویا میں اسلام کی ہمہ گیری کا تذکرہ کرتے ہوئے، مصنف نے معلوم نہیں اکس حیثیت سے ایک مسلمان ایکٹرس کا ذکر کیا ہے، (ص ۱۰۷) ہمیں مسلمانان یوگوسلاویا کی ترقی، اور تجدد سے انکار نہیں، اور نہ اس پر اعتراض ہے، ہندوستان کب اس سے بچا ہوا ہے؟ لیکن اسلام کی ہمہ گیری کے سلسلہ میں ایک مسلمان خاتون کی تمثیلی برتری پر زور دینا البتہ تعجب انگیز ہے، کم از کم ہم مشرقی اور اسلامی تہذیب کا دم بھرنے والوں کے لئے تو ضرور تعجب انگیز ہے، یورپ کے مسلمانوں کے متعلق، اس باب میں مفید معلومات جمع کی گئی ہیں، جو پڑھنے کے لائق ہیں،

آٹھویں باب میں "اسلام کے ارتقاء" کی بحث آتی ہے، آغاز میں لائق مصنف نے آخری صدیوں میں مسلمانوں کے انحطاط کے اسباب پر گفتگو کی ہے، ارتقاء کے تذکرہ سے پہلے انحطاط کی تحلیل بھی ضروری تھی، اس بحث میں اونھوں نے مجاہد جلیل حضرت علامہ شکیب ارسلان کے مشہور رسالہ (لماذا تأخر المسلمون و تقدم غیرھم) "مسلمان کیوں پیچھے رہے اور دوسرے کیوں بڑھ گئے"، سے کافی فائدہ اٹھایا ہے، جس کا اردو ترجمہ بھی سیرت کمیٹی نے (اسباب زوال امت) کے نام سے شائع کر دیا ہے،

> "اسلامی حکومت کے زوال کے ساتھ علماء "ایک محدود اسلام" کے دائرہ میں سوچنے لگے، ان کے تخیل میں عالمگیر حریت کا پیامبر مذہب نہیں رہا تھا، بلکہ ایک مقید اور تنگ مذہب سے آگے ان کا تصور نہیں بڑھتا تھا، آزاد خیالی اور حریتِ فکر کا علم بردار مذہب مولویوں اور پیروں کی تنگ خیالی کا شکار ہو گیا"، (ص ۱۷۱)

آٹھویں صدی ہجری کے بعد علمائے دین کی جو حالت ہو گئی تھی، اس لحاظ سے مصنف کا لہجہ پھر بھی نرم ہے،

> "لیکن حالت یہ ہو گئی، کہ علماء جنھیں صحیح روایات اور اسلامی تعلیمات کا محافظ ہونا چاہئے تھا،

ان کی توجہ مذہبی رسوم کی معمولی جزئیات تک محدود ہو کر رہ گئی، حقیقت یہ ہو کہ یہ رویہ شریعت سے انحراف کے ہم معنی تھا۔ (ص ۱۶۳)

"تقدیر" پر بے جا اعتماد اور "توکل" کو غلط سمجھنا، مصنف کے نزدیک جمہور کی اقتصادی تباہ حالی کا ایک بڑا سبب ہے، (ص ۱۶۷) اشخاص کا مسلمانوں کے مفاد پر حاوی ہو جانا بھی مسلمانوں کی تباہی کا باعث ہوا، شخصی اغراض اور ذاتی برتری کے جذبہ کے ماتحت اسلامی حکومتوں کے ٹکڑے ٹکڑے بھی اسی شخصیت پرستی کے باعث ہوئے، اور زیادہ افسوس یہ ہے، کہ مذہبی جذبات کو ہوا دے کر اپنے اغراض کو پورا کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا گیا، (ص ۱۶۱)

خلاصہ یہ کہ مصنف کے نزدیک مسلمانوں کے انحطاط کے چار اہم اسباب یہ ہیں:-

۱- ملا پرستی اور دینی تعلیم کا محدود ہو جانا، (ص ۱۷۱-۱۷۴)

۲- شخصیت اور استبداد پرستی (Autocracy) (ص ۱۶۱)

۳- اسلاف کے کارناموں پر بے جا تکبر، (ص ۱۷۶)

۴- احکام مذہب کی تعمیل سے غفلت اور انحراف (ص ۱۶۱)

ایک طرف علماء اور عام مسلمانوں کی یہ حالت تھی، دوسری طرف صلیبی جنگوں کے بعد یورپ کا اقتدار روز بروز بڑھنے لگا، تاآنکہ اٹھارویں صدی کے اواخر و انیسویں صدی میں ہم مسلم حکومتوں کو زندگی و موت کی کشمکش میں گرفتار پاتے ہیں،

لیکن مسلمانوں کی یہ کمزوریاں اپنی آپ پیدا کردہ تھیں، خود اسلام میں زمانہ کے مقابلہ کی پوری طاقت موجود ہے، جوں جوں علماء کا جمود بڑھتا گیا، مصلحین اور مجددین بھی ظہور پذیر ہونے لگے، آٹھویں صدی ہجری میں امام ابن تیمیہ[1] نے پہلے پہل اعتدال کی راہ دکھائی، اور جمود (ملائیت) و جمود

---

[1] ابن تیمیہ مولود ۶۶۱ھ متوفی ۷۲۸ھ۔

(مذہب سے انحراف) کے خلاف علم جہاد بلند کیا، ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد امام ابن قیم کے بعد یہ آواز پھر چند صدیوں کے بعد شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب نے بلند کی، مصنف نے عام خیال کے مطابق لکھا ہے کہ محمد بن عبد الوہاب امام ابن تیمیہ کی تصنیفات سے متاثر ہوئے تھے، (ص۱۷۱) لیکن محققین اور اہل نظر کا خیال ہے کہ ابن تیمیہ کی کتابیں، شیخ الاسلام تک نہ پہونچ سکی تھیں، بہرحال یہ ایک مستقل بحث ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، کہنا یہ ہے کہ محمد بن عبد الوہاب نے پہلے پہل بدعات اور عام زبون حالی کے خلاف مؤثر عملی قدم اٹھایا، ہمیں مصنف کی اس رائے سے بھی اختلاف ہے، کہ ہندوستان کی وہابی تحریک اور شمالی افریقہ کی سنوسی دعوت پر نجد کی محمدی تحریک کا اثر تھا، یہ غلط فہمی اصل میں مغربی مصنفین کو ہوئی ہے ہم نے اسکی مدلل تردید ایک دوسرے مضمون میں کی ہے[1] نجد کی وہابی تحریک، اور گذشتہ صدی کی دوسری اصلاحی تحریکوں کا مختصر ذکر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ (اسلام اور احمدیت) میں بھی آگیا ہے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، (حاضر العالم الاسلامی جلد ۴، ص ۱۶۱-۱۶۲)

قدرتی طور پر ابن تیمیہؒ، ابن قیمؒ، محمد بن عبد الوہابؒ، سنوسیؒ، سید احمد بریلویؒ، اسماعیل شہیدؒ کی تحریکات عام یورپین کتابوں میں اچھی طرح بیان نہیں کی گئی ہیں، اسی لئے "اسلام کے ارتقا" کے سلسلہ میں مصنف ان تحریکوں کا حق ادا نہ کر سکے اور اسکی جانب راقم الحروف نے مختصر طور پر اشارہ کر دینا ضروری خیال کیا، ہندوستان کی اسلامی تحریک جہاد (جو "وہابیت" کے نام سے مشہور رہی ہے) کا تو نام بھی نہیں آیا،

اس کے برعکس سرسید احمد خان مرحوم کی ان کوششوں کا ذکر پرزور الفاظ میں کیا گیا ہے

---

[1] ملاحظہ ہو، (وہابیت: ایک دینی و سیاسی تحریک) الہلال، پٹنہ، اپریل، مئی، جون ۱۹۶۸ء، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں محمد بن شنب جزائری نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے،

جو انھوں نے ارتقاے اسلام کے سلسلہ میں انجام دی تھیں (ص۸۱) سرسید اسکول کے متبعین اور ان کے نقطۂ خیال کی ترجمانی کرنے والوں میں مولوی چراغ علی، سید امیر علی، اور صلاح الدین خدابخش کی خدمتوں کو بھی سراہا گیا ہے،

مصنف نے حکیم اجمل خاں مرحوم اور جامعہ ملیہ کا ذکر بھی کیا ہے لیکن وہ اسے علی گڈھ تحریک سے الگ نہیں قرار دے سکے (۱۰۰) البتہ جامعہ کی خصوصیت کی طرف اشارہ موجود ہے، ہم ایک مصری صاحب قلم سے جو یورپ میں بیٹھ کر کتاب لکھ رہا ہو، یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ ہر ہر جزئیہ کو ٹھیک ٹھیک سمجھے، پھر بھی ڈاکٹر زکی علی اپنی اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں،

ہندوستان کی جدید تحریکوں کے سلسلہ میں وہ حضرت علامہ اقبالؒ کو خوب سمجھے ہیں، اور ان کے افکار و خیالات کی صحیح ترجمانی کی ہے، علامہ کے خطبات "جو تشکیل جدید ......" کے نام سے چھپے ہیں، ان کی نظر سے گذر چکے ہیں، جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے، ڈاکٹر عبد الوہاب عزام (استاذ فارسی، جامعہ فواد الاول، قاہرہ) کے بعد، ڈاکٹر زکی علی، دوسرے مصری بلکہ عربی اہل قلم ہیں، جو حضرت علامہ کی منزلت پہچاننے میں کامیاب ہوئے ہیں، اس سلسلہ میں مصنف نے ایک مغربی فاضل (Martin Sprengling) کی ایک تحریر بھی نقل کی ہے، جو چیکاگو کے رسالہ Christendom میں شائع ہوئی تھی، ظلم ہوگا، اگر ناظرین کو اس لذت میں شریک نہ کیا جائے مصنف رقمطراز ہیں:۔

"سر اقبالؒ کی اس تصنیف (تشکیل جدید) کی صحیح قدر و قیمت ظاہر کرنے کیلئے مناسب ہوگا اگر ہم ایک لائق مغربی فاضل کی رائے نقل کر دیں خاصکر اس نقطۂ نگاہ سے کہ اس میں مغرب و

Reconstruction of Religious Thought in Islam

ٹہ جامعہ مصریہ کا نام بدل کر اب جامعہ فواد الاول رکھ دیا گیا ہے،

اسلام کے تعلقات کی طرف اشارہ ہے،

"ایک محدود اور مخصوص حلقہ کے علاوہ عام طور پر سر محمد اقبال سے مغربی دنیا کما حقہ واقف نہیں،...... محمد اقبال ممکن ہے مورخ نہ ہوں لیکن وہ ایک انتہائی اعلیٰ طبقہ کے مذہبی اور ماہر دینیات (Theological) فلسفی ہیں، اور غیر معمولی قابلیت کے معدن لعل وگہر، چونکہ وہ مسلمان ہیں، اسلئے مغرب کے لئے ان کا پہچاننا اتنا آسان نہیں، جتنا گنجلک (abstruse) اور مبہم (obscure) ٹیگور رہا...... گاندھی کا یونہ میں روزانہ نئے مفکرین، نئے مقررین، شہرت یافتہ مصنفین کا انکشاف ہوتا رہتا ہے، ہندوستان، چین اور جاپان سے نت نئے فلسفیانہ، سیاسی، فنی خیالات کی درآمد ہوتی رہتی ہے،...... ہم یہاں یورپ کو ایک نہایت غیر معمولی، اور حیرت انگیز جوہر سے روشناس کرانا چاہتے ہیں، ایک سچا متجدد مسلمان، جو مغرب کی اعلیٰ سے اعلیٰ ترین شخصیتوں کے مقابلہ میں اگر ہر اعتبار سے قابل ترجیح نہیں، تو برابر ضرور ہے، الخ، (ص ۱۸۱-۲)

ترکی کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف نے سعید حلیم پاشا کی اصلاحی تحریک کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، وہ دراصل خلافت راشدہ کے تخیل کو عصری (ماڈرن) جامہ پہنانا چاہتے تھے، صحیح اسلامی حکومت کے قیام کی فکر انھیں برابر لگی رہی، ان کے خیالات کا اندازہ لگانے کے لئے ان کا رسالہ[1] "مسلم سوسائٹی کی اصلاح" (The Reform of Muslim Society) کافی ہے،

---

[1] اس مضمون کی طرف اشارہ ہے، جو سعید حلیم پاشا مرحوم نے اپنی شہادت سے کچھ ہی دنوں پہلے ایک فرنچ رسالہ کیلئے لکھا تھا، اس میں ان اسلامی خیالات کا خلاصہ یا ان کی جھلک موجود ہے، جو مرحوم نے اپنی مشہور ترکی کتاب اسلاملشمق (Islamlashmaq) میں ظاہر کئے تھے، اس کا انگریزی ترجمہ عبدالقیوم صاحب ملک کے قلم سے اسلامک کلچر جنوری ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا تھا، اب انجمن خدام الدین لاہور نے مستقل رسالہ کی صورت میں شائع کر دیا ہے،

امام سید جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہ اور ان کی تحریکوں پر بھی اچھی خاصی روشنی ڈالی گئی ہے،
سید رشید رضا مرحوم کی خدمات کا ذکر بھی شاندار الفاظ میں کیا گیا ہے،

مصر کی تحریک تجدد (ماڈرنزم) کا بھی سرسری ذکر آیا ہے، اور اس کے علم برداروں میں قاسم امین، فرید وجدی، علی عبد الرزاق کے نام لئے گئے ہیں، (۱۸۶) اب اس "تجدد" کے کارنامے بھی مختصر طور پر اس حقیر کی زبانی سُن لیجئے ؛:-

قاسم امین اس وقت مصر میں عورتوں کے نجات دہندہ خیال کئے جاتے ہیں، سب سے پہلے انہی نے پردہ کے خلاف آواز بلند کی، اور آج مصر کی عورتیں انہی کی بتائی ہوئی راہ پر چل کر اس نقطہ پر پہونچ گئی ہیں، جہاں یہ سوال پیدا ہو گیا ہے کہ وہ عورتیں بھی رہیں، یا نہیں، ؟ اور اب خود وہ اس بے پردگی کے نتائج سے گھبرا کر چلا اٹھی ہیں، عزیزہ عباس عصفور، مدرسۃ الحقوق (لا کالج) کی ایک طالبہ کی مہم اور جہاد، قاسم امین کا ردِ فعل ہے،

فرید وجدی اور علی عبد الرزاق ابھی زندہ ہیں، فرید وجدی کا عالم ضعیفی میں بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ ترکی، البانیہ اور بعض دوسری حکومتوں کے خلاف شریعت قانون کی پر زور حمایت کرتے ہیں ان کے نزدیک اذان اور نماز کی ادائگی اصل ماثور اور عربی کلمات میں ناجائز قرار دی گئی، تو کوئی ہرج نہیں، ان کے خیال میں کمالی حکومت کا ہر فعل قابلِ ستایش ہے، تین چار سال ہوئے الفتح (مصر) کے صفحات پر علامہ مصطفےٰ صبری (سابق شیخ الاسلام حکومتِ عثمانیہ) اور فرید وجدی کے درمیان زبردست معرکہ آرائی ہوئی تھی، پھر امیر شکیب درمیان میں آپڑے اور انھوں نے بھی وجدی صاحب کو قائل کرنے کی کوشش کی، لیکن ان کا یہ عذر تھا، (الاتراک فی حالۃ ثورۃ لم تنتہ بعد) [1] ترک ابھی ہیجان کی حالت میں ہیں، اسلئے ان کی غلطیاں لائق درگذر ہیں،

[1] یہ انہی کا فقرہ ہے اور امیر شکیب نے اسی کو اپنے مضمون کا سرنامہ قرار دیا تھا،

لیکن یہ منطق ہماری سمجھ میں نہیں آتی، یہ مانا کہ ان سے غلطیاں ہیجان کے عالم میں سرزد ہوئیں اور ہو رہی ہیں لیکن اس سے انکے غلط اعمال کی مدح وستایش کیوں ضروری قرار دیجاتی ہے، ؟ محبت سے انھیں متنبہ کیوں نہیں کیا جاتا، ؟

علی عبد الرزاق، فرید وجدی اور قاسم امین کے ہم پلہ یا کسی غیر معمولی قابلیت کے آدمی نہیں ان کا واحد "متجددانہ" کارنامہ ان کی تالیف (الاسلام واصول الحکم) ہے جس میں انھوں نے خلافت سے انکار کیا ہے، ان کے خیال میں خلافت راشدہ کوئی دینی چیز نہیں تھی، رسول کریم (ص) کے بعد کسی نہ کسی طریقۂ مملکت کا ہونا ضروری تھا حضرت ابو بکر رض اور حضرت عمر رض (وغیرہما) اتفاق سے منصب حکومت پر حادی ہو گئے"[1] یہ وہی کتاب ہے جس کا ۱۹۲۵ء میں بڑا غلغلہ تھا، ازہر کی سرکار نے علی عبد الرزاق صاحب کی عالمیت کی سند ضبط کر لی تھی، اور قضا کا عہدہ[2] انھیں خالی کرنا پڑا تھا، ان کے رد میں متعدد کتابیں بھی شائع ہوئی تھیں،

اس باب کے آخری صفحات (۱۹۴-۱۰۷) میں مصنف نے موجودہ تجدد کی لہر اور اسلامی یکجہتی میں تطابق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، دوسرے الفاظ میں وہ موجودہ تفرنج اور مغربیت کے سیلاب سے مایوس نہیں، نہ اسلامی ملکوں میں افرنگی قومیت وطنیت کے جذبات کی پرورش سے وہ بددل ہیں، پنڈت جواہر لال نہرو کے جواب میں، حضرت علامہ اقبال رح نے چند سال پیشتر[3] جو کچھ لکھا تھا، اس سے مصنف کو بہت تقویت ملی، ملت اسلامیہ کے نبض شناس نے سوشلسٹ پنڈت کے اس خیال کی سختی سے تردید کی تھی، کہ اس وقت اسلامی یکجہتی (Solidarity) کا

---

[1] سنا ہے، کہ وفدی حکومت کے دور میں انھیں پھر سرکاری منصب سے سرفراز کیا گیا ہے

[2] ملاحظہ ہو (Islam and Ahmadism) شائع کردہ انجمن خدام الدین، لاہور

کہیں وجود نہیں؛

مغربی مصنفین نے مصر کی فرنگیت کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے، مصنف نے بھی ان کے بعض اقوال نقل کئے ہیں لیکن اب مصر کے حالات بدل رہے ہیں، ہوا کا رُخ اسلامیت کی طرف ہے، ۱۹۲۶ء میں المنار ماہانہ کے سوا کوئی اسلامی رسالہ یا اخبار نہیں تھا، کوئی قابلِ ذکر اسلامی انجمن نہیں تھی، ادبی رسالے عربیت اور اسلامیت کے بدلے مصریت اور فرعونیت کے نعرے بلند کرتے تھے لیکن آج متعدد اخبار اور رسالے موجود ہیں جمعیۃ الشبان المسلمین کا جال ملک کے گوشہ گوشہ میں بچھا ہوا ہے، محمد حسین ہیکل[۱] جیسے "فرعونیت" کے علمبردار حیاۃ محمد (ص) اور فی منزل الوحی جیسی کتابیں لکھ رہے ہیں، احمد حسن الزیات کے ماہ نامہ الرسالہ[۲] (جو اس وقت سب سے اونچا ادبی رسالہ ہے،) کا ہر سال ہجرت نمبر شائع ہوتا ہے، خلاصہ یہ کہ مصر عاجز کے مطالعہ کے مطابق تیزی سے عربیت اور اسلامیت کی طرف آرہا ہے، مصنف نے اس کی توضیح کما حقہٗ نہیں کی،

قومیت اور وطنیت کے متعلق ہم ڈاکٹر زکی علی کے خیال سے متفق ہیں، کہ عربی ملکوں میں وطنیت کی غلط تحریک اب اسلامیت سے ٹکر نہیں لے گی یعنی ممالک عربیہ کی آزادی کے بعد اس کا پورا امکان ہوگا، کہ یہ حکومتیں ایک الگ مجلس اقوام میں شریک ہوں، مسلم حکومتوں اور قوموں میں اتنی پھوٹ نہیں جتنی مغربی اہلِ قلم بیان کرتے ہیں، خود یورپ کی بسنے والی قوموں میں کون سا جذبۂ اتحاد کار فرما ہے،؟ شاید مظلوموں پر تعدی کے سوا کسی مسئلہ میں ان کا اتحادِ خیال دشوار ہو،

"سوسائٹی کی ساخت سیاسی خیالات اور دوسرے اعتبارات سے یورپ کے مختلف

---

[۱] سابق ایڈیٹر السیاسۃ اور حال وزیر تعلیم، [۲] الرسالہ اور اوس کے سالانہ (ہجرت نمبر) کا مصنف نے بھی شاندار الفاظ میں ذکر کیا ہے، (ص ۱۹۲)

ملکوں کا باہمی اختلاف، اسلامی دنیا سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا ہے خصوصیت کے ساتھ اجتماعی اور ثقافتی خصوصیات اور عادات میں اسلام یورپ سے کہیں بڑھ چڑھ کر ایک وحدت کی حیثیت رکھتا ہے، (ص ۱۹۱)

مختلف اصلاحی تحریکوں سے یہ غلط فہمی نہ ہونا چاہئے کہ ان کا رخ مذہب اور قرآن کی تعلیمات کے خلاف ہوگا، مصنف اس باب مین مطمئن ہین، (ص ۳-۱۹۲) ہم گو گو کے عالم میں حالات و واقعات کا مطالعہ کر رہے ہیں،

پہلے حصہ کے آخری باب (ص ۲۱۰-۱۹۵) میں "اسلام اور مغرب" کی کشمکش پر بحث ہے، اسلام کی ترقی اور اس کے حلقۂ اثر کی وسعت کے ساتھ ہی اسے "مسیحیت" سے نبرد آزما ہونا پڑا، "اسلام اور مسیحیت" کی اس دیرینہ کشمکش کو آج "اسلام اور مغرب" کے نزاع سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے یہ کشمکش میدان جنگ تک محدود نہ تھی، زبان و قلم بھی اس معرکہ آرائی میں شریک ہوئے، اس سلسلہ میں یہ حقیقت خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے کہ مسلمانوں نے تمام رد و کد میں حضرت عیسیٰؑ کی شخصیت کا احترام ہمیشہ ملحوظ رکھا، لیکن مغربی مسیحیوں نے نبی کریم (ص) کی ذات گرامی کو بھی اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا، اور نہ صرف اسی قدر بلکہ ناپاک اور گندہ بہتان طرازیوں میں بھی انھوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی،

صلیبی جنگوں کے دوران میں اور ان کے بعد مغرب کی یہ دشنام طرازیاں اور بڑھ گئیں کلیسا والے گویا مسلمانوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کا عزم مصمم کر چکے تھے، پطرس راہب کی دعوت، عیسائی مقاماتِ مقدسہ کو "مشرکوں" کے قبضہ سے نکالنے کا عزم مصمم، مسلمانوں کے قاتلین کو جنت کی بشارت، امراء کو نئے مقبوضات کی تلاش، مشرق کے بازار کی طرف تاجرانِ مغرب کی للچائی ہوئی نظریں یہ اسباب تھے، جن کے ماتحت مسیحی مغرب، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف از سرِ نو پھر معرکہ آرا ہوا، یہ تنفر اور

عداوت صلیبی جنگوں کے بعد بھی عرصہ تک باقی رہی (ص ۱۹۶) اور کون کہہ سکتا ہے، کہ آج بھی یہ چیز باقی نہیں ہے، ؟ لباس و وضع کی تبدیلی سے دلوں کی تبدیلی نہیں ہوا کرتی،

مغرب کی عداوت صرف مذہب اور مذہبیات تک محدود نہیں رہتی، ایک صدی پیشتر تک یہ حال تھا، کہ اسپین کی تاریخوں میں عربوں کا دور نظرانداز کر دیا جاتا تھا،

مصنف نے اسلام اور نصرانیت کا بنیادی فرق اچھی طرح واضح کرنے کی کوشش کی ہے، نیز عیسائیوں کے ساتھ مسلمان بادشاہوں کا حسن سلوک اور اس کی موٹی موٹی مثالیں بھی دکھائی گئی ہیں، (ص ۲۰۲-۱۹۹) آرنلڈ پریچنگ آف اسلام ص ۸۸) اور بعض دوسرے افرنگی مصنفین کے حوالہ سے مصنف نے سلطان صلاح الدین کے حسن سلوک کی متعدد مثالیں دی ہیں، آرنلڈ نے یہان تک لکھا ہے کہ صلیبی مجاہدین کی وحشت و بربریت، اور صلاح الدین ایوبی کی انسانیت اور رواداری دیکھ کر خود صلیبی فوج کے افراد بہ کثرت حلقہ بگوش اسلام ہوگئے، ایک طرف اندلس مرحوم میں عربوں کے اخراج کے بعد باقی ماندہ لوگوں کے ساتھ شیدائیان مسیح کا برتاؤ ہے، دوسری جانب جنگ صلیبی کے بعد، صلاح الدین اور ان کے جانشینوں کا حسن سلوک، مسیحی عبادتخانوں اور فلسطین کے عیسائی باشندوں کے ساتھ ہے' دور جانے کی ضرورت نہیں دونوں کے نتائج آنکھوں کے سامنے ہیں، آج اسپین کو ہم اندلس مرحوم کہہ کر پکارتے ہیں، اور وہان مسلمان کا نام و نشان باقی نہیں، اس کے برخلاف فلسطین میں تمام گرجے اور معابد انگریزی بربریت کا منظر دیکھنے کے لئے صحیح و سالم موجود ہیں، تمام عیسائی خانقاہیں، مختلف فرقے ارتھوڈکس جن کا یورپ میں نام و نشان مٹا دیا گیا، آج فلسطین مین ایوبیوں اور عثمانیون کے دور عدل و انصاف کی داد دینے کے لئے موجود ہیں یہی نہیں، بلکہ وہ آج اپنے مسلمان بھائیوں کے دوش بدوش خود یورپ کے عیسائیوں کے خلاف نبرد آزما ہین،

دنیا کی بدنصیب اور مفسد قوم یہود پر مسلمان فرمانرواؤں کے احسانات ان گنت ہیں، مصر، شمالی افریقہ، اور دوسری اسلامی حکومتوں میں انھیں کافی اعزاز و رسوخ حاصل تھا، مسلمان جہاں پہنچے ان کے لئے نوید بشارت لیکر گئے، عیسائیوں کی غلامی سے انھیں نجات ملی لیکن قدرت کا تماشا دیکھئے، آج وہ بھی جان کے گاہک ہیں، آل عثمان کی مملکت میں یہود کو جو سہولتیں اور امتیازات حاصل تھے، ان کا تفصیلی تذکرہ کتاب میں موجود ہے، (ص ۶-۲۰۵)

یہ تو عہد قدیم اور قرون وسطیٰ کی باتیں تھیں، یہ اس وقت کی داستان تھی، جب ہم کچھ تھے، اپنی مظلومیت کا دکھڑا اگر سنایا جائے، تو رات بیت جائے، پر افسانہ ختم نہ ہو،

"مغرب کی تین پرانی پیش قدمیوں (اسکندر، روم، صلیبی) کے بعد، اب چوتھی بار یورپ موجودہ زمانہ میں حملہ آور ہوا ہے، یہ حملہ بہت وسیع، مسلسل اور دور رس ثابت ہوا ہے ولندیزیوں (ڈچ) اور پرتگالیوں کی مذہبی اور تجارتی کوششوں کے نقش قدم پر، فرانس، انگلستان، اور روس تینوں تین صدیوں سے ایک سہ گانہ ہم کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں، پہلے مذہبی تبلیغ، پھر تجارتی ترغیب، اس کے بعد مسلح دست بردیا قبضہ"

(ص ۲۰۶)

سو برس سے یہ حملہ زیادہ سخت اور جارحانہ ہو چکا ہے، اس میں شک نہیں، کہ اب مشرق کی اسلامی آبادی بیدار ہو چکی ہے، لیکن مشرق کے بیدار ہوتے ہوتے تمام مقبوضات کے حصے بخرے ہو چکے تھے، اور تو اور، بیسویں صدی کے آغاز میں ترکی، ایران، اور افغانستان، معاشی منطقوں (ZONEZ) میں تقسیم ہو چکے تھے،

کتاب کے دوسرے حصہ میں مصنف نے مسلمانوں اور مشرق کی بیداری، نیز موجودہ حالات پر سیر حاصل بحث کی ہے، اسلئے یہاں اسے چھیڑنے کی ضرورت نہیں، اس باب میں فاضل مصنف نے مغربی

استیلا کا تاریخی تجزیہ کیا ہے، جو قابل مطالعہ ہے، فرانس، انگلستان، اطالیہ نے اپنی سیاسی برتری کے تحفظ کی خاطر جو تعلیمی مہم جاری کی اس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اور جو کچھ لکھا گیا ہے، مستند بیانات اور واقعات کی روشنی میں (ص ۲۰۹-۲۱۰) اقتصادی دباؤ کے چہرہ سے بھی نقاب ہٹائی گئی ہے، (ص ۲۱۲) تمدن کے نام پر مغربی قوموں نے جو انسانیت سوز مظالم روا رکھے ہیں، ان پر بھی گہری نظر ڈالی گئی ہے، (ص ۲۱۴)

خلاصہ یہ کہ مصنف نے اخباری زبان میں مغرب کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا ہے، جگہ کی تنگی کے باعث اقتباسات نہیں دیئے جا سکتے، آخر میں مصنف نے "یورپ" کو ایک تنبیہ کی ہے، جو ہم انہی کے الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں:-

"مغرب کا تاثر اسلام کے متعلق واضح اور صحیح ہونا چاہیئے، اسے اسلام کے بنیادی مقاصد جاننا اور سمجھنا چاہئیں، اسے جاننا چاہیئے، کہ اسلام ایک "عقیدہ" کا مذہب ہے، اسلئے عمل کا اور عقل کا مذہب ہے، اسلئے صداقت کا اور فطرت کا مذہب ہے، اسلئے آزادی کا اور علم کا مذہب ہے اسلئے ترقی کا اور اقتدار کا مذہب ہے، اسلئے انضباط کا اور ایقان کا مذہب ہے، اسلئے شدتِ عمل کا اور (جسے یورپ میں خواہ مخواہ "وحشت" (Fanaticism) کہا جاتا ہے) اخوت کا مذہب ہے، اسلئے مساوات کا اور اتحاد کا مذہب ہے، اسلئے انسانیت عامّہ کا اور، اللہ کی قدرت پر اعتماد کا مذہب ہے، اس لئے سکون کا بھی ہے، اور یورپ کو یہ حقیقتیں جاننا اور ذہن نشین کرنا چاہئیں" (ص ۲۱۸)

ہم نے قصداً اصل انگریزی اسلوب بیان کی تقلید کی ہے، تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ مصنف نے جو کچھ لکھا ہے، وہ علم کیساتھ ساتھ عقیدت اور ولولہ سے لکھا ہے، اور سچ پوچھئے، تو یوں کہنے کو جو کچھ کہا جائے لیکن عقیدت اور ولولہ کے بغیر تحریر میں جان نہیں پیدا ہوتی،

کتاب کا پہلا حصّہ یہاں ختم ہوجاتا ہے، دوسرے حصّہ میں کل چار باب ہیں:-

گذشتہ ابواب میں پوری اسلامی تاریخ پر تبصرہ تھا اس حصہ میں صرف موجودہ حالات پر بحث ہے، اور معلومات کے تنوع کے لحاظ سے یہ حصّہ کتاب کی جان ہے، گو پہلے حصّہ کے بعض ابواب بھی بہت قیمتی ہین،

اس سلسلہ میں سب سے پہلے موجودہ بیداری کی تفصیل کی گئی ہے، یوں تو جنگ عظیم سے پہلے دنیا کے مسلمان خواب غفلت سے بیدار ہو چکے تھے لیکن اس کے نتائج جنگ کے بعد ظاہر ہوئے عثمانی حکومت کے کھنڈرون پر متعدد مستحکم اسلامی حکومتون کی دیوارین کھڑی ہوگئیں، اور جو پابند قفس رہ گئے، وہ بھی رہائی کی ہر ممکن کوشش عمل میں لا رہے ہین،

ترکی جنگ کے بعد ایک متجانس (Homogeneous) مستحکم حکومت کی شکل میں نمودار ہوئی، ایران، روس اور برطانیہ کی چشمک سے آزاد ہو کر مستقل آزاد سلطنت کا مالک ہے، روس اور برطانیہ کی بازیگاہ افغانستان بھی اپنی آزادی حاصل کرنے مین کامیاب ہو چکا ہے، وہابی فرمانروا ابن سعود کے زیر اثر عرب کا علاقہ بھی آج حیات نو حاصل کرکے شاید ہزار برس کی زبون حالی کے بعد دنیا کی سیاست میں اہمیت حاصل کر رہا ہے عراق ایک آزاد دستوری حکومت بن چکا ہے، مصر بھی آخر پچاس سال کی برطانوی غلامی کے بعد آزاد حکومت بن کر رہا، شام اور فرانس میں سمجھوتہ ہو چکا ہے، اور عنقریب شام کو

آزادی[1] کا پروانہ مل جائے گا، یمن بالکل آزاد ہے، اور البانیہ بھی قاعدہ کے لحاظ سے استقلال کا مالک ہے، فلسطین اپنی آزادی کی حصول کی خاطر بیش از بیش قربانیاں پیش کر رہا ہے، شمالی افریقہ میں بھی قومی تحریک روز بروز زور پکڑتی جارہی ہے،

(ص ۲۲۱-۲۲۲)

یہ بیداری صرف قومی یا سیاسی نہیں ہے، بلکہ ذہنی، اجتماعی، معاشی اور مذہبی زندگی کے تمام شعبوں تک اس کا اثر پھیلا ہوا ہے، تمام دنیاے اسلام اس وقت ایک تغیر کے عالم میں ہے، اور یہ تبدیلی مشرق قریب میں زیادہ سرعت کے ساتھ عمل میں آرہی ہے، مصنف نے اس باب میں مشرق قریب کی مختلف تحریکون کا جائزہ لیا ہے، اونھون نے نمونہ کے طور پر مشرق قریب کا انتخاب کیا ہے، اور راقم الحروف کے خیال میں اتنی تفصیلی معلومات ہندوستان اور چین وغیرہ کے متعلق انھیں ہو بھی نہیں سکتی تھیں، بہرحال عربی ممالک کی تمام ادبی و اجتماعی و دینی تحریکون اور بیداری کے ہر شعبہ پر نظر ڈالی گئی ہے، البتہ سیاسی ارتقاء کی بحث آیندہ باب کے لئے خاص کر دی گئی ہے،

عربی ممالک کی بیداری کے سلسلہ میں مصر کو بجا طور پر قیادت کا فخر حاصل ہے، مصری اخبارات اور مطبوعات سے پوری عرب آبادی متاثر ہوئی ہے، مراکش، الجزائر، تونس، طرابلس، سوڈان، زنجبار، حبشہ، حجاز، یمن، عراق، شام، عدن، نزدیک و دور جہاں بھی عربی بولنے والے بستے ہیں، مصری اخبارات اور مصری تحریکوں کے اثرات وہاں محسوس طور پر نظر آئین گے ۱۹۳۵ء میں مصر میں سیاسی ہیجان کا پیدا ہونا تھا کہ شام میں آگ لگ گئی، اور ابھی شام کا مسئلہ طے بھی نہیں ہوا تھا،

[1] سمجھوتہ تو واقعی ہو چکا تھا، اور مصنف کی طرح ہر شخص کو یقین تھا کہ مصر و عراق کے درجہ کا معاہدہ ضرور ہو جائیگا لیکن آخری اطلاعات یاس انگیز معلوم ہوتی ہیں، ابھی قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا، ممکن ہی شام کے غیور باشندوں کو ایک دفعہ اور زور آزمائی کرنا پڑے،

کہ فلسطین نے آخری طور پر جان کی بازی لگادی، مراکش میں از سرنو زندگی پیدا ہوئی، اور اب طرابلس میں پھر احساس پیدا ہو رہا ہے،

وحدت عربیہ کی تحریک اب خواب نہیں رہی فلسطین کے سلسلہ میں عربی حکومتیں اور عرب جس طرح ایک قوم بن گئے ہیں، اس کی مثال کم از کم ہندوستان تو پچاس سال تک پیش نہیں کر سکتا مصر نے فلسطین کے سلسلہ میں بھی قیادت کی باگ اپنے ہاتھوں میں رکھی ہے

اقتصادی تحریکوں میں بھی مصر پیش پیش ہے، مصری بنک کی سرگرمیاں اب آس پاس کے عربی علاقوں میں بھی پھیل رہی ہیں، کوثر اور زمزم نامی جہاز مصری حاجیوں کے لئے تیار کرلئے گئے ہیں، اور پچھلے دو برس سے تو مصری بنک اور اس کے بانی طلعت حرب پاشا، حجاز اور بسطح پر پورے دنیاے اسلام کی مفید خدمات انجام دیرہے ہیں،

مصر میں کسانوں اور مزدوروں کی تنظیم اور ان کی مستقل فلاح وبہبود کی کوششیں بھی ہو رہی ہیں، اور اس کے اثرات تمام عربی ملکوں میں محسوس کئے جارہے ہیں، (ص ۲۲۹)

مصنف نے ادبی تجدد اور ترقی پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے، جو عام طور پر انگریزی اور اردو جاننے والوں کیلئے ایک نئی چیز ہے،[1]

اسلامی ادبیات کے سلسلہ میں ڈاکٹر زکی علی نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے، کہ عربی، فارسی اور ترکی زبانیں، گو مختلف خاندانوں (عربی سامی زبان ہے، اور فارسی آرین یا انڈو یوروپین) سے تعلق رکھتی ہیں لیکن اسلام کے اثرات سب پر ہیں"، (ص ۲۳۳)

البتہ یہ اثر اب ایران کی جدید ادبیات میں بہت کم نظر آتا ہے، وہاں اب ایران کے پرانے

---

[1] عربوں کی قومی تحریک کے سلسلہ میں ہم نے ادبی تجدد پر بھی روشنی ڈالی ہے، ملاحظہ ہو (مدینہ جولائی ۳۷ء) اس کتاب میں معلومات اس سے زیادہ ہیں،

بادشاہوں (قبل اسلام) کا کلمہ پڑھا جاتا ہے، عربی اب تک دنیائے اسلام کی مذہبی زبان باقی ہے، لیکن ترکی سے عربی الفاظ کے اخراج نے عربی کی بین الملی حیثیت گھٹا دی ہے، (ص ۲۳۳)

مصنف نے عربی ادبیات عموماً اور مصری ادب پر خصوصاً پوری روشنی ڈالی ہے، اور تمام پہلوؤں کو اچھی طرح اجاگر کیا ہے، طوالت کا خوف مزید اقتباس دینے سے مانع ہے،

(ص ۲۲۹-۲۳۷)

مصنف نے طبعی طور پر مصر کی ادبی و ذہنی قیادت اور قاہرہ کی بین الملی حیثیت پر بہت زور دیا ہے، اور مختلف مثالوں سے مصر کی مرکزیت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، جس میں وہ پوری طرح کامیاب ہیں، (۹-۲۳۰) اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں تک ذہنی اور ادبی پیداوار کا تعلق ہے، مصر سب سے آگے ہے، اور مصر کی اچھائیاں اور برائیاں یکساں طور پر عربی علاقوں پر اثر انداز ہوتی ہیں، اس کی معمولی مثال یہ ہے، کہ حجاز اب تک صحافت میں کورا تھا، اب جو وہاں نوجوانوں کو شوق پیدا ہوا، تو وہی مصری معمولی رسالوں کی تقلید، وہی ادب لطیف (؟ یا کثیف) مہمل قصے یورپ اور جاپان کی تمام خبریں لیکن ہندوستان اور چین کے متعلق ایک حرف بھی نہیں،.....

مدینہ منورہ سے المدینۃ شائع ہوتا ہے لیکن اس میں آقائے مدینہ (روحی فداہ) کی بتائی ہوئی تعلیمات کا کہیں پتہ نہیں!! شکر ہے کہ مصر کو اپنی زعامت اور اسلامیت کا احساس پیدا ہو چلا ہے اگر یہ رفتار قائم رہی تو انشاء اللہ اس کے نتائج اچھے ہوں گے، بہرحال اس سے مصر کی مرکزیت اور قاہرہ کے ("Metropolis") ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا،

عربی کے ساتھ فارسی (۲۴۲-۲۴۰) اور ترکی (۲۴۵-۲۴۳) ادبیات کی تاریخ، اور موجودہ رفتار پر بھی اجمالی مگر غائر نظر ڈالی گئی ہے لیکن افسوس کہ اسلامی ادبیات کے سلسلہ میں ہماری (اردو) کا ذکر نہیں کیا گیا، گو یہ عربی کی طرح مالدار نہیں لیکن کم از کم ہندوستان کے مسلمانوں کی ذہنی حالت

کا صحیح اندازہ اردو ادبیات کے مطالعہ کے بغیر نہیں ہو سکتا، ہم نے یہ حقیقت عربی اخبارات میں بار بار ظاہر کی ہے، اور کوشش کریں گے، کہ مصنف تک اپنی شکایت پہونچائیں، تاکہ دوسرے ایڈیشن میں اردو کی حق تلفی نہ ہو، مصنف اس باب میں معذور تو ضرور تھے لیکن اگر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا (اردو) والا مقالہ بھی وہ پیش نظر رکھتے، تو کچھ نہ کچھ لکھ سکتے تھے،

نسوانی تحریک کی ترقی اور وسعت کا ذکر بھی شاندار الفاظ میں آیا ہے، (ص ۲۵۰-۲۴۵) اسمیں ترکی عورتوں کی آزادی اور بیداری کے گن گائے گئے ہیں، مصری خواتین کی بیداری بھی معرض بحث میں آئی ہے، فرق یہ بتایا گیا ہے کہ مصر کی تحریک اسلامی روایات سے وابستگی بھی قائم رکھے ہوئے ہے، (ص ۲۴۷) لیکن ہمیں یہ وابستگی کہیں نظر نہیں آتی، جو اسلامی قوانین موجود ہیں، وہ حکومت کی نگاہ کرم کا نتیجہ ہیں، عریانی، مخلوط تعلیم، مردانہ طرز تمدن، اور مغربی تہذیب کی تمام خرابیاں مصر میں نظر آتی ہیں، البتہ اب اس تباہ حالی سے عورتیں خود گھبرا اٹھی ہیں، اور اسکا ردعمل پیدا ہو رہا ہے، اور نہیں کہا جاسکتا، کہ آیندہ اس کا رخ کدھر ہو گا،؟

نوجوانوں کی بیداری اور ساتھ ساتھ تفریح، یا "مغرب زدگی" کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے لیکن مصنف کو یقین ہے کہ مذہب کی راہ سے وہ الگ نہیں ہوں گے، (ص ۲۵۰-۴)

اسلامی ملکوں کی بیداری کی تفصیل کے بعد ہر ملک پر الگ الگ نظر ڈالی گئی ہے، اور دنیائے اسلام کی آزادی (ص ۲۵۹-۲۵۵) پر مفصل بحث کی گئی ہے، ترکی سے لیکر ہر چھوٹے بڑے علاقہ کی سرگذشت بیان کی گئی ہے، اس مضمون کی محدود گنجایش میں ہمارے لئے ایک اجمالی تبصرہ کافی ہوگا، مصنف کے بیان کی تلخیص میں کہیں کہیں ضروری اضافہ اور معلومات کی تصحیح کر دی گئی ہے،

ترکی (ص ۲۵۵-۲۶۴)

عثمانی حکومت کا زوال دنیا کی تاریخ کا عظیم الشان واقعہ ہے، نئی جمہوریت کی داغ بیل

قومیت، صنعت، اور لادینیت (Secularism) کی بنیادوں پر رکھی گئی، ۳ مارچ ۱۹۲۴ء، الغائے خلافت کا دن ترکی کی تاریخ میں "نقطہ انحراف" کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے بعد مذہبی مدرسوں اور منصب قضا کی باری آئی، ساتھ ساتھ اوقاف کی ضبطی عمل میں آئی، چند مہینوں کے بعد (پہلی دسمبر ۱۹۲۵ء) ترکی ٹوپی کا پہننا جرم قرار پایا، اس کے بعد "درویشوں" کی جماعت خلاف قانون قرار پائی، اور اس سلسلہ میں ۳ دسمبر ۱۹۳۴ء کا قانون بھی قابل لحاظ ہے جس کی رو سے مذہبی لوگوں کو رسوم کی ادائگی کے علاوہ خاص لباس پہننے کا اختیار نہیں رہا،

الغائے خلافت کے بعد دوسرا اہم قدم ۲۴ مئی ۱۹۲۸ء کو اٹھایا گیا، لاطینی رسم الخط کا استعمال جبری قرار دیا گیا (پہلی جنوری ۱۹۲۹ء) مصنف کے بیان کے مطابق اس سے خواندگی کا اوسط بڑھ گیا، گو عربی اخبارات یہ ظاہر کرتے ہیں، کہ اس سے لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد گھٹ گئی ممکن ہو یہ تبدیلی کا فوری اثر رہا ہو، ترکی کی موجودہ تعلیم، ایک نظام کی پابند (یعنی تعلیم کا سارا نظام حکومت کے ہاتھ میں ہے) اور مخلوط ہے، ایک اچھی بات یہ ہوئی، کہ لادینیت کے پروگرام کے نفاذ کے ساتھ ساتھ غیر ملکی مشنریوں کی راہ بھی روک دی گئی، ۹ اپریل ۱۹۲۸ء کو دستور میں ایک اہم تبدیلی ہوئی، جسکے ذریعہ دستور سے مندرجۂ ذیل فقرہ حذف کر دیا گیا،

"ترکی حکومت کا مذہب اسلام ہے"

اسلامی قانون کے بدلے ایک مغربی قانون (جو فرنچ، سوئس، جرمن، اور لاطینی قوانین پر مبنی ہے) پر عمل درآمد شروع ہوا، عورتوں کی حیثیت بالکل بدل گئی، تعدد ازدواج ممنوع قرار پایا، سول میرج، ضروری ہو گیا، پردہ کا رواج صرف پروپگنڈا سے ختم ہو گیا، عورتوں کو تمام سرکاری ملازمتوں میں جگہ دی گئی،

یہ مذہبی اور اجتماعی اصلاحات کی ایک مختصر فہرست ہے، جو مصنف نے بلا کسی اظہار رائے

کے پیش کر دی ہے، ہم بھی اس پر اظہار خیال کرنا نہیں چاہتے، صرف اتنا عرض کر دینا نامناسب نہ ہوگا، کہ ہمیں ان اصلاحات کو شریعت کی کسوٹی پر رکھ کر جانچنا چاہئے، یہ بیانات کسی مغربی مصنف کی خیال آرائی کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک "ماڈرن" مسلمان نے جو ترکوں سے محبت رکھتا ہے، یہ معلومات فراہم کی ہیں،

اجتماعی اور ثقافتی اصلاحات کے ساتھ ساتھ ملک کی اقتصادی خوش حالی کا خیال بھی برابر پیش نظر رہا، بنکوں کے نظام کی تجدید کی گئی، انھیں غیر ملکی اثرات سے نکال لیا گیا، ۳۳ئہ میں ایک پنجسالہ اسکیم کی طرح ڈالی گئی،

سیاسی اعتبار سے ہمسایوں کے ساتھ ترکی کا رویہ دوستانہ رہا، روس سے دوستانہ روابط استوار کئے گئے، (لیکن اشتراکیت کی تبلیغ حدود مملکت میں سختی کے ساتھ ممنوع ہے) ۲۵ئہ میں روس سے معاہدہ ہوا، اور ۲۹ئہ، ۳۰ئہ، ۳۶ئہ میں اسکی تجدید ہوتی رہی، فرانس سے ترکی شامی حدود پر پھر نظر ثانی کرائی گئی، ۳۰ئہ میں یونان سے معاہدہ ہوا، اکتوبر ۳۱ئہ میں یونان کے پایۂ تخت اتینا میں ترکی وزراء کا شاندار استقبال ہوا، ۳۳ئہ میں میثاق بلقان کی تکمیل ہوئی، اور ۱۸ر جولائی ۳۲ئہ کو مجلس اقوام کی ممبری بھی حاصل ہوگئی، یہی نہیں، بلکہ مصر کے مجلس اقوام کی داخلہ کے موقع پر ترکی وزیر خارجہ نے جلسہ کی صدارت کی، ایشیا میں بھی ترکی کے تعلقات ہمسایوں کے ساتھ دوستانہ ہیں، البتہ سنجق (اسکندرونہ) کے معاملہ کی وجہ سے شام (سوریا) سے کشیدگی پیدا ہوگئی ہے، اس حسن معاملہ اور دوستانہ مراسم کی تصدیق کے لئے دول اربعہ کا معاہدہ (میثاق اسعد آباد) کافی ہے، جولائی ۳۶ئہ میں ترکوں کو درۂ دانیال کی قلعہ بندی کی اجازت مل گئی،

جب توقع ہی اٹھ گئی تو پھر گلہ کیسا، ورنہ فلسطین کے مسئلہ پر ترکی کی خاموشی اور (سنجق)

بردست اندازی کے متعلق کچھ تعرض کیا جاتا، جب تک (دمشق) کا علاقہ فرانس کے قبضہ میں رہا، کمالی حکومت خاموش رہی جونہی معاہدہ کا اعلان ہوا، اور شام کی خودمختاری کی توقعات پیدا ہوئیں ترکی حمیت بھڑک اٹھی اور پھر آج جو کچھ اسکندرونہ اور انطاکیہ میں ہورہا ہے اسکی تفصیل عربی اخبارات میں پڑھنے سے معلوم ہوتی ہے،

آثار مصر (ص ۲۶۴ – ۲۸۰)

مصر عرصۂ دراز سے ترکی حکومت کا ایک حصہ تھا، ۱۸۸۲ء سے ۱۹۱۴ء تک برطانوی اقتدار کے باوجود یہاں عثمانی حکومت کا نام باقی رہا، کچھ عرصہ تک فرانس اور برطانیہ میں رقابت رہی ۱۹۰۴ء میں فرانس قطعی طور پر برطانیہ کے حق میں دست بردار ہوگیا، برطانوی حکام ہمیشہ کہتے رہے کہ یہ تسلط عارضی ہے لیکن ۱۹۱۴ء تک برطانوی اقتدار حسب دستور قائم رہا، اور ملک میں بیداری اور قومی تحریک بڑھتی رہی،

۱۹۱۴ء میں برطانیہ اور عثمانی حکومت کی باہمی چھیڑ چھاڑ کے شروع ہوتے ہی، برطانیہ نے مصر پر اپنے قبضہ کا اعلان کردیا، عباس حلمی دوم، خدیو مصر (جو اس وقت استانبول میں تھے) معزول کئے گئے، اور ان کی جگہ ان کے چچا فواد تخت و تاج سے نوازے گئے، اور وعدہ کیا گیا کہ جنگ کے بعد تمام مقبوضات کو خودمختاری حاصل ہوجائے گی، جنگ کے خاتمہ پر اہل مصر نے ایفائے وعدہ کا مطالبہ کیا، لیکن بے سود، ملک میں بے چینی بڑھی، اور وفد کے رہنما سعد زغلول نے پیرس کی صلح کانفرنس میں مصر کی نمایندگی کا پرزور مطالبہ کیا، اسکو جواب میں سعد زغلول اور ان کے چند رفقا گرفتار کرکے مالٹا بھیج دیئے گئے، ملک میں انقلاب اور بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی، ۱۹۱۹ء کا انقلاب اتنا ہمہ گیر اور پرزور تھا، کہ اس کے فرو کرنے کے لئے جنرل النبی (Allenby) کے زیر قیادت ساٹھ ہزار مسلح فوج کو میدان میں آنا پڑا،

پھر سعد زغلول رہا ہوئے، اور لارڈ ملنر کی صدارت میں ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر ہوا، اہل مصر

نے اس کا مکمل بائیکاٹ کیا اور ملنر کو تسلیم کرنا پڑا کہ مصر کا قومی جذبہ دبایا نہیں جا سکتا، لیکن کمیشن کی سفارشات مطالبات سے بہت کم تھیں اس سے قوم نے بیزاری ظاہر کی، دوبارہ تحریک اٹھی، اور پھر اللنبی کی خدمات حاصل کرنی پڑیں، سعد زغلول جبرالٹر بھیج دیے گئے، ۲۸ فروری ۱۹۲۲ء کو برطانیہ نے مصر کو ایک آزاد حکومت تسلیم کیا، لیکن فوج، امتیازات، سوڈان اور نہر سویز کے بارے میں ایسی تحفظات رکھی گئیں، جو مصریوں کے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتی تھیں، ان تحفظات کا مسئلہ تو طے نہ ہو سکا، لیکن ایک جمہوری دستور کا حق عطا ہوا، (۱۹۲۳ء) اس دستور کے مطابق ۱۹۲۴ء میں نئی پارلیمنٹ کے انتخابات ہوئے، وفد کو اکثریت حاصل ہوئی، اور سعد زغلول (جو جلاوطنی سے واپس آچکے تھے) کی سرکردگی میں وزارت کی تشکیل ہوئی، اور معاہدہ کا مسئلہ از سر نو چھڑا، چند مہینوں کی تگ و دو کے بعد گفت و شنید ناکام ثابت ہوئی،

نومبر ۱۹۲۴ء میں سرلی اسٹیک (Sir Lee Stack) سوڈان کا گورنر جنرل قاہرہ میں مارا گیا، انگریزوں نے سخت تادیبی کارروائی کرنا چاہی، حکومت سے باضابطہ معافی کے مطالبہ کے علاوہ مجرموں کی تعزیر سیاسی مظاہروں کا بند کرانا، اور دس لاکھ پونڈ کے تاوان کا مطالبہ کیا گیا، وفدی وزارت نے مجلسِ اقوام سے دادرسی چاہی، اس پر سکریٹری وزارت خارجہ، مسٹر چمبرلین نے ایک ڈانٹ بتائی... اور ۱۹۲۳ء کا دستور ردی کی ٹوکری بن سکا،

۱۹۲۷ء میں چمبرلین نے ثروت پاشا وزیر اعظم (جنھوں نے ایک مشترک وزارت کی تشکیل کی تھی) سے معاہدہ کی گفتگو کی، پھر مسٹر ہنڈرسن سے محمد محمود پاشا سے ۱۹۲۹ء میں، اس کے بعد نحاس پاشا سے بھی گفتگو جاری رہی، لیکن وزارت عظمی کے یہ تینوں مسند نشین لندن سے خالی ہاتھ واپس آئے، نہر سویز، سوڈان، امتیازات، فوجی قبضہ کے متعلق برطانیہ قومی مطالبات ماننے پر راضی نہیں ہوا، مگر انگریزی

نوجوان کا قاہرہ کی سڑکوں پر شان حکومت کے ساتھ گھومتے پھرنا مصریوں کو کس طرح گوارا ہوسکتا تھا؟
غیر ملکیوں کے امتیازات کا دنیا کے کسی خطہ میں وجود باقی نہیں رہا، دوسرے ملکوں کے باشندے مصر
میں رہیں، پیسے کمائیں، لیکن ان پر کوئی ٹیکس عائد نہ ہو، اس سے زیادہ کیا بیہودگی ہوسکتی ہے، ؟
ان کے مقدمات فیصل کرنے کے لئے الگ مخلوط عدالتیں مقرر تھیں، سوڈان پر صرف مصر کا ہو، اور
اور انھیں کوئی اختیار نہیں ۱۹۳۰ء میں وفدیوں کے استعفار کے بعد صدقی پاشا کی آمریت
کا دور دورہ ہوا، قصر شاہی کے اثرات بھی بڑھ گئے، ۱۹۲۳ء کا دستور یکلخت منسوخ کر دیا
گیا، اور چند سال تک استبداد کا بازار گرم رہا،.... بالآخر نومبر ۱۹۳۴ء میں توفیق نسیم پاشا نے قلمدان
وزارت سنبھالا، اور دستور کی واپسی کا مطالبہ شروع ہوا، اسی دوران میں سر سیموئیل ہور کی تقریر نے (۹ر نومبر
۱۹۳۵ء) جس میں اس نے مصر کو دستور کے لئے نااہل قرار دیا تھا، ملک میں آگ لگادی، آخر
۱۹۲۳ء کا دستور پھر نافذ ہوا، حبشہ پر اطالیہ کی تاخت نے برطانیہ کی انانیت بھی ذرا کم کی، نئے
انتخابات میں وفد کو غلبہ حاصل ہوا، اور انھی کی زیر قیادت گفتگو سے صلح تکمیل کو پہنچی، اور ۲۶ر
اگست ۱۹۳۶ء کو لندن میں معاہدہ پر طرفین کے دستخط ہوگئے، اور ۱۹۲۲ء میں جن چار مسئلون
کے متعلق حکومت برطانیہ تحفظات چاہتی تھی، وہ ۱۹۳۶ء میں طے ہوگئے،
اس سمجھوتے میں گو فوجی قبضہ کے بارے میں برطانیہ ہی کا پلہ بھاری ہے، لیکن امتیازات
کا مسئلہ گویا حسب خواہ طے ہوگیا، مونترو کانفرنس (اپریل ۱۹۳۷ء) میں تمام حکومتوں نے
امتیازات سے دست برداری منظور کرلی صرف فرانس نے کچھ مخالفت کی تھی، سوڈان اور نہر سوئز
کے متعلق مصر کے مطالبات کافی حد تک تسلیم کر لئے گئے، ۲۶ر مئی ۱۹۳۷ء کو مجلس اقوام میں داخلہ
بھی ہوگیا،
مصنف نے جولائی ۱۹۳۶ء میں یہ سرگذشت لکھی ہے، اس ڈیڑھ سال کے عرصہ میں اور اہم انقلابات

رونما ہو چکے ہیں، شاہ فواد کی وفات اور جوان سال فاروق کی تخت نشینی کے بعد قصر شاہی اور وفد کی چشمک نے نئی کروٹ لی، تاآنکہ زعیم وفد کی جلد بازی، اور بے تدبیری سے انکی وزارت ٹوٹ گئی، نئے انتخابات میں وفد کو شکست فاش ہوئی، مصطفےٰ نحاس خود ہارے، ان کے دست راست، بلکہ وفد کی جان قبطی وزیر، مکرم عبید کو ایک ازہری مولوی (عبدالوہاب سلیم) نے شکست فاش دی، نئی وزارت میں پہلے پہل ایک صحافی (حسین ہیکل ایڈیٹر السیاسۃ) اور ایک متدین پروفیسر (مصطفےٰ عبدالرزاق استاذ فلسفہ جامعہ فوادالاول) کو جگہ دی گئی، صحافی کو وزارت تعلیم اور پروفیسر کو وزارت اوقاف سے نوازا گیا، شاہ فاروق کو ملک میں عجیب و غریب ہردلعزیزی پیدا ہو گئی، اور ہو رہی ہے مصطفےٰ امراغی ازہر کے جذبۂ اقتدار کی خاطر، اور عبدالحمید سعید (صدر جمعیۃ الشبان المسلمین) اسلامیت کی فضا پیدا کرنے کی غرض سے اپنی پوری قوت شاہ فاروق کی ہردلعزیزی کے لئے صرف کر رہے ہیں، جون جون وفد کی قوت گرے گی، فرعونیت[1] اور دہریت کا اقتدار کم ہوگا، نیز قصر کے اقتدار کے ساتھ ساتھ وفد کا جھنڈا سربلند نہیں رہ سکتا، بہرحال یہ تبدیلی اس منزل میں ہے، جہاں قطعی فیصلہ کرنا ذرا دشوار ہے،

فلسطین کا مسئلہ (ص ۲۸۱-۲۹۰)

ترکی اور مصر کی طرح مصنف نے فلسطین کی جد وجہد پر بھی روشنی ڈالی ہے، اردو میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اور شرح وبسط کے ساتھ، اسلئے یہاں لکھی ہوئی چیز کے اعادہ

---

[1] "فرعونیت" کی تحریک کا مقصد قدیم مصر (پراچین بھارت کے نمونہ پر) کی تہذیب کا احیا ہے، عربیت اور "اسلامیت" سے قطع تعلق اس کی پہلی منزل ہے ہے، شکر ہے کہ اب یہ تحریک بہت کمزور ہو رہی ہے، اس کا سب سے بڑا سبب محمد حسین ہیکل ایڈیٹر "السیاسۃ" آج (حیاۃ محمد) اور (فی منزل الوحی) کا مصنف ہو کر وزیر تعلیم بن چکا ہے، اب وہ ایک حد تک "اسلامیت" کا علمبردار ہے،

کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی"، (ملاحظہ ہو مدینہ ۲۸ و ۳۱ رجولائی ۳۳ء اور ۱۳ ار نومبر ۳۳ء)

شام (ص ۲۹۰-۲۹۷)

شام پر فرانسیسی انتداب کی ابتدا ۲۰ء میں دمشق پر قبضہ سے ہوئی، انتدابی حکومت نے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے اصول پر پہلا یہ کام کیا، کہ شام کے پانچ حصے کر دئیے، (۱) جمہوریہ لبنان (۲) جبل الدروز (۳) علویین کا علاقہ (۴) لاذقیہ اور انطاکیہ کے اضلاع (۵) شام کا باقی ماندہ علاقہ، حکومت سوریہ کے نام سے فلسطین کو چھوڑ کر پورے شام کی آبادی تیس لاکھ سے زیادہ ہے، اس پر پانچ پانچ خود مختار ریاستیں!!! اللہ کی شان ہے،

انتداب کا پہلا دور جنرل گورو کی حکومت سے شروع ہوا، گورو ساڑھے تین سال حاکم رہا، اور اسی نے ۲۰ء میں جمہوریہ لبنان کے نام سے الگ حکومت قائم کرائی، اس کے جانشینوں نے پوری پانچ حکومتیں قائم کرکے چھوڑیں، موجودہ ہائی کمشنر کی خواہش تھی، کہ پانچ کی جگہ چھ یا آٹھ حصے کر دئیے جائیں، ۳۰ رجنوری ۳۶ء کو حکم بھی نافذ ہو چکا تھا، اسی بنا پر شام میں پچاس روز مسلسل ہڑتال رہی جس کے آگے سردست فرانسیسی اقتدار کو جھکنا پڑا، فرانسیسی بے عنوانیوں کی وجہ سے قومی تحریک برابر زور پکڑتی رہی، قومی جوش اور یک جہتی کا سب سے بڑا مظاہرہ ۲۵ء کے دروزی جہاد[1] میں ہوا، فرانسیسی تہذیب بھی اس ہنگامہ میں بالکل عریاں ہوگئی، جب چپن گھنٹے مسلسل دمشق پر گولہ باری ہوئی، (۱۸، ۲۰ اکتوبر ۲۵ء) اقتصادی لحاظ سے بھی شام دور انتداب میں بہت تباہ ہوا، بعض اوقات ستر ستر ہزار فوج ملک میں رکھی گئی، ایک چھوٹا سا علاقہ اتنی بڑی فوج کس طرح برداشت کر سکتا تھا؟

شام کا مطالبہ آزادی کا تھا، عراق کے معاہدہ کے بعد اسی نمونہ پر ایک دوستانہ معاہدہ

---

[1] دروزی جہاد کی مکمل تفصیلات، امین سعید کی (الثورۃ العربیۃ الکبری) میں پڑھئے، مطبوعہ مصر تین ضخیم جلدوں میں،

کا مطالبہ ہوا، جو آخر ۱۹۳۶ء کی تاریخی ہڑتال کے بعد تسلیم کیا گیا، اور ایک عرصہ کی گفت و شنید کے بعد ۹ ستمبر ۱۹۳۶ء کو طرفین میں اتفاق ہوگیا اور وعدہ کیا گیا کہ تین سال کے عرصہ میں انتداب ختم ہو جائیگا، معاہدہ کی تصدیق پارلیمنٹ میں ہو جائے گی اور تقسیم شدہ اضلاع پھر اصل شام کے حدود میں شامل کر دیے گئے،

یہ جولائی ۱۹۳۶ء کی باتیں تھیں، اب تازہ اطلاعات یہ ہیں، کہ فرانس اپنے وعدہ سے پھر گیا[۱] ہے، اور شام ایک بار پھر انقلاب سے دوچار ہونے کو ہے، اللہ ان کی مدد کرے، ایک بات رہ گئی اس معاہدہ کی دفعات مرتب ہوتے ہی (ستمبر ۱۹۳۶ء) ترکی نے سنجق کا مطالبہ شروع کر دیا اور فرانس نے (حلوائی کی دوکان، باپ دادا کا فاتحہ) کے اصول پر عربوں کے احتجاج کے باوجود ترکی کے اکثر مطالبات منظور کر لئے، آج سنجق میں بھی تفرنج اور مغربیت کا دور دورہ ہے، جس کا شکوہ ہمیں ترکی مین تھا، اب اس علاقہ کا نام بدل کر (ہاتائی) رکھا گیا ہے، اور.........

فرنچ شمالی افریقہ (ص ۷ ـ ۲۹ ـ ۷ ـ ۳)

تونس میں فرانس کا باضابطہ اقتدار ۱۸۸۱ء میں قائم ہوا، یوں تو مالی حالت کی خرابی کی وجہ سے یہاں غیر ملکی اثرات پہلے ہی پیدا ہو چکے تھے، الجزائر پر فرانس کا حملہ ۱۸۳۰ء میں شروع ہوا، امیر عبد القادر جزائری نے ایسا بہادرانہ مقابلہ کیا، کہ فرانس کے دانت کھٹے ہو گئے، لیکن ...... سعدی از دست

---

[۱] ۲۴ جنوری کے اسٹیٹسمین میں ایک واقف کار نامہ نگار (جو یقینی انگریز ہے) نے بھی یہ خیال ظاہر کیا ہے، کہ فرانس شام سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں، لیکن اوس نے آخر میں یہ تجویز پیش کی ہے، کہ فلسطین، شرق اردن اور شام (موجودہ سوریہ) کو ملا کر ایک جمہوریت بنائی جائے، تاکہ یہود کو ایک وسیع میدان ملنے کی صورت میں "ارض اسرائیل" کا تخیل ترک کرنے پر آمادہ کیا جا سکے،

(اسٹیٹسمین ۲۴ جنوری ۱۹۳۹ء ص۶ کالم ۲)

خوشتین فریادزبرادران یوسف خود حریف کے ہوا خواہ بن گئے، آخر ۱۸۴۷ء میں امیر القادر نے ہتھیار رکھدیے، ان کی اولاد آج تک دمشق میں مقیم ہے، امیر عبد القادر[۱] اپنے کارناموں کے لحاظ سے ہندوستان کے سلطان ٹیپو سے مشابہت رکھتے ہیں، عربی ممالک میں سنوسی اعظم اور امیر محمد بن عبد الکریم ریفی کے سوا کوئی ان کے مقابلہ میں پیش نہیں کیا جاسکتا، (ان کے مجاہدانہ کارناموں کی تفصیل امیر شکیب ارسلان نے اچھی طرح کی ہے، ملاحظہ ہو حاضر العالم الاسلامی، جلد ۲ ص ۱۶۶ - ۱۷۴)

مراکش میں فرانسیسی اقتدار ۱۹۰۴ء میں قائم ہوا، فرانس نے مصر سے ہاتھ دھویا، اور اس کے عوض انگریزوں نے مراکش سے، اس طرح پر ۱۹۰۴ء سے دونوں آزاد ہوگئے، ایک خفیہ معاہدہ کی روسے مراکش کو فرنچ اور اسپینی منطقوں میں تقسیم کر لیا گیا تھا، جرمنی کو بھی کچھ دنوں شمالی افریقہ کے اس حصہ کی ہوس رہی، پھر شیر برطانیہ نے فرانس کی مدد کی، ۱۹۱۲ء میں مولای عبد الحفیظ سلطان مراکش نے فرانسیسی حمایت قبول کرلی لیکن عہد نامہ پر دستخط کرنیکے بعد اتنے کبیدہ خاطر ہوئے کہ تخت سے الگ ہوگئے، (بیچارے کا انتقال ابھی پیرس میں ہوا ہے، اپریل ۱۹۳۷ء) اسپینی منطقہ کے عربوں نے "حمایت" نہیں قبول کی، اور ۱۹۱۹ء سے باضابطہ چھیڑ چھاڑ شروع ہوگئی، ۱۹۲۱ء سے امیر عبد الکریم[۲] نے کمان اپنے ہاتھ میں لی، اور اسپینیوں کو مسلسل شکستیں دیں، ۱۹۲۲ء میں اسپین کی فوجی

---

[۱] امیر عبد القادر کی بلند ہمت اور علو نفس کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے کیا جاسکتا ہے جو انکی تراوش فکر کا نتیجہ ہیں:

تسائلنی امُّ البنین و انها، لاعلم من تحت السماء باحوالی

(مجھ سے بچوں کی ماں حال پوچھتی ہے، حالانکہ وہ آسمان کے نیچے سب سے زیادہ میرے حالات سے واقف ہے)

الا فاسألی جنس الفرنسیس، تعلمی بأنّ منایاھم بسیفی و عسالی،

(پوچھنا ہو تو فرانسیسیوں کی قوم سے میرا حال پوچھو (ان سے) معلوم ہوگا، کہ ان کی قضا میری تلوار اور نیزہ (کے ہاتھ) لکھی ہوئی ہے)

حکومت ریفی حدود سے ہٹ گئی ۱۳۴۵ھ میں امیر عبد الکریم نے فرانسیسی علاقہ پر تاخت کی اسپر کیا تھا، دو بڑی حکومتیں ایک ضلع کی مہم سر کرنے کے لئے متحد ہوگئیں، اور دو لاکھ مسلح فوج چند ہزار عربوں کے مقابلہ میں صف آرا کی گئی، آخر عبد الکریم عاجز آگئے، اور ۲۶ مئی ۱۹۲۶ء کو انھیں مڈغاسکر بھیج دیا گیا، جہاں وہ اب تک جلاوطن ہیں، مراکش کے اسپینی منطقہ میں فرنکو کی مہم سے ایک نئی صورت حال پیدا ہوگئی ہے، پچاس ہزار عرب سر بکف میدان میں ہیں اور مستقبل کے مبہم وعدوں پر جان دے رہے ہیں اگر وہ خود مختار ہوتے، تو کسی کا ساتھ نہ دیتے، لیکن بیچارے مجبور ہیں، فرنکو کی فوج میں کٹ رہے ہیں، اگر کامیابی بھی ہوئی، تو وعدوں کا ایفا مشکوک ہے، ادھر فرانس فرنکو کے وعدوں سے برہم ہے، اسپینی منطقہ کو اگر اختیارات ملے، تو مراکش کے فرانسیسی منطقہ میں اس کا ردعمل ہونا ناگزیر ہے،

مراکش میں فرانس کا دور حکومت بالکل تاریک ہے، اہل ملک کو کوئی حق حاصل نہیں، مذہبی تعلیم میں رکاوٹیں ہیں، ۱۹۳۰ء میں ایک فرمان (جسے مراکش کی اصطلاح میں "ظہیر" کہتے ہیں)

(بقیہ حاشیہ ص ۴۴) ومن عادۃ السادات بالجیش تحتمی وبی یحتمی جیشی وتمنع ابطالی،

افسروں کا خاصہ ہے، کہ وہ لشکر کی آڑ میں پناہ لیتے ہیں، لیکن میری فوج میری آڑ میں پناہ لیتی ہے اور میرے افسران میرے سہارے مدافعت کرتے ہیں،

امیر کثیر الاولاد تھے، ایک صاحبزادے امیر سلیم جزائری کو (جو عثمانی فوج میں ممتاز افسر تھے) جمال سفاح نے دوران جنگ میں پھانسی دیدی، دوسرے صاحبزادے امیر خالد عرصہ تک الجزائر میں قومی تحریک کی قیادت کرتے رہے، وفات کو دو چار برس سے زیادہ عرصہ نہیں گذرا ان کے پوتے امیر سعید جزائری آج کل دمشق میں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں،

[1] اصلی نام محمد بن عبد الکریم ہے، مصنف نے عبد الکریم لکھا ہے، اور یہی زبان زد ہے، انکے کارناموں کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، (حاضر العالم الاسلامی جلد ۳ (ص ۱۹۹، ص ۲۰۶)

جاری ہوا جس کی رو سے بربر آبادی کو عربوں سے الگ کرنے کی کوشش جاری ہے، تمام عالم اسلام میں اس پر احتجاج ہوا لیکن شنوائی نہ ہوئی، کیتھولک مشنریوں کو سرکاری امداد ملتی ہے، اخبارات کی زبان بندی پر سختی کے ساتھ عمل درآمد ہے، بالآخر تنگ آکر مراکشیون نے پیرس سے ایک فرنچ رسالہ (مغرب) جاری کیا ہے،

الجزائر کا حال بھی ابتر ہے، مسلسل احتجاج کے باوجود اب تک کچھ نہیں ملا، مقبوضات کے معاملہ میں اشتراکی اور قدامت پسند سب بیتھر ہو جاتے ہیں، جزائری بھی پیرس سے "الامۃ" (El Ouma) نامی ایک فرنچ اخبار نکالتے ہیں، الجزائر کی جمعیۃ العلماء (جس کے صدر عبد الحمید بن بادیس ہیں) اور اس کے آرگن "الشہاب"[1] (ماہانہ) اور البصائر (ہفتہ وار) مفید خدمات انجام دیر ہے ہیں،

خلاصہ یہ کہ سارے شمالی افریقہ میں ایک تحریک پائی جاتی ہے، جو ایک طرف فرنچ اقتدار کی مخالفت اور دوسری جانب وحدت عربیہ کی حمایت کرتی ہے،

فرانس آسانی سے اپنے مقبوضات سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں، جنگ عظیم میں ان علاقوں سے خوب مدد لی، صرف الجزائر سے ایک لاکھ تہتر ہزار جنگجو سپاہی اور ایک لاکھ انیس ہزار عام مزدور مہیا کئے گئے تھے، لیکن اب لیل و نہار بدل چکے ہیں، آزادی کی لہر دوڑ چکی ہے،

---

[1] راقم الحروف کے پاس یہ دونوں پرچے (الضیاء) کے مبادلہ میں آتے تھے، یہ کسی حال میں ہندوستان کے اچھے اخبارات اور رسالوں سے پیچھے نہیں ہیں، "الشہاب" کا ماہانہ سیاسی تبصرہ کسی حال میں "جامعہ" سے برا نہیں ہوتا، ان کا ہفتہ وار حکومت کی سخت گیری کے باعث کئی لباس بدل چکا ہے، پہلے (السنۃ) تھا، پھر (الشریعۃ) اس کے بعد (الصراط) کے قالب میں نمودار ہوا، آخری لباس البصائر تھا، اللہ جانے سال ڈیڑھ سال میں کیا ہو گیا ہو،

جو کسی کے تھامے نہیں تھمتی،

اس سلسلہ میں ایک بات اور قابلِ لحاظ ہے، مصر و شام کے برخلاف شمالی افریقہ کے عربوں میں افرنگی وطنیت یا دہریت کا نام و نشان نہیں، ان کی تحریک خالص اسلامی ہے، عربیت بھی ہے لیکن اسلامیت کے ماتحت، موجودہ حالات میں یہ چیز بہت کچھ قابلِ مسرت ہے، تونس نے اسکی اچھی مثال پیش کی ہے، وہاں حکومت نے ۲۰ دسمبر ۱۹۲۳ء کو ایک قانون نافذ کیا، جس کی رو سے اہلِ ملک کو فرانسیسی قومیت (الجنسیۃ الفرنسیۃ) اختیار کرکے تمام شہری حقوق حاصل کرنے کا اختیار دیا گیا، لیکن قوم پروروں نے اس قانون کا مقاطعہ کیا، اور پوری قوم نے فرانسیسی قومیت اختیار کرنے والوں کا اجتماعی بائیکاٹ کیا، ان کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جاتی، انھیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جاتا، بعض اوقات حکومت نے اپنے ہوا خواہوں کی تدفین مشین گن کے زیرِ سایہ کرادی لیکن دوسرے روز لاش بے گور و کفن قبر سے باہر تھی، ...... اس طرح کی رسہ کشی بارہا ہوئی، آخر رائے عامہ کی فتح ہوئی، یہ کوئی نئی بات نہیں، الفتح اور دیگر عربی اخبارات میں اس قسم کی مثالیں بارہا شائع ہوا کی ہیں،

(اطالیہ اور اسلام (ص ۳۰۷ - ۳۱۸)

عہدِ حاضر میں مسلمانوں کے ساتھ اٹلی کا پہلا رشتہ طرابلس الغرب پر حملہ سے شروع ہوا، عثمانی حکومت نے طرابلس کو اٹلی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا، انور مرحوم کی ذاتی تگ و دو سے بحث نہیں، میرا الزام حکومت پر ہے، سنوسیوں[۵] نے اٹلی کا پورا مقابلہ کیا، سنوسی اعظم (سید احمد شریف سنوسی متوفی ۱۳۵۲ھ) اور ان کے ساتھیوں نے اطالوی دیو کا بیس سال تک پامردی سے مقابلہ

---

۵ سنوسی زاویہ کی تاسیس محمد بن علی السنوسی (متوفی ۱۸۲۵ء) نے کی، آخری سنوسی زعیم (جنھیں امیر شکیب السنوسی الکبیر لکھتے ہیں) ان کے پوتے تھے،

گیا، اس جہاد کا آخری سرگروہ غازی عمر مختارؒ (جن کی عمر ستر سال سے متجاوز تھی) ۱۹۳۱ء میں سولی کے تختہ پر چڑھا دیا گیا،

۱۹۲۲ء سے اطالیہ نے طرابلس اور صحرائے لیبیا کے اندرونی سنوسی زاویوں پر قبضہ کی کوشش کی، آخر جغبوب پر بھی قبضہ ہوگیا، اور اس قبضہ کے بقا و استحکام کی خاطر اٹلی نے حکومتِ مصر سے ۱۹۲۵ء میں معاہدہ کیا، مصر نے اٹلی کا قبضہ تسلیم کر لیا، شاید یہ اسی دوستی کا نتیجہ تھا، کہ سنوسی اعظم کو اپنے آخری ایامِ حیات میں علاج کے لئے بھی مصر آنے کی اجازت نہ ملی، اور تو اور ازہر کی سرکار نے غائبانہ نمازِ جنازہ کی بھی اجازت نہیں دی، مشرقی افریقہ میں اٹلی کے دو علاقے اریتیریا اور سمالی لینڈ ہیں لیکن ان دونوں میں سے کوئی اطالوی مالِ تجارت کا بازار نہ بن سکا، ان کی ساری اہمیت حبشہ کی قربت کے باعث تھی، ۱۹۰۶ء کے "ثلاثی" (سہ گانہ) معاہدہ کے مطابق حبشہ میں برطانیہ فرانس اور اٹلی کے مخصوص منطقہائے نفوذ تسلیم کر لئے گئے تھے، ۱۹۲۶ء میں برطانیہ اور اطالیہ کے درمیان ایک دوسرا معاہدہ ہوا، جس کے خلاف حبشہ نے مجلسِ اقوام میں احتجاج بھی کیا،

ایک متعین پالیسی کے ماتحت اٹلی نے ۱۹۳۵ء میں حبشہ پر دھاوا بول دیا، اور مئی ۱۹۳۶ء میں یہ مہم سر بھی ہوگئی، مسلمانوں نے بھی احتجاج کیا، یہ احتجاج زیادہ تر حبشہ اور عہدِ نبوی کے دوستانہ مراسم کے زیرِ اثر تھا، شاید کم لوگوں کو یہ معلوم ہوگا، کہ حبشہ میں مسلمانوں کی آبادی غیر مسلموں سے زیادہ ہے، اور ان کے ساتھ سابق نجاشی کا سلوک نہایت ظالمانہ تھا، مصنف نے اس طرف اشارہ کیا ہے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، (حاضر العالم الاسلامی جلد ۳ ص ۱۱۹-۷۰) اور الفتح نمبر ۵۴۳ میں ایک "واقف کار مصری مسلمان" کا مضمون قابلِ مطالعہ ہے، اسی طرح امیر البیان کا مفصل مضمون مندرجہ الفتح نمبر ۴۴۴، اس مسئلہ پر نہایت شافی روشنی ڈالتا ہے،

یہ ایک حقیقت ہے، کہ حبشہ کے بعض علاقوں میں مسلمانوں نے اطالیہ کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا

استقبال کیا، مصنف مسولینی کے میٹھے میٹھے بیانات سے مطمئن معلوم ہوتے ہیں، لیکن طرابلس الغرب میں آج جو کچھ ہو رہا ہے، قابل فراموش نہیں، لوگ فلسطین کو رو رہے ہیں، یہاں ایک عربی علاقہ مستقل طور پر اسلام کی آغوش سے الگ کیا جارہا ہے، طرابلس کا نام ختم ہوگیا، اب وہ مملکت رومہ کا ایک جزء ہے، طرابلس کے رہنے والے عرب اب طرابلسی نہیں رہے، بلکہ رومی یا طلیانی ہوگئے، آج کل عربی اخبارات میں (امتہ مسلمتہ تساق الی الفناء) ایک مسلمان قوم فنا کی کے گھاٹ اتاری جارہی ہے،" کی صدا بلند ہے، لیکن کمزوروں کی کون سنتا ہے، ملاحظہ ہو الفتح شوال و ذی قعدہ ۵۷ھ نمبر ۲۴-۴۶،

یمن کے ساتھ بھی اطالیہ کا تعلق ہے، گو اب تک یمن آزاد تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن اٹلی کے تجارتی امتیازات کافی حد تک خطرناک ہیں، عربی اخبارات (امام یحییٰ) کو فوجی استحکام کی طرف برابر توجہ دلاتے ہیں، لیکن وہاں اب تک سو سال پہلے کی دنیا ہے، وہ تو برطانیہ اور اطالیہ کی باہمی چشمک کو دعا دیجئے، کہ اب تک یمن کی موجودہ حیثیت قائم رکھنے (Status quo) پر دونوں متفق ہیں،

مسلمانوں کی ایک دوسری آبادی البانیہ کے ساتھ بھی اطالیہ کا گہرا تعلق ہے، البانیہ کا بادشاہ احمد زوغو ہے[1] وہاں کی دو تہائی آبادی مسلمان ہے، اسلئے طبعی طور پر البانیہ میں اطالوی اقتدار مسلمان اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے،

عراق کی نئی حکومت (ص ۳۱۹-۳۲۳)

عراق پر برطانیہ کی نگاہ عرصہ سے تھی، خلیج فارس سو برس سے انگریزوں کے قبضہ میں ہے

[1] معارف:- یہ مضمون البانیہ پر اٹلی کے قبضہ سے پہلے لکھا گیا تھا، اب یہ حکومت بھی مسولینی کے جوع الارض کا شکار ہوگئی،

دوران جنگ میں برطانیہ نے عراق پر بھی اپنا جھنڈا لہرا دیا،

جنگ کے بعد شام قوم پرست عربوں کی امیدوں کا مرکز تھا، فرانس کے قبضہ کے بعد یہ امیدیں عراق کی طرف منتقل ہوگئیں، برطانیہ کو عراق کی حکم برداری (انتداب) ۱۹۲۰ء میں ملی، لیکن ایک طرف تو اہل عراق انگریزی استیلاء کے خلاف مسلسل احتجاج کرتے رہے، دوسری طرف تیل کے چشموں کے باعث برطانیہ کسی نتیجہ پر نہیں پہونچ رہا تھا، اس لئے ۱۹۲۲ء تک ملک کی سیاسی حالت متزلزل رہی، ۱۹۲۰ء میں عظیم الشان مسلح بغاوت[۱] نمودار ہوئی، سر برسی کاکس کے ذمہ یہ مہم کی گئی، آخر ایک عرب وزارت بنی، امیر فیصل منصب حکومت پر متمکن ہوئے، معاہدہ کا پہلا مسودہ عربوں کے لئے ناقابل قبول تھا، بڑی دشواریوں اور خونیں معرکوں کے بعد ۱۹۲۴ء میں عراق کی نئی حکومت نے یہ معاہدہ منظور کیا، ۱۹۲۶ء میں مجلس اقوام کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ کے بموجب موصل عراق کو مل گیا، اور انقرہ کے "ثلاثی" (عراق، برطانیہ، ترکی) معاہدہ (۱۹۲۶ء) کو بین الاقوامی منظوری حاصل ہوگئی، نیز ایک نیا عراقی برطانوی معاہدہ جنوری ۱۹۲۶ء میں مرتب ہوا ۱۹۲۷ء میں معاہدہ پر پھر نظر ثانی ہوئی، اور برطانیہ نے پہلی بار عراق کی خود مختاری تسلیم کی جس کی تکمیل ۱۹۳۲ء سے پہلے نہ ہوسکی، مالی اور فوجی معاہدوں کے لئے مجلس اقوام کی توثیق شرط قرار دی گئی تھی، اس سے دشواریاں پیدا ہوگئیں، ملک میں ہیجان کے وجہ سے ۱۹۳۰ء میں ایک نیا معاہدہ مرتب ہوا، اور عراق کی نمایندہ پارلیمنٹ نے اس پر مہر تصدیق ثبت کی، عراق کی آزادی تسلیم کی گئی، برطانیہ نے اپنے لئے دو اہم تحفظات رکھے، ۱-

---

[۱] لفظ (بغاوت) سے غلط فہمی نہ ہو، کمزوروں کی ہر تحریک ارباب اقتدار کے نزدیک "بغاوت" ہی کہلائیگی لیکن مظلوم اسے "جہاد" کہیں گے، راقم الحروف کے ذہن میں عربی کلمہ (ثورۃ) ہے، جو حق و باطل دونوں قسم کی شورش کیلئے استعمال ہوسکتا ہے، افسوس کہ عاجز کے محدود علم میں اس کا اردو مرادف نہیں ملتا،

۱۔ فوجی نقل و حرکت کے لئے حدود عراق کے استعمال کا اختیار،

۲۔ فرات کے مغربی حصہ میں ہوائی مستقر برقرار رکھنے کا حق،

۳ اکتوبر ۳۲ء کو عراق مجلس اقوام کی رکنیت سے سرفراز ہوا اس موقع پر امیر ملک شاہ فیصل کے متعلق چند کلمات لکھنا نامناسب نہ ہوگا، عراق کی یہ ساری کامیابی عراقیوں کی بہادری کے بعد شاہ فیصل کی سیاسی بیدار مغزی کا نتیجہ ہے شریف حسین کے بیٹوں میں یہ خاص امتیاز کے مالک تھے، اگر جمال پاشا سفاح کی سفاکیاں عمل میں نہ آتیں، تو یہ دوران جنگ میں ترکوں کے خلاف ہرگز نہ جاتے، (ملاحظہ ہو، امیر شکیب ارسلان کا مضمون "الجامعۃ الاسلامیۃ" فلسطین، ۲۷ جمادی الثانیہ ۱۳۵۲ھ اور رسالہ الضیا شعبان ۵۲ھ) افسوس کہ اس معاہدہ کی تکمیل کے بعد زیادہ دنوں تک امیر فیصل زندہ نہ رہے، ورنہ عراق آج کچھ اور ہوتا، مرحوم نے ۸ ستمبر ۳۳ء کو سوئٹزرلینڈ میں جان جان آفرین کے سپرد کی اور انکے جوان سال بیٹے شاہ غازی ان[1] کے جانشین قرار پائے،

عراق ایک زرخیز ملک ہے، زراعت پر زندگی کا مدار ہے، اب صنعت پر بھی زور دیا جا رہا ہے تیل کے چشموں سے ۸ لاکھ پونڈ کی سالانہ آمدنی اس پر مستزاد ہے، اندرونی سیاسی حالات ایک رفتار سے چل رہے تھے، کہ جنرل بکر صدقی (جس نے اشوریوں کی سرکوبی میں نمایاں خدمت انجام دی تھی) نے جعفر[2] عسکری کو قتل کر کے یٰسین ہاشمی مرحوم کی وزارت ختم کر دی اور ستمبر ۳۶ء

---

[1] معارف:۔ افسوس ہے کہ گذشتہ اپریل کو موٹر کے ایک اتفاقی حادثہ میں یہ جوان سال بادشاہ بھی چل بسا، اور اب اس کا صغیر السن بچہ اپنے چچیرے دادا امیر عبد اللہ والی شرق اردن کی ولایت میں تخت نشین ہوا ہے

[2] جعفر عسکری عربی تحریک کے ایک سرگرم قائد اور امیر فیصل کے ساتھ کام کر چکے تھے، پہلے یہ عثمانی فوج میں افسر تھے، سنوسیوں اور انگریزوں کی جنگ میں یہ گرفتار ہوئے، پھر دنیا میں یہ برطانیہ کے دوست کی حیثیت سے مشہور ہوئے امیر شکیب کے یہ الفاظ قابل غور ہیں ۔۔

میں قلمدان وزارت سلیمان حکمت کو تفویض ہوا،

یٰسین ہاشمی عربی تحریک (وحدت عربیہ یا پان عرب) کے پرانے کارکن اور شاہ فیصل کے دست راست تھے، اس وقت تک عراق وحدت عربیہ کی راہ پر جارہا تھا، سلیمان حکمت کی وزارت کمالیون کی طرف مائل تھی، سلیمان کے بڑے بھائی محمود شوکت پاشا عثمانی حکومت مین صدر اعظم رہ چکے تھے، بکر صدقی بھی کردی تھا، اسے بھی عربوں کی تمناؤن اور آرزوؤں سے دلچسپی نہیں ہوسکتی تھی، اسلئے عام پبلک اس وزارت سے خوش نہیں تھی، اس پر طرّہ یہ تھا کہ سابق وزراء کو جلاوطن کردیا گیا، یہی نہیں، بلکہ یٰسین پاشا ہاشمیؒ (جن کا انتقال کچھ ہی عرصہ بعد دمشق میں ہوا) کی لاش بھی بغداد میں سپرد خاک نہ کی جاسکی، اسکے لئے ایسی شرطیں عائد کی گئیں، کہ ماننے والون اور اعزہ نے دمشق ہی کو ترجیح دی، ان وجوہ کے ماتحت بکر صدقی کا قتل (۱۱ر اگست ۳۷ء) ہمارے لئے کوئی غیر متوقع خبر نہیں تھی،

جمیل مدفعی کو جو وحدت عربیہ کی مہم پرتین کا قصد کررہے تھے، بلاکر سلیمان حکمت کے بجائے وزارت عظمیٰ تفویض ہوئی سال ڈیڑھ سال یہ وزارت چلی، اب شاہ فیصل کے دیرینہ رفیق قصر شاہی کے معتمد، اور شاید برطانیہ کے چہیتے نوری سعید (ہاشمی وزارت کے وزیر خارجہ) اس منصب سے سرفراز کئے گئے ہین، اگر فلسطین اور وحدت عربیہ کے متعلق ان کا طرز عمل حوصلون کے مطابق ہوا تو ممکن ہے یہ وزارت ہر دلعزیزی حاصل کرلے،

مصنف نے صرف سلیمان حکمت کی کمالی ذہنیت" کا ذکر کیا ہے، گذشتہ سطروں میں شاہ فیصل

(بقیہ حاشیہ ص ۵۱)

جعفر باشا العسکری رئیس وزراء بغداد بالأمس ومن اعضاء الوزارۃ (۲) اليوم، وهو من اعز احباء الانكليز" (حاضر العالم الاسلامی جلد ۲ ص ۱۴۰ زیر طبع ۱۹۳۱ء)

اور آخری وزارتوں کے متعلق جو کچھ لکھا گیا، وہ راقم الحروف کے ذاتی مطالعہ اور استنتاج پر مبنی ہے، مصنف صرف واقعات فراہم کرتے ہیں "غیر جانبداری" پران کا پورا پورا عمل ہے،

عراق کی جوان سال حکومت کے بارے میں ایک بات اور قابلِ ذکر ہے، فلسطین کے بارے میں اس کا رویہ صد درجہ قابلِ ستائش اور جرأت آموز ہے، اور اس باب میں تمام وزارتوں کا رویہ ہمدردانہ رہا، فوزی قاوقجی کا بغداد میں شاہانہ استقبال ہوا، شاہ غازی نے ایوان شاہی میں دعوت دی (اسٹیٹسمین، اور لندن ٹائمز نے بارہا برطانیہ کو عراق کے خلاف اشتعال دلانے کی کوشش کی، اس سلسلہ میں توفیق سویدی، سابق وزیر خارجہ، اور حال وزیر داخلہ کی کامیاب کوششیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اب نوری سعید کی برطانیہ نوازی سے ذرا شبہ ہوتا ہے بہر حال ابھی کوئی رائے قائم نہیں ہو سکتی، آج کل میں بلکہ اس تحریر کے چھپنے سے پہلے حال کھل جائیگا،

(یہ سطریں ۲ ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ م ۲۴ جنوری ۱۹۳۹ء کو لکھی گئی ہیں،)

شرق اُردن (۳۲۴)

شرق اُردن پر امیر عبد اللہ حکمرانی کرتے ہیں "وفاداری بشرط استواری" پران کا عمل ہے، کرنل لارنس کی رائے میں عبد اللہ جنگ کی بجائے امن و سکون کی فضا میں زیادہ مفید ہو سکتے ہیں یہود کی نگاہ آز بھی اس علاقہ پر برابر پڑتی رہی ہے، خلاصہ یہ کہ آج تک امیر عبد اللہ کا شاید ہی کوئی فعل مسلمانوں اور عربوں کے لئے مفید ہوا ہو، انگریزوں کی نگاہ میں ان کی کیا وقعت ہے، اس کا ایک ہلکا سا اندازہ اسٹیٹسمین (۲۵ جنوری ۱۹۳۹ء) کے ایڈیٹوریل نوٹ سے ہو سکتا ہے،

جزیرۃ العرب کی نئی زندگی (ص ۳۲۴-۳۲۴)

آج سے تیس برس پہلے عرب میں تین خاندان حکمران تھے، حجاز میں شریف، نجد اور اسکے نواحی میں آل رشید، باقی ماندہ علاقہ میں آل صباح، اس فہرست میں اگر امام یمن اور عسیر کے امیر ادریسی

کو بھی شامل کر لیجئے، تو پانچ عالم ہو جاتے ہیں،

ابن سعود کے زیر سایہ ایک متحدہ حکومت قائم ہوئی، اس وقت سعودی حکومت کا رقبہ فرانس، جرمنی، بلجیم، و سوئٹزرلینڈ کے متحدہ رقبہ سے بھی زیادہ ہے، جنگ سے پیشتر اس نے احسا پر قبضہ کیا، پھر آل رشید کو زک دی ۱۹۲۴ء میں شریف حسین کا قلع قمع کیا، اور ۱۹۲۵ء میں حجاز مکمل طور پر ابن سعود کے زیر نگیں ہو گیا، ۱۹۳۰ء میں عسیر بھی حدود مملکت میں شامل کر لیا گیا، ۱۹۳۳ء میں امام یمن کی فوج شکست کھا چکی تھی، اور بحر احمر کے مشرقی ساحل پر اس کا قبضہ ہوا چاہتا تھا، کہ رہنمایانِ عالم اسلام (سید امین حسینی، امیر شکیب، ہاشم آتاسی، محمد علی علوبہ) کی مداخلت سے معاہدۂ طائف کی تکمیل ہوئی، (جون ۱۹۳۴ء)

مصنف نے شریف حسین کے دورِ حکومت کی خرابیاں، اور سلطان ابنِ سعود کی خوبیاں تفصیل سے گنائی ہیں، اہلِ ہند، حجاز اور والی حجاز سے اچھی طرح واقف ہیں، اس لئے کسی اقتباس یا تحشیہ کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی،

مصنف نے سعودی حکومت کی ستائش میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے ہمیں اتفاق ہے، صرف ایک بات کھٹکتی ہے، جی چاہتا ہے، کہ وہ اہلِ علم کے گوش گذار کر دیجائے، میری مراد سعودی حکومت کی خارجی حکمت عملی سے ہے، اینگلو امریکن کمپنی سے معدنیات کے استخراج کا معاہدہ، کلیفورنیا کی اسٹینڈرڈ آئل کمپنی کو تیل کے چشموں کا ٹھیکہ، عراق پٹرولیم کمپنی کو بحر احمر کے ساحلوں پر تیل کی تلاش کی اجازت، ان سب کی تاویل و توجیہ سمجھ میں آتی ہے، یا آسکتی ہے، مسٹر فلبی (جنھیں شاید بعض نیک دل مسلمان الحاج عبد اللہ فلبی سمجھتے ہوں) کا تقرب بھی گوارا کیا جا سکتا ہے، لیکن ایک مسئلہ ایسا بھی ہے جس کی تاویل نہیں سمجھ میں آتی، فلسطین کے سلسلہ میں تین سال سے تمام عربی علاقے پریشان ہیں، اخبارات، انجمنیں، وزارتیں، سب کے سامنے ایک مسئلہ ہے، یمن، عراق اور مصر کی حکومتوں نے اس باب میں دخل اندازی کی، اور قوت کے ساتھ یمن کے سرکاری اخبار الایمان تک نے سخت مضامین لکھے،

اس کے برخلاف "ام القری" میں اسپین، چین، زیکوسلواکیا، دنیا بھر کی خبریں آتی ہیں لیکن غریب فلسطین کا کہیں نام بھی نہیں آتا، "الشباب" (مصر) نے بار بار نکتہ چینی کی، آخر تنگ آکر محمد علی الطاہر نے مبادلہ بند کر دیا، مگر سعودی حکومت کا آرگن اپنے حال پر قائم ہے، اس سے بڑھکر یہ کہ قاہرہ میں پارلیمنٹری کانفرنس ہوئی، (اکتوبر ۱۹۳۸ء) چین، مراکش اور یوگوسلاویا تک سے نمایندے آئے، ہمسایہ حکومتوں کے مندوبین تھے، یمن سے حکومت اور قوم دونوں کے نمایندے آئے، لیکن سعودی حکومت اور حجاز کی نمایندگی نہیں ہوئی، دنیا کے مسلمان انگشت بدندان تھے، کہ یہ کیا معاملہ ہے، ؟ موتمر کے اختتام پر ڈاکٹر عبد الحمید سعید نے تار کے ذریعہ فیصلوں کی تائید چاہی، جواب ملا، (یھمنا ما یھم المسلمین) مسلمانوں کا درد دکھ ہمارا درد دکھ ہے" کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا، ؟ یہ انداز بیان تو نجد کے وہابی فرمانروا کا نہیں معلوم ہوتا،

"الفتح کے ایڈیٹر محب الدین خطیب، سلطان ابن سعود کی اس پالیسی کی صفائی پیش کرنا چاہتے ہیں، (ملاحظہ ہو: نمبر ۶۳۹، ۲۱ ر ذی القعدہ) ٹرزولٹ کے نام سلطان کا ایک مکتوب بھی شائع ہوا ہے، یہ سب صحیح، لیکن ام القریٰ فلسطین کا نام زبان پر لانے کر کیوں لرزہ براندام ہے، ؟

ایران[1] ص ۴۴۳ و ۴۴۲

(رضاشاہ پہلوی کے دور حکومت میں،)

پندرہ سال پیشتر اور آج کے ایران میں بڑا فرق ہے، آج ایران بالکل بدلا ہوا ہے، آج ایران آزاد اور اپنی قسمت کا آپ مالک ہے، جدید ایران کا ستارہ ۱۹۲۲ء میں چمکا، اور ۱۹۲۴ء میں ایرانی

---

[1] ایران کے ضمن میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ حرف بحرف مصنف کی تحریر کا خلاصہ ہے، راقم الحروف کی معلومات اس باب میں بہت محدود ہیں،

تخت پر متمکن کر دیا، ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۶ء تک شاہ کی کوششیں فوج کی تنظیم اور مرکز کی حیثیت بڑھانے میں صرف ہوئیں،

مئی ۱۹۲۸ء میں بیرونی امتیازات ختم کر دیئے گئے، ایران میں عام طور پر ترکی کی روح کام کر رہی ہے، اور اسی نمونہ پر نئی حکومت کی بنیادیں مستحکم کیجا رہی ہیں،

اب مرکز کا وقار قائم ہو چکا ہے، ۱۹۲۵ء میں جبری فوجی تعلیم کا نفاذ ہوا، اور آج ملک میں ڈھائی لاکھ باضابطہ مسلح سپاہ موجود ہے، مدنی قوانین میں بھی تبدیلیاں ہوئی ہیں، تعلیمی ترقی نمایاں ہے، تقریباً ہزار طالب علم یورپ اور امریکہ میں زیر تعلیم رہا کرتے ہیں، صنعت و حرفت پر خاص زور دیا جاتا ہے، افسوس یہ ہے کہ اب تک بعض اہم تجارتیں غیر ملکیوں کے قبضہ میں ہیں، شکر کی تجارت البتہ حکومت کے ہاتھ میں ہے، ایک وسیع ریلوے لائن زیر تعمیر ہے جو پورے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دے گی، بڑی بات یہ ہے کہ اس اہم اور وسیع اسکیم میں کسی غیر ملکی کمپنی کا ایک حبہ نہیں ہے، ایران کی مالی حالت قابل اطمینان ہے،

فنون لطیفہ اور آثار قدیمہ کی طرف بھی توجہ کیجاتی ہے، لندن کی رائل اکادمی میں ایرانی آرٹ کی نمائش (۱۹۳۱ء) اور فردوسی کی ہزار سالہ برسی کی تقریب سے ایران کی ثقافتی حیثیت بلند ہو گئی ہے،

روس اور برطانیہ سے تعلقات برابری کے اور دوستانہ ہیں، یہ صورت خاص طور پر اینگلو پرشین آئل کمپنی کے جھگڑے کے بعد سے پیدا ہوئی ہے، اپریل ۱۹۳۳ء کے نئے ٹھیکہ کے بعد ایران کو سالانہ ساڑھے سات لاکھ پونڈ سے کم نہیں ملتا، اس کے علاوہ ایرانی طلبہ کو دس ہزار پونڈ سالانہ کے وظائف ملتے ہیں، برطانیہ سے صرف بحرین کے ساحل کا جھگڑا رہ گیا ہے، ترکی سے حدود کا معاملہ ۱۹۲۹ء میں خاطر خواہ طے ہو گیا تھا، ۱۹۳۴ء میں خود شاہ نے ترکی کی سیاحت کی، افغانستان سے بھی تعلقات شگفتہ ہیں، طہران کی اصلاحات سے کابل کا اثر پذیر ہونا طبعی بات ہے،

آج کا افغانستان (ص ۴۲۔ ۲۴۳۔ ۴۴)

فروری ۱۹۱۹ء میں امیر امان اللہ تاج و تخت کا وارث ہوا، امیر حبیب اللہ پر برطانیہ نواز ہونے کا شبہہ تھا، اس لئے قتل کر دیا گیا، مئی ۱۹۱۹ء میں افغان فوجیں حدود ہند کی طرف بڑھنے لگیں، انگریزی سپاہ سے جھپٹ ہوئی، آخر برطانیہ نے افغانستان کی خود مختاری تسلیم کی، اور سرحد کا مسئلہ بھی افغانستان کے حسب خواہ طے پا گیا، (معاہدہ راولپنڈی)

نیا بادشاہ کمال اتاترک اور رضا شاہ کے طرز کا "مصلح" تھا، اوس نے مغربی ملکوں کے نمونہ پر اصلاحات کی ایک مہم شروع کر دی، روس سے ۱۹۲۱ء میں ایک دوستانہ معاہدہ ہوا، لیکن افغان حکومت نے روسی یا برطانوی ماہرین فن سے ہمیشہ احتیاط کی، اس کی رائے میں دور دراز کے استاد اور انجینیر بے ضرر ہوتے ہیں، ہمسایوں سے ڈرنا بے جا نہیں تھا، مارچ ۱۹۲۱ء میں ترکی سے بھی دوستانہ معاہدہ ہوا، اسی سال ایران سے ایک تجارتی و سیاسی میثاق کی طرح ڈالی گئی،

۱۹۲۸ء میں امان اللہ نے یورپ کا سفر کیا، راستہ میں مصر بھی ٹھہرا، ایران و ترکی کی راہ سے افغانستان کو واپسی ہوئی، اس نے مغربی طرز بود و ماند کی نقل اتارنی چاہی، اور قدیم روایات کو یکسر بدل دینے کی کوشش کی، نئی فوج اور نئے عہدہ دار تو اس نے تیار نہیں کئے اور جلد بازی میں پرانی سپاہ کو اپنا بدخواہ بنا لیا، اس کے علاوہ محاصل کی زیادتی اور فوجی بھرتی میں سختی کی شکایت بھی عام تھی، ۱۹۲۸ء میں شورش اٹھی، اور مئی ۱۹۲۹ء میں امان اللہ کو وطن چھوڑنا پڑا، آخر نادر شاہ نے آکر افراتفری دور کی، اور عام خواہش کے مطابق ۱۶ ر اکتوبر ۱۹۲۹ء کو مسند حکومت پر متمکن ہوئے،

نئے سلطان کے دور میں اندرونی اصلاح تیزی سے ہو رہی ہے، ایک فوجی اکادمی قائم ہے، یونیورسٹی کی تاسیس بھی ہوئی ہے، اسلامی ملکوں سے سیاسی مراسم استوار کئے گئے

نادرشاہ نے اسلامی روایات پر قائم رہتے ہوئے جدید اصلاحات کی اچھی چیزیں لے لیں، افسوس کہ ترقی کی یہ رفتار چند روزہ ثابت ہوئی، شاہ غازی ۸ رنومبر ۱۹۳۳ء کو شہید کر دیے گئے، ان کے جانشین ظاہر شاہ کے دور سلطنت میں بھی وہی معتدل حکمت عملی چل رہی ہے، افغانستان مجلس اقوام کا ممبر بھی بن چکا ہے،

مرحوم و مغفور حضرت علامہ اقبال کے الفاظ میں افغان اپنے اندر تین نمایاں خصوصیات رکھتے ہیں،:-

"مذہبی روح کا استحکام، خاندان، اور طبقات کے قیود سے کامل آزادی، اور وہ صحیح توازن جس کے ماتحت انھوں نے ہمیشہ مذہبی اور قومی تخیلات کی پرورش کی ہے ماضی کو باقی رکھنے کی روح، افغانون کے لئے ہمیشہ قوت کا سرچشمہ رہی ہے، اس کے ذریعہ وہ دور جدید کے مقتضیات کو لبیک کہتے ہوئے ماضی سے اپنا رشتہ قائم رکھتے ہیں"

(منقول از دیباچہ کتاب افغانستان)

ہندستان اور مشرق بعید میں اسلامی تجدد (ص ۳۵۴-۳۴۷)

جب کسی غیر ہندی اہل قلم کی کوئی تاریخی یا سیاسی کتاب (عربی ہو یا انگریزی) ہمیں ملتی ہے، تو ہم پہلے اس میں ہندوستان اور خاص کر مسلمانون کا حال دیکھتے ہیں، اور اس کی صحت و صداقت کے اعتبار سے پوری کتاب کے متعلق رائے قائم کرتے ہیں ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں، کہ زیر نظر کتاب اس معیار پر پوری اتری، بعض بہت معمولی فروگذاشتیں ہیں، جن سے کوئی کتاب خالی نہیں ہوتی،

مصنف نے جامعہ ملیہ اور حکیم اجمل خان کی کوششون کا علی گڈھ تحریک کے ضمن میں ذکر کیا ہے، جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، (ص ۱۰۰) لیکن کیا یہ ہلکی سی فروگذاشت اس صریح غلطی سے

لو ئی نسبت رکھتی ہے، جو (Whither Islam) میں ہندوستان کے مقالہ نگار نے ندوہ کے متعلق کی ہے، (ملاحظہ ہو کتاب مذکور ص ۱۹۳)

وہ لکھتا ہے:-

"سرسید کی دوسری کوشش لکھنؤ میں ندوۃ العلماء اور اس کے دار العلوم کی تاسیس تھی، اس کا مقصد الخ"

پورا بیان درست ہے لیکن ندوہ کی نسبت سرسید مرحوم کی طرف کرنا، اس سے زیادہ اور یا اندھیر ہو سکتا ہے، ؟ یہ مقالہ نگار کوئی انگریز افسر ہے، جو ہندوستان میں سالہا سال زندگی بسر کر چکا ہے، اگر بیچارہ زکی علی جنیوا میں بیٹھ کر جامعہ کو علی گڈھ سے الگ نہ دکھا سکا، تو کیا تعجب ہے، بہرحال کہنا یہ تھا کہ زکی علی ہندوستان اور یہاں کے مسلمانوں کو ٹھیک سمجھے ہیں، جو کچھ لکھا ہے، کافی پڑھ کر لکھا ہے، ذیل کے مختصر اقتباس سے صحیح اندازہ ہوگا:-

"سترہوین صدی عیسوی میں سارا ہندوستان مغلیہ حکومت کے زیر سایہ آگیا، اسلام کی عظمت کا سکہ ملک کے طول وعرض میں بیٹھ گیا، آخری دور میں حکومت کی بنیادیں کمزور ہو گئیں لیکن اسلام ایک مذہب کی حیثیت سے ملک کی رگ وپے میں پیوست ہو چکا تھا، آج وہاں آٹھ کروڑ سے زیادہ مسلمان آباد ہیں،

گو مسلمان تعلیم میں پیچھے رہ گئے، لیکن پھر بھی کوششیں جاری ہیں، سرسید احمد خان نے علی گڈھ میں اپنی یونیورسٹی قائم کی، اور موجودہ روشنی کے مطابق انھون نے اسلامی افکار کی ترجمانی کی،"　(ص ۸۰-۴۴)

، یہ کتاب لندن سے ۱۹۳۲ء میں پروفیسر (H. A. R. Gibb) کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے، میں مختلف ملکوں پر جدا جدا مقالات ہیں،

ثقافتی بیداری کے ساتھ ساتھ مسلمانان ہند سیاست میں بھی دلچسپی لینے لگے، ۱۹۱۲ء[1] میں مسلم لیگ کی تاسیس ہوئی، ہندوستان کی سیاسی حالت نے ملک کی دو اہم قوموں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا ہے، ہندو مسلم تعلقات کی تفصیلات میں ہم اس وقت نہیں پڑ سکتے، ہندو مسلمانوں کی باہمی آویزش کی مختلف اجتماعی، مذہبی، معاشی اور سیاسی توجیہیں کی گئی ہیں،

مصنف نے ایک مغربی اہل قلم (Clifford manshart) کی رائے ہندو مسلم مسئلہ پر نقل کی ہے یہ رائے اس حد تک ضرور صحیح ہے، کہ آیندہ یہ اختلافات زیادہ سے زیادہ طبقاتی جنگ (Class Truggle) کی شکل اختیار کرتے جائیں گے، لیکن اس سے "تہذیبی برتری" کی جنگ بند نہیں ہو سکتی، اس مغربی مصنف کی تحریر میں ایک غلط بیانی یہ بھی ہے، کہ افغان سود خوار اور ہندو مہاجنوں کو ایک حیثیت حاصل ہے، (ص ۲۲۹) جس قدر مسلمان پیشہ ور اور زمیندار ہندو مہاجنوں کے مقروض ہیں، اسکا عشر عشیر بھی ہندو عوام افغان سود خواروں کے دست نگر نہیں،

ہندو مسلم مسئلہ کے متعلق ایک مسلمان مصنف (رحمت[2] علی صاحب) کی یہ رائے بھی سننے کے لائق ہے، جو "نیشنلسٹ" زاویہ نگاہ کی ترجمانی کرتی ہے، ا-

"برطانوی استعمار پسند اس اختلاف کی علت ہندوستانی عوام کا مذہبی جنون قرار دیتے ہیں، ہندوستانی قومیت اسے برطانوی شہنشاہیت کی پیداوار سمجھتی ہے"

(ص ۲۴۹)

مصنف نے اس پیچیدہ مسئلہ پر ہر نقطۂ نگاہ کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، متحدہ قومیت

---

[1] مسلم لیگ کی تاسیس ۱۹۰۶ء میں ہوئی، البتہ زندگی ۱۹۱۲ء کے بعد پیدا ہوئی [2] رحمت علی صاحب کی کتاب فرنچ میں ہے، اور ۱۹۳۳ء میں پیرس سے شائع ہوئی ہے،

کے علم برداروں کی طرف سے بسنت کمار رائے کے ایک مضمون (شائع شدہ "اورینٹ" نیویارک نومبر ۱۹۴۳ء) کا اقتباس دیا گیا ہے، (ص ۳۵۱) بہرحال مصنف کو توقع ہے کہ

"ایک وسیع الخیال نظام تعلیم اور دونوں جماعتوں کے باہمی تعاون سے آزاد ہندوستان میں فرقہ وارانہ نزاع کا مستقل حل ہو سکے گا" (ص ۳۵۲)

مسلمانانِ ہند کی بین الملی ہمدردی اور مسلمانانِ عالم کی فلاح و بہبود سے ان کی دلچسپی کا تذکرہ بھی مناسب الفاظ میں کیا گیا ہے،

انڈونیسیا میں بھی تبدیلی ہو رہی ہے، مشرق قریب سے اس کے تعلقات روز بروز پائدار ہوتے جا رہے ہیں، مذہبی اور قومی تجدید و اصلاح کے لئے متعدد انجمنیں کام کر رہی ہیں جن میں انجمن شرکت اسلام، اور محمدیہ پارٹی خاص طور پر ممتاز ہیں، سورابایا، اور بٹاویا نشر و اشاعت کے مرکز ہیں، ولندیزی حکومت کا برتاؤ ان کے ساتھ اچھا نہیں، کوئی دینی و قومی تحریک وہ انگیز نہیں کر سکتی، اور مسیحی مشنریوں کی کھلم کھلا حوصلہ افزائی کیجاتی ہے،

جاپان میں اسلام کی ترقی کے امکانات کی طرف بھی مصنف نے اشارہ کیا ہے، (ص ۳۵۴)

چین کے سلسلہ میں الازہر سے چینیوں کے تعلقات کا مصنف نے خاص طور پر ذکر کیا ہے، یہ واقعہ ہے کہ مصری حکومت بلکہ شاہ فاروق کا چینی طلبہ پر بڑا احسان ہے، تقریباً تیس چینی طالب علم شاہ مصر کے صرف پر ازہر میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، متعدد مصری معلم ازہر کی طرف سے پیکنگ بھیجے گئے ہیں، اور اس طرح پر عربی زبان اور اسلامی علوم کی ترویج کے لئے ایک مستقل زمین تیار ہو رہی ہے،

اشتمالی روس اور اسلام

ترکی کی طرح روس کے متعلق بھی ہندوستان میں عام طور پر کسی بات پر یقین نہیں کیا جاتا، کچھ کہئے، جواب ملے گا "یہ سب انگریزوں کا پروپگنڈا ہے"، "سوشلزم" کی ظاہری خوبیوں پر مسلمان

نوجوان اس قدر فریفتہ ہین کہ وہ اس کے نظری پہلو (Philosophical aspect) کا مطالعہ بھی نہیں کرنا چاہتے، اور جو دو چار مطالعہ کے بعد مکمل سوشلسٹ بن چکے ہین وہ سیاسی سربلندیون[1] کی خاطر اپنے عقائد صاف صاف بیان نہیں کرتے،

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ مارکس کی تعلیمات میں وجود باری کی کہیں گنجایش نہین، تاریخ کی مادی تعبیر کا نظریہ روحانیت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکتا ہے، جب ایک مارکس کا پیرو رسول کریمؐ اور دیگر انبیاے کرام کی تعلیمات کو بھی مادہ اور روٹی کا جامہ پہنانا چاہتا ہے، تو پھر مذہب اور روحانیت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے، اس میں شک وشبہہ کی گنجایش نہیں، کہ اشتراکیت یا اشتمالیت انکار ربوبیت کی طرف رہنمائی ضرور کرتی ہے، اگر یہ حوصلہ افزائی نہ ہوتی، تو روس میں آج وسیع پیمانہ پر مخالف الوہیت تحریک (انٹی گاڈ موومنٹ) ہرگز نشوونما نہ پاسکتی،

مارکس اور سوشلزم کے تجزیہ اور تحلیل کا یہ موقع نہیں، کہنا صرف یہ ہے کہ نئی چیزون کی ظاہری چمک دمک سے مسحور ہونے کی جگہ ہمیں ان کی حقیقتوں کا پتہ لگانا چاہئے، اور پھر ان نتائج کو شریعت اور عقل سلیم کی کسوٹی پر کس کر جانچنا چاہئے، ورنہ روشن خیالی اور عقلیت کے دعوے سب غلط اور صرف دکھاوے کے ہین،

گو یہ موقع مارکسزم (Marxism) یا سوشلزم کی تنقید[2] و تحلیل کا نہیں، پھر بھی مذہب کے متعلق مارکس اور اس کے پیرؤن کا رویہ واضح کرنے کے لئے ہم ذیل میں ایک مشہور کمیونسٹ کی ایک تحریر کا اقتباس پیش کرتے ہین، کامریڈ ام، ان، راے ہمارے وطن کے

---

[1] ابھی جداگانہ طریق انتخاب باقی ہے، اس لئے "سیاسی سربلندیان" مسلمان ووٹرون کی مرضی کے بغیر نہین حاصل ہوسکتیں [2] اس موضوع پر حافظ فضل الرحمن صاحب انصاری کا ایک گران قدر مضمون "مدینہ" ۲ جولائی ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا ہے، یون خود سوشلزم کی بائبل (Das Kapital) بازارون میں ملتی ہے،

مشہور انقلابی رہنما ہیں، اور عرصہ تک کیمونسٹ انٹرنیشنل کے سرگرم کارکن رہ چکے ہیں، ہندوستانی کیمونسٹوں میں کوئی ان کی ہمسری کا ادعا نہیں کرسکتا، وہ گاندھی ازم، اور سوشلزم کا مقابلہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں، :-

"سوشلزم کا فلسفہ مادیت ہے، جو مذہب کو پس پشت ڈال دیتی ہے اور روحانیت کو تسلیم نہیں کرتی، دوسرے لفظوں میں زندگی اور مخلوقات کے مذہبی نظریہ کی تردید کرتی ہے، سوشلزم اور مارکس کی تعلیمات کا بنیادی جزء مادیت باصول تضاد (Dialectical materialism) پر مبنی ہے،......... پہلے فلسفہ کے ذریعہ دنیا کی تشریح کیجاتی تھی لیکن مستقبل میں اس کا منصب بدل جائے گا، اب یہ دکھانے کی کوشش کیجائے گی، کہ انسان کس طرح دنیا کی دوبارہ تعمیر کرسکتا ہے، .... اس کے معنی یہ ہوئے کہ مارکس کے فلسفہ میں انسان کسی قدرتی طاقت کے ہاتھ میں آلہ کار نہیں ہے، انسان اس دنیا کا جس میں وہ رہتا ہے، خالق ہے، انسان سوسائٹی کا خالق ہے،

یہ ایک طویل خطبہ کے اقتباسات ہیں، جو ان کے اخبار "انڈی پنڈنٹ انڈیا" (۲۲ جنوری ۳۹ء) میں شائع ہوئے ہیں، بحث کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے، :-

"بہرحال ایک شخصی خدا (Personal God) کا عقیدہ ہو یا عبادت کی تاثیر کا، یا عالم کا مذہبی تصور ہو...... یہ بالکل واضح ہے، کہ ان تصورات میں سے کوئی بھی کسی طرح مارکسی نظریہ زندگی اور انسانی جدوجہد سے میل نہیں کھا سکتا،

روس میں بیس سال سے مسلمانوں پر جو کچھ بیت رہی ہے، اس سے بحمد اللہ ہم واقف ہیں،

سلہ عام طور پر اس فقرہ کا ترجمہ "مادیت" بالفظ کیا جاتا ہے لیکن اس سے مفہوم واضح نہیں ہوتا،

آج کی صحبت میں مصنف کے بیانات کا خلاصہ درج کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، جو کافی مطالعہ اور تحقیق و جستجو کا نتیجہ ہیں :-

"سوویٹ روس کے علاقوں میں تقریباً تین کروڑ مسلمان آباد ہیں، جو مسلسل بالشویک پروپگنڈا اور سختی کے باوجود اپنی جگہ پر قائم ہیں،

"روس نے اسلام کے مقابلہ میں دو رخی حکمت عملی اختیار کی، باکو کانگریس (سنہ ۲۰ء) کے فیصلہ کے مطابق انھوں نے مشرقی دنیا میں اپنے کو مظلوموں کا ہمدرد اور غریبوں کا نجات دہندہ مشہور کیا، داخلی حکمت عملی اس کے خلاف تھی، اسٹالن کی تشریح (سنہ ۲۱ء کی رپورٹ) کے مطابق، اس کا مقصد مذہبی تنظیم کو ختم کرنا، اور تورانیت کی تحریک کو کمزور کرنا تھا، مخالف الوہیت تحریک سارے روس میں اسلامی نظام کو ختم کر دینا چاہتی ہے، قفقاز اور وسط ایشیا میں مسلمانوں کی مدافعت کے باعث، یہ تحریک کامیاب نہیں ہو رہی ہے، ایک کمیونسٹ مصنف کے اقرار کے بموجب،

"نسبتًہ گرجون کا بند کر دینا آسان ہے، لیکن مسجدون کا معاملہ اس سے جدا ہے، جن کے ختم کرنے کے لئے کافی عقل و فہم کی ضرورت ہے"

بیت المقدس کی موتمر اسلامی (دسمبر سنہ ۳۱ء) میں عیاض اسحاق (جو رسالہ Yani Mili Yul برلن کے ڈائرکٹر اور مختلف انجمنوں کے صدر ہیں) نے مسلمانان روس کی حالت پر ایک رپورٹ پڑھی تھی، یہ رپورٹ اطالوی رسالہ (Oriento Moderno) (مارچ سنہ ۳۳ء) میں شائع ہوئی تھی، اس پر مسلمانوں پر بیجا سختیوں کی مثالیں اور تفصیلات دی گئی تھیں، اصل یہ ہے کہ مذاہب کی مخالفت اور بیخ کنی ماسکو کے بنیادی عقائد میں شامل ہے،

"روسی ترکستان بالشویک پروپگنڈا کا اہم مرکز ہے، مرحوم انور پاشا یہیں ایک بالشویک ایجنٹ کے ہاتھوں شہید ہوئے، تاشقند جس کی آبادی آج پانچ لاکھ ہے، بالشویک ایشیا کا معاشی اور تہذیبی مرکز ہے، ان کی اہم جماعتوں کے مرکزی دفاتر یہیں ہیں، یہاں تبلیغی اسکول اور کالج بھی ہیں، یہیں سمرقند کے جامع مسجد کا منارہ[۱] منہدم کر دیا گیا ہے، اور اسکی جگہ لینن کا عظیم الشان مجسمہ نصب کیا گیا ہے، جس پر یہ الفاظ کندہ ہیں،

"آج کے بعد موذن مومنون کو اس منارہ سے (عبادت کی) دعوت نہیں دیگا بلکہ ....لینن"،

"کومنترن (کمیونسٹ انٹرنیشنل) شمالی افریقہ اور مشرق قریب میں مسلمان مزدورون پر اثر انداز ہونے کی پوری کوشش کر رہا ہے لیکن یہ حقیقت سامنے رہنا چاہئے، کہ مسلمانوں اور اشتراکیوں میں کبھی اشتراک عمل نہیں ہو سکتا،[۲]

افسوس کہ ہندوستان میں بعض مسلمان (بلکہ علما بھی) اشتراکی دہریوں کیساتھ سیاسی میدان میں اشتراک عمل کر رہے ہین، میرے خیال میں یہ غلط رواداری مسلمانوں کی یکجہتی کیلئے سم قاتل ثابت ہوگی،

شمالی روس کے حالات کا جائزہ اس سلسلہ کی آخری کڑی ہے، اس کے بعد اسلام اور بین الاقوامی تعلقات (ص ۲۷۰ - ۲۹۱) پر مصنف نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، اور بین الاقوامی سیاسیات میں مسلمانون کی اہمیت واضح کی ہے، جنگ عظیم سے پہلے مسلمان اور

---

[۱] بعض عینی شاہدوں نے بھی اسکی تصدیق کی ہے [۲] چند سال ہوئے شمالی افریقہ کے متعلق وہان کے ہر دلعزیز نوجوان لیڈر (حسن بو عیاد) نے اپنے ایک فاضلانہ مضمون نحن المغاربۃ مسلمون اعداء الشیوعیۃ والاستعمار میں یہ حقیقت اچھی طرح واضح کی تھی، (الفتح ۱۳۵۱ھ ہجری)

مسلم حکومتیں انتہائی بُری حالت میں تھیں، صحیح معنوں میں کوئی ملک آزاد نہیں تھا، عثمانی حکومت ہار مان کے لڑ رہی تھی، جنگِ عظیم کے بعد نقشہ بدل گیا، کمالی ترکی پھر تازہ دم ہوکر میدان میں آگئی، ایران و افغانستان نے چولا بدلا، عربی علاقے بیدار ہوئے، ابن سعود کی بیدار مغزی سے جزیرۃ العرب کا ایک بڑا حصہ فتنہ و فساد سے محفوظ ہوگیا، عراق و مصر آزاد ملکون کی صف میں داخل ہو چکے ہیں، شام کا قضیہ بھی طے ہوا چاہتا ہے، خلاصہ یہ کہ اس وقت آزاد مسلم حکومتوں کی ایک کافی تعداد نظر کے سامنے ہے، جو علاقے اب تک پابند قفس ہیں، وہ بھی جد و جہد سے غافل نہیں،

یہ سب سہی پھر بھی آبادی کے لحاظ سے مسلمانان عالم کی اکثریت آج تک دوسروں کی غلام ہے، دس کرور سے زیادہ مسلمان برطانیہ کے زیرنگیں علاقوں میں آباد ہیں، فرانس کی مملکت میں چھ کرور کے لگ بھگ ان کی آبادی ہوگی، اسی طرح ولندیزی مقبوضات میں کلمہ گویون کی تعداد پانچ کرور ہے، روس میں تین کرور حلقہ بگوشان اسلام موجود ہیں، اطالوی مقبوضات میں بھی مسلمانون ہی کی آبادی زیادہ ہے،

یہ علاقے ان استعماری حکومتون کے لئے بڑی اہمیت رکھتے ہین، صرف الجزائر میں فرانسیسی مالِ تجارت کی اس قدر کھپت ہے جتنی انگریزی مصنوعات کی ہندوستان میں نہین، خلیج فارس کا ساحلی علاقہ برطانوی ہوائی رہ گذر ہے، اس کی اہمیت دورانِ جنگ میں اور بڑھ جائے گی، اس فوجی اور ہوائی رہ گذر میں ابن سعود سے دوستانہ تعلقات رکھے بغیر کوئی توسیع نہیں ہو سکتی، عرب حکومتوں کو رام کئے بغیر اب بحرروم میں توازن قائم رکھنا دشوار ہے، اگر ہندوستان اور شمالی افریقہ میں بین الاقوامی پرزور تحریکیں ہون، تو برطانیہ اور فرانس کو مسلمانون کے بین الاقوامی مفاد کا لحاظ کرنا پڑیگا،

یہ خلاصہ ہے مصنف کے افکار و خیالات کا، آغاز میں انھون نے نہایت مدلل طرزبیان میں اسلام کی بین الاقوامی تعلیمات اور مسلمانوں کی یک جہتی پر زور دیا ہے، ان کا یہ کہنا بالکل صحیح

اسلام کے قوانین اور معتقدات، جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا، مسلمانوں کی روزمرہ کی زندگی، حکومت، سیاسی حکمت عملی، اور تجارت سب پر یکساں اثر انداز ہوتے ہیں، اس لئے اگر مسلمان یہ محسوس کریں کہ ان کا مذہبی وقار خطرہ میں ہے، تو بآسانی مخالفانہ تحریکیں اٹھائی جا سکتی ہیں، (صفحہ ۳۶۲)

اسی بنیاد پر مصنف کے نزدیک بین الاقوامی سیاسیات میں مسلمانوں کی بڑی اہمیت ہے، اس سلسلہ میں انھوں نے متعدد مثالیں بھی دی ہیں،

"وحدت عربیہ" یا اتحاد عرب کی تحریک پر مصنف نے سیر حاصل گفتگو کی ہے، انکے خیال میں اس خواب کی تعبیر دشوار نہیں، (۳۶۹-۳۷۰)

احیاے خلافت کا فوری امکان ابھی نہیں ہز کی علی مصری کے خیال میں بھی مصر کی سیاسی کمزوری کے باعث شاہ فاروق سردست اس کے اہل نہیں، پھر بھی بیت المقدس کی موتمر اسلامی (۱۹۳۱ء) اور یورپین مسلم کانگریس (۱۹۳۲ء) اور اس قسم کی دوسری بین الاقوامی کانفرنسوں سے مسلمانان عالم کی سیاسی قوت میں اضافہ ہونا لازمی ہے،

فلسطین کے سلسلہ میں عربوں کی یکجہتی بھی بطور دلیل کے پیش کیجا سکتی ہے، ایران کے ایک شیعہ عالم (ابو عبد اللہ زنجانی، رکن المجمع العلمی العربی، دمشق) نے "اتحاد اسلام" پر مصر میں ایک پر مغز خطبہ دیا تھا، اس کا بھی مصنف نے بطور فال نیک کے ذکر کیا ہے، بہرحال کتاب کے دوسرے حصوں کی طرح یہ باب بھی پر مغز اور پڑھنے کے لائق ہے،

کتاب کے آخری باب (دنیا میں اسلام ص ۳۷۹-۴۱۰) میں مصنف نے اس طرح گذشتہ ابواب کا جائزہ لیا ہے کہ ایک مختصر مضمون میں انھوں نے تمام کتاب کا خلاصہ پیش کر دیا ہے، طرز بیان کی دل نشینی اس پر مستزاد ہے،

اس تلخیص کے بعد انھوں نے "اسلام اور یورپ" کی باہمی مفاہمت کے امکانات پر سنجیدگی کے ساتھ بحث کی ہے، اور مفید باتیں بیان کی ہیں لیکن ہمیں ان سے دلچسپی نہیں ہوئی، ہم اپنی طرف سے لاکھ صلح و مفاہمت کی تجویزیں اور اخلاقی معیار پیش کریں لیکن ادھر سے پیش قدمی نہیں ہو سکتی، جب تک مسلمان اور مشرق کی قومیں اہل یورپ کی زبان (اسلحہ) میں ان سے گفتگو نہیں کریں، کسی مستقل مفاہمت کا امکان نہیں،

آخر میں (ص۱۲۱-۱۱۱) لائق مصنف نے مسلمانان عالم کی آبادی کے متعلق صحیح اعداد و شمار فراہم کرنے کی کوشش کی ہے، اور تفصیل کے ساتھ ہر ایک ملک اور علاقہ کے اعداد الگ الگ دئیے ہیں، جن ملکوں میں باضابطہ مردم شماری نہیں ہوئی ہے وہاں کے اعداد تقریبی ہیں، اس میں بھی حتی الوسع کم از کم تخمینہ کیا گیا ہے، مثال کے طور پر چین اور چینی ترکستان (منگولیا، اور تبت کے درمیانی علاقے اس میں شامل ہیں) کی کل آبادی مصنف نے ۵ کرور لکھی ہے، حالانکہ واقف کار چینی مسلمان صرف چین کے مسلمانوں کی تعداد ۵ کروڑ بتاتے ہیں، اسی طرح مسلمانان حبشہ کی آبادی مصنف نے پچاس لاکھ (۵۰ فی صدی) بتائی ہے، حبشہ کی صحیح آبادی جو کچھ بھی ہو لیکن مسلمانوں کی آبادی پچاس فی صدی سے زیادہ ضرور ہے، اس محتاط تخمینہ کے مطابق مسلمانان عالم کی آبادی ۴۴ کرور ہوتی ہے،

مختلف علاقوں کے صحیح اعداد و شمار نہ ہونے کی صورت میں، تخمینے مختلف ضرور ہوں گے لیکن یورپین ماہرین فن تو بسا اوقات سرکاری رپورٹوں میں دئیے ہوئے اعداد میں بھی تخفیف کر دیتے ہیں، اس کے برعکس مسلمان کبھی پچاس کرور اور کبھی ساٹھ کرور بتاتے ہیں، صحیح تخمینہ اور تلاش و جستجو بہت کم کیجاتی ہے،

اس سے پہلے ہم نے خود الضیاء (جلد ۳) میں "مسلم ریوائول" لاہور، اور بعض دوسرے

انگریزی رسالوں کی امداد سے اعداد مرتب کئے تھے، تخمینہ چالیس کروڑ کے لگ بھگ ہوتا تھا، اسکے بعد "حاضر العالم الاسلامی" کے جدید ایڈیشن (جلد ۳ صفحہ ۳۶۵-۳۷۰) میں امیر شکیب کے مرتب کردہ اعداد نظر سے گذرے، امیر البیان کے تخمینہ کے مطابق مسلمانان عالم کی آبادی (۱۹۳۲ء) میں سینتیس کروڑ کے لگ بھگ تھی، امیر شکیب ارسلاں بھی کم سے کم تخمینہ کرتے ہیں، ڈاکٹر زکی علی نے یہ اعداد ۱۹۳۶ء میں مرتب کئے ہیں، اسلئے قدرتی طور پر تعداد میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہونا چاہئے تھا، ان کے اعداد امیر البیان کے مرتب کردہ اعداد سے زیادہ مفصل اور واضح ہیں، نمونہ کے طور پر امیر البیان نے مراکش کی مجموعی آبادی اسی لاکھ بتائی ہے، ڈاکٹر زکی علی نے مراکش کی مردم شماری اس طرح کی ہے،

مراکش (فرانسیسی منطقہ)	(پچاس لاکھ)
" (مغرب اقصیٰ)	
" (فرانسیسی منطقہ)	(")
" (اسپینی منطقہ)	(سات لاکھ)

اس تفصیل سے کل آبادی ایک کروڑ سات لاکھ ہوئی، اسی نوعیت سے تمام ملکوں کی تفصیل کی گئی ہے، مراکش کے اعداد میں اتنا نمایاں فرق نئی مردم شماری کے باعث ہی ہے، اس قدر خامہ فرسائی کے بعد تلخیص اور تحشیہ نگاری سے قلم کو فرصت ہوتی ہے، میری کوشش مشکور ہوگی، اگر دو چار اصحاب بھی اصل کتاب کو پڑھ لیں، اور ان اہم مسائل پر جو آج مسلمانان عالم کے سامنے درپیش ہیں، غور و فکر کی کوئی نئی راہ نکالنے کی کوشش کریں،

دنیائے اسلام اور خلافت

موجودہ عہد میں خلافت عثمانیہ کے قیام و بقا کے لئے دنیا کی مسلمان قومیں کیا جدوجہد کر رہی ہیں، مصنف کے سفر یورپ کے دلچسپ معلومات ہیں، قیمت ۱۰؍ ضخامت ۵۰ صفحے،

تلخیص و تبصرہ

مزاج کا مطالعہ

اشخاص کے مزاج کی تین قسمیں ہوتی ہیں، ایک وہ جو اپنی طبیعت کی اندرونی کیفیات (Introvert) کے مطالعہ کے عادی ہیں، دوسرے وہ جو صرف اپنی ظاہری کیفیات (Extravert) کا مطالعہ کرتے ہیں، تیسرے وہ جو اپنی دونوں کیفیتوں (Ambivert) پر نظر رکھتے ہیں،

اگر کوئی شخص دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کے بجائے، گھر میں بیٹھ کر دلچسپ کتابیں پڑھتا ہو، اجنبیوں سے ملنے میں گھبراتا ہو، اپنے اوپر بیجا اعتراض سے کبیدہ خاطر ہوتا ہو، اپنے کپڑے اور ظاہری شکل کا زیادہ خیال رکھتا ہو، کسی اہم بات کا فیصلہ کرنے میں دوسروں کی رائے پسند نہ کرتا ہو، خاموشی سے سوچتے سوچتے مضمحل ہو جاتا ہو، کئی دوستوں کے بجائے صرف ایک مخلص دوست سے انس اور محبت رکھتا ہو، کسی کام کو شروع کرنے سے پہلے اسکے ہر پہلو کو اچھی طرح سوچتا ہو، کسی بات کا فیصلہ کرنے سے پہلے اسکی اہمیت سے زیادہ اپنے اصول کو پیش نظر رکھتا ہو تو اس کا مزاج اول الذکر قسم کا ہے، وہ فطری طور پر خاموش، جفاکش، حساس اور عزت پسند ہوتا ہے وہ زیادہ تر خوابِ خیال کی دنیا میں رہنا پسند کرتا ہے، اس مزاج کے لوگ تصنیف و تالیف، تلاش و تحقیق، آرٹ اور ایجاد کے زیادہ دلدادہ ہوتے ہیں، لیکن اس قسم کا مزاج متوازن نہیں

ہوتا ہے، اس میں توازن پیدا کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے، کہ ایسے مزاج والے اشخاص کو جسمانی ورزش خوب کرنا چاہئے، جسمانی ورزش کی تفریح میں ان کے دماغ کے رجحانات تخیل کی اونچی دنیا سے اتر کر ایک مناسب سطح پر آجاتے ہیں، ایسے مزاج کے لوگوں میں دماغی یکسوئی رہتی ہے، وہ اپنے ماحول سے دلچسپی پیدا کرکے اس ناخوشگوار پہلو کو دور کرسکتے ہین، اسکے لئے دوستون سے ملنا، مصیبت میں ہمسایوں سے ہمدردی کرنا، مجلس مباحثہ و مناظرہ میں حصہ لینا مفید ہے، اس قسم کی باتون سے اپنی ذات کے ضرورت سے زیادہ احساس کو کم کرنے کا موقع ملتا ہے جس سے اندرونی کیفیات کے مطالعہ کی شدت میں کمی ہوتی ہے،

دوسری قسم کے مزاج کے وہ لوگ ہیں جن کو اپنے دوستوں سے اپنی زندگی کے واقعات اور تجربات بیان کرنے میں لطف آتا ہے، ان کو لوگوں کے سامنے اپنی رائے ظاہر کرنے مین جھجک نہیں ہوتی، نئے نئے لوگوں سے ملنے جلنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں، اجنبیوں سے بھرے ہوئے کمرہ میں داخل ہونے میں حجاب نہیں کرتے، اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی میں متشدد ہوتے ہیں، کسی بات کا نفی میں جواب دینے مین نہیں گھبراتے، مواقع سے ہر قسم کا فائدہ اوٹھاتے ہین مباحثون میں جلد مشتعل اور برافروختہ ہوجاتے ہیں، ان کے دوستوں کا حلقہ جتنا زیادہ وسیع ہوتا ہے، اتنا ہی زیادہ ان کو زندگی کا لطف ملتا ہے،

ایسے لوگ فطرۃً ہمیشہ خوش رہتے ہین، ان کو کوئی غم اور فکر نہیں ہوتا، عام طور سے وہ کھلاڑی، اداکار، تماشون کے منتظم، اور میزبان بہترین ہوتے ہین، لیکن ان کے لئے بھی چند نفسیاتی ہدایتیں ہیں جنکے ذریعہ وہ اپنے مزاج کی اصلاح کرسکتے ہیں، عام طور سے ان کو اپنے مشاغل کے سطحی دلچسپی ہوتی ہے، اسلئے وہ اپنی تمام قوتون کو معاشرتی زندہ دلی میں برباد کردیتے ہین، جو صحیح نہیں ہے، انھین اپنی جسمانی اور ذہنی قوتوں کو مجتمع کرنا چاہئے، تاکہ ان میں آزادی اور ذمہ داری

کا احساس ہو اور جب وہ کسی کام کو شروع کریں، تو اس کو آخر تک پہونچائیں، اور جس کام میں کامیابی کی امید نہ ہو، اس کو ہاتھ نہ لگائیں، ان کے لئے کھانے پینے، بولنے چالنے، اور معاشرت کی دوسری دلچسپیوں میں حصہ لیتے وقت ضبط اور احتیاط بھی ضروری ہے، تاکہ انکی گفتگو سے کسی شخص کی ذات پر حرف گیری نہ ہو، اور ان کے کام سے ناخوشگوار صورتیں نہ پیدا ہو جائیں،

تیسری قسم کے لوگوں کا مزاج بہت متوازن ہوتا ہے، یہ لوگ طبعاً نہ جنگجو ہوتے ہیں، اور نہ عزلت پسند، وہ زندگی کے تمام مسائل کی پیچیدگیوں کو آسانی سے سلجھا لیتے ہیں، ہر قسم کے لوگوں سے تعلقات قائم کر سکتے ہیں، ان کے کام میں دقت اور رکاوٹ کم پیدا ہوتی ہے، ایسے لوگ، استاذ، باپ، کپتان، اور تیماردار کے فرائض نہایت کامیابی کے ساتھ انجام دیتے ہیں، مگر بعض اوقات ان کے مزاج کا رجحان مذکورۂ بالا دو قسموں میں سے کسی ایک کی طرف ہو جاتا ہے، اس میلان کو روکنے کی آسان صورت یہ ہے کہ جب وہ اس قسم کا خطرہ محسوس کریں، تو ان کو فوراً کسی دلچسپ مشغلہ میں مصروف ہو جانا چاہئے،

"ص ع"

اخبار علمیہ

سقراط کے متعلق ایک نئی رائے

اب تک اہلِ علم کو یہی معلوم تھا، کہ سقراط ایک بڑا فلسفی اور معلم تھا، جسکو ایتھنز کے نوجوانون کو گمراہ کرنے کے الزام میں موت کی سزا دیگئی، افلاطون نے جو اسکی قلمی تصویر لی ہے اسکی بنا پر گذشتہ ۲۳۰۰ برس سے یہی سمجھا جاتا تھا کہ وہ ایک مرتاض فلسفی تھا، جس نے ریاضت میں زندگی بسر کی، بازارون میں ایتھنز کے باشندون کے مدنی، تعلیمی، اور معاشرتی مسائل کی تحقیقات کی، یونانی سوفسطائیون کو ان کی غلطیون سے آگاہ کیا، اور عملی سیاست سے پرہیز کرتا رہا، مگر آخر میں ناواقف اور جاہل عوام نے اسکو محض اسلئے "جامِ شہادت" پلایا کہ وہ اپنے شاگردون کو انصاف اور اقتدار کی تعلیم دیتا تھا،

لیکن امریکہ کے ایک پروفیسر ابن ڈیویس ون اسپیر نامی نے حال ہی میں ایک کتاب "سقراط کون تھا" (Who was Socrates ?) شائع کی ہے جس میں سقراط کے متعلق عجیب وغریب اور نئے معلومات پیش کئے ہین، پروفیسر موصوف نے ارسٹوفینس (Aristophanes) کے ڈرامہ "بادل" (The Clouds) میں سقراط کی تصویر بالکل مختلف دیکھی، اس نے سقراط کو سوفسطائی اور ایک ان پڑھ جماعت کے ناموزون رہنما کی حیثیت سے پیش کیا ہے، جس کے اثرات اپنی جماعت پر ناخوشگوار تھے، پروفیسر مذکور کی مندرجہ بالا کتاب افلاطون اور ارسٹوفینس کے متضاد بیانات کا مندرجۂ ذیل تجزیہ کیا ہے،

ارسٹوفینس نے اپنا ڈرامہ ۴۲۳ء ق م میں لکھا ہے، جب سقراط، ۴۶ سال کا اور افلاطون محض چھ برس کا بچہ تھا، افلاطون سقراط سے ۴۰۷ء ق.م میں وابستہ ہوا، وہ عوام کی جماعت سے نفرت کرتا تھا، اسلئے جب اس نے سقراط کی زندگی کے حالات لکھے، تو اس کے ان پچھلے ستر برس کے واقعات کو جب کہ وہ عوام کا رہنما تھا، نظرانداز کر دیا، پروفیسر البن کا خیال ہے، کہ سقراط جوانی میں انقلابی اور باغیانہ خیالات رکھتا تھا، لیکن اپنی آخر زندگی میں قدامت پسند اور یونانی جمہوریت کا مخالف ہو گیا، نسلاً وہ ایک سنگ تراش کا لڑکا تھا، بچپن میں اسکی تعلیم سوفسطائیون کی صحبت میں ہوئی، اسلئے شروع میں ایک مفلس اور قلاش جمہوری تھا، لیکن جب اسکی شہرت بڑھی، تو وہ طبقۂ امراء کا جلیس بن گیا، اور ان سے نذر قبول کرنے لگا، ریاضت کم کر دی، اور ادنی ادنی عورتون سے شادی کر لی، جب وہ پچاس برس کا ہوا، عوام اس سے منحرف ہو گئے، اور وہی نوجوان اس کی اقتدا میں تھے، جو ایتھنز کی جمہوریت کے خلاف شورش کر رہے تھے،

سقراط کا ایک شاگرد کری ٹی اس استاد سے باغی ہو کر جمہوریت پسند طبقہ کا آمر بن گیا، ایتھنز کے امراء نے جب اپنی حکومت قائم کی، تو اوس نے تیس آدمیوں کی آمریت کی خونیں ہنگامہ بپا کیا، جس میں ڈیڑھ ہزار باشندے مارے گئے، اور بالآخر پھر جمہوریت قائم ہو گئی، اس جمہوری حکومت میں امراء اور ان کے تمام حامیوں کا قلع قمع کیا گیا، اسی سلسلہ میں سقراط کو بھی موت کی سزا دی گئی، "ص ع"

برکلے اور اُس کا فلسفہ

ادبیات

جام صہبائی

از جناب آثر صہبائی،

اے ہوش ربا نگاہ والے! آنکھیں ہیں کہ مد بھرے پیالے!
ہے رشک چمن شباب تیرا، یہ حسن ہے لاجواب تیرا،
آنکھوں میں ہو سیل نور جس سے رگ رگ میں ہو برق طور جس سے
روشن مری روح کو جو کر دے، جو مجھ میں تجلیات بھر دے
ایسا کوئی جلوہ کیا نہیں ہے؟!

اے مطرب خوش ادا خوش آہنگ! دنیا سے سرود ہے تیرا چنگ
ہر تان میں ہے پیام عشرت ہر نغمہ ہے ایک جام عشرت
جو برق گرائے میرے دل پر برسائے جو آگ میری گل پر
آلایش روح کو جلا دے خاشاک خرد کو پھونک ڈالے
ایسا کوئی نغمہ کیا نہیں ہے؟!

اے ساقی جام شادمانی، اک میکدہ ہے تیری جوانی،
ساغر میں ہے، شعلہ بار مستی، آنکھوں میں ہے صد ہزار مستی،

بخشے جو سرور و شور دل کو، کردے جو ریاض طور دل کو
جس میں مری روح غرق ہو جائے سرمستی جاوداں میں کھو جائے
ایسا کوئی جرعہ کیا نہیں ہے،!

کلام گویا

از جناب گویا جہان آبادی،

یہ دل ہے کسی اور کا ممنونِ نگارش آئینہ میں، آئینہ کی تحریر نہیں ہے،
دل جس کے تصور میں رہا کرتی ہیں اکثر وہ خلق کی خود ساختہ تصویر نہیں ہے،
انسان ہے آئینۂ اسرارِ حقیقت قرآن کی بالرائے یہ تفسیر نہیں ہے،
کوشش کے موافق ہی ہر انسان بڑھیگا اندازۂ قدرت ہے یہ تقدیر نہیں ہے،
دنیا تو سمجھ لے تجھے مسجودِ ملائک خود تیری نظر میں، تری توقیر نہیں ہے،
تبدیل بھی دنیا کو کیا کرتے ہیں انسان ہو شوقِ طلب ایک ہی تدبیر نہیں ہے،
کچھ اور ہی شے ہے جو ہلا دیتی ہے افلاک مسلم کی تڑپ نالۂ شبگیر نہیں ہے،
آزاد غلاموں کے یہ دل سے کوئی پوچھے پابند ہیں اور پاؤں میں زنجیر نہیں ہے،

گویا ہیں نگاہوں میں شاعرون کے معارف
محتاجِ تعارف کوئی تدبیر نہیں ہے،

رباعی

از حکیم الشعراء امجد حیدر آبادی،

بر چہرۂ خورشید سیاہی تا چند سلطانِ حقیقت بہ تباہی تا چند
جانم ہمہ تن، زقیدِ تن تنگ آمد این مردہ بدوشِ من الٰہی تا چند

مطبوعات جدیدہ

تفسیر سورۂ والعصر از مولینا حمید الدین فراہیؒ، تقطیع چھوٹی ضخامت ۷۷ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۱۰/ پتہ دائرہ حمیدیہ، مدرستہ الاصلاح، سرائمیر اعظم گڈھ

سورۂ والعصر قصار جوامع الکلم میں ہے، یعنی ان سورتوں میں سے ہے، جو الفاظ کے اختصار کے باوجود معنی کی وسیع دنیا رکھتی ہیں، مولینا حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مخصوص انداز میں ان معانی کو رُخ سے پردہ ہٹایا ہے، انھون نے اسکی دو تاویلیں کی ہیں، ایک تاویل کی رو سے اس میں ان لوگون کی حسرت ونامرادی بیان کیگئی ہو جو غفلت اور سرمستی میں اپنی عمر گنواتے ہین اور انھین نیکی اور سچائی اختیار کرکے دولت جاودان حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے، اس تاویل کو قبل وبعد کی سورتوں کے مضامین اور سورہ والعصر کے الفاظ ومعنی سے دکھایا گیا ہے، اس بحث میں لفظ والعصر کی تحقیق اور اسکی روشنی میں زمانہ کی قسم کھانے کے اسرار ظاہر کئے گئے ہیں، اور غافل انسانون کا خسران دکھایا گیا ہے، پھر لفظ "تواصوا" سے خلافت الٰہی کا ثبوت دیا گیا ہی اور ایمان وعمل صالح اور تواصی بالحق پر جو دولت سرمدی، اور تمام دنیا وی اور اُخروی بھلائیون کا سرچشمہ ہے تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، پھر صبر وحق کی حقیقت ظاہر کرکے ان کا باہمی تعلق دکھایا گیا ہے، دوسری تاویل اس سے زیادہ وسیع اور جامع ہے، اسکے لحاظ سے اس مختصر سورہ میں امت مسلمہ کے لئے دنیاوی، اُخروی اور اجتماعی کامرانیون کا دستور بیان کیا گیا ہے اس بحث میں ایمان کی حقیقت بتا کر اس کے حقیقی اور سیاسی مفہوم کا حکیمانہ فرق دکھایا گیا ہے

پھر عمل صالح کی حقیقت ظاہر کرکے اسکو دنیوی، اخروی اور اجتماعی کامرانیون کی بنیاد ہونے پر روشنی ڈالی گئی ہی، پھر حق و صبر کی لطیف تشریح اور ان کے باہمی تعلق اور عمل اور تواصی بالحق کے ربط کو دکھایا گیا ہے، آخر میں دعوت الی الحق کے فرض اور آزادی قول پر بحث ہے، اور ماقبل و مابعد کی سورتون سے اس تاویل کی تائید و توضیح کی گئی ہے، ان تمام مباحث کا مدار آیات قرآنی کلام عرب اور عقلی دلائل پر ہے، اور اس میں وہ تمام نکتہ آفرینیان ہیں، جو مصنف کا مخصوص حصہ ہین،

مضامین محمد علی، مرتبہ جناب محمد سرور صاحب بی اے استاذ جامعہ، تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۵ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ۱۰، ۲ر، پتہ مکتبہ جامعہ دہلی، لاہور، لکھنؤ،

مولینا محمد علی مرحوم نے ملک و ملت کے صدہا مہمات مسائل پر مضامین لکھے، ان مضامین کی علمی اور سیاسی قدر و قیمت کے متعلق کچھ لکھنا بے کار ہے، مولینا مرحوم کی شخصیت کی طرح جامعیت و ہمہ گیری، جرأت و صداقت، مذہب و قومیت کا صحیح اور معتدل امتزاج، مذہب کا سچا ولولہ، ان مضامین کی بھی خصوصیت ہے، وہ مذہب و اخلاق، قومیت و وطنیت اور سیاست ملکی کا درس اور ہماری گذشتہ سیاست کی تاریخ ہین، اس لئے ضرورت تھی، کہ ان بیش قیمت مضامین کو اتلاف سے محفوظ کر دیا جائے، محمد سرور صاحب استاذ جامعہ شکریہ کے مستحق ہین کہ انھون نے قابلیت اور سلیقہ سے ان بکھرے ہوئے موتیوں کو پرو کر اس قومی فرض کفایہ کو ادا کیا، اس مجموعہ مین مختلف عنوانون کے ماتحت ہمدرد کے دوسرے دور ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۸ء تک کے اڑسٹھ مضامین ہیں، یہ گویا اس دور کے ملکی اور ملی مسائل کی روداد اور مختلف واقعات و حوادث کی تاریخ ہے، اس میں علمی، مذہبی، تعلیمی، سیاسی اور وطنی مضامین، ذاتی حالات، دوسرون کے متعلق اظہار خیال وغیرہ مختلف موضوعون پر مولینا مرحوم کے خیالات ہیں، گو زمانہ کے لحاظ سے اب یہ داستان ماضی ہے، لیکن فائدہ کے لحاظ سے ان کی وہی تازگی ہے، افسوس ہے کہ پہلے دور

ہمدرد کے مضامین اس مجموعہ میں نہیں ہیں، امید ہے، کہ لائق مرتب انھیں بھی تلاش کرکے اس سلسلہ کو مکمل کر دیں گے، یہ مجموعہ ہندوستانیوں کے لئے عموماً اور مولانا مرحوم کے شیدائیوں کیلئے خصوصاً قابلِ قدر تحفہ ہے،

سیرۃ بتول:۔ مؤلفہ مولوی اعجاز الحق صاحب قدوسی تقطیع چھوٹی، ضخامت ۸۰ صفے کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۸؍، پتہ: سلیم اختر قدوسی، نامپلی جدید نمبر ۱۱، لال ٹیکری حیدرآباد دکن،

دار المصنفین کے سلسلہ سیر الصحابہ نے صحابہ اور صحابیات کی سیرت نگاری کی ایک عام شاہراہ کھول دی ہے، چنانچہ مولوی اعجاز الحق صاحب قدوسی اس سے پہلے اس موضوع پر بعض مفید کتابیں لکھ چکے ہیں، سیرت بتول اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اس میں معتبر کتابوں سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے مختصر حالات، سادہ اور آسان زبان میں لکھے گئے ہیں، مسلمان خواتین کیلئے حضرت فاطمہؓ کی زندگی نمونہ ہے، یہ کتاب بچیوں کو خاص طور سے پڑھانے کے لائق ہے،

من کی دنیا مصنفہ جناب رشید قریشی صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۰ صفے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ۱۲؍ پتہ:۔ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن،

یہ کتاب نوجوان مصنف کے بائیس مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے، ابھی ان کی ادبی مشق کا آغاز ہے، اسلئے تقریباً کل افسانے واردات شباب کی تعبیریں ہیں، اور ان میں نومشقی نمایاں ہے، تخیل اور انشا دونوں کی خامیاں نظر آتی ہیں، لیکن ہونہار مصنف میں فسانہ نگاری کی صلاحیت موجود ہے اگر مشق جاری رہی تو یہ ابتدائی خامیاں دور ہو جائیں گی،

نصاب تعلیم بالغان، مرتبہ صاحبزادہ سید الظفر خان صاحب قیمت ۹؍، پتہ مکتبہ جامعہ دہلی، لاہور، لکھنؤ،

آج کل کے تعلیمی مسائل میں تعلیم بالغان کا بھی ایک اہم مسئلہ ہے، متعدد ماہرین تعلیم نے اس کے عملی تجربات کرکے اس کے نتائج کے مطابق اس کا نصاب مرتب کیا، ان میں سے ایک یہ نصاب بھی ہے، اس میں پانچ کتابیں ہیں، اردو سکھانے کا آسان طریقہ، مدرّس کا قاعدہ نما، اردو کا قاعدہ نمبرا نمبر۲ نمبر۳ پہلی کتاب میں مولف نے اپنے عملی تجربات، طریقۂ تعلیم، اور اس کے نتائج لکھے ہیں، دوسرے میں اس طریقہ کے مطابق مدرسین کے لئے ہدایات ہیں اور اسکے اصول اور اس کی ترتیب بتائی ہے، باقی تینوں کتابیں، ان اصولوں کے مطابق ریڈرین ہیں، تشریح کے لئے جابجا تصویریں بھی دیدی ہیں، ہم نے اس نصاب کو پڑھا، ہمارے خیال میں وہ بالغون کی تعلیم کیلئے آسان اور مفید ہے،

اردو کے سو شعر، (چار حصے) منتخبہ جناب محمود علی خان صاحب جامعی، تقطیع جیبی، کتابت و طباعت بہتر قیمت ؟ پتہ مکتبہ جامعہ، دہلی،

محمود علی خانصاحب جامعی کے سو شعروں کے انتخاب کی جدت اتنی مقبول ہوئی کہ اس قسم کے بہت سے انتخابات شائع ہوئے، اب انھوں نے کسی خاص شاعر کے بجائے ہر دور کے ممتاز اساتذہ کے انتخابات شائع کئے ہیں، اور ولی دکنی سے لے کر موجودہ عہد تک چار دور قائم کئے ہیں، متقدمین متوسطین، متاخرین اور دور حاضر، اوران سب کے انتخابات علحدہ علحدہ ہیں، ہر حصہ کے شروع میں ایک مختصر نوٹ، اور آخر میں دو چار لفظوں میں اس حصہ کے شعراء کا تعارف ہے، انتخاب ایک ذوقی چیز ہے، ہر شخص کی پسند جداگانہ ہوتی ہے، تاہم اس انتخاب میں عموماً حسنِ مذاق سے کام لیا گیا ہے،

(م)

جلد ۴۴ نمبر ۲ — اگست ۱۹۳۹ء

معارف

دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت پانچ روپیہ سالانہ

مطبع معارف اعظم گڑھ

سیرۃ النبیؐ

رسول اللہ صلعم کے حالات وغزوات، اخلاق وعادات اور تعلیم وارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جس کا نام سیرۃ النبیؐ عام طور سے مشہور ہے، مسلمانون کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت واہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے،

ابتک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہین، پہلے مین ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہین، اور ابتدا مین ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہی جسمین فن سیرت کی تنقید وتاریخ ہی، دوسرے حصہ مین تکمیل دین، تاسیس حکومتِ الٰہی، وفات، اخلاق وعادات، اعمال وعبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہی، تیسرے حصہ مین آپکے معجزات وخصائص نبوت پر بحث ہے اسمین سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثین کیگئی ہین، پھر ان معجزات کی تفصیل ہی جو بروایات صحیحہ ثابت ہین، اسکے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید وتفصیل کیگئی ہے، چوتھے حصہ مین ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپکے ذریعہ مسلمانون کو تعلیم کئے گئے ہین، کوشش کی گئی ہی کہ اس مین قرآنِ پاک اور احادیثِ صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائین، پانچوین حصہ مین عبادت کی حقیقت، عبادت کی تفصیل وتشریح اور ان کے مصالح وحکم کا بیان ہی، اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ وموازنہ ہی، چھٹے حصہ مین حقوق، فضائل، اور آداب کے عنوانوں اور انکی ذیلی سرخیوں کے تحت اخلاقی تعلیمات کی تفصیل ہی، حجم ۹۱۲ صفحے قیمت قسم اول ۔ قسم دوم ۔

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول تقطیع خورد ۔ حصہ دوم تقطیع کلاں ۔ تقطیع خورد ۔ حصہ سوم تقطیع کلاں ۔ تقطیع خورد ۔ حصہ چہارم تقطیع کلاں ۔ تقطیع خورد ۔ حصہ پنجم تقطیع کلاں ۔

(منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ)

جلد ۳۸ | ماہ جمادی الثانی ۱۳۵۵ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۳۶ء | عدد ۲

مضامین

دار المصنفین کی ضرورت کا خاکہ جب پہلی دفعہ کاغذ پر کھینچا تھا تو ارد و مین ایک مکمل اور مفصل تاریخ اسلام کی یاد سب سے پہلے آئی تھی، خدا کا شکر ہے کہ پچیس برس کے بعد یہ آرزو پوری ہوئی، اور دار المصنفین کے کئی رفیقون نے مل کر سات آٹھ برس کی محنت مین اس سلسلہ کو لکھکر پورا کیا، امسال اس سلسلہ کی دو جلدین ناظرین کے سامنے آئین گی، ایک تو سب سے پہلی جلد جس مین شروع سے لیکر خلفاے راشدین کے زمانہ تک کی پوری تاریخ ہوگی، یہ جلد اب چھپ کر پوری ہورہی ہے، یہ سلسلہ اپنی تحقیق و تفصیل کے لحاظ سے اس قابل ہوگا کہ کالجون مین اسلامی تاریخ کے نصاب مین کارآمد ہوسکے،

تاریخ اسلام کے سلسلہ کی جو دوسری جلد چھپ کر مکمل ہورہی ہے وہ ٹرکی کی تاریخ ہو، یہ دو جلدون مین ہوگی، اور دولت عثمانیہ کے آغاز سے لے کر جمہوریہ ٹرکی کے اس عہد تک کے حالات پر مشتمل ہوگی، پہلی جلد عثمان خان سے شروع ہوکر سلطان سلیم تک ختم ہوئی ہے، اور یہی اس وقت مطبع مین ہے،

مورخ بلاذری کی انساب الاشراف کا ذکر کئی سال ہوے معارف مین آیا تھا، اب اس کتاب کا دوسرا حصہ جو بنو امیہ کے ارکان و افراد کے حالات کو شامل ہے، بیروت کی عبرانی یونیورسٹی کے ادارۂ مشرقیات کی طرف سے چھپ کر شائع ہوا ہے، یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ

یہ تاریخ بھی جو اسلام کی ابتدائی تاریخ کے واقعات پر مشتمل ہے، وہی ابومخنف، اور محمد بن سائب کلبی وغیرہ کی روایتون پر مبنی ہے، جن کی حیثیت تاریخ مین داستان گو سے زیادہ نہین، ہندوستان مین یہ کتاب حبیب کمپنی بک سیلر اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے نو روپیے (لعہ) مین ملیگی،

مجلس احیاء معارف نعمانیہ حیدرآباد دکن کا ذکر کئی دفعہ آچکا ہے، یہ مجلس چند علم دوست مخلص علماء کی تنہا کوششون سے چل رہی ہے، جن مین مولٰنا ابوالوفا صاحب قندھاری مدرس مدرسۂ نظامیہ حیدرآباد دکن کا نام خاص امتیاز رکھتا ہے، یہ مجلس ہندوستان، مصر، شام، قسطنطنیہ وغیرہ کے کتبخانون سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر حنفی فقہ کی قدیم بنیادی کتابون کو نکالتی، اور ان کو صحیح کرکے، ان پر حاشیے لکھکر بڑے اہتمام سے مصر مین چھپواتی ہے، اس سے پہلے چار اہم کتابین وہ چھپوا چکی ہے، اب اس نے اس سلسلہ کی پانچوین اور چھٹی کتاب شائع کی ہے، اور یہ دونون قاضی ابویوسف رحمہ اللہ کی تصنیف ہین،

پانچوین کتاب الرد علی سیر الاوزاعی ہے، امام اوزاعی نے سیر (یعنی اسلام کی جنگی قوانین) پر جو کتاب لکھی تھی، قاضی ابویوسف رحمہ اللہ نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نقطۂ نظر سے اس پر اعتراضات کئے ہین، اور اپنے اختلافات لکھے ہین، چھٹی کتاب اختلاف ابی حنیفہ وابن ابی لیلی ہے، یہ دونون امام قاضی صاحب کے استاد تھے، شاگرد نے اپنے دونون استادون کے فقہی اختلافات پر یہ کتاب لکھی ہے،

جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا دارالترجمہ جو خدمتین انجام دے رہا ہے، ان سے علم کا کون

طالب وشائق واقف نہین، خصوصیت سے جب سے یہان کی نظامت کی باگ ہمارے فاضل دوست مولوی الیاس صاحب برنی کے ہاتھون مین آئی ہے، اس سال دارالترجمہ کی طرف سے ۲۷ کتابین تاریخ، فلسفہ، سائنس، طب، معاشیات، نفسیات، نباتات، تعمیرات وغیرہ مختلف علمی شاخون پر شائع ہوئی ہین، اور دارالمصنفین کو موصول ہوئی ہین، ہم دارالترجمہ کی اس کامیابی پر اس کو دلی مبارکباد دیتے ہین،

دو برس کی بات ہے کہ ہم نے معارف مین مدینہ منورہ کے مشہور کتبخانہ شیخ الاسلام کے فاضل مدیر شیخ ابراہیم حمدی کی آمد کی اطلاع دی تھی، خدا کا شکر ہے کہ موصوف پچھلے سال ہندوستان سے خوش خوش واپس گئے، اس کتبخانہ کے لئے موصوف کو ایک قالین کی ضرورت تھی، جس کے بچھانے کا حجاز مین عام رواج ہے، وہان کا پرانا رومی قالین سو برس کے استعمال مین بیکار ہو گیا تھا، خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان نے مرکز اسلام کی اس ضرورت کو بھی پورا کیا، ہمارے ملک مین مرزاپور اور بنارس کے اطراف مین دیسی قالین بننے کے اچھے اچھے کارخانے ہین، جن مین سے ایک بھدوئی (ریاست بنارس) مین ہے جس کے مالک ماسٹر نذیر محمد صاحب بی اے ہین، موصوف کو جب کتبخانہ کی اس ضرورت کا علم ہوا تو انھون نے نہایت خندہ پیشانی سے اپنی طرف سے بلدۂ رسول اکرم صلعم مین یہ نذر گذرانا قبول کیا، اور بحمد اللہ کہ دو برس کی محنت شاقہ مین بڑے اہتمام سے نہایت خوشنما اور پائدار قالین جس کی لاگت پندرہ سو روپیہ کے قریب ہوگی تیار کر دیا ہے، اور اب وہ عنقریب مدینہ منورہ روانہ ہوگا، جزاہ اللہ خیر الجزاء،

مقالات

نامۂ خسروی

اعلیٰ حضرت سلطان العلوم آصف سابع ادام اللہ ملکہ

۱۰ ربیع الثانی ۱۳۵۸ھ،

مولوی سید سلیمان صاحب ندوی

چونکہ بدو شعور سے میری طبیعت کا رنگ ایسا رہا ہو کہ جب تک مذہبی مسائل ہوں یا دینی امور ہوں، بعد تحقیق و تفتیش کوئی خاطر خواہ معقول وجہ یا اسباب اسکے پائے نہ جائیں، اسکے قبول کرنے میں قلب کو پس و پیش رہتا ہو، چنانچہ مثال کے طور پر کہتا ہوں کہ ائمۂ اربعہ فقہار کے فتوے جو کچھ ہیں گو یہ سب اصول میں مذہب اسلام کے متفق ہیں آپس میں، تاہم فروعات میں ہر ایک کا اجتہاد جدا نوعیت کا واقع ہوا ہے، یعنی اس میں بھی ۴ فریق ہیں، یعنی احناف[۱]، شوافع[۲]، مالکی[۳]، حنبلی[۴] اور صرف نماز کی ادائی کو ہی لیا جائے، تو معلوم ہوگا، کہ نمبر اول کے ہاں نیت صلوٰۃ کے بعد ہاتھ ناف کے نیچے باندھنا، نمبر دوم کے ہاں سینہ پر باندھنا، اور رکوع میں رفع یدین کرنا، نمبر سوم کے ہاں ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھنا، اور نمبر چہارم کے ہاں شاید پیروی کرنا ہے مخلوط نمبر ۲ و نمبر ۳ کی، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہمارے نبیؐ برحق نے بعض دفعہ ہاتھ باندھکر نماز پڑھی ہو اور بعض دفعہ ہاتھ

چھوڑ کر بھی، لہذا دونوں طریقے درست ہیں، وغیرہ، اور بعض احناف کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے (مسجد میں) رکوع میں رفع یدین کرتے ہوئے جب کہ ان کے امام کے ہاں اسکی ضرورت نہیں ہے، وغیرہ وغیرہ،

پس اس خلجان اور مشترکہ حالات میں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس امام کے فتوی کی پیروی کیجائے، اور کس کا اجتہاد قوی ہے، (ان مسائل میں) اور کس کا قوی نہیں ہے، حالانکہ شریعت اسلام میں ان چار ہی ائمہ کے فتوے چالو ہیں، اور ہر ایک کو دوسرے پر برتری نہیں دیجاتی ہے بلکہ اپنی اپنی جگہ سب کو درست سمجھا جاتا ہے، اور جب یہ کلیہ تسلیم کر لیا جائے گا، تو ہر امام کی پیروی کرنے والا گروہ بر جادۂ حق سمجھا جائے گا،

الحاصل میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس بارہ میں مولوی صاحب کا کیا خیال ہے، اور اگر آیندہ کوئی موقع ہمدست ہوا تو اس وقت تفصیل سے ان امور پر بالمشافہ گفتگو بھی کرونگا مگر سردست اسی پر اکتفا کرنا کافی سمجھتا ہوں،

آخر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میرے نزدیک انسان جس طرح سے چاہے خدا کی عبادت کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس کا طریقہ ایسا ہو جس کو کہ اسکے مذہب نے بتایا ہو، (یعنی اوسکے خلاف کوئی دوسرا طریقہ نہ ہو) دراں حالیکہ اس سے بحث نہیں کہ ان ارکان میں اگر خفیف ترمیم پائی جائے، یا نوعیت شان بدلی ہوئی ہو تو کچھ مضائقہ نہیں ہے،

زیادہ امید ہے کہ مزاج رو بصحت ہوگا،

آصف سابع

اور

اختلاف طریقہ نماز

آج جب کہ امرا اپنے عیش خانوں میں یادِ خدا سے غافل ہیں، اور ابناے عصر زمانہ کے مہلک اثرات سے متاثر ہوکر نماز جیسی چیز سے جس پر اسلام کی ساری عمارت کی بنیاد ہے، بے پروا ہیں کیا یہ حیرت انگیز بات نہ ہوگی، کہ ایک سلطانِ وقت عیش خانہ کی آب و ہوا سے ناآشنا، اور زمانہ کے اثرات سے بے پروا ہوکر یادِ خدا کو اپنی زندگی کا فریضہ اور نماز کو اپنی زندگی کا دستور بنائے ہے اور اسکی حیثیت صرف تقلیدی نہیں، بلکہ علم و نظر اور تحقیق و کاوش سے اسکے اصول و فروع کی تفتیش کا ذوق رکھتا ہے،

اعلیٰ حضرت ادام اللہ ملکہ نے جس بحث کو چھیڑا ہے، وہ حقیقت میں تحقیق کے قابل ہے اور اور جس نوع سے اختلافات کی تطبیق کا اشارہ فرمایا ہے، وہ بالکل صحیح ہے یعنی "وہ ایسا طریقہ ہو جس کو اسکے مذہب نے بتایا ہو" اسلئے ہر وہ شے جو شارع کے حکم اور رسول کی سنت سے ثابت نہ ہو وہ صحیح نہیں، اور وہ تمام طریقے جو رسول کی سنت سے ثابت ہوں اور وہ سب صحیح ہوں، ان میں سے ہر طریقہ امت کیلئے قابلِ اختیار ہے، اور اگر ان میں سے کوئی طریقہ مقابلۃً زیادہ صحیح طریقہ سے ثابت ہو، تو وہ مستحب تر، اور دوسرے طریقے بحدِ جواز رہیں گے،

اصل نماز قیام وقعود و رکوع وسجود، اور قرأت کا نام ہے، اس میں تمام فقہا اور مجتہدین متفق ہیں، اختلاف فروعی باتوں میں ہے، ان فروعی باتون میں سے ہر بات کسی نہ کسی روایت میں آئی ہے، اسلئے جو جس روایت کو زیادہ صحیح سمجھتا ہی، وہ اس پر عمل کرتا ہے،

لیکن ان فروعیات میں ایک بات ایسی ہے، جو کسی روایت اور رسول علیہ السلام کے کسی عمل سے ثابت نہیں ہے، اور وہ بات قیام مین ہاتھون کو چھوڑ کر (ارسال) نماز پڑھنا ہے، اسمین شبہ نہیں کہ مالکیہ کا عمل اسی پر ہے، مگر کوئی معمولی سی معمولی روایت ان کے پاس انکے اس عمل کی تائید میں نہیں ہی، بلکہ ان کے مجتہد وامام حضرت امام مالک کی کتاب موطا میں بھی ہاتھ باندھ کر (وضع) ہی نماز پڑھنے کی روایت ہی، (صفحہ ۵۵) نیز ان کی سب سے مستند فقہ کی کتاب مدونہ میں بھی ہاتھ باندھنے کا ذکر ہے، (ص ۷۴، ج ۱) کہتے ہیں کہ عباسیہ کے زمانہ میں امام ممدوح کو ایک فتوی کی بنا پر جو حکامِ سلطنت کی مرضی کے مطابق نہ تھا، کوڑے مارے گئے تھے، جس سے ان کا شانہ اتر گیا تھا، اور وہ دونوں ہاتھ ایک دوسرے پر نہیں رکھ سکتے تھے، انکے پیرو ون نے یہ دیکھا تو سمجھے کہ ان کے نزدیک نماز میں ہاتھ باندھنا نہیں، بلکہ چھوڑنا ہی،

یہ تاویل کہیں نواب صدیق حسن خان کی کتابون میں نظر سے گذری تھی، مگر مدونہ کے دیکھنے سے جو امام مالک کے خاص شاگرد کی تصنیف ہے، معلوم ہوتا ہی کہ ان کے ایک شاگرد کہتے ہیں کہ امام مالک وتنی ہاتھ باندھنے کو ضروری نہیں سمجھتے تھے،

وقال مالك فی وضع الیمنیٰ	مالک نے داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ
علی الیسریٰ فی الصلاۃ قال	پر نماز میں رکھنے کی نسبت کہا کہ میں
لا اعرف ذٰلك فی الفریضۃ	اسکو فرض نماز میں نہیں جانتا، اور وہ
وکان یکرھہ ولکن فی النوافل	اس کو ناپسند کرتے تھے لیکن نفل

اذا طال القیام فلا باس بذلک نمازون میں جب قیام لمبا ہو تو کچھ ہرج

یعین بہ نفسہ (ص۷۴ جلد امصر) نہیں کہ اس سے سہارا لے،

مگر امام کے دوسرے شاگردون نے جمہور کے مطابق امام سے ہاتھ باندھنے ہی کی روایت کی ہے، اور امام نے خود ہی اپنی تصنیف موطا مین یہ دو روایتیں نقل کی ہیں، ایک یہ کہ تین باتیں شریعتوں کے متفقہ امور میں سے ہیں، جن میں سے ایک نماز میں ہاتھ باندھنا ہو اسکے بعد امام مالک اوسکی تشریح فرماتے ہیں کہ داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھے، دوسری روایت امام نے یہ نقل کی ہے "لوگوں کو حکم دیا جاتا تھا، (یعنی رسول اللہ صلعم حکم دیتے تھے) کہ نماز میں داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھیں" راوی کہتا ہو کہ اس واقعہ کی نسبت رسول اللہ صلعم کی طرف ہو،

(موطا امام مالک باب وضع الیدین احداھما علی الاخریٰ)

پہلی حدیث کی شرح مین مالکی محدث زرقانی نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے:-

"اشہب نے مالک سے نقل کیا کہ نفل اور فرض نمازون میں ہاتھ باندھنے میں مضائقہ نہیں، مالک کے مدنی شاگردوں نے یہی کہا ہو اور مطرف اور ابن ماجشون نے کہا کہ مالک نے اسکو اچھا سمجھا ہے، حافظ ابن عبد البر (مالکی) کہتے ہیں، کہ آنحضرت صلعم سے ہاتھ باندھنے کے سوا کوئی اور دوسری روایت نہیں آئی ہے، اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، اور یہی جمہور صحابہ اور تابعین کا مسلک ہے، اور اسی کو مالک نے موطا مین ذکر کیا ہے، اور مالک کے شاگردون میں سے ابن منذر وغیرہ نے اسکے سوا دوسری بات مالک سے نقل نہیں کی ہے، البتہ مالک کے شاگرد ابن قاسم نے مالک سے ہاتھ چھوڑنا نقل کیا ہے، اور اس کو اکثر مالکیون نے قبول کیا ہے، (ص۲۶۳ مصر)

باجی مالکی نے بھی شرح موطا مین ایسا ہی لکھا ہے، (ص۲۸۱ مصر)

بہرحال ہاتھ چھوڑنے کی نسبت امام کی رائے اگر ہو بھی تو اس رائے کو خود ان کے بڑے بڑے شاگردوں نے صحیح روایات کی بنا پر رد کر دیا، چنانچہ مدونہ میں اسکے بعد ہی ہے،

قال سحنون عن ابن وھب	سحنون نے کہا ابن وہب سے روایت
عن سفیان الثوری عن غیر	ہے، اور وہ سفیان ثوری سے روایت
واحدٍ من اصحاب رسول اللہ	کرتے ہیں، کہ انھوں نے بہت سے اصحاب
صلعم انھم رأوا رسول اللہ صلعم	رسول صلعم سے سنا ہے، کہ انھوں نے
واضعا یدہ الیمنیٰ علی الیسریٰ فی الصلوٰۃ	رسول اللہ صلعم کو نماز میں دیکھا کہ وہ داہنے
(ص ۷۶، جلد ا مصر)	ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھے تھے،

غرض کسی مجتہد کی ایسی رائے جو رسول اکرم صلعم سے ثابت یا آپ کے کسی قول وعمل سے مستنبط نہیں، قابل حجت نہیں، باقی تمام اختلافات فروعی ہیں، جو صحت نماز میں قادح نہیں نامۂ خسروی کے آخر میں جو یہ ارشاد ہے :-

"دران حالیکہ اس سے بحث نہیں کہ ان ارکان میں اگر خفیف ترمیم پائی جائے یا نوعیت شان بدلی ہوئی ہو تو کچھ مضائقہ نہیں ہے"۔

اس فقرہ کا ظاہری مطلب خود اعلیٰ حضرت کے سابق کے اس ارشاد گرامی کے خلاف ہے :-

بشرطیکہ اس کا طریقہ ایسا ہو، جس کو کہ اسکے مذہب نے بتایا ہو، (یعنی اوسکے خلاف کوئی دوسرا طریقہ نہ ہو)

مقصد یہ ہے کہ عبادات تمامتر وحی کی تعلیم سے ہیں، اس تعلیم میں کسی انسانی رائے سے خفیف سی خفیف ترمیم یا نوعیت شان کی تبدیلی جائز نہیں، یہ خالق فطرت ہی کو معلوم ہے

اور اوسی نے انبیا کو وحی سے بتایا، اور انھون نے ہم کو سکھایا، کہ ہم کس طرح اوس کی عبادت کرین،

مگر اعلیٰ حضرت کے اس آخری ارشاد سے کہ

"آخر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا، کہ میرے نزدیک انسان جس طرح سے چاہے خدا کی عبادت کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس کا طریقہ ایسا ہو جسکو اوسکے مذہب نے بتایا ہو"

یہ ظاہر ہے کہ اعلیٰ حضرت کا یہ منشا نہیں کہ ہر انسان کو اختیار ہے کہ جس طرح چاہے، وہ اپنے خدا کی عبادت کرے، کیونکہ اعلیٰ حضرت نے شرط لگا دی ہے، بشرطیکہ وہ طریقے اسکے مذہب نے بتائے ہون، اسلئے اعلیٰ حضرت کے اس عموم کا مقصد یہ ہے کہ مذہب اور صاحب مذہب سے جو جو طریقے مروی ہیں، ان میں سے کسی ایک طریق کو جو چاہے اختیار کرے، اس پر تقیید نہیں ہے، کہ کسی ایک طریق ہی کو جائز اور دوسرے کو تمامتر ناجائز سمجھا جائے،

اعلیٰ حضرت کے اسی منشار کی تائید اعلیٰ حضرت کے کلام سابق سے ہوتی ہے،

"بلکہ اپنی اپنی جگہ پر سب کو درست سمجھا جاتا ہے، اور جب یہ کلیہ تسلیم کر لیا جائیگا تو ہر امام کی پیروی کرنے والا گروہ برجادۂ حق سمجھا جائے گا"

اب رہی یہ بات کہ

"کس امام کے فتویٰ کی پیروی کی جائے، اور کس کا اجتہاد قوی ہے، (ان مسائل میں) اور کس کا قوی نہیں"۔

تو اس کا حل یہ ہے کہ جو فتویٰ کلامِ الٰہی اور ارشادِ رسالت پناہی کے عین مطابق ہو وہی قوی اور صحیح ہے، اور اگر احتمال تعدد کا ہے، یا محض رائے واستنباط کا دخل ہے، تو جو احتمال اور رائے واستنباط کلام الٰہی اور ارشاد رسول کریم علیہ السلام سے قریب تر ہو، وہی

قوی ہوگا، اور اگر ان میں دلائل کا تعارض ہے، اور ہر ایک کی دلیل اپنی جگہ پر صحیح معلوم ہوتی ہے، تو جس کو جو بات صحیح معلوم ہو، اوسی پر وہ عمل پیرا ہو، مگر اسکو چاہئے، کہ وہ دوسرے کو برسر غلط نہ کہے، کیونکہ یہ ایسے اختلافات ہیں، جن سے دین کیا دنیا کے معاملات بھی خالی نہیں ہجوں کے بہترین دماغ، وکلار کی بہترین قابلیتیں، اور قانون کے دفعات کی ہر لحاظ سے محتاط عبارتیں بھی انسانی فطرت کے اس اختلاف کو اب تک نہ مٹا سکی ہیں، نہ مٹا سکیں گی،

ہمارے علم کی حقیقت

از

جناب مولانا عبد الباری صاحب ندوی استاذ فلسفہ و دینیات جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن

"جہول" انسان علم کا اتنا دیوانہ اور جاننے میں اتنا غرقاب ہے، کہ خود جاننا یا علم ہے کیا، ؟ اس کو بہت کم سوچا ہے، اور اکثر نہ جاننے کو جاننا یقین کرتا، اور علم کے نام سے جہل در جہل (جہل مرکب) میں گرفتار رہتا ہے، بہت دور تک اور بہت گہرائی تک جاننے کا دعویٰ فلسفہ کو ہے، لیکن اس میں بھی یہ سوال کہ خود جاننا ہے کیا، ؟ پوری طرح بہت دیر میں اپنی طرف ملتفت کر سکا، قدیم یونانی فلسفہ میں سوفسطائیہ و ارتیابیہ نے کچھ کھل کر بحث کو چھیڑا تھا، مگر ایک نے اس سے نظامِ اخلاق کو برہم کرنا چاہا، اور دوسرے نے شک و لاعلمی میں ایسا غلو کیا، کہ دونوں سنجیدہ توجہ و قبول سے محروم رہے،

اس طرح گو یہ بحث بھی آسمان کے نیچے نئی نہیں، تاہم جدید فلسفہ میں اگر کسی شے کو جدید کہا جا سکتا ہے، تو وہ حقیقتِ علم ہی کے متعلق سوالات کی تحقیق و تفصیل ہے، ۱۶۷۱ء کی کوئی تاریخ ہے، کہ جان لاک نامی انگلستان کا ایک جواں سال دیوانۂ علم چند دوستوں کے ساتھ اصولِ اخلاق اور الہامی مذہب جیسے مسائل پر سرگرم مباحثہ ہے بحث کو تو وقت ختم ہی کر دیتا ہے لیکن مسائل

جہاں تھے وہیں رہے، اور جب خود بقول لاک کے کوئی نتیجہ اور حل نہ نکلا، تو ہم کو خیال آیا کہ ہماری راہ غلط ہے، اور اس طرح کے مسائل کی تحقیق سے پہلے ضروری ہے، کہ ہم خود اپنی قابلیتوں کی تحقیق کریں، اور دیکھیں کہ کن مباحث کے لئے ہماری قابلیاتِ فہم موزوں ہیں، اور کن کے لئے نہیں جاننے سے قبل یہ جاننا ضروری ہے، کہ ہم کیا جان سکتے ہیں، اور کیا نہیں، ؟

غرض لاک نے کہنا چاہئے، کہ پہلے پہل "وجود" کے بجائے "علم" کو فلسفہ کا مستقبل موضوع بنایا، جس نے آگے چل کر علمیات (ایپسٹما لوجی) یا نظریۂ علم کا نام پایا، اور "انسانی فہم" پر خود اسی نام[1] سے سینکڑوں صفحے کی ضخیم کتاب لکھی، پھر جو اس بحث کا سلسلہ چلا، تو اب تک سیکڑوں کتابیں اور ہزاروں صفحات لکھے جا چکے ہیں، اور لکھے جا رہے ہیں، اس سے قبل نظریۂ علم سے متعلق جو کچھ خیالات ملتے تھے وہ یا تو منطق و نفسیات وغیرہ کے ضمن میں،

اب تک فلسفہ نے انسانی عقل و فہم کی حدبندیوں پر اصرار نہیں کیا تھا، اس کی رسائی سے زمین و آسمان کی کوئی شے محسوسات و مجردات کا کوئی گوشہ باہر نہیں خیال کیا جاتا تھا، آدمی سب کچھ جان سکتا ہے، اور سب کچھ جاننا چاہئے، قافلے پر قافلے اسی راہ سے چلے جا رہے تھے، اور منزل کا نشان ناپید تھا، الفاظ کے گورکھ دھندوں کا نام اسرارِ علم رکھ لیا گیا تھا، اکثر موٹے موٹے بے معنی اور بے محل لفظوں کا لقب اعلیٰ و عمیق تعلیم تھی، جن کا مطلب نہ کچھ بولنے والے سمجھتے تھے، نہ سننے والے، اپنے جہل کی پردہ پوشی اور سچے علم کی راہ سے دوری کے سوا کچھ حاصل نہ تھا،

لہذا سب سے پہلے لاک کے نزدیک خود "انسانی علم کی اصلیت، قطعیت اور وسعت کی تحقیق" ضروری ہے، ہم کیسے جانتے ہیں، ؟ کیا جانتے ہیں ؟ اور کہاں تک جانتے ہیں، ؟ ہمارے علم کی اصل اور تصورات کا سرچشمہ کیا ہے، یہ کہاں سے آتے ہیں، (بدایت علم کا سوال) اس علم کی نوعیت کیا

[1] An Essay Concerning Human Understanding

ہوتی ہے، اسکی قطعیت و شہادت کا کیا مرتبہ ہے، ؟ (حقیقت یا ماہیت علم کا سوال) اور اس کی رسائی کے حدود کیا ہیں، ؟ (وسعتِ علم کا سوال) دراصل سارے مباحث کا حاصل و مقصود آخری ہی سوال کا فیصلہ ہے، اسلئے کہ اگر ہم اپنی فہم کی قابلیتوں کو اچھی طرح سمجھ لیتے، اپنے علم کی وسعت کو ایک مرتبہ جان لیتے، اور اس افق کو پالیتے، جو اشیاء کے روشن اور تاریک حصوں یا قابلِ فہم و ناقابلِ فہم کے مابین حد بندیاں کر دیتا، تو پھر غالباً لوگ بہت کم پس و پیش کے ساتھ ثانی الذکر کی نسبت اعترافِ جہل پر راضی رہتے، اور اول الذکر کے متعلق اپنی بحث و فکر کو زیادہ نتیجہ خیز اور تسلی بخش طور سے استعمال کرتے؛

لاک نے سارا زور کہنا چاہیئے، کہ سوال اول ہی کے جواب پر صرف کر دیا ہے، کہ باقی دونوں کا فیصلہ اسی سے از خود ہو جاتا ہے، کتاب کا بہت بڑا حصہ یعنی "فہم انسانی" کے سفر سوم تک یہی بحث پھیلتی چلی گئی ہے، کہ انسان کے علم کا ماخذ و مبدء کیا ہے، اور اس کے مختلف قسم کے تصورات[1] کیسے اور کیونکر پیدا ہوتے ہیں،

شعوری زندگی میں قدم رکھتے ہی انسان کے اندر اور باہر سے گوناگوں تجربات کا ایک سمندر ابل پڑتا ہے، جس کی موجوں کا سلسلہ ساحلِ حیات تک چلا جاتا ہے، رنگ، روشنی، سردی، گرمی، آواز، مزہ، بو، شکل، صورت، حرکت، سکون، قرب و بعد، صلابت و امتداد (پھیلاؤ) زمان و مکان، صغر و کبر، جزو کل، محدود و نامحدود، حق و باطل، خیر و شر، رنج و راحت، لذت و الم، حسن و عشق، شک و یقین، علت و معلول، وجود و عدم، قوت و ارادہ، وحدت و کثرت، عینیت و غیریت، غرض جو اور جس طرح کے بھی ادراکات "یا تصورات" ہوں ان کی نسبت اگر کسی سیدھے سادھے عامی آدمی کے

[1] تصورات سے مراد لاک کے نزدیک تمام ایسے ادراکات یا احوال شعور ہیں، جن پر ذہن اپنی فکر کو استعمال کر سکتا یا جن کو سوچ سکتا ہے،

تو ذہن کو ٹٹولا جائے، تو وہ یہی سمجھا ہوگا، کہ یہ سب کی سب اسکے اندر یا باہر ذہن یا خارج کے ایسے معلومات ہیں، جو اسی دنیا میں آکر اور اسی زندگی کے تجربات سے کسی نہ کسی طرح حاصل یا پیدا ہوتے ہیں کسی اور دنیا سے پیدایش کے ساتھ ہم ان کو لیکر نہیں آتے،

لیکن فلسفی اگلے ہوں یا پچھلے، ان کے اکثر اکابر کا خیال بالکل برعکس رہا ہی، قدیم دور کے سب سے بڑے فلسفی فلاطون نے تو اپنے شہرۂ آفاق عالم مثال کی ایک نئی دنیا ہی آباد کر دی تھی، اور کلیات کا علم اوس کے نزدیک انسان تمامتر اسی نئی دنیا سے اپنی پیدایش کے ساتھ لاتا ہی، اسکندریہ کے فلسفہ تک آتے آتے نئے فلاطون (فلاطینوس) نے کلیات کے ساتھ جزئیات کی آبادی کو بھی عالم مثال کی طرف منتقل کر دیا، فلسفۂ جدیدہ کے بانی ڈیکارٹ نے بھی تصورات کی تین قسمیں قرار دے کر ایک کی نسبت یہی دعوی کیا، کہ "ان کو ہم خود اپنی جبلت و فطرت کے ساتھ لے کر پیدا ہوتے ہیں"،

لاک ان سب کے برخلاف ایک طرف سلباً اس کا مدعی ہے کہ فطرت سے انسان اپنے لوح ذہن کو بالکل سادہ لیکر آتا ہے، اس پر کوئی جلی وخفی نقش قطعاً موجود نہیں ہوتا، دوسری طرف ایجاباً اس کا دعوی ہے، کہ جو کچھ اور جس طرح کا علم بھی انسان کو حاصل ہے، وہ سارا کا سارا پیدایش کے بعد اسی دنیا میں تجربات کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، اصطلاحاً یوں کہو کہ ہمارے اندر علم حضوری کا جو پہلے سے حاضر فی الذہن ہو، ایک نقطہ بھی نہیں، جو کچھ ہے، سب کی سب محض حصولی یعنی بعد کو تجربہ سے حاصل کردہ، بس یہی دو سلبی اور ایجابی مقدمات لاک کے نظریۂ علم کے تمام نتائج کی بنیاد ہیں،

علم حضوری کے قائلین دو دلیلیں پیش کرتے ہین، (۱) ایک تو بعض نظری و عملی اصول کا عالمگیر طور پر مسلم ہونا (۲) دوسرے ہر انسان کا عقل و تمیز کو پہونچتے ہی ان کا معلوم و قبول کر لینا،

لاک دونوں باتوں کو سرتاپا غلط کہتا ہے، بدیہی سے بدیہی قضایا کو لو، مثلاً الف الف ہے (قانون عینیت) یا یہ ناممکن ہے، کہ الف الف ہو بھی، اور نہ بھی ہو، (قانون تناقض) کون کہہ سکتا ہے کہ ان کا علم عالمگیر ہے، جو بچوں، احمقوں، دیوانوں، وحشیوں سب کو حاصل ہوتا ہے، ان تجریدات وکلیات تک انسان مدتوں کے تجربہ کے بعد جاکر کہیں پہونچتا ہے، یہی حال اخلاقی وعملی اصول یا ضمیر کا ہے، کہ عمل و اخلاق کا کوئی اصول ایسا نہیں، جو نفع وضرر کے تجربات کے بعد نہ بنا ہو اور جس کو ساری دنیا یکساں طور سے مانتی ہو، مثلاً:-

"ہرچہ برخود نپسندی بہ دیگران مپسند"

کون کہہ سکتا ہے، کہ بچوں یا وحشی اقوام میں یہ اصول عالمگیر طور پر مسلّم ہے، ضمیر بھی ایک قوم کا کچھ ہے، اور دوسری کا کچھ، قوم تو قوم بہتیری چیزوں میں فرد فرد کا ضمیر الگ ہوتا ہے، اس سے بڑھکر یہ کہ ایک ہی فرد کا آج کچھ ہوتا ہے اور کل کچھ، اور "بفرض یہ مان بھی لیا جائے، کہ کچھ صداقتیں ایسی ہیں جس پر تمام بنی نوع انسان متفق ہیں، تو بھی ان کا حضوری ہونا اس وقت تک لازم نہیں آتا، جبتک انکے متفق علیہ ہونے کی کوئی اور توجیہ نہ کیجا سکے"[1]

دوسری دلیل اور بھی عجیب تر ہے، کسی بات کا ذہن میں پیدائش سے پہلے ہی موجود ہونا، پھر اس کے قبول کے لئے عقل وتمیز یا سن شعور کا انتظار کیا معنی! گویا جو کچھ پیدائش سے قبل ہی معلوم ہے، وہ بعد پیدائش سالہا سال نامعلوم رہتا ہے، تو اس کا علم و عدم علم یا ذہن میں وجود و عدم برابر ہو گیا "جس بات کا ذہن کو نہ اب تک علم ہوا ہے نہ شعور، اس کو ذہن میں موجود کیسے کہا جا سکتا ہے، ورنہ پھر تو تمام باتیں جن کو ذہن کبھی بھی معلوم کرتا یا کر سکتا ہے، وہ پہلے ہی سے اس میں موجود و مرتسم قرار دیجا سکتی ہیں" اور یہ کہنا کہ ہر شخص ان کو عقل سے معلوم

---

[1] تمام ایسے مسلمات کی ایک ایک کرکے لاک نے تجربہ سے توجیہ کی ہے،

کر لیتا، ان کے حضوری ہونے کے بجائے اسٹے یہ ثابت کرتا ہے کہ ان کا علم استعمالِ عقل کے بعد حاصل ہوتا ہے، اسلئے کہ

"اگر یہ حضوری و خلقی ارتسامات ہوتے، تو ایسے اشخاص (بچے، احمق، وحشی وغیرہ) کے لئے سب سے بڑھ کر صاف و واضح ہوتے جن میں ان کا سرے سے ہم کو کوئی نشان ہی نہیں ملتا، جو میرے نزدیک ان کے غیر حضوری ہونے کے خیال کو بہت قوی کر دیتا ہے،... کیونکہ بچے، احمق، وحشی، اور ان پڑھ آدمی کا ذہن سب سے کم خارجی (یا حصولی واکتسابی) خیالات سے فاسد ہوتا ہے"[۵۱]
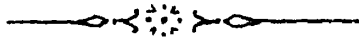
غرض علم کے مبدء و ماخذ کا پہلا سوال کہ یہ کہاں سے آتا ہے؟ لاک کے پاس اس کا جواب صرف ایک لفظ ہے "تجربہ" انسان ذہن کی لوح کو بالکل سادہ لیکر اس دنیا میں داخل ہوتا ہے، اور یہاں آکر جو کچھ جانتا یا جان سکتا ہے، اس کا سرچشمہ ہماری اسی دنیا، اور اسی زندگی کے تجربات اور صرف تجربات ہوتے ہیں، البتہ ہابس اور گسنڈی کے دعوے کے برخلاف وہ ان تجربات کی راہ حس اور آلاتِ حس کے علاوہ، خود اپنے ذہن کے افعال و کیفیات پر فکر و تامل کو بھی قرار دیتا ہے، خارجی چیزوں کا تجربہ حس سے حاصل ہوتا ہے، اور ذہنی کیفیات کا تامل سے، بس یہی خارجی و داخلی یا حسی و تاملی[۵۲] تجربات ساری کارگاہِ علم کا تانا بانا ہیں، اور جب علم کے تار و پود و تمامتر اکتسابی و حصولی ہیں، تو پھر ان سے جو قضایا بنتے ہیں، وہ کیسے خلقی یا حضوری ہوسکتے ہیں،

---

۵۱ تلخیصات فہم انسانی ص ۲۲، از جان رسل، مطبوعہ نیویارک، اکثر اقتباسات اسی سے ماخوذ ہیں، ۵۲ (Reflection) کے لئے تامل سے بہتر لفظ نہیں ملا، فکر یا تفکر Thinking کے لئے زیادہ موزوں و مستعمل ہے، تامل کو لاک تفکر کے محدود و مخصوص معنی میں نہیں لیتا بلکہ اس سے مراد ذہن کا خود اپنے افعال کا مشاہدہ یا شعور ہے،

اس دعویٰ کو اصلی مدعی کی زبان سے بھی سن لو،

" ذہن کو ایک سادہ کاغذ فرض کر لینے کے بعد جو تمام نقوش و تصورات سے قطعاً خالی ہے، سوال یہ ہے کہ پھر اس کے پاس یہ سامان کہاں سے آتا ہے، ؟ طرح طرح کے نقش و نگار اور ان گنت خیالات کا یہ ذخیرہ کہاں سے فراہم ہوتا ہے؟ اور علم و استدلال کا سارا سرمایہ کہاں سے حاصل ہوتا ہے، ؟ میرا جواب ایک لفظ میں یہ ہے، کہ "تجربہ" سے، تجربہ ہی پر ہمارے سارے علم کی بنیاد ہے، اور اسی سے یہ بالآخر ماخوذ ہوتا ہے، ہمارے مشاہدہ کا تعلق یا تو خارجی حسی اشیا سے ہوتا ہے، یا ذہن کے داخلی افعال سے، جن کا ہم خود ادراک کرتے یا جن پر تامل کرتے ہیں، بس یہی دو چیز ہے، جو ہماری فہم کے لئے سارا موادِ فکر ہیا کرتی ہے، علم کے یہی دو سرچشمے ہیں جن سے ہمارے تمام تصورات جو حاصل ہیں، یا ہو سکتے ہیں، اُبلتے ہیں[1]"

خلاصہ یہ کہ ذہن جو کچھ جانتا اور خیال کرتا یا کر سکتا ہے، وہ عبارت ہے تمامتر اسی حسی یا تاملی تجربہ کے پیدا کردہ تصورات سے،

ان تصورات کی دو قسمیں ہیں، بسیط اور مرکب،

۱۔ بسیط تصورات نام ہیں، حس اور تامل کے ان عنصری تجربات یا ابتدائی ارتسامات کا جن کے ادراک میں ذہن کی حیثیت محض انفعالی ہوتی ہے، جس طرح آئینہ کی اُن اشیا کے انعکاس میں جو اس کے سامنے آتی ہیں، یہی بسیط تصورات ہمارے سارے علم اور مرکب تصورات کا مواد و عناصر ہوتے ہیں،

" اشیا کی جو صفات ہمارے حواس کو متاثر کرتی ہیں، گو وہ خود ان اشیا میں

ایسی باہم مخلوط و متحد ہوتی ہیں، کہ ان میں کوئی بعد و فصل نہیں پایا جاتا، تاہم یہ ظاہر ہے، کہ جو تصورات ذہن کے اندر حواس کی راہ سے یہ پیدا کرتی ہیں، وہ بسیط اور غیر مخلوط ہوتے ہیں،...... مثلاً انسان بوقت واحد موم کے ایک ٹکڑے میں آنکھ سے حرکت و رنگ دیکھتا، اور ہاتھ سے گرمی و نرمی محسوس کرتا ہے، تاہم یہ بسیط تصورات جو ایک ہی شے میں متحد ہیں، اسی طرح ایک دوسرے سے بالکلیہ ممتاز ہیں جس طرح وہ جو مختلف حاسوں سے حاصل ہوتے ہیں، برف کے ایک ٹکڑے میں آدمی سردی و سختی کا جو احساس کرتا ہے، ان دونوں سے تصورات ذہن میں اسی طرح الگ الگ ہوتے ہیں جس طرح نرگس کی خوشبو اور سفیدی یا جس طرح شکر کے مزے اور گلاب کی خوشبو کے"۔[1]

یہ تصورات بسیط بعض صرف ایک حاسہ سے حاصل ہوتے ہیں، جیسے رنگ، بو، مزا، کہ صرف باصرہ، شامہ اور ذائقہ سے حاصل ہوتے ہیں، بعض ایک سے زائد حاسوں سے حاصل ہوتے ہیں، جیسے امتداد، شکل، حرکت، کہ یہ باصرہ، اور لامسہ دونوں سے حاصل ہوتے ہیں، بعض صرف تامل سے حاصل ہوتے ہیں، جیسے شک یقین، ارادہ، اور بعض حس و تامل دونوں سے جیسے لذت و الم اور قوت کے تصورات، بدبو بھی موجب الم ہوتی ہے اور شک بھی،

۲- جب ان بسیط تصورات کا ذخیرہ ذہن میں فراہم ہو لیتا ہے، تو ان ہی میں ترکیب و تجرید اور تعلق پیدا کرکے ذہن اپنے تصرف سے انواع و اقسام کے مرکب تصورات بناتا ہے گویا بسیط تصورات مرکب تصورات کے عناصر ترکیبی ہیں، اور ان کی تعمیر و ترکیب میں ذہن اپنی قوت و تصرف سے کام لیتا ہے، تصورات بسیط کی طرح محض انفعالاً ان کو قبول نہیں کر لیتا،

---

[1] سفر دوم باب ۲ بحوالہ بالا،

"جس طرح بسیط تصورات مختلف مجموعوں میں متحد ہوکر دیکھے اور پائے جاتے ہیں، اُسی طرح ذہن میں اسکی قوت ہی کہ مختلف تصورات بسیطہ کو ملاکرایک تصور کی حیثیت سے ملحوظ رکھ سکتا ہے، اور یہ نہیں کہ وہ ان کو صرف اسی طرح ملا سکتا ہے، جس طرح خارج مین ملکر پائے جاتے ہیں بلکہ جس طرح خود چاہے، ملحوظ رکھ سکتا ہی، اسی طرح جو تصورات مختلف تصورات بسیطہ کو ملاکر بنتے ہین، ان کو میں مرکب تصورات کہتا ہون، مثلاً حسن، تشکر، آدمی، فوج، کائنات کہ جو مختلف بسیط تصورات یا ایسے مرکب تصورات کے پیچیدہ مجموعے ہیں، جو خود بسیط تصورات سے بنے ہین، تاہم ذہن کی حسب مرضی ان میں سے ہرایک بجائے خود ایک مستقل چیز خیال کیا جاتا، اور ایک نام سے موسوم کیا جاتا ہے"۔

یہ تصورات مرکبہ گو بے شمار اور طرح طرح کے ہوتے ہیں، تاہم ان کی اصلی قسمیں تین ہی ہیں، شیون (یا اعراض) جواہر اور علائق (یا اضافات)، شیون بذات خود قائم نہیں ہوتے، نہ کوئی مستقل وجود رکھتے ہیں، بلکہ دوسرے کے ساتھ قائم اور اپنے وجود میں اس کے محتاج ہوتے ہیں، مثلاً مثلث، شکر گذاری، قتل وغیرہ، بخلاف اس کے جواہر سے مراد ان اعیان یا اشیاء کے تصورات ہیں، جو بذات خود قائم ہیں، یہ تصورات اس طرح حاصل ہوتے ہیں، کہ مختلف حواس کے بعض بسیط تصورات کا یکجا تجربہ ہوتا ہی، اسلئے ان کے مجموعہ کو ایک شے سمجھا جاتا ہے، اور ایک ہی نام سے موسوم کیا جاتا ہے، مثلاً ایک خاص شکل وصورت، خاص حرکات وسکنات، اور عقل واستدلال کی قوتوں وغیرہ کے یکجائی ومجموعی تجربات کا نام انسان ہے، تیسری قسم کے مرکب تصورات علائق یا اضافات کو ظاہر کرتے ہیں یعنی ان روابط وتعلقات کو جو مختلف اشیاء ایک دوسرے کیساتھ رکھتی ہیں

ان بسیط اور مرکب تصورات کے بننے بنانے میں ذہن وفہم کے جو ملکات وتصرفات بروئے کار آتے ہین، وہ حسب ذیل ہیں[1]:

[1] ویبر تاریخ فلسفہ ص ۳۵۰

۱- ادراک :- یہ علم کا پہلا درجہ، اور مواد علم کے داخلہ کا دروازہ ہے،

۲- حافظہ :- اس کا کام تصورات کو محفوظ رکھنا، اور ان کا اعادہ ہے،

۳- تمیز :- اس سے ذہن مختلف تصورات میں فرق و تمیز کرتا ہے،

۴- موازنہ :- اس سے تصورات میں ایک دوسرے کے ساتھ علائق و اضافات قائم ہوتی ہیں،

۵- ترکیب :- اس کے ذریعہ ذہن مختلف تصورات بسیطہ کو ملا کر مرکب تصورات بناتا ہے،

۶- تجرید :- اس کے ذریعہ سے ذہن جزئی اشیاء کے جزئی تصورات کو عام و کلی تصورات بناتا ہے، اس طرح کہ زمان و مکان اور دیگر عوارض سے جو اس کے وجود بالفعل کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں، قطع نظر کر لیتا ہے، یہ قوت صرف انسان کو حاصل ہے، باقی میں دیگر حیوانات بھی کم و بیش شریک رہتی ہیں،

مرتبۂ ادراک میں ذہن منفعل ہوتا ہے، بعد کے مراتب میں تدریجاً اسکی فاعلیت بڑھتی جاتی ہے، انھی مختلف قابلیات و ملکات سے فعلاً یا انفعالاً ہر طرح کے بسیط و مرکب تصورات حاصل ہوتے، اور ہر قسم کے انسانی معلومات وخیالات کی ان ہی سے توجیہ و تشریح ہو جاتی ہے، ذہن کی ان قوتوں اور حسی و تاملی تجربات کے باہمی فعل و انفعال کے علاوہ کسی دوسرے حضوری ذریعۂ علم کے فرض کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں، اور لاک نے "فہم انسانی" کی دو ضخیم جلدوں کے بڑے حصہ میں ایک ایک تصور کو لیکر اسی دعوی کے تحت اسکی توجیہ و تفصیل کی کوشش کی ہے،

ان میں سے ہم ذیل میں بعض زیادہ اہم اور ایسے تصورات سے مختصراً بحث کریں گے، جن کی بظاہر اس طریقہ سے توجیہ مشکل معلوم ہوتی ہے،

فلسفہ کی دنیا میں سب سے اہم بحث ہمیشہ وجود کی رہی ہے، جس کا بہت بڑا مظہر جس سے ہماری دنیا اور سارا عالم آباد ہے، وہ موجودات ہیں، جن کو ہم ان کے جاننے یا ادراک کرنیوالے

ذہن سے باہر مستقل بالذات موجود سمجھتے ہین، ان ہی کو ہم موجوداتِ واقعیہ وخارجیہ خیال کرتے ہیں، جو اپنے وجود میں ہمارے یا کسی کے ادراک و اعتبار کے تابع نہیں، ان کا جاننے یا شعور و تصور کرنے والا کوئی ہو یا نہ ہو، یہ بہرحال اپنی جگہ پر موجود و قائم رہتے ہیں،

لاک کے اصل موضوع کو گو براہِ راست ان موجوداتِ خارجیہ سے بحث نہین، بلکہ محض ان کے ذہنی تجربات و تصورات سے، مگر خود ان تصورات ہی کے متعلق سوال پیدا ہوتا ہے، کہ آیا یہ سارے کے سارے، اُن اشیاء کی جو خارج از ذہن موجود ہیں، محض ایک انفعالی تصویر و عکس ہیں، یعنی جو چیز جیسی خارج میں موجود ہے، ویسا ہی اس کا عکس آئینہ کی طرح ہمارے ذہن میں اتر آتا ہے، یا اسی کو یوں کہو کہ جس طرح کی تصویر یا تصور ہمارے ذہن میں پایا جاتا ہے، خارجی اشیاء بعینہ ایسی ہی ہوتی ہیں، یا کچھ فرق ہوتا ہے، عوام کیا خواص بھی بالعموم یہی سمجھتے سمجھاتے رہے ہیں، کہ آم کا جو مزہ، جو رنگ، جو بو ہم محسوس کرتے ہیں، وہی بعینہ خود آم میں بلا ہمارے احساس و ادراک کے موجود ہے،

مگر اس باب میں لاک نے اپنے پیشرو ہابس اور ڈیکارٹ کی طرح اشیاے خارجی کے اُن صفات کی جس سے ہمارے مختلف احساسات و تصورات پیدا ہوتے ہیں، دو قسمیں قرار دی ہیں، اوّلی، و ثانوی، صفاتِ اولیہ، بعینہ اسی طرح خارجی اشیاء میں موجود ہیں جس طرح کہ ہم ان کا تصور کرتے ہیں یعنی ہمارا تصور اصل کے مطابق تصویر یا مثنیٰ ہوتا ہے، بخلاف صفاتِ ثانویہ کے کہ ان کے مطابق و مماثل کوئی صفت ذہن سے باہر بیرونی اشیاء میں نہین پائی جاتی،

صلابت، امتداد، شکل اور حرکت پذیری صفاتِ اولیہ ہیں، جو کسی حالت میں جسم سے علٰحدہ نہیں ہو سکتیں، جسم میں کوئی تبدیلی ہو یہ بدستور قائم رہتی ہیں، باقی رنگ، بو، آواز، مزہ وغیرہ صفات

ثانویہ ہیں، جو اجسام کی ذات میں داخل نہیں، بلکہ اجسام میں محض اس کی قابلیت ہے، کہ وہ اپنے ذاتی یا اولی صفات کے عمل سے ہم میں اس قسم کے ثانوی احساسات یا تصورات پیدا کر دیتے ہیں، جن کا خود ان احساسات کے مماثل خارج از ذہن یا بلا احساس کوئی وجود نہیں ہوتا، چنانچہ اگر آلات حس، ان کے احساسات، یا احساس کرنے والا اگر نہ رہے یعنی اگر دیکھنے والی آنکھ، سننے والے کان، سونگھنے والی ناک، چکھنے والی زبان نہ رہے، تو رنگ، روشنی، بو، مزہ وغیرہ کا خود خارجی اشیاء میں کوئی وجود ہی نہ ہوگا،

صفات اولیہ میں سب سے اہم صلابت کا تصور ہے، جو مزاحمت یا لمس کی حس سے سے حاصل ہوتا ہے، اور جسم کے ساتھ تمام تصورات بسیط میں سب سے اساسی تعلق رکھتا ہے، لیکن صلابت سے مراد سختی نہیں، بلکہ جسم کا مکان کو اس طرح بھر لینا (شاغل ہونا) کہ پھر کسی دوسرے جسم کی اس میں قطعاً سمائی نہ ہو سکے، بخلاف اس کے سخت اس جسم کو کہتے ہیں، جو اپنی صورت آسانی سے نہ بدلے،

مادہ کے تصور کی بنیاد صلابت ہی کی صفت ہے، نہ کہ امتداد کی، جیسا کہ ڈیکارٹ کا خیال تھا، نہ امتداد اور مادہ ایک شے ہیں، اسی طرح لاک کے نزدیک جسم و مکان بھی دو جداگانہ چیزیں ہیں، مکان کا بلا جسم کے تصور ہو سکتا ہے، لیکن جسم کا بلا مکان کے نہیں ہو سکتا، ڈیکارٹ نے جسم، مادہ اور مکان سب میں پھیلاؤ کو مشترک پاکر سب کی ایک ہی حقیقت یعنی امتداد قرار دیدی تھی،

لاک کے نزدیک مادہ کی حقیقت دراصل مجموعۂ اعراض سے زیادہ نہیں، جس کا تصور خاص خاص اعراض یا صفات کے محض یکجائی تجربہ سے حاصل ہوتا ہے، باقی اگر صفات و اعراض کے اس یکجائی تجربہ

کے علاوہ کسی چیز کو ہم مادّہ یا جوہر کہتے ہیں، تو وہ صرف ایک اسم بے مسمّی ہے،

بعض بسیط تصوّرات ہمیشہ ساتھ ساتھ پائے جاتے ہیں جن کے متعلق فرض کرلیا جاتا ہی کہ یہ کسی شے واحد کے ساتھ قائم ہیں،......اور ایک نام رکھ لیا جاتا ہے جس کو ہم بلا احتیاطی سے بعد میں ایک ہی بسیط تصوّر کہنے اور سمجھنے لگتے ہیں، حالانکہ دراصل یہ چند ایسے تصوّرات سے مرکب ہوتا ہی، جو مجموعًا یکجا پائے جاتے ہیں، جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، چونکہ ہمارے خیال میں یہ بات نہیں آتی، کہ بسیط تصوّرات بذاتِ خود کیسے قائم ہوسکتے ہیں، لہذا ایک ایسا محل فرض کرلیتے ہیں، جس میں حال ہوکر یہ پائے جاتے، اور جس سے پیدا ہوتے ہیں، اسی محل کو ہم جوہر کہتے ہیں،

لیکن اگر کوئی شخص جوہر کے اپنے اس تجریدی و کلی تصوّر کی جانچ کرے، تو معلوم ہوگا کہ اس کے پاس ایسے صفات کے محض ایک مفروض و نامعلوم سہارے (یا محل) کے تصوّر کے سوا کچھ نہیں، جو ہمارے اندران بسیط تصوّرات کو پیدا کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں جن کو عام طور سے "اعراض" کہا جاتا ہے، اگر کسی سے سوال کیا جائے کہ وہ شے کیا ہے، جس میں رنگ یا وزن پایا جاتا ہے، تو وہ اس کے سوا کچھ نہ بتا سکے گا، کہ ٹھوس ممتد اجزاء، اور اگر پھر مطالبہ کیا جائے، کہ یہ ٹھوسپن (صلابت) اور امتداد کس چیز میں پائے جاتے ہیں، تو اس کی حالت اُس ہندوستانی سے بہتر نہ ہوگی، جس نے کہا تھا کہ دنیا ایک بڑے ہاتھی پر ٹھہری ہے، جب پوچھا گیا کہ ہاتھی کس چیز پر کھڑا ہے؟ تو کہا، ایک بڑے کچھوے پر، پھر پوچھا گیا، کہ اور یہ بڑا کچھوا؟ تو کہا، کسی اور چیز پر جس کو میں نہیں جانتا،

یہی حال نفس کے افعال، فکر، استدلال، خوف وغیرہ کا ہے، یہ سمجھ کر کہ یہ بذاتِ خود

قائم ہو سکتے ہیں، نہ جسم سے وابستہ، اور پیدا ہو سکتے ہیں، اسلئے لازماً ان کو بھی کسی اور جوہر کے افعال خیال کر لیا جاتا ہے، جسکو روح کہتے ہیں[ا]"

اسی طرح لاک کے نزدیک کسی شے کے مجموعی اعراض وصفات کے علاوہ، جن کا معمولاً ہر شخص کو مشاہدہ و تجربہ ہوتا ہے، ان کے قیام و بقا کیلئے کسی اور جوہری وجود، ہیولیٰ، مادہ یا روح کا فرض خالی فرض ہی ہے، کوئی واقعہ وحقیقت نہیں،

اضافات وعلائق کے مرکب تصورات میں سب سے اہم اور ہمہ گیر، علاقہ علت و معلول (تعلیل) کا ہے، جو ذرات سے لیکر سماوات تک تمام موجودات پر حاوی خیال کیا جاتا ہے، اس کا تصور اسطرح حاصل ہوتا ہے، کہ ہم کو اشیار میں آغاز اور تغیرات کا تجربہ ہوتا ہے، اور ان کے ایک دوسرے پر منحصر وموقوف ہونے کا یہی تجربہ علاقہ تعلیل کی اصل بنیاد ہے،

ہمارے حواس کو اشیار میں جو ہمہ وقت تغیرات نظر آتے رہتے ہیں، ان سے لازماً خاص خاص صفات وجواہر کے آغاز وجود کا علم ہوتا ہے، اور ان کا یہ وجود بعض دیگر موجودات کے خاص عمل واستعمال کے تابع ہوتا ہے، اسی مشاہدہ سے ہم علت و معلول کے تصورات حاصل کرتے ہیں، جو چیز کوئی بسیط یا مرکب تصور پیدا کرتی ہے، اسکو ہم "علت" کا عام نام دیدیتے ہیں، اور جو پیدا ہوتی ہے، اسکو "معلول" کا، مثلاً وہ جوہر جس کو ہم موم کہتے ہیں، اس میں دیکھتے ہیں، کہ بہاؤ یا سیالیت (جو ایک بسیط تصور ہے) پہلے موجود نہ تھی لیکن بعد کو ایک خاص درجہ کی گرمی پہونچانے سے پیدا ہو گئی، تو گرمی کے بسیط تصور کو موم کی اس سیالیت کے تعلق کے ساتھ "علت" کہتے ہیں، اور سیالیت کو "معلول"[ب]

علت کی اس بحث نے آگے چل کر ہیوم اور کانٹ کے فلسفہ میں بہت زیادہ اہمیت حاصل کی

ا؎ سفر دوم باب ۲۳، ب؎ رر باب ۲۶

ایک اور تصور جس نے فلسفہ کی خدا جانے کتنی بحثوں کو چیتیاں بنا دیا، اور جس پر فلاسفہ نے خدا جانے کتنے دفتر سیاہ کر ڈالے ہیں، وہ کلیات کا تصور ہے، چونکہ ہمارے تجربات خواہ حسی ہوں یا تاملی سب کے سب جزئی ہوتے اور ہو سکتے ہیں، اسلئے کلی تصورات کی ان سے اخذ وحصول کی کوئی صورت ہی نہیں معلوم ہوتی، لاک کو بھی تسلیم ہے کہ

تمام چیزیں جو پائی جاتی ہیں، وہ تو جزئی ہی ہوتی ہیں، پھر کلی الفاظ ہم کہاں سے لاتے یا اُن کلی اشیار کو کہاں سے پاتے ہیں، جس پر یہ الفاظ دلالت کرتے ہیں، ؟ الفاظ تو اس طرح کلی بنجاتے ہیں، کہ وہ کلی تصورات کی علامت بنا دیئے جاتے ہیں، اور تصورات اس طرح کلی ہوجاتے ہیں، کہ ان سے زمان ومکان وغیرہ کے وہ خاص حالات جدا کرلئے جاتے ہیں، جوان کو اِس یا اُس جزئی وجود کے ساتھ مخصوص کر دیتے ہیں، اس عمل تجرید کے ذریعے وہ ایک سے زائد افراد کی نمایندگی کے قابل ہوجاتے ہیں[۱]

بچے کو ماں یا انّا کا جو تصور ہوتا ہے، جزئی ہی ہوتا ہے لیکن جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی، اور تجربہ وسیع ہوتا جاتا ہے، اس کو ماں اور انّا جیسی صورتوں کے اور بھی تجربات ہوتے جاتے ہیں، اس طرح وہ ان جزئی تجربات کے ایسے مشترک صفات یا اجزار کا ایک تصور قائم کر لیتا ہی جس کے لئے انسان کا لفظ استعمال ہوتا ہے، ذہن کوئی نئی چیز پیدا نہیں کرتا، بلکہ زید عمرو بکر، کے مخصوص عوارض واحوال سے قطع نظر کرکے محض مشترک خصوصیات کے ملحوظ رکھنے کا نام ہی کلی تصور ہے، اور اظہارِ خیال یا تعبیر میں آسانی پیدا کرنے کی غرض سے ایسے تصورات کے خاص خاص مجموعون کو عام نام دیدئے جاتے ہین، انہی کو اعلام یا اسماے معرفہ کے مقابلہ میں اسماے نکرہ کہا جاتا ہے، جن کی ہر زبان میں اتنی کثیر تعداد ہوتی ہے، اور جن کا استعمال اتنا ناگزیر ہوتا ہے، کہ آدمی کو دھوکا ہونے لگتا ہے، کہ زید عمرو

[۱] سفر سوم باب ۳،

بکر کی طرح لفظ انسان کا بھی کوئی نہ کوئی واقعی مصداق ہونا چاہئے، جو اگر خارج میں نہیں موجود ہے تو لازماً آدمی اس کو اپنی پیدایش کے ساتھ ذہن میں لیکر آتا ہے، حتی کہ فلاطون جیسے فلسفی کی ژرف نگاہی بھی اس سے ایسا دھوکا کھاتی ہے، کہ وجود کلیات کیلئے ایک الگ نیا عالم ہی فرض کرلیتی ہے،

اب خود لاک کی زبان سے ذرا سن لو، کہ کلیات سازی کا یہ عمل بچوں میں کیسے ترقی کرتا ہے جب ان کے ذہن میں :-

"ماں اور انا کے تصورات اچھی طرح جم جاتے ہیں، اور یہ تصورات صرف ماں اور انا کی اسی طرح نمایندگی کرتے ہیں، جس طرح ان کی تصویریں صرف ان ہی کی نمایندہ ہوتی ہیں، جو نام بچے ان کو دیتے ہیں، وہ بھی ابتداءً ان ہی افراد یا جزئیات تک محدود ہوتے ہیں، اور انا یا ماں کے جو نام بچہ استعمال کرتا ہے، وہ بھی خاص اسی کی انا اور ماں کے لئے مخصوص ہوتے ہیں، بعد کو جب امتداد زمانہ اور وسعتِ تجربہ سے بچوں کو معلوم ہوتا ہے، کہ دنیا میں اور بھی بہت سی ایسی چیزیں ہیں، جو شکل و صورت وغیرہ کی خصوصیات میں ماں، باپ (یا جن اشخاص سے وہ مانوس ہیں) سے مشابہ ہیں، تو پھر وہ ایک ایسا تصور قائم کرتے ہیں، جو ان سب میں ان کو مشترک معلوم ہوتا ہے، اور دوسروں کی طرح اسکو "آدمی" کا نام دیتے ہیں، اور اس طرح بچوں کو کلی نام اور کلی تصور حاصل ہوجاتا ہے، جس میں وہ کوئی نئی بات نہیں کرتے، بلکہ زید، عمرو، بکر، وغیرہ کے مرکب تصور میں سے ان چیزوں کو خارج کر دیتے ہیں، جو ان میں سے اپنی اپنی جگہ ایک ایک کے ساتھ مخصوص نہیں اور صرف ایسی چیزوں کو لے لیتے ہیں، جو سب میں مشترک ہیں[1]"

(باقی)

[1] سفر دوم باب ۳،

از

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ایم اے،

یہ آٹھوین صدی ہجری کی ایک منظوم تصنیف ہے جس مین محمود غزنوی سے لیکر محمد تغلق کے عہد تک کی ملکی فتوحات کی رزمیہ تاریخ بیان کی گئی ہے، اس کو ڈاکٹر آغا مہدی حسین (آگرہ کالج آگرہ) نے گذشتہ سال اڈٹ کرکے شائع کیا ہے، ان سے پہلے جناب سید محمد یوشع صاحب لکچرار مدراس یونیورسٹی نے اس کو اڈٹ کرنے کی کوشش کی تھی، اور "عصامی نامہ" کے نام سے ایک مثنوی لکھ کر کتاب مذکور اور اس کے مصنف پر روشنی ڈالی تھی، اور اس کے دیباچہ مین اعلان کیا تھا، کہ یہ کتاب بہت جلد مدراس یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہو گی، مگر ڈاکٹر آغا مہدی حسین کی سعی مشکور سے ان کا نسخہ پہلے چھپ کر دلدادگانِ تاریخ و ادب کے ہاتھوں میں پہونچ گیا،

فتوح السلاطین کے مصنف کا نام زیر نظر مطبوعہ نسخہ کے سرورق پر صرف مولینا عصامی لکھا ہے، انڈیا آفس کے فارسی مخطوطات کے فہرست نگار نے قیاس کیا ہے کہ پورا نام عبد ملک عصامی ہوگا، عصامی کا ذکر معاصر یا بعد کے تذکروں میں کہین نہین آتا ہے، وہ شاعر تھا اور مورخ بھی لیکن اس کا نام شاعرون اور مورخون کی کسی فہرست مین نظر نہین آتا ہے، انڈیا آفس لائبریری کے فہرست نگار کا بیان ہے، کہ خزینۂ گنج الٰہی مین جو نوین اور دسوین صدی ہجری کے شاعرون کا ایک تذکرہ تھا عصامی

[illegible] کرآیا تھا لیکن یہ تذکرہ مفقود ہے، نظام الدین احمد بخشی مؤلف تاریخ اکبر شاہی اور محمد قاسم صاحب تاریخ فرشتہ نے اپنی اپنی [illegible] ون کے ماخذ کے سلسلہ میں فتوح السلاطین کا ذکر کیا ہے، ان کے علاوہ اس [illegible] ذکر کہیں اور نظر سے نہیں گذرا،

عصامی نے اپنی کتاب میں خود اپنے مختصر حالات لکھے ہیں، جن سے اس کے مختصر سوانح مرتب [illegible] سکتے ہیں، جیسا کہ ڈاکٹر آغا مہدی حسین اور سید محمد یوشع صاحب نے کیا ہے،

عصامی اپنے [illegible] ف میں سے ایک کو بغداد کا وزیر بتاتا ہے،

شنیدم وزیرے بہ بغداد بود محیط کرم معدن داد بود
بدستش ہمہ [illegible] وعقد دیار سپردہ سلاطین آن روزگار
دران ملک تر[illegible]نے وزارت براند جہانے فخر ملک عصامیش خواند
بدار ممالک بدانہ ہوش ورائے ضمیرش بہر باب مشکل کشائے،
کسے کو بگشتے بدان ملک شاہ وزیرش بکردے دران تختگاہ
بے رائے او ہیچ رائے زدے نہ بے علم او دست وپائے زدے

"وزیرے ب[illegible] " سے تو بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے، کہ عباسی فرمانرواؤں کا وزیر تھا، یوشع صاحب بھی اپنے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ "وہ متاخرین خلفاے عباسیہ کے دربار میں وزیر تھا، ڈاکٹر آغا مہدی حسین کو بھی یہ تسلیم کرنے میں تامل نہیں، مگر خلفاے عباسیہ کے وزرا کی فہرست میں فخر الملک عصامی نام کا کوئی وزیر [illegible] نظر نہیں آتا، مندرجۂ ذیل دو اشعار سے ظاہر ہوتا ہے، کہ وہ وزیر اعظم تھا،

کسے کہ بگشتے بر آن ملک شاہ وزیرش بکردے دران تختگاہ
نہ بے رائے [illegible] ہیچ رائے زدے نہ بے علم او دست وپائے زدی

اور جیسا کہ اوپر کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ ایک "قرن" تک اس عہدہ پر مامور رہا

وہ ہندوستان یا تو ۶۳۱ھ یا ۶۳۱ھ اور ۶۳۳ھ کے درمیان میں آیا، اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ۵۹۲ھ سے ۶۳۰ھ تک وزارت کے فرائض انجام دیتا رہا، یہ زمانہ ناصر لدین اللہ (المتوفی ۶۲۲ھ) ظاہر بامراللہ (المتوفی ۶۲۳ھ) اور مستنصر باللہ (المتوفی ۶۴۰ھ) کا ہے جنکے وزراء علی الترتیب مؤید الدینؒ محمد بن محمد بن عبد الکریم قمی اور نصیر الدین بن ابی الازہر احمد بن محمد بن ناقد تھے، پھر تعجب ہے کہ عصامی نے فخر الملک عصامی کو وزیر بغداد بود کیسے لکھ دیا "شنیدم" کے لفظ سے ظاہر ہوتا ہے، کہ وہ جو کچھ لکھ رہا تھا، اس پر خود اس کو یقین نہ تھا، عصامی کا بیان ہے کہ جب فخر الملک عصامی ہندوستان آیا، تو شمس الدین التمش نے اسکا پرجوش استقبال کیا،

چو نزدیک دہلی در آمد وزیر	شنید این خبر شاہ روشن ضمیر
کہ آمد ز بغداد یک مرد کار	کہ بود ست دستور آں خوش دیار
شنیدم ز دہلی خرامید تفت	بتعظیم او چند فرسخ برفت
وزیرے گزیں ہم در اثنائے راہ	بصد خرمی گرد پابوس شاہ
بسے پیشکش پیش خسرو کشید	پذیرفت از وشاہ اختر سعید
وزان پس بصد لطف بنواختش	ہماں روز دستور خود ساختش
دگر روز فرخندہ دستور شاہ	خرامان رسیدند در تخت گاہ
بسے سال آن شاہ روشن ضمیر	ہمی راند ملکے بہ رائے وزیر
ہم آخر بر آئیں کار آگہان	ببروند رخت ز دار جہان
بکرسی بنجم مرا بالیقیں	یکے آمدے آن وزیر گزین

ا۔ ناصر الدین اللہ (۵۷۵ھ یا ۶۲۲ھ) کے تمام وزراء کے نام یہ ہیں، ابو القاسم نصر بن عطار، جلال الدین ابو المظفر عبید اللہ، عز الدین، سعید بن علی، مؤید الدین، ابی المظفر، محمد بن احمد، نصیر الدین، ناصر بن مہدی، مؤید الدین قمی،

شمس الدین التمش کا معاصر مورخ طبقات ناصری کا مصنف ہے، مگر اس نے سلطان التمش کے قضاۃ، ملوک اور وزراء کی جو فہرست دی ہے، اس میں فخر الملک عصامی کا نام نہیں ہے، التمش کی حکومت کی تفصیل کے لئے طبقات ناصری کے بعد تاریخ مبارک شاہی (۸۳۷ھ) ہی مستند سمجھی جاتی ہے، مگر اس میں بھی فخر الملک عصامی کا ذکر نہیں، بعد کے مورخوں میں نظام الدین احمد بخشی اور فرشتہ نے اپنی اپنی تاریخوں میں اس کا ذکر کیا ہے، نظام الدین احمد کی عبارت یہ ہے،

"در آخر عمر فخر الملک عصامی وزیر بغداد کہ سی سال در بغداد بمنصب وزارت اشتغال داشت، و بفضائل و کمالات صوری و معنوی مشہور و مذکور بود، بہ سببے از اسباب دنیوی کہ مایہ رنجش و ملال خاطر ارباب دولت می باشد، جلائے وطن شدہ بدہلی آمد سلطان مقدم او را گرامی داشتہ باعزاز و اکرام تمام بشہر در آورد، و منصب وزارت داد مراحم خسروانہ در حق او بظہور آورد"[۱]

فرشتہ کی عبارت بجنسہ یہی ہے، نظام الدین احمد کا ماخذ منجملہ اور کتابوں کے فتوح السلاطین ہے اسلئے گمان ہوتا ہے، کہ اس نے تحقیق کئے بغیر یہ معلومات اس سے لے لئے ہیں، ورنہ ظاہر ہے کہ جس وزیر نے تیس سال تک بغداد میں وزارت کی ہو، اس کا ذکر عباسیوں کی تاریخ میں ضرور آنا چاہئے مگر اس عہد کی کسی تاریخ میں اس کا نام تک نہیں آیا ہے، اسلئے فخر الملک عصامی کا نہ صرف عباسیوں کا بلکہ شمس الدین التمش کا بھی وزیر ہونا مشکوک ہے،

عصامی کا بیان ہے، کہ فخر الملک کا ایک بیٹا ناصر الدین محمود بن التمش کے زمانہ میں وکیل در یعنی شاہی محلات کا کلید بردار تھا، اس عہدہ پر اس زمانہ میں معزز امراء فائز ہوتے تھے، ناصر الدین محمود کی سلطنت کے حال میں ہے،

---

[۱] طبقات اکبری جلد اول

دگر آن ظہیر ممالک کہ شاہ وکیل درش کرد بے گاہ و گاہ

یکے بود روشن دل و نیک نام چراغے ہم از دودۂ بو عصام

ہم از فخر ملک عصامی بہند بدادہ ہمان گوہر دل پسند

اس کا بیٹا عزالدین بلبن کی حکومت کا معزز عہدیدار تھا،

لقب عزّ دیں داشت آن نیک مرد ہمہ عمر از و کس شکایت نکرد،

مرا او را پدر بود صدر الکرام کزو تازہ شد گلشن بو عصام

ظہیر ممالک بدیں نام جو وکیل در شاہ فرزانہ بود

ان اشعار سے اندازہ ہوگا، کہ فخر الملک کے لڑکے کے دو القاب صدر الکرام اور ظہیر ممالک تھے، اور اس کے پوتے کا لقب عزالدین تھا، مگر تعجب ہے کہ صدر الکرام اور ظہیر ممالک کا ذکر طبقات ناصری میں نہیں، حالانکہ اس میں ناصرالدین محمود کے امراء کی ایک طویل فہرست ہے، اور نہ عزالدین کا نام بلبنی امراء کی اس فہرست میں ہے، جو ضیاء الدین نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں دی ہے،

عزالدین فتوح السلاطین کے مصنف کا دادا تھا، جب محمد تغلق نے دہلی کے باشندوں کو دیوگیر جانے کا حکم دیا، تو عزالدین بھی روانہ ہوا، اس وقت اس کی عمر ۹۰ سال کی تھی لیکن وہ دیوگیر پہنچ نہ سکا اور راستہ ہی میں اس کا انتقال ہوگیا، عصامی دیوگیر پہونچا، اور وہاں وہ چالیس سال تک رہا، اس مدت میں جیسا کہ اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، وہ تصنیف و تالیف میں مشغول رہا، مگر اس کے علم و فضل کی قدر دانی نہیں ہوئی، اور اس کی ساری علمی کاوشیں تلف ہوگئیں،

دلم گفت کائے مرد صاحب ہنر جہانے ز گفتار تو بہرہ ور

نخست آنچه گفتی تو آزیا درفت سواد و دیوانت بر باد رفت

مگر آخر میں دولت آباد کے قاضی بہاء الدین کے کرم و التفات سے اس کے جوہر فضل و کمال کی جلا ہوئی، قاضی بہاؤالدین نے جس کو علاؤالدین بہمنی کی طرف حاجب قصہ کا لقب ملا تھا عصامی کو اپنے یہاں طلب کیا، اور اُس کا کلام سُنا جس سے وہ اس قدر محظوظ ہوا کہ

بگفتا چنیں بلبلے خوش نوا بگلزار فردوس باشد سزا

چنیں مرغ حیف است دریں بوستان چنیں طوطی حبس ہندوستان

سزاے چنیں بلبلے لالہ زار نباشد مگر مجلسے شہریار

پھر عصامی کو وہ سلطان علاؤالدین بہمنی کے دربار میں لے گیا، جس کے حکم سے اس نے ہندوستان کی منظوم تاریخ لکھنی شروع کی، جو اس وقت زیر نظر ہے، اس میں قریب بارہ ہزار اشعار ہیں، ذہین اور طباع عصامی نے ان کو صرف پانچ مہینے اور نو دن کی مدت میں ختم کیا،

بنہ روز و شش ساعت و پنج ماہ شروع نمودم بے گاہ و گاہ

شب و روز خون دل خویشتن ہمہ آب کردم پئے این چمن،

کتاب کی تالیف کی تاریخ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہوتی ہے،

ز ہفصد فزون راست پنجاہ بود کہ طبعم بہ گفتن شروعش نمود،

شد آغاز در بیست و ہفت صیام ربیع نخستین ششم شد تمام

اس اہم علمی کارنامے کے بعد عصامی بہمنی دربار کی زرپاشیوں سے فیضیاب ہونے کیلئے ہندوستان میں نہیں ٹھہرا، بلکہ دولت اُخروی جمع کرنے کہ معظمہ چلا گیا، اور شاید یہیں واصل بحق ہوا،

فتوح السلاطین پر تاریخی نظر فتوح السلاطین امیر سبکتگین سے لے کر محمد بن تغلق تک کی منظوم تاریخ ہے، شاعر نے اپنے ماخذ کا ذکر اس طرح کیا ہے،

حدیثے کہ بشنیدم از باستان ۔۔۔ کشیدم بنظمش درین داستان

دگر انچہ اندر کتب یافتم ۔۔۔ سراز درج آن نیز کم تافتم

پراگندہ بس در قیمت گران ۔۔۔ کشیدم دریں سلک چون ناقدان

بتحقیق افسانہاے کہن، ۔۔۔ بردم بسے رنج در ہر سخن

حکایات شاہان ہندوستان ۔۔۔ طلب کردم از باخرد دوستان

ہمہ با تواریخ کردم رجوع ۔۔۔ چو دیدم موافق اصول و فروع

کشیدم دریں سلک ہر یک گوہر ۔۔۔ بجائے کہ دیدم سزاوار تر

دگر گوہرے ازان گہرہای ناب ۔۔۔ چو دیگر گہر ہا ندیدم خوش آب

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس تلاش وجستجو اور محنت و مشقت سے عصامی نے جو کچھ لکھا ہے وہ ہمارے موجودہ تاریخی لٹریچر میں کیا اضافہ کرتا ہے، اور معاصر تاریخوں کے مقابلہ میں اسکے بیانات اور معلومات کہان تک مفید ہیں،

فتوح السلاطین کے تاریخی واقعات کا آغاز محمود غزنوی کی پیدائش سے ہوتا ہے، عصامی نے لکھا ہے، کہ ۳۶۱ھ میں محمود کے باپ سبکتگین نے ایک رات خواب میں دیکھا، کہ اس کے محل میں آتشدان کے اندر سے ایک درخت نکلا، اور اتنا بلند ہوا کہ تمام دنیا اس کے سایہ میں آگئی، اسی رات کو اس کو خوشخبری ملی کہ اسکے یہان ایک لڑکا پیدا ہوا ہے، صبح کو لوگون سے خواب کی تعبیر پوچھی، تو ایک صاحب خرد نے عرض کیا، کہ بچہ جوان ہو کر اہل دنیا کے لئے عیش کا دروازہ کھول دیگا، ہفت اقلیم تسخیر کرے گا، اسکی فوج سندھ سے گذر کر

ہندوستان فتح کرے گا، وہ سومنات کے بتخانہ کو منہدم کرنے میں کامیاب ہوگا، فرات کو کفار کے خون سے رنگین کر دے گا، سبکتگین نے خوش ہو کر بچہ کا نام محمود اور کنیت ابوالقاسم رکھی، عصامی نے یہ واقعہ پیران بیدار مغز" سے سن کر لکھا ہے، جہاں تک خواب کا تعلق ہے اسکا ذکر طبقات ناصری میں بھی ہے، مگر اسکی تعبیر عصامی کی محض شاعرانہ اختراع ہے، جو آیندہ کے واقعات پر محمول کر لیگئی ہے،

ایک جگہ ہے، :-

چو بگذشت از سال او بیست چار	ز ہر فن بسیار استش کردگار
بہر جا کہ مشکل از و گشت حل	خطابش پدر کرد سیف الدول

مگر طبقات ناصری میں ہے کہ یہ خطاب محمود کو امیر نوح سامانی نے بو علی سیجوری خراسانی سے جنگ کرنے کے صلہ میں عطا کیا تھا،

محمود کی تخت نشینی کے بعد عصامی لکھتا ہے، :-

شنیدم ہماں سال آن شیر مرد ۳۸۶	سوے ہند آہنگ کفار کرد
یکایک در آمد بہ ہندوستان	شدش کار بر کامۂ دوستان
بیک حملہ افواج ہند و شکست	فتادش ہمان راے جے پال دست
مرا ورا در اقصاے غزنیں ببرد	بدلال بازار بردہ سپرد،
شنیدم بفرمان فرماں روا	بہشتاد دینار جے پال را،
مقیمان بازار بفروختند،	بہایش بنازن درانداختند
زسہ صد فزون شد چوں ہشتاد و ہفت	شہنشاہ در کشور زنج رفت
چو افتادش آن شہر و کشور بدست	دران تختگہ یک دو سالے نشست

سراسر بمالید ملک ہرات   وزان پس سپہ راند در گوجرات

عصامی نے ۳۸۰ھ سے ۴۱۶ھ تک کے واقعات کو اس طرح لکھا ہے، کہ سرسری مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام واقعات ۴۱۶ھ ہی میں ہوئے، پھر معلوم نہیں عصامی نے یہ کہاں سے گھڑ لیا، کہ محمود جے پال کو غزنین لے گیا، طبقات ناصری کے مصنف نے لکھا ہے کہ وہ من یزید (خراسان) بھیجد یا گیا، عنصری کا بیان ہے کہ وہ ہیرند بھیجا گیا، عتبی نے اپنی تاریخ یمینی اور گردیزی نے اپنی زین الاخبار مین اس کا ذکر نہیں کیا ہے اور نہ وہ جے پال کے فروخت ہونیکا حال لکھتے ہین، البتہ طبقاتِ ناصری میں اسکے بکنے کا ذکر ہے،

سومنات کے حملہ کے ذکر مین عصامی نے ایک دلچسپ قصہ لکھا ہے، کہ محمود جب دس سال کا تھا، تو ہندوستان کے موبدوں کے مشورے کے مطابق جے پال نے اسکے پاس تحائف بھیجے اور اس سے وعدہ لیا، کہ گجرات کو تاراج کرنے کی صورت میں سومنات کا بُت اسکے حوالہ کر دیگا جب محمود نے سومنات کو فتح کیا، تو اس کو ایفاے وعدہ کا خیال آیا، مگر وہ ایک کشمکش میں مبتلا ہو گیا،

بدل گفت آن خسرو تیز ہوش   کہ گر بت دہم شان شوم بت فروش

بفردا کہ مستان جام ہلاک   برآرند سر باز بالین خاک

من از بت فروشی شوم عام دفاش   زبت ساختن آزر بت تراش

وگرنہ دہم آن بت مرا خاص و عام   بخوانند محمود بدعہد نام،

محمود کے ذہن میں ایک ترکیب سوجھی، اس نے بت کو جلا دینے کا حکم دیا، اور جب ہندو بت لینے کے لئے اس کے پاس آئے، تو اس نے جلے ہوئے بت کے چونے کو پان میں دیکر پیش کیا، اور اس طرح بت دینے کا وعدہ پورا کر دیا، اس حکایت کے شروع میں عصامی

نے لکھا ہے،

حکایت شنیدم بنقلے صحیح		ازاں راویان امین و فصیح،

مگر اس کو فسانہ سے زیادہ وقعت نہیں دیجا سکتی ہے، اسی واقعہ کو فریدالدین عطار نے منطق الطیر میں اسطرح لکھا ہے،

یافتند آن بت کہ نامش بود لات		لشکر محمود اندر سومنات

ہندوان از بہر بت برخواستند		در رہش ہم سنگ زرمی خواستند

ہیچ گونہ شاہ می نفروختش		آتشے برگرد و حالی سوختش

ہر کسے گفتش نمی باید سوخت		زر زبت بہتر باید فروخت

گفت ترسیدم کہ تا روز شمار		بر سر این جمع گوید کردگار،

آزر و محمود را وارید گوش		آں یکے شد بت تراش ایں بت فروش

بعد کے مورخوں نے شاید فریدالدین عطار ہی کے بیان کو صحیح سمجھکر اس واقعہ میں رنگ آمیزی کی ہے، فرشتہ رقمطراز ہے کہ ہندوؤں نے جب محمود کو سومنات کے بت کی قیمت دینی چاہی تو اس نے کہا کہ

"اگر این کار بکنم مرا محمود بت فروش خواہند گفت و اگر بشکنم محمود بت شکن، خوشتر آنکہ در دنیا و آخرت مرا محمود بت شکن خوانند"

مگر معاصر ارباب تصنیف میں گردیزی، البیرونی، ابوالفدار، اور حتی کہ شاعر فرخی نے بھی اپنے طویل قصیدہ "سفر سومنات" میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے،

مذکورۂ بالا واقعہ کے فوراً ہی بعد عصامی نے ایک دوسری حکایت شروع کر دی ہے کہ ایک برہمن نے ایک پتھر کو زمین مین دفن کر دیا، اور ایک گائے کے بچہ کو روز اسی جگہ دانا

کھانے کو دیا کرتا تھا، ایک روز تمام لوگون کو جمع کرکے اس نے اعلان کیا، کہ تائید غیبی سے ایک گائے کا بچہ ان کو ایک مندر تعمیر کرنے کی بشارت دیگا، صبح کو گائے کا بچہ گھر سے نکلا، لوگ اس کے پیچھے چلے، حسب معمول گائے کے بچہ نے اس زمین کو سونگھا، جہاں وہ دانا چرا کرتا تھا، لوگ اس زمین کو کھودنے لگے، اسکے نیچے سے ایک پتھر نکلا، اور وہیں پر انھون نے سومنات بنایا، محمود ہندوستان آیا، تو بتخانہ کو مسمار کرکے اسکے بت کے چار ٹکڑے کئے، جن میں سے دو غزنی اور دو مکہ اور مدینہ بھجوادئیے، عصامی نے محمود غزنوی سے متعلق اس قسم کے اور بھی واقعات لکھے ہیں، جو محض دلچسپی کی خاطر قصوں اور کہانیوں کی طرح پڑھنے کے لئے ہیں، فرشتہ نے محمود غزنوی کے بہت سے قصے لکھے ہیں، مگر عصامی کے کسی قصہ کو اپنی تاریخ میں جگہ نہین دیا،

عصامی نے ایک جگہ حسن میمندی کو محمود کا وزیر بتایا ہے، جو صحیح نہیں، محمود کے وزرار کے نام علی الترتیب ابو العباس فضیل بن احمد، ابو القاسم احمد بن حسن المیمندی اور ابو علی حسن ابن محمد بن عباس تھے، فرشتہ نے تو تصریح کے ساتھ لکھا ہے، کہ حسن میمندی محمود کا وزیر نہ تھا،

"آنکہ بین الناس شہرت دارد کہ حسن میمندی در سلک وزرائے سلطان محمود انتظام داشت، عین غلط و محض خطاست واحمد بن حسن چون بحسن خط وجودت فہم وفضل اتصاف داشت، دراوائل صاحب دیوان انشاء ورسالت کردند، وجذبات التفات سلطانی اورا، از درجہ بدرجہ ترقی می داد تا بمنصب استیفائے ممالک رسیدہ شغل عرض عساکر ضمیمۂ امر مذکور گشت وبعد از چندگاہ ضبط اموال بلاد خراسان نیز باشغال سابق انضمام یافت...... چوں مشرب سلطانی نسبت بہ ابو العباس اسفراینی سمت تکدر پذیرفت زمام امور وزارت من حیث الاستقلال درکف کفایت آن خواجۂ ستودہ خصال قرار گرفتہ"
(ص۳۰، نولکشور پریس)

محمود غزنوی کے جانشینوں کا حال عصامی نے طبقات ناصری کے مصنف ہی کی طرح مختصر لکھا ہے، معز الدین بن سام المعروف بہ شہاب الدین غوری کی فتوحات کا ذکر کچھ تفصیل کے ساتھ ہے، لیکن پھر بھی ۵۶۹ھ سے ۶۰۲ھ تک کے بہت سے واقعات نظرانداز کر دیے گئے ہیں، اور جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ بہت ہی مختصر ہے البتہ رائے پتھورا اور غوری کی پہلی اور دوسری جنگ کو عصامی نے پورے رزمیہ انداز میں لکھا ہے جس میں فردوسی کی جھلک آگئی ہے پہلی جنگ کی شکست کے بعد غوری غزنین واپس گیا اسکو عصامی لکھتا ہے،

در آمد بلاہور شرمندہ وار	در آنجا بسے ستر کرد استوار
شنیدم سہے یک دو آنجا بماند	پس آنگہ بغزنیں زلاہور راند
چو در غزنیں آمد شہِ شرزہ زور	نوندی فرستاد در ملک غور
ہمان خسرو ترک را با پسر،	کشانید از خشم آن نامور
مسافر شد آن خسرو خوشخصال	کہ در خسروی بد دہ و چار سال
ہمو ختم اولادِ محمود بود	محیط کرم معدنِ جود بود

شد آن روز از گردش آسمان
ز اولادِ محمود خالی جہان،

صاحب طبقات ناصری نے خسرو ملک کے قتل کا ذکر غوری اور پتھورا کی لڑائی سے پہلے کیا ہے، گو اس نے بھی اسی واقعہ کو دو جگہ اور دو سنہ لکھ کر اپنے بیان کو مشکوک کر دیا ہے، غوری اور پتھورا کی جنگ کے ذکر سے پہلے لکھتا ہے،،

"چوں در شہور سنہ سبع وثمانین وخمسمائۂ عصیان وفتنۂ سلطان شاہ خوارزمی ظاہر شد خسروِ ملک و پسرش را شہید کردند" (ص ۱۱۸)

پھر خسرو شاہ کے مستقل بیان میں ہے،

"در شہور سنہ ثلث وثمانین (معزالدین محمد سام لشکر بلاہور آورد و لاہور فتح کرد و خسرو ملک را بہ عہد بیروں آورد و بطرف غزنین فرستاد و از آن جا بحضرت فیروز کوہ کہ دارالملک سلطان بزرگ غیاث الدین محمد سام بود، رواں کرد و غیاث الدین فرمان داد، تا خسرو ملک را بقلعہ بلروان از غرجستان محبوس کردند، وچوں حادثہ سلطان شاہ در خراساں ظاہر شد سلاطین غور و مجدان ہم آوردند، سلطان خسرو ملک را شہید کردند، در شہور سنہ ثمان وتسعین وخمسمایہ پسر او بہرام شاہ را کہ در قلعہ سیفرود غور محبوس بود، ہم شہید کردند و خاندان آل ناصرالدین سبکتگین مندرس گشت"؛

غوری جب دوسری بار پتھورا کے خلاف فوج لیکر آیا، تو عصامی نے سرخی میں "جنبیدن سلطان معزالدین محمد ابن سام کرت سیوم در ہندوستان" لکھا ہے، حالانکہ اس وقت تک جیسا کہ عصامی کے بیان سے بھی ظاہر ہے، غوری کے پے درپے کئی حملے ہو چکے تھے، اس سے آگے چل کر سرخی ہے "مصاف کردن پتھورا وگوبند با سلطان معزالدین بار سیوم وکشتہ شدن ایشان" مگر عصامی اور دوسرے مورخوں نے صرف دو ہی لڑائیوں کا ذکر کیا ہے، معلوم نہیں "بار سیوم" سے عصامی کی مراد کیا ہے،؟

پتھورا کی جنگ کے بعد عصامی غوری کی بہت سی فتوحات کو نظر انداز کرتے ہوئے کالیور (گوالیار) پھر اہرن وارہ اور پھر قنوج کی مہم کا ذکر کرتا ہے، جو ترتیب کے لحاظ سے بالکل درست نہیں، حالانکہ ان میں بعض سنہ جو عصامی نے لکھے ہیں، وہ غلط نہیں ہیں، مگر قنوج کی مہم ۵۸۹ھ میں کالیور (۵۹۲ھ) سے پہلے ہوئی، اور اہرن وارہ (انہروالہ) ۵۹۳ھ میں ہوئی، عصامی کا بیان ہے، کہ انہروالہ کی مہم میں غوری بھی شریک تھا، مگر طبقات ناصری میں ہے کہ اسکو قطب الدین نے

غوری کی غیر موجودگی میں فتح کیا (ص۱۳۱ وص۱۴۰)

کالیور کی تسخیر کے سلسلہ میں عصامی نے وہاں کے راجہ کی لڑکی کے بارے میں ایک دلچسپ قصہ لکھا ہے، کالیور (گوالیار) کے محاصرہ میں جب تین چار مہینے گذر گئے، توراجہ کی لڑکی ساٹھ ستر سہیلیوں کے ساتھ باپ کی خدمت میں حاضر ہوئی، اور

بتعظیم بوسید پاے پدر — نہ تنہا کہ با گلرخان دگر،
بگفتند کاے راے اختر سعید — چو امروز ماراست روز وعید
بدہ آنچہ ہر سال مرسوم ماست — بکن آنچہ رسم بر د بوم ماست

رسم یہ تھی کہ ہر سال "رایان ہند"

خراجے دیارے بہ دختر دہند — یکے تاج زریں بفرقش نہند

لیکن گوالیار کے راجہ نے یہ کہکر خراج دینے سے انکار کیا، کہ

چو در ملک من دیگرے ہست شاہ — بعز ولی از من خراجے مخواہ
وگر خواہی از وے بخواہ ایں خراج — کہ شد جمع بر وے ہمہ ساو و باج

راجہ کی لڑکی قلعہ سے اپنی سہیلیوں کو لے کر نکلی، ان کو دیکھکر غوریوں نے اپنی تلوار نیام میں رکھ لی، لڑکیاں شہاب الدین غوری کے پاس آئیں، راجہ کی لڑکی آگے بڑھی، سربسجود ہوئی اور بولی،

کہ از حد دریاے تا آب سند — وعید یست امروز در ملک ہند
بامروز رایان ہندوستان — بنوروز نشستند با دوستان
بسے گنج مر دختران را دہند — بسر ہاے شان تاج زریں نہند
من امروز بر عادت بوم خویش — طلب کردم از راے مرسوم خویش

چو معزول شد رائے ما از دیار حوالہ مرا کرد بر شہریار،

غوری نے لڑکی کو اس کے باپ کا ملک اس شرط پر بخش دیا، کہ گوالیار کے قلعہ کے اندر کفار کے آئین ورسم مٹا کر ایک مسجد بنا دیجائے، جو لڑکی نے منظور کیا، مگر یہ قصہ محض افسانہ ہے، جس کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں،

قطب الدین اور محمد غوری کے خوشگوار تعلقات کو ظاہر کرنے کے لئے عصامی نے ایک عجیب و غریب قصہ لکھا ہے، قطب الدین ایبک جب میرٹھ، دہلی، کتھیرہ (؟) فتح کر چکا، تو دو سال کے بعد اسکے سپاہیوں نے سرکشی کی، اور غوری کے پاس یہ مخبری کی کہ ایبک غرور میں اپنے سے کسی کو بہتر نہیں سمجھتا ہے، بادشاہ نے بدگمان ہو کر بطور امتحان ایک قاصد کے معرفت اپنے یہاں بلا بھیجا، ایبک التتمش کو دہلی میں چھوڑ کر ایک لشکر کے ساتھ غزنیں روانہ ہو گیا، راستہ میں اہرن وارہ فتح کرتا ہوا غزنیں پہونچا، غزنیں سے باہر اپنی فوج کو چھوڑ کر تنہا شہر میں داخل ہوا، وہ پہلے بادشاہ کے وزیر کے گھر گیا، پھر وزیر کے ساتھ بادشاہ کے پاس آیا، اسکی اطاعت و نیازمندی سے بادشاہ اس قدر خوش ہوا کہ

ہمہ شب شہ و ایبک نامور بگفتند احوال با یک دگر،

اس کے بعد عصامی لکھتا ہے،

چو شد روز گفت آن شہ نیک بخت بہ ایبک کہ گردد نہان زیر تخت

خود آنگاہ ہم اول بامداد برآن تخت با خورمی بار داد

طلب کرد آن قوم روباہ فن کہ گفتند در باب ایبک سخن

شنیدم چو آن زمرۂ نابکار رسیدند پیش شہ کامگار

بد ایشان بگفت آن شہ ہوشمند کہ اے زمرۂ نابکار و نژند

چہ گوئید در باب ایبک کنون	دہید از سر راستی خط بخون
کہ گر ایبک آید بر ایوان ما	نتابد سر از حکم و فرمان ما
برد خون ہر یک ہبا و ہدر	در آرید ہر یک درین شرط سر
چو آن قوم از شاہ روشن ضمیر	شنیدند و دادند خط ناگزیر
وزان پس بگفت آن شہ نیک بخت	کہ ایبک برون آید از زیر تخت
بفرمان شہ ایبک آمد برون	دعا و ثنا گفت شہ را فزون
بصد عذر بنہاد سر بر زمیں	بدیدند اہل یسار و یمیں

سلطان غوری قطب الدین ایبک کے بدخواہوں کو قتل کر دینا چاہتا تھا، مگر ایبک کی وساطت سے ان کی جان بخشی کی گئی، دوسرے دن ایبک اپنی فوج لیکر غزنین میں داخل ہوا، جہان بادشاہ کے حکم سے بہت ہی تزک و احتشام کے ساتھ اس کا استقبال کیا گیا،

معلوم نہیں یہ قصہ عصامی کو کہاں سے معلوم ہوا، معاصر تاریخوں میں طبقات ناصری کے مصنف نے التمش کے ذکر میں سرسری طور پر لکھا ہے، کہ

"سلطان قطب الدین از غزو نہروالہ و فتح گجرات با ملک نصیر الدین حسین بغزنین رفت"

(صفحہ ۱۶۰)

البتہ تاج المآثر میں ہے، کہ سلطان غوری نے جب قطب الدین کی فتوحات کا حال سنا تو وہ اس کو دیکھنے کا مشتاق ہوا، اور غزنی بلایا، قطب الدین شاہی فرمان پاتے ہی غزنی روانہ ہوگیا، غزنی پہونچا، تو سلطان نے اسکی آمد میں جشن منایا، اور زر و جواہر، خلعت اسلحہ اور غلام عطا کرکے سرفراز کیا، مگر وہ فوراً بیمار پڑ گیا جس سے وہ شاہی اعزاز و اکرام سے لطف اندوز نہ ہوسکا، جب اچھا ہوا، تو ہندوستان آیا، سلطان نے رخصت کرتے وقت ہندوستان

کی سلطنت اسکو عطا کی، (ایلیٹ جلد دوم ص ۲۲۰-۲۱) بعد کے مورخوں میں فرشتہ نے بھی یہی لکھا ہے، اور عصامی کے قصہ کو بالکل نظرانداز کر دیا ہے،

قطب الدین ایبک کا ذکر فتوح السلاطین میں بہت ہی تشنہ ہے، اسکی حکومت کے احوال مین سے صرف یلدز سے اس کی لڑائی، اور اوس کی موت کا ذکر کیا گیا ہے، شمس الدین التمش کا ذکر ذرا تفصیل کے ساتھ ہے، التمش کا تلفظ کہین التتمش، اور کہیں اتمش ہے،

التمش کے بیان میں عصامی نے پہلے یلدوز کی جنگ کا حال لکھا ہے، اس کے بعد قباچہ سے لڑائی کا ذکر کرکے اس کے دریا میں ڈوب جانے کا واقعہ لکھ دیا ہے، مگر طبقات ناصری میں ہے، کہ التمش ۶۱۴ھ مین قباچہ سے دو لڑائیاں لڑا، اور ۶۲۵ھ میں وہ پھر اس سے برسرپیکار ہوا، اور اسی لڑائی میں قباچہ ڈوب کر مرا، عصامی نے التمش اور قباچہ کی تینون لڑائیوں کا علحدہ علحدہ ذکر کرنے کے بجائے ایک ہی لڑائی میں تمام لڑائیوں کے نتائج لکھدیئے ہیں، التمش کی بعض فتوحات کے ذکر میں عصامی نے ترتیب قائم نہیں رکھی ہے، مثلاً کالیور کی فتح (۶۲۹ھ) کو وہ رنتھنبور کی (۶۲۳ھ) کی تسخیر سے پہلے لکھتا ہے، بعض واقعات مثلاً التمش اور خوارزم شاہ کی جنگ (۶۱۵ھ) اور خلیفہ بغداد کی طرف سے خلعت کی آمد کو حذف کر دیا ہے، مگر بعض ایسی نئی باتیں بھی ہیں، جو طبقات ناصری میں نہیں ہیں، مثلاً التمش کے دربار میں سماع کے متعلق قاضی حمید الدین سے جو بحث ہوئی، اس کا ذکر منہاج سراج نے نہیں کیا ہے، لیکن فرشتہ (جلد اول ص ۶۶) اور نظام الدین بخشی (ص ۶۳ جلد اول) نے اپنی اپنی تاریخون میں اس کا حوالہ دیا ہے، حمید الدین ناگوری سے جن علمائے ظاہر نے بحث کی تھی، ان کا نام عصامی نے قاضی سعد و قاضی عماد لکھا ہے، لیکن نظام الدین بخشی اور فرشتہ ملا جلال لکھتے ہین،

اس زمانہ میں دہلی کی خوشحالی اور عروج کا ذکر عصامی نے بہت ہی والہانہ انداز میں کیا ہے، ؎

به دہلی چنان تخت گاہے بساخت | سپاہش دراقصای آن ملک تاخت
دران شہر یکے رونقے شد پدید | بلے لذتے باشد اندر جدید
بسے سیدان صحیح النسب | رسیدند در وے ز ملک عرب
بسے کاسبان خراساں زمین | بسے نقشبندان اقلیم چین
بسے عالمان بخارا نژاد | بسے زاہد و عابد از ہر بلاد
ز ہر ملک ہر جنس صنعت گران | ز ہر شہر ہر اصل سیمیں بران
بسے ناقدان جواہر شناس | جواہر فروشاں برون از قیاس
حکیمان یونان طبیبان روم | بسے اہل دانش ز ہر مرز و بوم
دراں شہر فرخندہ جمع آمدند | چو پروانہ بر نور شمع آمدند
یکے کعبۂ ہفت اقلیم شد | دیارش ہمہ دار اسلیم شد

عصامی نے رضیہ کے ذکر میں بہت سی نازیبا باتیں لکھی ہیں، رضیہ نے جس تدبر و سیاست اور فہم و فراست سے حکمرانی کی، اور سرکش امراء کی بغاوت کو فرو کیا، ان کو اس نے بالکل نظرانداز کر دیا ہے، اور اپنی شاعری کا سارا زور اس میں خرچ کیا ہے، کہ وہ حیا کو بالائے طاق رکھکر پردہ سے باہر نکلتی تھی، قبا و کلاہ زیب تن کرتی تھی، ہاتھی اور گھوڑے پر سوار ہوتی تھی، اور اسکے رکاب میں مرد رہا کرتے تھے، اسی سلسلہ میں لکھتا ہے،

شنیدم غلامے ز جنس حبش | بدے در سواری بر مرکبش
گرفتے بیک دست بازوے او | بداوے سواریش بے گفتگو
بدان مرد شاہ جہان را غلام | شہش کردہ بودہ است یاقوت نام
امیر آخرش شاہ و شہزادہ بود | بفرمان رضیہ رضا دادہ بود

چو ارکان دولت در آن روزگار | بدیدند گستاخیش آشکار
برند غیرت ازان ماجرا | بگفتند با یکدگر در جدا
کزین گونہ کین دیو در ملک جم | مسخر ترا مد زجملہ خدم
عجب نے کہ گر دست یابد گہے | پئے کفن خاتم بگیرد رہے
زنان جملہ در دام آہرمنند | بخلوت ہمہ کار شیطان کنند

منہاج سراج جو رضیہ کے عہد کا چشم دید مورخ ہے، یاقوت کی مذکورہ بالا جسارت کا ذکر مطلق نہیں کرتا ہے، حالانکہ اسکی تاریخ میں رضیہ کی بے پردگی اور شہسواری کا ذکر وضاحت سے موجود ہے، تاریخ مبارک شاہی میں بھی اسکی طرف کوئی اشارہ نہیں، مگر بعد کے مورخون نے شاید عصامی کی شاعرانہ اختراع ہی کو ماخذ بناکر اس واقعہ میں بہت کچھ رنگ آمیزی کی ہے،

عصامی کا بیان ہے، کہ رضیہ نے ملک لاطونیہ سے عقد کرنے کے بعد سلطان معزالدین سے ۶۳۸ھ میں دو مرتبہ جنگ کی، اور آخری بار میدان جنگ سے فرار ہوئی، تو کیتھل میں ہندوون نے اسکو مع لاطونیہ کے مار ڈالا، طبقات ناصری اور تاریخ مبارک شاہی میں ایک ہی لڑائی کا ذکر ہے، مگر فرشتہ اور نظام الدین بخشی عصامی کی طرح دو لڑائیون کا ذکر کرتے ہیں،

عصامی نے لکھا ہے، کہ رضیہ کے مقابلہ میں سلطان معزالدین نے دونوں مرتبہ بلبن کو بھیجا، بلبن سے مراد شاید ملک عزالدین بلبن کشلوخان ہے لیکن منہاج سراج نے صاف لکھدیا ہے کہ

در ماہ ربیع الاول سنہ ثمان و ثلثین و ستمائۃ سلطان معزالدین لشکر دہلی بدفع ایشان برد، وسلطان رضیہ والتونیہ منہزم شدند"

اس واضح تحریر کے بعد عصامی کا بیان قابل ترجیح نہیں ہو سکتا ہے،

"باقی"

تلخیص و تبصرہ

سرہند مین پٹھانون کے مقبرے

مندرجۂ بالا عنوان سے ڈاکٹر اج۔ گوئٹز (H. Goetz) کا ایک مقالہ جولائی ۳۹ ئمہ کے اسلامک کلچر حیدر آباد میں شائع ہوا ہے، اسکی تلخیص ذیل میں درج ہے،

سرہند ہندوستان کا ایک اہم تاریخی قصبہ ہے، فیروز شاہ نے اسکو ضلع کا صدر مقام بنایا تھا، بابر جب پانی پت کی جنگ کیلئے جارہا تھا، تو یہان ٹھہرا تھا، ہمایون نے اسی جگہ سکندر شاہ سور کو ۱۵۵۵ء مین شکست دیکر کھوئی ہوئی سلطنت حاصل کی، بہادر شاہ اول کے زمانہ مین گورو گوبند سنگھ کی بیوی اور بچے یہیں تہ تیغ کئے گئے، مگر جب سکھون کا اقتدار ہوا، تو اس قصبہ کو انھون نے انتقاماً لوٹ کر ویران کر دیا،

اب وہان مغل سلاطین کے محل کا ایک باغ، سادھنا قصائی کی مسجد اور ایک مغل امیر ضلابت جنگ کا محل جہاز گڑھ باقی رہ گیا ہی، ان کے علاوہ جابجا بنیادوں کی اینٹیں پڑی ہیں، جو اس قصبہ کی گذشتہ عظمت کی یاد دلاتی ہیں، سکھوں اور مسلمانوں کے لئے یہ قصبہ ایک مقدس مقام ہی، سکھوں نے گرو گوبند کے اہل وعیال کی یادگار میں یہان ایک گوردوارا بنوایا ہے، جہان وہ اظہار عقیدت کیلئے آتے رہتے ہیں حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانیؒ کا مقبرہ ہے، اس مقبرہ کے احاطہ میں نہ صرف مجدد الف ثانیؒ کے اہل خاندان اور نقشبندی سلسلہ کے متوسلین مدفون

ہیں بلکہ شاہ زمان والی افغانستان بھی یہیں آسودہ خواب ہے، اس لئے یہ مقام مسلمانوں کی بھی زیارتگاہ ہے،

سرہند میں اور دوسرے مقبرے بھی ہیں، ہندوستانی آثار قدیمہ کے بانی جنرل الگزنڈر کنگھم نے اس مقام کا دوبار ۱۸۳۰ء اور ۱۸۶۳ء میں معائنہ کیا تھا، اور قدیم قصبہ سے ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر پیر میران کا ڈیرہ نامی گاؤں کے پاس بہت سے مقبرے دیکھے، ان میں سے دو مقبرے عام طور سے استاد و شاگرد کے نام سے مشہور تھے، ایک چھوٹا مقبرہ پیر بندی نقش والا کے نام سے منسوب تھا، یہ نام شاید پیر نقشبندی کی خرابی ہو، اس مقبرہ کی طرف کنگھم نے خاص توجہ کی، یہ ہشت پہل تھا، اسکی محرابیں کھلی ہوئی تھیں، اور اس کا گنبد ناشپاتی نما تھا جس سے مغل طرز تعمیر نمایاں ہوتا تھا، اسکے تمام حصوں میں پھولوں کی نقاشی تھی، گنبد کھپریل کا تھا جسکی ترتیب اس طرح رکھی گئی تھی، کہ جابجا گہری نیلی لکیریں ابھری ہوئی معلوم ہوں، ان لکیروں کے بیچ میں زرد اور سبز کھپریل مچھلی کے کانٹے کی طرح بچھائی گئی تھی، کنگھم نے تین مقبرے اور دیکھے ان میں سے ایک سکندر کی لڑکی ذوالقرنین (جو مقامی پیر میراں کی بیوی تھی) اور دو حج النسا اور تاج النساء کی طرف منسوب تھے، کنگھم کو ان مقبروں کے متعلق صحیح اور مستند معلومات حاصل نہ ہو سکے تھے، چنانچہ جس مقبرہ کو اس نے سکندر کی لڑکی کی طرف منسوب کیا ہے، وہ دراصل بہلول لودی کی لڑکی کا ہے، اسکی تحقیق ۱۸۸۸ء میں پنجاب کے محکمۂ آثار قدیمہ کے افسر جے، راجرز نے کی، اسکو پیر میران کا ڈیرۂ کے مقبرے میں ایک کتبہ ملا، اس سے یہ معلوم ہوا، کہ یہ سلطان بہلول لودی کی لڑکی بیجان کا مقبرہ ہے، جو ۱۱ر صفر ۹۰۱ھ کو فوت ہوئی، اور یہ مقبرہ سکندر لودی کے زمانہ ۹۰۲ھ میں تعمیر ہوا،

ان میں پیر نقشبندی والا حسین مقبرہ بالکل منہدم ہو گیا ہے لیکن اور دوسرے مقبرے

ابھی محفوظ ہیں، یہ عمارتیں آرٹ اور تعمیرات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اہم ہیں، کہ یہ ہندی اسلامی آرٹ کے ایک غیر معروف عہد کی یادگار ہیں، اور آخری تغلق، لودی، اور نو وارد مغلوں کے طرز تعمیر کی کھوئی ہوئی کڑیاں ہیں، استاد خوجا (خواجہ) خان کے مقبروں کی دیواروں کی نقاشی اور مصوری کے اعلیٰ نمونے ہندی اسلامی نقاشی کے مطالعہ کیلئے بہت مفید ہیں،

سلطان بہلول لودی کی لڑکی سجان کے مقبرہ کے سوا باقی اور مقبرے سرخ اینٹوں کے بنے ہوئے ہیں، ان میں سب سے قدیم حج النسار اور تاج النسار کے مقبرے ہیں، یہ اپنے طرز کے لحاظ سے فیروز شاہ کے مقبرے سے مشابہ ہیں، مگر ان میں سے ایک کی بیرونی آرایش تغلق شاہ کے مقبرے کی آرایش سے ملتی جلتی ہے، اس کے گنبد کسی قدر نکیلے ہیں، دیواروں کی ڈھال فیروز شاہ کے مقبرے سے بھی کم ہے، دروازوں کے سامنے پشتے ہیں، جو پندرہویں صدی کے طرز تعمیر کا گویا پیش خیمہ تھے،

ان عمارتوں میں ایران کے ایلخانی حکمرانوں اور مصر کے مملوک فرمانرواؤں کے مقبروں کے بھی اثرات ہیں، مقبروں کے اندرونی حصوں کے تعویذ غیر معمولی بلند ہیں، جو التمش کی قبر سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہیں، ان تعویذوں کے اوپر ایک محراب ہے جس میں ایک چھوٹی مربع کھڑکی ہے، محراب میں پلاسٹر سے خوبصورت تختیاں بنائی گئی ہیں، یہ اور گوشہ کی محرابی چھتیں جو برجیوں تک پھیلی ہوئی ہیں، لکڑی کی کمان پر واقع ہیں، محراب سے متصل کھڑکی کی کمان گھوڑے کی نعل کی طرح ہے، جو لودی اور سوری طرز تعمیر کا نمونہ ہے، مقبرہ کی جالیاں سادہ مگر حسین ہیں، یہ اینٹ سے ستاروں کی شکل کی بنائی گئی ہیں، ان میں بکثرت حاشیے ہیں،

ان دونوں مقبروں کے پاس ایک دوسرا دو منزلہ مقبرہ ہے، یہ پندرہویں صدی اور شاہان بہمنی کے مقبروں کے طرز کا نمونہ معلوم ہوتا ہے، اور کسی حد تک گلبرگہ کے "ڈاکو کے مقبرہ"

سے مشابہ ہے، جو اشتر (بیدر) کے مقبروں اور گولکنڈہ میں ابراہیم قلی قطب شاہ کے مقبرے کی درمیانی کڑی ہے،

سرہند کے اس مقبرہ کی دیواریں ڈھلوان ہیں، اس کے چاروں گوشوں پر مرکزی گنبد کے اردگرد گلبرگہ کی وضع کی مستحکم شہ نشینیں بنی ہوئی ہیں، مگر اس میں اور سرہند کے کسی دوسرے مقبرہ میں وہ دو منزلہ طاقچے نہیں ہیں، جو دکنی عمارتوں میں عام طور سے پائے جاتے ہیں، اس کے سامنے خلجی روایات کے مطابق برساتیاں ہیں، اس کی دیواریں نیلی کھپریل کی گگریوں (Cresting) سے آراستہ ہیں، یہ گگریاں چھجوں، گنبدوں، شہ نشینوں اور پشتوں میں ہر جگہ نظر آتی ہیں، علٰحدہ علٰحدہ کھپریل کا طرز مانڈوا ور جونپور کی عمارتوں اور دہلی کے لودی کے مقبروں میں عام طور سے پایا جاتا ہے،

اس مقبرہ کے اندرونی حصہ کا انحصار مرصع محرابوں اور طاقچوں پر ہے، اسکی دیواروں کی محرابیں گھوڑوں کی نعل کی جیسی ہیں، اس کے چھوٹے طاقچوں میں جوف، کجی، اور چوٹیاں ہیں جو آگے چل کر، مانڈو، گلبرگہ کی بڑی مسجد، دتیا، اور چھا اور بھان گڑھ کی راجپوت عمارتوں میں عام طور سے پائی جاتی ہیں، ان کے نمونے شاہجہاں کے عہد کی چوٹی دار محرابوں میں بھی دکھائی دیتے ہیں،

سلطان بہلول کی لڑکی سبحان کا مقبرہ گہرے خاکستری پتھروں کا بنا ہوا ہے، جو کسی مندر سے اکھاڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، اس کا طرز تعمیر لودیوں اور سرہند کے مذکورہ بالا مقبروں سے بالکل جدا ہے،

استاد و شاگرد کے مقبرے (جن کے نام علی الترتیب سید خاں پٹھان اور خوجا خاں تھے) سب سے آخر میں بنائے گئے ہیں، ان کے سامنے کے حصے اور مختلف برساتیاں تیمور کی ترکستانی

عمارتوں اور ہندوستانی مغلوں کے طرز تعمیر سے مشابہ ہیں، لیکن ان کے گنبدوں کی کجی میں لودی آرٹ اور چھتوں کی شہ نشینوں میں پندرہویں صدی کا طرز نمایاں ہے، اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ یہ لودی عہد میں بنا تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پندرہویں صدی کا ترکستانی طرز بابر کے حملہ سے پہلے ہی ہندوستان میں رائج ہوگیا تھا، یا ممکن ہے کہ یہ تعمیر مغلوں کے ابتدائی دور حکومت کی ہو، ہمایوں نے سکندر سور کے خلاف سرہند میں جنگ کی تھی، اس سے گمان ہو سکتا ہے کہ شاید اسکے بعض مقتول ساتھی ان مقبروں میں دفن ہوں ان مقبروں کی برجیاں اور شہ نشینیں لودی طرز کی ہیں، جو شاید مقامی روایات کے مطابق بنادی گئی ہوں، لیکن ان کے گنبد اور بالائی لائین کی وضع، الور کے فتح جنگ کے مقبرہ (۱۵۴۷ء) سے ملتی جلتی ہے، گو الور کی پہلی تین منزلیں اور ان کی گیلریاں دکنی طرز تعمیر سے مشابہ ہیں، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسکی اور دہلی اور سرہند کے مقبروں کی تعمیر کے درمیانی زمانہ میں فن تعمیرات میں بہت سے تغیرات ہوئے، اسلئے زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ سرہند کے مذکورۂ بالا مقبرے مغلوں کی حکومت کے شروع ہونے سے پہلے تعمیر ہوئے

ان مقبروں میں سے ایک کی دیواروں پر مصوری کا اعلیٰ نمونہ ہے، پھولوں کے درمیان سرو اور دوسرے درخت اُگے ہوئے ہیں، اور اوپر ہوا میں بادل متحرک ہیں، یہ طرز تو تیموری ہے لیکن اس میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور مٹی کے تودوں میں سے پودے بھی اُگے نظر آتے ہیں، جو جامع التواریخ مصنفہ رشید الدین (۱۳۰۶ء-۱۳۱۴ء) کی مصوری اور نقاشی سے ملتے جلتے ہیں، ممکن ہے کہ ایلخانی آرٹ کی بعض خصوصیات پنجاب میں رائج ہوگئی ہوں، مگر اس آرٹ کا طرز مذکورۂ بالا تصویروں کے غیر اہم حصوں میں ہی، ورنہ مجموعی حیثیت سے یہ بابر یا ہمایوں کے کسی آرٹسٹ کے ہاتھ کی تصویر معلوم ہوتی ہے، اور اگر یہ واقعی بابر کے عہد کی ہے، تو یہ مسلمانوں کی مصوری کا قدیم ترین نمونہ ہے،

"ص،ع"

ایک قیمتی تعیش

ستر فی صدی اشخاص عصبی المزاجی کے مرض میں مبتلا ہیں، اگرچہ اس مرض کو کوئی شخص پسند نہیں کرتا، لیکن اسکے بہت کم مریض ایسے ہیں، جو اس سے نجات پانا چاہتے ہیں، وہ اس مرض کا ازالہ تو ضرور چاہتے ہیں، لیکن اس کی جو تدبیریں ان کو بتائی جاتی ہیں، وہ ان پر عمل کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، حالانکہ یہی ایک ایسا مرض ہے، جس سے جسم کے سارے نظام میں بے ترتیبی، قلب کی حرکتوں میں انتشار، ہاضمہ میں فتور، اور دماغی سکون میں اختلال پیدا ہو جاتا ہے، اسکے مریض یا تو کام کرنے سے دل چراتے ہیں، یا ضرورت سے زیادہ عجلت کے ساتھ کام کرتے رہتے ہیں، ان کا مزاج چڑچڑا ہو جاتا ہے، اور وہ دوسروں کو مشکل سے خوش کر سکتے ہیں، مگر خود انکی مدد اور ہمدردی کے محتاج ہوتے ہیں،

عصبی المزاجی کا سبب مستقل ذہنی تشویش اور فکر ہے، یہ تشویش اور فکر محض ایک خیالی شہرت اور نیکنامی کو برقرار رکھنے کے لئے ہوتی ہے،

عصبی المزاج اشخاص کے دل میں بچپن سے یہ خیال کسی صورت سے پیدا ہو جاتا ہے کہ ان کی ذات دوسروں کی ذات سے مختلف ہے، وہ اپنے والدین کی غیر معمولی محبت اور شفقت کی وجہ سے یہ محسوس کرنے لگتے ہیں، کہ وہ دوسرے بچوں کے بہ نسبت زیادہ محبوب، معزز اور قابلِ توجہ ہیں، یا اسکے برعکس بزرگوں کی جھڑکی اور غفلت سے ان کے دماغ میں یہ بیٹھ جاتا ہے، کہ وہ نسبۃً کمزور، بیوقوف، احمق اور ناقابلِ توجہ ہیں، اور جب وہ سنِ بلوغ کو پہونچتے ہیں، تب بھی ان کے دل اور دماغ پر اسی قسم کے جذبات اور خیالات چھائے رہتے ہیں، اور جب وہ کوئی کام شروع کرتے ہیں، تو اپنی خیالی برتری کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے

ہیں، یا کم از کم ان کی یہ کوشش ہوتی ہے، کہ کام کے انجام دینے میں ان کی خیالی کمتری اور پستی کا اظہار نہ ہونے پائے،

ان دونوں حالتوں میں فکر و تشویش اس کو دامنگیر رہتی ہے، جس سے ان کو نہ ذہنی سکون میسر ہوتا ہے، اور نہ قلبی اطمینان، بلکہ ان کا سارا عصبی نظام پراگندہ رہتا ہے، اگر غور کیا جائے، تو دونوں حالتوں میں عصبی المزاج مریض اپنی غلط قسم کی عزت نفس کی حفاظت کرنا چاہتا ہے، اس کے لئے وہ عصبی المزاجی کی تمام تکلیفوں اور زحمتوں کو برداشت کرتا ہے لیکن اپنی عزت نفس پر حرف گیری پسند نہیں کر سکتا ہے یہ کتنا قیمتی اور مسرفانہ تعیش ہے!!

مگر یہ تعیش لا علاج نہیں ہے، اسکے عادی پر یہ خیال مسلط رہتا ہے، کہ وہ دوسرے لوگوں کی طرح غلطی نہیں کر سکتا، وہ کسی کا محتاج نہیں ہے، بلکہ لوگ خود اسکے محتاج ہیں، وہ اس قسم کے توہمات کا قصداً شکار نہیں ہوتا، بلکہ اپنی طبیعت سے مجبور ہوتا ہے، اس میں وہ تغیر اسی وقت پیدا کر سکتا ہے، جب اس کو اسکی گذشتہ زندگی کے واقعات بتا کر یہ دکھایا جائے، کہ اس قسم کا مہلک خیال اس میں کس طرح اور کیونکر پیدا ہوا، اس طرح رفتہ رفتہ وہ اپنے خیالات کے اسباب و علل پر خود غور کرنے لگے گا، اور جب وہ غور کرنے لگے تو پھر اسکو یہ بتانا چاہئے کہ ایک غلط قسم کی عزت نفس کو برقرار رکھنے کی فکر، تشویش بے اطمینانی، اور تکلیف بہتر ہے یا صحیح قسم کی خودداری، خود اعتمادی، آزادی، ہمت اور صحت،

"ص ع"

اخبار علمیہ

زہرہ مین آبادی

تمام سیارون میں زمین سے قریب ترین سیارہ زہرہ ہے، زمین سے اسکی مسافت ۲۶ لاکھ میل ہے، اسکی زیادہ سے زیادہ دوری ۱۲۶ لاکھ میل تک ہوجاتی ہے، یہ اپنے حجم اور وزن میں زمین ہی کے برابر ہے، اور اس میں زمین ہی کی طرح فضا ہے جس کا عینی مشاہدہ بھی کیا گیا ہے جب زہرہ زمین اور آفتاب کے درمیان سے ہو کر گذرتا ہے، تو آفتاب کے سامنے ایک تاریک داغ کی شکل میں متحرک نظر آتا ہے، اور جب قرص آفتاب میں داخل ہوتا ہے، یا اس کو چھوڑتا ہے تو اسکے کنارہ کے ان حصون میں جو آفتاب سے باہر ہوتے ہیں، روشنی اور چمک نظر آتی ہے، اور اسی وقت ہوتا ہے، جب زہرہ کی فضا سے روشنی پھیلتی ہے، زہرہ آفتاب سے ماورا ہمیشہ نہیں گذرتا ہے، پہلی بار ۱۸۷۴ء میں گذرتا ہوا دکھائی دیا تھا، پھر ۱۸۸۲ء میں اس کا مشاہدہ کیا گیا، لیکن اب وہ ۸ جون ۲۰۰۴ء اور اسکے بعد ۶ جون ۲۰۱۲ء میں گزرے گا،

ماہرین ہیئت کا خیال ہے، کہ زہرہ میں بھی اس دنیا کی طرح براعظم، سمندر، دریا اور پہاڑ ہیں، انھوں نے دوربینوں کو ذریعہ ان چیزون کو دیکھنے کی کوشش کی ہے، لیکن اب تک صرف دھندلے نشانات نظر آئے ہیں، علماے ہیئت کی رائے ہے، کہ زہرہ کے سامنے بادلون کی اتنی ضخیم تہ در تہ ہے، کہ اسکی آبادی کو دیکھنا آسان نہیں، پھر بھی وہاں کی بعض چیزون کے متعلق معلومات حاصل کئے گئے ہیں، مثلاً زہرہ کا ایک دن اس دنیا کے چار ہفتے کے برابر ہوتا ہے

جسکے معنی یہ ہیں، کہ وہاں سال میں صرف بارہ یا تیرہ دن ہوتے ہیں، زہرہ کی عمومی حرارت کا بھی اندازہ لگایا گیا ہے جب یہ آفتاب کے سامنے سے گذرتا ہے، تو اسکی حرارت ۸۰ یا ۹۰ ڈگری اور اسکے تاریک داغ کی حرارت نقطۂ انجماد سے ۴۰ ڈگری کم ہوتی ہے، اتنی حرارت میں وہاں کسی آبادی کا ہونا ناممکن نہیں، زہرہ میں کاربن ڈی اکسائڈ کی کثرت ہے لیکن آکسیجن کا پتہ نہیں چلتا ہے اگر ہو بھی تو بہت ہی تھوڑی مقدار میں ہے، آکسیجن کی کمی کی وجہ سے بعض ماہرین ہیئت کا خیال ہے کہ اگر زہرہ میں آبادی ہے تو یہ اپنی اسی ابتدائی منزل میں ہے جس میں موجودہ دنیا کی آبادی لاکھوں برس پہلے تھی

جذبات اور دانت

دماغ کے علاج کے ماہر الگزنڈر ریڈ مارٹن نے مان ہاتن (امریکہ) کے ماہرین دندان کی ایک مجلس میں تقریر کرتے ہوے کہا کہ اگر بچے دانت سے جھنجھنا کاٹنے کی کوشش کرتے ہیں، یا کھلونے کو چباتے رہتے ہیں، یا کاغذ اور لکڑی کو کترتے ہیں، تو اس سے ان کو کوئی ضرر نہیں پہونچتا، جو والدین اپنے بچوں کو ان حرکتوں سے باز رکھتے ہیں، وہ نہ صرف بچوں کے جبڑوں کو نقصان پہونچاتے ہیں، بلکہ ان کی شخصیت اور انفرادیت کے نشو و نما میں بھی مزاحم ہوتے ہیں، بچوں کو مسرت و رنج کا احساس، اشتہا، اور آسودگی کی تسکین سب سے پہلے منہ کے ذریعہ سے ہوتی ہے، اسلئے ان کو منہ اور دانت کی حرکتوں میں پوری آزادی حاصل ہونی چاہئے،

ماں کے اندرونی جذبات کا رد عمل بچوں کے دانتوں پر لازمی طور سے ہوتا ہے، جو عورتیں ایام حمل میں متردد، متفکر اور کبیدہ خاطر رہتی ہیں، ان کو بچوں کے دانت کے لئے کیلشیم (چونا) فاسفورس اور حیاتین استعمال کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن بچے کی پیدایش کے بعد ان کو اپنے جذبات کے توازن کو قائم رکھنا چاہئے، بچوں کو غیر معمولی ناز و نعمت سے رکھنے میں ان کے دانت

مضبوط اور سخت نہیں ہونے پاتے، اسکیمو اپنے بچوں کو زیادہ احتیاط سے نہیں رکھتے، چنانچہ وہ سوکھے چمڑے بھی چباتے رہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے، کہ ان کے دانت آخر عمر تک خراب نہیں ہوتے ہیں،

بچوں پر سختی کرنے سے بھی ان کے دانت پر اثر پڑتا ہے، تندی اور جھڑکی سے وہ مشتعل اور عصبی المزاج ہو کر دانت پیستے ہیں جن سے ان کے جبڑے کمزور ہوجاتے ہیں، جو بچے کس مپرسی اور تنہائی میں رہتے ہیں، وہ بعض اوقات غیر معمولی طور سے مٹھائی کے لالچی ہوتے ہیں، شاید مٹھائی کھا کر اپنی زندگی کی مٹھاس کی کمی کو پورا کرنا چاہتے ہیں،

سیاروں کے ساتھ انسان کی گردش

بیان کیا جاتا ہے، کہ جب زمین خطِ مستقیم کے گرد گھومتی ہے، تو قطب شمالی اور خطِ استوار کے بیچ کے بسنے والے انسان ایک گھنٹہ میں زمین کے ساتھ ۰۰ میل کا چکر کرتے ہیں، آفتاب کے گرد زمین کی حرکت سے ایک آدمی ایک سال میں دو سو کرور میل کی مسافت یعنی ایک سکنڈ میں ۱۰ میل طے کرتا ہے، نظام شمسی کی حرکت سے ایک آدمی Vega (صورت شلیان کا روشن ترین ستارہ) کی طرف ایک سکنڈ میں ۱۲ میل متحرک ہوتا ہے، اسی طرح کہکشاں کی سمت وہ ایک سکنڈ میں ۰۰ میل جاتا ہے،

حال ہی میں کلیفورنیا کے ایک مشہور سائنس داں نے دس سال کی محنت کے بعد یہ تحقیق کی ہے، کہ کہکشاں (Milky Way) دوسری کہکشاں (Draco) کی طرف ایک سکنڈ میں سو میل کی رفتار سے جارہی ہے،

"م ع"

باب التقریظ والانتقاد

رسائل اور اخبارات کے خاص نمبر

جوہر اقبال مرتبہ جناب محمد حسنین صاحب متعلم، بی اے، تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر مجلد قیمت مرقوم نہیں، پتہ مکتبہ جامعہ دہلی،

طلبائے جامعہ نے سر اقبال مرحوم کی یادگار میں رسالہ "جوہر" کا یہ خاص نمبر نکالا ہے، اس میں اقبال کی شاعری، انکی تعلیمات، ان کے سوانح اور ان کی بعض تصانیف پر متعدد ممتاز اہل قلم، اور طلبہ کے مفید مضامین ہیں، لکھنے والوں میں ڈاکٹر عابد حسین صاحب پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی، ڈاکٹر قاضی عبد الحمید صاحب، مولینا ابو الاعلیٰ مودودی، اور مولینا سعید احمد صاحب کے نام قابل ذکر ہیں، مضامین قریب قریب سب اچھے ہیں "عشق اور عقل اقبال کی شاعری میں "حیات اقبال کا سبق"، اقبال کی شخصیت اور اس کا پیغام" اقبال کا فلسفۂ زندگی، اور عمل" اور اقبال کا جذبہ مذہب" خاص طور سے پڑھنے کے لائق ہیں، طلبہ میں "اقبال کی تعلیم محمد عرفان صاحب" اقبال اور انسانیت" حسن سبحانی، "اقبال کی اردو شاعری پر ایک نظر" محمد حسنین صاحب اچھے مضامین ہیں، اردو کے اقبال نمبر کے بعد یہ نمبر اقبال کی شاعری کی مختلف حیثیتوں پر اچھا تبصرہ ہے،

کرسینٹ فروغ اردو نمبر، مرتبہ عبد السلام صاحب خورشید تقطیع بڑی ضخامت ۱۴۴ صفحے کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت مرقوم نہیں، پتہ :- اسلامیہ کالج لاہور،

بزم فروغ اردو کے نام سے اسلامیہ کالج لاہور کے طلبہ کی ایک ادبی انجمن ہے جس میں مختلف موضوعوں پر مقالات پڑھے جاتے ہیں، اور غالباً ان کا مجموعہ شائع کیا جاتا ہے، کالج میگزین (کریسنٹ) کا یہ نمبر ان مقالات کا تیسرا مجموعہ ہے، اس میں نو مقالات ہیں، "دور مغلیہ میں لاہور کے مدارس" شجاع الدین صاحب، "کانگریس پر ایک مورخانہ نظر" محمد یونس صاحب، "اقبال اور عصر حاضر کی سیاسی تحریکات" عبد السلام صاحب خورشید، "اردو تغزل میں اصلاح" غلام جیلانی صاحب "کوہ نور ہیرے کی داستان" عبد الصمد صاحب، "پاکستان" جہانگیر "اسلامی تمدن اور قیام امن" حمید عاجز، "اردو قصیدہ کی نشو و نما" غلام رسول صدیقی "مولینا ظفر علی خان کی طنزیہ شاعری" تابش صدیقی، یہ دیکھ کر مسرت ہوئی، کہ اسلامیہ کالج کے طلبہ کا مذاق ستھرا ہے، اور آج کل کے نوجوانون کی طرح ان کی ادبی مشق ادب و افسانے پر ضائع نہیں ہوتی، بلکہ وہ سنجیدہ اور مفید موضوعون پر بھی غور و فکر کرتے ہیں، طلبہ کی استعداد کو دیکھتے ہوئے، یہ سب مضامین خاصے ہیں خصوصاً پہلا مضمون بہت اچھا ہے، پاکستان کا تخیل کیسا ہی ہو لیکن اس پر جغرافی حیثیت سے دلچسپ بحث کی گئی ہے، اردو قصائد کا مضمون بھی مفید ہے،

ہمدرد صحت ضبط تولید و اصلاح نسل نمبر | مرتبہ حکیم حاجی عبد الحمید صاحب دہلوی تقطیع بڑی، ضخامت ۲۲۲ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر،

قیمت باختلاف کاغذ ۱۲ اور ۱۰ ار، پتہ:- ہمدرد منزل لال کنوان دہلی،

حکیم عبد الحمید صاحب دہلوی اہم طبی مسائل پر اپنے رسالہ ہمدرد صحت کے مفید نمبر نکالا کرتے ہیں، اس سے پہلے وہ مختلف مسائل پر متعدد نمبر نکال چکے ہیں، یہ نمبر جو درحقیقت پوری کتاب ہے موجودہ دور کے ایک اہم اور عالمگیر مسئلہ "ضبط تولید و اصلاح نسل" پر ہے، ضبط تولید (برتھ کنٹرول) کی دو حیثیتیں ہیں، ایک تو محض تعیش، اور اخفاے جرم کیلئے جو آج کل یورپ میں رائج

یہ نہ صرف مذہب بلکہ اخلاق، انسانیت اور منشائے تخلیق کے خلاف ہے، اور اب خود یورپ میں اسکے خلاف آوازیں بلند ہونے لگی ہیں، لیکن بعض خاص حالات مثلاً بیماریوں کی صورت میں وہ کبھی مناسب ہوجاتا ہے، اور اس صورت میں مذہباً بھی اس میں کوئی قباحت نہیں، اس لحاظ سے یہ نمبر اس اہم مسئلہ پر نہایت مفید ہے، اس میں تاریخی، علمی، اقتصادی، طبی، مذہبی مختلف نقطۂ نظر سے اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر مبسوط و محققانہ مضامین فراہم کئے گئے ہیں، اس مختصر ریویو میں اسکی تفصیل کی گنجایش نہیں، اسکے ابواب سے ان بحثوں کا سرسری اندازہ ہوجائے گا، اس میں گیارہ باب ہیں، ضبط[۱] تولید تاریخ کی روشنی میں، استقرار[۲] حمل، منع حمل[۳] کے ذرائع، اسکے مجربات[۴]، ضبط تولید[۵] کی تحریک مختلف ممالک میں، ضبط تولید[۶] اور معاشیات، ضبط[۷] تولید و نفسیات علم، اصلاح نسل، متفرقات[۹]، ضبط تولید[۱۰] و مذاہب عالم، ضبط[۱۱] تولید و اصلاح نسل، اور مشاہیر عالم، ادبیات[۱۲] ضبط تولید، تشریح[۱۳] اعضائے تولید، بعض بعض ابواب میں کئی کئی فصلیں ہیں، ہر باب میں اسکے متعلقہ موضوع پر نامور یونانی اطبا اور ڈاکٹروں کے محققانہ مضامین ہیں، جن میں بعض یورپ کے مشاہیر فن بھی ہیں، غرض اس نمبر میں اس مسئلہ کا کوئی پہلو چھوٹنے نہیں پایا ہے، ہر پہلو پر نہایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، فن سے متعلق اور ارباب فن کی متعدد تصویریں ہیں، اردو میں اس موضوع پر غالباً اس سے بہتر معلومات کا ذخیرہ نہیں مل سکتا، یہ نمبر عام لوگوں سے زیادہ اطبا کیلئے مفید ہے،

ادب لطیف سالنامہ، مرتبہ چودھری برکت علی صاحب و مرزا ادیب کی بی اے

تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۹ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت عہ پتہ سرکلر روڈ لاہور

ادب لطیف کا یہ سالنامہ حسب معمول ۳۹ئہ کے شروع میں نکلا تھا لیکن ہمارے پاس وقت سے نہ پہونچا تھا، اسلئے اب تک ریویو نہ ہوسکا، یہ سالنامہ اپنی تمام قدیم روایات کا حامل ہے، بلکہ افسانوں کے لحاظ سے گذشتہ نمبروں سے کچھ بڑھا ہی ہوا ہے، اس میں ہر ذوق کے

افسانے ہیں، اور بیشتر دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہیں، "افسانہ کیونکر بنتا ہے" پریم پجاری خود داری ڈاکٹر اعظم کریوی اُس نے کہا" مسعود جاوید" داغ معصیت" مسز شیخ عبدالقادر صاحب" ماں" مس احمد شجاع بہت اچھے افسانے ہیں "لکشمی کا سواگت" اوپندر ناتھ اشک" دفینہ" منشی پریم چند اور" زوال کینٹن" سبق آموز ہیں، "عدالت" نریندر ناتھ" میں کون ہوں" ناکارہ حیدر آبادی، اور "نئی روشنی" حکیم احمد شجاع تینوں افسانوں میں بہ ترتیب عدالتوں کے انصاف آجکل کے بے کار نوجوانوں اور مغرب زدہ لوگوں کا نہایت دلچسپ خاکہ اڑایا گیا ہے، حسب معمول صحرانورد کے دلچسپ خطوط کی ساتویں قسط بھی ہے، لیکن اب صحرانورد پر تکان کے آثار طاری ہیں، ذوقی چیز کے منصبی فرض بنجانیکا نتیجہ یہی ہوتا ہی بعض علمی و سنجیدہ مضامین بھی ہیں لیکن بہت معمولی درجہ کے ان میں بادشاہ حسین صاحب کا مضمون "ہندوستان کی حرفتی ناقابلیت" مفید ہے،

پیشوا میلاد نمبر، مرتبہ عزیز حسن صاحب بقائی تقطیع بڑی ضخامت ۱۳۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت معمولی قیمت ۸؍ پتہ:۔ دفتر پیشوا جامع مسجد دہلی،

جناب بقائی صاحب نے حسب معمول ولادت نبوی کی مبارک تقریب پر یہ نمبر نکالا ہے، اسکے ایک حصہ میں جناب آغا رفیق صاحب کے قلم سے پوری سیرت نبوی اور اخلاق نبوی کا مختصر ذکر ہے دوسرے حصہ میں مولوی محمد ادریس صاحب نے معاہدات و فرامین نبوی جمع کر دیئے ہیں، سیرت کے لحاظ سے یہ نمبر خاصہ ہی لیکن اس موضوع پر اردو میں ہر معیار کی اتنی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، کہ سیرت کے نمبروں سے کوئی خاص فائدہ نہیں، اسکے بجائے حیات طیبہ کے اور پہلوؤں اور اسلامی تعلیمات کو پیش کرنا زیادہ مفید ہوگا،

کہکشاں مسلم لیگ نمبر، مرتبہ جناب محمد صابر صاحب تقطیع اوسط ضخامت ۱۰۸ صفحے کاغذ کتابت وطباعت معمولی قیمت ۱؍ پتہ:۔ دفتر کہکشاں دہلی،

کہکشاں ادبی رسالہ ہے لیکن اس نمبر میں اس نے سیاست میں قدم رکھا ہے، اس میں کانگریس اور مسلم لیگ کے نزاعی امور میں لیگی نقطۂ نظر سے معمولی درجہ کے مضامین ہیں، اردو اور ہندی کے مسئلہ پر کئی مضمون ہیں، جن میں اسکے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، قابلِ ذکر مضامین میں وار دھا اسکیم پر تنقید، طلوعِ اسلام سے نقل کیا گیا ہے، ایک مضمون "ملعون کانگریسی تثلیث" کی تلخی ملعون کے لفظ سے ظاہر ہے، اس میں وار دھا اسکیم، مسلم ماس کانٹیکٹ اور ردتی اور سرمایہ داری کے مسائل پر توحید کی عینک سے تنقید کی گئی ہے، اس قبیل کے اور چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں،

عصمت سالگرہ نمبر، مرتبہ جناب رازق الخیری صاحب تقطیع اوسط ضخامت ۱۵۲ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مرقوم نہیں، پتہ:۔ دفتر عصمت، کوچۂ چیلان دہلی،

رازق الخیری صاحب نے حسب معمول عصمت کا یہ سالگرہ نمبر نکالا ہے، ابتدا میں گذشتہ سال کی مضمون نگار خواتین کے مضامین پر مفید تبصرہ ہے، اس سے ہماری تعلیم یافتہ خواتین کی علمی رفتار کا اندازہ ہوتا ہے، مضامین میں تنوع، معلومات اور دلچسپی ہر پہلو کا لحاظ رکھا گیا ہے، مذہبی، علمی، ادبی، تاریخی اور سیاسی ہر ذوق کے مضامین اور نسوانی مسائل پر مفید اور کارآمد معلومات ہیں، ڈاکٹر نصیر الدین صاحب کا مضمون "دنیا میں کیا ہو رہا ہے" تعلیم یافتہ خواتین کے مطالعہ کے لائق ہے، شایستہ اختر بانو صاحبہ کا مضمون "ٹلی کی سیر" دلچسپ بھی ہے، اور مفید بھی، "علامہ راشد الخیری کی ادبی حیثیتیں" بھی اچھا مضمون ہے، ادب و افسانے کا حصہ بھی دلچسپ ہے، "شیلا"، "مصلح"، اور "دراج ہنس" دلچسپ افسانے ہیں، خالص نسوانی موضوعوں پر بھی متعدد چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں، اشعار میں آیاتِ قرآنی کا ترجمہ، خواہ وہ ادبی لحاظ سے کتنا ہی کامیاب کیوں نہ ہو، پسندیدہ نہیں ہے، کہ قرآن نے خود اپنی جانب شاعری کی نسبت کی تردید کی ہے،

مدینہ جوبلی نمبر، مرتبہ جناب ابوسعید صاحب بزمی تقطیع بڑی ضخامت ۱۴۰ صفحے کاغذ معمولی، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مرقوم نہیں، پتہ:۔ بجنور، یوپی۔

اردو اخباروں میں مدینہ کو جو امتیاز حاصل ہے، اس سے اخبار بین طبقہ اچھی طرح واقف ہے، وہ چوتھائی صدی سے ایک روش پر ہمت و استقلال کیساتھ ملک و ملت کی مخلصانہ خدمات انجام دے رہا ہے، اس طویل مدت میں بڑے بڑے انقلاب و حوادث ہوئے، اس میں مدینہ کو بھی مختلف قسم کی آزمایشوں سے دوچار ہونا پڑا، لیکن کسی دور میں اس کا قدم نہیں ڈگمگایا، اس طویل مدت کی یادگار میں اس نے جوبلی نمبر نکالا ہے، اس کو ہندوستان کے عموماً اور مسلمانوں کے خصوصاً اہم مسائل اور موجودہ دور کے اہم مباحث اور افکار و خیالات اور ہندوستان سے متعلق مختلف قسم کے مفید معلومات کا مجموعہ بنانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے، چنانچہ زبان، تعلیم و تہذیب، معاشی اور سیاسی مسائل پر قدیم تاریخ و جدید خیالات دونوں نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے، موجودہ مسائل کے علاوہ متعدد تاریخی مضامین اور مختلف قسم کے معلومات ہیں، لکھنے والوں میں ہر خیال کے ممتاز لوگوں کے نام ہیں، مولینا سید سلیمان ندوی، مولینا اسلم جیراجپوری، ڈاکٹر سپرو، ڈاکٹر محمود وزیر تعلیم بہار، قاضی عطاء اللہ وزیر تعلیم سرحد، ڈاکٹر اشرف، مولوی سید طفیل احمد صاحب، مولینا سید علی زینبی، اس طرح اس نمبر میں مضامین کے تنوع کیساتھ مختلف خیالات کے لوگوں کی ترجمانی ہے، عام دلچسپی کیلئے ادب اولٰی افسانے، اور فکاہات کی چاشنی بھی دیدی گئی ہے نظموں کا بھی وافر حصہ ہے، ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کے اسلامی آثار کے متعدد فوٹو ہیں، ان خوبیوں کے ساتھ بعض معمولی فروگذاشتیں بھی نظر آئیں، مثلاً ایک مضمون میں ہے خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کے خلاف ایک معمولی شخص ابی بن کعب نے یزید بن ثابت کی عدالت میں ایک شکایت پیش کی (ص ۱۱) حضرت ابی بن کعبؓ معمولی شخص نہیں، بلکہ بڑے مقتدر صحابی ہیں،

یزید بن ثابت نہیں، بلکہ زید بن ثابت ہے،

الامان شہید نمبر، مرتبہ جناب عبدالحمید شملوی، تقطیع اوسط، ضخامت ۰۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت معمولی قیمت ۴ر پتہ :- دفتر الامان دہلی،

عبدالحمید صاحب شملوی نے اخبار الامان کے بانی مولینا مظہر الدین مرحوم کی یادگار میں یہ نمبر نکالا ہے، اس میں مرحوم کے سوانح اُن کی سیرت، ان کے سیاسی و مذہبی خدمات پر مضامین اُن کے حادثہ کی تفصیلات، اور اسکے مختلف پہلوؤں پر مرحوم کے احباب و مخلصین کے تاثرات ہیں،

"م"

نئے رسالے

نیا ادب مرتبہ سبط حسن صاحب تقطیع چھوٹی، ضخامت ۰، صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت سالانہ سے رفی پرچہ ۴ر پتہ :- دفتر نیا ادب نظیر آباد لکھنؤ،

سوشلزم کے عقائد و خیالات سے بحث نہیں، لیکن اب یہ عقیدہ اتنا عالمگیر ہو رہا ہے، کہ دنیا کی فلاح اور اس کا امن وسکون سوشلزم سے وابستہ کیا جا رہا ہے، ہندوستان میں اس کے اثرات صرف سیاست تک محدود نہیں ہیں، بلکہ ادب و لٹریچر میں بھی اس ذہنی انقلاب کے آثار نمایاں ہیں، اور اس نے جدید خیالات و رجحانات کا ایک نیا لٹریچر پیدا کر دیا ہے، "نیا ادب" اسی کا ترجمان ہے، ہم کو یہ دیکھکر خوشی ہوئی، کہ اس رسالہ میں انتہا پسندی اور بے راہ روی یعنی اپنی ہر قدیم چیز سے بیزاری اور بے معنی انقلاب کی دعوت نہیں ہے، بلکہ وہ سنجیدگی اور متانت کے ساتھ اپنے خیالات کی اشاعت کرتا ہے، اس کے بیشتر مضامین اسی مقصد کے ماتحت ہوتے ہیں، ادبی لحاظ سے بھی اچھا رسالہ ہے، ادب وافسانہ کا حصہ دلچسپ ستھرا اور مفید ہوتا ہے، ہم نے اسکے جتنے نمبر دیکھے سب کو ادبی اعتبار سے بہتر پایا، "پرانے زمانہ کے لوگ" میں پرانے

بزرگوں کی اچھی مصوری کی گئی ہے، "آم کا پھل" میں دیہاتی زندگی کے واقعات کا ایک دلچسپ پہلو دکھایا گیا ہے، "امیر کا محل" مغرب زدہ بیوی، اور ترقی پسند خیالات کا اچھا نمونہ ہے، لکھنؤ کی آب و ہوا اچھے رسالون کیلئے کچھ زیادہ سازگار نہیں ہے، لیکن یہ رسالہ زندہ رکھنے کے لائق ہے،

انیس نسوان ۔ مرتبہ شیخ محمد اکرام صاحب بیرسٹرایٹ لا، تقطیع اوسط ضخامت ۴۰ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت سالانہ صہ معمولی اڈیشن سے رفی پرچہ ۸ر اور ۱۲ر

پتہ:۔ دفتر انیس نسوان دہلی،

ہماری عورتون نے قدیم اور جدید دونون تہذیبون کے اچھے اثرات کے مقابلہ مین اسکے بُرے اثرات زیادہ قبول کئے، پرانے زمانہ مین وہ عموماً جہل وجمود، لغو رسم ورواج اور وہم پرستی میں مبتلا رہین، اور اب نئی پود یورپ کی ظاہر فریب تہذیب کا شکار ہے، جس کا مشاہدہ اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانوں کی خواتین میں کیا جاسکتا ہے، شیخ محمد اکرام صاحب نے جو پرانے خدام ادب میں ہین، عورتوں کو اس وبا سے بچانے، ان میں صحیح مذہبی تعلیم، اور اسلامی اور مشرقی خیالات کی اشاعت اور ان کے جائز حقوق کی حفاظت کیلئے یہ رسالہ نکالا ہے، ہم نے اسکے چند نمبر دیکھے، اور ہر نمبر کو رسالہ کے مقاصد اور مضامین کے لحاظ سے بہتر پایا، تمام مضامین سنجیدہ، مفید، پراز معلومات اور صحیح اسلامی و مشرقی تعلیم و خیالات کا سبق ہوتے ہیں، ان میں علمی، ادبی، مذہبی، تاریخی، اصلاحی ہر طرح کے معلومات کا لحاظ رکھا جاتا ہے، ہر نمبر میں التزام کے ساتھ عورتوں سے متعلق کسی قرآنی تعلیم پر کوئی نہ کوئی مضمون ضرور ہوتا ہے، فاضل اڈیٹر کے مضامین خاص طور سے عورتوں کے پڑھنے کے لائق ہوتے ہیں، لکھنے والون میں بعض ممتاز اہل قلم کے نام نظر آئے، شیخ عبد القادر صاحب کا مضمون "اچھی گھروالی" پروفیسر جمیل واسطی صاحب کا "تہذیب مغرب کدھر جارہی ہے" اور شائستہ اختر بانو صاحبہ کا "انیس نسوان کا قابل تحسین خیر مقدم" مضامین خاص توجہ سے پڑھنے کے لائق ہین

کہ وہ تہذیب جدید کے مرکز لندن میں بیٹھ کر مشرقی نقطۂ نظر سے لکھے گئے ہیں، انیس ہر شریف خاتون کا ہمدم و ہمراز بنانے کے لائق ہے، رسالہ کے اڈیٹر شیخ اکرام صاحب ہمارے پرانے ادبی رفقاء میں ہیں، امید ہے کہ ان کی نگرانی میں یہ رسالہ پوری طرح کامیاب ہوگا،

چنگاری مرتبہ جناب سجاد ظہیر صاحب تقطیع بڑی، ضخامت ۴۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت معمولی، قیمت سالانہ ستے رہ ششماہی ۱؎۔ ۲۰ر، فی پرچہ ۴ر، پتہ ۱۰۔ محلہ بانس تراشان، سہارنپور،

انقلاب روس سے پہلے وہاں سوشلسٹ پارٹی کا ایک اخبار "اسکرا" (چنگاری) نکلتا تھا، اس نے انقلاب کا شعلہ بھڑکانے میں بڑی مدد دی، اسلئے ہندوستان کے سوشلسٹ نوجوانوں نے بھی یہ چنگاری سلگائی ہے، اتفاق سے اوسکی ادارت سجاد ظہیر صاحب کے ہاتھوں میں ہے جنھیں "انگارہ" دہکانے کا کافی تجربہ ہے، اسلئے امید ہے، کہ یہ چنگاری کسی دن شعلہ بن جائیگی انقلابی خیالات کی اشاعت اسکا مقصد ہے، اس مقصد کے مطابق اس کے تمام مضامین ہوتے ہیں، بین الاقوامی سیاست اور اسکے نتائج پر بحث اور سوشلسٹ نقطۂ نظر سے ہندوستان کی سیاست پر تبصرہ اس کا مفید اور کارآمد حصہ ہوتا ہے، سیاسی معلومات کے لئے اچھا رسالہ ہے،

سہیل مرتبہ حکیم ظ، کمال صاحب ندوی تقطیع اوسط ضخامت ۴۸ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت سالانہ سے ششماہی ۱۲ر، پتہ گھسیاری ٹولہ گیا، بہار،

بہار کی سرزمین اخبارات و رسائل کے لئے بہت شور واقع ہوئی ہے، لیکن اب اسمیں روئیدگی کی صلاحیت نظر آنے لگی ہے، اور ادبی پودے اگنے لگے ہیں، چنانچہ حال میں ایک نیا رسالہ سہیل گیا سے طلوع ہوا ہے، ہم نے اسکے کئی نمبر دیکھے، شروع کے نمبر ادبی لحاظ سے ابتدائی منزل میں تھے، مگر اب اس کا ہر قدم ترقی کی طرف بڑھ رہا ہے، زیادہ حصہ ادب اور

افسانے کا ہوتا ہے، کبھی کبھی کوئی اچھا اور مفید مضمون بھی نظر آجاتا ہے، لائق اڈیٹر کا مضمون "خواب وتعبیر خواب" مفید ہے زبان کی صحت کیجانب کم توجہ ہے، لیکن جیسا کہ اوسکی رفتار سے معلوم ہوتا ہے یہ خامیاں جلد دور ہو جائینگی، بہار سے یہ رسالہ بھی غنیمت ہے، اسلئے اردو زبان کے قدر دانوں کو اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے، تعجب ہے کہ پٹنہ کے اصحاب ادب جن پر اردو زبان کی خدمت کا بڑا حق ہے کیوں خاموش ہیں، معیار مرحوم کے بعد پھر وہاں سے کوئی قابل ذکر رسالہ نہ نکلا،

البیان مرتبہ جناب محمد حسین صاحب عرشی تقطیع بڑی ضخامت ۶۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت سالانہ سے رقی پرچہ ۴؍ پتہ:- دفتر امت مسلمہ امرتسر،

"بلاغ" امرتسر جماعت اہل قرآن کا مشہور رسالہ ہے، غالباً جماعت کے اندرونی اختلافات کے باعث اسکے سابق اڈیٹر و پبلشر ڈاکٹر علم الدین صاحب "امت مسلمہ" سے خارج کر دیئے گئے، اور اب ڈاکٹر صاحب اور بلاغ کی جگہ جناب محمد حسین صاحب اور البیان نے لی ہے، بلاغ کے مقاصد او خصوصیات معلوم و مشہور ہیں، البیان اسی کا مثنیٰ ہے، صرف نام بدل گیا ہے، باقی مقاصد اور مضامین کی نوعیت وہی ہے، اس جماعت کے علم و تحقیق کے نادر نمونے بلاغ میں اکثر نظر آیا کرتے تھے، البیان بھی اس میدان میں اس سے پیچھے رہنا نہیں چاہتا، چنانچہ فاضل اڈیٹر کا مضمون "ملت ابراہیم" اس کا دلچسپ نمونہ ہے، گو اسکے تمام مضامین خاص نقطۂ نظر سے لکھے جاتے ہیں، لیکن کبھی کبھی عام مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے بھی کوئی مفید مضمون نکل جاتا ہے،

ہمجولی، مرتبہ ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی، و آمنہ خاتون صاحبہ، تقطیع بڑی، ضخامت ۴۰ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت سالانہ عار پتہ:- ہمجولی دہلی

ڈاکٹر سعید احمد صاحب کی ادارت میں طبیب نسواں کے نام سے عرصہ سے ایک نسوانی رسالہ نکل رہا تھا، اسی نے اب ہجولی کا لباس پہن لیا ہے، صرف ظاہری قالب بدلا ہے معنوی خصوصیات وہی ہیں، عورتوں کے لئے سنجیدہ علمی و ادبی مضامین اور نسوانی مباحث پر مفید اور کارآمد باتیں پیش کرتا ہے "چالاک تاجر" "ہفت ہزاری داوا"، اور "پٹھان کا بیٹا" دلچسپ افسانے ہیں "ریل کا سفر" گو بہت مختصر ہے لیکن لطف سے خالی نہیں، ہجولی شریف خواتین کی سہیلی بننے کے لائق ہے،

منزل دہلی، مرتبہ صاحبزادہ عالمگیر مرزا دہلوی تقطیع بڑی ضخامت ۵۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت سالانہ عہ ششماہی عہ، فی پرچہ ۳۰ر، پتہ:- بلیماران دہلی،

یہ رسالہ چند مہینوں سے دہلی سے نکلتا ہے، اوسط درجہ کا ادبی رسالہ ہے، بیشتر مضامین ادبی اور بعض معمولی درجہ کے علمی ہوتے ہیں، ہر نمبر میں شریفی خاندان کے کسی نامور بزرگ کے حالات دیتا ہے،

مووی لینڈ مرتبہ جناب ایل سی بھلہ صاحب بی اے تقطیع بڑی ضخامت ۴ صفحے کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت سالانہ عہ، فی پرچہ ۳ر، پتہ:- سکندرآباد دکن،

یہ فلمی رسالہ ہے، اور غالباً انگریزی میں بھی نکلتا ہے، اس میں فلم کے متعلق فنی مضامین، دنیائے فلم کی خبریں، اور اس سے متعلق ہر قسم کے معلومات ہوتے ہیں، ادب اور افسانے کا بھی ایک حصہ ہوتا ہے، سراج احمد صاحب علوی کا مضمون "آرٹ" بہت دلچسپ ہے، آج کل کے فلمی رسالوں کی زینت عموماً ادب لطیف، سطحی معلومات اور فلم اسٹار کی تصاویر سے ہوتی ہے، لیکن یہ رسالہ اس موضوع پر سنجیدہ مضامین و معلومات پیش کرتا ہے،

مسیح الملک، مرتبہ جناب حکیم محمد منظر الدین صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۴ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت اوسط، قیمت سالانہ عہ، پتہ:- دفتر رسالہ مسیح الملک قرول باغ دہلی،

دہلی کا نیا طبی مدرسہ جامعہ طبیہ حکیم کبیر الدین صاحب کی سرپرستی میں طب کی اچھی خدمت کر رہا ہے، مسیح الملک

اسی کا آرگن ہے، یہ واقعہ ہے، کہ طب یونانی اطبا، کے جمود اور فنی قناعت پسندی کی وجہ سے بہت پیچھے رہ گئی ہے، لیکن اب زمانہ کے حالات نے اس کو حرکت پر مجبور کیا ہے، چنانچہ یہ رسالہ اسی مقصد سے نکالا ہے، کہ وہ علمی اور عملی دونوں میدانوں میں طب یونانی کا قدم آگے بڑھائے، اور اسکے تمام وسائل کو کام میں لائے، مثلاً قدیم مسائل کی تحقیقات، پرانے طریقوں کو نئے مذاق کے مطابق بنانا، جدید اکتشافات سے فائدہ اٹھا کر نئے حالات کا مقابلہ کرنا، حکومت سے طب یونانی کی اہمیت منوا کر اسے پبلک میں مقبول بنانا، طبی دنیا کے حالات سے اطبا کو باخبر کرنا، وغیرہ، جامعہ طبیہ کے کارکنوں کی ہمت سے امید ہے، کہ رسالہ ان مقاصد میں کامیاب ہوگا،

کارنامہ، مرتبہ مسرور قنوجی، تقطیع اوسط، ضخامت ۴۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت معمولی، قیمت سالانہ ۱ؔ، فی پرچہ ۲؍، پتہ:- سبزی منڈی الہ آباد،

یہ رسالہ الہ آباد سے نکلتا ہے، اس کے ٹائٹل پر تو علمی و ادبی لکھا ہے، لیکن جتنے نمبر ہم نے دیکھے ان میں بیشتر طبی مضامین نظر آئے، ادب اور افسانہ کا بھی حصہ ہے، لیکن بہت مختصر، طب کے متعلق کار آمد باتیں ہوتی ہیں،

کاشتکار جدید مرتبہ چودھری رحمت خان صاحب، تقطیع اوسط، ضخامت ۲۲ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت معمولی، قیمت سالانہ ۱ؔ، فی پرچہ ۲؍، پتہ:- کسان اینڈ کمپنی بیج و پودے فروش بیچیرین روڈ، لاہور،

کاشتکار کے نام سے عرصہ سے ایک زراعتی رسالہ لاہور سے نکلتا تھا، لیکن اڈیٹر کے ایک ہونہار شاگرد نے اس پر قبضہ جمالیا، جس کا شکوہ اس رسالہ میں ہے، اسلئے اب انھوں نے کاشتکار جدید کے نام سے یہ نیا رسالہ نکالا ہے، اس کا موضوع نام سے ظاہر ہے، اس میں زراعت و باغبانی کے متعلق مضامین و معلومات ہوتے ہیں، جن لوگوں کو اس سے دلچسپی ہے، ان کے لئے اس میں کام

باتیں ہوتی ہیں،

معلومات مرتبہ جناب احمد الدین احمد صاحب مارہروی تقطیع بڑی، ضخامت ۴۰ صفحے،

کاغذ، کتابت، وطباعت بہتر، قیمت سالانہ ے، ششماہی ۱عہ، فی پرچہ ۳ر، پتہ:۔

دفتر معلومات اٹاوہ،

یہ دلچسپ اور مفید رسالہ مسلمانون کے مرکزی اسکول اٹاوہ سے نکلتا ہے، اس میں بچوں کے معلومات بڑھانے والے مختلف قسم کے مضامین تاریخی واقعات، جدید اکتشافات، سائنس کی ایجادات اور مختلف چیزون کے متعلق دلچسپ اور نادر معلومات ہوتے ہیں، مثلاً "روپیہ کی کہانی" "مکھی کھانے والا پودا" "چینونٹی" "مشینون کی دنیا" "سینما کی ایجاد" "ڈرائنگ کا کھیل" "برف کے نیچے" وغیرہ، بچوں کے مذاق کے لطائف وظرائف بھی ہوتے ہیں، یہ رسالہ بچوں کے لئے مفید بھی ہے اور دلچسپ بھی،

ہونہار، مرتبہ رام لوچن شرن، وانیس الرحمٰن صاحب، تقطیع بڑی ضخامت ۵۵ صفحے

کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت سالانہ ے ر، فی پرچہ ۳ر، پتہ :۔ پستک بھنڈار

لہریا سرائے دربھنگہ،

ہونہار بچوں کا رسالہ ہے، اسکی زبان بہت سادہ اور آسان رکھی گئی ہے جو ثقیل عربی وفارسی، اور بھدے سنسکرت الفاظ دونون سے پاک اور ہندوستانی زبان کا نمونہ ہوتی ہے لیکن زبان کا معیار ایسا ہے، کہ بچے بھی آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں اور ہر طرح کے خیالات بھی ادا کئے جا سکتے ہیں، مضامین ومعلومات کے لحاظ سے بھی بچوں کے لئے مفید اور موزون ہے ان کی تعلیم وتربیت کے لئے مفید اور ان کی معلومات بڑھانے والے مضامین ہوتے ہین، ہر لحاظ سے یہ رسالہ حوصلہ افزائی کا مستحق ہے، اس کا ایک ہندی اڈیشن بھی نکلتا ہے،

سعادت (پندرہ روزہ) مرتبہ جناب لطیف فاروقی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۴ صفحے،

کاغذ سفید، کتابت و طباعت اچھی، قیمت سالانہ للعہ، پتہ:- دفتر سعادت کٹڑہ تار کشاں لاہور،

یہ رسالہ بھی بچّوں کا ہے، ان کے ذوق اور دلچسپی کے مضامین، اور ان کے لئے مفید معلومات ہوتی ہیں، "م"

اخبارات

شہباز (روزانہ) مرتبہ جناب مرتضیٰ احمد خان صاحب میکش تقطیع بڑی ضخامت ۸ صفحے، قیمت سالانہ عـــہ ششماہی ھہ سہ ماہی للعہ، فی پرچہ ۱ر، پتہ:- دفتر شہباز نمبر ۱۸ ریلوے روڈ لاہور،

یہ اخبار گذشتہ اپریل سے لاہور سے نکلنا شروع ہوا ہے، اور اسی شان سے جس شان سے لاہور کے دوسرے اردو روزنامے نکلتے ہیں، ترتیب، تہذیب، اخبار، سیاسی مسائل میں بحث ونظر کسی لحاظ سے وہ اردو کے کسی اچھے اخبار سے کم نہیں ہے، ہندوستان، بیرونی دنیا، اور عالم اسلام کی خبروں کے ساتھ ہندوستان کی سیاست، بین الاقوامی حالات اور اسلامی مسائل پر سنجیدہ بحث وتبصرہ ہوتا ہے، اسکی یہ خصوصیت لائق ذکر ہے، کہ وہ کسی پارٹی سے تعلق نہیں رکھتا، گو اس پارٹی بازی کے دور میں اس سے دامن محفوظ رہنا بہت مشکل ہے، خدا شہباز کی اس پرواز کو قائم رکھے، ہندوستان کی اسلامی سیاست کے بارہ میں شہباز بھی عام اسلامی پریس کا ہم نوا ہے لیکن سنجیدگی اور متانت کے ساتھ سندباد جہازی جیسے بحر ظلمات کے پرانے تیناور کی رہبری بھی اسکو حاصل ہے، اسکی اشاعت سے اردو اخبار دن میں ایک اچھے روزنامے کا اضافہ ہوا ہے،

پرچم (ہفتہ وار) مرتبہ سبط حسن صاحب تقطیع اوسط اخباری ضخامت ۱۶ صفحے، کاغذ معمولی

کتابت وطباعت بہتر، قیمت سالانہ ۵ ششماہی ۳ پتہ:- نمبر ۱ لال باغ روڈ لکھنؤ

یہ اخبار سبط حسن صاحب مدیر نیا ادب کی ادارت میں نکلتا ہے، اس کے مقاصد بھی وہی ہیں جن کا نئے ادب کے ریویو میں ذکر ہو چکا ہے، اس رسالہ کی طرح یہ اخبار بھی بڑا اعتدالی اور افراط و تفریط سے پاک ہے، وہ تجدد و انقلاب کا اندھا داعی نہیں ہے، بلکہ صرف اسکے مفید حصہ کا مبلغ ہے، اور آج کل کے نام نہاد ترقی پسند مسلمانوں کی طرح اسلام اور مسلمانوں سے بے تعلق نہیں، بلکہ ملک کے ساتھ ملت کا بھی درد رکھتا ہے، اور مسلمانوں کی سیاست اور ان کے حقوق و مفاد پر خاص طور سے بحث کرتا ہے، ایسی انقلابی دعوت نہایت مبارک ہے، اخباری حیثیت سے بھی اچھا اخبار ہے، ہفتہ بھر کی ہندوستان اور بیرونی دنیا کی اہم سیاسی خبریں دیتا ہے، ہندوستان کی سیاست اور بین الاقوامی حالات پر واقف کارانہ تبصرہ ہوتا ہے، رائیں عموماً سنجیدہ اور متین ہوتی ہیں، خالص سیاسی اخبار و کوائف کے علاوہ مختلف ملکوں کے ایسے حالات پر بھی مضامین ہوتے ہیں جن کا اثر سیاست پر پڑتا ہے، سیاست اور سوشلزم کے دائرہ میں جو جو موضوع آسکتے ہیں، سب پر مضامین و معلومات ہوتے ہیں، ادب اور افسانے کا بھی ایک حصہ ہے لیکن سیاسی رنگ لئے ہوئے

ہماری زبان (پندرہ روزہ) مرتبہ جناب ریاض حسن صاحب تقطیع اوسط ضخامت ۱۶ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت عہ سالانہ، پتہ:- نمبر ۱ دریا گنج دہلی،

اردو زبان کو مٹانے کی جو مسلسل کوششیں جاری ہیں، وہ اب کوئی راز نہیں لیکن جس ترتیب و تنظیم اور جس وسعت و قوت کے ساتھ یہ کام ہو رہا ہے، اس کا پورا علم کم لوگوں کو ہے، مخالفین اردو نے ہندوستان کی آزادی کی طرح اردو کشی کو بھی اپنا نصب العین بنا لیا ہے، ان کے افراد سے لیکر جماعتوں اور اداروں تک اس کام میں لگے ہوئے ہیں، اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا

ہے، کہ ان جماعتوں اور اداروں کا دامن بھی اس سے پاک نہیں، جن کا مقصد متحدہ قومیت کی تعمیر ہے، اور جو سیاسی مصالح کی بنا پر اردو کی حفاظت کے مدعی ہیں، لیکن انکے ہاتھوں میں قوت کی وجہ سے ان کے ہتھکنڈے اردو کے لئے کھلے ہوئے مخالفین سے زیادہ مہلک ہیں، مسلمانوں کے پاس اسکے مقابلہ کیلئے زبانی شور و غل کے سوا کچھ نہیں ہے، لے دے کے ایک انجمن ترقی اردو اپنی بساط کے مطابق عملاً مقابلہ کر رہی ہے، اسی غرض سے اس نے یہ پندرہ روزہ اخبار نکالا ہے، ہندوستان میں اردو کی سرگذشت کا آئینہ ہے، غریب اردو پر مخالفین کے ہاتھوں جو کچھ بیتی رہی ہے، اور انجمن ترقی اردو اسکے مقابلہ کیلئے جو کچھ کر رہی ہے، اس میں اسکی پوری روداد ہوتی ہے، اس سے مخالفین اردو کی تخریبی سرگرمیوں اور انجمن ترقی اردو کی مدافعانہ اور تعمیری کارگذاریوں کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔

آزادی کی جد و جہد میں کوتاہی کا الزام ایک دوسرے کے سر رکھتی ہیں، اس طبقہ کے ہندوؤں کا دعوی ہے، کہ مسلمانوں کو ہندوستان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، ان کی سیاست کا نشو و نما انگریزوں کی زیر نگرانی ہوا، انھوں نے ہندوستان کی آزادی میں کوئی حصہ نہیں لیا، بلکہ اس راہ میں مشکلات پیدا کیں، ان کے مقابل کی جماعت کہتی ہے، کہ ہندو ہمیشہ سے مسلمانوں کے دشمن اور انگریزوں کے دوست رہے، ہندوستان کی کامل آزادی کبھی ان کا مقصد نہیں تھا، بلکہ وہ برطانیہ کی سنگینوں کی حفاظت میں ہندو راج چاہتے ہیں، مذکورۂ بالا کتاب اس دوسرے نقطۂ نظر سے ہندوؤں کے جواب میں لکھی گئی ہے، اسکے دو حصے ہیں، پہلے حصہ میں دکھایا گیا ہے، کہ ہندوؤں نے ہمیشہ مسلمانوں کے ساتھ دشمنی اور انگریزوں سے دوستی کا ثبوت دیا، مسلمانوں کی دشمنی میں انھوں نے ہندوستان کو انگریزوں کا غلام بنایا، خود اسلامی حکومتوں کو مٹایا، اور ان کے مٹانے میں انگریزوں کی مدد کی، پھر آزادی کی پہلی جنگ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں سے مل کر مسلمانوں کو پامال کیا، فرقہ وارانہ سوالات پیدا کرکے ہندو مسلمانوں میں اختلاف کا بیج بویا، مسلمان ہمیشہ مکمل

سالانہ سے ششماہی عہ سہ ماہی عہ فی پرچہ ا، پتہ :- دفتر جمہور قمر علی بلڈنگ ریواچند رتن چند لسیاری کوارٹر کراچی،

جمہور سندھ کی مسلم نیشنلسٹ پارٹی کا آرگن ہے، اس کا مسلک پارٹی کے نام سے ظاہر ہے وہ آزاد خیال قوم پرست اور کسانوں اور مزدوروں کا حامی اخبار ہے، باہمی اختلات سے قطع نظر ہندوستان کی آزادی، متحدہ قوت کی تعمیر اور نوجوانوں میں خالص قومی اسپرٹ پیدا کرنا اسکا نصب العین ہے، اخباری لحاظ سے بھی اچھا ہے، ہفتہ بھر کی اہم سیاسی خبریں دیتا ہے، اور سیاسی مسائل پر خالص قومی نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالتا ہے تاہم اسلامی مسائل سے بھی بے بہرہ اور بے خبر نہیں ہے،

"م"

دنیا کی اہم سیاسی خبریں دیتا ہے، ہندوستان کی سیاست اور بین الاقوامی حالات پر واقف کارانہ تبصرہ ہوتا ہے، رائیں عموماً سنجیدہ اور متین ہوتی ہیں، خالص سیاسی اخبار و کوائف کے علاوہ مختلف ملکوں کے ایسے حالات پر بھی مضامین ہوتے ہیں جن کا اثر سیاست پر پڑتا ہے، سیاست اور سوشلزم کے دائرہ میں جو جو موضوع آسکتے ہیں، سب پر مضامین و معلومات ہوتے ہیں، ادب اور افسانے کا بھی ایک حصہ ہے لیکن سیاسی رنگ لئے ہوئے

ہماری زبان (پندرہ روزہ) مرتبہ جناب ریاض حسن صاحب تقطیع اوسط ضخامت ۱۶ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ سالانہ، پتہ :- نمبر ا دریا گنج دہلی،

اردو زبان کو مٹانے کی جو مسلسل کوششیں جاری ہیں، وہ اب کوئی راز نہیں لیکن جس ترتیب و تنظیم اور جس وسعت و قوت کے ساتھ یہ کام ہو رہا ہے، اس کا پورا علم کم لوگوں کو ہے، مخالفین اردو نے ہندوستان کی آزادی کی طرح اردو کشی کو بھی اپنا نصب العین بنا لیا ہے، ان کے افراد سے لیکر جماعتوں اور اداروں تک اس کام میں لگے ہوئے ہیں، اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا

مطبوعات جدیدہ

مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ
مؤلفہ جناب عبدالوحید خاں صاحب بی اے، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۳۴۴ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت اوسط قیمت عہ
پتہ:۔ نمبر۹ ر ٹوش روڈ لکھنو،

متحد الخیال ہندو اور مسلمانون کے علاوہ دونوں قوموں میں بعض جماعتیں ایسی ہیں جو آزادی کی جدوجہد میں کوتاہی کا الزام ایک دوسرے کے سر رکھتی ہین، اس طبقہ کے ہندوؤں کا دعوی ہے، کہ مسلمانون کو ہندوستان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، ان کی سیاست کا نشو ونما انگریزون کی زیر نگرانی ہوا، انھوں نے ہندوستان کی آزادی میں کوئی حصہ نہیں لیا، بلکہ اس راہ میں مشکلات پیدا کین، ان کے مقابل کی جماعت کہتی ہے، کہ ہندو ہمیشہ سے مسلمانون کے دشمن اور انگریزون کے دوست رہے، ہندوستان کی کامل آزادی کبھی ان کا مقصد نہیں تھا، بلکہ وہ برطانیہ کی سنگینون کی حفاظت میں ہندو راج چاہتے ہیں، مذکورۂ بالا کتاب اس دوسرے نقطۂ نظر سے ہندؤن کے جواب میں لکھی گئی ہے، اسکے دو حصے ہین، پہلے حصہ میں دکھایا گیا ہے، کہ ہندوؤں نے ہمیشہ مسلمانوں کے ساتھ دشمنی اور انگریزون سے دوستی کا ثبوت دیا، مسلمانون کی دشمنی میں انھون نے ہندوستان کو انگریزوں کا غلام بنایا، خود اسلامی حکومتوں کو مٹایا، اور ان کے مٹانے میں انگریزون کی مدد کی، پھر آزادی کی پہلی جنگ ۱۸۵۷ء میں انگریزون سے مل کر مسلمانوں کو پامال کیا، فرقہ وارانہ سوالات پیدا کرکے ہندو مسلمانون میں اختلاف کا بیج بویا، مسلمان ہمیشہ مکمل

آزادی کی جنگ میں ہندوؤں سے آگے رہے چنانچہ اس زمانہ میں جب کانگریس برطانیہ کی وفاداری کے رزولیوشن پاس کرتی تھی، مسلمان رہنما آزادی کا سبق دیتے تھے، ترک موالات کی ہمہ گیر تحریک مسلمانوں ہی کے جوش آزادی کا نتیجہ تھی، اور اس زمانہ میں ہندوستان کی سیاست کی باگ انہی کے ہاتھوں میں تھی، جو بعد میں مسلمان رہنماؤں کی غلطی سے ہندوؤں کے ہاتھوں میں چلی گئی، اس تحریک کے بعد ہندوؤں نے شدھی اور سنگھٹن کی فرقہ وارانہ تحریکین پیدا کرکے ہندو مسلم اتحاد کا خاتمہ کر دیا، پھر نہرو رپورٹ سے ان کا اصل مقصد یعنی برطانیہ کے زیر سایہ ہندو راج بالکل ظاہر ہو گیا، اور گول میز کانفرنس میں مولانا محمد علی مرحوم کی تقریر اور گاندھی جی کے طرز عمل سے مسلمانوں کے مطمح نظر اور ہندوؤں کے منصوبوں کا پورا ثبوت مل گیا، دوسرے حصہ میں جدید دستور کے نفاذ کے بعد کے حالات و واقعات کی روشنی میں ہندوؤں کے منصوبوں اور مسلمانوں کے استیصال کی تدبیروں اور ان کے حقوق کی پامالی کو دکھایا ہے، اس میں وہ تمام واقعات، اعتراضات، اور شکوک و شبہات ہیں، جو مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے پیش کئے جاتے ہیں، یہ مؤلف کے نقطۂ نظر سے کتاب کے مباحث کی نوعیت ہے، نقطۂ نظر خواہ کیسا ہی ہو اسکی تائید میں کچھ نہ کچھ واقعات مل ہی جاتے ہیں، چنانچہ لائق مؤلف نے واقعات ہی کی روشنی میں یہ کتاب لکھی ہے، جن میں سے کچھ صحیح بھی ہیں، لیکن بہت سے واقعات سے ایسے نتائج نکالے گئے ہین، جن کی مخالف نقطۂ نظر رکھنے والا دوسری تاویل کر سکتا ہے، اس لئے اس کتاب کی بنیاد کچھ زیادہ مضبوط نہیں ہے، لیکن اس حیثیت سے وہ لائق قدر ہے کہ اس میں مسلمانوں کی سیاست کی تاریخ، آزادی کی جنگ میں ان کی جدوجہد اور ایثار و قربانی کے واقعات اور بہت سے مفید معلومات آگئے ہیں، اس سے بھی زیادہ لائق ستایش نوجوان مؤلف کی محنت و ہمت اور سنجیدہ غور و فکر کی صلاحیت و استعداد ہے، کہ اس عمر میں جب کہ عموماً مسلمان

کافی سامان ہو، ترجموں میں حضرت شیخ الہندؒ اور مولینا اشرف علی صاحب کے اردو تراجم اور مولینا عبد الماجد صاحب دریابادی کے انگریزی ترجمہ کا جو تقریباً پورا ہو چکا ہو، ذکر نہ ہونا تعجب انگیز ہے،

تاریخ ملت مؤلفہ جناب مسلم دیلوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۸ صفحے کاغذ کتابت و طباعت اوسط قیمت و پتہ مرقوم نہیں

مؤلف نے اس کتاب میں عہد جاہلیت سے لیکر اختتام خلافت راشدہ تک کی مختصر تاریخ لکھی ہے، عہد رسالت کے آخر میں اسلامی تعلیمات، اخلاق نبوی کلام اللہ کے نزول کی تاریخ، اسکی جمع و ترتیب، اسکی تعلیم کے اثرات اور کلام اللہ سے متعلق متفرق مفید معلومات ہیں خلافت راشدہ کی سیاسی تاریخ کے ساتھ خلفاء کی سیرت، نظام خلافت کے جستہ جستہ حالات مسلمانوں میں اسلامی تعلیم کی تاثیر کے واقعات اور دنیا پر اسکے اثرات کا ذکر، اور اسلام اور مسلمانوں سے متعلق بہت سی مفید باتیں ہیں، اردو میں سیرت نبوی، اور خلافت راشدہ پر اتنی مستند کتابیں لکھی جا چکی ہیں، کہ ان سے آسانی کے ساتھ معتبر مختصرات مرتب کئے جا سکتے ہیں، اسلئے اس تاریخ کے اکثر واقعات صحیح ہیں، کہیں کہیں پر غلط واقعات اور غیر معتبر روایات درج ہو گئی ہیں، مثلاً عقیقہ کے بعد جو ساتویں دن ہوا تھا، آنحضرت صلعم کا حضرت سعدیہ کو حوالہ کیا جانا، ابو طالب کے انتقال کے تیسرے دن حضرت خدیجہؓ کا انتقال، انصار کا اپنے برتن توڑ کر آدھا آدھا مہاجرین میں تقسیم کر دینا، علاج اور متعدی امراض کے متعلق آنحضرت صلعم کی ہدایات وغیرہ کے واقعات غلط ہیں، یرموک کی جنگ کے واقعات واقدی سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں، جوش مذہب میں واقعات کے بیان میں کہیں کہیں مبالغہ کا رنگ آگیا ہو، واقعات کے بیان اور تحریر دونوں میں توازن نہیں ہو، بعض معمولی واقعات کو طول دیا گیا ہے، بعض اہم واقعات کا سرسری ذکر ہو، ایسا معلوم ہوتا ہو کہ دو مختلف آدمیوں کی تحریر ہو، بعض بعض مقامون پر قلم جادۂ ادب سے ہٹ گیا ہو، مثلاً محمد جیسا پہلوان "آپ کی بوٹی بوٹی الگ کر دیں" آنحضرت صلعم یا رسول اللہ صلعم کے بجائے عموماً حضرت محمد ہو جو ایک مسلمان کے قلم سے بالکل ناموزوں ہو،

تاریخ و تنقید ادبیات اردو | مرتبہ جناب حامد حسن صاحب قادری تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۱۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ پتہ: حامد حسن صاحب قادری پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ،

مؤلف نے کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ کے استفادہ کے لئے یہ کتاب لکھی ہے، اس کے شروع میں ایک مقدمہ ہے، اس میں اردو زبان کی اہمیت، وسعت اور مقبولیت پر علمی اور تاریخی حیثیت سے بحث کی گئی ہے، اس میں اگرچہ کوئی جدید تحقیق اور نئی بات نہیں ہے، بلکہ مختلف لوگوں کے خیالات اور تحقیقاتوں کو یکجا کر دیا گیا ہے، تاہم فائدہ سے خالی نہیں ہے، اردو زبان کے "ہندستانی" نام اور اسکے بعض الفاظ کے املا کی ترمیم کی تجویز کی مخالفت میں مؤلف نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی ذاتی رائے ہے، جو کسی علمی یا لسانی اصول پر مبنی نہیں ہے، زبان کوئی جامد چیز نہیں ہے بلکہ زمانہ کے اقتضا کے مطابق ہر زبان کو اس قسم کے تغیرات سے گذرنا پڑتا ہے، خود اردو کے عربی اور فارسی الفاظ میں، لفظی و معنوی تغیرات ہوئے ہیں بہرحال اس بحث میں اردو زبان کے مختلف پہلوؤں کے متعلق مفید معلومات ہیں، اصل کتاب میں اردو نثر کی بقدر تمہید اور نظم پر اجمالی نظر ڈالی گئی ہے، اس میں ہر دور کے مشاہیر شعراء کے نام، ان کے کلام کے نمونے، ان کے رنگ پر تبصرہ، شاعری کے عہد بعہد کے تغیرات، ان کے مختلف اسکولوں کی خصوصیات، اصناف شاعری کی تاریخ، تنقید جدید شاعری اور تغزل پر تبصرہ وغیرہ، اردو شاعری کے تمام پہلوؤں پر مختصر نوٹس، اور سرسری تنقید ہے، آخر میں شاعری سے متعلق مؤلف کے تین مضامین "آگرہ اسکول" "شاعری میں چوری"، "ہمارے شاعر" ہیں، یہ مختصر کتاب طلبہ کیلئے اردو شاعری کے مطالعہ میں رہنمائی کا کام دے سکتی ہے،

"م"

دارالمصنفین کی نئی کتابیں

تابعینؒ

علم وعمل اور مذہب و اخلاق مین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے اور صحابۂ کرام کے بعد ان ہی کی زندگی مسلمانون کے لئے نمونۂ عمل ہے اس لئے سیر الصحابہ کی تکمیل کے بعد دارالمصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس مین حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز، حضرت حسنؒ بصری، حضرت اویسؒ قرنی، حضرت امام زین العابدینؒ، حضرت امام باقرؒ حضرت امام جعفرؒ صادق، حضرت محمد بن حنفیہؒ، حضرت سعید بن مسیبؒ، حضرت سعید بن جبیرؒ، حضرت محمد بن سیرینؒ، حضرت ابن شہاب زہریؒ، امام ربیعہ رائیؒ، امام مکحولؒ شامی اور قاضی شریحؒ وغیرہ چھیانوے اکابر تابعینؒ کے سوانح ان کے علمی، مذہبی، اخلاقی اور عملی مجاہدات اور کارنامون کی تفصیل ہے، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی، ضخامت ۵۶۰ صفحے، قیمت: للعہ

مختصر تاریخ ہند

ہمارے اسکولون مین جو تاریخین پڑھائی جاتی ہین ان کا لب ولہجہ دلآزاری اور تعصب سے خالی نہین ہوتا، اور اس وجہ سے ہندوستان کی مختلف قومون مین تعصب اور بغض وعناد پیدا ہوتا ہے، مولانا ابو ظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسون اور طالب علمون کیلئے اس غرض سے لکھی ہے کہ اس کا طرز بیان قومی جذبات سے متاثر نہ ہو اور ہندو اور مسلمان فرمانروا‌ؤن نے ہندوستان کے زمین جو کام کئے ہین وہ طالب علمون کو بلاتفریق مذہب بتلائے معلوم ہو جائین ضخامت ۳۰۰ صفحے قیمت عہ

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۰۱

ستمبر ۱۹۳۹ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت: پانچ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سیرۃ النبی

رسول اللہ صلعم کے حالات وغزوات، اخلاق وعادات، اور تعلیم وارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جس کا نام **سیرۃ النبی** عام طور سے مشہور ہے، مسلمانوں کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت واہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے،

ابتک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہیں، پہلے میں ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں، اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جسمیں فن سیرت کی تنقید تاریخ ہے، دوسرے حصہ میں تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق عادات، اعمال عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے، تیسرے حصہ میں آپکے معجزات خصائص نبوت پر بحث ہے جسمیں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کیگئی ہیں، پھر ان معجزات کی تفصیل ہے جو بروایات صحیحہ ثابت ہیں، اسکے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید وتفصیل کیگئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپکے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں کوشش کی گئی ہے کہ اس میں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں، پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادت کی تفصیل وتشریح اور ان کے مصالح وحکم کا بیان ہے اور دوسرے مذاہب کی عبادات سے ان کا مقابلہ وموازنہ ہے، چھٹے حصہ میں حقوق فضائل رذائل آداب کے عنوان اور اسکی ذیلی شرحوں کے تحت اخلاقی تعلیمات کی تفصیل ہے، حجم [illegible] صفحے قیمت قسم اول [illegible] قسم دوم [illegible]

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول تقطیع خورد [illegible] حصہ دوم تقطیع کلاں [illegible] تقطیع خورد [illegible] حصہ سوم تقطیع کلاں [illegible] تقطیع خورد [illegible] حصہ چہارم تقطیع کلاں [illegible] تقطیع خورد [illegible] حصہ پنجم تقطیع کلاں [illegible]

(مہتمم دار المصنفین اعظم گڈھ)

جلد ۴۴ | ماہ رجب المرجب ۱۳۵۸ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۳۹ء | عدد ۳

مضامین

شذرات

جامع ازہر مصر میں ایسے طالب علموں کے لئے جن کی مادری زبان عربی نہیں، ایک ہلکا سا مختصر نصاب بنا دیا گیا ہے، جس میں کامیاب ہونے کے بعد ان کو سندِ اغراب (غیر عربون کی سند) دیدی جاتی ہے، ہندوستان کے طالب علم عام طور سے اسی قسم کی سند یا اس سے بھی کم درجہ کی سند لے کر ہنسی خوشی واپس چلے آتے ہیں، حالانکہ اس کی حیثیت میٹرک کی بھی نہین،

اب جامع ازہر کی اعلیٰ تعلیم تین کالجوں پر منقسم ہے، ایک شرعی، دوسری ادبی اور تیسری دعوت وارشاد کی، ان میں جو طالب علم تکمیل پاتے ہیں وہ سندِ عالی پاتے ہیں، اور بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، اس شعبۂ تکمیل میں اب تک دو تین ہندوستانیوں کے سوا کسی نے جگہ نہیں پائی، دو برس ہوے کہ ہمارے مدرسۂ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے دو فاضل حافظ **محمد عمران خاں** بھوپالی اور **سعد الدین** انصاری (معلم جامعہ دہلی) نے اس اعلیٰ تعلیم میں داخلہ کی غیر معمولی اجازت پائی،

اب ہمارے ناظرین کو یہ سنکر بڑی خوشی ہوگی کہ حافظ محمد عمران خاں نے نہ صرف یہ کہ اپنے شعبہ مین کامیابی حاصل کی، بلکہ اپنے درجہ میں خود مصریوں کے مقابلہ میں بھی وہ اوّل آئے، ان کے درجہ مین کل ۴۴ طالب علم تھے، ان میں سے صرف ۸ کامیاب ہوئے، جن میں حافظ محمد عمران خان

ندوی کا نام سب سے اول ہے، ہم اس کامیابی پر دارالعلوم ندوہ کو دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

حافظ محمد عمران خان نے جن علوم کے تحریری امتحان میں جو نمبر پائے ان کی تفصیل یہ ہے،

علوم القرآن میں ۵۰ میں ۳۵، علوم الحدیث میں ۵۰ میں ۳۸½، موازنۂ مذاہب میں ۴۰ میں ۲۱½، عربی تقریر میں ۴۰ میں ۲۵، انگریزی میں ۴۰ میں ۳۰½ اور ان علوم کے زبانی امتحان میں علوم القرآن میں ۲۰ میں ۱۳، علوم الحدیث میں ۲۰ میں ۱۴، موازنۂ مذاہب میں ۲۰ میں ۱۰ اور انگریزی میں ۲۰ میں ۱۷ اور مجموعی حیثیت سے ۷۱ فیصدی،

حافظ صاحب موصوف مزید تعلیم کے لئے یورپ بھی جانا چاہتے تھے، مگر جنگ کے سبب سے اب وہ واپس آرہے ہیں، غالباً ۲ ستمبر تک وہ ہندوستان واپس آجائیں، وہ دارالعلوم سے فراغت کے بعد دارالعلوم کے شعبۂ اہتمام و انصرام کا کام انجام دیتے تھے، ہماری آرزو ہے کہ وہ واپس آکر دارالعلوم کے بیش از بیش کام انجام دیں، اور دین و ملت اور قوم و ملک کو ان کے وجود سے بہتر سے بہتر فائدے پہنچیں،

چودھویں صدی ہجری کے شروع میں ندوۃ العلماء اور اس کا دارالعلوم ہماری مذہبی تعلیم کی تاریخ میں ایک انقلابی تحریک تھی، اگرچہ عربی مدرسوں کی طرف سے اس کی دعوت کا خیر مقدم سرد مہری سے کیا گیا، مگر غور سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آہستہ آہستہ اس کی آواز نے ملک کے اس سرے سے اس سرے تک اپنا پورا اثر ڈالا، درس نظامیہ کے تبرک اور افادہ کا پرانا تخیل اب اتنا بدل گیا ہے کہ اب اس کے ابطال کے لئے کسی دلیل کی بھی ضرورت نہیں،

اوراب بلا استثنا ہر مدرسہ اسکی اصلاح کے لئے مضطرب اور بے چین ہے لیکن جو چیز افسوس کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ اس اصلاح کے لئے جس سرمایہ کی ضرورت ہے اس سے سب کا ہاتھ خالی ہے،

دار العلوم ندوۃ العلماء کی عظیم الشان عمارت لکھنؤ میں دریاے گومتی کے کنارے موجودہ مسلمانوں کی غفلت کا مجسم ماتم ہے، یہ عمارت ریاست بہاولپور کی ایک شاہی خاندان کی خاتون مرحومہ کی فیاضی کی مرہونِ منت ہے، اس عمارت کی تکمیل کے لئے تقریباً پچیس ہزار کی ضرورت اور ہے، کاش ریاست بہاولپور کے عباسی فرمانروا کے کانوں تک میری یہ آواز پہنچ سکتی کہ ان کی تھوڑی سی توجہ سے ان کے اسلافِ کرام کی یادگار بپایۂ تکمیل کو پہنچ سکتی ہے،

درسگاہ کے علاوہ کتب خانہ کی عمارت کی سخت ضرورت ہے، تقریباً تیس ہزار کتابوں کا یہ سرمایہ اپنی عمارت نہ ہونے کے سبب سے نہایت بے ترتیبی سے ناموزوں حالت میں پڑا ہے، چھوٹے بچوں کے لئے دار الاقامہ کی نہایت ہی سخت ضرورت ہے، جس کے بغیر درسگاہ کا بڑا حصہ ان کے رہنے سہنے میں گھرا ہوا ہے، کیا ہمارے مسلمان اہلِ کرم ان مین سے کسی ضرورت کی طرف توجہ کرسکتے ہین؟ واجرهم علی الله

مقالات

تہنید اور بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق

پر

تبصرے

از نواب صدر یار جنگ مولینا حبیب الرحمن خان شروانی

مکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

جون کے معارف میں تہنید کے عنوان کا مضمون لفظ بلفظ پورے شوق و توجہ سے پڑھا، اس سے پہلے مئی کے مضمون کی بابت آپ کو لکھ چکا ہون، بہرحال ان دونو مضامین سے آپکا ایک نیا ادبی ذوق ظاہر ہوا، جو محققانہ ہے، اس کا جاری رہنا عام فائدہ کا ضامن ہوگا، اگر تعصب کی مدد نہ ہو تو آپ کی تحقیق کا جواب دیا جانا بظاہر ممکن نہین۔

والسلام

از معارف:۔

"موصوف نے مئی کے مضمون یعنی "بعض پرانے لفظون کی نئی تحقیق" پڑھکر اپنے جس مکرمت نامہ میں اپنی خوشی اور پسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا، وہ نہایت لطیف و دلچسپ تھا، لیکن افسوس ہو کہ وہ میری غفلت سے ضائع ہوگیا، مولانا نے اس میں بعض لفظون

کی تحقیق خود اپنی طرف سے بھی کی تھی، جن میں سے ایک لفظ شاگرد کی نسبت لکھا تھا، کہ اسکی اصل "شاہ گرد" ہے، یعنی بادشاہ کے ارد گرد جو لوگ رہتے ہوں، اسی طرح شامیانہ کی نسبت لکھا تھا کہ حیدرآباد میں اسکو "شاہ میانہ" بولتے ہیں، جو اپنی اصلیت آپ ظاہر کررہا ہے،

(۲)

از

پروفیسر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی

مخدوم مکرم

مئی کے معارف میں آپ کے مقالے کی دوسری قسط پاکے بہت خوشی ہوئی۔ اس میں بھی آپ نے تحقیق کی داد دی ہے، اور تمام مطالب کو بڑی خوبی اور سادگی سے ادا کیا ہے مضمون نہایت دلنشین ہے،

جی چاہا کہ کہین کہین کچھ تفصیل ہوتی کہین ایک آدھ بات کھٹکی بھی، اسلیئے میں نے بعض باتیں لکھ لی ہیں، جو اس عریضے کے ساتھ بھیجتا ہون،

امید کہ مزاج گرامی قرین عافیت ہوگا،

والسلام

از معارف:۔

"مئی کے معارف میں جو مضمون "بعض پرانے لفظون کی نئی تحقیق" کے عنوان سے چھپا تھا، یہ مضمون کی دوسری قسط تھی، پہلی قسط ایک سال ہوا، کہ ہندستانی الہ آباد میں چھپی تھی،

ں مضمون میں اپنی بعض کوتاہیوں کا ممنون ہوں کہ ان کے بدولت پروفیسر صاحب
خیام کی طرح علم میں بخیل ہیں، اور قلم کو بہت کم حرکت دیتے ہیں، ایک بیش قیمت مقالہ
عارف کو ہاتھ آیا، موصوف نے اس مقالہ میں لفظ شوربا، باورچی، نان بائی، اور بعض
مانون کے ناموں کی نادر تحقیق کی ہے، علم کا یہ لذیذ دسترخوان آیندہ صفحوں میں ناظرین
کے سامنے چنا ہے۔"

(۳)

از

پروفیسر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی

مخدوم محترم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

ل صبح کو میں آپ کو ایک چھوٹا سا خط اُسکے ساتھ ایک بہت لمبا دم چھلا بھیج چکا تھا
رے پہر "معارف" (جون کا شمارہ) صادر ہوا۔ تہنید پر آپ کا مقالہ پڑھکر بے اندازہ مسرت
آپ نے نہایت صحیح رُخ سے اِس بحث پر بحث کی ہے۔ خدا کرے یہ مضمون بیش خیمہ
ث پر کئی مقالوں کا اور یہ ہماری زبان کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔
ں دل میں ڈرتا ہوں کہ کہیں آپ بُرا نہ مان جائیں، مگر زبان کم بخت مانتی نہیں۔ "بوتام"
چھا لفظ ہے اُسے "بگاڑ" کہنا تو کچا میں سن نہیں سکتا۔ ہم جس لفظ کو اپنی زبان میں لیتے
بان کی ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر اُسے "بناتے" ہیں یعنی ہماری زبان اُسی اپنے ڈھب کا
ہے بیاسے بگاڑنا کیونکر کہئے گا، ؟ اور بوتام میں تو یہ بھی نہیں جس زمانے میں فرانسیسی
مان آئے، اُن کی زبان سے پہلے پہلے (شاید ہندستانی سپاہیوں نے) بوتون

سنا۔ بٹن بہت بعد کو انگریز لوگ لائے۔ اسی طرح ایک اور لفظ ہے کارتوس، انگریزی میں کارٹ برج۔ اس سے ہمارا کارتوس ہرگز نہیں بنا۔ فرانسیسیوں سے کارتوش سن کے ہمارے سپاہیوں نے کارتوس تلفظ کیا۔ جیسے دیش سے دیس ہوا، کارتوش سے کارتوس ہوا۔ انگریز کمانڈنٹ بولتا ہے اسی کو فرانسیسی کوماں داں بولتا ہے۔ کمیداں کہا تو ہم نے اس کا کیا بگاڑا؟

۲۔ حضرت کے ذیل میں حضرتِ دہلی وغیرہ بھی آجاتا تو اچھا ہوتا۔

۳۔ حکیم برہم مرحوم کے قول کی تائید اس قدر میں بھی کرسکتا ہوں کہ مواد ان معنوں میں میں نے بھی پہلے پہلے مولانا شبلی مرحوم کی تحریر میں دیکھا تھا۔ اصول کے متعلق میں متفق نہیں ہوں۔

۴۔ تنخواہ کے معنے بدن کا چاہنے والا نہیں ہیں۔ جیسے حسبِ دلخواہ میں دلخواہ کے معنے دل کا چاہنے والا نہیں۔ ترکیب اسم فاعل کی سہی، پر معنی اسم مفعول کے ہیں۔

صفحہ ۱۲۹ پر مرزا فرحت اللہ بیگ کے نام کے ساتھ دو جگہ "مرحوم" لکھ دیا گیا ہے، آج سے آٹھ دن پہلے کا تو مجھے علم ہے کہ وہ صحیح سلامت تھے۔[1]

---

[1] معارف:۔ فرحت اللہ بیگ کو معارف کے تنقید نگار نے مرحوم (خدا رحمت فرمائے) ہی لکھا ہے نا، مرے ہوئے نہیں لکھا، پھر آپ نے زندگی اور موت کا جھگڑا کیوں اٹھایا! اصل یہ ہے کہ عظمت اللہ خاں اور فرحت اللہ بیگ میں ان کو تشابہ ہوا، اللہ تعالیٰ عظمت اللہ خاں پر رحمت اور فرحت اللہ بیگ کو عمر دراز عطا فرمائے،

تس

بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق

(استدراک)

از

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، پروفیسر عربی الہ آباد یونیورسٹی

۱۔ کاتب نے اکثر جگہ 'ناشتا' کا املا ہ سے کیا ہے جو سراسر غلط ہے۔ ص ۳۲۵ پر اخیر سطر میں اور ص ۳۲۶ پر چھٹی سطر میں 'ناشتا' لکھنا چاہیے تھا۔ ص ۳۲۶ کی دوسری اور اخیر سطر میں یہ لفظ اردو کی واحد محرّف[1] حالت میں ہے، اس لیے 'ناشتے' لکھنا چاہیے تھا۔ ہمارے ہاں اکثر لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ الف اور مختفی ہ ایک دوسرے کے بدل ہیں، اس لئے جہاں جی میں آئے ہ لکھ دو، جہاں چاہو الف لکھ لو۔ اسی ذیل میں 'شوربہ دار گوشت' (ص ۳۲۷) ہے۔ فارسی میں 'شوربہ دار' نہ ملے گا، کیونکہ لفظ "شوربا" ہے، 'شوربہ' نہیں 'شوربے دار' اردو ہے، اسے ے ہی سے لکھنا چاہیئے اور اسی طرح 'تھانے دار'، 'ٹھیکے دار'، 'بوٹے دار' وغیرہ۔

آگے چل کے 'تاگہ کو' (ص ۳۳۱) اور 'کونہ' (ص ۳۳۲) دکھائی دیا۔ ہ دونوں جگہ غلط ہے: 'تاگے کو' اور 'کونا' چاہیے تھا۔ مختفی ہ صرف فارسی یا عربی لفظوں میں آسکتی ہے۔ ٹھیٹ ہندستانی لفظوں میں الف اور محرّف حالت میں ے چاہیے[2]۔

---

[1] اس کی تشریح کے لیے دیکھیے میرا مقالہ 'اردو میں احوالِ اسم' (رسالہ اردو، ج ۳) [2] رسالہ ہندستانی ج ۱، ص ۱۱ اور آگے۔

۲- فارسی میں 'ناشتا' کے معنے بلاشبہہ 'اس بھوکے[۵۱] کے ہیں جس نے صبح سے کچھ نہ کھایا ہو'، چنانچہ "خاقانی" کہتا ہے:

دیو از خورش بہ ہیضہ و جمشید ناشتا؛

مگر ہندستانیوں نے 'ناشتاشکستن' کے ساتھ ساتھ ایرانیوں سے 'ناشتا کردن' بھی سنا اور اُس میں کچھ تصرف کیے بغیر 'ناشتا کرنا' بولنے لگے، "ناظم" ہروی[۵۲] کہتا ہے

آناں کہ ناشتاے سرجوش می کنند معشوق را برہنہ در آغوش می کنند۔

مرزا "غالب" نے یہ شعر دیکھا ہوتا، تو اپنے شاگرد مرزا "تفتہ" کو یوں نہ لکھتے:

"جیسا کہ ہندی میں مشہور ہے، اُس نے ناشتا کیا یا نہیں؟"[۵۳]

جب 'ناشتا کرنا' فارسی محاورے کے مطابق ٹھہرا تو 'ناشتا' کا ہندستانی مفہوم فارسی سے زیادہ دور نہیں رہتا۔

۳- اسی طرح 'ناہار شکستن'، 'ناہار کردن'، 'نہار کردن'، فارسی محاورے ہیں[۵۴]، مگر ہم یوں

---

[۵۱] چونکہ ابتدا میں 'ناشتا' صفت ہی کے معنے رکھتا تھا، اُس پر 'ئی' بڑھا کر 'ناشتائی' بنایا گیا اور 'ناشتائی شکن' اُس چیز کو کہا جو نہار منہ کھائی جائے، نہار کھانے والے کو 'ناشتاشکن' کہیں گے۔ "واله" ہروی کہتا ہے:

سینہ از داغ ناشتاشکن است چاک تا روزی گریبان است

[۵۲] المتوفی سنہ ۱۰۸۱ہجری۔ [۵۳] اردوے معلیٰ، حصہ ۲، ص ۱۷۔

[۵۴]
بہ طبع گرسنہ چشم حمیت، اندیشم کہ جز بہ نعمت جود تو نشکند ناہار۔ (عرفی)
شوم بہ جانب ہامون دشت پیمایم کہ تا کجا ز قی را فعیے کنم ناہار۔ (زلالی)
گر ہمچو صبح صاف بود اشتہاے تو با قرص آفتاب توانی نہار کرد۔ (مخلص کاشی)

نہیں بولتے۔ پھر بھی کوئی اس خیال میں نہ رہے، کہ نہاری ہم ہی کھاتے ہیں۔ ایرانی بھی نہاری کھاتا ہے، میر محمد ہاشم "سنجر" کاشی نے کہا ہے:

می خوری خون جگر، سنجر، بخور

صبح، من ہم ایں نہاری خوردہ ام۔

اس کھانے کو جو نہار منہ کھائیں، ایران میں قدیم زمانے میں بھی 'نہاری' کہتے تھے۔ اُستاد "فرخی" کا شعر ہے:

من دوش بہ کف داشتم آن زلف ہمہ شب   وز دولتِ او کردہ ام امروز نہاری۔

اس 'نہاری' کو 'نہارہ' بھی کہتے ہیں، اور 'نہار' سے 'نہاریدن' مصدر بھی بن گیا ہے۔[۵]

۴۔ 'آہار' فارسی اور سنسکرت دونوں میں غذا کو کہتے ہیں مگر اُس کے متعلق صاحب "برہانِ قاطع" کا یہ استدلال شاعروں کے حسنِ تعلیل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا کہ "آہار غذا کو کہتے ہیں جو بدن کو تقویت کا باعث ہوتی ہے، اس لئے لیئی کو بھی 'آہار' کہنے لگے، جو کا غذ اور کپڑے کی قوت کو بڑھاتی ہے"۔

۵۔ اس میں کیا کلام کہ 'سُلفہ' (ناشتا) اور 'سَلَف' (اگلے لوگ) دونوں ایک ہی مادّے (س ل ف) سے نکلے ہیں، کیونکہ اس مادّے کے معنی ہیں، 'پہلے (واقع) ہونا'، مگر یہ کہنا کچھ بہت ٹھیک نہیں، کہ 'سُلفہ' سے 'سلف' نکلا ہے۔

۶۔ 'رکابی' اُس مفہوم میں بھی، جو ہندستان میں معروف ہی، فارسی میں موجود ہے:۔

ز فیضش کردہ ذرّہ آفتابی   زخوانِ او مہِ نو یک رکابی۔ (سلیم)

---

[۵] نہار مخففِ ناہار...... نہارہ یعنی ناہاری است...... نہاری یعنی نہارہ باشد... نہاریدن... مصدر نہارست کہ چیزے خوردن اندک باشد۔ (برہان)

۷۔ 'قلیہ' بلاشبہہ عربی ہے۔ البتہ فارسی میں آکر ی کی تشدید گر گئی (جیسے اور بھی بہتیرے لفظوں میں)۔ ایران میں یہ کھانا بہت پسند ہوا۔ اس کی کئی قسمیں ہیں۔ بکری کی کلیجی اور دل قیمہ کرکے گھی میں تلتے ہیں، تو اُسے 'قلیہ پوتی' کہتے ہیں[۱]۔ یہی 'حسرۃ الملوک' کے نام سے مشہور ہے، شاید اس لئے کہ ہے تو عام لوگوں کا کھانا، پر ایسے مزے کا کہ کبھی شاہی دسترخوان پر پہنچ جائے تو بادشاہ سلامت کو بھی پھر اُس کی حسرت ہی رہے۔ 'قلیہ سُغدی' اس سالن کو کہتے ہیں جس میں گوشت او (گردوں وغیرہ کی) چربی اور انڈے ڈال کر پکاتے ہیں۔ نام سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہ سُغد کے رہنے والوں کی ایجاد ہے۔ 'قلیہ را از مزہ بُرد' ایسی جگہ پر کہیں گے کہ کسی نے پوچ گوئی میں مبالغہ کرکے بات کا مزہ کھو دیا ہو۔ 'قلیہ خوار' کنایہ ہے ایسے آدمی کی طرف جو رکیک اور ذلیل خدمتیں بجالاکر اپنے قلیے روٹی کا سہارا کرلے؛ ہمارے ہاں قلیے کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہے۔ 'قلیے روٹی' کی جگہ 'قورمے روٹی' کا سہارا کہیں گے۔ دیکھیے تھا تو ایک غیر زبان کا لفظ، پر فارسی میں کیسا گھر کر گیا!

۸۔ 'قیمہ' کوئی کہتا ہے فارسی ہے کوئی سمجھتا ہے عربی ہے، مگر حقیقت میں ترکی ہے اور 'قیمق' مصدر ہے (قیمہ کرنا)، ہمارے ہاں 'قیمہ پلاؤ' تو پکتا ہے مگر شوربے دار قیمہ نہیں ہوتا۔ ایران میں 'قیمہ شوربا' ہوتا ہے، جو ایک قسم شوربے ہی کی ہے۔

۹۔ 'قورمہ' بھی ترکی ہے۔ ترکی مصدر 'قاوُرمق' (یا قاوُورمق) کے معنے ہیں بھوننا، تلنا (یا دم

---

[۱] 'پوت' کلیجی ہے۔ اِس سے کہیں کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ یہ وہی 'پُوت' ہے جسے ہمارے ہاں 'لختِ جگر' کہتے ہیں۔ ہاں، ایک بات ہو سکتی ہے: ہندستانی میں انتڑیوں وغیرہ کے لیے 'آنتیں پوتیں' بولتے ہیں؛ جیسے "ڈاکو نے اُس کے پیٹ میں ایک بھالا ایسا مارا کہ بچارے کی آنتیں پوتیں نکل پڑیں"۔ اِس 'پوتیں' کو اگر تابع مہمل نہ مانیے، تو یہ 'پوت' (کلیجی) کی جمع ہے، مطلب یہ کہ کلیجی اور وہ چیزیں جو اُس سے ملی ہوئی ہیں جیسے دل پھیپھڑا وغیرہ

پر پکانا)، 'قاوُرمہ': اس طرح پکائی ہوئی چیز۔ ترکی زبان میں طویل حرفِ علت نہیں ہوتے۔ اس لیے الف اور زبر میں، واو اور پیش میں، ی اور زیر میں، مقدار کے لحاظ سے کچھ فرق نہیں۔ جہاں چاہیے زبر کی جگہ الف، پیش کی جگہ واو اور زیر کی جگہ ی لکھیے، اس طرح 'قاوُورمہ' 'قاورمہ'، 'قورما' ایک ہی لفظ کی کئی لکھاوٹیں ہیں۔ معنے اور تلفظ سب کے ایک ہیں۔ اسی سے ہمارا 'قورمہ' بنا ہے۔ فارسی لغت کی کتابوں میں قورمہ نہیں ملتا۔ معلوم ہوتا ہے ایرانیوں نے قلیے ہی پر قناعت کی۔

۱۰۔ قیمے اور قورمے پر ایک اور ترکی لفظ یاد آیا۔ 'قبُرغہ' اور 'قبُرقہ' پسلی کو کہتے ہیں، فارسی کے لغتوں میں یہ لفظ ایک قصّے کی تقریب میں آیا ہے۔ لکھا ہے کہ ایک شخص کے پاس ایک غلام تھا، بہت ہی احمق۔ آقا نے ایک دن (شاید اس کی کسی تازہ بے وقوفی پر جھنجلا کر) کہا کہ سب آدمیوں کے تو سات پسلیاں (ہفت قبُرغہ) ہوتی ہیں، مگر تیرے چھے ہی (شش قبُرغہ) ہیں؛ تو مر جائیگا۔ غلام یہ سن کر سخت پریشان ہوا اور اسی وہم میں بالآخر اُس کی جان گئی۔ اُس وقت سے احمق آدمی کو 'شش قبرغہ' کہنے لگے۔ چنانچہ شرف الدین شفائی" کا شعر ہے:

شش قبُرغہ غلام مجہولی

کہ نہ گرجی بود نہ کشمیری۔

سینے کے گوشت کے پارچے، پسلی کی ہڈیوں کے ٹکڑوں سمیت، ماہی توے میں تل لیے جاتے ہیں۔ اِن کو بھی 'قبرغہ' کہتے ہیں، جو ترکی کھانوں میں ایک لذیذ قسم کباب کی ہے۔ ہندستان میں اس قسم کے کباب کشمیریوں کے ہاں عام طور پر پکتے ہیں اور وہ بھی اُن کو "قبرغہ" ہی کہتے ہیں البتہ نوکروں نے اُسے "قبرگہ" بلکہ "قبرگاہ" بنا لیا ہے۔ مخدومی سر تیج بہادر سپرو فرماتے تھے کہ استنبول میں اُنھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہاں بھی اس لذیذ کھانے کا نام اور مزا بالکل وہی ہے جو کشمیر میں۔

۱۱-'شوربا' کو عربی مادّے 'ش ر ب' سے ذرا بھی تعلق نہیں۔ 'شوربا' دو لفظوں 'شور' اور 'با' سے مل کر بنا ہے اور یہ دونوں فارسی اور ٹھیٹ فارسی ہیں۔ 'ابا' کے معنے محض کھانے کے ہیں، چاہے آش ہو یا شوربا یا روٹی۔ ایک نعتیہ قصیدے میں "خاقانی" کہتا ہے:

چوں نوبتِ نبوّت او در عرب زدند

از جودی و اُحد صلوات آمدش صدا

برخوانِ این جہان نہ زد انگشت در نمک

ناخوردہ دست شستہ ازیں بے نمک اُبا[1]

'اَبائے گلوگیر' اس کھانے کو کہتے ہیں جس سے پھندا بیٹھے یا جو اُچھو جائے۔ "خاقانی" ہی نے ایک اور جگہ کہا ہے:

ازیں حریفِ گلو بُر حَذَر گزید، حَذَر!

وزیں اَبائے گلوگیرِ ابا نمود، ابا۔

جیسے اور لفظوں میں سے 'اَبا' میں سے بھی ابتدائی الف بعد کی زبان میں گر گیا۔ مرکب لفظوں میں 'با' آتا ہے[2] یا اس کا بدل 'وا' اور کبھی 'فا' اور 'پا' بھی۔ ملاحظہ ہو:

---

[1] کلیات خاقانی کے نولکشوری چھاپے میں یہ شعر اس طرح ہے:

برخوان آن جہان زدہ انگشت در نمک   نان خوردہ دست شستہ ازیں بے نمک ابا

اور 'آن' کا ایک نسخہ 'این'، 'زدہ' کا 'نزد' اور 'در' کا 'بر' ہے۔ میں نے 'این' اور 'نزد' کو اختیار کیا ہے اور دوسرے مصرعے میں 'نان خوردہ' کو میں صحیح نہیں جانتا، 'ناخوردہ' چاہیے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ اس جہان کی لذتوں پر ہاتھ نہیں ڈالا اور اس دنیا کے بے نمک کھانے کو بے کھائے (اس سے) ہاتھ دھوئے۔ [2] 'با' یا 'وا' اکیلا کم آتا ہے؛ مگر آتا ہے، جیسے حکیم "سنائی" کے اس شعر میں:

(۱) آرد با۔ حریرہ، جسے آردابہ بھی کہتے ہیں۔

(۲) اسپید با، سپیدوا جسے ماست با بھی کہتے ہیں، ایک کھانا ہے جو دہی سے بنتا ہے۔

(۳) بیا۔ "بن با" کا مخفف۔

(۴) برغست وا۔ برغست (جنگلی پالک) کا آش۔

(۵) بن با۔ بن یا ون (یعنی حبۃ الخضراء) کا سالن۔

(۶) بوبا۔ پہاڑی بکری کے گوشت کا سالن۔ (بُو = پہاڑی بکری)۔

(۷) پینوا، پیئوا۔ تازہ پنیر کا آش۔ (پینو = تازہ پنیر یا دہی)۔

(۸) خشک وا، خشک فا۔ روٹی جو بے خمیر آٹے کی پکے، نان فطیر یعنی چپاتی۔

(۹) دوغ با۔ اسپید با۔ ماست وا۔

(۱۰) زیربا، زیروا۔ ہلدی پڑا شوربے دار سالن؛ کوئی سالن جس میں شوربا بہت ہو (جسے ہم لوگ "بنیا ڈھب" کہتے ہیں)۔

(۱۱) زیرہ با۔ مرغ کا سالن جس میں زیرہ اور سرکہ پڑا ہو، اور زعفران اور مسالے بھی۔[۱]

(۱۲) سرکہ با، سکبا، سکوا؛ گوشت، گیہوں کا دلیا، سرکہ اور خشک میوہ ڈال کر پکاتے ہیں۔

گرت نزہت ہمی باید بہ صحرائے قناعت شو
کہ این جا باغ در باغست و خوان در خوان و وا در وا۔

[۱] مرزبان نامہ ص ۱۶۹ (لائڈن ۱۹۰۹ء)۔ یہ کتاب مرزبان ابن رستم ابن شروین نے چوتھی صدی ہجری میں طبرستان کی بولی میں لکھی تھی۔ سعد الدین وراوینی نے ۶۲۲ھ سے پہلے اُس کا ترجمہ عراقی فارسی میں کیا۔ دلچسپ اور نتیجہ خیز کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ یہاں اُن میں سے ایک داستان طباخ نادان (ص ۱۶۷-۱۶۹) سے بحث ہے:

(۱۳) شبکنبا (شکنبہ با شکنب ابا یا شکنب اوا کا مخفف)[۵] او جھڑی، گیہوں کا دلیا اور سرکہ ڈال کر پکاتے ہیں۔

(۱۴) شوربا، شورزوا۔ پکے ہوئے گوشت کا پانی۔

(۱۵) شیربا، شیروا؛ دو چیزوں کو کہتے ہیں: (۱) شیر برنج، (۲) دودھ کو دہی کی طرح جما کر اس پر خشک میوہ چھڑک دیتے ہیں اور کچھ دن رہنے دیتے ہیں، پھر کھاتے ہیں یعنی ایک قسم کا پنیر۔

(۱۶) غوربا، غورہ با، غورہ وا؛ گوشت میں کچے انگور ڈال کر پکاتے ہیں[۶]۔

ایک حکیم ایک دن کچھ لوگوں کے سامنے تقریر کر رہا تھا حکمت کے بہت سے نکتے بیان کیے۔ اور ایک موقع پر اعتدال کی فضیلت میں کہا کہ اگر چاروں خلطیں: صفرا، سودا، بلغم، خون، ٹھیک مقدار میں ہوتی ہیں تو آدمی کا مزاج اپنی حالت پر رہتا ہے، اور اسی طرح آفتاب جب ربیع میں اعتدال پر ہوتا ہے تو دن رات کے گھنٹے برابر برابر ہوتے ہیں۔ ایک باورچی بھی کھڑا یہ تقریر سن رہا تھا، سمجھا کہ اعتدال سے مراد ہے چیزوں کی مقداروں کا برابر برابر ہونا۔ یہ سن کر

"برفت و دیگے زیرہ با بساخت و گوشت و زعفران و زیرہ و نمک و آب و دیگر توابلِ راستا راست (یعنی برابر برابر) در و کرد۔ چون بپرداخت پیش استاد نہاد و بدہان جہل خویش ظاہر گردانید۔"

اس قصے سے دو باتیں معلوم ہوئیں: (۱) ایران میں یہ کھانا چوتھی صدی میں بھی پکتا تھا اور زیرہ با کا لفظ چوتھی نہیں تو چھٹی ساتویں صدی میں ضرور بولا جاتا تھا۔ (۲) زیرہ با میں گوشت اور زیرے کے علاوہ زعفران اور اور مسالے بھی پڑتے تھے۔

[۵] شبکنب اور شبکنبہ او جھڑی کو کہتے ہیں، شکنب ایک شکل شکم کی ہے۔

[۶] طبری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کچے انگور کا سالن ایران میں ایک بہت پرانی چیز ہے

(۱۷) کدوبا۔ کدو کا سالن۔

(۱۸) کرنبا، (کرنب با، کا مخفف) کرم کلے کا سالن۔

(۱۹) کشک با، حلیم (کشک جو کو کہتے ہیں، اور پنیر کو بھی)۔

(۲۰) گندم با۔ گیہوں اور گوشت کا کھچڑا۔ حلیم۔

(۲۱) گیپا، گیپا۔ بکرے کی آنتوں کے ٹکڑوں کو دھو کر صاف کرتے ہیں، پھر اُن میں گوشت کا قیمہ اور نمک مسالا یا چاول میوہ وغیرہ بھر کر پکاتے ہیں۔ اس طرح کے کھانے کو اور بعضے میٹھے کھانوں کو بھی گیپا کہتے ہیں۔ اِس میں 'پا' یقیناً وہی 'با' ہے۔ 'کی' یا 'گی' کی تحقیق نہیں۔

(۲۲) ماست با، ماست وا، اسپید با، دوغ با۔ اسی کو 'ماستابہ'، 'ماستاوہ' یا 'مستاوہ' بھی

(تاریخ طبری، لائڈن، ج ۱، ص ۹۹۰)۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ بلعمی کے فارسی ترجمے (نولکشوری) میں یہ حکایت کیوں کر حذف ہو گئی۔ اگر فارسی ترجمہ ہوتا تو غالباً اُس میں 'غورہ با' کا لفظ بھی ملتا۔ حکایت اِس سلسلے میں ہے کہ ہرمز (نوشیرواں کا بیٹا) رعایا کے حقوق کی حفاظت میں امیروں اور درباریوں کو بہت سخت سزائیں دیتا تھا۔ طبری کی روایت یہ ہے:-

"انگوروں کے پکنے کی فصل تھی کہ ایک دن ہرمز گھوڑے پر سوار ساباط مدائن کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں باغ اور تاکستان پڑتے تھے۔ جو سوار بادشاہ کے ساتھ تھے اُن میں سے ایک نے، یہ دیکھ کر کہ ایک تاک میں کچے انگور لٹک رہے ہیں، کچھ گچھے توڑ لیے اور ایک غلام کو جو اُس کے ساتھ تھا دے کر کہا: اِن کو گھر لے جاؤ گوشت کے ساتھ پکا کر ان کا شوربا بنانا؛ آج کل بہت فائدے کی چیز ہے۔" تاکستان کا رکھوالا یہ دیکھ کر اُس کی طرف آیا اور اُسے پکڑ لیا اور زور سے چیخا۔ سوار اُس سزا کا خیال کر کے، جو ہرمز اُسے اُس کی اِس دست درازی پر دیتا، ایسا ڈرا کہ اپنی سونے کے کام کی پیٹی جو اس وقت وہ لگائے تھا اُتار کر باغبان کو اُن ادھ کچرے انگوروں

پکھتے ہیں یعنی ماست اور آب سے بنا ہوا۔

۲۲۔ نسک با۔ کھانا جس میں مسور ڈال کر پکاتے ہیں۔

ان سب لفظوں میں جو ایک مشترک ٹکڑا 'با/وا' ہے، اور کہیں کہیں 'پا/فا' بھی۔ اُسے لغت نویسوں نے آش کا ہم معنی بتایا ہے۔ مگر ایک لفظ ایسا بھی ہے جس میں یہ معنے ٹھیک نہیں بیٹھتے یعنی انگشت با۔ انگشت وا۔ انگشت۔ کوئلے کو کہتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ کوئلے کا آش حریرہ یا سالن ایک بے معنی بات ہو گی، اُس روٹی کو انگشت وا کہتے ہیں، جو کوئلے کی آگ پر سنکی گئی ہو۔ ایران کے عام دستور کے مطابق تنور میں نہ پکائی گئی ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ 'با/وا' وغیرہ کے معنی پکانے کے ہیں[۱]۔ چنانچہ ایک اور لفظ ہے نان با/نان وا جو نان پز کا ہم معنی ہے یعنی روٹی پکانے والا، یہ وہی نان بائی ہے جسے ہمارے ہاں بھی سب خوب پہچانتے ہیں۔ صاحب بہار عجم کا یہ خیال صحیح نہیں، کہ شاید یہ اصل میں نان و بائی تھا کثرت استعمال

[۱] "ازالوان ابا ہا بساختند" (مرزبان نامہ ص ۲۰۰)۔

کے بدلے دی جو اُس نے اُس کے باغ سے توڑ لئے تھے، اور اسے غنیمت جانا کہ رکھوالے نے اسے قبول کر لیا۔

فردوسی نے اس واقعہ کو یوں لکھا ہے:

وزآں پس بہ نخچیر شد شہریار	بیاورد ہر کس فراواں شکار۔
سپہبد نژادے وکندآورے	رزے دید، درراہ، بارآورے
سراسر ہمہ رز پُر از غورہ دید	بفرمود، تا کہترش دردوید۔
ازاں خوشۂ چند ببرید و بُرد	بہ ایوان وخوالیگرش راسپرد۔
بیامد خداوند رز در زمان؛	بدیں مرد گفت: ای بدبدگمان؛

سے عطف کا واو گر گیا" بہار کے پیش رو مصنفوں نے "نان با" کے معنے خباز، اور "نان پز" ہی لکھے ہیں[۵] "نان با" اسم فاعل ترکیبی ہے، جیسے خود "نان پز" یا "دل کش"، "دل آزار" وغیرہ۔ ترکیب "انگشت با" کی یہی ہے مگر اس میں معنے اسم مفعول کے ہیں، جیسے "دلپذیر"، "شہ نشین"، "مشکل خواں" (وہ لکھاوٹ جو مشکل سے پڑھی جاسکے)[۶]

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "با" اگر فعل ہے (جس سے اسم فاعل اور اسم مفعول بنتے

نگہبان این رز نہ بودی بہ رنج،	نہ دینار دادی بہار انہ گنج۔
چرا رنج نابردہ کردی تباہ؟	بنالم کنون از تو در پیش شاہ۔
سوار دلاور، ز بیم زیان،	بہ زودی کمر باز کرد از میان؛
بدو داد پر مایہ زریں کمر،	بہ ہر مہرہ در نشاندہ گہر۔
خداوند رز، چون کمر دید، گفت	کہ کردار بد چند باید نہفت؛
تو با شہر یار آشنائی مکن!	خورندہ نہ داری بہائی مکن۔
سپاسے نہم بر تو بر زیں کمر	تو بے جانی، ار بشنود داد گر۔

("شاہنامہ"، کلکتہ، ج ۴، ص ۱۸۰۱)

[۴] افسوس ہے کہ فردوسی نے یہاں انگوروں کو خوان سالار (یا باورچی) کے حوالے کر کے قصے کو مختصر کر دیا اگر کچے انگوروں کے سالن کی صفت جو سوار نے بتائی تھی بیان کرتا تو "غورہ" کیساتھ "غوربا" بھی شاہنامہ میں آجاتا۔

[۵] غالباً اور لفظوں کے قیاس پر "نان با" کو لوگ "نان بائے" بھی بولنے لگے۔ وہی آگے بڑھ کے "نان بائی" ہو گیا۔ یہاں "ی" نسبتی یا مصدری نہیں۔ البتہ "نان با" کے پیشے کو "نانبائی" کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح "دکان نانبائی" کا ترجمہ ہوگا: "دکان جس میں روٹی پکتی اور بکتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ اردو میں (اور پشتو میں بھی) "نان بائی" روٹی پکانے اور بیچنے والے کو کہتے ہیں۔

[۶] ملاتشد قامت مجنون ز گرانباری فکر ٭ خط دیوانی زنجیر چہ مشکل خوانست۔ (صائب)

ہیں)، تو اُس کا مصدر 'بائیدن' (یا بائتن) ہونا چاہیئے، مگر ایسا کوئی مصدر نہیں ہے۔ اِس کا جواب یہ ہی کہ 'بین' 'بیند' 'بینم' کا بھی تو مصدر نہیں ہی۔ 'دیدن' ایک دوسرے مادّے کا مصدر ہے جس کے امر اور مضارع کے صیغوں کا پتا نہیں۔ ہر زبان میں ایسا ہوتا ہی کہ ایک مدت گزر جانے پر کچھ لفظ ترک ہو جاتے ہیں (متروک نہیں کہتا کہ وہ ہمارے شاعروں کا حصّہ ہے)۔ ان میں سے بعضوں کے کچھ نشان باقی رہ جاتے ہیں، جو اکثر دوسرے لفظوں کے ساتھ مل کر پہچانے بھی نہیں جاتے کہ یہ مستقل لفظ ہیں یا کبھی تھے۔ یہی حال اِس 'با' کا ہے جو کہیں کہیں 'وا'، 'پا' یا 'فا' کی صورت میں بھی دکھائی دیتا ہی۔

اِسی سلسلے کا ایک اور لفظ 'باورچی' ہی جسے لوگ عام طور پر فارسی نہیں جانتے یا کم سے کم جن معنوں میں وہ ہندستان میں بولا جاتا ہے اُن کو غیر فارسی جانتے ہیں۔ نویں صدی ہجری کے ایک ایرانی شاعر "آذری"[۵] کا شعر ہی:

> چوں قسمتِ ارزاق کند، شیرِ فلک را
>
> باورچیِ خوانِ تو زند نعرہ کہ "نازو"[۶]

اس ترکیب کی بحث پر یاد آیا کہ ہمارے اِس زمانے کے مالکانِ تحریر کتاب کی لکھائی چھپائی کی صفت میں ایک نیا لفظ 'دیدہ زیب' لکھا کرتے ہیں۔ یہاں 'زیب' کا لفظ قیاسِ لغوی سے بہت دور ہے۔ سوا سرمے کاجل کے مشکل ہی سے کسی چیز کو 'دیدہ زیب' کہہ سکتے ہیں۔

[۵] نورالدین جمال حمزہ، آذری تخلص، اِسفرائیں (خراسان) میں ۷۸۴ھ ہجری میں پیدا ہوا بہت ذی علم تھا اور کئی تصنیفیں چھوڑیں۔ احمد شاہ بہمنی کے عہد میں ہندستان آیا تھا؛ تھوڑے دن بعد خراسان واپس گیا اور وہیں ۸۶۶ھ ہجری میں مرا۔

[۶] بلی کو 'نازو' کہہ کے پکارتے ہیں۔ یہاں وہ شیرِ فلک کو اِس طرح پکارتا ہی؛ گویا اُس کے نزدیک شیر بلی ہی۔

اِس سے لغت نویسوں کے اِس قول کی تائید ہوتی ہے کہ "شاہی خاصے کے مہتمم اور چاشنی گیر کو باورچی کہتے تھے"۔ پھر بھی بعض لغت نویسوں نے اِس کے معنے طباخ، مطبخی یا آش پز لکھے ہیں اور ہندستان میں یہ لفظ انھیں معنوں میں بولا جاتا ہے۔ اکثر لوگ خیال کرتے ہیں کہ کسی فارسی لفظ کا جو مفہوم ایران میں ہو وہی اُس کا حقیقی اور اصلی مفہوم ہے، مگر یہ خیال ہمیشہ صحیح نہیں ہوتا۔ بعض لفظ ایسے ہیں کہ کئی سو برس ہُوئے ہندستان میں اپنے اصلی معنوں میں رائج ہُوئے اور اب تک بولے جاتے ہیں، مگر خود ایران میں اُن کا مفہوم بدل گیا۔ اِس لیے یہ بات قیاس سے دور نہیں کہ 'باورچی' ابتدا میں ایران میں بھی کھانا پکانے والے ہی کو کہتے ہوں۔

لفظ کے اشتقاق کو دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ تین ٹکڑے ہیں: 'با'، 'ور'، 'چی'۔ با کے معنے کھانا یا کھانا پکانا۔ اِس لیے 'باور' کے معنے ہوئے کھانا پکانے کے فن کا ماہر یا اُستاد؛ جیسے سخنور، ہنرور، پیشہ ور، زخمہ ور[۵]، سوداور[۶]۔ جب 'باور' اسم فاعل ہے تو پھر 'چی' کا بڑھانا ضروری نہ تھا، لیکن زبان کے بولنے والوں کے ذہن میں جب کسی لفظ کا اشتقاق پوری طرح صاف نہیں ہوتا ہے تو اکثر ایسے حرف بڑھا دیے جاتے ہیں، جن کی حقیقت میں ضرورت نہیں ہوتی مگر جو مماثل لفظوں کے قیاس پر زبان میں نہ صرف راہ پا جاتے ہیں، بلکہ صحت اور فصاحت کی سند بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ یہاں ایک اور بات بھی ہے۔ 'باور' ایک لفظ پہلے سے زبان میں موجود تھا جس کے معنے یقین کے ہیں۔ اِس وجہ سے ضرورت تھی کہ دونوں میں فرق کرنے کے لئے ایک کی صورت کسی قدر بدل جائے۔

---

[۵] زخمہ = مضراب۔ زخمہ ور = ستار وغیرہ بجانے میں اُستاد؛ موسیقی کا ماہر۔ [۶] سوداور = سوداگر۔ برہان[۵] میں اِسے 'سوداآور' قرار دیا ہے، مگر یہ قیاس سے دور ہے۔ 'ور' بدل ہرگز 'گا'۔

ان سب باتوں کو ملا کر دیکھیے تو اس میں شبہ نہیں رہتا کہ "باورچی" کے معنے ابتدا میں 'پکانے والے' ہی کے تھے۔ 'کھانا چکھنے والے' یا 'دسترخوان کے مہتمم' کے معنے بعد کو پیدا ہوئے اور غالبًا ایک زمانے تک ساتھ ساتھ دونوں معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوتا رہا۔ زبان کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں سے 'باورچی خانہ' بنا اور "باورچی گری" (یعنی کھانا پکانے کا فن یا خدمت)۔ 'باورد' ایک جگہ کا نام ہے اور 'باوردی' اس کی طرف نسبت؛ مگر 'باوردی' ایک کھانا بھی ہے جو آٹے سے بنتا ہے، یعنی ایک طرح کا حریرہ۔ اس کا یہ نام یا تو اس لئے ہے کہ باورد کے لوگ خاص طور پر اسے کھاتے ہوں گے، یا پھر وہی 'با' اس کا بھی ایک جزء ہے۔ یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔

'با' کی ترکیب والے عربی میں دو تین لفظ ملتے ہیں: زیرباج، سکباج، شورباج جو فارسی سے عربی میں آئے ہیں۔ عام خیال ہے کہ عربوں نے جب 'زیربا' وغیرہ کو اپنی زبان میں لیا تو اُن کے آخر میں ایک 'ج' اپنی طرف سے بڑھا کر بولنے لگے۔ یہ صحیح نہیں۔ 'توتیا' بھی تو عربی میں فارسی سے گیا، مگر اُسے کسی نے 'توتیاج' نہ بنایا۔ واقعہ اتنا ہی ہے کہ جہاں غیر زبان میں گ ہوتا ہے، وہاں عرب ج بولتا ہے۔ اسلامی زمانے کے آغاز تک بہت سے فارسی لفظوں کے آخر میں گ بولا جاتا تھا (جو آگے چل کے گر گیا)۔ ایسے فارسی لفظ جب عربوں نے سُنے تو گ کی جگہ ج بولے، اس لئے یہ ج ثبوت ہے اس بات کا کہ فارسی لفظ 'با' قبل اسلامی فارسی میں 'باگ' تھا۔ اس زمانے کی ایرانی زبانوں (پہلوی وغیرہ) میں جو گ تھا وہ اُس سے زیادہ پرانے زمانے میں ک تھا، اس لئے اس لفظ کی صورت قدیم فارسی میں 'باک' ٹھہرتی ہے۔ ب، پ، ت، د کا آپس میں بدل جانا بہت عام ہے، جیسا کہ خود 'با' کے مرکبات میں دیکھا گیا اور اور لفظوں میں بھی اکثر دیکھا جاتا ہے۔ اس لئے 'با' کی اصل 'باک' یا 'واک' ہونا چاہیے، یا پھر 'پاک'[1] اور یہی "پخ" اوستا میں و

---

[1] یزدی گبری بولی میں آج بھی باورچی خانے کو 'پاک وی' کہتے ہیں۔

'پاک' کی شکل میں موجود ہی، جس کے معنے ہیں 'پکتا ہوا' یا 'پکاتا ہوا'۔ 'اوستا' کی زبان میں اس کا مادہ 'پک' ہی، جس کے معنے ہیں 'پکانا'؛ کسی چیز کو اُبال کر یا تنور میں پکا کر یا تَل کر کھانے کے لیے تیار کرنا؛ سنسکرت میں بھی اِس مادے کی یہی صورت ہے اور یہ اور ہمارا 'پکنا' اصلاً ایک ہی لفظ ہے۔

۱۲- 'باورچی' کا ذکر آیا، تو 'میدہ سالار' کا بھی خیال آیا۔ روٹی پکانے والے کو کہتے ہیں گیہوں کے آٹے کو دو یا کئی بار چھانتے ہیں تو 'میدا' ہو جاتا ہے (فارسی: میدہ)۔ اُردو میں بہت عام ہے اور الف سے (یعنی کھینچ کے) بولا جاتا ہے۔ اِس لیے الف ہی سے لکھنا بھی چاہیے؛ مگر لوگ ستم کرتے ہیں کہ 'مائدہ' لکھتے ہیں جو دوسرا ہی لفظ ہے۔ عربی میں مائدہ اُس خوان کو کہیں گے جو کھانے سے پُر ہو۔ صرف 'کھانے' کو بھی کہتے ہیں۔ جاہلی شاعروں کے کلام میں نہیں آیا ہے، مگر قرآن میں تو ایک سورت ہی المائدۃ ہے۔ پھر بھی یہ لفظ اصل میں عربی نہیں؛ حبشی زبان سے آیا ہے اور اُس میں 'ماذ' ہے۔ عربی مادے 'م ی د' سے اِس لفظ کو تعلق نہیں۔ فارسی والے 'میدہ' اور 'مائدہ' کو گڈمڈ نہیں کرتے۔ 'میدہ سالار' روٹی پکانے والے کو کہتے ہیں، 'مائدہ سالار' خاصے کے مہتمم یا چاشنی گیر کو۔

۱۳- کباب کی صورت ہی عربی نہیں، حقیقت بھی عربی ہے۔ 'کَبّ' کے معنے ہیں 'اوندھا کیا'، مگر اسی کے ساتھ 'لوٹا پوٹا'؛ 'الٹا پلٹا' بھی۔ اور یہیں سے ہے کہ گوشت کو آگ پر الٹ پلٹ کرنے کے معنے پیدا ہوئے، چنانچہ 'کَبَّبَ' کے معنے ہیں: گوشت کو کباب کیا'۔ لسان العرب میں بہت کھول کر لکھدیا ہی:

(۱) والکبابُ الطباهجۃُ والفعلُ التکبیبُ ... وکَبَّ الکبابَ عَمِلَہٗ۔

(جلد ۲، ص ۱۹۱)۔

(۲) الطباهجۃ فارسیؔ معرّبۃ ضربؔ من قلیِ اللحم۔ (جلد ۳، ص ۱۳۱)

اِس کے بعد کوئی گنجایش شک کرنے کی نہیں رہتی۔

۱۴۔ کھانے، سب تو نہیں، جو سامنے تھے ہو چکے۔ ایک لذیذ چیز رہ گئی۔ اودھ کے قصبوں میں 'جھجلے' پکتے ہیں اور اودھ ہی میں کہیں کہیں اُن کو "شیرازے" بھی کہتے ہیں[۵۱]۔ عربی میں پانی نچوڑے ہوئے دہی یا پنیر کو 'شیراز' کہتے ہیں اور جمع دو طرح پر آتی ہے 'شرارین' اور 'شوارین'۔ برہان قاطع میں لکھا ہے کہ بعضوں نے اِس لفظ کو عربی بتایا ہے۔ عربی لغت کی کتابوں میں اسے فارسی بتایا ہے اور یہی صحیح ہے۔ فارسی میں علاوہ پنیر کے بعض مٹھائیوں مربّے اور اچار کو بھی کہتے ہیں۔ جھجلے بھی میٹھی چیز ہے معلوم نہیں ایران کی کس خاص مٹھائی کی مشابہت سے 'شیرازے' نام پڑا۔

۱۵۔ 'قالین' کی مختلف صورتوں کے بارے میں دو باتیں عرض کروں گا:

(۱) ق فارسی حرف نہیں ہے۔ عربی اور ترکی لفظوں کے ساتھ فارسی میں داخل ہو گیا مگر عام طور پر ایرانی اِسے غ سے بدل دیتے ہیں۔ اِس لئے 'آقا' سے 'آغا' ہوا، 'قالی' سے 'غالی' اور 'چہ' لگ کر 'غالیچہ'۔ (۲) فارسی کے بعضے اِسموں کی دو دو صورتیں ہیں: 'آستی' اور 'آستین'، 'زمی' اور 'زمین'۔ اِس قیاس پر لوگ عربی لفظ 'کمین' کو 'کمی' بھی بولنے لگے۔ چنانچہ اسدی نے اپنی فرہنگ "لغتِ فُرس" میں لکھا ہے:

"کمی کمین باشد۔ خسروی گفت

اے سراپاے معدنِ خُرّمی[۵۲] چشم تو بر دلم نہادہ[۵۳] کمی"۔

---

[۵۱] تفصیل کے لیے دیکھیے 'ہندستانی' ج ۳، ص ۴۰۲، حاشیہ ۲۔ [۵۲] یہاں 'خرّمی' کو بلا تشدید پڑھنا چاہیے۔ [۵۳] یعنی 'نہادہ'۔

اسی قیاس پر قالی کی دوسری صورت قالین ہو گئی۔یہاں "ن" نسبت یا کسی اور معنی کے لئے فرض کرنا بجا نہ ہوگا۔

۱۶۔"شاگرد"۔"سعدی" کا ایک اور شعر بھی ہے:

زرش دیدم و زرع و شاگرد و رخت　　ولے بے مروت چو بے بر درخت

مگر یہ لفظ تو بہت پرانا ہے۔پہلوی میں "اشاکرت" تھا۔اس سے قدیم ارمنی زبان میں پہنچ گیا تھا: "اشکرت"، معنے وہی: "چیلا"۔

۱۷۔"راز" (= راج)۔"عسجدی" کا شعر مجھے یوں ملا:

بہ یکے تیر ہمہ فاش کند راز حصار　　در بر و کردہ بود سنگ بجائے گل راز۔

ایک شعر حکیم "سنائی" کا بھی ہے:

جان بہ دانش کن مزین تا شوی زیبا از آنک

زیب کے گیرد عمارت بے نظام و دست راز۔

۱۸۔"مستری" کے بارے میں ایک زمانے میں میرا بھی ایسا ہی کچھ خیال تھا، مگر وہ تو پرتگالی نکلا: Mestre۔

۱۹۔"خرط" کے سلسلے میں یہ بات بھی کہنے کی ہے کہ "مخروطات" کا علم ریاضیات کی ایک بہت اہم شاخ ہے جس میں یہ اصطلاحیں عام ہیں: "مخروطی قائم"، "مخروطی مائل"، "مخروطی مجسم"، "مخروطی مضلع"۔

۲۰۔عربوں سے "شاقول" سن کے ایرانیوں نے "شاقول" کہا مگر اسے ذرا ہلکا کر کے "شاقل" بھی بولنے لگے اور "شاہول" بھی۔شاید اسی اخیر لفظ سے پشتو میں "شاوُل" ہو گیا اور ہندستانی میں "شاہول" اور "ساہُل" ہوا۔ہندستانی میں زیادہ عام "ساہُل" ہے۔یہ سب کچھ ہوا مگر اصل کے لحاظ سے "شاقول" عربی نہیں ہے بلکہ آرامی سے عربی میں آیا ہے۔"فاعُول" عربی وزن نہیں ہے۔

گو کہ اس وزن پر بہت سے لفظ عربی میں استعمال ہوتے ہیں۔آرامی زبان میں (جس کی سب سے اہم بولی سُریانی ہے) فاعول اسم فاعل کا وزن ہے۔چنانچہ اس وزن کے لفظوں اور ناموں کو عرب کے اہلِ لغت نے بالاتفاق دخیل بتایا ہے۔ایسی صورت میں یہ کہنا درست نہیں کہ شاید شاقول ش سے نہ ہو بلکہ تاقول ث سے ہو۔واقعہ یہ ہے کہ آرامی زبان میں یہ مادہ (ش ق ل) موجود ہے اور علاوہ "شاقول" کے اور لفظ بھی اس مادے سے بنے ہیں۔یہ بالکل ویسی ہی بات ہے کہ ناطور کو کوئی ناطور سمجھے پہلا لفظ آرامی زبان میں موجود ہے اور اُس کا وزن آرامی ہے، دوسرا عربی میں موجود نہیں اور وزن بھی عربی نہیں۔

اس وزن پر جو لفظ عربی میں ملتے ہیں اُن کی تقسیم یوں ہو سکتی ہے:۔

(۱) وہ لفظ جو آرامی ہیں اور آرامی سے عربی میں آئے۔

(۲) وہ لفظ جو کسی اور زبان (یونانی فارسی وغیرہ) سے آرامی میں آئے اور اُن کا الحاق آرامی وزن فاعول سے ہو گیا اور اس آرامی صورت میں وہ عربی میں داخل ہوئے۔

(۳) وہ لفظ جن کو عربوں نے اِس غیر عربی وزن کے قیاس پر خود بنا لیا۔

اس لحاظ سے "شاقول" پہلی شق میں پڑتا ہے۔تیسری شق میں پانچ سات لفظوں سے زیادہ نہیں ہیں اور اُن میں "شاقول" ہرگز نہیں ہے۔

۲۱۔ اُردو میں "ذرا" ایک نیا لفظ بنا۔عربی "ذرّہ" اسم ہے؛ وہ بھی اردو میں عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔اصل "ذرا" کی بھی اُسی عربی ذرّے سے ہے: مگر جب دونوں کے معنے جدا دونوں کے استعمال کا محل جدا جدا، دونوں کے تلفظ میں فرق، اور سب سے بڑی بات یہ کہ عربی میں یہ نیا لفظ موجود نہیں، تو پھر اِس کو ذال سے لکھنے پر بعضے لوگوں کو کیوں اصرار ہے۔جیسے "صحیح" سے اردو میں ایک دوسرا لفظ "سہی" نکلا:

"سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا"

یا جیسے 'مثال' سے ایک نیا لفظ 'مسل' بنا، ویسے ہی 'ذرّہ' سے 'ذرا'۔ یہ جو نئے لفظ بنے ہیں اِن کو بھی 'مسل' اور 'ذرا' لکھنا چاہیے۔

۲۲- فارسی میں 'چلبلہ' ہی اور 'چلپلہ'۔ معنے ہیں:

مضطرب اور بے آرام'؛ چنانچہ ظہیر فاریابی کہتا ہے:

اے ز نورِ رای تو خورشید و مہ شد در حجاب

وے ز جودِ دستِ تو ابرِ بہاری چلپلہ۔

ہندستانی 'چلبلا' کے معنے کچھ مختلف ہیں پھر بھی فارسی سے بہت قریب۔ ایک امکان یہ بھی ہے کہ ہندستانی لفظ بجائے خود پیدا ہوا اور فارسی 'چلبلہ' کا اثر اُس پر نہ پڑا ہو۔

۲۳- 'غفص' جب عربی لفظ نہیں، تو 'ص' سے کیوں لکھا جائے؟ 'غفس' چاہیے۔ "گف" بھی بولتے ہیں۔ یہ سب اُسی 'گبز' کے مختلف تلفظ ہیں۔ بنگال کے بعض مسلمان بزرگوں کو میں نے 'غول مال' بولتے سنا ہے۔ 'گول مال' کی شاید "تعریب" فرمائی ہے۔ دور کیوں جائیے خود ہمارے ہاں ایسے لوگ ابھی موجود ہیں جو 'بیگم' کو "بیغم" اور 'کاغذ' کو 'قاغذ' بولتے ہیں۔

لغاتِ جدیدہ

عربی زبان کے اخبارات، رسائل، تصنیفات، اور بول چال میں ہزاروں نئے الفاظ پیدا ہو گئے ہیں جن کے بغیر آج کل کی عربی زبان سمجھنا دشوار ہے، مصنف نے اس کتاب میں اس قسم کے چار ہزار جدید عربی الفاظ کا لغت لکھا ہے، طبع سوم قیمت ۱۲ حجم ۱۹۱ صفحے۔

"منیجر"

ہمارے علم کی حقیقت

از

جناب مولانا عبد الباری صاحب ندوی استاذ فلسفہ و دینیات جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن

(۲)

علم کے متعلق تین سوالات تھے، ہم کہان سے جانتے ہیں، ؟ (مبدء یا بدایت علم کا سوال) کیا جانتے ہیں، (ماہیت علم کا سوال) اور کہانتک جانتے ہیں، ؟ (منتہی یا نہایت علم کا سوال) اور ان بالا میں دراصل صرف پہلے سوال کا جواب تھا، کہ ہمارے تمام انواع واقسام کے معلومات و خیالات کا واحد سرچشمہ و ماخذ تجربہ اور محض تجربہ ہے، باقی دونون کے جوابات پہلے ہی کے جواب سے ازخود نکل آتے ہیں، اور اسی کی لازمی تفریعات ہیں،

جب ہمارے علم کا ماخذ و مبدء تجربہ اور صرف تجربہ ٹھہرا، تو ظاہر ہے کہ ہم جو کچھ بھی جانتے اور جان سکتے ہین، وہ اسی حسی و تاثی تجربہ کے پیدا کردہ تصورات اور ان کے مابین ربط و توافق یا تخالف و تضاد کا ادراک ہے، بس یہی ہمارے علم کی حقیقت و ماہیت ہے،

"علم اس کے سوا مجھ کو کچھ نہیں نظر آتا، کہ وہ ہمارے تصورات کے مابین ربط و توافق یا تضاد و تخالف کا ادراک ہے بس صرف اتنی ہی علم کی حقیقت ہے، جہاں یہ ادراک ہے علم ہے، اور جہان یہ نہیں ہے، وہان گو ہم وہم، قیاس، یا زعم سے کام لیں لیکن علم ہمیشہ مفقود ہوتا ہے۔"[1]

[1] سفر چہارم باب ۱

غرض علم یا جاننا نام ہے مختلف تصورات کے مابین توافق یا عدم توافق کے ادراک کا،
اس ادراک کے باعتبار یقین تین مراتب ہیں،

۱۔ یا تو یہ ادراک دو تصورات کے مابین بالذات و بلاواسطہ ہوگا، اس طرح جو علم حاصل ہوتا ہے، وہ بالکل قطعی اور یقینی ہوتا ہے، شک و شبہہ کی کوئی گنجایش نہیں رکھتا، اس کو ہم وجدانی (بدیہی) علم کہہ سکتے ہیں، اسلئے کہ اس میں ذہن کو ثبوت و تحقیق کی کوئی زحمت نہیں اٹھانی پڑتی، بلکہ یہ صداقت کا اسی طرح ادراک کر لیتا ہے، جس طرح آنکھ روشنی کا، ذہن کو صرف اس کی طرف ملتفت ہونے کی ضرورت ہوتی ہے، اور وہ ادراک کر لیتا ہے، کہ مثلاً سفید سیاہ نہیں ہے، دائرہ مثلث نہیں ہے، تین دو سے زیادہ، اور ایک دو کے مساوی ہے، اس طرح کی صداقتوں کو ذہن تصورات پر نظر پڑتے ہی محض وجداناً، بلا کسی مزید تصور کی وساطت کے پالیتا ہے، خود ہم کو اپنے وجود کا علم بھی اسی طرح بداہتہً و وجداناً حاصل ہے، گو ہم اپنی ذات یا روح کی مابعد الطبیعیاتی حقیقت و ماہیت سے آگاہ نہ ہوں، لیکن نفس اس کے وجود کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی،

"کیونکہ[1] ہمارے لئے کوئی چیز خود ہمارے وجود سے زیادہ بدیہی نہیں ہو سکتی.....
اگر میں تمام چیزوں میں شک کروں، تو بھی خود یہ شک مجکو اپنے وجود کے ادراک پر مضطر کر دے گا، اور خود اس میں شک کی کوئی صورت نہ ہوگی........
اگر میں جانتا ہوں کہ میں شک کرتا ہوں، تو جس یقین کے ساتھ میں شک کو جانتا ہوں، اسی یقین کے ساتھ اس کا ادراک رکھتا ہوں، کہ کوئی چیز شک

[1] خلاصہ بحوالہ سفر چہارم ج ۲ ب ۱۰،

کرنے والی ہے"؛[1]

یہ وہی دیکارٹ کا استدلال ہے، کہ

"میں سوچتا ہوں اس لئے میں ہوں"؛

۲- دوسرا مرتبہ علم ویقین کا برہانی ہے، جس میں ہم دو تصورات کے مابین جو تعلق ہے اُس کو کسی اور تصور یا تصورات کی وساطت سے جانتے یا پاتے ہیں، جب ذہن براہِ راست دو تصورات کے موازنہ سے ان کے توافق یا عدم توافق کا فیصلہ نہیں کر سکتا، تو دیگر تصورات کی وساطت سے کام لیتا ہے، اسی کو ہم "استدلال" کہتے ہیں، اور جو درمیانی تصورات اس وساطت کا کام دیتے ہیں، ان کو "ثبوت" کہا جاتا ہے" یہ ثبوتی علم گو یقینی ہوتا ہم اسکی شہادت نہ اتنی صاف و روشن ہوتی ہے، نہ ذہن اسکو اتنی جلد قبول کرتا ہے، جتنا وجدانی علم کو" دوسرا فرق یہ ہوتا ہے، کہ اگرچہ برہانی علم میں بھی دیگر تصورات کی وساطت کے بعد توافق یا عدم توافق کا ادراک شک وشبہہ سے نکل جاتا ہے، لیکن اس کے قبل شبہہ رہتا ہے، جو وجدانی علم میں نہیں ہو سکتا۔

وجود باری کا علم لاک کے نزدیک ہم کو برہاناً حاصل ہے، نظمِ عالم کے علاوہ اور اس سے بڑھ کر خود ہم کو اپنے اور اپنی طاقتوں کے وجود کے لئے ایک علیم وقدیر ذات کو ماننا پڑتا ہے، گو ہم اس کے صفات کا احاطہ نہیں کر سکتے، لیکن جب ہم اپنی اُس انفرادی ذات کی تحلیل کرتے ہیں جس کا علم واذعان (جیسا کہ ابھی اوپر معلوم ہو چکا) بلا شائبۂ شک بداہتہً ووجداناً حاصل ہے، تو وہ لازماً اپنے ماوراء کسی اور ذات کی محتاج معلوم ہوتی ہے،

یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ہم کو خدا کا علم ویقین حاصل ہو سکتا ہے، اور کیسے ہو سکتا ہے،

---

[1] خلاصہ بحوالہ سفر چہارم ج ۲،

میں سمجھتا ہوں کہ ہم کو خود اپنی ذات اور اس غیر مشکوک علم سے آگے جانے کی ضرورت نہیں کہ ہم خود ہیں، ...... انسان قطعاً جانتا ہے، کہ وہ موجود ہے، اور یہ کہ وہ کوئی شے ہے ...... دوسری طرف یہ بھی وجداناً وبداہتہً جانتا ہے، کہ کسی شے کی نسبت یہ سمجھنا کہ وہ محض لاشے سے پیدا ہو سکتی ہے، ایسا ہی ہے، جیسے لاشے کو دو قائمۃ الزاویوں کے برابر قرار دینا[۱]"

لہذا اگر میں ہوں تو میرا کوئی نہ کوئی پیدا کرنے والا بھی ضرور ہے، اور جس چیز کی کوئی ابتدا ہو اس کی کوئی نہ کوئی ابتدا کرنے والا یا خالق ہونا لازمی ہے، اور بالآخر اس خالق کو ازلی بھی ہونا چاہئے" اس لئے کہ جو چیز ازل سے نہ ہو گی، اس کی کوئی نہ کوئی ابتدا ہو گی، جسکو لازماً کسی اور شے کا آفریدہ ہونا پڑے گا[۲]"

پھر انسان اپنے اندر علم وادراک بھی پاتا ہے جس سے ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے' کہ ہماری خالق صرف کوئی چیز ہی نہیں بلکہ کوئی علم وادراک والی ذات ہے، ...... اگر یہ کہا جائے کہ ایک زمانہ ایسا تھا، کہ کوئی عالم ومدرک ذات نہ تھی، اور وہ ازلی ذات قطعاً فہم وادراک سے خالی تھی، تو میرا جواب یہ ہے کہ پھر ایسی صورت میں کبھی علم کا وجود نہیں ہو سکتا تھا، جو چیزیں علم سے قطعاً خالی ہیں، اور بلا کسی ادراک کے اندھے پن کے ساتھ عمل کرتی ہیں، ان کے لئے علم وادراک والی ذات کا پیدا کرنا ایسا ہی ناممکن ہے، جیسے کوئی مثلث اپنے تین زاویوں کو دو قائموں سے بڑا بنا دے، کیونکہ بے حس مادہ کے تصور کے یہ ایسا ہی منافی ہے، کہ وہ اپنے اندر ادراک وحس پیدا کرلے سکتا ہے، جیسا مثلث کے تصور کے یہ منافی ہے، کہ وہ اپنے اندر

---

[۱] و [۲] خلاصہ بحوالہ سفر چہارم جلد ب،

قائمون سے بڑے زاویے بنا سکتا ہے[۱]،

ماحصل یہ کہ جس طرح ہم کو خود اپنی ذات کے وجود کا علم بلاریب وشک وجداناً حاصل ہے، اسی طرح جب ہم اس ذات کو سامنے رکھکر اور اس کے تصور کی وساطت سے اس کے خالق کا پتہ لگانا چاہتے ہیں، تو برہاناً اس کا قطعی ویقینی علم حاصل ہوجاتا ہے، کہ وہ ایک ازلی علیم وقدیر ذات ہے، اور یہی خدا ہے،

"میرے نزدیک یہ ایک واضح بات ہے، کہ ہم کو ہر اُس شے سے زیادہ خدا کے وجود کا یقینی علم حاصل ہے، جو ہمارے حواس کے لئے براہ راست منکشف نہیں ہے، نہیں بلکہ میں کہہ سکتا ہون، کہ ہم خدا کا موجود ہونا اس سے زیادہ یقین کے ساتھ جان سکتے ہیں، جتنا کہ کسی اور چیز کا اپنے سے باہر موجود ہونا"۔

۳۔ تیسرا درجہ حسی یا ظنی علم کا ہے جس میں آدمی حس کے ذریعہ جزئی اشیاء کا ادراک کرتا، اور کائنات مادی کا علم حاصل کرتا ہے، گو یہ علم وجودِ ذات اور وجودِ باری کا ایسا یقینی وقطعی نہیں، تاہم ظنِ غالب اس کے وجود ہی کا ہے، اور عملاً اس کا پایا جانا یقینی معلوم ہوتا ہے، اگرچہ براہ راست ہم کو صرف اپنے تصورات کا علم حاصل ہے، اور موجوداتِ خارجی کا علم حسی تصورات کی وساطت ہی سے حاصل ہوسکتا ہے، اور اس لئے لازماً ہمارا علم صرف اسی حدتک درست ہوسکتا ہے جس حدتک کہ ان تصورات اور حقائقِ اشیا میں موافقت ہو، اور ایسا نہیں ہے، کہ ہمارے پاس اس کا سرے سے کوئی معیار ہی نہ ہو، کہ ہمارے تصورات خود اشیا کے موافق ہیں یا نہیں، ہمارے بسیط تصورات یقیناً حقائقِ خارجی کے مطابق ہوتے ہیں، کیونکہ بغیر حواس کی وساطت کے ذہن ان کو خود کسی طرح نہیں بنا سکتا، (جیسے کہ پیدائشی اندھے) لہذا معلوم ہوا کہ یہ محض ہمارے

[۱] خلاصہ بجوالہ سفر چہارم جلد ۱

تخیل کا افسانہ نہیں، بلکہ خارج از ذہن اشیار کی قدرتی اور باقاعدہ پیداوار ہیں، بیرونی اشیا کی واقعیت کا مزید ثبوت یہ امر بھی ہے، کہ واقعی حس سے جو تصور حاصل ہوتا ہے، اور حافظہ میں اس کا جو اعادہ کیا جاتا ہے، ان دونوں میں بہت فرق ہوتا ہے، اور جو لذت یا الم واقعی حس کی صورت میں ہوتا ہے، وہ محض اس کے اعادہ میں جب کہ بیرونی اشیار غائب ہوتی ہیں نہیں ہوتا، اس کے علاوہ ہمارے حواس ایک دوسرے کی توثیق کرتے ہیں، جو شخص آگ دیکھ رہا ہے، اس کو اگر اس کے واقعی اور خارجی وجود کی نسبت شبہہ ہو، اور جاننا چاہتا ہو کہ محض اس کا وہم نہیں، تو وہ اس میں اپنا ہاتھ ڈال کر اطمینان کر سکتا ہے، اس سے جو تکلیف ہوگی، وہ محض تصور یا وہم سے نہیں ہو سکتی تھی[1]

اس طرح کم وبیش مختلف مراتب یقین کے ساتھ ہم کو سب سے زیادہ یقینی طور پر بلا کسی شک وشبہہ کی گنجایش کے پہلے خود اپنی ذات کا یقین حاصل ہے، اس کے بعد ذات باری یا خدا کا، اور اسکے بعد اپنے باہر کی کائنات مادی کا، باقی سارے انسانی معلومات وخیالات اسی مثلث کے کسی کسی زاویہ سے تعلق رکھتے ہیں،

جب ہمارے علم کی حقیقت یہ ٹھہری کہ وہ فقط ہمارے تصورات کے مابین کسی ربط یا عدم ربط کے ادراک کا نام ہے، اور یہ تصورات تمامتر ہمارے تجربہ کے تابع ہیں، تو اب تیسرے سوال کا جواب کہ ہم کہاں تک جانتے ہیں، ؟ یعنی ہمارے علم کی حدود رسائی کہاں تک ہی ؟ اسکے سوا کیا ہو سکتا ہے، کہ بس جہاں تک ہمارے تجربات و تصورات کی رسائی ہے، جس چیز کی نسبت نہ ہم کوئی تجربہ رکھتے ہیں، نہ کوئی تصور قائم کر سکتے ہیں، اسکی نسبت کوئی علم ویقین بھی نہیں حاصل کر سکتے ہیں، جس طرح اجسام کی دنیا میں ہم اپنے اندر سے اور اپنی کسی طاقت سے جسم کا ایک ذرہ

[1] ویبر (تاریخ فلسفہ) بحوالہ سفر چہارم باب ۱۱

بھی خلق نہیں کر سکتے، صرف ان میں الٹ پھیر یا ترکیب و تحلیل کر سکتے ہیں، اسی طرح علم کی دنیا میں اگر تجربہ کی روشنی تصورات نہ بخشے، تو ہمارا ذہن محض ایک تاریک کمرہ ہوگا، خود اپنے اندر نہ ہم کوئی تصور رکھتے ہیں، اور نہ خلق کر سکتے ہیں، غرض جہاں تجربہ و تصور نہیں، وہاں علم و یقین بھی نہیں، زیادہ صحت کے ساتھ یوں کہو کہ جہاں تجربہ نہیں، وہاں تصورات نہیں، جہاں سرے سے تصورات ہی نہیں، وہاں ان کے مابین توافق و عدم توافق کا ادراک کہاں سے ہو سکتا ہے،

اس کے بعد اولاً تو ہمارا تجربہ، اور لازماً اس تجربہ سے حاصل شدہ تصورات نہایت محدود، پھر ان تصورات میں بھی بہتیرے ایسے ہیں، جن کے باہمی تعلقات کی تہ تک پہونچنے کا ہم دعویٰ نہیں کر سکتے، نہ ان کے توافق و عدم توافق کا علم حاصل ہے، مثلاً ہم نہیں بتا سکتے، کہ رنگ و بو، مزہ وغیرہ صفات ثانوی میں باہم یا ان کا صفات اولیہ سے کیا تعلق و ربط ہے، اسی طرح ہم نہیں جانتے، اور نہ شاید جان سکتے ہیں، کہ مادہ و فکر یا نفس و جسم کے تصورات کی ماہیت یا ان کا مابینی ربط کیا ہے،

"ہم مادہ و فکر کے تصورات رکھتے ہیں، لیکن یہ جاننا کبھی ممکن نہ ہوگا، کہ آیا کوئی محض مادی شے سوچتی، اور فکر کرتی ہے یا نہیں، بغیر وحی کے محض اپنے تصورات پر غور کرکے یہ معلوم کرنا ناممکن ہے، کہ قدرت مطلقہ نے بعض نظامات مادہ کو موزون بنا کر فکر و ادراک کی طاقت نہیں بخشی ہے، یا اس کے برخلاف ایسے موزون مادہ کے ساتھ ایک ذی فکر غیر مادی جوہر کو مربوط و وابستہ نہین کر دیا ہے، نفس تصورات کی حد تک ہمارے لئے یہ کچھ زیادہ بعید از فہم نہیں، کہ اگر خدا چاہے، تو وہ مادہ میں فکر کی ایک قوت کا اضافہ فرما دیسکتا ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ ایک جوہر کا اضافہ کرے، جو فکر کی قوت رکھتا ہو،......... کیونکہ اس مین کوئی تناقض مجکو نہیں نظر آتا، کہ اولین ازلی ذی فکر ہستی، اگر چاہے، بے حس مخلوق مادہ کے بعض نظامات کو، موزون ترکیب کے ساتھ کچھ حس و ادراک اور فکر عطا کر دے،

گو جیسا کہ میں ثابت کر چکا ہوں، (سفر چہارم باب) خود مادہ کو (جو اپنی ذات ہی میں حس و فکر سے خالی ہے) یہ او لین ازلی صاحب فکر ہستی فرض کرنا کسی طرح تناقض سے کم نہیں، بات یہ ہے کہ میرے نزدیک یہ بحث ہی ایسی ہے، جو ہمارے علم کی رسائی سے خارج ہے، جو شخص اسکی پیچیدگی پر بے تعصبی سے غور کریگا، وہ روح کی مادیت یا غیر مادیت کسی مفروضہ کا بھی قطعی فیصلہ کرنے کے قابل اپنی عقل کو نہ پائے گا، ہر مفروضہ کی مشکلات اس کو دوسرے کی طرف ڈھکیلنا چاہیں گی بعض لوگ یہ ظلم کرتے ہیں، کہ ایک مفروضہ میں کوئی ناقابل تصوّر بات پاکر جلد بازی سے مخالف مفروضہ کی طرف چلے جاتے ہیں، گو ایک منصف مزاج کے لئے وہ بھی پہلے ہی کی طرح ناقابل فہم ہوتا ہے"[۱]

حاصل یہ نکلا کہ اسی طرح کے جتنے فلسفیانہ و مابعد الطبیعاتی مسائل ہیں، اگر وحی کا سہارا نہ ہو، تو انسان محض اپنی عقل سے قطعاً کسی درجہ کے بھی یقین تک ان میں نہیں پہنچ سکتا،

مگر لاک کا مقصود اس سے ہمارے علم و دانش کی تحقیر نہیں، بلکہ صرف تحدید ہے یعنی ہماری عقل و فہم کی قوتیں جن چیزوں کے لئے اور جس حد تک فہم و ادراک کے قابل ہیں، انہی چیزوں کیلئے اور اسی حد تک ان کو محدود رکھنا چاہئے، اگر تم کان سے دیکھنا چاہو، تو کان کا نقص نہیں، وہ تو سننے کے لئے ہے، اور آوازوں کے علاوہ کوئی اور علم و ادراک نہیں دیسکتا، اسی طرح اگر تم دانت سے لوہے کے چنے چبانا چاہو، اور تمھارے دانت ہی ٹوٹ جائیں، تو دانتوں کا قصور نہیں، وہ تو فقط تمھاری جسمانی پرورش کے لائق جو غذائیں ہوں، ان کی چکی ہیں، نہ کہ لوہا پیسنے کی مشین،

"اگر ہم اپنے علم کی تنگی اور جہل کی تاریکی کو پیش نظر رکھیں، جو ہمارے علم سے بے انتہا زیادہ ہے، تو اس کو بہت سے نزاعات کے خاتمے، اور مفید علم کی ترقی میں مدد مل سکتی ہے"

[۱] تحقیقات فہم انسانی، سفر چہارم باب۳

بشرطیکہ یہ معلوم کرنے کے بعد کہ ہم کہاں تک صاف واضح تصورات رکھتے ہیں، اپنے خیالات کو انہی چیزوں پر غور و فکر میں محدود کر دیں، جو ہماری فہم کی دسترس میں ہیں اور اس سے آگے اتھاہ تاریکی میں (جہاں نہ ہمارے پاس دیکھنے کے لئے آنکھیں ہیں نہ ادراک کی قوتیں) محض اسی زعم میں نہ گھسیں، کہ ہماری فہم سے کوئی چیز ماورا نہیں"۔[1]

نظریۂ علم کے متعلق لاک کے خیالات اور فلسفہ کو جو اسکی کتاب "فہم انسانی" کے کئی سو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں، سطور بالا میں معمولی تشریحات کے ساتھ تا بہ امکان اُسی کے الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، رد و قبول سے تعارض نہیں کیا گیا ہے، اور گو ان خیالات میں نظر و تنقید کی بہت گنجایش ہے جس پر بعد کے فلاسفہ نے اپنے فلسفوں کی بڑی بڑی عمارتیں کھڑی کر دی ہیں، تاہم تین نتائج لاک کی تحقیقات کے ایسے نکلتے ہیں، جن پر نہ صرف فلسفہ کی عمارتیں کھڑی ہیں اور جدید فلسفہ کی ساری تاریخ ان ہی کے رجحانات و تفریعات سے بھری ہے، بلکہ تعصب سے پاک انصاف پسند اہلِ فکر کے لئے ان سے گریز کی راہ مشکل ہے،

اور شاید انکے ناگزیر ہونے ہی کی بنا پر بلا انقطاع بعد کے تین اکابر فلاسفہ نے اپنے فلسفہ کی تان یکے بادیگرے انہی پر توڑی، برکلے نے لاک کی منطق سے تصوریت کا نتیجہ نکالا ہیوم نے دونوں سے ارتیابیت کا، اور کانٹ نے مقدمات ثلاثہ کی تکمیل سے انتقادیت کا، دراصل تینوں نتائج غیر منفک اور ایک دوسرے کی محض تفریع ہیں، ساتھ ہی صرف جدید فلسفہ کی ہی نہیں بلکہ سارے فلسفہ کی سب سے قیمتی کمائی ہیں،

کامل تصوریت تک پہونچنے سے خود لاک کی نظر خدا جانے کیسے چوک گئی، کہ اس نے صفات

---

[1] سفر چہارم باب ۳ و ۴،

میں اوّلی وثانوی کی ایک بے بنیاد تفریق قبول کرکے اوّلی کے خارج از ذہن ہونے کا دعوٰی کرتا، ورنہ جس دلیل سے اس نے صفات ثانویہ کو ذہنی قرار دیا ہے، وہی صفاتِ اولیہ میں چلتی ہے، اور برکلے نے یہی کرکے لاک کی ناقص تصوریت کو کامل کر دیا، اس کے علاوہ تصوریت کی راہ میں ایک بڑا پتھر فلاسفہ کا وہ ہیولی یا جوہر تھا جس کو وہ اعراض وصفات کا محل قرار دیتے تھے، اس کو لاک نے جس طرح محض اسم بے مسمٰی اور فرضی شئے ثابت کیا، اس کو تم اوپر دیکھ چکے، اس کے نزدیک اس جوہر یا حقیقت خارجی کی حقیقت مجموعہ صفات کے سوا کچھ نہیں، اور صفات خواہ اوّلی ہوں خواہ ثانوی کسی کا براہ راست علم نہیں، سب کے علم کا واحد ذریعہ خود ہمارے ہی تصورات ہیں، جو ظاہر ہے، کہ ہمارے ذہن کے علاوہ کہاں پائے جا سکتے ہیں،

"جب ذہن اپنے تمام خیالات واستدلالات میں محض اپنے تصورات کے سوا اور کوئی شے براہ راست نہیں رکھتا، اور صرف ان ہی تصورات کے متعلق سوچتا یا سوچ سکتا ہے، تو ظاہر ہے، کہ ہمارا علم صرف ان تصورات ہی سے آشنا ہے"[1]

انسانی علم اور معلومات کے خالص تصوری یا ذہنی ہونے کا اس سے بڑھ کر واضح اعلان کیا ہو سکتا ہے، اور یہی اعلان دراصل تصوریت کی فتح کا اعلان ہے،

اور اس سے لازمًا کائناتِ خارجی کی موجودیت وحقیقت کے متعلق طرح طرح کے شکوک وشبہات رونما ہوتے ہیں، جن سے خواہ مخواہ ارتیابیت کا نتیجہ نکالنا پڑتا ہے، اور جس کو برکلے کی تصوریت کے بعد ہی ہیوم نے کھول دیا، خود لاک کو اس نتیجہ کا اتنا اندیشہ تھا، کہ اسکی تردید میں نہ صرف آواز نہایت پست ہے، بلکہ بالآخر ایک محض مناظرانہ الزامی جواب میں پناہ لینی پڑی،

"ہم کو اپنی ذات سے باہر اشیاء کے وجود کی جو اطلاع حواس کے ذریعہ ملتی ہے، گو وہ اتنی

---

[1] لیوس کی سوانحی تاریخ فلسفہ ص ۴۱۵،

یقینی نہ ہو، جتنا ہمارا وجدانی علم، یا وہ استدلالی نتائج جو ہم خود اپنے ذہن کے واضح و تجریدی تصورات کے متعلق حاصل کرتے ہیں، تاہم یہ بھی ایک ایسا تیقن ہے، جو علم کے نام کا مستحق ہے، اگر ہم اپنے کو اس یقین پر مائل پاتے ہیں، کہ ہمارے ذہنی قوی ان اشیاء کے وجود کی صحیح اطلاع دیتے ہیں، جو ان کو متاثر کرتی ہیں، تو اس کو بے بنیاد یقین نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ میرے خیال میں اتنا شکی وارتیابی کوئی شخص نہیں ہو سکتا، کہ ان چیزوں کے وجود میں شک کرے، جن کو دیکھتا اور محسوس کرتا ہے، یا جو شخص اس درجہ شک کر سکتا ہے، (وہ اپنی جگہ کچھ خیال کرے) لیکن کم از کم مجھ سے بحث نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ اس کا بھی ہرگز یقین نہیں کر سکتا، کہ میں اس کے خیالات کے خلاف کوئی بات کہہ رہا ہوں[1]"

اس کے علاوہ ہیوم نے اپنی ارتیابیت کو علاقۂ علت و معلول یا نظریۂ تعلیل میں جس حد تک پہونچایا ہے، اس کا بھی نہایت واضح اعتراف و بیان خود لاک کے ہاں ایسا موجود ہے، کہ ہیوم کا سارا فلسفۂ علیت اسی کی شرح قرار دیجا سکتی ہے،

"اشیا، جہاں تک ہمارا مشاہدہ جاتا ہے، باقاعدگی کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں، جس سے ہم نتیجہ نکال سکتے ہیں، کہ وہ ایک قانون کے تحت عمل کرتی ہیں، مگر ایسا قانون جس کو ہم جانتے نہیں، لہذا گو علل یکسانی کے ساتھ عمل کرتے، اور نتائج ان سے مسلسل ظاہر ہوتے ہیں، تاہم ان کے باہمی ربط و انحصار کا ہم اپنے تصورات میں کوئی پتہ نہیں چلا سکتے ہمکو ان کا محض ایک تجربی علم حاصل ہوتا ہے[2]"

لیکن اس ارتیابیت سے صحیح ترین اور مفید ترین جو نتیجہ نکل سکتا تھا، وہ علم کی محدودیت کا تھا، اور گو اسی نتیجہ کی منطقی تکمیل کا پورا حق ہیوم کے جانشین کانٹ نے ادا کیا، مگر خود لاک سے

---

[1] یوس ص ۲۷۵، [2] ص ۲۷۶،

اپنی ساری بحث وکاوش کا جو مدعا و منتہیٰ قرار دیا ہے، وہ دراصل صرف یہی ایک نتیجہ ہے، بلکہ جیسا ابھی کہا جا چکا، سارے فلسفہ کی کدوکاوش کا اگر کوئی عملی فائدہ یا صحیح نتیجہ نکالا جا سکتا ہے، تو وہ بھی صرف یہی ہے، لہذا اس کو ذرا غور سے خود لاک کی زبان سے اچھی طرح سن لینا چاہئے اس موقع پر جی، ایچ، لیوس نے اپنی سوانحی تاریخ فلسفہ میں (ص ۴۶۱ تا ص ۴۶۲) جو طویل اقتباس درج کیا ہے، اس کو نقل کئے بغیر نہیں رہا جاتا،

"فہم کی ماہیت و نوعیت کی اس تحقیق سے اگر میں اسکی توتوں کو معلوم کرسکوں کہ وہ کہاں تک پہونچتی ہیں، کن چیزوں کے لئے کس حد تک وہ مناسب ہیں، اور کہاں وہ ناکام رہتی ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ انسان کے ذہن کیلئے جو ہر شے میں گھستا ہے، اس لحاظ سے مفید ہوگا، کہ ایسی چیزوں میں دخل دینے کے متعلق جو اسکی گرفت سے باہر ہیں، زیادہ محتاط رہکر اپنی رسائی کی انتہا پر ٹھہر جائے، اور ایسی چیزوں کی نسبت اپنے جہل پر خاموش بیٹھ جائے جو تحقیق کے بعد ہماری قابلیتوں کی رسائی سے ماوراثابت ہوں"

"ہم کو اپنے ذہن کی تنگی کے متعلق کچھ زیادہ وجہ شکایت نہ ہوگی، بشرطیکہ ہم اس کو انھیں چیزوں میں استعمال کریں، جو ہمارے کام کی ہیں، کیونکہ ان کے قابل وہ پوری طرح ہے اور اگر ہم محض اسلئے اپنے علم کی منافع و فوائد کی ناقدری کریں، اور اسی کو ان مقاصد تک ترقی دینے میں غفلت برتیں، جن کے لئے یہ ہم کو دیا گیا تھا، کہ کچھ چیزیں اسکی دسترس سے باہر ہیں، تو یہ ایک ناقابل عفو اور ساتھ ہی طفلانہ ضد ہوگی، اور کسی کاہل و سرکش نوکر کیلئے شمع کی روشنی میں اپنا کام نہ کرنے کا یہ کوئی عذر نہ ہوگا، کہ دن دوپہر کی روشنی نہ تھی، جو شمع ہمارے اندر روشن ہے، ہمارے کاموں کیلئے اسکی روشنی بالکل کافی ہے"

اگر ہم اپنی قوت کو جان لیں، تو زیادہ بہتر طور سے اسکو جانیں گے کہ کس کام میں یہ

کامیابی کی امیدون کے ساتھ لگائی جاسکتی ہے...... جہازران کے لئے اپنے خط کی لمبائی کا جان لینا بہت کارآمد ہے، گو وہ اس سے سمندر کی ساری گہرائیون کی تھاہ نہ لے سکے،...... انہی باتوں نے تحقیق فہم کے متعلق اس کتاب کا پہلے پہل خیال پیدا کیا، کیونکہ میں نے خیال کیا، کہ انسانی ذہن جس قسم کی تحقیقوں میں پڑسکتا ہے، ان کی نسبت اطمینان حاصل کرنے کا سب سے پہلا قدم یہی ہے، کہ ہم خود اپنی فہم کا جائزہ لین، اور دیکھیں کہ کن چیزوں کے لئے وہ موزوں ہے، اس کے بغیر میرے نزدیک ہم پہلی ہی اینٹ ٹیڑھی رکھتے رہے اور اسلئے جو صداقتیں ہمارے سب سے زیادہ کام کی تھیں، انکے حصول سے تشفی کی تلاش فضول تھی، کیونکہ ہم نے تو اپنے خیالات کو وجود کے بحر زخار مین غرق کر رکھا تھا، گویا یہ ناپیداکنار وسعت ہماری فہم کی قدرتی وغیرمشکوک ملکیت تھی جس مین نہ کوئی چیز اسکے فیصلوں سے مستثنیٰ تھی، نہ اوسکی گرفت سے محفوظ تھا، اس طرح جب لوگوں نے اپنی تحقیقات کو اپنی قابلیتوں سے باہر پھیلادیا، اور اپنے خیالات کو ایسی گہرائیوں میں اتار دیا، جہاں قدم جمانے کی کوئی جگہ نہ تھی، تو یہ کوئی تعجب کی بات نہین کہ سوالات پر سوالات اور نزاعات پر نزاعات کا اضافہ ہوتا چلا جائے جن کے کسی صاف فیصلے پر نہ پہنچنے سے صرف یہی نتیجہ ہوسکتا تھا، کہ شکوک بڑھتے جائین، اور بالآخر ایسے لوگوں کے اندر کامل ارتیابیت گھر کرلے[1]؛

لاک کی نصیحت حرف حرف بجا، لیکن انسان تو علم ویقین کا بھوکا ہے، اسکے منہ میں اگر روٹی کی جگہ پتھر ڈالنے سے تسلی نہیں ہوسکتی، تو اس جواب سے بھی تسلی نہیں ہوسکتی، کہ تیری بھوک ہی غلط ہے بھوک کے دفع ہونے کیلئے تو روٹی ہی کہیں نہ کہیں سے ملنی چاہئے، اگر عقل وفلسفہ کا دروازہ بند ہو تو کوئی اور در کھٹکھٹانا پڑیگا،

فتوح السلاطین

از

جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب، ایم، اے،

(۲)

ناصر الدین محمود کو عصامی التمش کے بیٹے ناصر الدین کا لڑکا بتاتا ہے جس کا انتقال لکھنؤ میں ہوا، مگر منہاج سراج نے صاف طور سے لکھا ہے، کہ ناصر الدین کے مرنے کے بعد جب التمش کا سب سے چھوٹا لڑکا پیدا ہوا، تو اپنے مرحوم بیٹے کی یاد میں اس کا نام ناصر الدین ہی رکھا،

عصامی ناصر الدین محمود کی حکومت کے ابتدائی بارہ سال کے واقعات کو حذف کرکے سنہ ۶۵۶ھ کے مغلوں کے حملہ، اچہ اور ملتان کی تسخیر اور بلبن زر کی بغاوت کا ذکر کرتا ہے جو سنہ کی ترتیب کے لحاظ سے درست نہیں بلبن کے ساتھ زر کے لکھنے سے معلوم نہیں عصامی کی کیا مراد ہے، یہ بلبن زرد ہی ہے، جسکو منہاج سراج نے ملک عز الدین بلبن کشلو خاں لکھا ہے؛

عصامی نے ناصر الدین محمود اور بلبن کے لڑکوں سے متعلق ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے، دونوں کے لڑکے ایک روز باغ میں تفریح میں مشغول تھے، کہ بلبن کے لڑکون نے کہا:-

که چون والد ما دریں روزگار   نباشد کسے زیرک و ہوشیار

ناصر الدین محمود کے لڑکوں کو یہ لاف زنی اچھی معلوم نہ ہوئی،

بگفتند کای ہمان عزیز   اگر ہست درخاں فراواں تمیز

ہم آخر بہ بینی کہ اندر جہان — شود عاجز از زیرکی ناگہان
گر او پیر پختہ و مائیم خام — چو خواہیم کاورا در آریم دام
بمیدان نہ اسپش فرو افگنیم — بتدبیر او را پیادہ کنیم

بلبن کے لڑکوں کا خون جوش میں آیا، اور انھوں نے چیلنج دیا، کہ وہ اگر ایسا کر دکھائیں گے تو وہ اسّی دینار ہار جائیں گے، محمود کے لڑکوں نے اس چیلنج کو قبول کیا،

چو آن روز بگذشت ہر چہار سر — بمیدان برفتند روز دگر
الغ خان دران روز چالش کنان — بہ پیچید در سمت میدان عنان
چو آمد بہ میدان بجوب اختری — ہمی کرد ہر سوے جولانگری
شنیدم یکے زان دو شہزادگان — ابا خان آزادہ شد ہم عنان
دو سہ بار با خان دوانید اسپ — وزاں پس بہ پیش جہانید اسپ
درا ہمال از دست چابک فگند — ز خان خواست پس چابک آن ہوشمند
فرود آمد از اسپ آن خان راد — ستد چابک و دست شہزادہ داد
وزاں پس ز میدان بگشتند باز — خرامان و خندان بگشتند باز

بلبن کو جب واقعہ کی نوعیت معلوم ہوئی تو بہت پریشان ہوا،

بدل گفت کا بناؤ فرمان روا — بدین سان کہ گشتند حیلہ گرا
یکے روز ما را بہ مکر و فنون — بگیرند و بندند و ریزند خون

ان سے چھٹکارا پانے کے لئے تدبیرین سوچتا رہا،

ہم آخر شنیدم ز نقص خرد — ز بن بختن زد یکے رائے بد
بشہ در قفاے بداد ند زہر — بر آمد بہر سوے شورے بہ شہر

معلوم نہیں یہ قصہ کہاں تک سچ ہے، کسی تاریخ سے یہ پتہ نہیں چلتا، کہ ناصر الدین محمود کے دو جوان لڑکے تھے، کہیں کہیں اسکے ایک کمسن بچہ کا ذکر آتا ہے، مگر جب وہ مرا تو اسکی اولاد نرینہ میں کوئی باقی نہ تھا، لیکن بلبن کا محمود کو زہر دینے کا واقعہ غور طلب ہے، ناصر الدین محمود کے آخری عہد کی کوئی معاصر تاریخ موجود نہیں، طبقات ناصری محمود کی وفات سے پانچ سال پہلے ہی ختم ہو جاتی ہے، بعد کی تاریخوں میں برنی کی فیروز شاہی بلبن کے عہد سے شروع ہوتی ہے، مگر اس میں اس واقعہ کی طرف کوئی اشارہ نہیں، تاریخ مبارک شاہی میں ہے،

ہم چنان زحمت بر تن مبارک سلطان غالب آمد، بتقدیر اللہ تعالیٰ یازدہم ماہ جمادی الاول سنہ اربع وستین وستمائۃ از دار الفنا بدار البقا رحلت فرمود" (ص ۳۹)

نظام الدین، فرشتہ اور بدایونی بھی رقمطراز ہیں کہ محمود بیمار پڑ کر مرا، لیکن عصامی کا معاصر ابن بطوطہ لکھتا ہے، کہ "غیاث الدین بلبن نے ناصر الدین کو مار ڈالا، اور خود بادشاہ بن بیٹھا" (ص ۲۲) اب حقیقت کچھ بھی ہو، لیکن عصامی اور ابن بطوطہ کے بیان سے پتہ چلتا ہے، کہ محمد تغلق کے عہد تک عام روایت یہی تھی، کہ بلبن نے محمود کو زہر دیکر ہلاک کر دیا،

بلبن کے حال میں عصامی لکھتا ہے:-

ز تاریخ بد شش صد وشصت وپنج ۔۔۔ ز اجلاس او گشت گیتی زرنج

دوم سال در سمت چتور تاخت ۔۔۔ ششم سال در ملک لاہور تاخت

ز اطراف دہلی ہماں شیر مرد ۔۔۔ بہر جائے جنگلے قلع کرد

حصار جرالی وزکی زسر ۔۔۔ عمارت بکرد آن شہ نامور

بنا شد از وحصن گوپال گیر ۔۔۔ بدستش بسے سرکش آمد اسیر

بلبن کی تخت نشینی کا سنہ ضیاء الدین برنی نے ۶۶۲ھ (ص ۲۵) اور یحییٰ سرہندی مؤلف

تاریخ مبارک شاہی نے ۶۶۴ھ (ص ۴۰) لکھا ہے، عصامی ۶۶۵ھ لکھتا ہے، مگر بعد کے موَرخوں میں نظام الدین بخشی اور فرشتہ نے ۶۶۴ھ ہی کو صحیح سمجھا ہے، چتور، جمالی اور زکی کے نام شاید غلط چھپ گئے ہیں، چتور، سنتور ہوگا، سنتور سے بظاہر وہی پہاڑیاں مراد ہیں جو دہرہ دون کے جنوب میں آج کل کوہ سوالک کہلاتی ہیں، جرالی بالکل واضح نہیں بلبن کے ذکر میں مبارک شاہی میں ہے:-

"در موضع مکر کھوری حصاری بنا کرد، آن را حصار نو نام نہادہ بدار الملک مراجعت کرد، بعدہٗ طرف حوالی عزیمت کرد" (ص ۴۰)

مگر برنی حوالی سے مراد، حوالی شہر دہلی لیتا ہے، اسکی تاریخ سے کہیں پتہ نہیں چلتا ہے کہ حوالی کسی خاص جگہ کا نام ہے، ایک جگہ وہ حصار جلالی کی تعمیر کا ذکر کرتا ہے:-

"ہم دران نہضت احصار جلالی عمارت فرمود، وآن حصار را ہم بافغانان داد و آنجاں دزد خانہا را تھانہ ساخت وزمین جلالی را ہم مفروز کرد وجلالی کہ مسکن قطاع طریق بود وہموارہ ابنائے سبیل ہندوستان را آنجا راہ قطع شدی موطن مسلمانان وحارسان راہ گشت، و الی یومنا مستقیم ماند" (ص ۵۸)

جرالی سے عصامی کی مراد معلوم نہیں حوالی یا جلالی ہے، زکی بھی واضح نہیں ہوتا ہے گویا رل گیر کا ذکر تو برنی میں موجود ہے، (ص ۵۷)

عصامی نے لکھا ہے کہ بنگالہ میں طغرل کی بغاوت کا فتنہ بلبن کے آٹھوین سن جلوس میں شروع ہوا، برنی نے اسکی تاریخ چودھوان سن جلوس لکھا ہے، فرشتہ نے بھی ۶۷۸ھ لکھا ہے، طغرل کی سرکشی کے سلسلہ میں عصامی کا بیان ہے، کہ بلبن نے پہلے ترمتی کو طغرل کے خلاف بھیجا، مگر وہ شکست کھا کر فرار ہو گیا، بلبن نے اوسکو وادہ پر چڑھوا دیا، اور دوسری بار

بہادر کی نگرانی میں ایک لشکر جرار بھیجا، مگر اس کو بھی شکست ہوئی، تیسری بار بلبن خود گیا، اور طغرل پسپا ہوکر علی نامی ایک فوجی سپاہی کے ہاتھوں سے مارا گیا، برنی نے بھی طغرل کی بغاوت کا حال بہت ہی تفصیل سے لکھا ہے، لیکن اسکی تاریخ میں ترمتی کا نام کہیں نہیں آتا ہے، یحیٰی سرہندی کا بیان برنی سے بھی مختلف ہے، وہ امین خان کو لکھنوتی کا حاکم اور طغرل کو اس کا نائب بتاتا ہے، طغرل باغی ہوا، تو امین خان کو اوس نے محبوس کر دیا، بلبن نے ترمتی کو بغاوت فرو کرنے کیلئے بھیجا، اسکے بعد ملک شہاب الدین میرادوھ کو روانہ کیا، اور ملک اختیار الدین نیک ترس نے طغرل کو زندہ گرفتار کیا، نظام الدین بخشی اور فرشتہ نے برنی ہی کی روایت قبول کی ہے، مگر فرشتہ نے دوسرے حملہ کے فوجی سردار کا نام ترمتی لکھا ہے، لیکن نظام الدین نے برنی کی طرح ترمتی کا ذکر نہیں کیا ہے،

بلبن کے لڑکے سلطان شہید اور مغل کی جنگ کا حال عصامی نے بہت ہی جوش خروش کے ساتھ لکھا ہے جسکے پڑھنے سے رزمیہ بیان کا پورا لطف حاصل ہوتا ہے،

معزالدین کیقباد کے زمانہ کے جو واقعات عصامی نے لکھے ہیں، وہ قریب قریب برنی سے ملتے جلتے ہیں، صرف ترتیب میں فرق ہے، کیخسرو کے قتل کا واقعہ برنی کے یہاں بہت ہی مختصر ہے، مگر عصامی نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے جسکو فرشتہ نے عصامی کا حوالہ دیکر نقل کیا ہے، (دیکھو تاریخ فرشتہ جلد اول ص۸۲ نولکشور) ناصر الدین بغرا اور کیقباد کی ملاقات کا حال عصامی نے بہت ہی موثر انداز میں لکھا ہے، اس ملاقات کے ذکر میں شاعروں اور ادیبوں نے قلم کی جولانیاں خوب خوب دکھائی ہیں، خسرو نے تو قرآن السعدین کے نام سے ایک مثنوی ہی لکھی ہے، برنی نے بھی تاریخ فیروز شاہی میں اس موقع پر اپنی انشاپردازی کا اعلیٰ کمال دکھایا ہے، عصامی نے بھی اس واقعہ کو دلپذیر پیرایہ میں لکھا ہے، جو اسکی قادر الکلامی کی دلیل ہے،

کیقباد کے آخری عہد کے حال میں عصامی نے لکھا ہو کہ اس کی حکومت میں انتشار پھیلا، تو فیروز خلجی (یعنی جلال الدین خلجی) بابل سے دہلی طلب کیا گیا، اور عماد الملک کے خطاب سے سرفراز ہوا، عصامی کی مراد بابل سے معلوم نہیں کیا ہو؟ برنی کا بیان ہے کہ وہ سمانہ سے بلایا گیا، اور سیاست خان کے لقب سے سرفراز کیا گیا، (تاریخ مبارک شاہی میں یہ خطاب شایستہ خان ہے) عصامی نے لکھا ہو کہ فیروز خلجی کو شاستی خان (؟) کا خطاب معزالدین کیقباد کے لڑکے شمس الدین کیومرث کے عہد حکومت میں ملا،

جلال الدین خلجی کی حکومت کے ذکر میں عصامی نے واقعات کے تقدم و تاخر کا خیال نہیں رکھا ہو، اور کہیں کہیں اس کا بیان برنی کی تاریخ سے مختلف ہے، مثلاً برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں ہے، کہ مغلوں کے حملہ کو روکنے کے لئے جلال الدین خلجی نے خود فوج کی رہنمائی کی تھی لیکن عصامی نے لکھا ہے کہ ملک خامش نے اسکی سرداری کی، برنی نے ملک خاموش کا تو کہیں ذکر ہی نہیں کیا ہے، البتہ یحیی سرہندی نے اسکو جلال الدین خلجی کا عارض ممالک بتایا ہے، (ص۶۲) چنگیز خان کے پوتے کا ہندوستان میں قیام کرنے اور سلطان کی لڑکی سے شادی کرنے کا ذکر عصامی نے مطلق نہیں کیا ہے،

عصامی سلطان علاء الدین خلجی کو بادشاہ ہونے سے پہلے برابر ملک گرشاسپ اور کبھی علی کہتا ہے، یہ خطاب کسی اور تاریخ میں میری نظر سے نہیں گذرا، جلال الدین خلجی کے قاتل کا نام برنی نے محمود سالم لکھا ہو، لیکن عصامی کا بیان ہو کہ علاء الدین نے خود قتل کیا،

جلال الدین کے زمانہ میں علاء الدین کی دکنی فتوحات کے ذکر میں عصامی اور برنی کے بیانات کچھ مختلف ہیں، برنی رقمطراز ہے کہ علاء الدین کڑہ سے نکل کر ایلچ پور پہنچا، ایلچ پور میں گھٹی لاجورہ آیا، دیوگیر کے راجہ رام دیو نے علاء الدین کی لشکر کشی کی خبر پاکر اپنے ایک راناکے

ماتحت کھٹی لاجورہ ایک فوج بھیجی لیکن علاؤالدین نے اسکو شکست دی اور دیوگیر کی طرف بڑھا، جہاں رام دیو نے زر وجواہر دیکر اطاعت قبول کر لی، عصامی کا بیان ہے، کہ گرشاسپ ملک یعنی علاء الدین کڑہ سے روانہ ہو کر کھٹی لاجورہ پہونچا، وہ ایلچ پور کا ذکر نہیں کرتا ہے مگر برنی کا بیان صحیح ہے، کہ علاء الدین کھٹی لاجورہ جانے سے پہلے ایلچپور پہونچا، یہ طبقات طبقات ناصری میں بھی مذکور تھا، جیسا کہ فرشتہ نے اپنی تاریخ میں حوالہ دیا ہے، عصامی کا بیان ہے کہ کھٹی لاجورہ میں وہان کے حاکم نے جسکو دیوگیر کے راجہ رام دیو نے مدد دینے سے انکار کر دیا، علاء الدین کے خلاف برسرپیکار رہا، اس جنگ میں کھٹی لاجورہ کی فوج کی طرف سے دو ہندو عورتوں نے بڑی جانبازی دکھائی، گو آخر میں گرفتار ہوگئیں،

همان هر دو هندو زنانِ دلیر که بودند در کینه چون ماده شیر
یکایک بر افواجِ ترکان زدند بسے دنبل و بوق پیکان زدند
عجب کرد لشکر ازین چیرگی، که ناید ز هندو چنین چیرگی
دو سه گام ازان جمله پستر شدند همان هندوان چیره دل تر شدند

.. ..

شنیدم که کاتهان دران کارزار مگر با دو هندو زنِ نامدار
ستادند بر ترک آویختند بسے خون دران حربگه ریختند
هم آخر شدند از پس دار و گیر دران دشت بر دستِ ترکان اسیر
چو بر دستِ ترکان فتاد آن دو زن که بودند چالاک و شمشیر زن
ببردند نزدیک گرشاسپ نیو عجب کرد ازان حال کشور خدیو
بگفتا ملکے که هندو زنان نتابند از پیش شیر افگنان

اس واقعہ کا ذکر فتوح السلاطین کے علاوہ کسی اور تاریخ میں میری نظر سے نہیں گذرا، اس جنگ کے بعد عصامی لکھتا ہے کہ علاؤالدین کی فوج کھتکہ پہونچی،

به کهتکه رسیدند با کر و فر همه شهر کردند زیر و زبر

معلوم نہیں یہ کونسا مقام ہے، ؟ اسی کے بعد دیوگیر کی تسخیر ہوئی، جہاں کے راجہ نے اطاعت قبول کرکے مندرجۂ ذیل چیزیں پیش کیں،

بسے نازکان ملائک فریب همه انس گیرندہ و خوش رکیب
نوده بیک چشمه هر نازنین، وجود و عدم از میان و سرین
بسے سیم ساقان تعظیم دوست شده مردم از ساق شان سیم دوست
همه غرق زیور زسر تا بپا بهفته بهر چشم مردم ریا،
برآن آهوان گشته شیران اسیر ندیدم گهے آهوے شیر گیر
بپوشید پیرایه هر نازنین سراسر مرصع ز دُرّ ثمین
بهر خانه تودهاے گهر برآورده هر خانه از سیم و زر
بهر سوز تر مینه خمر وارها بهر جانب از عطر انبارها،
بهر کو چپایش زرِ بے شمار بسے گنج فارغ ز تشویش مار
بسے جامهاے طبیعت پذیر چه کم آید آن جامه در دیوگیر
نه چندان گرفتند مردان کار که آید همه عمر اندر شمار
منکلل یکے چتر گوهر نگار، مرصع همه از درشاهوار
جواهر نه چندان که اهل قلم بصد سال کردن تواند رقم،

بسے پیل وبس اشتر و را ہوار   ازین ہشت زنجیر زان صد قطار

بیاورد درپیش گرشاسپ نیو

ابا دختر جاں فزا رام دیو

یہ کوئی شاعرانہ مبالغہ نہیں، بلکہ برنی بھی لکھتا ہے،

"سلطان علاؤالدین از دیوگیر چندان زر و نقرہ و جواہر و مروارید و نفایس و اوانی وابریشم و تیوالہ آورد کہ درقرن زیادت ازان تاریخ برآمدہ است، و در ہر عصری از اعصار بادشاہان در ہنگام تبدیل وتحویل وزرہاے فاخر خرچ شد، ہنوز بسے پیل و مال دجواہر و مروارید آوردہ سلطان علاء الدین در خزانۂ دہلی موجود است"۔

البتہ برنی یہ ذکر نہیں کرتا ہے، کہ رام دیو نے اپنی لڑکی بھی پیش کی، اس صلح کے بعد عصامی کا بیان ہو کہ رام دیو کا لڑکا بھیلم جو کسی مہم پر گیا ہوا تھا، علاء الدین سے لڑنے کے لئے تیار ہوا، اسکے پاس پانچ لاکھ پیادہ فوج اور دس ہزار سوار تھے، مگر باپ کی وساطت سے وہ اپنے ارادہ سے باز آیا، برنی مذکورۂ بالا صلح کے بعد خاموش ہو جاتا ہے، مگر فرشتہ نے اس سلسلہ میں جو تفصیلات لکھی ہیں، وہ برنی اور عصامی سے بالکل مختلف ہیں، فرشتہ کا بیان ہے، کہ علاء الدین کڑہ سے روانہ ہو کر ایلچپور پہونچا، اور وہاں سے دیوگڑھ پر دھاوا کیا، اتفاق سے دیوگڑھ کے راجہ رام دیو کا بیٹا اپنی ماں کے ساتھ کسی بت خانہ کی زیارت کیلئے باہر گیا تھا، راجہ نے علاء الدین کے حملہ کی خبر سنی، تو دو تین ہزار سپاہیوں کو مقابلہ کے لئے بھیجا" جنھوں نے دیوگڑھ سے دو کوس کے فاصلہ پر علاؤالدین سے جنگ کی، مگر وہ پسپا ہو کر بھاگے، علاء الدین کی فوج نے دیوگڑھ کو لوٹ کر اسکے قلعہ کا محاصرہ کیا، محاصرہ کی مدت بڑھی تو علاؤالدین نے پچاس من سونا، کئی من موتی، اور بیش بہا کپڑے لیکر رامدیو سے صلح کر لی،

اور دہلی واپس جانے کی تیاری کر رہا تھا، کہ رام دیو کا لڑکا اپنی فوج لیکر نمودار ہوا، باپ کی مداخلت اور ممانعت کے باوجود اس نے علاء الدین کے خلاف میدان جنگ میں فوج اتاری، اور دیوگڑھ سے تین کوس باہر ایک گھمسان لڑائی شروع ہوئی، ہندوؤں کی کثرت اور جانبازی سے قریب تھا کہ علاء الدین کی فوج کے پاؤں اکھڑ جائیں، مگر ملک نصرت کے جنگی فریب سے ہندو آخر میں مغلوب ہوئے، اور بھاگے، رام دیو نے پھر چھ سو من سونا، سات من موتی، دو من لعل و یاقوت والماس و زمرد، ایک ہزار من چاندی، چار ہزار من ریشمی کپڑے وغیرہ دیکر اپنے اور ملک کو مامون و مصئون کیا، فرشتہ کی ان تفصیلات کا ماخذ شاید طبقات ناصری ہے، مگر فرشتہ کے معاصر نظام الدین نے برنی ہی کو اپنا ماخذ بنایا ہے، اس نے رام دیو کے لڑکے کی جنگ کا ذکر مطلق نہیں کیا ہے،

سلطان علاء الدین خلجی کے ذکر میں عصامی نے زیادہ تر اسکی فتوحات کا حال لکھا ہے، اور مغلوں اور ظفر خاں کی جنگ کے حال میں رزمیہ شان بدرجۂ اتم موجود ہے، ظفر خاں کی جانبازی، دلیری، اور بامردی کی تصویر بہت ہی موثر انداز میں کھینچی ہے، اس سلسلہ میں ایک عجیب بات لکھی ہے جو گو واقعہ نہ ہو لیکن دلچسپ ہے،

ظفر خان چو فارغ شد از سیستان	بملک مغل کرد پیکے روان
فرستاد بر دست او معجزے	دگر سرمۂ غازۂ و چادرے
حدیثے نبشتہ چو زور آوران	نبشتہ در و کائے شہ کافراں
یکے شاہ بنشست در ملک ہند	کہ بگرفت از تیغ تا آب سند
گرت ہست زوری دراں مرز و بوم	بروں آر لشکر از ان ملک شوم
بیا تا چو مردان خروشش آوریم	بمیدان ہیجا دو چادرے خوریم

دگر خود دریں کار کردی درنگ نہ گیرد کسے بیش نامت بتنگ
ہماں سرمہ و غازہ درکار کن بسے تو بہ از کار پیکار کن،
بہ معجز بسر خویشتن را بپوش، دگر بارہ در کار ہیجا مکوش

ظفر خان مغلوں سے جنگ کرتا ہوا بڑی بہادری سے مرا، برنی نے لکھا ہے کہ علاء الدین اور اس کے بھائی الغ خاں کے رشک وحسد سے اسکی جان گئی، مگر عصامی نے اسکی طرف مطلق اشارہ نہیں کیا ہے،

عصامی نے مغلوں کے چھ حملوں کا ذکر کیا ہے پہلا "قتلغ خواجہ" دوسرا اور چوتھا ترغی کی سپہ سالاری میں ہوا، ترغی پہلے حملہ میں بھی شریک تھا، مگر وہ سپہ سالار نہ تھا، تیسرے حملہ میں مغل تھری کے مقام پر علاء الدین کی فوج سے متصادم ہوئے، پانچواں حملہ علی بیگ و ترتاق اور چھٹا لبک نے کیا، برنی نے سات حملوں کا ذکر کیا ہے، بعد کے مورخوں میں یحیٰی سرہندی نے پانچ، فرشتہ نے چھ اور نظام الدین نے سات حملوں کا حال لکھا ہے، برنی کی روایت کے مطابق پہلا حملہ ۶۹۵ھ میں ہوا، جس میں الغ خان اور ظفر خان نے مغلوں کو جالندھر کے پاس شکست دی، یحیٰی سرہندی نے اس جنگ کے مقام کا نام منجھور لکھا ہے، (؟) اور اس میں ظفر خان کی شرکت کے بجائے ملک تغلق امیر دیالپور کا نام لکھا ہے، فرشتہ اور نظام الدین نے بھی اسی کو پہلا حملہ قرار دیا ہے لیکن نظام الدین کے یہاں لڑائی کی جگہ کا نام جارمنجو منقول ہے، (ص ۱۴۱) عصامی اس حملہ کا ذکر مطلق نہیں کرتا ہے، مغلوں کا دوسرا حملہ قتلغ خواجہ کی سرداری میں ہوا، جس میں ظفر خان مارا گیا، اسی کی تفصیل عصامی نے لکھی ہے تیسرا حملہ ۷۰۳ھ میں ترغی نے کیا، عصامی کے بیان کے مطابق یہ دوسرا حملہ تھا، یہ حملہ علاء الدین کی فوج کے لئے بہت ہی ہلاکت خیز ہوا، لیکن قبل اس کے کہ اسکی فوج پسپا ہو، مغلوں کو رسد کی

کمی کی وجہ سے مجبوراً واپس جانا پڑا، یحییٰ سرہندی کا بیان ہے کہ اس معرکہ میں ترغی گرفتار ہوگیا تھا، مگر برنی اور عصامی کے بیان سے اس کی تائید نہیں ہوتی ہے، فرشتہ اور نظام الدین کی روایت بھی برنی سے مختلف نہیں، عصامی کا تو بیان ہے کہ مذکورۂ بالا حملہ کے بعد ترغی نے پھر ہندوستان پر فوج کشی کی، جو اس عہد میں مغلوں کا چوتھا حملہ تھا، لیکن برنی کی روایت سے ۷۰۳ھ کے بعد ترغی کا پھر ہندوستان آنا ثابت نہیں ہوتا ہے، علی بیگ اور ترتاک کے حملہ کو برنی نے چوتھا حملہ لکھا ہے، یحییٰ سرہندی، فرشتہ اور نظام الدین نے بھی اسی کو چوتھا حملہ قرار دیا ہے، مگر ترتاک کے نام میں کچھ اختلاف ہے، یحییٰ سرہندی اس کو ترتق اور فرشتہ ترپال لکھتا ہے، عصامی کے بیان کے مطابق جو حملہ تیسرا ہے، اس کا ذکر برنی، سرہندی اور فرشتہ نے نہیں کیا ہے، عصامی نے علی بیگ اور ترتاک کے خلاف جنگ کرنے والے امیر کا نام ملک نایک لکھا ہے، جو اور کسی تاریخ میں نہیں، اس حملہ کے بعد عصامی نے صرف کبک (جس کو برنی نے کنک، یحییٰ سرہندی نے کیک، نظام الدین نے کبیک اور فرشتہ نے گنگ لکھا ہے) کے حملہ کا ذکر کیا ہے، یحییٰ نے پانچویں اور ساتویں حملے کا ذکر ایک ساتھ کرکے چھٹے کو نظرانداز کر دیا ہے، نظام الدین نے بھی برنی کی تقلید میں سات حملوں کا ذکر کیا ہے، لیکن فرشتہ نے ایک یعنی چھٹے حملہ کو حذف کر دیا ہے،

رنتھنبور کی تسخیر کے ذکر میں عصامی نے لکھا ہے کہ گجرات سے کچھ نومسلم قیزی محمد شاہ اور کابھرو علاء الدین کی فوج سے فرار ہوکر رنتھنبور کے راجہ کے یہاں پناہ گزین تھے، الغ خان نے ان مفرورین کو واپس کر دینے کے لئے راجہ کو خط لکھا، لیکن اوس نے انکار کیا تو شاہی فوج حملہ آور ہوئی، الغ خاں کو حملہ میں کامیابی نہیں ہوئی، بلکہ جیسا کہ برنی کا بیان ہے، کہ نصرت خان کو محاصرہ میں ایک گولہ سے مارا گیا، عصامی نصرت خان کے مارے جاتے

کا ذکر نہیں کرتا ہے، علاء الدین الغ خان کی مدد کو روانہ ہوا، برنی کی تاریخ میں ہے، کہ علاء الدین جب رنتھنبور کی تسخیر کے لئے جا رہا تھا، تو تلپت میں اسکے بھتیجے اکت خان نے اس پر قاتلانہ حملہ کیا لیکن عصامی کا بیان ہے، کہ یہ واقعہ چتوڑ کی مہم کے زمانہ میں پیش آیا، یحییٰ سرہندی نے اس واقعہ کا ذکر ہی نہیں کیا ہے، نظام الدین اور فرشتہ برنی ہی کی تائید کرتے ہیں، رنتھنبور کا قلعہ ایک سال کے محاصرہ کے بعد فتح ہوا، وہاں کا راجہ ہمیر دیو جب بالکل مایوس ہوگیا تو عصامی کا بیان ہے، کہ

یکے جوہرے کرد رائے ہمیر برآمد ز ہر کنگرہ ز نفیر،
یکے آتشے در حرم بر فروخت ہمہ محرمان حرم را بسوخت
نفائس تمامی در آتش فگند ہمہ خانماں کرد برخود سپند
پس انگہ سر خویش را کرد گل بدان تا سرش چو برّد اجل
نگردد سرش دست آویز کس نیاید کسے بر سرش دست رس
طلب کرد اصحاب نادر را وداعے ہمی کرد ہر مرد را

غریوے برآمد درون حصار،
بنالید دیوار و در زار زار،

عصامی لکھتا ہے کہ ہمیر کے سارے کے سارے ساتھی لڑتے ہوئے مارے گئے، برنی نے قلعہ کی فتح کے ذکر میں اختصار سے کام لیا ہے، لیکن فرشتہ رقمطراز ہے، کہ جب قلعہ فتح ہوا، تو علاء الدین نے ہمیر کے کل وزراء کو یہ کہکر قتل کرایا، کہ جب یہ بے وفا اپنے مالک کے نہ ہوئے تو ہمارے کب ہوں گے، اور قلعہ کے اندر داخل ہوا، تو اس کو بے حساب دولت ملی، جو اس نے الماس بیگ الغ خان کو عطا کی، واللہ اعلم، آگے چل کر عصامی نے لکھا ہے کہ

علاء الدین نے بدگمان ہوکر الغ خاں کو زہر دیا جس سے وہ مرگیا، مگر برنی کا بیان ہے کہ وہ جبل اور تلنگ کی تسخیر کو جا رہا تھا کہ راستہ میں مرگیا، اسکی لاش دہلی آئی، علاء الدین اسکی موت سے بہت ہی اندوہگین ہوا، اور ایصالِ ثواب کیلئے صدقے تقسیم کئے، (ص ۳۳۵)

علاء الدین کے عہد کی دکنی فتوحات کے سلسلہ میں برنی اور عصامی کے بیانات میں تھوڑا سا اختلاف ہے، برنی کے قول کے مطابق ملک نایب پہلی بار ۷۰۹ھ سے پہلے دیوگیر گیا، وہاں سے رامدیو اور اس کے لڑکوں کو گرفتار کرکے دہلی فاتح اور منصور واپس آیا، عصامی کے بیان سے بھی اسکی تصدیق ہوتی ہے، دوسری بار ۷۰۹ھ میں ارنگل گیا، راستہ میں دیوگیر کے راجہ رامدیو نے جو علاء الدین کا باجگذار ہوکر اپنی سلطنت کو واپس چلا گیا تھا، ہر قسم کی مدد پہنچائی، ملک نایب نے ارنگل پہنچکر اس کے قلعہ کا محاصرہ کیا، اور سخت معرکہ کے بعد اس کا راجہ لدر دیو پسپا ہوا، اس نے بے شمار ہاتھی، گھوڑے، نقد و جواہر پیش کرکے امان چاہی، فتوح السلاطین میں اس مہم کا ذکر بھی اسی طرح ہے، تیسری بار ملک نایب ۷۱۰ھ میں دھورسمندر اور معبر کی طرف گیا، برنی کا بیان ہے کہ دھورسمندر جاتے ہوئے ملک نایب دیوگیر پہونچا، تو اسکو معلوم ہوا کہ رامدیو مرگیا ہے، وہ آگے بڑھا، اور دھورسمندر اور معبر کو فتح کرکے ۷۱۱ھ میں دہلی واپس آیا، اسکے بعد برنی صرف یہ لکھ کر خاموش ہو جاتا ہے کہ اسی سال تلنگ کے راجہ لدر دیو نے بیس ہاتھی بھیجکر یہ درخواست کی کہ "اس کا موعودہ خراج دیوگیر میں کسی کو بھیج کر وصول کر لیا جائے" مگر عصامی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک نایب ۷۱۱ھ کے بعد ایک بار پھر دیوگڑھ گیا، رامدیو کے بعد اسکے لڑکے بھیلم نے سرکشی اختیار کی، تو علاء الدین نے اس کی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے ملک نایب کو پھر بھیجا، ملک نایب نے جنگ کئے بغیر دیوگیر کو شاہی مملکت میں پھر داخل کر لیا، تاریخ فرشتہ میں بھی ملک نایب کا چوتھی بار دیوگیر پہونچنا

مذکور ہے، اس کا بیان ہے کہ "تلنگ کے راجہ کا خط" ملا تو ملک نایب خراج وصول کرنے روانہ ہوا، اور دیوگڑھ پہونچکر رامدیو کے بیٹے کی بھی خبر لی، اس کو قتل کرکے ملک کو دشمنوں اور سرکشوں سے بالکل صاف کر دیا، فتوح السلاطین میں رام دیو کے لڑکے کے قتل کا ذکر نہیں ہے،

خبر شد بہ بھیلم کہ آمد سپاہ | چو کم دید خود را سر حربگاہ
نداد ہ مصافے ہزیمت نمود | ملک نایب ایں ماجرا چون شنود
درآمد خروشاں بصد دار و گیر | گرفت انگہے قلعۂ دیوگیر
کسے را نہ کشت و کسے را نہ بست | ہمہ خلق شہر از امانش برست

ہمہ شہر و کشور چناں ضبط کرد،
کہ کس سر نہ پیچید ازاں شیر مرد

عصامی گجرات کی تسخیر کے سلسلہ میں الغ خان اور نصرت خان کی مہم کے بعد ملک جھیتم کی لشکرکشی کا بھی ذکر کرتا ہے، جس نے پٹن وغیرہ کو فتح کرکے راے کرن کی لڑکی دول دیوی کو حاصل کیا، برنی نے گجرات کے اس دوسرے حملہ کا ذکر نہیں کیا ہے، مگر امیر خسرو کی مشہور مثنوی دولرانی میں گجرات کے دوسرے حملہ کی تفصیل مذکور ہے، گو اس حملہ کے فوجی سرداروں کے نام فتوح السلاطین کے نام سے مختلف ہیں، امیر خسرو کا بیان ہے کہ اس مہم پر الف خان اور پنچمین مامور ہوئے تھے، عصامی نے ملک احمد جھیتم کا نام معلوم نہیں کس سند پر لکھا ہے، عصامی کے زیر نظر امیر خسرو کی کوئی تصنیف شاید نہ تھی، اسی لئے خضر خان اور دولرانی کے عشق و وصال کی داستان کی تفصیل میں خسرو کی مثنوی کا فتوح السلاطین پر کوئی اثر نہیں تعجب ہے، کہ امیر خسرو نے جس واقعہ کے بیان میں اپنے

شاعرانہ کمال کا سارا زور تمام کردیا ہے، اس کا ذکر برنی نے اپنی تاریخ میں کہیں نہیں کیا ہے، تاریخ مبارک شاہی میں بھی اس واقعہ کو نظر انداز کردیا گیا ہے، بعد کے مورخوں میں نظام الدین نے بھی اس واقعہ کو حذف کردیا ہے، البتہ فرشتہ نے قاضی احمد غفاری کی تاریخ جہان آرا کے ذریعہ سے اس واقعہ کو تفصیل سے لکھا ہے،

علاء الدین کی وفات کے بعد ملک کافور کے کفران نعمت، خضر خان اور شادی خان کیساتھ اسکے بے رحمانہ سلوک، پھر اس کے قتل اور شہاب الدین کی معزولی کی تفصیلات میں عصامی اور برنی کے بیانات کم وبیش یکساں ہیں، قطب الدین خلجی کے ذکر میں گجرات کی مہم، دیوگیر کی تسخیر، یک لکھی کی سرکشی اور سرکوبی اور خسرو خان کی دکنی فتوحات کے بیان میں تاریخ فیروز شاہی اور فتوح السلاطین میں کچھ زیادہ فرق نہیں، البتہ عصامی نے لکھا ہے کہ یک لکھی کی سرکوبی کے لئے خسرو خاں گیا، مگر برنی کے بیان کے مطابق قطب الدین نے دوسرے امراء کو بھیجا، خسرو خاں اور پرواریوں کی فتنہ انگیزی، شورہ پشتی اور سفاکی کے واقعات عصامی نے برنی ہی کی طرح لکھے ہیں، اس کے بعد ناصر الدین (یعنی خسرو خاں) اور ملک غازی (یعنی غیاث الدین تغلق) کی جنگ کا حال برنی سے زیادہ تفصیل کیساتھ درج ہے، جس میں رزمیہ شان بھی بدرجہ کمال موجود ہے،

(باقی)

تلخیص و تبصرہ

مسلمانوں کے مستعمل سنہ

اسلام کے شروع سے لے کر اس وقت تک مسلمانوں میں مختلف قسم کے سنہ مستعمل ہوتے رہے، جن کی تعداد بیس کے قریب ہے، ایرانی فاضل، ایس۔ ایچ تقی زادہ نے ان سنوں پر لندن کے بلیٹن آف دی اسکول آف دی اورنٹیل اسٹڈیز میں ایک مقالہ لکھا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے:-

۱۔ ہجری قمری سنہ: جاہلی عرب سال کا حساب چاند کے مہینوں سے کرتے تھے، اسلام نے اس کو برقرار رکھا، مگر عرب جاہلیت کی طرح ابتدائے اسلام میں بھی کسی خاص سنہ کا رواج نہ تھا، سب سے پہلے ہجرت نبوی کے تقریباً سترہ سال بعد اس سنہ کا رواج ہوا، چونکہ یہ چاند کے حساب سے آنحضرت صلعم کی ہجرت کے سال یعنی ۶۲۲ء سے شمار کیا جاتا ہے، اس لئے یہ سنہ ہجری قمری کہلاتا ہے، لیکن سال کی ابتدا، ماہ ربیع الاول کی بجائے جس میں آپ نے ہجرت فرمائی تھی، ماہ محرم سے ہوتی ہے، جس سے اہل عرب اپنا سال شروع کرتے تھے،

۲۔ ہجری شمسی فارسی سنہ
۳۔ ہجری شمسی مصری سنہ: یہ صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ کب سے اس سنہ کا رواج ہوا

مگر تاریخ سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ عباسی خلافت کے شروع میں یہ سنہ رائج تھا، اور خراج کی وصولی کی دقتوں کی وجہ سے یہ شمسی سنہ اختیار کیا گیا تھا، اسی لئے یہ سنہ خراجی بھی کہلاتا ہے، مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں خراج شمسی حساب سے وصول کیا جاتا تھا، اور حکومت کے دفاتر میں اس کا اندراج قمری سال کے مطابق ہوتا تھا، لیکن آگے چل کر یہ مشکل پڑی کہ شمسی اور قمری سال میں دس دن پندرہ گھنٹے بارہ منٹ کا فرق ہونے کی وجہ سے ہر تینتیس ۳۳ سال کے بعد ایک قمری سال بڑھتا چلا جاتا تھا، چنانچہ مختلف مسلمان بادشاہوں کے زمانہ میں اس مشکل کا یہ حل نکالا گیا کہ ہر تینتیس شمسی سال میں ایک سال کا اضافہ کرکے اسکو قمری سال بنا لیا گیا، مثلاً متوکل علی اللہ کے زمانہ میں دونوں سال کا فرق بڑھتے بڑھتے ۲۴۲ھ میں پورے ایک سال کا فرق پڑ گیا تھا، اور حکومت کے دفاتر میں یوں درج ہونے لگا تھا، کہ "۲۴۲ھ میں ۲۴۱ھ کا مالیہ وصول ہوا، اور ۲۴۳ھ میں ۲۴۲ھ کا" جب متوکل کو معلوم ہوا تو اس نے اپنے درباری منجم علی بن یحییٰ کو اس کی اصلاح کا حکم دیا، چنانچہ اس کی تجویز کے مطابق دفاتر سے ایک قمری سال ۲۴۲ھ چھوڑ دیا گیا،

مصر اور فارس میں شمسی اور قمری سال کا یہی طریقہ رائج تھا، مگر مصری مسلمانوں میں اسکندری تقویم کے مطابق شمسی سال ۳۶۵ ۱/۴ دن کا ہوتا تھا، اور فارسی مسلمانون کے ہاں قدیم ایرانی تقویم کے مطابق ۳۶۵ دن کا،

۴ - مالیہ ہجریہ سنہ | ۱۷۸۹ء میں ترکی حکومت نے سنہ خراجیہ کی طرح سنہ مالیہ کے نام سے ایک نیا سنہ جاری کیا، جس کا حساب ہجری سنہ سے ہوتا تھا، لیکن جولیسی سال اور شامی مہینوں کے ناموں کے ساتھ تھا، اس میں بھی ہر تینتیس سال کے بعد شمسی سال میں ایک سال بڑھا کر اس کو قمری بنا لیا جاتا تھا، یہ طریقہ ۱۲۸۸ھ تک جاری رہا،

۵ - ہجری شمسی ایرانیہ سنہ | ۱۹۲۵ء میں ایران میں پارلیمنٹ کی تجویز کے مطابق ہجری شمسی سن کو رائج کیا گیا، مگر مہینوں کے نام فارسی اور موجودہ تقویم کے مطابق ابتدائی چھ مہینے ۳۱ دن کے اور باقی مہینے ۲۹ دن کے رکھے گئے، صرف بارہواں مہینہ ہر چار سال میں ۳۰ دن کا رکھا گیا، موجودہ حکومت میں قمری اور شمسی دونوں سنہ استعمال کئے جاتے ہیں، مذہبی چھٹیاں قمری سنہ کے مطابق دی جاتی ہیں، اور باقی سارا مالی کام شمسی حساب کے مطابق کیا جاتا ہے، شمسی سال کا پہلا مہینہ انگریزی مہینوں کے برخلاف موسم بہار یعنی ۲۱ر مارچ سے شروع ہوتا ہے،

۶ - یزدگردی سنہ | اسلام سے پہلے ایران میں یہ رواج تھا کہ ہر نئے بادشاہ کی تخت نشینی سے اس بادشاہ کے نام سے ایک نیا سنہ جاری ہوتا تھا، ساسانی خاندان کا اخیر فرمانروا یزدگرد تھا، وہ ۶۳۲ء میں تخت نشین ہوا، اس سال سے یزدگری سنہ شمار ہوتا ہے، جب مسلمانوں کا قبضہ ایران پر ہوا، اور وہان کے لوگ مسلمان ہوئے تو ایک زمانہ تک ان کے ہاں یہ سنہ جاری رہا، اور اب تک زردشتوں اور ہندوستان کے پارسیوں میں یہی سنہ مستعمل ہے،

قدیم ایرانیوں کے ہاں یزدگردی مہینے تیس تیس دن کے ہوتے تھے، اور باقی پانچ دن آٹھویں مہینے آبان کے آخر میں بڑھا دیئے جاتے تھے، موجودہ زردشتی اور پارسی بارہویں مہینے کے آخر میں ان پانچ دنوں کو بڑھا دیتے ہیں،

۷ - مجوسیہ سنہ | مسلمانوں کی تصنیفات میں اس کا نام تاریخ مجوس ہے، کسی زمانہ میں ایران کے مختلف حصوں خاصکر طبرستان، گیلان، قم اور ایران کے مرکزی صوبوں کے لوگ، اور خراسان اور ماوراء النہر کے زردشت اس سنہ کو عام طور پر استعمال

کرتے تھے، یزدگردی اور مجوسی سنہ میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں کہ مجوسی سنہ یزدگرد کے مارے جانے کے دوسرے سال یعنی سنہ ۶۵۲ء سے شروع ہوتا ہے، اس لحاظ سے اگر یزدگردی سنہ میں بیس برس گھٹا دیے جائیں، تو وہ مجوسی سنہ بن جاتا ہے،

۹۔ جلالی یا ملک شاہی سنہ | سلجوقی فرمانروا سلطان جلال الدین ملک شاہ کے زمانہ مین جب قمری اور شمسی سالوں میں کمی بیشی کی وقت پیش آئی، تو اس نے سنہ ۴۷۱ھ میں اپنے منجموں کو اس کی اصلاح کا حکم دیا۔ چنانچہ انھوں نے جن میں سے ایک عمر خیام بھی تھا، شمسی سال کی اصلاح کرکے ایک نیا سنہ جاری کیا، جس کا نام سنہ جلالی یا سنہ ملکشاہی رکھا گیا، ملک شاہ نے مذہبی امور کے لئے قمری سال کو برقرار رکھا، اور مالی تنظیمات میں منجمین کے اصلاح کردہ سنہ کو رائج کیا، اس وقت سے دونوں سنہ یعنی قمری اور شمسی ساتھ ساتھ استعمال ہونے لگے، شمسی سنہ کے مہینے فارسی تھے۔ اس کے کل مہینے تیس تیس دن کے تھے، اخیر کے مہینے اسفندار میں پانچ دن اور ہر چار سال میں چھ دن بڑھا دیے جاتے تھے،

خانی چنگیزی سنہ | یہ سنہ مشہور چنگیز خان کی تخت نشینی کے سال یعنی سنہ ۶۰۳ھ سے شمار کیا جاتا ہے، یہ سنہ بہت کم مستعمل ہوا ہے، صرف ابو محمد عطا بن احمد بن محمد بن خواجم غازی سمرقندی کی ایک عربی قلمی تصنیف میں جو علم ہیئت پر ہے، اور شاہ عباس اول کے مشہور منجم ملا مظفر کی شرح بست باب میں استعمال ہوا ہے، اس سنہ میں مہینے فارسی استعمال کئے گئے ہیں،

۱۰۔ خانی غازانی سنہ | یہ سنہ ۱۰ یا ۱۱ رجب سنہ ۷۰۱ھ سے شمار کیا جاتا ہے، اور تاریخ الخان کی شہادت کے مطابق پہلی رجب سنہ ۷۰۱ھ شمار ہوتا ہے،

۱۱- الٰہی سنہ | شہنشاہ اکبر نے ۹۹۲ھ میں اس سنہ کو جاری کیا تھا، جو شاہ جہان کی تخت نشینی کے سال تک برابر استعمال ہوتا رہا، یہ سنہ اکبر کی تخت نشینی کے سال یعنی ۹۶۳ھ / ۱۵۵۶ء سے شمار کیا جاتا ہے، یہ سنہ شمسی تھا، اس کے مہینوں کے آخر میں پانچ دن کا اضافہ کرنے کی بجائے ان کو مہینوں میں بانٹ دیا گیا تھا،

۱۲- عیسوی سنہ | ترکی میں سب سے پہلے ۱۹۲۶ء سے اس کا رواج ہوا، یہ سنہ گریگوری تقویم کے مطابق ہے، مارچ، مئی اور اگست کے علاوہ اس کے باقی مہینوں کے نام شامی ہیں،

۱۳- تخلیقی سنہ | مسلمان مورخوں نے اپنی کتابوں میں اس سنہ کو استعمال کیا ہے، یہودیوں اور عیسائیوں کا اس میں بہت اختلاف ہے، کہ یہ سنہ کب سے شروع ہوا،

۱۴- طوفانی سنہ | یہ سنہ طوفانِ نوحؑ سے شمار کیا جاتا ہے، اس سنہ کے اجرار کی تاریخ میں بھی عربی اور فارسی مورخوں کا سخت اختلاف ہے، ابومعشر بلخی، حمزہ اصفہانی، مسعودی، سجزی، بیرونی کوشیار، صفدی علی یزدی کے دیئے ہوئے سنین سے بالترتیب یہ سنہ نکلتے ہیں، ۳۱۰۱ ق م - ۳۱۰۲ ق م، ۳۲۳۷ ق م، ۳۱۰۳ ق م، ۳۰۱۲ ق م، ۳۰۹۲ ق م، ۳۱۴۷ ق م، ۲۶۰۲ ق م،

۱۵- اسکندری سنہ | اکثر مسلمان مورخوں نے اس کو اپنی تصنیفات میں استعمال کیا ہے، اس کا مشہور نام تاریخ اسکندری ہے، مسلمانوں نے اس کو شامیوں سے لیا تھا جن میں یہ عام طور پر مستعمل تھا، یہ سنہ باختلاف روایات ۳۱۱ ق م - یا ۳۱۲ ق م سے شروع ہوتا ہے،

۱۶- تاریخ الصفر | یہ سنہ پہلی جنوری ۳۸ ق م سے شمار کیا جاتا ہے، خیال کیا جاتا ہے کہ اسی تاریخ کو اگسٹس نے اسپین فتح کیا تھا، اسپین کے مسلمانوں میں یہ تاریخ رائج تھی، محمد

یحییٰ بن عبدالکریم نے علم ہیئت پر اپنی ایک کتاب میں جس کا ایک قلمی نسخہ برلن کے کتبخانہ میں ہے، اس تاریخ کو استعمال کیا ہے،

۱۷۔ تاریخ الشہداء اس کا دوسرا نام تاریخ الحقبات ہے، یہ ۲۹ راگست ۲۸۴ء سے شروع ہوتی ہے، کسی زمانہ میں یہ مصر میں رائج تھی، عیسائیوں کی عربی تصنیفات میں یہ تاریخ عام طور پر پائی جاتی ہے،

۱۸۔ معتضدی تقویم عباسی خلیفہ معتضد باللہ کے زمانہ میں ۲۸۲ھ کا نوروز ۱۱ جون کے بجائے ۱۲ اپریل کو پڑ رہا تھا، اس لئے پرانی تقویم میں اصلاح کرکے معتضدی تقویم کے نام سے ایک نئی تقویم بنائی گئی، اس میں شمسی سال کے پانچ دنوں کو آٹھویں مہینے آبان میں بڑھانے کی بجائے ہر چار سال کے بعد چھ دن کا اضافہ کر دیا جاتا تھا، یہ نئی تقویم غالبًا جلالی تاریخ کے وجود میں آنے تک برابر استعمال ہوتی رہی،

خوارزم کے فرمانروا احمد بن محمد بن عراق بن منصور نے اسی معتضدی تقویم کے مطابق ۳۴۸ھ ۹۵۹ء میں خوارزمی تقویم کی اصلاح کی،

۱۹۔ خلف بن احمد کی تقویم، سیستان کے صفاری شہزادہ خلف بن احمد نے ایک نئی تقویم بنائی تھی، فارسی کتاب نوروز نامہ میں جو عمر خیام کی طرف منسوب ہے لکھا ہے کہ اس کتاب کے مصنف کے وقت تک اسی نئی تقویم میں سولہ دن کا فرق ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نئی تقویم کچھ زیادہ صحت کے ساتھ نہیں بنی تھی،

۲۰۔ ۱۹۲۵ء سے پہلے کی ایرانی تقویم، ۱۹۲۵ء کی اصلاحی تقویم سے پہلے ایران میں ایک دوسری تقویم رائج تھی، جس کے مہینوں کے نام بارہ برجوں (حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو، حوت) کے

ناموں پر رکھے گئے تھے، اس تقویم کا سنہ موسم بہار یعنی ۲۱ر مارچ سے شروع ہوتا تھا، موجودہ افغانستان میں یہی تقویم رائج ہے، مگر سنہ ہجری شمسی کے ساتھ،

ان کے علاوہ مسلمانوں کے ہاں اور بھی بہت سی تاریخوں کے نام ملتے ہیں، جیسے تاریخ بخت نصر، مقدونیہ کے فلپ کی تاریخ، تاریخ اگسٹس، تاریخ انٹونیس، وغیرہ، لیکن چونکہ ان کا شاذ و نادر ہی استعمال ہوا ہے، اس لئے ان کے بتانے کی ضرورت نہیں،

"ح"

ہماری بادشاہی

ہمارے چھوٹے بچوں کے نصاب میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی، جو ان کو تیرہ سو برس کی قومی تاریخ سے باخبر کرسکے، یہ کتاب اسی ضرورت کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے، اس کی زبان بچوں کے لائق دلچسپ اور پسندیدہ ہے، یہ ان تمام بڑی بڑی سلطنتوں کی مختصر اور آسان تاریخ ہے، جو گذشتہ صدیوں میں مسلمانوں نے دنیا کے مختلف حصوں میں قائم کیں، امید ہے کہ اسکولوں، مدرسوں اور مکتبوں کے کارکن اور معلم اس کو نصاب تعلیم میں داخل کریں گے، ضخامت ۲۰۰ صفحے، قیمت :- عہ

مقالاتِ شبلی جلد ششم تاریخی

یعنی

یہ حصہ مولانا شبلی مرحوم کے ان تاریخی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں اسلامی حکومتوں کے تمدن وتہذیب، علم وفن، شوق علم، اور بے تعصبی کے متعلق نہایت محققانہ واقعات درج کئے گئے ہیں، اور ان کے متعلق یورپین مورخین کے اعتراضات کے جوابات دیئے گئے ہیں،

ضخامت :- ۲۴۴ صفحے، قیمت :- ہیر

"مینیجر"

اخبارِ علمیہ

مریخ میں آبادی

زمین سے سب سے قریب سیارہ مریخ ہے اور وہ برابر زمین سے قریب تر ہوتا جارہا ہے گذشتہ ہفتہ وہ زمین سے بہت قریب آگیا تھا اور زمین سے اس کا فاصلہ ۳۶۰۰۰۰۰۰ میل رہ گیا تھا،

مریخ کی آبادی کا نظریہ ۱۸۷۷ء میں جب ایک اطالوی ہیئت داں شیا پریلی (-Schiaparelli) نے کرۂ مریخ کی نہروں کے دھندلے نشانات کی تصویر لی اور آگے بڑھا، شیا پریلی کے اس نظریہ سے فائدہ اٹھاکر امریکہ کے مشہور ہیئت دان پرسیول لاول (Percival Lowell) نے دعوی کیا کہ وہ نہروں کے نشانات کو صاف طور پر دیکھ سکتا ہے، لاول کا یہ خیال تھا کہ مریخ کے باشندوں نے یہ نہریں اس لئے کھودی ہیں تاکہ قطبین پر جو برف پانی بن کر بہہ رہی ہے، اس سے ان نہروں کے ذریعہ خشک زمینوں کو سیراب کیا جائے،

لیکن بعض دوسرے ہیئت دانوں نے جن میں سے بعض لاول سے بھی زیادہ دقیق النظر تھے، اس کی تردید کی، کہ یہ نہریں نہیں ہیں، بلکہ ہمارے ذہن اور نظر کا دھوکہ ہیں،

کرۂ مریخ پر نباتات کی روئید گی بھی ہیئت دانوں کا مشہور نظریہ ہے، اور اس کا ثبوت یہ دیا جاتا ہے، کہ مریخ میں جو سرخ رنگ نظر آتا ہے وہ یہ اسی روئیدگی کا نتیجہ ہے، لیکن اب اس

رنگ کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ مریخ کی زمین نے کیمیائی طریقہ پر آکسیجن کو جذب کر لیا ہے جس کی وجہ سے وہ زنگ آلود ہو گئی ہے، اس کرہ کی سطح پر جو سیاہ دھبے ہیں وہ سردی کے موسم میں زیادہ واضح نظر آتے ہیں، گرمی کے موسم میں ان کا رنگ سبزی مائل نیلگوں ہوتا ہے، اور سردی میں بادامی زردی مائل رنگ کا یہ تغیر اس بات کا قوی ثبوت ہے، کہ مریخ کی زمین پر روئیدگی ہے،

اس سلسلہ میں ایک شبہہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ زمین کے سبز درختوں میں خضرہ (Chlorophyll) پایا جاتا ہے، لیکن جب مریخ کی سبزی کا طیف پیما تجزیہ (Spectroscopic Analysis) کیا جاتا ہے، تو اس میں خضرہ نہیں دکھائی دیتا، شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ زمین کے سبز درختوں میں خضرہ آفتاب کی روشنی کو حاصل کرنے کا ذریعہ بنتا ہے، اور چونکہ مریخ کی حالت زمین سے مختلف ہے اس لئے وہاں خضرہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے،

مریخ میں جاندار کا ہونا بھی ایک قیاس ہی ہے، یہ کرہ زمین سے چھوٹا سرد اور خشک ہے، اس کی ہوا بہت ہلکی ہے، مونٹ ولسن کے ماہرین ہیئت آڈمس اور ڈنہم کے نظریے کے مطابق مریخ میں زمین سے دس فیصدی کم آکسیجن ہے لیکن خود ہمارے کرۂ زمین میں بھی بہت سے ایسے جاندار موجود ہیں، جو آکسیجن کی موجودہ مقدار سے بھی کم میں زندگی بسر کر سکتے ہیں، بہت ممکن ہے کہ مریخ میں ایسے ہی کم آکسیجن میں سانس لینے والے جاندار ہوں، یا وہ آکسیجن کی کمی کی وجہ سے اسکی کم مقدار میں زندگی بسر کرنے کے عادی ہو گئے ہوں، ایسے جاندار ذہین تو ہو سکتے ہیں مگر وہ بہت ہی سست ہوں گے،

آیندہ سال کیلیفورنیا کی دو سو انچ لمبی دوربین تیار ہو جانے کے بعد بھی مریخ کی آبادی کا مسئلہ غالباً حل نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس دوربین میں سے مریخ کی جسامت زیادہ بڑی ہو کر

نظر توآسکتی ہے، لیکن فضائی تبدیلیوں کی وجہ سے وہ صاف نہیں دکھائی دیسکتا،

اگر مریخ کے باشندے زمین کے باشندوں سے اشاروں کے ذریعہ سے کچھ کہنا چاہیں تو ان کے لئے یہ ایک اچھا موقع ہے، اگر وہ ایک بلند مینار پر ڈیڑھ کرور کھرب شمعوں کی طاقت کی ایک بتی جلائیں تو شاید مونٹ ولسن کی ایک سو انچ لمبی دوربین میں اس کی کچھ خفیف روشنی دکھائی دے سکے، بہرحال مریخ کی آبادی سے ابتک نامہ وپیام کا کوئی ذریعہ نہیں پیدا ہوا ہے،

لاول کی رصدگاہ میں مشہور ہیئت داں ارل کارل سلیفر نے موجودہ ماہرین ہیئت سے زیادہ مریخ کا مطالعہ کیا ہے، چند سال پہلے اُس نے مریخ کی تصویریں لی تھیں جن سے معلوم ہوا کہ مریخ کی سطح پر اکثر بادل اور طوفان اٹھتے رہتے ہیں، اور خاصکر مریخ کے خط استوار کے قریب توشدت کے ساتھ طوفان آتے رہتے ہیں، مگران کا زور صرف صبح کے وقت ہوتا ہے اور جیسے جیسے سورج بلند ہوتا جاتا ہے، بادل اور طوفان بھی غائب ہوتے چلے جاتے ہیں،

گزشتہ ہفتہ زمین کے شمالی حصہ سے زیادہ اس کے جنوبی حصہ میں مریخ صاف دکھائی دینے والا تھا، اس لئے ڈاکٹر سلیفر نے جنوبی افریقہ کے شہر بلوئیم فان ٹین کی رصدگاہ میں بیٹھ کر مریخ کا معاینہ کیا، اس کو مریخ کے قطب جنوبی کے نزدیک ایک سیاہ نقطہ نظر آیا جو اصل میں اتنا بڑا ہوگا، جتنا کہ موجودہ ممالک متحدہ امریکہ ہے، یہ سیاہ نقطہ اس سے پہلے کبھی نہیں دکھائی دیا تھا، اس سے ڈاکٹر سلیفر نے یہ قیاس کیا ہے کہ شاید یہاں نئے درخت اُگ آئے ہیں،

"ع"

از

حکیم الشعرا امجد حیدر آبادی

دن رات تجسس ہے یہ آخر کس کا؟ جس کے پیاسے ہیں ہم وہ دریا ہی کہاں؟
مدت سے خدا خدا کہا کرتے ہیں آخر اس اسم کا مسمیٰ ہے کہاں؟

یہ لاینحل سوال کس سے پوچھیں
کیسا ہے وہ ذوالجلال کس سے پوچھیں

(مولوی سے خطاب)

ہاں مولوی صاحب آپ تو عالم ہیں کچھ اس کا پتہ آپ بتا سکتے ہیں؟
فرمایا کہ ہے عرش بریں اُسکا مقام ہم بندے کہاں عرش تک جا سکتے ہیں

کیوں راہِ طلب میں خود کو گمراہ کرو
بیٹھے ہوئے گھر میں اللہ اللہ کرو

(فلسفی سے خطاب)

ہاں فلسفی صاحب آپ کیا کہتے ہیں کیا ہم بندوں کا کوئی مولا ہی نہیں
کہنے لگے "کیا خدا خدا کہتے ہو" یہ اسم وہ ہے جس کا مسمّیٰ ہی نہیں

دنیا میں کوئی خدا سے آگاہ نہیں

یہ اپنی ہی من گھڑت ہے اللہ نہیں

ماہرِ سائنس سے خطاب

پھر ماہرِ سائنس سے یہ ہم نے پوچھا اس بارے میں کہئے آپ کیا کہتے ہیں

فرمایا، گذشتہ سے تو لاعلم ہیں ہم اس وقت تو "برق" کو خدا کہتے ہیں

بجلی کی تجلیوں کا سب جلوہ ہے

موسیٰ نے اسی کو طور پر دیکھا ہے

صوفی سے خطاب

صوفی صاحب! ذرا مُراقب ہو کر کچھ آپ اپنی زبان سے فرمائیے گا

کہتے ہیں کسے خدا؟ تو ارشاد ہوا وہ ساتھ ہے آپ کے جہاں جائیے گا

مظہر ہیں اُسی کے سب، یہ سافل عالی

خود اپنا وجود اُس سے کب ہو خالی

امجد سے خطاب

امجد صاحب! کچھ آپ ارشاد کریں ہم بھی تو سُنیں کہ آپ کیا کہتے ہیں

فرمایا کہ "یُومِنُونَ بِالْغَیبِ" کے تحت ہم "طاقتِ غیبی" کو خدا کہتے ہیں،

وہ طاقتِ غیبی، جو محیط الکل ہے

ثابت کرتی ہے جس کا ہونا ہر شے

جس کے آگے کسی کی چلتی ہی نہیں،

جو اس کی مشیت ہو وہ ٹلتی ہی نہیں

شاعر سے خطاب

شاعر صاحب! خدا کو تم کیا سمجھے شاعر بھی تو دُور کی خبر لاتے ہیں

کچھ دل میں گنگنا کے یوں فرمایا ہم اپنے خیال میں اسے پاتے ہیں

دنیا والے "خیال" کہتے ہیں اُسے

ہم، "جلوۂ ذوالجلال" کہتے ہیں اُسے

راوی کوئی نہ ملا، اس سے ملانے والا — دیکھا نہ گیا کوئی دکھانے والا

اس دَور میں ایک بھی کولمبس نہ ہوا — امریکہ کا پتہ چلانے والا

ہم موردِ الطافِ کرم کس کے ہیں — یا خوگرِ صد جور و ستم کس کے ہیں

ہر چیز جہاں میں ہے اِس کی اُسکی — اے کاش کوئی کہدے کہ ہم کس کے ہیں

سمجھایا ہر اک نے اپنے ڈھب سے — لیکن ہم کو تو کوئی رستہ نہ ملا

پہونچے ہم اسی فکر میں اک دوست کے گھر — واں کھیل رہا تھا اُن کا کم سن بچہ

پھولے ہوئے گال رُخ پر بکھرے ہوئے بال

اک چاند کا ٹکڑا، ماہِ تاباں کی مثال

ہم نے اُسے گود میں اُٹھا کر پوچھا — معصوم فرشتے! کچھ تمھیں سمجھاؤ،

بولو، کہ خدا کہاں ہے، اور کیا ہے؟ — ہنسکر بولا کہ آؤ، گھر میں آؤ،

جس کو تم پوچھتے ہو، وہ تو یاں ہے

کیا تم کو بتا ہی دوں؟ وہ میری ماں ہے

تم بھی یون ہی تمام رحمت ہو جاؤ — دنیا کے لئے موجبِ راحت ہو جاؤ

بن سکتے ہو تم خود بھی خدا گر چاہو — بس کچھ نہیں بندۂ محبت ہو جاؤ

رب اپنے ہر اک بندے کے ہمراہ ہوا — اس واسطے انتقام، دل خواہ ہوا

ہے رحم و کرم ہی سے خدائی کا رواج — اللہ بھی محبت ہی سے اللہ ہوا

تفسیر حسن بیان

آج کل سب سے بڑا آسان کام قرآن کی تفسیر لکھنا ہے، جنکو عربی میں ذرا بھی سد بدھ نہین، وہ بھی اپنے کو خاکساری سے اس کا اہل جانتے ہیں، اردو کے نئے مفسّروں میں اسکی کئی مثالیں سامنے ہیں، لیکن ابھی حال میں "حسن بیان" کے نام سے کسی غلام حسن نیازی پشاوری کی تفسیر شائع ہوئی ہے اور جرأت یہ ہے کہ وہ لوگون کے پاس ریویو کی غرض سے بھیجی گئی ہے،

مصنف نے مقدمہ میں یہ لکھا ہے کہ چونکہ خواجہ کمال الدین صاحب عربی میں "کم پایہ" تھے، اسلئے "غلطی" سے بچنے کے لئے ان کو "مدد" کی ضرورت ہوتی تھی، جو عربی زبان میں اون سے زیادہ ماہر ہو "یہ "زیادہ ماہر" بزرگ یہی غلام حسن صاحب نیازی ہیں، سوان نیازی صاحب کی عربی مہارت کا یہ حال ہے کہ انھوں نے اپنی قابلیت کے اظہار کیلئے شروع ہی میں عربی کے دو حرف لکھے ہیں، اور دونوں غلط! ٹائٹل پر لکھتے ہیں "حسن بیان من غلام حسن نیازی" حالانکہ عربی کا کم پایہ طالب علم بھی جانتا ہے کہ یہ موقع مِن کا نہیں ل کا ہے،

مقدمہ کے پہلے صفحہ میں خواجہ صاحب کیلئے دعا کی ہے "اللّٰھم اغفر لہٗ" حالانکہ عربی داں تو عربی داں عام مسلمان بھی جانتا ہے کہ غفر کا صلہ لام ہے، اللّٰھم اغفرلہ، نہ کہ اللّٰھم اغفر لہٗ،

اب فرمائیے کہ عربی میں جن کا یہ پایہ ہو ان کی تفسیر کیسی ہوگی، اور ان "کم پایہ" بزرگ کے بھروسہ اور سہارے پر جو قرآن پاک کا کام کیا گیا ہو، وہ کس بھروسہ کے لائق ہے،

قرآن پاک کی تفسیر سے زیادہ ترجمہ "دلچسپ" ہے، اب تک تو یہ کیا جاتا تھا، کہ قرآن پاک کا ٹیسٹ ترجمہ تو ٹھیک کیا جاتا تھا، البتہ اسکی تفسیر میں تحریفیں کیجاتی تھیں، ان نئے مفسر نے کہا کہ یہ بھی ایک طول عمل ہے، یہ کیوں نہ کیا جائے، کہ ترجمہ ہی ایسا کیا جائے جس میں تفسیر میں زیادہ کاوش نہ کرنا پڑے، یعنی تحریف ترجمہ ہی میں کی جائے، چنانچہ شروع سے آخر تک یہی کیا ہے، شروع ہی کی ایک آیت کا ترجمہ سنیے،

ذٰلك الكتاب لاريب فيه ـــ یہ کتاب ہے جس میں بے شک ہدایت

هدى للمتقين، ـــ ہے پرہیزگاروں کے لئے،

اس ترجمہ میں حبس قرآن پاک کے کس لفظ کا ترجمہ ہے، اگر آیت پاک کا یہ مطلب ہوتا جو اس ترجمہ میں بتایا گیا ہے تو اس آیت کی عربی یوں ہوتی، لاريب فى انه هدى للمتقين یا یوں ہو سکتی لاريب انه هدى للمتقين، یہ غلطی بعض بے معنی اعتراضوں سے بچنے کے لئے سید احمد خان مرحوم نے کی ہے، اور اس مفسر جدید نے اسکی تقلید کی ہے،

پوری تفسیر ۹۵۰ صفحوں کی ایک جلد میں ہے، اوپر قرآن مع ترجمہ ہے، نیچے تفسیری حاشیے ہیں، قادیانی حضرات بھی شاید اتنی "کم پایہ" تالیف کو اپنے دار الکتب میں رکھ کر خوش نہ ہوں گے،

تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس میں تاریخی دلچسپی بھی کم نہیں، فتنہ تاتار کے حال میں لکھا ہے (ص ۴۹۵) کہ "خوارزم کے سلطان الپ ارسلان نے" حالانکہ خوارزم کو الپ ارسلان نے نہیں سلطان قطب الدین محمد نے" (گزیدہ ص ۴۹۶) اور جو قصہ لکھا ہے وہ بھی بے ثبوت ہے،

"س"

فہارس لسان العرب

لسان العرب ابن منظور اندلسی المتوفی ۷۱۱ھ عربی زبان کی ایک نہایت مستند اور ضخیم تالیف ہے، جو ۲۰ جلدوں میں مصر سے شائع ہوئی ہے، اس کتاب میں لغات کے ثبوت اور تشریح میں عربی کے سیکڑوں شاعروں کے نام اور ان کے ہزاروں شعر درج ہیں، ان میں سے بہت سے شاعر تو ایسے ہیں جن کے نام و کلام کو زمانہ کے بے رحم ہاتھوں نے مٹا دیا ہے بہت سے اشعار ایسے ہیں جن کے لغات کے معنی نامعلوم، اور ان کے مطالب تحقیق و سماع کے محتاج ہیں، ابن منظور نے ان کے لغات کو حل، اور ان کے مطالب کی تشریح کی ہے، مگر چونکہ یہ اشعار کتاب کے ہزاروں صفحوں میں بکھرے ہوئے ہیں، اسلئے ان شاعروں کے کلام اور ان کے مطالب کے ذخیرہ کو آسانی سے کوئی پا نہیں سکتا، اغانی کا بھی یہی حال تھا، مگر یورپ کے ایک فاضل نے اس کی ایک ایسی فہرست بنا دی کہ اغانی کے فائدہ کی مقدار خدا جانے کتنی بڑھ گئی،

خوشی کی بات ہے کہ لسان العرب کی یہ خدمت ایک ہندی نژاد کی قسمت میں آئی، مولوی عبد القیوم صاحب ایم اے، ریسرچ اسٹوڈنٹ پنجاب یونیورسٹی نے اس کام کو بڑی محنت سے انجام دیا ہے، انھوں نے پہلے تو یہ کیا ہو کہ لسان العرب میں جتنے شاعروں کے نام جہاں جہاں آئے ہیں، ان کو یکجا کیا ہی، اور پھر ان کو حروف تہجی پر ترتیب دیا ہی، اور ہر جلد کے جس جس صفحہ میں وہ نام آئے ہیں، ان کا حوالہ دیا ہے، اس طرح آپ نہایت آسانی سے یہ معلوم کرسکتے ہیں کہ کس شاعر کا نام کہاں کہاں آیا ہے، اور اس کے اشعار اس کتاب میں کہاں کہاں ہیں،

اسکی دوسری جلد میں اشعار کی فہرست ہو گی، کہ کون شعر اس میں کہاں ہی، یہ کام جتنی

محنت اور ہمت اور دیدہ ریزی کا ہے اس کا اندازہ اہل علم ہی کر سکتے ہیں، مولف نے اپنی اس محنت سے خدا جانے کتنے عالموں اور طالب علموں کو تلاش کی محنت اور زحمت سے بچا دیا ہے،

"س"

اسلامی سکّوں کا مجموعہ

ڈھاکہ مین

مولنا حکیم حبیب الرحمن صاحب (ڈھاکہ) ان اہل علم میں ہیں جن کی عمر کا بڑا حصہ علم و فن کی خدمت میں گذرا ہے، موصوف کو اسلامی تاریخ اور خصوصاً اسلامی بنگال کی تاریخ سے بڑی دلچسپی ہے، جس کا ثبوت اونکے محققانہ مضامین سے ملتا رہتا ہے،

آج کل تاریخی تحقیقات اور خصوصاً بادشاہون کے سال و سنہ کی تحقیق کے لئے ان کے پرانے سکے بڑی اہمیت رکھتے ہیں، کیونکہ یہ معدنی اوراق درحقیقت ان کی معاصر تاریخیں ہیں، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے سبب سے ان سکّوں کے جمع کرنے کا شوق بنگال کے بعض اہل علم میں بھی پیدا ہوا، انہی میں ہمارے دوست مولنا حکیم حبیب الرحمن صاحب بھی ہیں،

موصوف کے پاس سکوں کا نادر مجموعہ جمع ہوگیا تھا، کئی سال ہوئے کہ ان کو خیال ہوا کہ یہ کسی پبلک مقام پر رکھے جائیں، اور اس کے لئے انھوں نے دار المصنفین کے غریب خانہ کو چنا تھا، مگر کہاں نقرئی و طلائی سکے، اور کہاں دار المصنفین کا غریب خانہ! بہرحال وطن کی محبت غالب آئی اور انھون نے اس ذخیرہ کو ڈھاکہ میوزیم کے سپرد کر دیا، ڈھاکہ میوزیم کے ناظر (کیوریٹر) ڈاکٹر ان بی، بھٹا سالی ایم اے نے ان سکون کی فہرست (کٹیلاگ) اپنی تحقیقات کے ساتھ انگریزی میں شائع کی[1] ہے،

---

[1] قیمت ۸؍، ڈھاکہ میوزیم،

یہ کل سکے تعداد میں ۱۱۲ ہیں، ان میں تین سکے ہند و عہد کے ہیں، ایک کشمیر کا، اور دوسرا ہند کے شاہیہ خاندان کا جو افغانستان اور ہندوستان کی سرحد پر تھا، اور جس کا خاتمہ سلطان محمود نے کیا، اور تیسرا قنوج کے گھروار خاندان کا ہے، باقی سب اسلامی سکے ہیں،

ان اسلامی سکوں میں سب سے پرانا خلیفہ عبد الملک اموی کا ہے، جسکے زمانہ میں سب سے پہلے اسلامی سکے ڈھالے گئے، یہ سکہ ۸۱ھ کا ہے جس میں ایک طرف کلمۂ توحید اور سنہ اور دوسری طرف سورۂ اخلاص اور قرآن پاک کی ایک اور آیت ہے،

سکوں کی سب سے بڑی تعداد شیر شاہ کی ہے، اس بادشاہ کے ۹۵ سکے ہیں جن میں سب سے نادر ۹۴۵ھ کا سکہ ہے، اس کے بعد بنگال کے بادشاہوں کے سکوں کی تعداد ہے، دلی جونپور اور گجرات کے علاوہ ایک سکہ نیپال کا، دوسرا غزنین کا ہے، ایران کے مغل تیموری اور صفوی بادشاہوں کے کئی سکے ہیں، کابل کے امیروں کے سکے بھی ہیں،

"س"

مطبوعاتِ جدیدہ

تذکرۂ وقار، مرتبہ جناب منشی محمد امین صاحب زبیری، سابق مہتمم تاریخ بھوپال، تقطیع اوسط ضخامت ۴۰۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مرقوم نہیں، پتہ:- مؤلف سے علی گڈہ سے ملے گی،

سرسید احمد خاں مرحوم کے رفقاے کار میں سے ہر ایک نے اپنی صلاحیت و استعداد کے مطابق، اپنی قوم کی نہایت قیمتی خدمات انجام دیں، اس لحاظ سے ان سب کی زندگی ایک خاص حیثیت رکھتی ہے، لیکن اخلاقی اوصاف کے لحاظ سے نواب وقار الملک مرحوم کا درجہ ان سب میں ممتاز تھا وہ اخلاق کی بلندیٔ سیرت کی مضبوطی، سچائی اور دیانت کا نمونہ تھے منشی محمد امین صاحب زبیری جنھوں نے اس سلسلہ کے مختلف بزرگوں کی مختصر سوانحمریاں لکھی ہیں، نواب وقار الملک کی مفصل سیرت عرصہ ہوا مکمل کر چکے تھے، لیکن اس کی اشاعت کی نوبت نہ آئی تھی کہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے "وقار حیات" کے نام سے ایک مبسوط سیرت لکھوا کر شائع کی، گو اس کی ترتیب میں بھی منشی محمد امین صاحب زبیری کے مسودہ سے فائدہ اٹھایا گیا تھا، لیکن خود ان کی مرتب کردہ سیرت کی اشاعت کی نوبت اب آئی ہے، یہ سیرت گو "وقار حیات" کے مقابلہ میں مختصر ہے لیکن صاحبِ سیرت کی زندگی کا کوئی پہلو چھوٹنے نہیں پایا ہے، ابتدائی حالات، اس دور کے قومی خدمات، حیدر آباد کی ملازمت کے زمانہ کے خدمات اور کارنامے، ریاست کے مختلف شعبوں میں

اصلاح و ترقی، مفید نئے شعبوں کا قیام، ریاست اور رعایا کی خیر خواہی، حیدرآباد کی سیاست کے نشیب و فراز و انقلاب و حوادث، یہاں سے سبکدوشی کے بعد علیگڈہ کالج سے تعلق، اس کی خدمات، کالج کی سیاست کے مختلف دور، اور اس سے متعلق تمام واقعات و حالات، اس کی تاریخ ان میں نواب وقار الملک کی مخلصانہ کوششوں، انکی دیانت و حق پرستی، اور ان کے دوسرے مذہبی تعلیمی اور اصلاحی خدمات اور کارناموں کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اس زمانہ میں علی گڈہ کالج مسلمانوں کی سیاست کا مرکز تھا، اور اس کا سکریٹری مسلمانوں کا نمایندہ ہوتا تھا، اس لئے اس دور کی سیاست کے بعض پہلو بھی آگئے ہیں، ان تمام واقعات میں نواب وقار الملک مرحوم کے اخلاق و سیرت کی بلندی، اور دیانت و حق پرستی مشترک ہے، مولف نے واقعات کے جمع کرنے میں بڑی محنت اٹھائی ہے، ان کی کوششوں سے ان کو بعض ایسے حالات کے حاصل کرنے میں بھی کامیابی ہوئی ہے، جن کا حصول بہت دشوار تھا، گو یہ سیرت نسبتہً مختصر ہے لیکن صاحب سیرت کی زندگی کے جملہ حالات کو جامعیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے،

فن تفسیر، مؤلفہ جناب مرزا عزیز فیضانی دارا پوری، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہت معمولی قیمت ۱۲ر پتہ شیر بلڈنگ موچی دروازہ، لاہور،

آج کل کے خود ساختہ مفسروں نے کلام اللہ کی تفسیر جیسے نازک فرض اور اہم ذمہ داری کو اتنا آسان بنا دیا ہے کہ جسے عربی میں ذرا شد بد ہوئی، وہ قرآن کا مجتہد مفسر بن بیٹھا، بلکہ عربی کی بھی ضرورت نہیں پڑتی، اردو ترجمہ کی مدد کافی سمجھی جاتی ہے، اس سہولت اور آزادی نے کلام اللہ میں من مانی تاویلوں کا دروازہ کھول دیا ہے، جس کے نمونے آئے دن نظر آتے رہتے ہیں، اس آزادی کو پیش نظر رکھ کر مرزا عزیز فیضانی صاحب نے فن تفسیر کے اصول و شرائط پر یہ کتاب لکھی ہے، اس میں چار باب ہیں، پہلے باب میں دوسرے اہل مذاہب اور ان کی مذہبی کتابوں کے

مقابلہ میں کلام اللہ کی صحت اور اس کی تفسیر و تاویل میں مسلمانوں کا اہتمام اور ان کی احتیاط اپنی مذہبی کتابوں کی تفسیر سے دوسرے اہل مذاہب کی غفلت اور بے توجہی کے اسباب اور قرآن کی تفسیر میں قرن اول کے مسلمانوں کا شغف و اہتمام دکھایا ہے، دوسرے باب میں زمانہ مابعد خصوصاً موجودہ دور کے مسلمانوں میں قرآن کی تفسیر کی جانب سے بے توجہی کے اسباب و وجوہ اور مذہب سے ان کی غفلت دکھائی گئی ہے، تیسرے باب میں غلط تاویل و تفسیر کے اسباب بتائے ہیں، چوتھے باب میں علمی حیثیت سے تفسیر کے اصول و شرائط بیان کئے ہیں، مرزا صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، وہ اخلاص حسن نیت اور خدمتِ دین کے جذبہ سے لکھا ہے، اور اپنے مقدور بھر موضوع کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی ہے، لیکن علمی حیثیت سے اس کتاب کے مباحث کی وہ نوعیت نہیں ہے، جو اس کے لئے درکار تھی، پہلے تین باب اصل مقصد کی تمہید ہیں، چوتھا باب موضوع سے متعلق ہے، اس میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی فوز الکبیر اور سیوطیؒ کی اتقان سے تفسیر کے کچھ اصول و شرائط دیدیے گئے ہیں انھیں وضاحت کے ساتھ جدید مذاق کے مطابق مدلل علمی طریقہ سے پیش کرنا چاہیے تھا، اس کتاب کی علمی حیثیت پر خدمتِ دین کا جذبہ غالب ہے اس لئے تحریر میں وہ سنجیدگی و متانت نہیں ہے، جو اس موضوع کے لئے ضروری تھی، تحریر کی متانت سے استدلال زیادہ قوی اور موثر ہو جاتا ہے، بہرحال مرزا صاحب کا دینی جذبہ لائق قدر ہے، اور یہ کتاب فائدہ سے خالی نہیں،

ہندوستان کی صنعت و تجارت | مرتبہ جناب مولانا منت اللہ صاحب رحمانی ایم اے، تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۱۲ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مرقوم نہیں، پتہ مکتبہ سلفیہ مونگیر بہار،

اردو میں ہندوستان کی قدیم صنعت حرفت و تجارت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ہندوستانیوں

کے نقطۂ نظر سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور کی جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے کم کتابیں اس سے خالی ہونگی، متفرق مضامین میں بھی یہ معلومات ملتے ہیں، مؤلف نے ان متفرق معلومات کو اس کتاب میں یکجا کر دیا ہے، شروع میں انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کی صنعت و حرفت اور دوسرے ملکوں میں اسکی مقبولیت و تجارت کے حالات ہیں، اس کے بعد ہندوستان کے حصول کے لئے یورپ کی مختلف طاقتوں کی کوششوں اور انگریزوں کی کامیابی کا ذکر ہے، پھر ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کی تاریخ، اور اس کے دور میں ہندوستان کی صنعت و حرفت کی تباہی کے حالات ہیں، اور اس وقت سے لیکر اس زمانہ تک جن جن طریقوں سے اس کو تباہ کرکے انگریزی مصنوعات اور اس کی تجارت کو فروغ دیا گیا، اس کی تفصیل ہے، کمپنی کے زمانہ سے لیکر اس وقت تک مختلف دوروں کی ہندوستان کی درآمد و برآمد کے اعداد و شمار دیدیے ہیں، جس سے ہندوستان کے صنعتی زوال و بیرونی ممالک کے تجارتی فروغ کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے،

انمول کہانیاں از جناب شوکت عثمانی صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۳۱ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت ۱۲ر، پتہ بھارت پبلشنگ ہاؤس آگرہ،

یہ کتاب مؤلف کے بارہ انقلابی افسانوں کا مجموعہ ہے، جو بیشتر طبعزاد اور بعض ترجمہ ہیں، ان میں نوجوانوں مزدوروں اور کسانوں کو ابھارنے کے لئے انقلاب کی مختلف شکلوں اور اس راہ کے پیش آنیوالی واقعات و حالات کو افسانوں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے، مصنف کا مخاطب زیادہ تر نیچا طبقہ ہے، اس لئے شاید عمداً اس کی زبان پست رکھی گئی ہے، کیونکہ کوئی پڑھا لکھا شخص بغیر عمداً بگاڑے ہوئے ایسی خراب زبان نہیں لکھ سکتا، لیکن یہ کوشش نہ صرف بے نتیجہ بلکہ زبان کے لئے مضر ہے، ہندوستان کے کسانوں اور مزدوروں میں اس کے

خریدنے اور پڑھنے کی صلاحیت نہیں، اس لئے مصنف کا مقصد تو پورا نہ ہوگا، البتہ زبان مسخ ہوگی،

مصنفین اردو مرتبہ جناب زوار حسین صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۳۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت معمولی قیمت :۔ ۲ر پتہ :۔ حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی

سید زوار حسین صاحب نے اردو کتابوں کی یہ نئی وضع کی دلچسپ فہرست مرتب کی ہے، اس کی ترتیب فن وار ہے، تصانیف کے ساتھ مصنفین کے مختصر حالات اور جہاں تک مل سکے ہیں، ان کے فوٹو بھی دیدیے ہیں، چنانچہ اس فہرست میں ۲۳۰ مصنفین وشعراء کے حالات اور ۱۰۳ کے فوٹو ہیں، گو اس میں اکثر بڑے مصنفین وشعراء کے حالات آگئے ہیں، لیکن بہتوں کے حالات رہ بھی گئے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ نقش اوّل اور اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے، امید ہے کہ دوسرا اڈیشن اس سے زیادہ جامع اور مکمل ہوگا، میرے نام کے ساتھ ایم اے غلط لکھ گیا ہے، ایسے "غنیمت" موقعوں پر بعض مصنفین کو اپنے خود ساختہ کمالات کے اشتہار کا اچھا موقع ملتا ہو جس کے بعض نمونے اس کتاب میں بھی نظر آتے ہیں مولف کی یہ ستم ظریفی قابل داد ہو کہ ایسے مصنفین کے تذکرہ کے نیچے انکے شکریہ کے طور پر ان کے خود نوشت قلم کا حوالہ بھی دے دیا ہے، ایک صاحب نے اپنے کو دارالعلوم ندوہ اور مولینا فاروقی چریا کوٹی کا تکمیل یافتہ لکھا ہے جو صحت سے قطعاً خالی ہے،

سُریلی بانسری، از جناب سید انور حسین صاحب آرزو لکھنوی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ، کتابت، وطباعت، بہتر، قیمت مجلد :۔ عار پتہ :۔ انڈین بک ڈپو لکھنؤ،

جناب آرزو لکھنوی اس دور کے ممتاز شاعر ہیں، زبان کی سادگی اور صفائی ان کے

کلام کی خصوصیت ہے لیکن اب ان کو یہ دھن سمائی ہے کہ ان کے کلام میں عربی اور فارسی کا کوئی ایسا لفظ بھی نہ آنے پائے جو روزانہ کی زبان میں منجھ کر اردو میں کھپ گیا ہو، سریلی بانسری اسی قسم کی شاعری کا نمونہ ہے، یہ خاصا ضخیم دیوان ہے، سوسوا سو غزلیں قطعات اور رباعیاں ہیں، لیکن ان میں شاعر کے تخلص آرزو کے سوا عربی اور فارسی کا کوئی معمولی لفظ بھی نہیں آنے پایا ہے، اس سے جناب آرزو کی قدرتِ زبان کا تو ضرور اندازہ ہوتا ہے، لیکن شاعری کا رنگ اتنا پھیکا پڑگیا ہے، کہ اسے مشکل سے شاعری کہا جا سکتا ہے، اس قسم کی کوشش ایسی ہی لایعنی ہے، جیسے بے نقطوں کی تحریر لکھنے یا اور اس قسم کی کسی صنعت کی کوشش، ایسی کوششوں سے لکھنے والے کی اُپج اور کسی حد تک قدرتِ زبان کا تو اندازہ ہوتا ہے، لیکن وہ چیز اپنی جنس سے نکل جاتی ہے، جناب آرزو نے جو التزام اور پابندی اپنی شاعری میں رکھی ہے، اس سے خیال تو کسی نہ کسی طرح ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں ضرور ادا ہو جائے گا، لیکن اس میں کوئی ندرت و لطافت نہیں ہو سکتی کہ جہاں زبان کا جامہ اتنا تنگ ہو، وہاں تخیل کی گنجایش کہاں نکل سکتی ہے، اصولی حیثیت سے خیالات اصل ہیں، اور زبان ان کا جامہ، یعنی خیالات کے مطابق الفاظ لائے جاتے ہیں، لیکن ایسی کوششوں میں یہ اصول الٹ جاتا ہے، الفاظ اصل بن جاتے ہیں، اور خیالات ان کے تابع، پھر اتنے محدود دائرہ میں خیالات کی بلند پروازی کی گنجایش کہاں نکل سکتی ہے، زبان کو سادہ اور آسان بنانے کی کوشش اردو کے ہر بہی خواہ کا فرض ہے، کہ آیندہ صرف آسان ہی زبان زندہ رہیگی، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ عربی و فارسی کے وہ الفاظ بھی نکال دیے جائیں، جو اردو میں جذب ہو کر اپنی اصلیت تک کھو چکے ہیں، بہرحال دیوان جناب آرزو کی شاعری کا نہیں البتہ انکی قدرتِ زبان کا نمونہ ہے ۔ "م"

(مطبع معارف مین محمد ادریس فاروقی نے چھاپکر شائع کیا)

سیرۃ النبیؐ

رسول اللہ صلعم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جس کا نام **سیرۃ النبیؐ** عام طور سے مشہور ہے مسلمانوں کی موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت و اہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے،

ابتک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہیں، پہلے میں ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں، اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جس میں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے دوسرے حصہ میں تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے، تیسرے حصہ میں آپ کے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہے اس میں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کیگئی ہیں، پھر ان معجزات کی تفصیل ہے جو بروایات صحیحہ ثابت ہیں، اسکے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کیگئی ہے چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپ کے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں کوشش کی گئی ہے کہ اس میں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں، پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادات کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح و حکم کا بیان ہے اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے، چھٹے حصہ میں حقوق و فضائل اخلاق کا مجموعہ اور ان کی ذیلی تشریح کے متعلق تعلیمات کی تفصیل ہے، حجم ۱۱۲ صفحے قیمت قسم اول [illegible] قسم دوم [illegible]

قیمت با اختلاف کاغذ حصہ اول تقطیع خورد [illegible] حصہ دوم تقطیع کلاں [illegible] تقطیع خورد [illegible] حصہ سوم تقطیع کلاں [illegible] تقطیع خورد [illegible] حصہ چہارم تقطیع کلاں [illegible] تقطیع خورد [illegible] حصہ پنجم تقطیع کلاں [illegible]

جلد ۴۴ | ماہ شعبان المعظم ۱۳۵۸ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۳۹ء | عدد ۴

مضامین

شذرات

امسال دار العلوم ندوہ سے دس طالب علمون نے فراغت پائی، ان مین سے دو سرحد کے آزاد علاقہ کے، ایک نیپال کے، ایک کشمیر کے، چار بہار کے اور دو اودھ کے تھے، ان فارغ شدہ طالب علمون کا وداعی جلسہ ۸ر اکتوبر ۳۹ئہ کی دوپہر کو بڑی کامیابی کے ساتھ ہوا، طلبہ نے تقریرین کین اور نظمیں پڑھین اور رخصت ہونے والون کو بڑی محبت سے رخصت کیا، جلسہ میں بعض ایسی تقریریں ہوئیں جو بڑی مؤثر اور دلپذیر تھیں، نظمون میں ایک نظم پونہ کے ایک طالب علم نے کہی اور پڑھی تھی جو ایسی صاف تھی کہ اس کو مہاراشٹر کے بجاے لکھنؤ کا کلام کہا جا سکتا تھا،

ان طالب علمون کے دور دراز وطنوں کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ ہر عربی درسگاہ دنیاے اسلام کی اخوت و محبت کا آئینہ ہوتی ہے، دیس دیس کے لوگ آتے اور سالہا سال ایک ساتھ گذار کر واپس جاتے ہیں، اور ایک دوسرے کی محبت اپنے ساتھ یادگار لے جاتے ہین،

ہم کو خوشی اس سے ہوئی کہ ان طالب علموں میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ پر پہنچ کر دین کی خدمت کا عہد کیا، اللہ تعالیٰ ان کو مزید توفیق دے کہ اسلام کے لئے ان کا وجود بہتر سے بہتر ثابت ہو سکے، اور ان کے ذریعہ مسلمانون کے انتشار و پراگندگی کا علاج ہو سکے، اور قوم، اور ملک اور وطن کے مجازی نظرون سے اونچے ہو کر دین حق کی وسیع حقیقت کے عالمگیر حدود تک انکی نگاہیں پہنچیں،

ان عربی درسگاہون کی تعلیمی زبان اردو ہی ہی، اس سے قصد و ارادہ کے بغیر یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہی کہ دور دور صوبون اور ملکون کے لوگ یہان آکر اردو زبان سمجھنے اور بولنے لگتے ہین، دار العلوم مین اس سے آگے بڑھ کر یہ کوشش کیجاتی ہی کہ وہ ایسی اردو سیکھ جائین جس مین لکھ پڑھ بھی سکین اس کا اثر یہ ہی کہ اس ملک کی زبان کشمیر و نیپال و سرحد اور ترکستان اور چین تک برابر پہنچ رہی ہی، اور ذرا کوشش ہو تو یہ ہندوستانی زبان نہ صرف ہندوستان کی بلکہ ایشیا کی بین الاقوامی زبان ہوسکتی ہی، اور یہ صرف مسلمانون کے لئے نہین بلکہ ہندؤن اور مسلمانون دونون کے لئے فخر اور خوشی کا سرمایہ ہے،

افسوس ہی کہ اتنی کھلی ہوئی حقیقت ہمارے ہموطنون مین سے اس طبقہ کی سمجھ مین نہیں آتی جو ہزارون برس سے ہندوستان کی چاردیواری مین اس طرح بند ہین کہ اس کے باہر دہ جھانکنا بھی نہین چاہتے، ہندوستان پر مسلمانون کا بڑا احسان یہ ہے کہ انھون نے ہندوستان کو دنیا کا حصہ بنادیا، اور ہندوستان سے دنیا کو اور دنیا کو ہندوستان سے مالا مال کردیا،

لیکن اس روشنی کے عہد مین بھی جب ساری دنیا ایک گھر کی حیثیت مین ہوگئی ہی اس بات کی کوشش کی جارہی ہی کہ پھر ہندوستان کو ساری دنیا سے الگ کرلیا جائے، اس کوشش کا نمونہ وہ تحریک ہی جس کا منشا یہ ہے کہ ہندوستان کی مصنوعی عام زبان وہ ہندی بنائی جائے جس کی بنیاد خالص سنسکرت پر ہو، اس کی دلیل یہ دیجاتی ہے کہ دکن، مدراس اور بنگال کے ہندؤن کی صوبہ وار زبانین چونکہ سنسکرت مادہ سے بنی ہین، اس لئے سنسکرتی ہندی ہی ان کی عمومی ملکی زبان ہوسکتی ہی

الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر جھا نے ۱۲ ستمبر ۳۹ء کو گوالیار مین مہاراجہ گوالیار کی موجودگی مین ایک مجلس مین اس پر تقریر فرمائی ہے کہ سنسکرتی ہندی ہی ہندوستان کی عمومی زبان بن سکتی ہی، اور اسی پرانی دلیل کو دوبارہ دہرایا ہے، ہمارے نزدیک لائق پروفیسر نے یہ تقریر ایک آنکھ بند کرکے ارشاد فرمائی ہے، اور یہ سمجھ لیا ہے کہ آٹھ کروڑ مسلمان جو نظری اور مجبوری کے طور سے نہین

بلکہ عملاً اردو کو ہندوستانی زبان بنا چکے ہیں، ہندوستان میں موجود نہیں، پھر انھوں نے دکن اور مدراس کی طرف تو دیکھا، مگر بلوچستان، سرحد، کشمیر، سندھ اور پنجاب کی طرف غور نہیں فرمایا، کیا ان کی زبانیں ہندوستان کی عمومی زبان میں کوئی حصہ نہیں رکھتیں،

اور سنسکرت کے ساتھ مدراس کا نام لیکر تو غضب ہی کیا گیا ہی، مدراس بلکہ دکن و میسور تک کا پورا علاقہ جو دراویڈی قوموں اور زبانوں کا مسکن ہے، آریہ قوم اور سنسکرت زبان سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتیں، ان ملکون مین ہندی کے خلاف جو تحریک پھیل رہی ہے اس کا منشا بھی یہی ہے کہ ہندوستان کے یہ پرانے اور اصلی باشندے یہ نہین چاہتے کہ سنسکرتی ہندی کو اپنی زبان بناکر آریہ ہندوون کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈالیں، اور اپنے کو ہندوستان سے فنا کر دین، اور ہندوستانی اردو سے ان کو یہ ڈر نہیں،

اس کے بعد الٰہ آباد یونیورسٹی کے سنسکرت ریڈر پروفیسر سکسینہ کا ایک تازہ مضمون اس محدود اور تنگ ذہنیت کا نمونہ ہی، اردو تو اردو، ہندوستانی تک سے ان کو اس لئے اختلاف ہی کہ وہ آسان اردو کے معنی مین ہی، اور اسی لئے سرکار بہار کی ہندوستانی کمیٹی کی ممبری سے انھون نے استعفا دیا ہے اور اپنا استعفا اخبارون مین چھپوایا ہی، موصوف اپنے پیشہ اور خدمت کے لحاظ سے بے شبہہ سنسکرت کے عالم ہین، مگر کیا سنسکرت کے ان عالمون کو عربی اور فارسی کے عالمون کے اس ایثار، صلح پسندی، اور رواداری سے کچھ سبق نہین ملسکتا جو اپنے اپنے رتبہ سے نیچے اترکر ہندوستانی کی خدمت کیلئے آگے بڑھ رہے ہین، اسی قسم کی محدود اور تنگ ذہنیتین ہر دور میں ہندوستان کی بربادی کا سبب ہوئی ہین اور آگے بھی ہونگی، اور حقیقت یہی ہی جیسا کہ سر تیج بہادر سپرو نے اپنی کشمیر کی بہادرانہ تقریر مین کہا ہی کہ "اردو ہندو اور مسلمانون کی مادری زبان ہی جو بزرگوں کی ہزار سالہ محنت اور محبت کی یادگار ہی جو لوگ اس زبان کو مٹانا چاہتے ہیں وہ اس ہزار سالہ محنت اور محبت کو برباد کرنا چاہتے ہین"،

مقالات

"بغداد" کی وجہ تسمیہ

از

ڈاکٹر عبد الستار صدیقی پروفیسر عربی الہ آباد، یونیورسٹی

ایران اور ہندستان میں عام طور پر یقین کیا جاتا ہے کہ بغداد، نوشیروان عادل[1] کا باغ تھا، جہاں بیٹھ کر وہ مظلوموں کی دادرسی کیا کرتا تھا۔ لوگ اُس باغ کو "باغِ داد" کہنے لگے، اور پھر "کثرتِ استعمال" سے اِضافت کا کسرہ گر گیا اور فکِّ اضافت کے ساتھ "باغ" کا الف بھی جاتا رہا۔ اِس طرح "باغِ داد" سے "بغداد" ہو گیا۔ فارسی کے فرہنگ نویسون نے بھی اِسے مان لیا؛ چنانچہ "برہانِ قاطع" میں ہے:

"بغداد... نامِ شہریست از عراق عرب، و اصلِ آن باغِ داد بودہ است بہ سببِ آن کہ ہر ہفتہ یک بار انوشروان در آن باغ بارِ عام دادے و دادرسی مظلومان کردے و بہ کثرتِ استعمال بغداد شدہ است۔"

"فرہنگِ انجمن آرائے ناصری" کے موئف رضا قلی خان نے "برہان" پر جا بجا حملے کیے ہیں، مگر اس معاملے میں اُسے بھی "برہان" سے اِتفاق ہے۔ "ناصری" کے مقدمے میں لکھا ہے:

[1] خسرو انوشروان دادگر نے (جو خسرو اوّل ہوا) ۵۳۱ سے ۵۷۹ عیسوی تک حکومت کی۔ خسرو

"و حذف یک حرف از وسط چنانکہ بہ لفظ آر از آگر... وستدن از ستادن....

ہمچنیں بغداد از باغداد"

یہاں سب سے پہلے یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا تاریخ کی رو سے یہ صحیح ہے کہ نوشیروان ایک باغ میں بیٹھ کر مظلوموں کی فریاد سنا کرتا تھا، اور اگر ایسا تھا تو وہ باغ کیا اُسی جگہ تھا جہاں آگے چل کے منصور عباسی کا پایہ تخت آباد ہوا؟

ایران کے بادشاہوں کا حال فارسی میں سب سے زیادہ فردوسی کے "شاہ نامے" میں ملتا ہے۔ شاہنامے کو ہم صحیح معنوں میں تاریخ نہیں کہہ سکتے، اس لیے کہ جو روایتیں ایران میں مشہور تھیں اور فردوسی کو پہنچیں اُس نے نظم کر دیں۔ اُن کی چھان بین کرنے کا نہ کوئی سامان اُس کے پاس تھا، نہ ایک شاعر کو اس کی ایسی کچھ ضرورت ہی تھی۔ پھر بھی یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ جو کچھ فردوسی نے لکھا ہے وہ سراسر بے بنیاد ہے اور توجہ کے قابل نہیں۔ اس لیے اُس کے "شاہنامے" پر بھی ایک نظر ڈال لینا چاہیے۔ شاہنامے میں بغداد کا ذکر کئی جگہ آیا ہے۔ ان میں سے چار جگہ نوشیرواں سے پہلے کے بادشاہوں کے حال میں ہے۔

کیانیوں کے پانچویں بادشاہ کیخسرو کے حال میں کہتا ہے:

ہر آن کس کہ از شہر بغداد بود ابا نیزہ و تیغ و فولاد بود[۱]

کیخسرو، نوشیروان سے تو کیا، دارا اور سکندر سے بھی سینکڑوں برس پہلے ہوا ہے۔ اس لیے ماننا پڑے گا کہ فردوسی کے نزدیک نوشیرواں کے "باغِ داد" سے بہت پہلے بغداد موجود تھا۔ البتہ یہاں ایک گنجائش ہے کہ شہر مُلک کو بھی کہتے ہیں جیسے شہرِ ایران اور شہرِ توران

ہی کی عربی صورت کِسریٰ ہے۔ خسرو پرویز (خسرو دوم)، نوشیروان کا پوتا تھا۔

[۱] "شاہ نامہ" کلکتہ ج ۲ ص ۵۶۲۔

خود شاہ نامے میں بہت آیا ہے اور شہر یاز اور شہر یدرز کے لفظوں میں اس کے معنے "دیس" ہیں، "نگر" نہیں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ فردوسی کا مطلب شہرِ بغداد سے وہ ملک یا خطہ ہے جہاں اُس کے زمانے میں بغداد آباد تھا۔

ایک اور جگہ جب فریدوں اپنے باپ ضحاک سے لڑنے جا رہا ہے، یوں ہے:

به اروند اندر چو آورد روے چناں، چوں بود مردِ دہیم جوے۔
(اگر پہلوانی[1] نہ دانی زبان به تازی تو اروندرا دِجلہ دان)
سوم منزل آن شاہِ آزاد مرد لب دِجلہ شہرِ بغداد کرد[2]

اِس جگہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں شاعر کا اصل مقصود تو دِجلہ ہے۔ بغداد کا نام محض اِضافی طور پر آ گیا ہے، یعنی "وہ دِجلہ جس پر آج کل بغداد سا باغ و بہار شہر آباد ہے۔"

مگر مشکل یہ ہے کہ فردوسی اور جگہ بھی بغداد کو یاد کرتا ہے۔ نوشیروان کے جدِ اعلیٰ، اردشیرِ بابکان کی تخت نشینی کا بیان اِس شعر سے شروع ہوتا ہے:

به بغداد بنشست بر تختِ عاج به سر بر نہاد آن دل افروز تاج[3]

یہاں ایک معقول اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ ساسانی شہنشاہوں کا پایۂ تخت تو مدائن تھا؛ وہیں تخت نشینی کی رسم ادا ہوئی ہو گی۔ فردوسی شاید عراق کی جغرافیا نہیں جانتا تھا، اردشیر کی تخت نشینی کی شادی اُس نے خلیفہ منصور کی راجدھانی میں رچا دی۔

مگر یہی اردشیر مرتے وقت اپنے بیٹے شاپور کو نصیحت وصیت کرتا ہے، اُسی میں کہتا ہے:

به گیتی مرا شاد رسانست شش ہوا خوش گوار و پُر از آب کش:

---

[1] یعنی پہلوی۔ [2] "شاہنامہ" ج ۱ ص ۳۹۔ [3] "شاہنامہ" ج ۳ ص ۱۳۹۱۔

یکے خواندم "خورۂ اردشیر" هوا مشک بوے (و) بجوی آب شیر؛
چو "رام اردشیر" ست شہرے دگر کزو بر سوے پارس کردم گذر؛
دِگر شارسان، "اورمزد اردشیر" کہ گردد زِ بادش جوان، مرد پیر؛
کزو تازہ شد کشورِ خوریان پُر از مردم وآب وسود وزِیان؛
دِگر شارسان برکۂ اردشیر پُر از باغ وپُر گلشن وآب گیر؛
دو در بوم بغداد وآب فرات پُر از چشمہ وچارپاے و نبات[۵۱]

ممکن ہے یہاں بھی کوئی اعتراض وارد ہو سکے، مگر اس میں شبہہ نہیں کیا جا سکتا کہ فردوسی "برہانِ قاطع" والی بغداد کی تحقیق سے بے خبر تھا، یا یوں کہیے کہ فردوسی کے زمانے میں لوگ بغداد کو نوشیروان کا "باغ داد" ہرگز نہیں سمجھتے تھے؛ نہیں تو فردوسی اس بے باکی سے بار بار نوشیرواں کے زمانے کی چیز کو کھینچ کھینچ کے صدیوں پیچھے نہ لیجاتا۔ اس کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ خود نوشیروان کے حال میں بغداد کا نام کہیں ایک جگہ بھی اُس نے نہیں لیا ہے، نہ کہیں یہ کہا ہے کہ نوشیرواں کسی باغ میں بیٹھ کر دادرسی کیا کرتا تھا۔ فردوسی کے سوا، مورخوں میں سے بھی کسی نے نوشیرواں کی حکومت کے حال میں بغداد کا کہیں نام نہیں لیا ہے۔

فردوسی سے کوئی ساڑھے تین سو برس بعد اور "برہان قاطع" کی تالیف سے سوا تین سو برس پہلے، ۷۴۰ھ میں حمد اللہ مُستوفی قزوینی نے "نُزہتہ القُلوب" لکھی۔ اُس میں ہے:

"بغداد... اُمّ البلادِ عراقِ عرب و شہر اسلامی است... و در زمانِ اکاسرہ بر آن زمین بہ طرفِ غربی دیہے کرخ نام بود شاپورِ ذوالاکتاف ساختہ، و بہ طرفِ شرقی دیہے ساباط نام از تو ابعِ نہروان، وکسریٰ انوشروان خففت اللہ عنہ

---

[۵۱] شاہنامہ ج ۴ ص ۱۴۱۵۔

برصحاری آن دیہ باغے ساختہ بود و باغ داد نام کردہ۔ بغداد اسم علم آن شد[1]

یہاں قزوینی ایک طرف تو بغداد کو عراق کا سب سے پرانا شہر (اَقْدَمُ البلاد) بتاتا ہے، دوسری طرف نوشیروان کو بغداد کا بانی قرار دیتا ہے، حالانکہ اسی عراق کے بہت سے شہر نوشیرواں کے زمانے سے صدیوں پہلے آباد ہو چکے تھے[2]، قزوینی نے یہ نہیں بتایا کہ نوشیرواں نے اس باغ کا نام "باغ داد" کس بنا پر رکھا[3]

مشہور عرب مورخ مسعودی[4] نے دو مختلف باتیں لکھی ہیں:۔

وباغُ البُستانُ بالفارسیۃ فقیل	اور باغ فارسی میں بستان کو کہتے ہیں؛
بغداد لأجل ذلک وقیل	اسی لیے "بغداد" کہا گیا۔ اور یہ بھی کہتے
إنّہ کان موضع صَنَمٍ یقال	ہیں کہ مجوسی مذہب کے ظہور سے اور
لہ باغ قبل ظہور المجوسیۃ	اس زمین پر فارس کا غلبہ ہونے سے
وَغلبۃ فارس علیٰ ھٰذا الصُّقع	پہلے یہ مقام ایک "باغ"[5] نام بت کا استھان
والاوّل اشہر کذلک ذکر	تھا۔ پہلا قول زیادہ مشہور ہے اور ایسا
ابن ابی طاھر فی کتابہ فی اخبار	ہی ابن طاہر نے اپنی کتاب میں، جو بغداد

---

[1] "نزہۃ القلوب" (تیسرا مقالہ)، لائڈن ۱۹۱۵، ص ۳۳ [2] ایک بات اس بیان میں یہ بھی درست نہیں کہ ساباط کو (جس کا ایرانی نام "بلاش آباد" ہے) بغداد کے پاس بتایا ہے۔ ساباط تو بغداد سے دور، مدائن کے پاس ہے اور اسی لیے اُسے "ساباطُ المدائن" کہتے ہیں۔ [3] بعد کو لوگوں نے "داد" کو عدل کے معنوں میں لے کر یہ حاشیہ چڑھا دیا کہ اسی باغ میں بیٹھ کر نوشیرواں مظلوموں کی دادرسی کیا کرتا تھا۔ [4] ابوالحسن علی ابن الحسین المسعودی بغداد میں پیدا ہوا اور غالباً ۳۴۵ یا ۳۴۶ھ میں مرا۔ [5] جیسا کہ آگے چل کے معلوم ہوگا یہ "باغ" نہیں، "بغ" ہے۔

بغداد وغیرہ کے حالات پر ہے، کہا ہے اور اور
منّ المصنفین[۱] مصنفوں نے بھی۔

اب دیکھنا چاہیے کہ عربی کے اور مورخ کیا کہتے ہیں۔ اسلامی تاریخ سے اتنا معلوم ہوتا ہے، کہ ابوبکر صدیق رضؓ کے عہد میں جب ایران پر فوج کشی ہوئی تو پہلی انبار، حیرہ اور بغداد سے ہوئی (۱۳ ہجری)۔ اُس زمانے میں بغداد میں ہر مہینے بازار لگتا تھا اور بغداد پر جو حملہ ہوا اُسی عرب موّرخوں نے اسی لیے "سوق بغداد" کا حملہ لکھا ہے[۲] یہ بھی لکھا ہی کہ یہ بازار بہت پرانا بازار تھا منصور نے ۱۴۵ھ میں اس پرانی بستی کو ایک بڑا شہر بنادیا اور ۱۴۶ھ میں خزانہ دفتر وغیرہ کوفے سے بغداد لائے گئے[۳]

یہ سب کچھ تو کہا گیا مگر اس بات کا کہیں ذکر نہ آیا کہ وہاں نوشیروان اپنے کسی باغ میں ہفتے میں ایک دن بیٹھ کے مظلوموں کی دادرسی کیا کرتا تھا۔ پہلوی اور سریانی ماخذوں میں بھی، جو عربی تصنیفوں سے زیادہ پرانے ہیں، اُس باغ کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ پھر یہ بھی نہ بھولنا چاہیے، کہ بغداد کبھی کسی ساسانی بادشاہ کا پایہ تخت نہیں رہا اور اشکانیوں سے لیکر ساسانیوں کے عہد کے آخر تک ایران کا پایہ تخت طیسفون (یا مدائن) تھا[۴] جو بغداد سے پچیس

---

[۱] "کتاب التنبیہ والاشراف" (لائڈن ۱۸۹۴ء) ص ۳۶۰۔ [۲] بلاذری "فتوح البلدان" (ولندیزی مستشرق دخویے کی اشاعت) ص ۲۴۶ اور ۲۵۰؛ ابن اثیر "الکامل" ج ۲ ص ۳۴۳؛ یاقوت ج ۱، ص ۶۷۹، [۳] بلاذری، ص ۲۹۴-۲۹۵؛ مسعودی "التنبیہ والاشراف" ص ۳۶۰-
[۴] فردوسی کے ہاں مدائن اور طیسفون کی جگہ آیا ہے اور کہیں کہیں اس طرح کہ اُس کا پایہ تخت ہونا صاف ظاہر ہوتا ہے، جیسے نوشیروان کے باپ قباد کے حال میں:

چو بر تخت بنشست فرخ قباد کلاہ بزرگی بہ سر بر نہاد

میل کے فاصلے پر ہو۔ اُس زمانے میں بغداد کی حیثیت ایک بڑے گاؤں سے زیادہ نہ تھی۔ مکان جو بستی میں تھے تقریباً سب کے سب کچی اینٹ کے تھے۔ جہاں تک تاریخ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کچی عمارت بھی کوئی ایسی نہ تھی جسے نوشیرواں نے بنوایا ہو۔ اِس پر بھی کوئی "باغِ داد" والی کہانی کو سچ جانے، تو یہی ماں لینا پڑے گا کہ نوشیروانِ عادل اپنی عدالت کا اجلاس اُسی باغ کے کسی پیڑ کے نیچے کرتا ہوگا۔ مگر یہ بات عقل سے دور اور بہت دور ہے کہ مدائن کے آرام دہ محلوں کو چھوڑ کر وہ ہر ہفتے پچیس میل کا سفر کر کے ایک ایسی جگہ دادرسی کرنے جاتا ہو، جہاں نہ دھوپ سے بچاؤ کی کوئی صورت تھی، نہ مینہ سے۔ جن مظلوموں کی دادرسی اِس طرح سے ہوتی ہوگی اُن بچاروں پر یہ ایک دوسری مصیبت پڑتی ہوگی، جس کے ڈر سے شاید بہت سے مظلوم نوشیرواں کے عدل سے ہاتھ ہی دھو بیٹھتے ہوں۔

سوے طیسفوں شد ز شہرِ صطخر ۔۔۔ کہ گردن کشان را بدان بود فخر۔

(شاہنامہ ج ۳ ص ۱۶۰۳)

بہ شیراز فرمود، تا ہر چہ بود، ۔۔۔ ز مردان و از گنج و کشت و درود،

بیارند یکسر سوے طیسفون، ۔۔۔ سپارد بہ گنجور او رہنمون۔

(ایضاً ۱۶۵۲)

خود نوشیرواں کے کارناموں میں ہے:

سپاہے بزرگ از مدائن برفت ۔۔۔ بشد رام برزین سوے جنگ تفت

(ایضاً ص ۱۶۵۲)

یکے لشکرے از مدائن براند ۔۔۔ کہ روے زمیں جز بہ دریا نہ ماند

(ج ۴ ص ۱۶۹۱)

ایک اور بات بھی سوچنے کی ہے: یہ مان بھی لیجیے کہ بغداد کی اوّلین صورت "باغِ داد" تھی، تو اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ایک مدت تک پہلی صورت رہی، اور اس پر بہت طویل زمانہ گذرنے کے بعد مخفف صورت وجود میں آئی ہو گی۔ نوشیروان ۱۳ ستمبر ۱۳۱ ء ۵ کو تخت پر بیٹھا اور تخت پر بیٹھتے ہی اُسے اپنے بھتیجے کی سرکشی کا مقابلہ کرنا پڑا، پھر کئی لڑائیوں میں مصروف رہا۔ اِس لیے پہلے آٹھ دس برس میں اُسے اِصلاحی کاموں اور دادرسی کی فرصت نہ ملی ہو گی اور مستقل طور پر کسی دادستاں کے قائم کرنے کا

اور اِن شعروں سے تو یقین ہوتا ہے، کہ نوشیرواں کا دادستان بھی مدائن ہی میں تھا:۔

وزان شہر سوے مدائن کشید،	کہ آنجا بُدے گنجہا را کلید!
گلستان چنین با حیل اوستاد	ہمی راند از پیشِ مہران ستاد۔
چو کسریٰ برآمد بر تختِ خویش	گرازان و ہمباز با بختِ خویش
جہان چون بہشتے شد آراستہ	زِداد و زِ خوبی واز خواستہ۔
برآسود گیتی زِ آویختن،	بہ ہر جاے بیداد و خون ریختن۔
جہان نو شد از فرّہٗ ایزدی،	ببستند، گفتی، دو دستِ بدی۔
نہ دانست کس غارت و تاختن،	دگر دست سوے بدی آختن۔
جہانے بہ فرمانِ شاہ آمدند	زکشّری و تازی بہ راہ آمدند۔
کسے گر بہ رہ بر درم ریختے	ازآن خواستہ دُزد بگریختے
زدیبا و دینار بر خشک و آب	بہ رخشندہ روز و بہ ہنگامِ خواب
زبیم وزِ دادِ جہان دار شاہ	نہ کردے بد اندیش آن سو نگاہ۔

(ایضاً ص ۱۷۰۹-۱۷۱۰)

موقع اُسے جلد سے جلد کہیں ۱۴۵ء کے لگ بھگ ملا ہوگا۔ پھر یہ بھی نہیں معلوم کہ جس داستان
کے لیے اُس نے ایک باغ معین کر دیا تھا اُس کا نام خود اُسی نے "باغِ داذ" رکھا تھا۔ "برہان" کی
عبارت سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ اُسے لوگ "باغِ داذ" کہنے لگے۔ جب صورت یہ ہے تو یہ نام اگر
کبھی تھا بھی، تو کم سے کم جلوس سے پندرہ بیس برس (یعنی ۱۵۶ء سے) پہلے نہ پڑا ہوگا۔
پندرہ بیس برس میں شاید "باغِ داذ" سے عام طور پر "باغ داذ" ہو گیا ہو، یعنی اضافت کا کسرہ حذف
ہو گیا ہو۔ اس طرح ۱۵۵ء تک "بغداذ" کی یہ صورت پیدا نہ ہوئی ہوگی۔ مگر ہجرت کے تیرہویں
برس ربیع الاول یا ربیع الثانی (یعنی مئی جون ۶۳۴ء) میں جب بغداد کا بازار لٹا تو اُس کا نام
بلاشبہہ "بغداذ" تھا، "باغ داذ" نہ تھا اور یہ فرض کرنا غلط نہ ہوگا کہ اُس سے کم سے کم تیس چالیس
برس پہلے بھی یہ نام "بغداذ" ہی تھا۔ اس طرح "باغ داذ" سے "بغداذ" ہو جانے کا زمانہ تیس پینتیس برس
سے زیادہ نہیں ٹھہرتا۔ یہ مدت کسی جگہ کے نام کے تلفظ کے یوں بدل جانے کے لیے بہت ہی تھوڑی
ہے۔ ایسی مدت سو دو برس بھی ہو تو زیادہ نہیں۔

اس تخمین سے بھی "باغِ داذ" والا نظریہ بہت ہی مشتبہ ٹھہرتا ہے خاص کر اُس شہر کے لیے
جسے "اُمّ البلاد" کا لقب ملا ہو اور جس کے بازار کو مورّخوں نے اسلام کے ابتدائی زمانے
میں "السُّوقُ العتیق" کہا ہو[1]۔ سر ہنری رالن سن کا تخمینہ تو یہ ہے کہ بغداد کا نام حضرت عیسیٰؑ
سے چار ہزار برس پہلے کا ہے[2]۔ اس رائے سے اتفاق کرنا میرے نزدیک درست نہ ہوگا
مگر یہ کہنا کسی طرح غلط نہ ہوگا کہ یہ فارسی نام زردشت کے زمانے سے پہلے کا ہے یعنی
نوشیروانِ عادل کے زمانے سے گیارہ بارہ سو برس پہلے کا۔

اب اس اندازے اور تخمین کو چھوڑ کر کچھ اور ماخذوں کی طرف مڑنا چاہیے، مگر اس سے

---

[1] بلاذری "فتوح البلدان" ص ۲۹۴ [2] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، "مضمون بغداد"۔

پہلے دو تین باتیں سامنے آجائیں تو اچھا ہے:-

ایک یہ کہ بغداد اگر مرکب ہے تو اس کے اجزا "بغ" اور "داد" ہو سکتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ "داد" کے معنے عدل کے ہیں، مگر اس کے سوا اور معنے بھی ہیں۔

تیسرے بغداد کے علاوہ بھی بعض نام ایسے ہیں جن کا پہلا ٹکڑا "بغ" ہے، جیسے ہرات اور مرو کے درمیان ایک قصبہ بغشور (جسے صرف "بغ" بھی کہتے ہیں)[1] آرمینیا میں ایک بغاوند ایک بغروند[2] یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان ناموں میں بھی "بغ" پہلے کبھی "باغ" ہوگا، پھر مخفف ہو کر "بغ" ہو گیا ہوگا۔ مگر جیسا کہ آگے آتا ہے، پرانے زمانے میں بہت سے آدمیوں کے ناموں میں بھی "بغ" یا "بگ" آیا ہے۔

ایران کی تاریخ، جغرافیا، مذہبیات وغیرہ پر عربی میں بہت مواد ہے اور ایسا تحقیقی مواد جس پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ عربی کے محققوں کی تحقیق کی رو سے بغداد کی وجہ تسمیہ کیا ٹھہرتی ہے۔ مسعودی کا بیان اور بلاذری کے حوالے اوپر آچکے ہیں مگر اور مصنفوں نے بغداد کی وجہ تسمیہ کی تحقیق کی ایسی کوشش کی ہے کہ اس سے مسعودی کے مجمل بیان کی تشریح اور تصحیح ہوتی ہے۔ مجھے جہاں تک معلوم ہوا ابو عبداللہ یاقوت حموی (متوفی ۶۲۶ھ) نے اپنی "معجم البلدان" میں سب سے زیادہ روایتیں بغداد کی وجہ تسمیہ کی نقل کی ہیں[3] انھیں میں "باغِ داد" والی کہانی بھی ہے، جو ایرانیوں کو بہت پسند آئی۔ مگر یاقوت کے ہاں نہ تو نوشیروانِ عادل[4] کا ذکر ہے، نہ "داد" کے معنی "دادرسی" یا "عدل" لیے گئے ہیں، یا اضافے

---

[1] بلاذری ص ۲۰۴؛ یاقوت "معجم البلدان" ڈیوسٹن فلڈ کی اشاعت کج ۱ ص ۶۹۴ - ۶۹۵؛ تاریخ جہانگشا جوینی، ج ۱ ص ۱۱۰۔ [2] بلاذری ص ۱۹۴؛ یاقوت، ج ۱ ص ۶۹۴ - ارمنی زبان میں اس کا تلفظ "بگرونڈ" ہے۔ [3] یاقوت ج ۱ ص ۶۷۷ - ۶۷۸۔ [4] جو دو جگہ "کسریٰ" آیا ہے، سو اس میں کوئی تخصیص نوشیروان

غالباً ایرانیوں کی طباعی کا نتیجہ ہیں۔ ستم تو یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے عربی مصنفوں میں سے بھی بعضوں نے اسی مشہور کہانی کو مان لیا۔ مفتی عبدہ سا شخص اپنی "مقامات بدیعی" کی شرح میں یوں لکھتا ہے:

"ولفظها فی الاصل فارسیٌّ مرکّبٌ من باغ بمعنی بستان وداد بمعنی العدل" [۱]

یاقوت نے جو روایتیں نقل کی ہیں یہ ہیں:۔

(۱) بعضے عجمی کہتے ہیں کہ بغداد ایک شخص کا باغ تھا، کیونکہ "باغ" بستان کو کہتے ہیں اور "داد" کسی آدمی کا نام ہے۔

(۲) اور بعضے (عجمی) کہتے ہیں کہ "بغ" ایک بت کا نام ہے۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ مشرق کے ملک سے ایک خواجہ سرا کسریٰ کے دربار میں لایا گیا۔ کسریٰ نے اُسے ایک قطعہ زمین کا عطا کیا (وہی جو آگے چل کے بغداد کہلایا)۔ خواجہ سرا اپنے وطن میں بتوں کی پرستش کیا کرتا تھا اس لئے وہ بول اُٹھا: "بغ دادی"، یعنی (بغ) بُت نے مجھے یہ عطا کیا۔

(یہاں "دادیٰ" کی "ی" سمجھ میں نہیں آتی، سوا اس کے کہ واحد مخاطب کی "ی" فرض کیجائے مگر ایسی صورت میں عربی ترجمہ اُس سے مختلف ہونا چاہیے تھا جو "معجم" کے متن میں ہے۔ یعنی یہ ہونا چاہیے تھا: اے بغ، تو ہی نے مجھے یہ (زمین) عطا کی"۔)

(۳) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "بغ" کے معنے بُستان ہیں اور "داد" عطا کیا۔ چونکہ کسریٰ نے یہ باغ اُس خواجہ سرا کو دے دیا تھا، اس لیے "بغ داد" کہلایا۔

کی نہیں ۔ اُسے اور اُس کے بعد کے ہر ساسانی بادشاہ کو عرب "کِسریٰ" کہتے تھے۔ [۱] مقامات بدیع الزمان وشرحها للشیخ محمد عبدہٗ، بیروت ۱۸۸۹، ص ۶ حاشیہ ۱۔

(اگر یوں سمجھے تو پھر اُس باغ کا نام "باغِ دادۂ" ہونا چاہیے تھا۔ مگر "دادۂ" کی صورت ساسانی عہد کی زبان میں "داذک" یا "داذگ" تھی۔ یہ معرب ہو کر (اگر پہلے الف کا حذف ہو جانا بھی مان لیا جائے تو) "بغداذق" یا "بغداذج" ہو گیا ہوتا، جیسے "بیذق" اور "ساذج"؛ اور موجودہ فارسی میں "بغدادہ" ہوتا۔ لیکن ان صورتوں میں سے ایک بھی کہیں نہیں ملتی۔)

(۴) حمزہ ابن الحسن[1] نے کہا ہو کہ "بغداذ" ایک فارسی نام ہے جو "باغِ داذویہ" کا معرب ہے، اس لیے کہ منصور کے بسائے ہوئے شہر کا ایک ٹکڑا "داذویہ" نام ایک ایرانی کا باغ تھا اور بعضے ٹکڑے اُس رقبے کے وہ تھے جہاں ایک پرانے شہر کے کچھ آثار باقی تھے، جس کی داغ بیل ایران کے کسی بادشاہ نے ڈالی تھی، پھر اسے یوں ہی چھوڑ دیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ اُس بادشاہ نے شہر کا نام کیا رکھنے کو کہا تھا، تو کہنے والے نے جواب دیا: "ہلیذ وہ دروذ" ای خلوها بسلام[2] (یعنی اسے سلام کر کے چھوڑ دو) جب یہ قصہ لوگوں نے منصور کو سنایا

---

[1] ابو عبداللہ حمزۃ بن الحسن الاصفہانی، عربی کا ادیب اور مصنف تھا۔ ۳۵۰ اور ۳۶۰ھ کے درمیان کسی وقت مرا۔ تاریخی اور لغوی تحقیق میں مصروف رہا کرتا تھا اور فارسی لفظوں کی تحقیق زردشتی موبدوں وغیرہ سے کیا کرتا تھا، مگر جو اشتقاق، خاص کر ایسے فارسی لفظوں اور ناموں کے بتاتا ہو کہ عربی میں آتے ہیں، اکثر غلط ہوتے ہیں۔ سبب اِس کا زیادہ تر یہ ہے کہ اسلام سے پہلے کی ایرانی زبان سے پوری واقفیت نہیں رکھتا تھا اور اُس کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ کھینچ تان کر کسی عربی لفظ کو ایرانی اصل سے ثابت کرے۔ شعوبی تحریک کے اِس پہلوان نے بصرہ کی اصل "بس راہ" قرار دی ہے! (معجم ج ۱، ص ۶۴۳)

[2] "ہلیذ وہ دروذ" میری قرارت ہے۔ عربی متن کے نسخوں کے اختلاف یہ ہیں: (۱) هلیدوه وسروذ، (۲) هلیذ وه وسروذ، (۳) هلیذ دوه ورُوذ (۴) هلیذ وده رَوَسَرذ۔ اِن میں سے کوئی نسخہ پورا صحیح نہیں۔ "ہلیذ" (یعنی ہلیہ) کی عربی ہوئی

تو اُس نے کہا: "میں نے اس کا نام مَدِینَۃُ السَّلَام رکھا"۔

(یہ کہانی بھی بس کہانی ہی ہے۔ صحیح روایتیں کہتی ہیں کہ مدینۃ السّلام" میں "السّلام" سے خود اللہ کا نام مقصود ہے یا اس سے سلامتی مراد ہے۔)

(۵) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بغداد اگلے زمانے میں دساور کی ایک منڈی تھا۔ وہاں چین کے سوداگر آیا کرتے اور بہت نفع کما لے جاتے، اور چین کے بادشاہ کا نام "بغ" تھا۔ سو یہ سوداگر جب (مالا مال ہو کے) اپنے دیس کو لوٹنے لگتے تو کہا کرتے "بغ داد" یعنی یہ نفع جو ہم نے کمایا ہے، سو ہمارے بادشاہ کا عطیہ ہے۔

(یہ حکایت یوں صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ چین کی زبان فارسی سے بالکل مختلف تھی۔ چینی بھلا فارسی لفظ "داد" کیوں بولتے اور وہ بھی ایک ایسے فقرے میں جس سے چین کے بادشاہ کا شکر ادا کرنا چاہتے تھے۔ اور اگر یہ مان بھی لیجیے کہ دس بیس چینی مسافر ایسا کرتے بھی تھے تو اُس سے شہر کا نام کیوں کر پڑ گیا اور خود اُس شہر کے رہنے بسنے والوں نے اُسے کیوں کر اختیار کر لیا۔)

(۶) بغداد کا لفظ سات طرح پر بولا جاتا ہے:۔

(۱) بغداد؛ (۲) بغدان؛ (۳) بغداذ؛ اس تیسری صورت کو بصرے کے نحوی (عربی زبان میں) جائز نہیں سمجھتے۔ اُن کا قول ہے کہ کلامِ عرب میں ایسا کوئی لفظ نہیں آیا ہے جس میں دال کے بعد ذال ہو۔ ابوالقاسم عبدالرحمٰن ابن اسحٰق کہتا ہے[۱] کہ میں نے (اپنے استاد)

"خلقوا"، "وہ" بدل ہے "بہ" کا اور اس کی عربی "بِ"۔ اس کے بعد "رود" کی پرانی صورت "ر و ذ" ہے اور اس کی عربی ہی "نہر" ہے۔

[۱] الزجاجی (متوفی ۳۴۰ھ) الزجاج کا شاگرد تھا اور بصری علما میں ہے۔

ابن السّری[۱] سے کہا پھر جو "خُرداذ" عربی میں اسی طرح بولا جاتا ہے اُس کے بارے میں آپ کیا کہیے گا؟ انھوں نے کہا کہ وہ تو فارسی لفظ ہی؛ کلام عرب سے نہیں۔ اِس پر میں نے کہا: بس یہی جواب اُس شخص کی طرف سے بھی دیا جائے گا جو "بغداذ" بولتا ہے، اِس لیے کہ "بغداذ" کلام عرب سے نہیں ہی۔ کِسائی[۲] نے "بغداذ"[۳] کو اصل کی بنا پر جائز گردانا اور یہ اور صورتیں بتائیں: (۴) مغداذ؛ (۵) مغداد؛ (۶) مغدان۔ (ساتویں صورت یاقوت نے نہیں لکھی ہے۔ یہ "بغدین"[۴] ہے۔)[۵]

(۷) عبد العزیز ابن ابی رَوّاد[۶] کے سامنے کسی نے "بغداد" کہہ دیا تو کہا: "بغداد" نہ کہو، اِس لیے کہ "بغ" ایک بُت ہے اور "داد" کے معنے دیا۔ ہاں "مدینۃ السلام" کہو کہ "سلام" اللہ کا نام ہے اور شہر جتنے ہیں سب اُسی کے ہیں، سو یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی کہے "مَدینۃ اللہ"[۷]

---

[۱] ابو اسحٰق ابراہیم ابن محمد ابن السّری الزّجاج البصری (متوفی ۳۱۰ھ) المبرّد کا شاگرد اور ابو القاسم الزّجاجی کا اُستاد۔ [۲] ابو الحسن علی ابن حمزۃ الکِسائی الکوفی (متوفی ۱۸۹ھ) ایرانی الاصل تھا۔ کوفے کے نحویوں میں بہت ممتاز تھا اور ہارون الرشید کا درباری۔ [۳] معجم کے متن میں اِس جگہ ذال نہیں دال ہے۔ یہ چھاپے کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ [۴] الجوالیقی "کتاب المعرّب" ص ۳۲۔ [۵] یہ مختلف صورتیں ایران کی مختلف بولیوں میں ہوں گی۔ ب اور م آپس میں بدلتے ہیں جیسے "بنگ" (بھنگ) کو "منگ" بھی بولتے ہیں، آ بھی اِے سے اکثر لفظوں میں بدلا ہے: "تیو" = "تاو" (=تاب)؛ "کیک" = "کاک" (آنکھ کی پُتلی)؛ "خراش" = "خریش"۔ "بغدان" کا ن غالبًا اور مقاموں کے ناموں کا شان وغیرہ کے قیاس پر ہے۔ [۶] دیکھو نَوَوی، "تھذیب الاسماء واللغات" ج ۱ (ویوستن فلڈ کی اشاعت) ص ۳۹۴۔

[۷] یاقوت، ج ۱، ص ۶۷۰ اور ج ۴، ص ۲۵۳۔

(ابن ابی سرّ قاد کا زمانہ ۱۴۰ ہجری کا ہے اور بغداد کی وجہ تسمیہ کے متعلق شاید اس سے پرانا قول کسی عربی کتاب میں مشکل سے ملے۔ اس کی صحت میں شبہہ کرنے کی گنجائش بھی نہیں۔)

(۸) کہا جاتا ہے کہ منصور نے شہر کا نام مَدِیْنَۃُ السّلام اس لیے رکھا کہ اس میں سلامتی کی نیک فال ہے[۵۱]

یاقوت سے پہلے کے مصنفوں نے بھی اس مبحث پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں سے فنِ لغت کی بنیاد پڑی جو کچھ انھوں نے کہا ہو وہ بھی ابن ابی رَوّاد کے قول کے موافق ہے، لُغت کے جگت اُستاد اَصْمَعی[۵۲] کے قول کو ابن قُتیبۃ[۵۳] نے اختصار کیساتھ نقل کیا ہے، اور جوالیقی[۵۴] نے کسی قدر تفصیل سے۔ ابنِ قُتیبۃ کہتا ہے:

وَکانَ الاصمعیُّ لا یقول	اصمعی "بغداد" نہیں کہتا تھا اور (لوگوں
بَغدَاد وینْھی عن ذلك و	کو) اس (لفظ کے استعمال) سے منع
یقول مَدِینۃ السلام	کرتا تھا اور مدینۃ السلام کہا کرتا؛
لأنّہ سمع فی الحدیث أنّ	اس لیے کہ اُس نے حدیث میں سُنا تھا
بغ صَنمٌ وَ دادَ عطیّۃٌ بالفارسیۃ	کہ بغ ایک بت ہے اور داد فارسی میں

[۵۱] یاقوت، ج ۲ ص ۲۵۳۔ (ج ۱، ص ۸۰۶ میں اسی بات کو لفظوں کی کمی بیشی سے کہا ہے۔) [۵۲] ابو سعید عبدالملک ابن قُرَیب الاصمعی ۱۲۲ھ میں پیدا اور ۲۱۶ھ میں فوت ہوا، بصرے کے نحویوں میں بہت سربرآوردہ ہے۔ [۵۳] عبداللہ ابن مسلم ابن قُتَیْبَۃ دینوری ۲۱۳ھ میں پیدا ہوا اور ۲۷۶ھ میں مرا۔ "ادب الکاتب" کا مصنف ہے۔ [۵۴] ابو منصور موہوب ابن احمد ابن الخضر الجوالیقی ۴۶۶ھ میں پیدا ہوا اور ۵۳۹ھ میں مرا۔ "کتاب المُعرّب من الکلام الأعجمی" کا مؤلف ہے۔

كانها عطيةُ الصنم[۱]	عطیے کو کہتے ہیں تو (بغداد) ایسا ہی ہوا جیسے بُت یا دیوتا کا دیا ہوا۔"

جوالیقی پہلے اپنی تحقیق کا خلاصہ لکھتا ہے:

وَبغداذُ اسمٌ اعجميٌّ كان بَغْ صَنمٌ و داذ عطيةٌ۔	بُغداذ ایک عجمی نام ہے۔ 'بغ' ایک بُت تھا اور 'داذ' کے معنے ہیں عطیہ۔

پھر کہتا ہے:-

وَكان الاصمعيُّ يكرهُ أن يقولَ بغداذ وَينهى عن ذلكَ لهذا المعنى ويقول مدينة السّلام... قال ابوحاتم وَ سألتُ الاصمعيَّ عن بغداذ وبغداذ وَبغدانَ و بغدينَ هل يُقالُ كُلُّ هذا اوكرِهَ أنْ يتكلّمَ بشيءٍ منهُ وقال هذا اردئٌ أخشى أن يكون شراً كاذ وقال البغضُه إلىَّ بالذال المنقوطة مِن فوقُ	"اور اصمعی اِس سے کراہیت کرتا تھا کہ بُغداذ کہے اور (لوگوں کو) اُس (کے استعمال) سے منع کرتا، اُنھیں معنوں کی وجہ سے (جو اوپر بیان ہوئے) اور (بغداد کو) مدینۃ السلام کہا کرتا تھا"..... (اصمعی کا شاگردِ رشید) ابوحاتم[۲] کہتا ہے: "میں نے اصمعی سے بغداد، بغداذ، بغدان، بغدین کے بارے میں پوچھا کہ کیا یہ سب صورتیں صحیح ہیں؟ اصمعی نے پسند نہ کیا کہ وہ اِن (لفظوں) کے متعلق کچھ بھی کہے اور کہا کہ یہ سب ردی ہیں؛ میں ڈرتا ہوں

[۱] ابن قتیبہ "ادب الکاتب" (لائڈن ۱۹۰۰ء) ص ۴۶۰ [۲] ابوحاتم السجستانی (یعنی سیستانی) جو ۲۵۰ھ میں مرا، اصمعی اور ابوعبیدہ کا شاگرد اور ابوعبید قاسم ابن سلام کا ہم سبق تھا اور ابن درید کا اُستاد۔

وَکان یقولُ مدینۃ السّلام[1] | کہ کہیں شرک کا مرتکب نہ ہو جاؤں۔ پھر کہا میرے نزدیک ذالِ منقوطہ والی صورت سب سے بھونڈی ہے۔ وہ ہمیشہ 'مدینۃ السلام' کہا کرتا تھا"

اصمعی کے قول کو ابن ابی ردّاد کے قول سے ملا کے دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے ئی زمانے میں علما کا اس پر اتفاق تھا، کہ "بغ" کسی بُت یا دیوتا کا نام تھا۔ باغ کا لفظ اِس یں بعد کو آیا اور وہ بھی ایرانیوں کے ذریعے سے۔ اِس لیے ضروری ہو کہ ایرانی زبانوں س لفظ "بغ" کی تلاش کیجائے۔

قبل اِس کے کہ ایرانی ماخذوں کی طرف رجوع کیجیے دو تین باتیں نظر کے سامنے آجائیں عاہے:۔

(۱) فارسی میں ب اور ف آپس میں بدلتی ہیں، جیسے "زبان" اور "زفان"، "برغست"، اور ت" وغیرہ۔

(۲) گ کبھی کبھی غ سے بدلتا ہے، جیسے "لگام" کی جگہ "لغام"، "گاوتنگ" (بیل کو ہانکنے ر) کے بجائے "غاوتنگ"، "چگامہ" کے لیئے "چغامہ" اور "گلگونہ" کی جگہ "غلغونہ" بولتے ہیں

(۳) زبر بدل کر پیش ہو جاتا ہے، اور اِس کی مثالیں بہت ہیں۔

(۴) اگر فارسی کے ساتھ پرانی ایرانی زبانیں اور ایران کے مختلف خطوں کی بولیاں بھی اِس مقابلے ںامل کر لیجائیں تو (۱)، (۲) اور (۳) کی مثالیں بہت کثرت سے ملتی ہیں۔

---

[1] جوالیقی، "کتاب المعرّب" ص ۳۲۔

اب دیکھنا چاہیے کہ "بغ" کے معنی فارسی لغت کی کتابوں میں کیا دیے ہیں:-

"بغ بہ فتح اول... زمین کندہ و گودا گویند و نام بتے ہم ہست"۔ (برہان)

پہلے معنے سے ہمیں کام نہیں؛ یہ لفظ ہی اور ہے۔ دوسرے معنے وہی ہیں جو عربی کے لغویوں نے بتائے ہیں۔ انھیں معنوں میں فرغانہ اور ماوراء النہر کے لوگ "بغ" کو "فغ" بولتے ہیں چنانچہ "برہان" ہی میں ہے:

"فغ بہ فتح اول... بہ لغت فرغانہ و ماوراء النہر بمعنی بت باشد، کہ عربان صنم خوانند و بمعنی معشوق و مصاحب و کسے راکہ بسیار دوست دارند ہم آمدہ است، و کنایہ از جوانان خوبصورت و صاحب حسن ہم است"۔

"اسدی" طوسی کی فرہنگ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے:

"فغ بت باشد بعبارت فرغانیان۔ عنصری گفت:

گفتم فغان کنم ز تو اے بت ہزار بار

گفتا کہ از فغان بوذ اندر جہاں فغان"

فارسی میں "بت" کے لفظ سے جو معنے استعارے کے طور پر لیے جاتے ہیں وہی "فغ" سے بھی "فرہنگ شعوری" اور اور کتابوں میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ لفظ ف کے پیش سے بھی ہے؛ "فغ" جس کی جمع "فغان" ہے۔ عنصری کے شعر میں ایک اور لفظ "فغان" (فریاد) آیا ہے۔ اس کے بھی دو تلفظ ہیں "فَغان" اور "فُغان"، جن میں سے دوسرا زیادہ صحیح ہے، پہلا زیادہ مشہور۔ اس شعر میں دونوں کی ف کو اگر پیش سے پڑھیے تو تجنیس تام ہے اور عجب نہیں کہ یہی شاعر کا مقصود ہو۔ ممکن ہے کہ کوئی یہ سمجھے کہ پرانے زمانے میں جب بتوں کی پوجا ہوا کرتی تھی، تو لوگ فریاد کے وقت بتوں کی دہائی دیتے اور "فغان، فغان" کہہ کے ان کو پکارتے ہوں گے؛ اور اس سے "فغان" (فغ کی

جمع اکے معنے ' فریاد ' ہوئے۔ ایسا نہیں ہوسکتا : 'فغان ' کی پرانی صورت ' افغان ' ہے اور اُسے
'فغ ' سے تعلق نہیں۔ ہاں اور بہت سے لفظ ہیں جو ' فُغ ' سے بنے ہیں :۔
فُغاک ۔ ابلہ ، بے وقوف ۔ (اسدی، "لغتِ فرس")
فُغِستان ۔ (۱) بُت خانہ ، (۲) بادشاہوں کی حرم سرا، (۳) خوبصورتوں اور حسینوں کا
مجمع ۔ ("برہان قاطع")۔
فُغُستان ۔ (۱) زن ومنکوحہ ، (۲) صورتِ سلاطین و امرا ۔ ("برہان")۔
(یہ لفظ عجیب ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ س کو پیش صرف اِس لیے دیا گیا کہ
'فُغِستان ' سے فرق ہو جائے۔ اِس کے دونوں معنے کنایے پر مبنی ہیں)
فُغَنشُور ، **فَغَنشُور** ۔ "نام شہریست از ملکِ چین و مردم آنجا بہ غایت خوب صورت و صاحب حُسن می شوند و جمیع بُتان و بُتگران در آن شہر می باشند"۔ ("برہان")۔
فغواره ، اُسے کہتے ہیں جو تکبّر یا بہت رنج یا شرمندگی سے چپ ہو اور بات نہ کرسکے
"معنی ترکیبی لغت 'بت مانند' است، چہ 'فُغ ' بُت را گویند و 'واره ' مانند
را یعنی ہمچو جماد خاموش است"۔ ("برہان")
خلاصہ یہ کہ 'بَغ '، 'فَغ '، 'فُغ ' کے معنی عربی ہی محققوں نے نہیں، فارسی والوں نے بھی
"بت" بتائے ہیں۔ اِس میں شبہہ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ تینوں ایک ہی لفظ کے مختلف لہجے ہیں۔
بتوں کا عمل دخل اِسلام سے پہلے زیادہ تھا۔ اِس لیئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اِسلام سے
پہلے کی ایرانی زبانوں میں "باغ" اور "بغ" کی تلاش کیجائے۔

زمانے کے لحاظ سے ایران کی زبان کی تقسیم یوں کی جاتی ہے :

۱- پُرانا دوْر - ابتدا سے تیسری صدی قبل مسیح تک -

اِس دور کی زبان میں بس دو ہی چیزیں ہیں جو ہم تک پہنچی ہیں: ایک "اوستا"[۱] کے وہ حصے جو سکندر کے حملے کے وقت ضائع ہونے سے بچ گئے تھے اور اب تک محفوظ ہیں۔ دوسرے ہخامنشی (یا کیانی) فرمانرواؤں کے کتبے جو میخی یا پیکانی شکل کے حرفوں میں پتھر وغیرہ پر کُھدے ہوئے اب بھی موجود ہیں۔ "اوستا" کی تحریر کا زمانہ چھٹی صدی ق۔م۔ کے لگ بھگ مانا گیا ہے اور میخی کتبے ۶۰۰ سے ۴۰۰ ق۔م تک کے ٹھہرتے ہیں۔ "اوستا" کی زبان اور ان کتبون کی زبان میں تھوڑا سا فرق ہی، اِس لیے کہ زردشت کی مقدس کتاب ایران کے شمال مشرقی حصے، باختر، میں وجود میں آئی اور وہان کی بولی میں ہے۔ ہخامنشی شہنشاہوں دار یوش[۲] اعظم وغیرہ کا پایۂ تخت ایران کے جنوب مغربی حصے پارس میں تھا۔ اُن کے کتبے وہاں کی بولی میں ہیں۔ زبان میں پورب اور پچھاں کا فرق ہمارے ہی ہاں نہیں، ایران میں بھی رہا ہے۔ عجب اتفاق ہے کہ جیسے یہاں دلی کی بولی نے صحت اور لطافت کی سند پائی وہاں پارس کی بولی مُستند ٹھہری اور اب تک ہے، اور جسے آج ہم فارسی کہتے ہیں، وہ اسی

---

[۱] یہ غلط مشہور ہے کہ "زند" اصل کتاب ہے اور "اوستا" اُس کی شرح۔ حقیقت میں "اوستا" اصل متن ہے۔ "وزَنْد" اوس کا ترجمہ اور شرح (پہلوی زبان میں)۔ "پازَنْد" میں "زَنْد" کی مزید تشریح ہے اور کسی قدر بعد کی پہلوی میں ہے۔

[۲] میخی کتبوں میں یہ نام "دَارَیَ وَہُشْ" ہے۔ اسی کا مخفف "داریوش" ہوا اور مزید تخفیف ہوکر "دارا" ہو گیا۔ اِس نام کا پہلا تاجدار داریوش اعظم تھا (۵۲۲ - ۴۸۶ ق۔م۔) داریوش دوم کی حکومت ۴۲۴ سے ۴۰۴ ق۔م تک رہی۔ تیسرا دارا وہ بدبخت دارا ہے جس نے سکندر سے شکست کھائی۔ ۳۳۵ سے ۳۳۰ ق۔م تک اِس کی حکومت رہی اور اُسی پر کیانی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

پُرانی ایرانی زبان کی نئی صورت ہی۔

(۲) درمیانی دوُر۔ تیسری صدی ق۔م۔ سے لے کر ساتویں صدی عیسوی تک۔

اِس دور میں ۲۴۴ ق۔م۔ سے ۲۲۴ عیسوی تک اَشکانیوں کی حکومت رہی۔ اِس خاندان کے مورثِ اعلیٰ کا نام اَرَشَک تھا، اِس لیے اِس کے بادشاہ "ارشکانی" یا "اَشکانی" کہلائے۔ وطن اِن لوگوں کا "پَہلَو"[1] تھا یعنی وہ علاقہ جو پہاڑوں کے دامن یا "پہلو" میں واقع تھا۔ پہاڑی قوم بڑی بہادر تھی، اور یہ اِنھیں کی بہادری اور پہلوانی تھی جس نے ایران کو یونانی عاملوں کے پنجے سے چھڑایا۔ "پہلوان" (جو اصل میں "پہلو" کی جمع ہے) اور "پہلوی" اور "پہلوانی" کے لفظ اِنھیں سے نسبت رکھتے ہیں۔ ہر چیز جو ممتاز اور سربلند تھی، چنانچہ فصیح اور شستہ زبان بھی، پہلوی کہلائی۔

اگرچہ "پہلوی" کا لقب اِس دور کی فارسی کے لیئے اَشکانیوں سے شروع ہوا، لیکن اُن کے عہد میں علم اور ادب کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں ہوئی۔ اشکانیوں کے بعد ساسانیوں کی حکومت ۲۲۴ سے ۶۵۱ عیسوی تک رہی، اور اِسی زمانے میں پہلوی ادب کا آغاز اور عروج ہوا، جس کا سلسلہ اسلامی دور کی ابتدا تک جاری رہا۔

پہلوی ادب کے علاوہ مانی اور اُس کے پیروؤں کی کتابیں تیسری سے ساتویں آٹھویں صدی عیسوی تک مختلف وقتوں اور ایران کی مختلف بولیوں میں لکھی گئیں۔

۳۔ آخری دوُر ۔ (اسلامی) ۔ پہلی صدی ہجری سے اب تک ۔

اِن تینوں دوروں کی زبانوں کا فرق اِس طرح سمجھ میں آ سکتا ہے کہ اگر اِس زمانے کے فارسی پڑھنے والے کے سامنے اوستا یا میخی کتبوں کی عبارت پڑھیے تو وہ کچھ بھی نہ سمجھیگا

---

[1] اب اس کا نام خراسان ہے۔

ہاں اگر درمیانی دور کی زبان کی کوئی عبارت پڑھی جائے تو وہ اُس کے بہت سے لفظوں کو پہچان لے گا۔

اس سلسلے میں یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ پرانی ایرانی (یعنی اوستا اور میخی کتبوں کی) زبان، وید کی زبان اور سنسکرت سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے۔ اسی طرح درمیانی دور کی فارسی اور پراکرت میں بعض چیزیں مشترک ہیں۔

اب دیکھنا چاہیے کہ 'باغ'، 'بغ' اور 'داد' کی اِن مختلف دوروں میں کیا شکلیں ہیں۔

(۱) 'باغ' (بستان) پہلے دور میں نہیں ہے۔ دوسرے دور میں بھی شروع میں نہیں ملتا۔ البتہ آخر میں استعمال ہونے لگا تھا۔ خسرو پرویز کی حکومت کا اخیر سال تھا کہ خود اُسی کی فوج نے جس کے ساتھ اُس کا بیٹا شیرویہ بھی ہو گیا تھا، اُس پر نرغا کیا تو اُس نے اپنے محل سے بھاگ کر ایک باغ میں پناہ لی جس کا نام "باغِ ہندوان" تھا۔ طبری اِسے "باغ الھندوان" کہتا ہے[۱]۔ "اوستا" میں "باگ" آیا ہے مگر اُس کے معنے ہیں "حصّہ"؛ یہی سنسکرت میں 'بھاگ' ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ ترکے کے حصّے کرنے میں جو 'باگ' کا لفظ استعمال ہوتا تھا اُسی سے "بستان" کے معنے پیدا ہو گئے ہوں گے۔ میں اِس کو صحیح نہیں جانتا، گو کہ نہیں بتا سکتا کہ باغ کی اصل کیا ہے۔

(۲) 'بغ' کی صورت "اوستا" میں "بَغَ" اور "میخی کتبوں" میں 'بَغَ' ہے؛ اور معنے ہیں "خدا، دیوتا"۔ سنسکرت کے 'بھگوان' یا 'بھگونت' وغیرہ کا پہلا جز 'بھگ' اور یہ 'بغ' ایک ہی لفظ ہے۔ ایران میں یہ لفظ زردشتی مذہب سے پہلے موجود تھا اور اُس زمانے سے تعلق رکھتا ہے

---

[۱] طبری، تاریخ، جلد اص ۱۰۴۳۔

جب وہاں بُت پجتے تھے۔ یہی مسعودی نے بھی کہا ہے[1]

پُرانی فارسی تقویم میں بعض مہینوں کے نام اُن سے مختلف ہیں جو "اوستا" میں آتے ہیں۔ چنانچہ "مہر" کے لیے میخی کتبوں میں 'باغ یادِ' یا 'باغ یادِش' ہے (جس میں 'باغ' کا الف اصلی نہیں)، سُغدی زبان میں یہ مہینا 'فغکان' کہلاتا ہے[2]۔ اِس میں شک نہیں کہ 'باغ یادِش' مرکب ہے 'بغ' اور 'یاد' سے۔ محض ترکیب کی جہت سے 'بغ' کا تلفظ 'باغ' ہو گیا ہے۔ سولھویں مہر کو "بغ" کی پوجا ہوتی تھی اور نذر دی جاتی تھی۔ ارمینیا میں ایک گانو ہے جس کا نام 'بگ یرچ' ہے اور جہاں مہر دیوتا کا مندر تھا۔ یہ نام بلاشبہہ "بغیادِش"[3] کی ارمنی شکل ہے، اِس لیے کہ "مہر" اور 'بغ' ایک ہی دیوتا کے دو نام ہیں۔

(۳) "داد" پرانا لفظ ہے۔ اِس کا مادّہ "دا" ہے؛ جو فارسی ہی میں نہیں، تقریباً سب آریائی زبانوں میں ملتا ہے۔ سنسکرت میں بھی اِس کا مادّہ "دا" ہی ہے۔ یونانی، لاطینی وغیرہ میں بھی اِس کے مشتقات کثرت سے تھے اور اِن زبانوں سے جو اور زبانیں نکلی ہیں اُن میں سے بہتوں میں ہیں۔ اِس طرح پر ہماری اردو کا 'دینا' اور فارسی کا "دادن" دونوں ایک ہی اصل سے ہیں۔ ایک زبان میں یہ مادّہ "دِہ" کی، دوسری میں "دے" کی شکل میں دکھائی دے رہا ہے۔ فارسی میں اِس سے "داد" ہے، یعنی وہ چیز جو دی جائے یا بخشی جائے۔

---

[1] دیکھو مسعودی کا اقتباس، جو اوپر (ص ۲۴۹) آچکا ہے۔ [2] البیرونی، ص ۲۲۴۔ [3] اِس پر ایک فارسی لفظ یاد آیا: تین صورتیں ہیں: بغیار، بغیاز، بغیازی، (اور یہی تین صورتیں ف کے ساتھ)۔ "برہان" میں اِس کے کئی معنے دیے ہیں: (۱) شاگردانہ، (۲) مٹھائی یا اُس کی قیمت جو نیا کپڑا پہننے کے وقت دی جاتی ہے، (۳) خوشی کی خبر۔ اِس لفظ کی پہلی صورت دوسری کی تصحیف ہے، تیسری میں "ی" بڑھا دی گئی ہے۔ دوسری اصل چیز ہے: "بغیاز"۔ اِس کی "ز" اصلی نہیں، بعد کے زمانے کے تلفظ

(۴) ایک دوسرا لفظ بھی "داد" ہے، جس کے معنی ہیں انصاف اور حق۔ اس کا مادہ بھی پرانی فارسی میں "دا" ہے مگر سنسکرت میں "دھا"۔ اوستا اور کتبوں کی زبان میں اس کے معنے ہیں: دھرنا، بنانا، پیدا کرنا، انصاف کرنا۔ "دادار" (بنانے والا، خالق) اسی سے ہے۔

(۵) "برہان قاطع" وغیرہ نے جو "باغ داد" کو اصل قرار دیا ہے اُس میں اضافت ہی۔ اس لیے یہ بھی دیکھ لینا چاہیے کہ زبان کے مختلف دوروں میں اضافت کی صورت کیا رہی ہی۔ پہلے مضاف پھر اُس کے آخر حرف پر کسرہ اور پھر مضاف الیہ: اس صورت کو تیسری دور کی صرف نحو کی اصطلاح میں "اضافتِ مستوی" کہتے ہیں۔ یہی اضافت کا کسرہ توصیفی ترکیب میں بھی استعمال ہونے لگا، مگر اُس سے یہاں بحث نہیں۔ جب مضاف اور مضاف الیہ میں گہرا میل ہوجاتا ہی اور کوئی مرکب بہت زیادہ استعمال ہونے لگتا ہی تو اُس میں سے اضافت کا کسرہ جاتا رہتا ہی، جیسے "صاحبِ دل" سے "صاحب دل" اور برہان کے دعوے کے مطابق "باغِ داد" سے "باغ داد"۔ یہ سب کچھ تیسرے ہی دور کی باتیں ہیں۔ دوسرے دور میں بھی یہ اضافتِ مستوی ملتی ہی، مگر پہلے دور میں اس کا مطلق پتا نہیں۔

اس کے مقابلے میں ایک دوسری صورت اضافت کی ہے کہ پہلے مضاف الیہ پھر مضاف اور دونوں کے بیچ میں کوئی تیسری چیز نہیں۔ اسے فارسی کے نحویوں نے "اضافتِ مقلوب" کا نام دیا ہی۔ پہلے دور کی زبان میں اضافت کی یہی ایک صورت ہی، جیسے شاہان شاہ (جس سے شاہنشاہ اور پھر شہنشاہ ہوگیا) اسی طرح کی ترکیب ہی ایران شہر (یعنی شہر ایران) ایران زمین وغیرہ "مستوی" اور "مقلوب" کی اصطلاحوں کو دیکھ کے لوگ اکثر سمجھتے ہیں کہ وہ پرانی، یہ نئی چیز ہے، مگر اصل یوں ہے کہ جسے "مقلوب" کہتے ہیں وہی پرانی صورت ہی اور "مستوی" نئی صورت

پر مبنی ہے۔ اصل وہی "بغیاذ" ہے یعنی "بغیاذ" اور یہ لفظ اُسی "بغ" دیوتا کی ایک بھولی ہوئی یاد ہے ایک اور لفظ ہے: "بغامہ"۔ غولِ بیابانی کو کہتے ہیں۔ کیا عجب کہ اس میں بھی "بغ" چھپا بیٹھا ہو۔

غرض کہ 'باغِ داد' کی ترکیب پُرانی (یعنی پہلے دَور کی) فارسی میں ممکن نہیں۔
کچھ جگہوں کے نام، جو بلا شبہہ پہلے ایرانی دَور یا اُس سے بھی پہلے کے ہیں اوپر عرض کیے جا چکے
اب اشخاص کے وہ نام بھی گنائے جاتے ہیں جن کا ایک جزو "بَغ" ہے۔ وہ لوگ جن کے یہ نام
سلام ہی سے نہیں، ساسانیوں کے زمانے سے بھی صدیوں پہلے گذرے ہیں۔ ایران کی
خ میں کوئی ساٹھ ستر آدمیوں کا ذکر آتا ہے جن کے ناموں کا پہلا جزو "بَغ" ہے۔ اِن میں سے
ے سے یہاں لکھے جاتے ہیں:۔

۱۔ بَگ وات (ارمنی تلفظ: بَگ دتّ یا بَگ دتِ) ارمینیا کے ایک علاقے کا بادشاہ
جس نے ۷۱۶ ق۔م میں اشور کے بادشاہ سارگون سے شکست کھائی۔
(اوستا میں: "بغو وات" یعنی خدا کا دیا ہوا؛ خداداد۔[۱])

۲۔ بَگ باز (اوستا کا "باز" تیسرے دور کی زبان میں "بازو" ہو گیا)، داریوش اوّل
کا فیلڈ مارشل تھا۔ (بَگ باز۔ دیوتا کے بازوؤں والا؛ دیوتا کی سی
قوّت والا۔)

۳۔ بَگ پات، اُسی بگ باز کا باپ۔ ("پات" پرانی زبان میں "حفاظت کرنے والا"
بَگ پات = وہ جس کا محافظ خدا ہو۔)

۴۔ بَگ بخش، داریوش اوّل کے ایک درباری کا اور بہت سے آدمیوں کا نام تھا۔
(اِس نام کے معنے ہُوئے: "وہ جسے خدا نے معاف کر دیا یا جس کے قصوروں
سے درگذر کیا"۔ فارسی میں دو لفظ ہیں جدا جدا: (۱) بخشودن، جس سے

---

[۱] ...زبک (ترکستان) میں ایک چاندی کا سکہ پایا گیا جس پر ایک ایرانی شہربان (صوبہ دار) کی شبیہہ ہے اور آرامی
میں "بگو وَتَ" لکھا ہوا ہے۔ یہ یا تو اُس صوبہ دار کا نام ہے یا کوئی دعائیہ جملہ۔

امر "بخشائے" حاصل مصدر "بخشایش"، اسم فاعل "بخشائیدہ"، مضارع "بخشاید" ہے، (۲) بخشیدن جس سے امر "بخش"، حاصل مصدر "بخشش"، اسم فاعل "بخشندہ" مضارع "بخشد" ہے۔ "بخشیدن" کے معنے ہیں "دینا، عطا کرنا" اور "بخشودن" کے معنے معاف کرنا۔ اِس نام میں جو "بخش" ہے وہ اِسی "بخشودن" سے متعلق ہے، "بخشیدن" سے نہیں۔

دوسرے دَور کی زبان میں "اَپخشایشن" تھا جو تیسرے دور میں "بخشایش" ہوا۔ چنانچہ "بگ بُخشُن" میں بھی ب کا پیش ہے۔ "بخشیدن" کی جگہ دوسرے دور کی زبان میں "بَخشَن" تھا۔)

۵۔ بگ دَوشت ("دَوشت" پرانا لفظ ہے میخی کتبوں میں یہ لفظ "دَوشتر" ہے اور دوسرے اور تیسرے دَور میں "دوست"۔ "دوستار" بھی اِسی کی ایک صورت ہے جس میں پرانی "ر" باقی ہے۔ لوگوں نے غلطی سے "دوستار" کو "دوست دار" سمجھا اور یونہی لکھنے بولنے لگے۔)

۶۔ بگ فرنا۔ (پرانی فارسی میں "فرنا" چمک دمک یا نور کو کہتے تھے۔ آگے چل کے یہی لفظ "فر" ہو گیا۔ "بگ فرنا" کو سوا "نور اللہ" کے اور کیا کہیے؟۔)

۷۔ بگ کرت، پارس کے دو پرانے فرماں رواؤں کا نام ("کرت" کے معنے کیا ہوا، بنایا ہوا۔)

ظاہر ہے کہ "باغ" (بستان) اِن ناموں کا جُز نہیں ہو سکتا۔ اِن میں جو "بغ" یا "بگ" آیا ہے اُس کا ترجمہ سوا "خدا، رب، اِلٰہ، معبود، پرمیشر" کے کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ میخی کتبوں اور "اوستا" میں یہ لفظ جہاں کہیں آیا ہے انھیں معنوں میں ہے۔ درمیانی زمانے میں مانی اور اُس کے

ماننے والوں کی کتابوں[1] میں بھی اِس لفظ کے یہی معنے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ "بغداد" اِسلام ہی سے نہیں، ساسانی حکومت سے بھی صدیوں پہلے کا نام ہے اور معنے اُس کے ہیں: "دیوتا کی دین" یا خدا کی بسائی بستی"۔

اِسی سلسلے میں دو اور لفظ بھی توجہ چاہتے ہیں: "فغفور" اور "بیستون"۔

فغفور | چین کے بادشاہ کے لیئے "فغفور" خاص لقب ہے۔ بیرونی نے اپنی کتاب "الآثار الباقیۃ عن القرون الخالیۃ" میں اِسے "بغبور" لکھا ہے[52] جو اِس لفظ کی عربی (یا عربائی ہوئی) صورت ہے۔ "فغفور" سُغد[53] کی بولی ہے۔ اِسے معرب نہ سمجھنا چاہیے۔ سُغدی میں ف فارسی کی ب اور پ کی قائم مقام ہے اور فارسی میں یہ لفظ "بَغپور" ہے۔ "بَغ" کے جو معنے اوپر لکھے جا چکے ہیں اُن کے لحاظ سے "بَغپور" کے معنے ہوئے: "خدا کا بیٹا"۔ یہ استعارہ اور اصطلاح ہے، جیسے "ظل اللہ"۔ ہاں، ایک بات ضرور ہے۔ چین کے بادشاہ کا یہ لقب کیسا کہ نہ "بغ" چینی لفظ، نہ "پور"؟[54] البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ چینی زبان کا کوئی لفظ ہو، اُس کا فارسی ترجمہ "بغپور" ہو، یہ صحیح ہے۔

---

[1] چینی ترکستان میں ایک گانو ہے: تُرفان، جہاں ۱۹۰۸ع میں ریت میں دبا ہوا ایک پورا کتب خانہ نکلا۔ کتاب سلامت تو ایک نہ تھی، ہاں پراگندہ ورقوں کا ایک ڈھیر زمین سے نکالا گیا، مگر جو نکلا مانی کے مذہب سے متعلق ہے اور اب برلین کے سرکاری عجائب گھر میں وہ سارا ذخیرہ جمع ہے۔ کچھ چیزیں شائع ہوئی ہیں زیادہ ابھی ویسے ہی رکھی ہیں۔ [52] زخاؤ کی اشاعت، ص ۱۰۱۔ عربی کے اور مصنفوں نے بھی یوں لکھا ہے۔ [53] سُغد میں فرغانہ شامل ہے۔ [54] کون نہیں جانتا کہ "پور" اور "پسر" فارسی میں بیٹے کو کہتے ہیں۔ ایک ہی لفظ کی دو صورتیں ہیں۔ پہلے دور کی زبان میں بیٹے کو "پُ ثْ رَ" کہتے تھے (سنسکرت میں: "پُ ت رَ")۔ جو حرف پُرانی فارسی میں ثْ اور سنسکرت میں تْ تھا وہ دوسرے دور کی زبان

جیسا کہ فرانسیسی فاضل سِل وَین لیوی نے چینی ماخذوں کی مدد سے ثابت کیا ہے، ہندستان کے جس کُشن راجا نے "دیوپُتر" کا لقب اختیار کیا تھا اُس نے چین کے بادشاہ کے خطاب کی نقل اُتاری تھی۔ چینی شہنشاہ کا لقب چینی زبان میں تِین تسؤ "تھا، اُسی کا فارسی ترجمہ "بغپور" سُغدی "فغفور"، ارمنی چین بکُر" ہوا۔ ایران کے اشکانیوں کے پُرکھوں نے اپنے مشرقی وطن میں اِسی چینی لقب کی تقلید میں "بغپور" کا لقب اختیار کیا اور پھر یہ لفظ مغرب کے ملکوں میں بھی پھیل گیا۔

بیستون | شیریں فرہاد کی داستان جس نے سُنی ہے، کوہ بیستون کو جانتا ہے۔ عوام میں یہ بھی مشہور ہے کہ کسی بادشاہ نے اُس جگہ ایک ایسا محل بنوایا تھا جس میں کھم ایک بھی نہ تھا، ساری چھتیں گویا ہوا میں لٹک رہی تھیں؛ اِسی سے "بے ستون" نام پڑا۔ سچ یہ ہے کہ اِسی نام سے لوگوں کو یہ خیال ہوا ہوگا کہ وہاں کوئی بے ستونوں کی عمارت ہو گی۔ حمد اللہ مستوفی نے جو حال اِس پہاڑ کا لکھا ہے اُس میں ہے:

"کوہ بیستون بہ کُردستان از جبال مشہور است و سخت است و از سنگ سیاہ بر روے ہامون پیدا شدہ است بے آن کہ در دامنش درہ یا پشتہ باشد.... در کتب

میں س ہو گیا؛ چنانچہ پہلوی میں "پُسَر" (اور اُس کا مخفف "پُس") ہے۔ فارسی لغت میں "پُسر" اور "پِسر" دونوں ہیں، بلکہ پازند میں بھی یہ لفظ دونوں طرح ملتا ہے؛ مگر "پِسر" کا زیر اصلی نہیں، "پِدر" کے اثر سے پیدا ہو گیا ہے۔ باپ کا اثر بیٹے پر پڑنا کچھ اَن ہونی بات تو نہیں۔ پُرانی ث پہلوی میں آکر ہ بھی ہو گئی ہے؛ چنانچہ "پُ ثْ رَ" کی ایک صورت پہلوی میں "پُ ہْ رَ" بھی ہے۔ یہ ہ فارسی میں وٗ ہو جاتی ہے۔ اِس طرح "پور" ہوا۔ اب رہا "پُس" (جو شاہنامے میں بھی کئی جگہ آیا ہے)، سو یہ "پُسَر" کا مخفف ہے۔ ہمارے دیس کی زبان میں اِس کے مقابلے میں "پُ ثْ رَ" کا مخفف "پوت" ہے۔

خسرو و شیرین شیخ نظامی گنجہ آوردہ کہ خسرو پرویز فرہاد را گفت :

کہ ما را ہست کوہے بر گذرگاہ کہ مشکل می توان کردن برآن راہ۔

میانِ کوہ راہے کندہ باید چنان، کآمد شدن ما را بشاید۔

روایتے مجہول است و شیخ نظامی آن جا را مشاہدہ نہ کردہ بہ تسامع سخنے گفتہ است و حقیقتش آن کہ در پائے قلۂ این کوہ برروے صحرا چشمۂ بزرگ است.... برسر آن چشمہ صُفّۂ بارگاہ ساختہ اند...... درآخر این کوہ.... صُفّۂ دیگر کوچک ساختہ برسرِ دو چشمہ..... وآن صُفّہ را صُفّۂ شبدیز[1] می خوانند۔ صورتِ خسرو و شیرین و فرہاد و رستم و اسفندیار برآن جا ساختہ است......[2]"

یہی مصنف آگے چل کے ایک اور پہاڑ کے بیان میں کہتا ہے:

"کوہ راسمند..... نیز چون بیستون پیدا شدہ است بے آن کہ در پایانش درہ و پشتہ باشد، سنگے سیاہ است و برمثالِ خانہ بہ سقفِ سحاب درآوردہ[3]"

اِس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ محل کو نہیں پہاڑ کو "بے ستون" کہا ہے، لیکن زبان کی تاریخ

---

[1] اِسے "تختِ شبدیز" بھی کہتے ہیں۔ [2] "نزہتہ القلوب" ص ۱۹۲-۱۹۳۔

شیخ نظامی نے یہ پہاڑ دیکھا نہ تھا سُنی سُنائی ایک بات کہہ دی۔ شیخ مستوفی نے اُسے صرف دیکھا ہی نہیں اُس کی اونچائی تک ناپی پھر بھی سُنی سنائی کہے بغیر نہ رہے کہ تصویریں جو وہاں بنی ہیں خسرو اور شیرین اور فرہاد کی ہیں۔ اِس میں اور مصنفوں نے بھی دھوکا کھایا ہے۔ اصل یوں ہے کہ یہ تصویریں خسرو پرویز سے صدیوں پہلے، داریوشِ اعظم کے زمانے میں بنی تھیں۔

[3] "نزہتہ القلوب" ص ۱۵۵۔ یہاں "بیستون" ہے مگر اس سے پہلے جو ٹکڑا نقل ہوا ہے اُس میں "بیستین" بغیر واو کے اور ص ۱۰۰ پر "بہستان" آیا ہے۔

اِسے بھی ماننے نہیں دیتی۔ فارسی "بے" کی پرانی صورت "اپے" ہے دوسرے دور کی زبان میں "اَوَ"
اور "اَپے" تھی پہلے دور کی زبان میں یہ حرفِ نفی نہیں ملتا اگر اُس زمانے میں تھا بھی تو "اپئی" ہو سکتا ہے
اور حال یہ ہے کہ اِس مقام کا یہ نام کیانیوں کے وقت میں بھی نہ الف رکھتا تھا، نہ ب کی جگہ پ
یا و۔ اِس لیے اِس نام کا "بے" اور "ستون" سے ترکیب پانا ممکن نہیں۔

ایک اور بات بھی توجہ چاہتی ہے۔ اِس نام کا اِملا کئی طرح پر کیا جاتا ہے۔ مستوفی قزوینی
نے "بیستون" کے علاوہ "بیتن" اور "بہستان" بھی لکھا ہے۔ عربی مصنف عموماً "بہستون" لکھتے ہیں اور یاقوت
نے اِسے یوں ضبط کیا ہے: "بَھِستون بالفتح ثم الکسر"[1] ظاہرا یہ تلفظ عربوں نے ایرانیوں
سے سُنا اور جوں کا توں نقل کیا مگر بعد کو خود ایران میں ھ بدل کر ی ہو گئی اور وہ اِس طرح پر
کہ ھ گر گئی اور اُس کے گر جانے سے کسرہ کھنچ کر ی ہو گیا۔ اِس کی ایک اور مثال "سیستان"
ہے کہ اصل میں "سَگِستان" تھا، گ گرا اور اُس کا کسرہ کھنچ کر ی ہو گیا۔ جب عرب وہاں پہنچے
تو انھوں نے "سگستان" سُنا، گ کو ج سے بدل کر "سجستان" بولنے لگے۔ پہلے دور کی زبان
میں یہ نام "سَکَستانَ" تھا۔ ایک قوم تھی "ساک" وہ وہاں بستی تھی۔ "سَگزی" (پہلوی "سَگچیک") اُسی
خطے کی طرف نسبت ہے، عربی میں "سجستانی"۔

ابھی یہ بات باقی ہے کہ بہستون اور بہستان کے وا ور الف میں کیا تعلق ہے۔ یہ وا مُر
اِمالے کا ہے جو فارسی میں عام ہے، جیسے "نما" کا الف "نمود"، "نمونہ" وغیرہ میں و ہو گیا یا پیمانہ کی
شکل "پیمونہ" بھی ہے۔

"بہستان" پہلے دور کی زبان میں "بَغِستان" تھا، چنانچہ پہلی صدی ق۔م۔ کی یونانی تصنیف
میں یہ نام اِس طرح لکھا ہوا ملتا ہے: ب گ س ت ن و ن (جس میں و ن ایک یونانی

[1] "معجم البلدان" ج ۱، ص ۷۶۹۔

لاحقہ ہے)۔

اس بغستان کی چٹان پر داریوش اعظم کے کارنامے میخی خط میں کندہ ہیں اور یہی میخی کتبہ سب میں بڑا ہے۔ جو گھوڑے کی مورت وہاں کھڑی ہے وہ خسرو کا نہیں، داریوش اعظم کا شبدیز ہے جو تصویریں خسرو پرویز وغیرہ کی سمجھی جاتی ہیں وہ بھی داریوش اور اس کے درباریوں اور مفتوح بادشاہوں اور سپہ سالاروں کی ہیں، جو اسیر کرکے اُس کے سامنے لائے گئے ہیں۔ اسی پہاڑ پر بغ دیوتا کا مندر تھا جس کے آثار ابھی تک باقی ہیں اور یہ زرتشتی مذہب سے پہلے کی یادگار ہے "بغ" کا "غ" بعد کو "ہ" سے بدل گیا اور اس طرح "بغستان" سے "بہستان" ہوا جس کا امالہ "بہستون" ہے

اب ان تینوں لفظوں کے بارے میں چوتھی صدی ہجری کے ایک محقق خوارزمی[1] کی تحقیق پیش کی جاتی ہے جو اپنی مختصر مگر نہایت گران قدر تصنیف "مفاتیح العلوم" میں لکھا ہے:-

بغستان بیت الاصنام و بغ	بغستان بتوں کا استھان ہے اور بغ
ھو الصنم و بذلك سُمّیت	بُت۔ اسی سے بغداد نام پڑا یعنی بُت
بغداذ، ای عطیة الصنم	کا عطیہ، جیسا کہ اصمعی کا قول روایت
علی ما حُکِیَ عن الاصمعی	کیا گیا ہے، اور اسی لیے بادشاہ کو
و لذلك یسمّون الملكَ بغ و	بغ کہتے ہیں اور سردار اور پیشوا کو بھی اور
ھكذا الامام و السیّد و بہ	اسی سے چین کے بادشاہ کا لقب بغ بور
سُمّی مَلِك الصین بغ بور ای	پڑا یعنی "بادشاہ کا بیٹا"۔

مفاتیح العلوم ص ۱۴

[1] ابو عبداللہ محمد ابن احمد ابن یوسف خوارزمی جس نے ۳۶۶ اور ۳۸۱ کے درمیان کسی وقت مفاتیح العلوم لکھی۔

وقال ابن دُرُستویہ[1] فی کتابہ
تصحیح الفصیح[2] أخطأ الأصمعیُّ
فی ماذکر من اشتقاق بغداد،
اذ لم تکن الفرسُ عبدۃ الاصنام
إنّما ھو باغ داد و باغ ھو
البستان و داد ھو اسم
رجل و ھذا من ابن درستویہ
اختراعٌ کاذبٌ و خطأٌ فاحشٌ
فإنّ بغ عند الفرس ھو
الالٰہ والسید والملک

ابن درستویہ[1] اپنی کتاب "تصحیح الفصیح"[2]
میں کہتا ہے کہ اصمعی نے جو کچھ بغداد
کے اشتقاق کے بارے میں بیان
کیا ہے اس میں غلطی کی ہے، کیونکہ
ایرانی بتوں کے پوجنے والے نہ تھے
اصل یوں ہے کہ وہ تو باغ داد ہے
اور باغ، سو بستان ہے اور داد،
سو ایک آدمی کا نام۔ یہ ابن درستویہ
کا جھوٹا اختراع اور اُس کی بہت
بھونڈی غلطی ہے، اِس لیے کہ بغ

---

[1] ابو محمد عبد اللہ ابن جعفر ابن دُرُستویہ ۲۵۸ھ میں پیدا ہوا اور ۳۴۷ھ میں مرا۔ (مسعودی اُس سے دو ایک برس پہلے مرا تھا اِس لیے دونوں ہمعصر تھے)۔ ابن درستویہ بصرے کے نحویوں اور مبرد کے شاگردوں میں سے تھا۔ بہت سی کتابوں کا مصنف تھا مگر دو تین سے زیادہ اب نہیں ملتیں جہاں تک معلوم ہے "تصحیح الفصیح" کا بھی کوئی نسخہ کسی معروف کتب خانے میں نہیں ہے۔ [2] یہ کتاب ثعلب (ابو العباس احمد ابن یحییٰ متوفی ۲۹۱ھ) کی معرکۃ الآرا کتاب "الفصیح" کی شرح تھی۔ آٹھویں صدی ہجری تک "الفصیح" کی کم سے کم بیس شرحیں، دو ذیل، پانچ منظوم شرحیں یا خلاصے لکھے گئے۔ کتاب زیادہ سے زیادہ پچاس صفحے کی ہے مگر مصنف نے بیس برس کی محنت اُس پر صرف کی تھی۔ جرمانی مستشرق بارٹ نے ۱۸۷۶ء میں اُسے شائع کیا۔ بغداد کا ذکر اُس میں (ص ۴۱) صرف اتنا ہے:

وكانوا يعظمون الاصنام
ويتبركون بها ويسمون
الصنم بغ وبيت الاصنام
بغستان ولعمري ان الفرس
كانوا يعبدونها ويصورونها
على صور الملوك والائمة
ولعل بغداد هي عطية
الملك[51]

کے معنے تو ایرانیوں کے ہاں "خدا"
کے ہیں اور "بادشاہ" کے، اور وہ بتوں
کو بڑا جانتے اور برکت دینے والا
مانتے تھے، اور بت کو بغ کہتے تھے او
بتوں کے استھان کو بغستان۔ میرے
ایمان کی قسم ایرانی اُن کی پوجا کرتے
اور بادشاہوں اور پیشواؤں کی
تصویروں کی طرح پر اُن کی تصویریں
بنایا کرتے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ
بغداد (سے مراد) ہو "بادشاہ کا عطیہ"

ابنِ درستویہ نے غالبًا حمزہ اصفہانی کے قول پر بھروسا کرکے[52] اصمعی کے قول[53] کو غلط ٹھہرایا اور سخت دھوکے میں پڑا۔ مسعودی نے دونوں روایتیں لکھ دی ہیں اور ابن ابی طاہر اور "مصنفوں" کے قول کی بنا پر کہا ہے کہ زیادہ مشہور یہی ہے کہ بغداد کا پہلا جزء "باغ" (بستان) ہے[54] "اور مصنفوں" میں حمزہ اصفہانی اور ابن درستویہ، جو مسعودی کے ہمعصر تھے، ضرور

يقال هي بغداد وبغدان وتذكر وتؤنث (کہتے ہیں کہ اِس کی دو صورتیں ہیں: بغداد اور بغدان، اور یہ لفظ مذکر بھی بولا جاتا ہے اور مونث بھی)۔

[51] "مفاتیح العلوم" (ولندیزی مستشرق فان فلوٹن کی اشاعت، لائڈن ۱۸۹۵ء) ص ۱۱۵-۱۱۶۔

[52] دیکھو اوپر ص ۲۵۶، اور حاشیہ ۱۔ [53] دیکھو اوپر ص ۲۵۹-۲۶۰

[54] دیکھو اوپر ص ۲۵۹؛

شامل ہوں گے۔

خوارزمی کا مکمہ جنچا تلا ہے اور اُس کے بعد کوئی شبہ اصمعی کے قول کے صحیح ہونے میں نہیں رہتا۔ البتہ اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ "بغپور" چین کے شہزادوں کا لقب ہرگز نہ تھا، بلکہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، چین کے بادشاہ کو کہتے تھے اور اسے ویسا ہی استعارہ سمجھنا چاہیے جیسا "ظل اللہ" میں ہے۔ بادشاہ کے "ربانی حقوق" کو پورب ہی نہیں پچھم کی قومیں بھی آج سے چند ہی صدیوں پہلے تک مانتی رہی تھیں۔ خوارزمی کا خیال اِدھر نہیں گیا، نہیں تو یہ فقرہ شاید "مفاتیح العلوم" میں جگہ نہ پاتا:

"ولعلّ بغداد هی عطیّةُ الملک۔"

(اور شاید بغداد سے مراد ہو "بادشاہ کا عطیہ")

از

جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب، ایم، اے،

(۳)

غیاث الدین تغلق کے عہد کے بعض متنازعہ فیہ واقعات پر عصامی کے بیان سے کافی روشنی پڑتی ہے، مثلاً تلنگانہ کی فتح کے سلسلہ میں ابن بطوطہ کا بیان ہے، کہ غیاث الدین کے لڑکے الغ خان نے اپنے مصاحب عبید شاعر کے ذریعہ سے یہ افواہ پھیلا دی اکہ دہلی میں غیاث الدین کا انتقال ہو گیا، تاکہ فوجی امراء اور سردار اس کو اپنا بادشاہ تسلیم کریں، اس بیان کو کرنل ولزلی ہیگ نے جو یورپ میں اسلامی ہند کا مستند مورخ سمجھا جاتا ہے، بڑی اہمیت دی ہے، حالانکہ برنی، یحییٰ سرہندی، اور پھر بعد کے مورخوں میں فرشتہ، نظام الدین اور بدایونی نے الغ خان کی نیت پر حرف گیری مطلق نہیں کی ہے، بلکہ واضح طور پر لکھا ہے کہ عبید شاعر اور اس کے رفقاء نے محض فتنہ کے لئے یہ افترا باندھا، عصامی کے مندرجۂ ذیل بیان سے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے، کہ عبید نے یہ جھوٹی افواہ کیوں اڑائی،

مگر بود بر خانِ والا تبار	یکے فیلسوفے در آن روزگار
ہمیشہ زدے بر ورق ہا رقوم	زدے لاف در کار رملِ نجوم
بردی زدو غافلاں را مدام	عبید ش ہمی خواند ہر کس بنام

الغ خان یکے روز خواندش براز	بگفتا بکن دفتر خویش باز
چو ہستت بہ تنجیم دعوی مدام	بیان کن بتاکید و جہدِ تمام
کہ کے فتح گردد حصار تلنگ	معین بمدت بگو بے درنگ
و گر خود تفاوت بود زان شمار	نگردد برآن حکم فتح حصار
شود لانہایت سراسر دروغ	باختر شناسیت نبود فروغ
عبید این حکایت چو از خان شنید	بغیر اطاعت گریزے ندید
دریں کار یک ہفتہ مشغول گشت	شنیدم چو یک ہفتہ کامل گذشت
بیاورد بر خان رقوم شمار	معین در و روز فتحِ حصار
شنیدم کہ آن روز در پیش خان	بدعوی برآورد یکسر زبان
بگفتا کہ گر در فلاں وقت و روز	نیاید ظفر خان کشور فروز
بدارم برآرند گردِ حصار	مگر این سخن راست شد زاں شمار
غرض چونکہ زاں مدت اکثر گذشت	و زان معین نیز دیک گشت
عبید از پئے دفع تہدید خویش	چہ بود آنکہ از زرق و تقلید خویش
یکے فتنہ اندر سپہ ساز کرد	چو روبہ یکے بازی آغاز کرد
شنیدم تکین و تمر را بگفت	یکے قصۂ ناخوش اندر نہفت
کہ خسرو زباد فنا خاک گشت	وزیں ماجرا یک دو ہفتہ گذشت
دو سہ ہفتہ شد خان روباہ فن	بزیر قبا می ورد پیرہن
نہفتہ ہمی دارد این راز را	رخش ہست بر ماتم شہ گوا
دگر نامۂ بعد روزے سہ چار	بردمی رسد از سران دیار

ہمی دار د آں نامہ از ما نہاں نہ از ما کہ از جملہ سر لشکراں
گر فہم کنوں از مزاجش قیاس کہ می خواہد آں خان حق ناشناس
جفاے کند بر سران سپاہ،
یلان را بعذرے کشد بے گناہ،

عصامی محمد تغلق کا سخت مخالف ہے، اگر ابن بطوطہ کا بیان امر واقعہ ہوتا، تو عصامی کو بھی اس کی خبر ضرور ہوتی، اور وہ ضرور اس کا ذکر کرتا، پھر اس میں کچھ بھی حقیقت ہوتی، تو غیاث الدین تغلق دوسری بار تلنگانہ کی مہم الغ خان کے سپرد نہ کرتا، اور جب وہ لکھنوتی کی بغاوت فرو کرنے کے لئے گیا تو اس کو ورنگل سے بلاکر دہلی میں اپنا نائب بناکر نہ چھوڑ جاتا، تلنگ کی فتح کے بعد الغ خان جاج نگر گیا، (جو اڑیسہ کا پایۂ تخت اور موجودہ کٹک کے پاس دریاے مہاندی پر واقع تھا) برنی کا بیان ہے، کہ الغ خان جاج نگر کی تسخیر کے بعد تلنگ ہی واپس آیا، اور جب غیاث الدین تغلق لکھنوتی کی مہم پر روانہ ہونے لگا، تو اس کو دہلی بلا بھیجا، نظام الدین بخشی نے بھی یہی لکھا ہے، مگر یحیٰی سرہندی کا بیان ہے، کہ الغ خان ورنگل واپس آیا، اور اپنی خواہش کے مطابق ورنگل کا انتظام کرکے دہلی روانہ ہوا، فرشتہ کا بیان یحیٰی سرہندی کی تائید میں ہے، عصامی رقمطراز ہے کہ الغ خان جاج نگر سے سیدھا دہلی واپس آیا، جہاں اسکی فتوحات کے صلہ میں اس کو مرصع خلعت دی گئی، اور جشن منایا گیا، اور اسکے بعد ہی مغلوں کا حملہ ہوا، برنی نے مغلوں کے حملہ کا ذکر دو تین سطروں میں کیا ہے یحیٰی سرہندی، نظام الدین اور فرشتہ نے اس کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے، مگر عصامی نے اس کا ذکر حسب معمول پورے رزمیہ انداز میں تفصیل کیساتھ کیا ہے جس میں مفید معلومات بھی ہیں،

عصامی کا بیان ہے کہ تغلق نے ملک شادی کی نگرانی میں ایک فوج گجرات بھی بھیجی جس نے دو ماہ تک وہاں کے حصار (؟) کا محاصرہ کیا، مگر اس حصار کے ہندو گویوں اور رامشگروں کی ایک جماعت نے حیلہ اور فریب سے ملک شادی کو قتل کر دیا، جس کے بعد فوج ناکام واپس آئی، تعجب ہے کہ اس مہم کا ذکر برنی، یحیٰ، فرشتہ، نظام الدین، اور موجودہ دور کے ارباب تحقیق میں سے بھی کسی نے نہیں کیا ہے،

لکھنوتی کی مہم کے سلسلہ میں عصامی کے بیانات برنی اور دوسرے مورخوں سے کچھ مختلف ہیں، عصامی کی تفصیلات سے ظاہر ہوتا ہے، کہ لکھنوتی کا حاکم غیاث الدین بورہ (بہادر شاہ) تھا، اور اس کا شریک اس کا بھائی ناصر الدین تھا۔ جب غیاث الدین تغلق بہادر شاہ کی متمردانہ حرکتوں کی خبر سن کر اسکے خلاف فوج کشی کرنے چلا، تو ناصر الدین راستہ میں آکر ملا، اور اسکی فوج میں شریک ہو کر لکھنوتی پر حملہ آور ہوا، ابن بطوطہ کا بیان ہے، کہ غیاث الدین بورہ جب بنگالہ کا بادشاہ بنا، تو اسنے قتلو خاں اور اپنے دوسرے بھائی کو مار ڈالا، مگر ان بھائیوں میں شہاب الدین اور ناصر الدین بھاگ کر تغلق کے پاس آئے تغلق ان کو ساتھ لیکر لکھنوتی پر حملہ آور ہوا، اور غیاث الدین بورہ کو قید کرکے دہلی لایا، برنی کا بیان ہے، کہ ناصر الدین لکھنوتی کا حاکم اور بہادر شاہ سنار گاؤں کا ضابط تھا، بعض امرائے بنگالہ کی ابتری اور اسکے حکمران کے ظلم و تعدی کی شکایت کی، تو غیاث الدین تغلق فوج لیکر لکھنوتی روانہ ہوا، اور جب ترہت پہونچا، تو سلطان ناصر الدین اطاعت گذاری کی نیت سے غیاث الدین تغلق کے پاس حاضر ہوا، ہندو راجاؤں نے بھی اسکی اطاعت قبول کی، مگر سنار گاؤں کے حاکم بہادر شاہ نے سر تسلیم خم کرنا پسند نہ کیا، چنانچہ تاتار خان نے اس پر فوج کشی کی، اور اسکو قیدی بنا کر حاضر کیا، ناصر الدین لکھنوتی کا حاکم بدستور رہا، اور بہادر شاہ

طوق و سلاسل کے ساتھ دہلی آیا،

عصامی کا بیان ہے کہ لکھنوتی کی مہم سے واپسی میں سلطان غیاث الدین تغلق ترہٹ سے گذرا، تو وہاں کا راجہ خوف سے جنگل میں جا چھپا، تغلق شاہ بھی راجہ کے تعاقب میں جنگل کی طرف روانہ ہوا، جنگل بہت ہی گنجان تھا، لیکن تغلق شاہ نے اپنے ہاتھوں سے اسکے درختوں کو کاٹنا شروع کیا، اسکی تقلید میں ساری فوج درخت کاٹنے میں مشغول ہو گئی، یہاں تک کہ سارا جنگل میدان ہو گیا، دو تین دن کے بعد تغلق ترہٹ کے حصار کے قریب پہونچا، جس کے گرد پانی سے بھری سات خندقیں تھیں، مگر تغلق نے ہمت اور پامردی سے کام لیکر دو تین ہفتے میں قلعہ کو تسخیر کرکے راجہ کو اپنی حراست میں لے لیا، اور ترہٹ کی حکومت ملک تلبغہ کے بیٹے احمد خاں کو سپرد کرکے دہلی کی طرف روانہ ہوا، اس فتح کا ذکر برنی اور یحیٰی سرہندی نے نہیں کیا ہے، لیکن فرشتہ نے فتوح السلاطین کا حوالہ دیکر اپنی تاریخ میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ (دیکھو تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۱۳۲ نولکشور پریس)

آخر میں سلطان غیاث الدین تغلق کی موت کا واقعہ ہے، عصامی نے سنی سنائی دو روایتیں لکھی ہیں، ایک تو یہ کہ ہاتھی کے دوڑنے سے کوشک محل جس میں غیاث الدین تغلق ٹھہرا تھا، گر پڑا، اور دوسری یہ کہ محل طلسم پر اس طرح کھڑا کیا گیا تھا، کہ گر پڑے، اس واقعہ پر تبصرہ کرنا، ایک فضول اور لاحاصل بحث ہے، کیونکہ اس موضوع پر ہر دور کے مؤرخوں نے اپنی موشگافی اور قلم کی جولانی دکھا کر اپنی تحقیق و تدقیق کا نمونہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے مگر اب تک کوئی ایک دوسرے کو قائل نہ کر سکا ہے، کہ محمد تغلق باپ کی موت کا ذمہ دار یا اس سے بری الذمہ تھا، اسلئے ہم اس پر کسی قسم کی روشنی ڈالنا محض تضیع اوقات سمجھتے ہیں، اس کے بعد محمد تغلق کی حکومت کا حال شروع ہوتا ہے، عصامی محمد تغلق کا معاصر ہے

اس لئے اس دور کے متعلق فتوح السلاطین میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس پر توجہ سے نظر ڈالنے کی ضرورت ہے،

عصامی نے اس عہد کے واقعات کے ذکر میں سنہ کی ترتیب کو بالکل قائم نہیں رکھا ہے، اسلئے واقعات کے تقدم و تاخر کی تعیین میں بڑی پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے،

محمد تغلق کی تخت نشینی کے بعد عصامی نے کلانور اور فرشور (پشاور) کی مہم کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

شنیدم در آغاز ملک آن خدیو ‌ ‌ بفرمود تا سرفرازان نیو،

زخازن ستانند یکسالہ زر ‌ ‌ بلشکر سپارند تعجیل تر

بسازند نو آلتِ کارزار ‌ ‌ کہ مار است در سر ہوای شکار

چو زر شد باصحاب لشکر ادا ‌ ‌ دگر روز فرمود فرمانروا،

یکے سایباں سوے ملتان زنند ‌ ‌ وزو سایہ در بام چرخ افگنند

دریں ماجرا ہفتہ ریک و رفت ‌ ‌ شہ از شہر دہلی سپہ راند تفت

بلاہور بعد از دو ماہے رسید ‌ ‌ قضا اخترش را بہ گردوں کشید

شنیدم کہ خود ہم بلاہور ماند ‌ ‌ سران سپہ را بفرشور راند

بداں تا حدود دیارِ مغل ‌ ‌ نہنگانِ ہندی تبا زند کل

سرانِ سپہ چو بفرمانِ شاہ ‌ ‌ زلاہور راندند یکسر سپاہ

یکا یک کلانور و فرشور را، ‌ ‌ گرفتند گردانِ کشور کشا

زن و بچۂ کافراں شد اسیر ‌ ‌ برآمد ز اقصاے گردوں نفیر

مغل کان بہر سال ز آبِ سندھ ‌ ‌ گذشتے تبا راجِ اقصاے ہند

درآن سال برعکس ایں زیب کار	بملک مغل تاخت ہندی سوار
گرفتند چوں سرکشان حشم	بغفلت کلانور و فرشور ہم
بنام جہاندار کشور کشا	بخواندند خطبہ درآن شہرہا

اس مہم کا ذکر کسی اور تاریخ میں نہیں،

اس کے بعد بہاء الدین گرشاسپ کی بغاوت کا حال ہے، ضیاء الدین برنی نے ایک جگہ گرشاسپ کو سلطان محمد تغلق کی بہن کا لڑکا، عصامی نے پھوپھی زاد اور فرشتہ نے چچا زاد بھائی لکھا ہے، برنی نے گرشاسپ کی بغاوت کا ذکر مطلق نہیں کیا ہے، ابن بطوطہ نے گو اس کا حال تفصیل سے لکھا ہے لیکن اس کی تاریخ نہیں دی ہے، یحییٰ سرہندی نے اس کی تاریخ ۷۲۸ھ (اواخر) لکھی ہے، اور اس کے بیان سے صاف ظاہر ہے کہ یہ بغاوت دارالسلطنت کے دیوگیر منتقل ہو جانے کے بعد ہوئی، لیکن فرشتہ نے اس کو دارالسلطنت کے منتقل ہونے سے پہلے کا واقعہ بتایا ہے، اور لکھا ہے کہ اس بغاوت کے فرو کرنے ہی کے زمانہ میں محمد تغلق نے دیوگیر کی مرکزی حیثیت کو پسند کیا تھا، عصامی کے بیان سے بھی یہی ظاہر ہے کہ گرشاسپ کی بغاوت دارالسلطنت کی تبدیلی سے پہلے واقع ہوئی تھی،

گرشاسپ سکر کا جاگیردار تھا، فرشتہ نے سکر کو ساغر لکھا ہے، یہ گلبرگہ کے پاس والی جگہ ساگر ہے، عصامی نے بغاوت کی مندرجۂ ذیل تفصیل لکھی ہے:

گرشاسپ نے علم بغاوت بلند کرکے بہت سی فوج اپنے گرد جمع کرلی، محمد تغلق کو خبر ہوئی تو گجرات سے احمد ایاز کو اس کی سرکوبی کے لئے بھیجا، احمد ایاز شاہی لشکر لیکر دیوگڑھ پہنچا، اور دونوں طرف کی فوجیں صف آرا ہوئیں، لڑائی شروع ہوئی تو گرشاسپ کا ایک امیر خضر بہرام منحرف ہوکر احمد ایاز کی فوج سے مل گیا، جس سے شاہی فوج کو بڑی تقویت پہنچی، گرشاسپ پسپا

ہوکر میدانِ جنگ سے بھاگا اور سکر میں جاکر دم لیا، اور وہاں سے اپنے اہل وعیال کو لیکر کنپلہ (کرناٹک)
کے راجا کے یہاں پناہ گزیں ہوا، اسی اثنا میں محمد تغلق خود دولت آباد پہونچا، اور گرشاسپ کے تعاقب
میں احمد ایاز کو کنپلہ بھیجا، کنپلہ میں احمد ایاز کو دو بار شکست ہوئی، لیکن جب مزید شاہی لشکر پہونچا تو گرشاسپ مغلوب ہوا، اور
ھندرگ میں جاکر پناہ لی، شاہی لشکر نے ھندرگ کو بھی فتح کرلیا، اور کنپلہ کا راجہ گرفتار ہوا، گرشاسپ
نے ھندرگ سے فرار ہوکر دہور سمندر کے راجہ بلال دیو کے دامن میں پناہ لی، مگر بلال دیو شاہی لشکر
سے کچھ ایسا خوفزدہ ہوا کہ اس نے گرشاسپ کو گرفتار کرکے احمد ایاز کے سپرد کردیا، جس نے اسکو
محمد تغلق کے پاس حاضر کیا، محمد تغلق نے اسکی کھال کھچوا کر اسمیں بھس بھروا دیا اور سارے شہر میں تشہیر کرائی کہ حکومت کے
سیاسی مجرموں کا یہ حشر ہوتا ہے۔

گشتاسپ کی بغاوت کی تفصیلات عصامی کے بعد صرف ابن بطوطہ کے یہاں ملتی ہیں، عصامی
اور ابن بطوطہ کی عمومی تفصیلات یکساں ہیں، البتہ جزوی تفصیلات میں ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ جب کنپلہ
کا راجہ پسپا ہونے لگا، تو اس نے ایک چتا تیار کرائی جس میں عورتیں، امراء، وزراء جل مرے اور خود
راجہ ہتھیار باندھ کر شاہی فوج پر ٹوٹ پڑا، اور لڑتا ہوا مارا گیا، ابن بطوطہ کا یہ بھی بیان ہے کہ کنپلہ
کے راجہ کے گیارہ بیٹے گرفتار ہوکر مشرف بہ اسلام ہوئے، اور تغلق کے دربار میں معزز عہدوں پر
مامور کئے گئے، ان میں سے بعض کے تعلقات ابن بطوطہ سے گہرے تھے، عصامی ان باتوں کا ذکر
نہیں کرتا ہے۔ مگر بغاوت کی جو تفصیلات اس نے لکھی ہیں، ان کو فرشتہ نے اپنے الفاظ میں بالاستیفا
نقل کیا ہے،

اس بغاوت کے بعد عصامی نے کندھیانہ کی مہم کا ذکر کیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس
بغاوت کے بعد سب سے پہلا اہم واقعہ یہی ہے، حالانکہ اس کے بعد دار السلطنت دہلی سے دیوگیر منتقل ہوا
مگر عصامی اس کا ذکر کندھیانہ کی تسخیر اور بہرام ایبہ کی بغاوت کے بعد کرتا ہے، کندھیانہ کی فتح کا

حال برنی اور یحییٰ نہیں لکھتے ہیں، مگر عصامی کے بیان سے ان کی خاموشی کی تلافی ہو جاتی ہے کندھیانہ (موجودہ سن گڑھ) کا حصار ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا، اسلئے محمد تغلق کو یہاں آٹھ مہینے گذارنے پڑے مگر آخر میں کندھیانہ کا راجہ ناک نایک مغلوب ہوا، یہیں محمد تغلق کو بہرام ایبیہ کی بغاوت کی خبر ملی، اس نے دولت آباد کی طرف مراجعت کی اور وہاں سے دہلی آیا، اور دہلی سے بہرام ایبیہ کی سرکوبی کے لئے ملتان روانہ ہوا،

بہرام ایبیہ (یعنی کشلی خاں) کی بغاوت کا حال جس تفصیل سے عصامی نے لکھا ہے وہ کسی اور تاریخ میں نہیں ہے، مگر اس نے اس بغاوت کے اسباب پر کوئی روشنی نہیں ڈالی، برنی بھی خاموش ہے، ابن بطوطہ اور یحییٰ دو مختلف وجوہ لکھتے ہیں، ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ محمد تغلق نے غیاث الدین پورہ اور ملک گرشاسپ کی لاشوں کو بھوسہ بھروا کر مشتہر کرایا تو کشلی خاں کو یہ ناگوار گذرا، اور اس نے دونوں لاشوں کو دفن کرا دیا جس سے محمد تغلق بہت ہی ناراض ہوا، اور کشلی خاں کو قتل کرنے کا ارادہ کیا، کشلی خاں کو معلوم ہوا تو وہ باغی ہو گیا، لیکن یہ بیان صحیح نہیں، کیونکہ غیاث الدین کا قتل (۷۳۱ھ) گرشاسپ کے قتل (۷۲۶ھ) کے بعد ہوا، تاریخ مبارک شاہی میں یہ سبب بتایا گیا ہے کہ شاہی فرمان کے بموجب علی خطی نامی ایک مغل کشلی خاں کے خاندان کو دولت آباد لانے ملتان گیا، وہاں وہ ان لوگوں سے سختی، درشتی اور بدتمیزی سے پیش آیا جس کی بنا پر وہ قتل کر دیا گیا، کشلی خاں بادشاہ کے قہر و غضب سے ڈرا، اور باغیوں میں داخل ہو گیا، فرشتہ اور بدایونی بھی یہی سبب لکھتے ہیں، ممکن ہے کہ محمد تغلق کشلی خاں کے خاندان کو دولت آباد میں بلا کر اسکو اپنے قبضہ میں کرنا چاہا ہو جسے کشلی خاں نے پسند نہ کیا ہو،

اس بغاوت کو فرو کرنے کی جو تفصیلات عصامی نے لکھی ہیں، وہ کسی اور تاریخ میں نہیں، ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ شاہی فوج اور کشلی خاں سے مقابلہ ملتان سے دو منزل دور بمقام ابوبہر ہوا

لڑائی کے روز محمد تغلق نے یہ ہوشیاری کی کہ چتر کے نیچے اپنی جگہ شیخ رکن الدین ملتانی کے بھائی شیخ عماد الدین کو کھڑا کر دیا، اور خود چار ہزار سپاہی لیکر دوسری طرف چلا گیا، کشلو خاں کے سپاہیوں نے شاہی چتر کے پاس پہونچکر عماد الدین کو قتل کر دیا، کشلو خان کے لشکر نے سمجھا کہ بادشاہ مارا گیا، چنانچہ شاہی فوج میں لوٹ شروع ہوئی، کشلو خاں اکیلا رہ گیا، محمد تغلق نے موقع پاکر کشلو خاں پر حملہ کیا اور اسکو قتل کرکے اس کا سر کاٹ لیا جو ملتان کے دروازہ پر لٹکا دیا گیا۔ عصامی کی تفصیل بالکل مختلف ہی، اس کا بیان ہے کہ محمد تغلق نے پہلے لالہ بہادر اور لالہ کرنگ کو مقدمۃ الجیش بناکر بھیجا، کشلی خاں کا داماد کشمیر ان کے مقابلہ کے لئے آیا، اور بمقام بوہنی دونوں میں جنگ ہوئی، مگر کشمیر کو شکست کھاکر بھاگنا پڑا، اس کے بعد کشلی خاں خود فوج لیکر بڑھا، اور میدان کارزار گرم ہوا تو شاہی فوج کی طرف سے لکھنوتی کا بادشاہ ناصر الدین، اسمٰعیل، شیخ ابو الفتح اور ہوشنگ بڑی جانبازی کے ساتھ لڑے، اور دوسری طرف کشلی خاں، اس کے بھائی شمس الدین اور داماد کشمیر نے بزد آزمائی کی، مگر کشلی خاں کی فوج پسپا ہو کر بھاگی، کشلی خاں لڑتا ہوا گرا، اور شاہی فوج کے سپاہیوں نے اس کا سر کاٹ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا، جو عبرت کے لئے نیزہ پر لٹکا دیا گیا، عصامی نے جنگ کی تفصیل بہت ہی پرجوش طریقہ پر لکھی ہی،

اس کے بعد غیاث الدین پورہ کے قتل کا ذکر ہے، غیاث الدین تغلق کے عہد میں بیان کیا جا چکا ہی کہ غیاث الدین پورہ سنار گانوں سے مقید ہو کر دہلی لایا گیا، مگر جب محمد تغلق تخت نشین ہوا تو اس نے غیاث الدین پورہ کو اپنی مملکت میں واپس بھیجدیا، وہاں پہونچکر اوس نے پھر بغاوت کی، تاتار خاں المخاطب بہ بہرام خاں نے اس کے خلاف لشکر کشی کی، اور وہ زندہ گرفتار کیا گیا، تاتار خان نے اسکی کھال کھنچواکر بادشاہ کے پاس بھیجدی، عصامی نے بغاوت کا سبب نہیں لکھا ہے، البتہ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ جب تغلق غیاث الدین کو اسکی مملکت میں واپس کر رہا تھا، تو

اس سے وعدہ لئے کہ وہ بہرام خاں کے ساتھ مل کر حکومت کریگا، اور سکہ اور خطبہ میں دونوں کے نام ہوں گے، اور اپنے بیٹے محمد عرف بر باط کو بطور ضمانت شاہی دربار میں بھیجدے گا، مگر غیاث الدین نے دوسری شرط کو پورا کرنے میں پہلوتہی کی، اسی جرم میں اس پر لشکرکشی کی گئی،

اس واقعہ کے بعد محمد تغلق کے مظالم کا حال شروع ہوتا ہے جس میں سب پہلے دارالسلطنت کے منتقل ہونے کا ذکر ہے، حالانکہ واقعات کی ترتیب کے لحاظ سے اس کا ذکر پہلے آنا چاہیے تھا، کتاب کے شروع میں عصامی نے تاریخ لکھنے پر توجہ کی تھی، لیکن پھر اس کا کوئی التزام نہیں رکھا چنانچہ محمد تغلق کے عہد کے واقعات میں اُس نے کوئی تاریخ نہیں لکھی ہے، اسلئے وہ واقعات کی ترتیب کو قائم نہیں رکھ سکا ہے،

دارالسلطنت کی تبدیلی کا سبب عصامی نے یہ لکھا ہے کہ سلطان دہلی کے باشندوں سے بدگمان تھا، اس لیے ان کو دیوگیر چلے جانے کا حکم دیا،

چوں شہ بدگمان بود بر خلق شہر	نہفتہ بسے داشت در نوش زہر
ہم آخر چو از پوست بیروں فتاد	چو ضحاک سر در سیاست نہاد
ز بیداد بسیار کشت آدمی	چو کم دید در روے زشتن کمی
نہانی یکے راے زد با صواب	کہ در یک مہ آن شہر گردد خراب
بگویند در ہر طرف آشکار	کہ ہر کو بود مخلص شہریار
سبک خیمہ زیں شہر بیروں زنند	سوے ملک مرہٹہ عزیمت کنند
چو سر بر خط حکم خسرو نہند،	شہ روزگارش بسے زر دہد
وگر سر بتابد ز فرمانِ شاہ	سرش خاک گردد بر ایوانِ شاہ
سزاوار آہن بگردد سرش	سرش خاک و بر باد گردد تنش

بگفتا بشہر آتشے در زنند — ہمہ خلق از شہر بیرون کنند
ہمہ خلق گریاں پے خانہ خویش — رہا کردہ مالوف اوطانِ خویش

بدگمانی کا سبب عصامی نے ظاہر نہیں کیا ہے، ابن بطوطہ کا بیان ہو کہ لوگ خطوط میں بادشاہ کو گالیاں لکھ بھیجتے تھے، اس لئے اُس نے بطور سزا دہلی کو اجاڑ دینے کا تہیہ کیا، مگر ظاہر ہے کہ عصامی اور ابن بطوطہ کے بیانات تشفی بخش نہیں، برنی کا بیان ہو کہ محمد تغلق نے دیوگیر کو اس لئے دار السلطنت بنانا چاہا کہ یہ مرکز میں واقع تھا، اور اسکی مسافت دہلی، گجرات، لکھنوتی، ستنکانو، سنارگانو، تلنگ، معبر، دھورسمندر اور کنپلہ سے برابر تھی، یہی اصل سبب تھا، اور اسی کو بدایونی اور فرشتہ نے قابل قبول قرار دیا ہو، گو موخر الذکر نے ہندوستان کے پایۂ تخت کو ایران و توران جیسے قوی دشمنوں سے اتنا دور رکھنا تدبر اور دانشمندی کے خلاف سمجھا ہے، مگر جغرافیائی حیثیت سے اس کا انتخاب برا نہ تھا، دہلی ہمیشہ دشمنوں کے زد میں رہی، اور محض اس کی تسخیر سے ہندوستان کی مملکت حملہ آوروں کے قبضہ میں چلی جاتی تھی مگر دیوگیر کے پہاڑی راستوں کو طے کرنا دشمنوں کیلئے مشکل تھا، اسلئے تغلق نے وہاں منتقل ہو کر اپنے کو بیرونی حملوں سے مامون اور مصئون کر لینا چاہا، اس کے علاوہ دہلی میں بیٹھکر جنوبی ہند کو اپنے قبضہ میں رکھنا آسان نہ تھا، علاؤ الدین کی بے پناہ فوجیں بھی جنوبی ہند کے راجاؤں اور حکمرانوں پر استیلا نہ پا سکی تھیں، محمد تغلق نے قریب ہو کر ان کو مغلوب کرنا چاہا،

برنی رقمطراز ہے کہ محمد تغلق کو دار السلطنت کی تبدیلی کا خیال جیسے ہی آیا، اوس نے حکم دیا کہ دہلی جو رشک مصر و بغداد ہو رہی تھی، ویران کر دی جائے، اس کی سرائے مسمار اور اردگرد کے گاؤں غیر آباد کر دیئے جائیں، اور بوڑھے، بچے، غلام اور لونڈیاں دیوگیر روانہ ہو جائیں، حکم بجا لایا گیا، مگر راستہ کی دوری اور مشقت سے بے شمار جانیں تلف ہو گئیں، اور جو لوگ پہونچے

وہ غریب الوطنی میں گھٹ گھٹ کر مر گئے، عصامی نے بھی اس سفر کی صعوبتوں کی بہت ہی بھیانک تصویر کھینچی ہے،

چہ پیر و چہ کودک چہ مرد و چہ زن رہا کرد ہر یک دیار و دمن

بسے نازنیں داد جاں با گداز چو حجاج ماندہ براہ حجاز

بسے طفل بے شیر گشتہ ہلاک بسے سر پئے آب خفتہ بخاک

دراں رہ بدیدم کہ ہر دلبرے بہر غول گاہے نہادہ سرے

ہمہ نازکانے کہ ہرگز بخواب نہ خوردہ غم از گرمی آفتاب

یکے جامۂ کہنہ بیچیدہ پائی ہمی کرد سجدہ بگامی دو جای

یکے پا برہنہ رہے می نوشت ہمہ دشت از ایشان صنم خانہ گشت

بروئے کہ جز داغ صندل نبود شد از کوشش گرد زرد و کبود

بچشمے کہ جز در گلستاں نہ رفت بہامون برفت و بیاباں رفت

بسے آبلہ اندراں پا نشست بسے خار گردوں دراں پا شکست

ازاں قافلہ با عذاب شدید سوئے دولت آباد عشرے رسید

شہ از ظلم بے زاد و بے راحلہ ہمہ خلق را کرد بس قافلہ

پیاپے رواں کردہ ہر شش نہ شہر نہ از عدل و احساں کہ از خشم و قہر

چنیں شہر معمور کردہ خراب چہ گوید بداور فردا جواب

دران شہر چوں کس نماند از کرام بہ بستند درواز ہا را تمام

یہ تصویر ابن بطوطہ کے بیان سے اور بھی ہولناک ہوجاتی ہے جب وہ لکھتا ہے کہ دہلی کے تمام باشندے چلے گئے تو ایک روز گلی میں دو آدمی دکھائی دیے، ایک اندھا تھا، دوسرا لولا، وہ دونوں

بادشاہ کے سامنے لائے گئے، لولے کو اُس نے منجنیق سے اڑا دیا، اور اندھے کے لئے حکم دیا کہ اسکو دہلی سے دولت آباد تک جو چالیس دن کا راستہ ہو گھسیٹ کر لیجائیں، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا مگر دولت آباد اس کا صرف ایک پانوں پہنچا،

مگر تاریخ مبارک شاہی کے مصنف یحیٰی سرہندی کا بیان عصامی برنی اور ابن بطوطہ سے مختلف ہی، وہ لکھتا ہی کہ ۷۲۷ھ میں محمد تغلق نے دیوگیر منتقل ہو جانے کا ارادہ کیا، تو راستہ میں سرائیں، خانقاہیں اور منزلیں بنوائیں، کھانا، شربت اور پان کا انتظام حکومت کی طرف سے کیا تاکہ گذرنے والے مسافروں کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو سڑک کے دونوں جانب سایہ دار درخت نصب کرائے کہ ان کی ٹھنڈی چھاؤں میں مسافر آرام سے سفر کرسکیں، اس کے بعد اپنی والدہ مخدومۂ جہان، امرار، ملوک، مشاہیر، نوکر چاکر، ہاتھی گھوڑے اور خزانے کو دیوگیر لے گیا علما، و اکابر کو بلا کر وہاں آباد کیا، اور لوگوں کو مکانات بنانے کے لئے اخراجات کے علاوہ انعام و اکرام عطا کئے جب راستہ میں اتنی سہولتوں اور آسایشوں کا انتظام تھا، تو پھر برنی ابن بطوطہ اور عصامی نے معلوم نہیں کیوں راستہ کی تکلیف اور مصیبت کا اس قدر مبالغہ آمیز ذکر کیا ہے؟ یحیٰی سرہندی نے راستہ اور سفر کی صعوبتوں کا ذکر مطلق نہیں کیا ہے، جب دہلی خالی ہوئی، تو لکھتا ہے کہ

"شہر دہلی چناں خالی شد کہ چند روز دروازہا بستہ ماندہ بود، وسگ و گربہ در درونِ شہر بانگ نمی کردند"

مگر پھر فوراً ہی لکھتا ہی کہ

"مردم عوام و اوباش کہ در شہر ماندہ بودند جملہ اسباب شہریاں از خانہا بیروں می آوردند و تلف می کردند"

دونوں عبارت کو ساتھ پڑھنے سے یہ کیونکر یقین کیا جاسکتا ہو کہ دہلی بالکل خالی اور ویران ہوگئی، گو عصامی نے بھی لکھا ہو کہ دہلی خالی ہوجانے کے بعد اس میں صرف الو رہا کرتے تھے، ممکن ہو کہ یہ طرزِ بیان دہلی کی خوشحالی کم ہوجانے پر ماتم کرنے کی غرض سے اختیار کیا گیا ہو،

دارالسلطنت کا تبدیل ہونا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہر زمانہ میں فرمانرواؤں نے اپنی اپنی مصلحتوں کی بنا پر پایۂ تخت کی تبدیلی کی ہے، محمد تغلق نے بھی دولت آباد کو مرکزی مقام اور مغلوں کے حملے سے محفوظ اور جغرافیائی حیثیت سے مستحکم سمجھ کر دہلی پر ترجیح دیا اور پایہ تخت کو منتقل کرنے میں تمام ممکن سہولتیں بہم پہنچائیں، لیکن عام طور سے یہ تبدیلی پسند نہیں کی گئی، اسلئے شاعروں مورخوں اور سیاحوں نے اس فعل کو مذموم قرار دے کر اس کے ذکر میں ہر قسم کی رنگ آمیزی کی برنی ابن بطوطہ اور عصامی کی تحریریں اسی رنگ آمیزی کا نمونہ ہیں، مگر جب عصبیت کی شدت کم ہوئی تو مورخوں کا اندازِ تحریر بھی بدل گیا، چنانچہ یحییٰ سرہندی کا مذکورۂ بالا بیان اسی کی دلیل ہے، اس سلسلہ میں اُس نے کچھ اور واقعات لکھے ہیں، جو برنی ابن بطوطہ اور عصامی کے یہاں مذکور نہیں، اس کا بیان ہو کہ دارالسلطنت کی تبدیلی دو دفعہ ۷۲۷ھ اور پھر ۷۲۹ھ میں واقع ہوئی پہلی بار محمد تغلق امرار و ملوک کو دولت آباد لے گیا، اور دوسری بار جمیع ساکنان دہلی کو روانہ کیا، برنی نے ایک ہی تبدیلی کا ذکر کیا ہے، جس سے یحییٰ کا بیان بظاہر مشکوک ہوجاتا ہے لیکن برنی نے اس عہد کے بہت سے واقعات حذف کر دیے ہیں، اسلئے ممکن ہو کہ اوس نے اختصار کی خاطر ایک تبدیلی کو نظر انداز کر دیا ہو، یحییٰ برنی کی طرح محمد تغلق کا ہم عصر مورخ نہیں ہے لیکن اس نے اپنی تاریخ محمد تغلق کے بالکل متصل عہد میں لکھی ہے، اس لئے اس کا بیان غیر مستند نہیں قرار دیا جاسکتا ہو، چنانچہ بدایونی اور فرشتہ نے اسکی تقلید میں دو تبدیلیوں کا حال لکھا ہو، گو موخر الذکر کی ترتیب کچھ خلط ملط ہوگئی ہو،

یحیٰی نے دو مرتبہ دارالسلطنت کو تبدیل کرنے کے اسباب نہیں لکھے ہیں، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے پہلے سوچا ہوگا کہ دولت آباد اور دہلی دونوں کو صدر مقام رکھا جائے اس لئے پہلی بار خزانہ تو دولت آباد لے گیا لیکن ٹکسال گھر دہلی میں رہنے دیا (محمد تغلق کے ۷۲۷ھ ۷۲۸ھ اور ۷۲۹ھ کے سکوں میں دہلی ہی کی مہریں ہیں) یہ قیاس اور بھی مستحکم ہوجاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ بہرام ایبیہ کی بغاوت فروکرکے وہ دہلی ہی واپس آیا اور یہاں اُس نے دو سال قیام کیا، پھر ممکن ہے کہ مغلوں کے حملے کے خطروں اور لوگوں کی خواہشوں کا اندازہ لگا کر دولت آباد کو اپنی منشاء کے مطابق آباد کرنے کے لئے دہلی کے لوگوں کو بھی وہاں چلے جانے کا حکم دیدیا ہو

عصامی نے ملکی اور سیاسی وجوہ سے قطع نظر کرکے دہلی کی تباہی کے تین اسباب اور لکھے ہیں، (۱) عام طور سے سو برس کے بعد دنیا میں ایک بڑا انقلاب ہوتا ہے، دہلی کو قائم ہوئے سو برس ہوچکے تھے، اس لئے یہ تباہ ہوئی، (۲) دہلی کے عام باشندوں کی مذہبی اور اخلاقی حالت بہت پست ہوگئی تھی، اس لئے ان پر یہ عذاب نازل ہوا، عصامی کے اشعار ملاحظہ ہوں تاکہ اس عہد کے لوگوں کی پستی کا بھی نقشہ سامنے آجائے،

زہر کوچۂ اہل بدعت نجاست	ہم از شومت شاں سعادت بکاست
رہا کرد خلقش رسوم قدیم	شدہ ہر کجا بدعتے مستقیم
لباسے دگر خلق پرداختند	ز دستار تا کفش نو ساختند
گروہے زگزبند باریک پوش	گندم نمای شدہ جو فروش
بظاہر سراسر تواضع نمائے	بباطن بیابی خصومت گرائے
نشانہ شدہ ہریکے در فساد	ہمہ دیدہ سخنان سست اعتقاد
بسے سینہ از چرب شاں بداغ	دو صد کفر ہریک بگفتہ بلاغ

بآزار و لہا شادہ و لے | شب و روز در خرج تا حاصلے
بعاجز کشی پور دستان ہمہ | قوی دست بر زیر دہقان ہمہ
گہ لاف ہر یک چو روئین تنے | گہ کار رجلہ چو بیوہ زنے
ہمہ مردم آزار و شیطاں نواز | ہمہ آشنا سوز و بیگانہ ساز
مصلا و سبحہ برانداختہ | صراحی و ساغر عوض ساختہ
بسے کارہا کردہ اندر نہاں | کہ نا رو خرد مند را و بر زباں
ہم آخر آن قوم بسیار گشت | گنہگاری شاں ز حد بر گذشت
ہمہ شومت آں گروہ نژند | بہ بنیاد دہلی خللہا فگند

(۳) نظام الدین اولیاؒ دہلی چھوڑ کر باہر چلے گئے تھے، اس لئے دہلی بھی ویران ہو گئی

نخستیں ہماں مرد فرزانہ فر | قدم زد ز دہلی بملکے دگر،
وزاں پس شد آں شہر کشور خراب | درآں ملک شد فتنہ کامیاب
قدم تا گہ برداشت آں مرد راہ | بفرمان ایزد ازاں تخت گاہ
درآں تختگہ کس خوش آبے نخورد | بجز غصہ جام شرابے نخورد
ازاں ملک امن و اماں رخت بست | فساد و خطر جاے ایشاں نشست

عصامی نے محمد تغلق کے سکوں کے طرز عمل پر جو کچھ لکھا ہے، وہ نہ صرف معاصر مورخون کے بیانات سے بالکل مختلف بلکہ عجیب وغریب ہے، عصامی کا بیان ہے کہ محمد تغلق سلطنت میں بغاوتوں سے عاجز ہوا تو اس نے اپنی رعایا کو مفلس اور قلاش کر دینا چاہا تاکہ وہ سرکش نہ ہو سکے اس لئے اس نے لوہے، اور چمڑے کے سکوں کو رائج کر کے اس سے سونا غصب کر لینے کی کوشش کی،

شنیدم ہماں خسرو دوں پرست | کہ بر قصد اصحاب دیں بر نشست

چو بشنید از منہیان فساد | کہ معمور شد باز ہر سو بلاد
بدل گفت کین خلق آسودہ حال | تلف می نگردد ز پشتی مال
بتاراج شان حیلہ ساختم | بتدبیر شان تعبیہ باختم
ہنوز ند ایں طایفہ برقرار | بہ پشتی اموال در ہر دیار
ہمان بہ کہ پشتی شان بشکنم | بتدبیر شاں جملہ مفلس کنم
چو مفلس شود ہر کجا منعمے | بگردیہ کشد کار ہر مکرمے
شود ہر یک از لطمۂ فاقہ پست | کسے مرکسے را نگیرد بدست
شنیدم چو شہ با دل ایں قصہ گفت | یکے رائے ناخوش درو اندر نہفت
دگر روز کز جنبش آفتاب | ہمہ گشت پرزر جہان خراب
بفرمود شاہ مخرب سیر | بخازن کہ تو یض ہر سیم و زر
سراسر ہمہ آہن و چرم ہم | سپارد باہل سزاے درم
بدان تا ز سر سکہا نوزنند | ہمہ مہر بر آہن و مس کنند

عصامی کے مذکورۂ بالا بیان میں ژولیدگی ہے اور اختراع بھی، معاصرین میں برنی اور یحییٰ اور متاخرین میں فرشتہ، نظام الدین اور بدایونی لوہے اور چمڑے کے سکوں کے رائج ہونیکا ذکر مطلق نہیں کرتے ہیں، برنی اور یحییٰ کا متفقہ بیان ہے کہ محمد تغلق نے مس کے سکے جاری کئے لیکن فرشتہ کا بیان ہے کہ مس کے علاوہ پیتل (برنج) کے بھی سکے جاری کئے، اور یہ صحیح ہے کیونکہ راجرز نے انڈین میوزیم کے سکوں کی فہرست میں محمد تغلق کے عہد کے پیتل کے سکے بھی مذکور ہیں جن کا سنہ ۷۳۰ھ ہے موجودہ دور کے ایک انگریز اہل قلم کا خیال ہے کہ محمد تغلق نے چمڑے کے نوٹ کو رائج کرنے کی کوشش کی، (انڈین ہسٹری کیوری جلد اول ص۲۰۰) مگر اس خیال کی تائید فتوح السلاطین

کے سوا کسی اور معاصر تاریخ سے نہیں ہوتی ہے، اب یا تو عصامی کے اُس بیان کو صحیح سمجھ کر قبول کر لیا جائے یا مزید معاصرانہ تفصیلات کی غیر موجودگی میں اسکو نظر انداز کر دیا جائے،

مگر عصامی نے جدید سکون کے رائج کرنے کے جو اسباب لکھے ہیں وہ بالکل قابلِ قبول نہیں کیونکہ مورخون کا متفقہ بیان ہے کہ جب یہ تجربہ ناکام رہا تو محمد تغلق نے اپنی رعایا کو شاہی خزانہ سے ان سکوں کے بدلے سونے اور چاندی کے سکّے دیئے تو پھر رعایا کو مفلس بنانے کی روایت کیونکر قبول کیجا سکتی ہے، بات یہ تھی کہ سونے کی گرانی اور چاندی کی کمی کے سبب سے ذہین اور طبّاع سلطان تغلق نے چودہویں صدی عیسوی میں سکّوں کی اشاعت اور شرحِ تبادلہ کی آسانی کی خاطر وہی طرزِ عمل اختیار کرنا چاہا جو اٹھارہویں صدی کی متمدن حکومتوں نے کیا لیکن فضا سازگار نہیں ہوئی، اسلئے اربابِ عقل و دانش بھی اسکی نوعیت اور حقیقت کے سمجھنے سے قاصر رہے اور جب سمجھ نہ سکے تو اسکے اسباب پر مختلف قسم کی قیاس آرائیاں کیں، عصامی کا بیان اوپر گذر چکا ہے، برنی نے لکھا ہے کہ تغلق ربعِ مسکوں کو تسخیر کرنا چاہتا تھا، اسلئے اپنی بےشمار فوجوں کو تنخواہ دینے کیلئے مس کے سکّے جاری کئے، یحیٰی کا بیان ہے کہ انعام و اکرام سے شاہی خزانہ خالی ہو گیا تھا، اسلئے محمد تغلق نے مس کے سکّے جاری کر کے خزانہ کو پُر کرنا چاہا، مگر بعد کے مورخوں نے جب اسکو سمجھنے کی کوشش کی، تو انکو یہ فعل اس قدر مذموم نظر نہیں آیا، جتنا معاصر مورخون کی نظروں میں تھا، فرشتہ قمطراز ہے کہ تغلق نے سوچا کہ جس طرح چین میں کاغذی سکہ چاؤ رائج ہے، اسی طرح ہندوستان میں تانبے اور پیتل کے سکّے رائج کئے جائیں، موجودہ دور کے اربابِ بصیرت بھی اس طرزِ عمل کو بُرا نہیں سمجھتے ہیں بلکہ بعض انگریز مورخوں نے تو محمد تغلق کو دھاتوں اور سکّوں کے علم کا امام کہا ہے، اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اس زمانہ میں چاندی کی عالمگیر قلت اور کمی تھی، اسلئے مس کے سکّوں کا جاری کرنا تدبّر اور بصیرت کی دلیل تھی،[۱] مگر جن ذرائع اور تدابیر سے اُس نے سکّوں کو چلانا چاہا وہ موثر نہ تھے اسلئے اسکی ساری مآل اندیشی بے مدعا ہو کر رہ گئی،

(باقی)

---

[۱] دیکھئے The Chronicles of Pathan Kings by E Thomas اور Growth of English industry and commerce by Cunningham

حافظ امان اللہ بنارسی

اور انکی

مسجد خانقاہ اور مزار کے کتبے

از سید سلیمان ندوی

ہندوستان کی خاک سے جو مشہور علما اٹھے، ان میں ایک نام حافظ امان اللہ بنارسی کا ہے، انکی عظیم الشان شخصیت کے اندازہ کے لئے یہ واقعہ کافی ہے کہ علماے فرنگی محل کے مورثِ اعلیٰ اور درسِ نظامی کے بانی ملا نظام الدین فرنگی محلی ان کے شاگردوں میں تھے۔

آزاد بلگرامی نے حافظ صاحب کا مختصر حال مآثر الکرام اور سبحۃ المرجان میں لکھا ہی، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں معلوم، اور جو کچھ لکھا ہی، وہ یہ ہے،

حافظ صاحب کے والد کا نام نور اللہ اور دادا کا نام حسین تھا، بنارس وطن تھا، ہندوستان کے نامور علماء میں سے تھے، معقول و منقول دونوں میں کامل دست رس تھی، اصولِ فقہ میں خاص طور سے انکو کمال حاصل تھا، اس فن میں مفسر نام ایک متن متین اور پھر محکم الاصول کے نام سے اسکی شرح لکھی، تفسیر، اصول، فلسفہ اور کلام کی کتابوں میں سے تفسیر بیضاوی، عضدی، تلویح، حاشیۂ قدیمہ، شرح مواقف، شرح حکمۃ العین، اور شرح عقائد ملا جلال دوانی وغیرہ پر حاشیے لکھے، اور دیوان عبدالرشید جونپوری المتوفی ۱۰۸۳ھ کے رسالہ رشیدیہ پر جو فنِ مناظرہ کا مشہور رسالہ ہی، تنقیدی حاشیہ لکھا اور ملا محمود جونپوری نے حدوثِ دہر کے مسئلہ میں میر باقر استرآبادی کے خلاف جو رسالہ لکھا تھا، ایک رسالہ

ان دونوں محققوں کے درمیان محاکمہ لکھا،

سلم و مسلم کے مصنف ملا محب اللہ بہاری اور حافظ صاحب دونوں ہم عصر تھے، اور اتفاق سے لکھنؤ میں جمع ہوگئے تھے، ملا صاحب سلطان عالمگیر کے زمانہ میں وہاں کے قاضی اور حافظ صاحب صدر امور مذہبی تھے، ان دونوں میں باہم علمی بحثیں اور دوستانہ مناظرے ہوتے رہتے تھے،

اس زمانہ میں سید پور غازی پور کے خاندان کا ایک پیر روشن ضمیر الہ آباد کے ایک دائرہ کا قطب تھا یعنی شیخ محمد یحییٰ المعروف بہ شاہ خوب اللہ الہ آبادی متخلص بزائر، حافظ صاحب نے ان کے دست مبارک پر نقشبندیہ طریقہ میں بیعت کی، شاہ صاحب کو اپنے اس مرید پر ناز تھا، فرماتے تھے، کہ تصوف اور علم کا یہ اجتماع میر سید شریف جرجانی اور خواجہ علاء الدین عطار کے بعد ابھی ہوا ہے،

حافظ صاحب نے ۱۱۳۳ھ میں بنارس میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے،

(مآثر الکرام جلد دوم ص ۲۱۲ وسبحۃ المرجان ص ۸۲)

آٹھ نو برس ہوئے کہ راقم کو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس بنارس کے موقع پر بنارس جانے کا اتفاق ہوا اس تقریب کو غنیمت جان کر شہر کے مقبروں اور گورہائے غریباں کی بھی زیارت کی، اسی سلسلہ میں حافظ امان اللہ صاحب مرحوم کے مدرسہ و خانقاہ کا بھی پتہ لگا، اور اسکی زیارت کی، اور پھر ان کے بزرگون کے مقبرہ تک بھی گیا، اور زمانہ کے دست برد سے جو نقوش باقی رہ گئے تھے، ان کو پڑھنے کی توفیق ملی،

حافظ صاحب کی خانقاہ میں جاکر حافظ صاحب کے سلسلۂ اولاد کے بعض افراد سے ملاقات ہوئی جن سے معلوم ہوا کہ حافظ صاحب کی جسمانی یادگاروں کا سلسلہ اب تک باقی ہے، اودھ کی نوابی کے زمانہ میں جن شرفا نے شیعیت قبول کر لی، ان میں ایک یہ خاندان بھی ہے، خاندان کے بعض افراد گو اس وقت سرکار انگریزی میں اچھے عہدوں پر سرفراز تھے، مگر علم و عمل کی برکت

سے تقریباً محرومی ہی؛

ایک مختصر سی مسجد و خانقاہ دیکھی جس کے سائبان کی دیوار پر ایک کتبہ لگا ہی، اس کتبہ سے یہ معلوم ہوا کہ حافظ صاحب کے والد مولینا نور اللہ عالم شریعت اور عارف طریقت دونوں تھے، شاہ عالمگیر کے زمانہ میں وہ بنارس کے مفتی تھے، اور جہاں یہ مسجد و خانقاہ بنی تھی، وہاں پہلے کوئی بتخانہ تھا جسکی جگہ پر یہ نئی تعمیر ہوئی، مسجد کا کتبہ یہ ہے:۔

فول وجھک شطر المسجد الحرام ۱۰۸۵ھ

خانقاہ کی دیوار پر کتبہ یہ ہے،

زحکم شاہ سلطان شریعت	دلیل زہد برہان طریقت
شہاب آسمان سرفرازی	محمد شاہ عالمگیر غازی
سر اصنام و بت خانہ شکستہ	ظہور مسجد دلخواہ گشتہ
باستصواب نور اللہ مفتی	غلام درگہ پیران چشتی،
بنا ے خانقاہے ہست پیدا	ز دولت خانۂ تاریخش ہویدا
	۱۰۹۶ھ

اللہ محمد ابوبکر عمر عثمان علی،

اس سے معلوم ہوا کہ مسجد کی بنیاد ۱۰۸۵ھ میں پڑی، اور خانقاہ کی تعمیر ۱۰۹۶ھ میں ہوئی، شہر سے باہر ایک گنبد کے اندر ان بزرگون کا مزار ہے، اس میں تین قبریں ہیں، ایک مفتی نور اللہ صاحب کی اور دو ان کے دو بیٹوں حافظ امان اللہ اور حافظ دوست محمد کی، گنبد کے اوپر حسب ذیل اشعار ثبت ہیں، جن میں بعض حروف ایسے مٹ گئے کہ مجھ سے پڑھے نہیں گئے،

چشم بکشا . . ور و بر روضۂ دوست	ہر چہ بینی بدان کہ مظہر اوست
درحقیقت دل است روضۂ دوست	ہر کہ عاشق گرفت دوست از دوست

روضۂ چشم کن صفاسے دوست | اوست در ہر مقام وخلق از دوست
صاف کن روضۂ دلِ خود دوست | صوفی روضۂ دلِ خود دوست

دیگر

نماند کسے دائم اندر جہان | ندارد بقا گنبدِ آسمان
بغلطند زیرِ زمین مہوشان | بخاک اندر آیند کیخسروان
گداو شہ و قانع و تاجران | گذشتند چوں برق دیگ ماں زن
بسا بادشاہے سکندر نشان | نشانش نماند درین کاروان
درین دہر ہر کس کہ آمد دوان | بدنیا کجا یافت آرام جان
چہ شد آسمان ....سرا | چہ..............این گلستان
نہ آن شہ سواران لشکرکشان | نہ آثار ترکش نہ تیر و کمان
کجا خاک و کو باد و آب روان | کجا آتش و گرمی ریگ وان
نہ افلاک پائندہ و پاسبان | نہ ردی زمین ہمچنان جاودان
.........کند.........شان | مگر است.......کل یوم شان
بنا کرد حافظ درین بوستان | ز بہرِ خدا مرقدِ دوستان
مورخ با مدادِ غیب اللسان | نکو یافتہ روضۂ طالبان

۱۱۱۴ھ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ صاحب شاعر بھی تھے، اور حافظ تخلص کرتے تھے، ۱۱۱۴ھ
...ں یہ مقام حافظ صاحب کا باغ تھا، جہاں یہ روضہ تعمیر کیا تھا،

بہرحال ان کتبوں سے یہ پتہ چلا کہ حافظ صاحب کے والد بنارس میں شاہ عالمگیر کی طرف سے مفتی تھے، ۱۰۰۰ھ میں انھوں نے اپنی مسجد اور ۱۰۹۶ھ میں خانقاہ بنائی، اور ۱۱۱۴ھ میں حافظ صاحب نے یہ روضہ تعمیر کیا، جس کا مطلب یہ ہے، کہ اس زمانہ میں ان کے والد ماجد کا انتقال ہو چکا تھا، اور ۱۱۳۳ھ میں خود حافظ صاحب نے وفات فرمائی، اس لئے ۱۰۰۰ھ سے لے کر ۱۱۳۳ھ تک یعنی کم از کم چھپن برس تک ان باپ بیٹوں کے فضل و کمال کے انوار دنیا میں چمکتے رہے،

تلخیص و تبصرہ

سگمنڈ فرائڈ

گذشتہ ستمبر میں آسٹریا کے مشہور محلل نفسی سگمنڈ فرائڈ کا پچاسی سال کی عمر میں لندن میں انتقال ہو گیا، نفسیات میں اس کا موضوع جنسی جبلت تھا، پچاس برس تک وہ اس پر غور و فکر کرتا رہا، شروع میں اوس نے پانچ سال تک وائنا میں عصبی المزاجی پر تحقیقات کی، ۱۸۹۶ء میں جب اوس نے اپنے لکچروں میں یہ دعویٰ کیا کہ عصبی المزاج اشخاص کے مرض کا سبب ان کی جنسی جبلت میں پایا جاتا ہے، تو عام طور سے اسے مضحکہ انگیز سمجھا گیا، لیکن عصبی المزاجی کے مریض رفتہ رفتہ سگمنڈ فرائڈ کی طرف رجوع کرنے لگے، ان میں بعض ایسے تھے، جو جانوروں سے غیر معمولی طور سے خوفزدہ رہتے تھے، یا گفتگو میں ہکلاتے تھے، یا تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اپنے ہاتھوں کو پانی سے دھوتے رہتے تھے، یا سر کے درد یا کسی اور بیماری میں مدتوں سے مبتلا تھے، یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مفلوج تھے، ان میں سے اکثر جنون کی حد تک پہونچ چکے تھے، فرائڈ ان تمام امراض کا علاج نفسیاتی طریقہ سے کرنا چاہتا تھا، مگر اس سے اس کو اب تک واقفیت نہیں ہوئی تھی،

اس قسم کے امراض کا علاج عموماً مصنوعی نیند کے ذریعہ سے کیا جاتا تھا، ایک دن فرائڈ کے ایک دوست ڈاکٹر جوزف بروار نے اس سے اپنی ایک مریضہ کا واقعہ بیان کیا، مریضہ کی عمر اکیس سال تھی، اس کا باپ ایک مہلک مرض میں مبتلا تھا، وہ اسکی تیمارداری کرتی تھی، کہ ایک دن اس کے داہنے

ہاتھ اور دونوں پیروں پر فالج گر گیا، ڈاکٹر مذکور نے مصنوعی نیند کی حالت میں مریضہ سے مختلف سوالات کئے، اس سے مرض کے تمام علامات ظاہر ہوتے گئے، تیمارداری کے زمانہ میں لڑکی نے اپنی بہت سی خواہشون کو غیر سنجیدہ، غیر اخلاقی، اور خود غرضانہ سمجھ کر دبا رکھا تھا، ان میں سے ہر خواہش مرض کا سبب ثابت ہوئی، مثلاً ایک شام کو وہ اپنے باپ کے پاس بیٹھی تھی، کہ پڑوس کے مکان سے ناچ کے باجہ کی آواز سنی، اُس کے دل میں ناچ میں شریک ہونے کی خواہش پیدا ہوئی لیکن اس نے اس خواہش کو دبا دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ ناچ کے باجہ کی آواز سنتی، تو زور سے کھانسنے لگتی، اس واقعہ کا حیرت انگیز حصہ یہ ہے، کہ جب مریضہ کو اپنے مرض کے اسباب اور اسکی نوعیت سے واقفیت ہوئی، تو اس کے سارے امراض جاتے رہے،

فرائڈ کو اس واقعہ سے بڑی دلچسپی ہوئی، اور وہ اپنے ڈاکٹر دوست کے ساتھ کام کرنے لگا، وہ بھی عصبی المزاج اشخاص سے مصنوعی نیند میں مختلف قسم کے سوالات کر کے نفسیاتی نتائج پر پہنچنے کی کوشش کرتا تھا، اور اس نے دبے ہوئے جذبات اور خواہشوں کے ازالہ کی صورتوں پر غور وتحقیقات شروع کی،

اس کی تحقیقات پر اعتراضات ہونے لگے، اوس وقت ڈاکٹر مذکور نے فرائڈ کے ساتھ کام کرنا چھوڑ دیا، مگر فرائڈ برابر اپنے مریض کے بھولے ہوئے خیالات اور دبے ہوئے جذبات کو معلوم کرنے کے طریقوں پر غور کرتا رہا، ایک دن اس کے ایک مریض نے اپنی مصنوعی نیند کے سوال وجواب کو لفظ بلفظ دہرا دیا، اس سے فرائڈ کی تحقیقات کی نوعیت بالکل بدل گئی، اُس نے مصنوعی نیند کے طریقہ کو چھوڑ کر مریضوں سے براہ راست گفتگو کرنا زیادہ بہتر اور مفید سمجھا، وہ مریض کو اپنے دفتر میں لٹا دیتا، اور اس کے تمام افکار وخیالات کو معلوم کرنے کی کوشش کرتا، مریض شروع میں چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر کرتا، پھر رفتہ رفتہ وہ اپنی گذشتہ زندگی کے بھولے ہوئے واقعات کو ازسر

فرائڈ اپنے نکتہ رس ذہن اور نفسیاتی تجزیہ کے ذریعہ واقعات کو ترتیب دے کر مرض کی نوعیت کو سمجھا،

عصبی المزاج اشخاص کی ایک بڑی تعداد کو دیکھنے کے بعد فرائڈ اس نتیجہ پر پہنچا ہے، کہ ان کے مرض کا واحد سبب ان کی جنسی پراگندگی ہے، جو محض ناخوشگوار ازدواجی زندگی اور ناکامیاب محبت ہی کی وجہ سے نہیں ہوتی ہے، بلکہ بچپن کے اور بہتیرے واقعات بھی اس کا سبب ہوتے ہیں چنانچہ فرائڈ نے اپنے نظریہ کی تشریح کے لئے دو اصطلاحیں وضع کی ہیں، (Oedipus Complex اور libido) libido لاطینی لفظ ہے جس کے معنی "جنسی خواہش" کے ہیں، Oedipus یونانی قصوں میں تھیبس کا بیٹا بتایا جاتا ہے، اس نے اپنے باپ کو قتل کرکے ماں سے شادی کر لی تھی،

فرائڈ کا نظریہ یہ ہے کہ انسان کی سب سے زبردست قوت اسکی جبلت جنسی ہے، لڑکپن میں اس کا اظہار انگوٹھا چوسنے، کھانے اور جسم سے فضلہ کے اخراج کے ذریعہ سے ہوتا ہے، آگے چل کر یہ جبلت یا تو شادی کے ذریعہ ایک دوسری ذات میں منتقل ہو جاتی ہے، یا غلط راستہ پر پڑ کر ناروا صورت اختیار کر لیتی ہے، یا لطیف اور بلند ہو کر تکوینی قوتوں کا باعث ہوتی ہے، فرائڈ کا خیال ہے کہ کسی ملک کا آرٹ، علم اور موسیقی وغیرہ اسی وقت ترقی کر سکتے ہیں، جب اسکے افراد کی جنسی جبلت کی پست سطح کو بلند کر دیا جائے،

اسی جبلت کی بنا پر بعض اوقات لڑکے اپنی ماں سے غیر معمولی محبت اور باپ سے نفرت کرتے ہیں جس کو فرائڈ اڈیپس گرہ (Oedipus Complex) کہتا ہے، کبھی باپ کے ساتھ محبت بھی برقرار رہتی ہے، لیکن اندرونی طور پر بچوں کے دلوں میں باپ سے رشک و حسد ہوتا ہے، اسی جبلت کے ماتحت لڑکیاں باپ سے زیادہ اور ماں سے کم محبت کرتی ہیں، بچپن

کے یہ ذہنی رجحانات بلوغ میں دوسری طرف منتقل ہو جاتے ہیں، مگر جو کمزور طبائع ان پر غالب نہیں ہوتے، وہ جنسی خواہشوں کی بے راہ روی سے عصبی المزاجی کے شکار ہو جاتے ہیں،

جنگ عظیم سے پہلے وائنا میں جہاں ہر قسم کی آزادی حاصل تھی، فرائڈ کے نظریوں کا مذاق اڑایا گیا، اطبا نے اسکے خلاف احتجاج کیا کہ اس نے جنسی جبلت کو غیر معمولی اہم بنا کر بچپن کی معصومیت کے خوشگوار تخیلات کو درہم برہم کر دیا ہے، اور اولاد و والدین کی پر کیف محبت و شفقت کی خواہ مخواہ عیب جوئی کی ہے، لیکن جنگ کے بعد فرائڈ کے نظریہ سے عام دلچسپی پیدا ہو گئی، اسکی اصطلاحات کا حوالہ کثرت سے آنے لگا، بعض حلقوں میں فرائڈ کا نظریہ تعیش پسندی کا اجازت نامہ سمجھا گیا، مگر فرائڈ کا نظریہ ہرگز اس کا حامی نہیں، وہ تمدنی زندگی کے لئے تہذیب نفس کو بہت ضروری سمجھتا ہے، اور جنسی خواہشات کے نامناسب ضبط اور اس کی بے جا آزادی میں ایک درمیانی راستہ نکالنا چاہتا ہے،

فرائڈ کے نظریہ کی حامی اور مخالف دونوں جماعتیں پیدا ہو گئی ہیں، حامیوں کی تعداد ممالک متحدہ امریکہ میں زیادہ ہے، مگر اس میں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں، جنکو فرائڈ کے نظریہ سے پورا پورا اتفاق نہیں، وہ جنسی جبلت اور اڈیپس گرہ کو اتنی اہمیت نہیں دینا چاہتے ہیں، بلکہ ان کا خیال ہے، کہ جنسی خواہشوں سے زیادہ، سوسائٹی اور معاشرت شخصیت کو مجروح کرتی ہیں، چنانچہ زیورچ کے مشہور ماہر نفسیات کارل جنگ نے فرائڈ کے نظریہ سے منحرف ہو کر نیم مذہبی طریقہ علاج" کی تلقین کی، الفرڈ ایڈلر نے فرائڈ کے نظریہ پر تنقید کرتے ہوئے دعوی کیا، کہ انسانی طبائع کا سرچشمہ جنسی خواہش نہیں، بلکہ جذبۂ برتری ہے، عام طور سے جسمانی کمزوری یا بزرگوں کی سختی اور دباؤ سے ان میں کمتری کا احساس پیدا ہو جاتا ہے، مگر اسی احساس کمتری کے ذریعہ کمزوری کو قوت اور کمی کو زیادتی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے، مثلاً ڈیموستھینیز ہکلا اور بیتھوون بہرا

غا، ان دونوں میں کمتری کا احساس پیدا ہوا، اور انھوں نے اُسے دور کرنے کی اتنی کوشش کی،
ڈیموستھینیز کی خطابت آج تک مشہور ہے، اور بیتھووَن کا موسیقی کا کارنامہ اب تک فخر سے بیان
کیا جاتا ہے،

گذشتہ سال جب نازیون نے وائنا پر قبضہ کیا تو فرائڈ کی ساری ملکیت ضبط کرلی گئی اس
مانہ مین اسکے جبڑے میں سرطان ہوگیا تھا، وہ آخری عمر میں اپنے وطن کو چھوڑنا نہ چاہتا تھا،
لیکن مجبوراً اُسے چھوڑکر لندن میں پناہ لینی پڑی، یہاں اس نے بڑی پرسکون زندگی بسر کی،
رف خطوط کے جواب دیتا تھا، اور کبھی کبھی پرانے مریضوں کو کچھ ہدایت دے دیا کرتا تھا، لیکن
س کی زندگی کے دن پورے ہوچکے تھے، چنانچہ گذشتہ ستمبر مین وہ اس دنیا سے چل بسا،
ذشتہ سولہ سال سے اسکی صحت اچھی نہ تھی، اس مدت میں اسکے پندرہ آپریشن ہوئے، مگر اپنی تکلیف
کے متعلق کبھی ایک لفظ زبان پر نہ لایا، اور برابر مسرور و مطمئن نظر آتا تھا،

اس جلاوطنی کے زمانہ مین اُس نے ایک کتاب "موسیٰ اور توحید" لکھی جس میں یہودیون کی
رتخ زوایات وقصص پر نظر ڈال کر یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہودی مذہب کے پیغمبر حضرت موسیٰ
لیہ السلام یہودی (اسرائیلی) نہ تھے، بلکہ مصری تھے، فرائڈ کا بیان ہے، کہ اگر یہ دعویٰ تسلیم
کر لیا جائے، تو پھر یہودیون کی تاریخ نفسیاتی طور سے بالکل واضح اور صاف ہوجاتی ہے،
گر حضرت موسیٰ مصری تھے، تو وہ موحد تھے، کیونکہ امن ہوٹپ چہارم کے زمانہ میں مصر میں توحید
ستی شروع ہوئی، اس نے تمام مقامی دیوتاؤں کو نیست و نابود کر کے اپنے ملک میں توحید کو
ائج کیا، لیکن اسکے مرنے کے بعد توحید کو فروغ نہ ہوا، اور پھر پرانے دیوتاؤں کی پرستش شروع
ہوگئی، صرف ایک محدود حلقہ مین توحید باقی رہ گئی، اگر حضرت موسیٰ مصری تھے، تو وہ اسی محدود
حلقہ سے تعلق رکھتے تھے، امن ہوٹپ کی وفات کے بعد طوائف الملوکی کے دور میں حضرت

موسیٰ علیہ السلام غلام یہودیوں کو اپنا پیرو بنا کر ان کو مصر سے باہر لے گئے، اور انھیں قانون رسم و رواج اور معاشرتی نظام کی تعلیم دی۔ حضرت موسیٰ تند مزاج، سرگرم، لائق اور حوصلہ مند مصری تھے، چنانچہ فرائڈ اس نتیجہ پر پہونچا ہے، کہ یہودیوں نے آخر میں حضرت موسیٰ کو قتل کر دیا لیکن ان کے قتل کے بعد توحید باقی رہی، سچائی، عدل، اور انصاف کا رواج ہوا، بتوں، سحر، جادو، اور دیوتاؤں سے عقیدت ختم ہوگئی، مگر یہودیوں کے دماغ پر اپنے پیغمبر کے قتل کا جرم ایسا محیط رہا، کہ نفسیاتی طور سے ان کا ذہن ہمیشہ پراگندہ اور منتشر رہا، ان کے ذہن کی یہ ژولیدگی اور پراگندگی اسی وقت جا سکتی ہے، جب وہ اپنے اس جرم کے ارتکاب کا صاف صاف اعتراف کریں،

فرائڈ کا خیال ہو کہ یہودیوں سے جرمنوں کی نفرت کی وجہ ان کی توحید سے برگشتگی ہی جرمن عیسوی مذہب کے پیرو ضرور ہیں، مگر ان کو جبر و اکراہ سے عیسائی بنایا گیا تھا، جس کے اثرات ان کے افعال میں غیر شعوری طور پر اب تک نمایاں ہیں اور عیسائی مذہب سے ان کی مخفی برگشتگی یہودیوں کے سامی اور موحدانہ مذہب سے نفرت میں منتقل کیجا رہی ہے،

فرائڈ کے منطقیانہ دلائل، تاریخی واقعات اور انسانیاتی نتائج میں خامیاں ہیں لیکن اس کتاب سے خاص دلچسپی لی جا رہی ہے، کیونکہ فرائڈ نے قوموں کی تحلیل نفسی کرکے بعض عجیب و غریب تاریخی نظریے پیش کئے ہیں،

"ص ع"

خوف اور بچے

خوف ایک ایسا تہیج ہے، جو انسانی نسل کی بقا کے لئے لازمی ہے، کیونکہ جو افراد اپنے سے برتر قوتوں کے خوف سے بھاگ کر کہیں پناہ گزین ہو گئے، ان ہی سے انسانی نسل پھیلی،

ابتدائی زمانہ میں جن جن چیزوں سے انسان ڈرا کرتا تھا، ان میں سے بہتیری چیزیں اس زمانہ میں ڈرنے کی نہیں رہ گئیں، لیکن کچھ ایسی چیزیں بھی ہیں جن سے گذشتہ زمانہ کے لوگ خوف نہ کھاتے تھے، لیکن اب ان سے عام طور سے لوگ ڈرتے ہیں، اور اس خوف کو اپنے بچوں میں منتقل کرتے رہتے ہیں،

بچہ جب پیدا ہوتا ہے، تو وہ طبعاً کسی چیز سے نہیں ڈرتا، مثلاً وہ آگ یا شمع کی لو کو ہاتھ سے پکڑنے کی کوشش کرتا ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے، کہ اس کے دل میں جلنے کا ڈر مطلق نہیں ہوتا، اس کو رفتہ رفتہ معلوم ہوتا ہے، کہ کون کون سی چیزیں ڈرنے کی ہیں، مگر بعض غیر معمولی ممتا والدین اور غیر ذمہ دار اور کاہل اساتذہ ان چیزوں کی فہرست اتنی طویل کر دیتے ہیں، کہ بچوں کی ذات اور ذہنی نشو و نما کو سخت نقصان پہنچتا ہے، بھوت پریت، کتے، پولیس، مردے، قبرستان اور تاریکی وغیرہ کا خوف ان پر کچھ ایسا طاری ہو جاتا ہے کہ ان چیزوں کا عجیب و غریب تخیل ان کے سامنے رہتا ہے،

بچوں کی زندگی میں خوف ایک بہت ہی ہولناک اور خطرناک چیز ہے، جو کسی طرح ان کے دلوں میں پیدا نہ ہونا چاہئے، خوف سے بچے ڈرپوک اور بزدل ہو جاتے ہیں اور ان کی طبیعت سے اولوالعزمی اور حوصلہ مندی جاتی رہتی ہے، اور آگے چل کر وہ زندگی میں کوئی کیف اور مزہ نہیں پاتے ہیں، چنانچہ سن بلوغ میں جب ان کو نوبت، بے روزگاری، بیماری یا عزیزوں کی موت، یا لوگوں کی نکتہ چینی سے سابقہ پڑتا ہے تو اس وقت ان کو اپنی زندگی ایک ناقابل برداشت بار معلوم ہوتی ہے،

عام تجربہ یہ ہے کہ جب ایک بار خوف جاگزین ہو جاتا ہے، تو پھر اس سے زندگی بھر چھٹکارا پانا مشکل ہو جاتا ہے، دماغ کی ساری توجہ خوف ہی کی طرف مبذول رہتی ہے، مثلاً ایک مقرر اپنے سامعین کی نکتہ چینی کے خوف سے اپنی تقریر میں غلطیوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن اس سے غلطیوں کا ارتکاب خواہ مخواہ ہو جاتا ہے، یا ایک شخص دریا کے ساحل پر کھڑے

ہونے سے ڈرتا ہے، لیکن احتیاط کے باوجود اس کا پاؤں کنارہ سے پھسل جاتا ہے،

اسی طرح جب بچوں کو اساتذہ مار مار کر حساب سکھانے کی کوشش کرتے ہیں، تو ان کی ساری توجہ حساب کے سوالات حل کرنے کے بجائے مار کی طرف رہتی ہے، اکثر والدین اور اساتذہ اپنی غیر معمولی سختی، تنبیہ، اور تادیب پر فخر کرتے ہیں، مگر بچوں کی تربیت میں یہ ذرائع اچھے نہیں کہے جا سکتے، کیونکہ وہ سزا کے خوف سے ان چیزوں کی طرف بھی مائل نہیں ہوتے، جو ان کی شخصیت کی نشو و نما کیلئے ضروری ہیں، یہ ممکن ہے کہ والدین اور اساتذہ کے خوف سے وہ بچے چوری کرنا، جھوٹ بولنا اور دھوکا دینا چھوڑ دیں، مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ ایمانداری، سچائی اور اخلاص کے فریفتہ ہو جائیں، بلکہ اکثر اس کا ردِ عمل یہ ہوتا ہے، کہ وہ جھوٹ چوری اور دھوکہ بازی کو والدین اور اساتذہ سے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں، تجربہ سے معلوم ہوا ہے، کہ چھتر فی صدی سات برس کے نیچے جھوٹ بولا کرتے ہیں اور صرف اس لئے کہ وہ جوانوں کی دنیا میں اپنے کو غیر محفوظ اور بے حامی و مددگار سمجھتے ہیں، اور ان بزرگوں کا جبر اور دباؤ جتنا زیادہ بڑھتا جاتا ہے، اتنا ہی ان میں جھوٹ بولنے کی عادت ترقی کرتی جاتی ہے، ذمہ دار والدین اور اساتذہ کا یہ فرض ہے کہ وہ بچوں کا ماحول ایسا خوشگوار رکھیں کہ ان کو جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی نہ پیش آئے اور اگر ماحول کے خوشگوار ہونے کے باوجود وہ جھوٹ بولتے ہوں تو غیر شعوری طور پر ان میں سچائی کا احساس خود بخود پیدا ہو جائے گا، جو زجر و توبیخ سے پیدا کئے ہوئے احساس سے زیادہ مفید اور پائدار ثابت ہوگا،

"ص ۔ ع"

مقالاتِ شبلی حصہ ہشتم مولینا کے قومی اور اخباری مضامین کا مجموعہ جو الندوہ، مسلم گزٹ اور دوسرے رسائل و اخبارات سے یکجا کئے گئے، ضخامت ۲۰۳ صفحے، قیمت:- عہ

اخبار علمیہ

دمشق کے علمی ادارے

شام کے سیاسی انتشار اور بے چینی کے باوجود یہاں کی تمدنی اور علمی حالت روز افزوں ترقی پر ہے، دمشق، حلب، قدس اور بیروت میں بڑے بڑے علمی مرکز ہیں، دمشق کے علمی اداروں کے نام یہ ہیں، (۱) المجمع العلمی العربی (۲) دار الکتب الاھلیہ الظاھریہ (۳) دار الآثار (۴) الجمعیۃ السوریۃ،

شاہ فیصل مرحوم نے المجمع العلمی العربی کے نام سے ۱۹۱۹ء میں ایک علمی مجلس قائم کی تھی، اس کا مقصد علمی اور سائنٹفک مباحث پر مقالات اور کتابیں شائع کرنا اور کاروباری اور سائنٹفک اصطلاحات وضع کرنا ہے، اس مجلس کے نام سے ایک بلند پایہ علمی رسالہ بھی شائع ہوتا ہے، یہاں سے بہت سی قابل قدر کتابیں مثلاً جاحظ کی تہذیب الاخلاق، اموی خلیفہ ولید بن یزید کا دیوان اور قاضی تنوخی کی نشوار المحاضرہ کی آٹھویں جلد شائع ہو چکی ہیں، اس کے ارکین نے بھی مختلف موضوع پر متعدد کتابیں لکھی ہیں، مشہور امیر شکیب ارسلان کئی بلند پایہ کتابوں کے مصنف ہیں، ان میں ایک کا نام غزوات العرب فی اوربہ ہے، مجلس کے ناظم محمد کرد علی نے خطط الشام کے نام سے شام کی ایک مبسوط تاریخ لکھی جو شائع ہو چکی ہے، اس میں شام کی تاریخ جغرافیہ تمدن اور کلچر کی پوری تفصیلات ہیں، خیر الدین الزرکلی نے قاموس العالم کے نام سے تین جلد

میں ایک تذکرہ لکھا ہے، شیخ کامل الغزی نے حلب کی تاریخ تین جلدوں میں لکھی،

دارالکتب الاھلیہ الظھیریہ کے نام سے سلطان عبدالحمید نے ۱۲۹۰ھ میں ایک کتب خانہ قائم کیا، پرانے مدارس کی تمام کتابیں اس کتب خانہ میں منتقل کردی گئی ہیں، اس میں پانچ ہزار نادر مخطوطات ہیں،

المجمع العلمی العربی کے ساتھ ۱۹۱۹ء میں دارالآثار کے نام سے ایک میوزیم قائم ہوا تھا، اور پہلے المجمع العلمی ہی کی عمارت میں تھا، اب ایک نئی عمارت میں منتقل کردیا گیا ہے، اس عجائب خانہ میں اسلامی عہد اور اس سے پہلے کی بہت سی قدیم چیزیں محفوظ ہیں، اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے محل کے شکستہ آثار جو دمشق اور تدمر کے درمیان برآمد ہوئے ہیں، یہاں منتقل کردیئے گئے ہیں، اس محل کا طرز تعمیر دمشق کے موجودہ طرز سے بہت زیادہ مختلف نہیں،

الجمعیۃ السوریہ شام کی یونیورسٹی ہے جس کو شاہ فیصل مرحوم نے ۱۹۱۲ء میں قائم کیا تھا، یہاں صرف قانون، طب، دواسازی، دندان سازی اور نسوانی امراض کے علاج کی تعلیم دیجاتی ہے، تمام مضامین عربی زبان میں پڑھائے جاتے ہیں، یونیورسٹی کے اساتذہ نے اپنے اپنے فن پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں، شعبۂ طب کی طرف سے ایک رسالہ المجلۃ الطبیہ شائع ہوتا ہے،

جیکوب فرائدنتھل کی صدسالہ سالگرہ

گذشتہ جون میں جرمنی اور انگلستان میں جیکوب فرائدنتھل کی صدسالہ سالگرہ منائی گئی، جیکوب فرائدنتھل ۲۰ جون ۱۸۳۹ء کو ہینوور (جرمنی) کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا، اس کا باپ ایک معمولی دوکاندار تھا، جب فرائدنتھل کی عمر ۱۲ سال کی ہوئی تو اس کے باپ نے اس کو دوکان پر بٹھانے کی کوشش کی، مگر دوکانداری سے اس کو کوئی دلچسپی نہ ہوئی، اس لئے مجبوراً اسکو برسلو کے ایک یہودی اسکول

مین داخل کر دیا گیا، جہاں وہ ۱۸۶۲ء تک لائق اساتذہ کی نگرانی مین تعلیم پاتا رہا، اسی زمانہ مین اس نے عبرانی اور قدیم یونانی و لاطینی ادبیات کا مطالعہ کیا، اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ گوٹنجن گیا، یہاں اس نے مشہور فلسفی لاٹز کی زیر نگرانی فلسفہ پڑھنا شروع کیا، اور ارسطو کے فلسفہ پر ایک مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی، اسی اثنا مین اس نے خدا سے متعلق یونانی اور عبرانی تخیلات پر مختلف مضامین لکھے، الگزنڈر کے مذہبی فلسفہ اور ازمنہ وسطیٰ کے فلسفہ پر بھی اس کی تحقیقات شائع ہوئین،

یونیورسٹی کی تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ برسلو کے اسکول مین استاذ مقرر ہوگیا، پھر برسلو یونیورسٹی مین لکچرر ہوا، اس زمانہ مین کسی جرمن یونیورسٹی مین کسی یہودی کا پروفیسر مقرر ہونا آسان نہ تھا لیکن وہ ۱۸۸۸ء مین برسلو یونیورسٹی کا پروفیسر مقرر ہوا،

پروفیسری کے زمانہ مین فرائڈنتھل نے اسپنوزا پر تحقیقات کرنا شروع کی، اسپنوزا پر اس کی پہلی کتاب "اسپنوزا اور اصول متکلین" ۱۸۸۸ء مین شائع ہوئی، ۱۸۹۵ء مین اس نے ایک طویل مقالہ "اسپنوازم کی تاریخ" کے عنوان سے جیواش کوارٹلی ریویو مین لکھا، اس کے بعد برلن اکادمی کیطرف سے اسپنوزا کی سوانح اور تصانیف پر باضابطہ تحقیق کا کام اس کے سپرد ہوا، اس سلسلہ مین اس نے انگلستان، ہالینڈ اور دوسرے مقامات کے کتب خانون کی سیر کی، اور آخر ۱۸۹۹ء مین اپنی تحقیقات کو دو جلدون مین شائع کیا جس مین اسپنوزا کی تمام تصانیف پر بہت فاضلانہ نقد و تبصرہ اور حواشی ہین، پانچ برس کے بعد فرائڈنتھل نے اسپنوزا کی سوانح پر ایک علٰحدہ کتاب لکھی، جو اپنے موضوع کے لحاظ سے اب تک بے مثل سمجھی جاتی ہے، وہ "اسپنوزا کی تعلیم" کے نام سے ایک دوسری کتاب لکھ رہا تھا، کہ ۱۹۰۷ء مین اس کا انتقال ہوگیا، اس کی وفات کے بعد یہ نامکمل کتاب اڈٹ کرکے شائع کر دی گئی، یہ چھ سو صفحون کی ہے،

اسپنوزا پر بہت سی کتابین لکھی گئی ہین، مگر فرائڈنتھل کی تصانیف سب سے بہتر ہین، اس کی وجہ

یہ ہے کہ سپنوزا کو پوری طرح سے سمجھنے کے لئے جن باتوں کی ضرورت ہے، وہ فرائڈنتھل میں موجود تھیں، دونوں نے ایک ہی قسم کی زندگی بسر کی، دونوں نے قدامت پرست یہودی خاندان میں پرورش پائی، دونوں کی سیرت و کردار یکساں تھے، دونوں عبرانی، قدیم یونانی اور لاطینی ادبیات اور موجودہ افکار کے دلدادہ تھے، دونوں نے مشرقی اور مغربی، جدید اور قدیم اور مذہبی اور غیر مذہبی طرز افکار میں مماثلت پیدا کرنے کی کوشش کی، اس لئے فرائڈنتھل سے زیادہ بہتر اسپنوزا کا سوانح نگار اور اس کی تصانیف کا ناقد و مبصر اور کون ہو سکتا تھا،

فرائڈنتھل کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر رسالہ "فلسفہ" لندن میں پروفیسر اے۔ وُلف نے اس کے بارے میں لکھا ہے، کہ "جب تک زمانہ میں عمیق النظر مفکرین اور اعلیٰ کردار کی قدر باقی ہے فرائڈنتھل کی یاد بھی دلوں میں منقوش رہے گی"۔

دنیا کا سب سے بڑا موتی

کچھ سال پہلے بحر جنوبی میں جزیرہ پالاوان کے ایک ملاح کو مچھلی کے شکار میں اتفاقاً ایک موتی ملا تھا جسکو اُس نے اپنے علاقہ کے سردار کو پیش کیا، وہ اسکو ایک بیش قیمت ملکیت سمجھکر اپنے پاس رکھے ہوئے تھا کہ اس کا لڑکا ملیریا میں مبتلا ہو گیا، اس کی حالت روز بروز بدتر ہوتی جا رہی تھی کہ اتفاق سے وہاں ایک امریکن بحری سیاح آ پہونچا، جس کے علاج سے وہ لڑکا اچھا ہو گیا، علاقہ کے سردار نے اس صلہ میں امریکن سیاح کو موتی نذر کر دیا جسے وہ اپنے ساتھ ممالک متحدہ امریکہ لایا، اس موتی سے امریکہ مین غیر معمولی دلچسپی لیجا رہی ہے، اس کا وزن چودہ پونڈ ہے، اسکی لمبائی ۱۴۱ انچ چوڑائی ۵½ انچ، اونچائی ۱۲۰ انچ ہے، اسکی شکل انسان کے دماغ کی سی ہے، یہ دنیا کا سب سے بڑا موتی سمجھا جاتا ہے، اسکی قیمت ۱۳۰ لاکھ ڈالر سے زیادہ لگائی جاتی ہے، سائنس کے ماہرین کا خیال ہے کہ یہ موتی ۰۰ برس میں تیار ہوا ہوگا،

ص ع

مطبوعات جدیدہ

انگریزی کتابیں

Aspects of Iqbal مقالات یوم اقبال } مرتبہ الطاف حسین شوکت، بی اے سکریٹری اقبال کمیٹی، انٹر کالجیٹ مسلم

برادر ہڈ، لاہور، تقطیع متوسط، ضخامت ۲۰۱ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، قیمت

نادارد، پتہ قومی کتب خانہ ریلوے روڈ، لاہور

یہ کتاب ان اردو اور انگریزی مقالات کا مجموعہ ہے، جو ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو انٹر کالجیٹ مسلم برادر ہڈ لاہور کے یوم اقبال کے موقع پر پڑھے گئے تھے، انگریزی مقالات کے شروع میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی تمہید ہے، جو اپنے اختصار کے باوجود اقبال کے فلسفہ اور انکی شاعری کی ایک جامع تبصرہ ہے، ہر مقالہ پنجاب کے مشہور انگریزی اہل قلم جناب کے۔ اف، خان درانی کا مضمون "اقبال کا نظریہ خودی" ہے، جو اگرچہ اس موضوع کا سرسری خاکہ ہے، تاہم انگریزی میں اس عنوان پر اب تک جتنے مضامین لکھے گئے ہیں، ان میں یہ مقالہ قابل توجہ ہے، نکلسن نے اہل یورپ کو اقبال کے فلسفہ خودی سے روشناس کرنے کی کوشش کی تھی، مگر وہ ناکافی ہے، ضرورت ہے کہ ہندوستان کے ارباب قلم اقبال کے فلسفہ، ان کے پیام اور مشن کو پوری تشریح وتفصیل کے ساتھ اہل یورپ تک پہنچائیں، اس کی کو ایک حد تک جناب خواجہ غلام السیدین صاحب نے اقبال کا تعلیمی فلسفہ لکھ کر پورا کیا ہے، جن کا

ایک باب اقبال اور سیرت نیک کا تخیل" زیر نظر کتاب میں بھی شامل ہے، اقبال کے فلسفہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جا چکی ہے، لیکن بعض پہلو ابھی تشنۂ بحث ہیں چنانچہ خواجہ غلام السیدین صاحب نے اقبال کو ایک تعلیمی مفکر اور فلسفی کی حیثیت سے پیش کرکے اقبال کی شاعری میں ایک نیا موضوع پیدا کیا ہے، جو ان کے نزدیک نہ صرف اعلیٰ نظریہ اور فلسفہ ہے، بلکہ اپنے تعلیمی مطمح نظر اور نصب العین کے لحاظ سے قابل عمل بھی ہے، تیسرا مضمون جناب گربچن سنگھ ام۔ اے کا "اقبال کی شاعری میں انسان" کے عنوان سے ہے، اس میں براوننگ، خیام حافظ، اور غالب کے "انسان" کو پیش نظر رکھکر یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، کہ ان تمام شعرار کے مقابلہ میں اقبال کا "انسان" بہت بلند و برتر ہے، یہ مضمون گو مختصر ہے، مگر سلجھا ہوا ہے، چوتھا مضمون جناب میز الدین صاحب ایم اس و ان سی کا "اقبال کی شاعری میں مابعد الطبیعیاتی عنصر" پر ہے جس میں انسانی خودی اور معراج پر زمان مکان روح اور ارتقار روح کی روشنی میں سائنٹفک بحث کی گئی ہے، مقالہ نگار نے موضوع کی وسعت کا لحاظ کرکے اپنی تحریر کو صرف جاوید نامہ تک محدود رکھا ہے، مگر جو کچھ لکھا ہے غور و فکر سے لکھا ہے، آخری مضمون جناب اس ام۔ عمر فاروقی صاحب ام۔ اے کا "اقبال اور نتشے" پر ہے، جس میں خدا کے پرستار اقبال کا ملحد اور بے دین نتشے سے مقابلہ کرکے یہ دکھایا ہے کہ اقبال کے انسان کامل اور فوق البشر کا تخیل نتشے کے تخیل کا رہین منت نہیں، بلکہ اس کے خیالات مشرق کے فلاسفہ اور صوفیائے کرام محی الدین ابن العربی، ابن خلدون اور حضرت مجدد سرہندی سے ماخوذ ہیں،

اردو حصہ میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولینا عبد السلام ندوی، چودھری غلام احمد صاحب پرویز اور پروفیسر سید عابد علی صاحب عابد کے مقالات اہم اور مفید ہیں، "یوم اقبال" میں اگر اسی قسم کے مقالات پیش کئے جائیں، تو نہ صرف علم و ادب کی خدمت ہو، بلکہ اقبال کے فلسفہ کی بھی تشریح

ہوتی رہے گی، جس کے بعض پہلو اب تک پورے طور سے واضح نہیں ہو سکے ہیں،

انڈیا آفس لائبریری کیٹلاگ جلد دوم حصہ ششم | (انگریزی) مرتبہ اے، جے۔ اربری، لٹ ڈی، ضخامت ۱۱۵ صفحے، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، قیمت نہ دارد،

پتہ:۔ انڈیا آفس لائبریری لندن

یہ انڈیا آفس کی مطبوعہ فارسی کتابوں کی فہرست ہے، جس کو لائق فہرست نگار نے بڑی محنت اور کاوش سے مرتب کیا ہے، یہ فہرست علوم و فنون کے بجائے کتاب اور مصنف کے ناموں کے حروف تہجی کی ترتیب پر ہے، اس میں یہ التزام رکھا گیا ہے، کہ کتابوں کے نام کے ساتھ مصنف کے نام بھی دیدیے گئے ہیں، اور اس کے تحت میں ان کی تصانیف کا صرف ذکر کر دیا گیا ہے، پھر تہجی کی ترتیب کے سلسلہ میں ان کے ذکر میں جابجا مختصر نوٹ ہیں، اس سے فہرست گو طویل ہو گئی ہے، لیکن فہرست کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے بڑی آسانی پیدا ہو گئی ہے، کتابوں کے نوٹ میں مخطوطات کی طرح ان کی نوعیت اور موضوع پر بحث نہیں کی گئی ہے، بلکہ کتاب کا موضوع مصنف اور مطبع کے نام مختصر طور پر لکھدیے گئے ہیں، انڈیا آفس کے کتب خانہ میں ہندوستان کی ہر مطبوعہ کتاب کا ایک نسخہ سرکاری طور پر جاتا ہے، اسلئے فہرست میں ہندوستان کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد ایران اور دوسرے ممالک کی کتابوں سے زیادہ ہے، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے، کہ ہندوستان نے ایران سے زیادہ قدیم فارسی کی خدمت کی،

اسلامی فن خطاطی (*A monograph of Islamic-Calligraphy*) مصنفہ ام ضیاء الدین، ضخامت ۷۰ صفحے، تقطیع متوسط، کاغذ لکھائی چھپائی، عمدہ، قیمت نہ دارد، ملنے کا پتہ:۔ وشوا بھارتی بک شاپ ۲۱۰ کارنوالس اسٹریٹ کلکتہ،

یہ دلچسپ کتاب شانتی نکیتان بنگال سے وشوا بھارتی کے سلسلہ کی ساتویں کتاب ہے، اس کے مصنف ضیاء الدین مرحوم شانتی نکیتان میں اسلامی شعبہ کے لکچرر تھے، کتاب ۱۹۳۶ء میں لکھی گئی تھی، اس کے بعد ہی مؤلف نے انتقال کیا،

کتاب کی تمہید میں اسلامی فن خطاطی کے آغاز، اس پر سریانی اور مانی اثرات، پھر عرب، ایران اور اسپین میں اس کے کمال و عروج کا ایک سرسری لیکن پر از معلومات خاکہ ہے، اس کے بعد کوفی طرز خطاطی، اس کے مختلف اقسام اور اسٹائل اور ہر صدی میں اس کی تدریجی ترقی اور مختلف جگہوں اور عمارتوں پر لکھے ہوئے حروف پر فنی نقطۂ نظر سے نقد و تبصرہ ہے، اگلے باب میں باکمال خطاطوں کی علمی اور معاشرتی پوزیشن، سلاطین وقت اور ارباب علم کی نظروں میں ان کی وقعت پر بعض تاریخی واقعات پیش کئے گئے ہیں، ہندوستان میں شاہان تیموریہ کی خطاطی کی سرپرستی کا بھی اجمالی ذکر ہے، اس باب میں اس سے زیادہ تفصیلی بحث کی گنجایش تھی، آخری باب میں مختلف خطوط، نسخ، نستعلیق، ثلث، شکستہ، رقع، توقیع، ریحان، گلزار، طاؤس، منشور، محقق، بہار، ہلالی، بدر الکمال، ولایت اور طغریٰ وغیرہ کی ایجاد، اور ترقی پر مختصر لیکن جامع بحث ہے، کتاب میں کثرت سے خطاطی کے نادر نمونے دیے گئے ہیں، جن سے کتاب کی زینت اور اہمیت دوبالا ہوگئی ہے، خاتمہ پر ماخذوں کے سلسلہ میں کتابوں اور رسالوں کی ایک طویل فہرست ہے، جس سے مولف کی محنت، تحقیق اور وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے،

The voice of Omar Khayyam	مؤلفہ جمشید جی۔ ای۔ سکلتوالا۔ ضخامت ۹۲ صفحے، لکھائی چھپائی،

اور کاغذ عمدہ، تقطیع متوسط، قیمت مذکور نہیں، ملنے کا پتہ:۔ مسٹر جی ای سکلتوالا، لال گیرہ چیمبرز، ٹمرنڈ لین، فورٹ بمبئی،

مسٹر جمشید جی سکلتوالاان ارباب قلم میں ہیں جن کو عمر خیام سے عشق ہے، وہ خیام پر مختلف کتابیں لکھ چکے ہیں، زیر نظر تصنیف میں بھی خیام پر مختلف قسم کے چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں، اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ خیام پر مغربی اہل قلم اور اہل الرائے نے جتنے خیالات ظاہر کئے ہیں ان کو مولف نے علحدہ علحدہ عنوانات قائم کرکے اپنی توضیحات کے ساتھ جمع کر دیا ہے اس طرح فضلائے مغرب کے اقوال و آراء کی روشنی میں خیام کو سمجھنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے بعض حلقوں میں خیام ایک آزاد خیال، رند مشرب اور ملحد سمجھا جاتا ہے، مولف نے جابجا اسکی تردید کرکے دکھایا ہے، کہ وہ خداپرست صوفی، سنجیدہ فلسفی، ہیئت مفکر اور ماہر نجوم و ریاضی تھا،

کتاب کے شروع میں خیام نظام الملک، اور حسن بن صباح کی ہمدرسی کی داستان کو تاریخ و سنین کے لحاظ سے ناقابل قبول قرار دیا ہے اس سلسلہ میں تمام یورپین اہل قلم کی تحریریں مؤلف کے پیش نظر تھیں، لیکن ان کے ایک ہم وطن مصنف مولینا سید سلیمان ندوی کی تالیف "خیام" ان کے مطالعہ میں نہ آسکی، ورنہ اس داستان کی تردید اور خیام کو ایک فلسفی اور صوفی کی حیثیت سے پیش کرنے میں ان کے دلائل اور براہین کی نوعیت بالکل مختلف ہوتی، تاہم کتاب کے بعض مباحث مثلاً "عمر خیام اور جدید مفکرین" اور "عمر خیام بحیثیت مفکر اور فلسفی" پڑھنے کے قابل ہیں، اور مؤلف نے خیام کی شاعری کے روشن پہلوؤں کو دکھانے میں کافی مشقت اٹھائی ہے

اتحاد و عمل کی طرف دعوت | A call to unity and Action. | مرتبہ جناب عبدالجبار صاحب ضخامت ۲۱۲ صفحے

لکھائی چھپائی معمولی، تقطیع چھوٹی قیمت ندارد، ملنے کا پتہ عبدالجبار حنیفہ منزل، اجمیر،

اس رسالہ میں مولف نے اوامر و نواہی، عقائد اسلام، روزہ، حج، نماز، جہاد، انبیاء، حقوق والدین و حقوق نسوان وغیرہ کے متعلق قرآنی احکام منتخب کرکے ایک جگہ جمع کر دیئے ہیں کہ انگریزی

تعلیم یافتہ طبقہ کلام پاک کے ان احکام سے مستفید ہوسکے،

مؤلف کو عبد اللہ یوسف علی صاحب کا ترجمہ پسند ہے، اسلیے شروع سے آخر تک ان ہی کے ترجمے اور حواشی نقل کر دیے گئے ہیں، شروع میں سر سلطان احمد بیرسٹر ایٹ لا، پٹنہ کا دیباچہ ہے اسکے بعد مؤلف نے خود ایک طویل تمہید لکھی ہے، جس میں بعض غیر متعلق باتیں بھی آگئی ہیں، مؤلف کا خدمت دین کا یہ جذبہ لائق قدر ہے،

Flashlights On Islam | مصنفہ ڈاکٹر نجم الدین جعفری، ال ال ڈی، بیرسٹر ایٹ لا، ضخامت ۳۰ صفحے تقطیع چھوٹی لکھائی چھپائی

متوسط، قیمت ۸ ر ملنے کا پتہ :- منیجر آدمی پریس شملہ،

یہ کتاب نجم الدین صاحب جعفری کے چھوٹے چھوٹے انگریزی مقالات کا مجموعہ ہے جو بعض موجودہ مسائل پر خالص اسلامی نقطۂ نظر سے لکھے گئے ہیں، تحریر رواں اور سلیس ہے، مصنف کی وسعت نظر سے ہم کو مقالات میں اس سے زیادہ عمق اور جامعیت کی توقع تھی، جو غالباً اختصار کی وجہ سے پیدا نہ ہوسکی، اسکول اور کالج کے طلبہ کے لئے یہ رسالہ مفید ہے،

Friday Sermons (خطباتِ جمعہ) مترجمہ انعام اللہ خان بی اے ضخامت ۸۲ صفحے، لکھائی چھپائی معمولی، قیمت ندارد، ملنے کا پتہ جمعیۃ العلما ربرما ۲۱۲ مغل اسٹریٹ رنگون

زیر نظر رسالہ مولانا حافظ حکیم عبد اللہ رشید نواب کی صاحب پیش امام سورتی سنی جامع مسجد رنگون کے عربی خطبات کا انگریزی ترجمہ ہے، جن میں مسلمانوں کی موجودہ مذہبی، اخلاقی، معاشرتی، اور اقتصادی ضروریات پر قرآن اور حدیث کی روشنی میں خطبے ہیں، امید ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کو اس کی اشاعت سے فائدہ پہونچے گا،

(ص، ع)

دار المصنفین کی نئی کتابیں

تابعینؓ

علم وعمل اور مذہب و اخلاق میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ
تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے، اور صحابۂ کرام کے بعد ان ہی کی زندگی مسلمانوں کے لئے نمونۂ عمل تھی
اس لئے سیر الصحابہ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کر
لیا ہے، اس میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ، حضرت حسنؒ بصری، حضرت اویسؒ قرنی، حضرت امام زین العابدینؒ
حضرت امام باقرؒ، حضرت امام جعفرؒ صادق، حضرت محمد بن حنفیہؒ، حضرت سعید بن مسیبؒ، حضرت
سعید بن جبیرؒ، حضرت محمد بن سیرینؒ، حضرت ابن شہاب زہریؒ، امام ربیعہؒ رائی، امام مکحولؒ دمشقی
قاضی شریحؒ وغیرہ چھیانوے اکابر تابعینؒ کے سوانح ان کے علمی، مذہبی، اخلاقی اور عملی مجاہدات اور
کارناموں کی تفصیل ہے، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی، ضخامت ۵۶۰ صفحے، قیمت: للعہ

مختصر تاریخ ہند

ہمارے اسکولوں میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں ان کا لب ولہجہ دل آزاری اور تعصب سے
خالی نہیں ہوتا اور اس وجہ سے ہندوستان کی مختلف قوموں میں تعصب و بغض و عناد پیدا ہوجاتا
ہے، مولانا ابو ظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسوں اور طالب علموں کیلئے اس غرض سے لکھی ہے
کہ اس کا ہر بیان قومی تعصبات سے متاثر نہ ہو اور ہندو و مسلمان فرمانرواؤں نے ہندوستان کے
بنانے میں جو کام کئے ہیں وہ طالب علموں کو [illegible] معلوم ہو جائیں، ضخامت [illegible] صفحے، قیمت [illegible]

شذرات

خیر و برکت کا مہینہ اب ختم کے قریب ہے، دار المصنفین کی مسجد حسبِ دستور امسال بھی قرآنِ پاک کے نزول سے معمور رہی، اس سلسلہ میں ذکر کے قابل ایک رفیقِ دار المصنفین مولوی محمد یوسف صاحب عمری (دار السلام عمر آباد مدراس) کا محراب سنانا ہے، ان کو یہیں آکر حفظِ قرآنِ پاک کا شوق پیدا ہوا، اور اپنے عام روزانہ علمی مشاغل کے ساتھ اس مقدس فرض کو انجام دیا، اور آخر اس سال سب سے پہلی دفعہ انھوں نے پورے قرآن پاک کے سنانے کی سعادت پائی، والحمد للہ،

دار المصنفین اور مولانا شبلی مرحوم کی وفات پر امسال ۱۸ نومبر کو پورے پچیس برس گذر جائیں گے، بعض مخلص احباب کی تحریک تھی کہ اس موقع پر دار المصنفین کی نقرئی جوبلی منائیں، یا معارف کا ایک یادگار شبلی نمبر نکالیں، کچھ دنوں تک یہ تجویز خیال میں رہی، اور آخر جی نہ چاہا کہ پیروی عام کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ خیال پختہ ہو گیا کہ مولانا شبلی مرحوم کے سوانحِ حیات مکمل کر کے چھاپ دیئے جائیں، چنانچہ اس کام کو میں نے خود شروع کر دیا ہے، اور پورے جوش اور انہماک کے ساتھ یہ کام انجام پا رہا ہے، کوشش ہے کہ دسمبر تک اس کی پہلی جلد لکھ کر تمام ہو جائے،

کتاب کا نام **حیاتِ شبلی** ہوگا، اور دو جلدوں میں تمام ہوگی، پہلی جلد ان کی زندگی کے واقعات اور کارناموں پر ہوگی، اور دوسری ان کی تصنیفات کے تبصرہ پر، یہ پہلا موقع ہے کہ عصرِ جدید کے ایک ایسے عالم کے سوانحِ حیات مرتب ہونگے جس نے قدیم و جدید کو پیوند کرنے کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہے،

شوال سے دارالعلوم ندوہ کا تعلیمی سال شروع ہو جائیگا، یہ بات افسوس کے ساتھ دیکھی جارہی ہے کہ اعلیٰ گھرانوں سے عربی تعلیم بالکل فنا ہوگئی ہے، اور گویا مذہبی تعلیم اور مذہبی علوم کے زندہ اور باقی رکھنے کی خدمت کا سارا بوجھ غریبوں کے کندھوں پر رہ گیا ہے، کیا کھاتے پیتے گھرانوں نے امتِ محمدیہ کے دفتر سے اپنا نام کٹ لیا ہے، یا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ رزق کا دروازہ صرف رومن حروف کی تعلیم کے ذریعہ ہی کھل سکتا ہو، حالانکہ صاف نظر آرہا ہے کہ یہ جدید تعلیم اس دروازہ کے کھولنے سے بھی عاجز ہے،

مسلمان حیرت سے سنیں کہ ہمارے ہندو ہموطنوں کے سامنے اب یہ تجویز ہے کہ اسکول کے ابتدائی درجوں میں معمولی سنسکرت کی تعلیم لازمی کردیجائے، دوسری طرف ہم مسلمان ہیں کہ روز بروز اپنی مذہبی زبان سے دور ہوتے جاتے ہیں، سارے عربی مدرسوں کا جائزہ لے لیجئے، شاید ہی کسی دولتمند رئیس یا ایسے اعلیٰ شریف گھرانے کے لڑکوں کو آپ عربی تعلیم میں مصروف پائیں گے، اگر ایک دو ہوں بھی تو اُن کا شمار نہیں میں ہے،

تاریخ اسلام کا جو عظیم الشان سلسلہ دارالمصنفین میں لکھا جا رہا تھا اس کی پہلی جلد چھپکر شائع ہوگئی، اب اس کی دوسری جلد مطبع کو جارہی ہے، امید ہو کہ سنہ ۱۹۴۰ء کے آخر تک وہ بھی شائع ہوجائیگی، اسی کے ساتھ دولتِ عثمانیہ کی نہایت مکمل تاریخ جو زیر طبع تھی اس کی پہلی جلد بھی تیار ہوگئی ہو، ہماری زبان میں یہ پہلا موقع ہے کہ اسلام کی اس زندہ سلطنت کی کوئی مستند اور سنجیدہ تاریخ شائع ہو رہی ہو،

اس وقت دنیا جس کشمکش میں مبتلا ہے اس کی نسبت یہ کہنا چاہئے کہ یہ قوموں کے سیاسی بحران کا عہد ہو، اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یورپ کی اس تنگ قومیت کا نتیجہ ہے جس نے ہر انسانی نسل کو دوسری انسانی نسل کا دشمن بنا دیا ہے، اور یہیں سے اسلام کی اس عالمگیر اخوت کی قدر معلوم ہوگی

جس نے رنگ، نسل، خون، اور جغرافیہ کی تقسیموں کو انسانی حقوق کی تقسیم کا ذریعہ نہیں ٹھہرایا ہے،

روس اور جرمنی اپنے سیاسی اور اقتصادی مسلک کے لحاظ سے دو مختلف مذہب رکھتے ہیں اور ابتک ان دو مذہبوں کے ماننے والوں میں علانیہ اختلاف تھا، مگر یہ اختلاف اصول کی تبدیلی کے بغیر زمین کے حصوں کی تقسیم میں متحد ہوگیا، اب کیا ہمارے انجان نوجوان سوشیالسٹ بالشوازم اور ہٹلرازم کے درمیان تطبیق کی کوشش کرینگے،

لکھنؤ میں شیعہ سنی اختلاف جس نوبت پر پہنچ گیا ہے شاید یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچکر عارف روم نے ارشاد فرمایا ہے،

نورِ حق کے بر تو گردد منجلی
اے گرفتارِ ابوبکرؓ و علیؓ

اگر حقیقت میں سنیوں کو شیعوں کے فعل سے اسی قدر تکلیف ہو تو ان کا پہلا فرض یہ ہے کہ محرم کے ان تمام بدعاتِ سیئہ سے جو اسلام کی رسوائی کا باعث ہیں یک قلم الگ ہوجائیں، ورنہ یہ کیا ہے کہ شیعوں سے نفرت کرنا اور شیعیت کے مراسم خود ادا کرنا، جو باتفاقِ علماے سنت ناجائز اور ناروا ہیں، اور متعدد بار اسکے فتاوی شائع ہوچکے ہیں،

اسکے بجاے عوام کی دلچسپی اور فائدہ کیلئے ان تمام اکھاڑوں اور فوجی کرتبوں کی نمایش کو جس کا موقع محرم قرار دیا گیا ہو عیدین کے موقع پر رواج دینا چاہئے جو عین سنت اور صحابہ کرام کے مسلک کے مطابق ہو، اور جسکا اصطلاحی نام تقلیس ہو، عہدِ اول میں یہ تقلیس عیدین کے موقع پر کیجاتی تھی، صحابۂ کرام شریک ہوتے تھے، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ بیت کرام دیکھتے تھے، اور خوش ہوتے تھے،

مقالات

نفس اور جسم

از جناب خواجہ عبد الحمید صاحب ایم اے لکچرار فلسفہ گورنمنٹ کالج لائل پور

۱۔ نفس اور جسم، ذہن اور مغز، روح اور بدن، متضاد الفاظ سمجھے گئے ہیں، ان متقابل الفاظ کو ایک دوسرے کا نقیض سمجھا جاتا ہے، اور سننے والے کے دل میں فوراً یہ خیال آتا ہے کہ جسم اور مغز اور بدن انسان کے اس حصہ کے نام ہیں، جو فانی ہے کثیف ہے ثقیل ہے، آلائشوں سے پُر ہے، اور ایک قسم کا قید خانہ ہے جس میں عنصر حیات اپنی مختلف صورتوں میں بند کر دیا گیا ہے، اس کثیف اور فانی قید خانہ میں ہمارا ذہن، ہمارا نفس، اور ہماری روح کچھ عرصہ کے لئے بند کر دیے گئے ہیں، اور ایک خاص زمانہ کی بندش کے بعد انسان کے یہ غیر فانی حصے آزاد ہو جائیں گے، نفس اور جسم کا یہ تضاد اپنی وسعت میں انسان کے جملہ خیالات کو اس طرح گھیرے ہوئے ہے، کہ مذہب، فلسفہ، اخلاق، نفسیات اور معاشرت کے ہر پہلو اور ہر شعبہ میں اس کے اثرات نمایاں ہیں، اس تضاد نے ایک بدیہی حیثیت حاصل کر لی ہے اور بدیہیات کی طرح اسے عوام اور خواص بے چون و چرا تسلیم کر لیتے ہیں، ذیل کے مقالے میں اس مفروضہ تضاد پر صرف علمی حیثیت سے نظر ڈالی جائے گی، کہ یہ تضاد حقیقی ہے، یا نہیں، اس بحث میں اوس کی مذہبی، اخلاقی، اور معاشرتی حیثیتیں نظر انداز کر دی جائیں گی،

اس مسئلہ کے حل کے لئے ہمارے سامنے دو سوال ہیں، (۱) نفس اور جسم سے مراد کیا ہے؟

(۲) ان کا باہمی تعلق کیسا ہے؟

۲ - جدید سائنس نے یہ ثابت کر دیا ہے، کہ نظامِ عالم میں کوئی چیز ساکن محض اور غیر متغیر نہیں ہے جسے ہم ساکن اور غیر متغیر کہتے ہیں، وہ بھی درحقیقت اپنے اندر طرح طرح کے تغیرات چھپائے ہوئے ہے جنھیں ہم سائنس کے نازک آلات اور باریک بین مشاہدہ کے بغیر دیکھ نہیں سکتے، بعض اوقات تغیرات آپس میں ایک قسم کا باہمی توازن پیدا کر لیتے ہیں، اور یہ توازن سکون کی حالت میں ظاہر ہوتا ہے، حالانکہ وہ سکون حقیقی نہیں ہوتا، بعض اوقات یہ تغیرات اس قدر سست رفتار ہوتے ہیں، کہ ہم غلطی سے اُس شے کو غیر متغیر اور ساکن تصور کر لیتے ہیں، مثلاً اونچے اور برفانی پہاڑوں میں برفانی دریا (گلیشیر) اس قدر سست رفتار ہوتے ہیں کہ چوبیس گھنٹوں میں وہ صرف دو یا تین انچ آگے بڑھتے ہیں، ذی حیات اجسام میں تغیرات ہر لمحہ جاری رہتے ہیں، اور جب حیات کے ساتھ شعور کا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے، تو پھر اِن تغیرات کا ٹھکانا نہیں کسی لمحہ میں اپنی ذہنی کیفیت کا جائزہ لیجئے، کتنے خیالات آتے ہیں جاتے ہیں، کس قدر مواد احساسات کا آپ کے حواس آپ کو دیتے ہیں، وغیرہ وغیرہ،

۳- ہر تغیر ایک عمل ہوتا ہے اور ایسے عملوں کی کئی قسمیں ہیں،

(۱) بعض عمل طبیعی ہوتے ہیں، مثلاً ہوا کی گردش، پانی کا ڈھلوان کی طرف بہنا، دھوئیں کا اوپر کی طرف اڑنا، وغیرہ انسان کے جسم کے اندر بھی ایسے عمل جاری ہیں، مثلاً دل کے مرکزی انجن سے عروق و شریان میں خون کا دوران پھیپھڑوں کے اندر ہوا کا داخل ہونا، اور خارج ہونا، وغیرہ،

(۲) بعض عمل کیمیادی ہوتے ہیں، مثلاً اشیا کا آگ میں جلنا، دیگچی میں مختلف چیزوں کا پکنا، اور مل کر نئی چیز یعنی سالن کا تیار ہونا، وغیرہ، اسی طرح انسان اور جانوروں کے معدے میں کھائی ہوئی غذا کا مختلف اندرونی رطوبتوں میں مل کر اور اندرونی گرمی کی مدد سے تحلیل ہو کر نئی رطوبتیں، یا خون یا مواد فاسد

وغیرہ کا پیدا ہونا کیمیاوی عمل ہے طبیعی عمل میں مادہ صرف ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا ہے، لیکن کیمیاوی عمل میں مادہ کے مختلف اقسام اس طرح آپس میں ملتے ہیں، کہ ایک نئی چیز یا مادہ کی نئی قسم پیدا ہو جاتی ہے،

(۳) بعض عمل حیاتی ہوتے ہیں، مثلاً نباتات اور حیوانات کی بالید گی اور انحطاط، انسان کے جسم میں بھی یہ عمل جاری ہیں، مثلاً بالوں اور ناخون کا بڑھنا جسم کی عام صحت یا عدم صحت، اعضا کا نشو ونما وغیرہ حیاتی عمل ہیں،

(۴) بعض عمل نفسی محض ہوتے ہیں، مثلاً میں اس وقت ان الفاظ کے لکھنے میں مصروف ہوں، یہ الفاظ اور خیالات میرے ذہن میں اس وقت مرکزی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن ان کے گرد اگرد اور بیسیوں خیالات اس مضمون سے متعلق دھندلی صورتوں میں آتے جاتے ہیں، اور موجود ہیں، ان دھندلے خیالات کے علاوہ مجھے اپنے جسم و لباس اور اپنے حواس سے مختلف احساسات حاصل ہو رہے ہیں، جن کا ایک منٹ پہلے مجھے شعوری علم نہ تھا، ان دھندلے خیالات اور محسوسات کو جو اس وقت میری شخصیت میں موجود ہیں، اور میرے مرکزی شعور کے لئے ذہنی پس منظر کا کام دے رہے ہیں، ہم نفسی محض کہہ سکتے ہیں،

(۵) ہاں - جو خیالات کسی ایک لمحہ میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں، ان کی حالت شعوری ہوتی ہے، جب تک ہم جاگ رہے ہیں، شعوری عمل ہمارے ذہن میں جاری ہے، البتہ ایک خیال جو اس وقت شعوری حیثیت رکھتا ہے، دس پندرہ منٹ کے بعد بالکل غیر شعوری یا نفسی محض بن سکتا ہے عمل کی یہ پانچویں قسم ہے،

(۶) شعوری اور غیر شعوری دونوں حالتوں میں بارہا یہ ہوتا ہے، کہ ہم اپنے آپ کو ایک ایسی ہستی یا ایسے عالم سے متصل پاتے ہیں، جو ہماری ادراکی اور محسوس دنیا سے بہت بالا اور مختلف

ہے ایسی ہستی کو ہم خدا اور ایسے عالم کو ہم روحانی عالم کا نام دیتے ہیں، اس عالم کی کیفیتوں کا بیان کرنا ہمارے لئے آسان کام نہیں ہے، لیکن ہم اس کی موجودگی اور حقیقت کو اس طرح محسوس کرتے ہیں، کہ ہمارے لئے اس کا انکار ناممکن ہوجاتا ہے، ذہن کی یہ حالتیں روحانی کہلاتی ہیں، اور یہ بھی عمل فعل ہیں،

اوپر جو چھ قسم کے عمل بیان ہوئے ہیں، ان میں سے پہلے تین کو خارجی یا جسمی اور باقی تین کو داخلی یا ذہنی کہہ سکتے ہیں، عمل کی ان دو اہم قسموں میں فرق یہ ہے، کہ (۱) ذہنی یا داخلی عمل کا ادراک صرف وہی شخص کرسکتا ہے جس کے ذہن میں وہ عمل جاری ہے، دوسرا شخص ان عملوں کا بلا واسطہ ادراک اور احساس ہرگز نہیں کرسکتا، وہ صرف اپنی ذہنی حالت کو معیار قرار دے کر دوسرے کی ذہنی حالت کا اندازہ کرسکتا ہے، گلاب کا پھول سونگھ کر مجھے بھی لذت حاصل ہوتی ہے، اور آپ کو بھی، لیکن میں آپ کی لذت کا صرف اس قدر اندازہ کرسکتا ہوں کہ میری جیسی ہوگی، یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں آپکی لذت کو اسی طرح جانتا ہوں جیسے اپنی لذت کو، اسکے برعکس خارجی یا جسمی عمل جتنے بھی ہیں، اور جہاں بھی ہیں ان کا بلا واسطہ احساس ہر وہ شخص کرسکتا ہے، جو اس ادراک و احساس کے لئے تیار ہو، مثلاً ہر شخص اگر چاہے تو طبیعی کیمیاوی اور حیاتی فعلوں کا مشاہدہ کرسکتا ہے، خواہ یہ عمل و فعل خارجی دنیا میں جاری ہوں یا خود اُس کے جسم کے اندر،

(۲) ذہنی اور شعوری (یعنی داخلی) عمل کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اُس سے ہم دنیا جہان کے ہر طرح کے عمل و فعل اور ہر شے کو اپنے شعور کی گرفت میں لے سکتے ہیں، ہستی اور نیستی دونوں کو ہم اپنے شعور کی وجہ سے سمجھ سکتے ہیں، چیونٹی سے لیکر خدا تک کا تصور ہم اپنے ذہن میں قائم کرسکتے ہیں، شعور کی یہی وہ ہمت مردانہ ہے، جس سے انسان یزدان کو بھی اپنی کمند میں لے آتا ہے،

۴۔ عمل کی جو چھ قسمیں اوپر بیان کی گئی ہیں، وہ سب کی سب انسان میں جاری وساری ہیں، انسان ان چھ عملوں سے مرکب ہے، ان میں سے پہلے تین عمل جو خارجی ہیں، انسان کا جسم (یا بدن) بنتے ہیں، اور باقی تین عمل جو داخلی ہیں، اس کا نفس و ذہن،

اب علمی تحقیق نے ثابت کر دیا ہے، کہ ہمارے جسم کا اہم ترین حصہ مغز ہے، اُس کے بغیر انسان انسان نہیں رہتا، ہاتھ پاؤں کاٹ دیجئے، اور دوسرے اعضا قطع کر دیجئے، انسان موجود ہے، سر کاٹ دیجئے، تو وہ انسان نہیں لاشہ ہے، مغز جسم انسانی کا وہ اہم ترین حصہ ہے جس کے بغیر نہ ذہن ہے، نہ دماغ، نہ نفس ہے نہ روح، اس لئے یہ سوال کہ نفس اور جسم کا باہمی تعلق کیا ہے، درحقیقت یہ سوال ہے، کہ ذہن اور مغز کا باہمی تعلق کیا ہے، اور کیسا ہے، اور اس ضمن میں ہم کیا کچھ کہہ سکتے ہیں، اس مقالے کے بقیہ حصہ میں اس سوال پر قدرے تفصیل سے بحث کیجائے گی،

۵۔ بحث سے پہلے ہمیں یہ امر واقعہ تسلیم کرنا ہے، کہ نفس اور جسم میں تعلق ہے، اور ضرور ہے اگر کسی شخص کو بخار ہے، یا وہ کسی اور بیماری میں مبتلا ہے، تو وہ دماغی کام کما حقہٗ کر نہ سکے گا، یعنی اگر جسم کی صحت بگڑی ہوئی ہے، تو نفسی حالت بھی بگڑی ہوئی معلوم ہوگی، اسی طرح اگر نفسی حالت بگڑی ہوئی ہے، تو جسمانی حالت بھی فوراً خراب ہو جائے گی، مثلاً اگر کسی شخص کے دل میں رنج وغم کے جذبات یا باطل اوہام جمع ہو رہے ہیں، تو اسکی جسمانی حالت دیکھتے دیکھتے گر جائے گی، مشہور ہے کہ چند طباع لڑکوں نے جنھیں اسکول سے چھٹی کی ضرورت تھی، استاد صاحب کو سچ مچ بیمار کر دیا، ایک آیا اور پوچھنے لگا، کیوں جناب خیریت تو ہے، آج چہرہ غیر معمولی طور پر زرد ہے، ؟ جواب ملا کچھ بھی نہیں، دوسرا آیا، تیسرا آیا، جب کئی لڑکے یکے بعد دیگرے یہی پوچھتے رہے، تو استاد صاحب کو سچ مچ لرزہ پیدا ہو گیا، انگریزی مثل ہے

تشویش نے بلی کو بھی مار دیا، نفس اور جسم کا یہ تعلق امر واقعہ ہے، اور ہمارا روزانہ مشاہدہ ہمیں یہی بتاتا ہے،

اب ہمیں ایک قدم اور آگے بڑھنا چاہئے، عضوی نفسیات[ل] نے ثابت کر دیا ہے کہ ذہن اور مغز کا باہمی تعلق بھی بہت گہرا ہے، اور امر واقعہ ہے، اس کے ثبوت میں دو قسم کی شہادتیں پیش کیجاتی ہیں،

(۱) یہ دیکھا گیا ہے کہ اُن تمام جانوروں میں جن کے جسم میں ریڑھ کی ہڈی ہے، جس جانور کا مغز دوسرے جانوروں سے مقابلۃً حجم میں (جسم کی نسبت سے) زیادہ ہے اور ترکیب میں بھی زیادہ پیچیدہ ہے، وہی جانور ذہانت میں دوسرے جانوروں سے بہتر ہے، انسان ذہین ترین جانور ہے، اور انسان کا مغز نہایت پیچیدہ اور نہایت ہی بوجھل ہے، تجربہ بتاتا ہے کہ ہاتھی، کتا، لومڑی وغیرہ ذہین جانور ہیں، ان کی کھوپڑیوں کو جب کھولا جاتا ہے، تو معلوم ہوتا ہے، کہ ان کے قد و قامت کے لحاظ و تناسب سے ان کے مغز نہایت بوجھل اور پیچیدہ ہیں،

(۲) بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ نفس کی کوئی خاص شعوری حالت مختل ہو جاتی ہے، مثلاً ایک شخص بیماری سے پہلے شعوری لحاظ سے بھلا چنگا تھا، لیکن اب ٹھیک بول نہیں سکتا، کہ نہیں سکتا سمجھ نہیں سکتا، یا اندھا ہو گیا ہے، بہرا ہو گیا ہے، وغیرہ اسکی وجہ؟ وجہ یہ ہو کہ بیماری سے (یا بعض اوقات کسی اور وجہ سے جس کی نوعیت نا معلوم ہے) مغز کے وہ حصے جو ان شعوری حالتوں کے لئے مقرر تھے، یا تو ضائع ہو گئے ہیں، یا وہ خون کے کسی جمے ہوئے قطرہ کی وجہ سے جو ان حصوں میں پھنس گیا ہے، کام نہیں کرتے، مغزی حصے نہایت نازک ہوتے ہیں، ان کی معمولی

ل‌ـه Physiological psychology.

صحت میں اگر ذرا سی بے قاعدگی بھی ہو جائے تو وہ بسا اوقات تباہ کن بلکہ مہلک ثابت ہوتی ہے، جب مغز کے اِن حصوں پر جراحی عمل جو عموماً نہایت مشکل اور خطرناک ہوتا ہے،) کیا جاتا ہے، تو صاف معلوم ہوتا ہے، کہ یہ حصے خراب ہو چکے تھے، جسکی وجہ سے وہ شعوری حالت بھی جس کا ان پر انحصار تھا، ضائع ہو گئی تھی، اگر یہ نقصان خفیف ہوتا ہے تو جراح کی کامیاب کوشش سے وہ دور ہو جاتا ہے، اور اس کے ساتھ وہ شعوری حالت بھی عود کر آتی ہے، جو بیماری کی وجہ سے معطل یا ضائع ہو چکی تھی، بارہا ایسا ہوتا ہے، کہ آنکھیں بالکل صحیح دکھائی دیتی ہیں ان کی اندرونی ساخت وکیفیت بالکل معمول کے مطابق ہے، لیکن بینائی ضائع ہو گئی ہے، اسکی وجہ صرف یہی ہوتی ہے کہ بینائی ایک شعوری حالت ہے، جس کا تعلق صرف آنکھ ہی سے نہیں (جو محض ایک آلہ اور ذریعہ ہے بینائی کا) بلکہ مغز کے پس پشت حصہ سے ہے، جب مغز کا یہ حصہ انحطاط پکڑ گیا، یا بالکل ضائع ہو گیا، تو بینائی کا ضائع ہو جانا لازمی نتیجہ تھا،

(۳) عضوی نفسیات نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ مغز کے مختلف حصوں کی ماموریتیں الگ الگ ہیں، مثلاً انسان میں مغز کا پچھلا حصہ (گدی سے اوپر) بینائی کے لئے ہے، مغز کے ماتھے والے حصے کردار کے لئے ہیں، دائیں اور بائیں طرف کے حصے کچھ محسوسات کیلئے اور زیادہ تر الفاظ وزبان کے لئے مخصوص ہیں، مغز کے اوپر والے حصے (یعنی مغز کا کثیر حصہ) غالباً اعلیٰ شعوری حالتوں کے لئے مخصوص ہے، چھوٹا مغز (گردن سے ذرا اوپر والا پچھلا حصہ) یعنی Cerebellum توازن جسم کے لئے ہے، وغیرہ، عضویات مغز ابھی ابتدائی مرحلوں میں ہے، لیکن جس قدر بھی ہے، اس سے ذہن ومغز کا تعلق ثابت ہوتا ہی ہے

۶۔ الغرض یہ امر واقعہ ہے کہ انسان کی داخلی (ذہنی) حالتوں اور خارجی (جسمی) حالتوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے، یا عام زبان میں یہ کہئے کہ انسان کے جسم وذہن یا جسم ونفس میں گہرا تعلق

ہے اس تعلق کو علمی حلقوں میں ایک قانون کی صورت میں بیان کرتے ہیں،

یہاں دو اصطلاحات ذہن نشین کرلینی چاہئیں، انسان کی ہر نفسی یا ذہنی حالت، عمل یا فعل کو نفسیہ یا ذہنیہ کہہ سکتے ہیں، اسی طرح اس مغزی عمل فعل یا حالت کو، جو نفسی عمل، فعل یا حالت سے پہلے یا اس کے ساتھ واقع ہوتی ہے، ہم عصبیہ یا مغزیہ کہہ سکتے ہیں،

اب ذہن و مغز کے تعلق کا قانون یہ ہے کہ ہر نفسیہ کسی عصبیہ کے ساتھ ساتھ یا اوس کے ہمرکاب واقع ہوتا ہے، یعنی اگر آپ کے ذہن میں کوئی نفسی حالت موجود ہے تو یقین رکھیے کہ اسکے ساتھ ساتھ یا اس سے ذرا پہلے ایک عصبی حالت بھی واقع ہوئی ہے، اگر وہ عصبی حالت واقع نہ ہوئی ہوتی، تو آپ کی یہ ذہنی یا نفسی حالت بھی واقع نہ ہوتی،

اِس قانون سے مراد کیا ہے؟ اسکی نوعیت اور حقیقت کیا ہے، ؟ کس حد تک یہ قانون قطعی ہے، ؟ کیا یہ قانون علوم طبعیات اور کیمیا کے قوانین کی طرح عددی شکل میں ڈالا جاسکتا ہے یا نہیں، ؟ یہ سوالات غور طلب ہیں، اور ذیل میں ان پر بحث کیجاتی ہے،

قانون یہ ہے کہ ہر نفسیہ کسی عصبیہ کے ساتھ یا اسکے ہمرکاب واقع ہوتا ہے، اسکی توجیہ کیلیے دو نظریے پیش کئے گئے ہیں، ایک نظریہ کا نام نفسی مادی متوازیت[1] ہے، اور دوسرے کو نفسی جسمی تفاعلیت[2] کہتے ہیں،

(۱) نفسی مادی متوازیت کا نظریہ یہ ہے کہ مغزی حالتیں اور نفسی حالتیں بالکل الگ الگ چیز ہیں، ان میں باہمی تفاعل ناممکن ہے، ایک مادی ہے، دوسری غیر مادی، ایسی دو مختلف الجنس چیزوں میں تفاعل ہو کیسے سکتا ہے، ؟ ذہنی حالتیں سلسلہ وار الگ ترتیب سے جاری ہیں،

[1] Psycho-physical parallelism

[2] Psycho-neural interactionism

اور انکے ساتھ ساتھ مغزی اور عصبی حالتیں اپنی ترتیب سے الگ سلسلہ وار جاری ہیں (دیکھو شکل اوّل)

یہ دو سلسلے (عصبی و نفسی) متوازی جاری ہیں، لیکن ان میں باہمی عمل اور ردِ عمل یعنی تفاعل ناممکن محض ہی، ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس وقت ہماری نفسی حالت ل تھی، اس وقت ہماری عصبی یا مغزی حالت ا تھی، ا نے ب کو پیدا کیا، ب نے ج کو اور ج نے د کو اور اسی طرح آگے یہ سلسلہ جاری رہے گا، (یعنی جب تک انسان جاگ رہا ہے یا زندہ ہے) یہ عصبی سلسلہ تھا نفسی سلسلہ یہ ہے کہ ل کے بعد م پیدا ہوا، اس کے بعد ن اور اس کے بعد و وغیرہ یعنی ب اور م ساتھ ساتھ تھے، ج اور ن ساتھ ساتھ تھے، اور د اور و ساتھ ساتھ تھے۔ انسان کی یہ دو مختلف حالتیں متوازی سلسلوں میں بڑھتی رہتی ہیں لیکن ہم ہرگز یہ کہہ نہیں سکتے کہ کس نفسیہ (ذہنی حالت) نے کسی عصبیہ (مغزی حالت) کو پیدا کر دیا ہے، یا کسی عصبیہ نے کسی نفسیہ کو پیدا کر دیا ہے، مادی سلسلہ مادی تغیرات (یعنی مغزی تغیرات) کا ذمہ وار ہے، اور نفسی سلسلہ نفسی تغیرات (یعنی ذہنی تغیرات) کا ذمہ وار ہے، یہ ہے نفسی مادی متوازیت کا نظریہ اور علماے سائنس کے ایک کثیر حصہ نے اُسے قبول کیا ہے،

شکل نمبرا

انسان

نفسیہ	عصبیہ
ل	ا
↓	↓
م	ب
↓	↓
ن	ج
↓	↓
و	د
↓	↓
وغیرہ	وغیرہ

(۲) اس نظریہ کے برعکس دوسرا نظریہ یعنی نفسی جسمی تفاعلیت کا ہے، وہ کہتا ہے کہ عوام کا یہ خیال نسبتہً زیادہ صحیح ہے، کہ روح اور جسم یعنی ذہن اور مغز میں تفاعل ہے، ان کے درمیان عمل بھی ہے، اور ردِ عمل بھی، ایک کا دوسرے پر اثر ہوتا ہے، اور ایک دوسرے سے اثر پذیر بھی ہوتا ہے، (دیکھو شکل دوم)

عصبی حالتیں نفسی حالتوں پر اثر کرتی ہیں، اور خود اُن سے متاثر ہوتی ہیں، ا کو پیدا
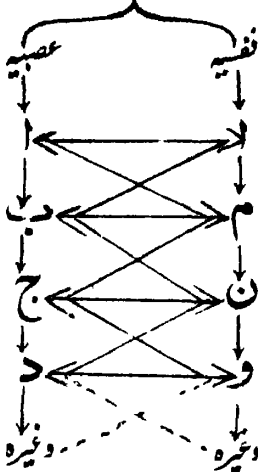
کرسکتا ہے، اور خود اس سے پیدا ہوسکتا ہے، ا اور ا
ل کرم کو بھی پیدا کرسکتے ہیں، اور ب کو بھی ہر نفسی
حالت کا ہر عصبی حالت سے تعلق ہوتا ہی، یا ہوسکتا ہے
ہم محض اپنی سہولت کے لئے ان کے الگ الگ نام
رکھ لیتے ہیں، ورنہ عصبیہ و نفسیہ دونوں انسان کی حالتیں
ہیں، اور ان ہی عملوں سے وہ مرکب ہی، ہم خارجی
(جسمی) عملوں کو ایک نام دیتے ہیں، اور داخلی (ذہنی)
عملوں کا دوسرا نام، متوازیت ہمیں لغویات میں پہنچا

شکل نمبر۲

انسان

نفسیہ — عصبیہ

ا — ا
م — ب
ن — ج
و — د
وغیرہ — وغیرہ

دیتی ہے، مثلاً اوس کے مطابق اگر اس وقت میں لکھ رہا ہوں، تو لکھنے کا عمل جو عصبی اور مغزی ہی
خود بخود جاری ہے، اور میرے ذہن، شعور اور نفس کا اس پر کوئی اثر نہیں، بلکہ وہ محض ایک
تماشائی کی حیثیت سے متوازی سلسلہ میں ساتھ جارہے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے جسمی فعل
و عمل کے تعین میں ہمارے نفس و ذہن کو ایسا ہی اختیار حاصل ہے، جیسا کہ ہمارے مغز کو، یہ
دعوی بالکل لغو ہے، کہ جسمی افعال کا سلسلہ نفس و ذہن کے اثر سے آزاد رہ کر چل سکتا ہے یا
چل رہا ہی، نفس اور مغز میں تفاعل ہے، اور یہ تفاعل ہر لحہ اور ہماری شخصیت کے ہر پہلو اور شعبہ
میں جاری ہے، متوازیت نے اپنے غلط نظریہ سے جسم و روح یا نفس و مغز کے تقابل کو
وہ اساسی اور قطعی اہمیت دے دی ہے، جس کے لئے درحقیقت نہ گنجائش ہے اور نہ دلیل
یہ نظریۂ تفاعلیت علمی حلقوں میں اس قدر مقبول نہیں ہوا، جس قدر کہ نظریۂ متوازیت
بھی دو مفروضے ہیں ادنہیں ان دونوں کو ذرا غور سے دیکھنا چاہئیے،
۷ - متوازیت کے حق میں دو دلیلیں پیش کیجاتی ہیں، اور دونوں دلیلوں میں سلبی پہلو

غالب ہے،

(۱) پہلی دلیل یہ ہے کہ اگر متوازیت کو ترک کر کے نظریۂ تفاعلیت قبول کر لیا جائے تو قانون تحفظ قوت[1] کی شکست لازم آتی ہے، اور چونکہ یہ قانون نہایت اہم اور صحیح ہے، اس لئے جو نظریہ اس کے خلاف جاتا ہے، وہ خود غلط ٹھہرا، اور جو نظریہ (یعنی متوازیت) اس غلط نظریہ (یعنی تفاعلیت) کا مدمقابل ہے، وہ صحیح ثابت ہوا، یعنی تفاعلیت کے ابطال سے متوازیت کی صحت ثابت ہوئی ہے،

تفاعلیت سے قانونِ تحفظِ قوت کی شکست کیسے ہوتی ہے؟ اس طرح کہ اگر ہم یہ مان لیں کہ جسم یا مغز کا فعل اور اثر روح یا ذہن پر ہو سکتا ہے، تو اس کے معنی یہ ہوے کہ مادی قوت ذہنی قوت میں بدل گئی یعنی نظامِ عالم میں جو مجموعی مقدار مادی قوت کی موجود تھی، اس کا کچھ حصہ ذہنی قوت میں منتقل ہو گیا، اور مادی قوت کی مقدار میں کمی واقع ہو گئی، اس طرح اگر یہ مان لیا جائے کہ روح یا ذہن یا شعور کا فعل واثر جسم یا مغز پر ہو سکتا ہے، تو اس سے یہ لازم آیا کہ ذہنی قوت کا کچھ حصہ مادی قوت میں داخل ہو گیا، اور اس طرح نظامِ عالم میں مادی قوت کی مجموعی مقدار میں کچھ اضافہ ہو گیا، دونوں حالتوں میں قانونِ تحفظ قوت ٹوٹ جاتا ہے، کیونکہ تحفظ قائم نہیں رہتا، مادی قوت یا تو کم ہو جائے گی، اور یا زیادہ، کیا یہ اعتراض صحیح ہے؟

---

[1] قانون تحفظ قوت یہ ہے کہ نظامِ عالم میں قوت کی مجموعی مقدار مقرر اور محدود ہے، اس میں نہ کمی ہو سکتی ہے، اور نہ زیادتی، صرف صورتیں بدل سکتی ہیں، مثلاً آپ کھانا کھاتے ہیں، اور اپنے اندر نئی قوت اور صحت محسوس کرتے ہیں، حالانکہ بھوک کی حالت میں آپ اپنے آپ کو کمزور محسوس کرتے تھے، یہ قوت کہاں سے آئی؟ جواب ملتا ہے کہ غذا میں جو قوتیں چھپی تھیں، وہ آپ کی صحت کی صورت میں ظاہر ہوئی ہیں،

نظریہ تفاعلیت کی طرف سے اس اعتراض کا یہ جواب ملتا ہے کہ

(۱) اوّل تو یہ دعویٰ ہی غلط ہے، کہ قانونِ تحفظِ قوت بالکل اٹل، واضح اور ناقابلِ شکست قانون ہے، اسے قانون کہنا بھی صحیح نہیں، اور خود اس قانون کے موجداُسے ہرگز عالمگیر اہمیت اور وسعت نہیں دیتے، درحقیقت یہ قانون نہیں ہے، بلکہ ایک تعمیم ہے، جو مادی دنیا کے چند شعبوں میں مشاہدہ اور تجربہ کی بناپر قائم کی گئی ہے، لیکن اس تعمیم کی نظری حیثیت بہت کمزور ہے، اس لئے اسے صرف تعمیم تجربی کہہ سکتے ہیں، قانون کا لقب اس کے لئے صحیح نہیں، اس لئے جو اعتراض اس تجربی تعمیم کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے، وہ صحیح اور قطعی نہیں ہو سکتا، کیا ہمارے پاس کوئی دلیل یا وجہ ایسی موجود ہے جس کی بناپر ہم یہ حکم لگا سکیں کہ نظام عالم کی مادی قوت کی مقدار اس طرح محدود، محصور اور لبستہ ہے کہ نہ تو اس میں اضافہ ہو سکتا ہے، اور نہ کمی ؟ ایسی کوئی وجہ و دلیل موجود نہیں تھی، اس لئے ایک تعمیم کو وہ اہمیت نہیں دیجا سکتی جو ایک قانون کو حاصل ہوتی ہے، تعمیم کا نام ہی ظاہر کرتا ہے کہ یہ کلیہ بہت کم مثالوں کی بناپر قائم کیا گیا ہے، اور ان مثالوں سے متعلق حلقۂ شہادت کے باہر، تعمیم کا کلیہ اپنی اہمیت کھو بیٹھتا ہے،

(۲) 'تحفظِ قوت' کی تعمیم کو اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو اسکی کمزوری اور کھلتی ہے کہا جاتا ہے، کہ 'قوت' یا 'توانائی' کی دو صورتیں ہوتی ہیں، ایک تفاعل بالفعل (توانائی بالفعل) یہ ہوگی کسی جسم کی استعدادِ عمل اپنی حرکت کے لحاظ سے۔ اور دوسری تفاعل بالقوت (توانائی بالقوت) یعنی کسی جسم کی استعدادِ عمل بلحاظ ان قوتوں کے جو اُس کے اور دوسرے اجسام کے تعلق سے پیدا ہوتی ہیں، آسان لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک واضح اور حرکی صورت ہے، یعنی وہ صورت جس میں عمل ظاہر ہو رہا ہے، اور قوت عمل کی صورت پکڑ رہی ہے، مثلاً پتھر شیشہ پر گرا،

اور شیشہ ٹوٹ گیا، اس حالت میں پتھر کی قوت حرکی اور واضح تھی، دوسری صورت وہ ہوتی ہے جس میں قوت عمل میں ظاہر نہیں ہورہی ہے، بلکہ ہماری آنکھوں سے غائب ہوکر کسی شے میں مخفی یا مضمر ہو گئی ہے، مثلاً میں ایک پتھر اٹھاکر اپنے مکان کی اوپر والی چھت پر لے جاتا ہوں، پتھر کو اوپر لیجانے میں میں نے قوت خرچ کی، (یعنی میری یہ قوت حرکی تھی) لیکن آخر اس صرفِ قوت کا نتیجہ کیا ہوا؟ تحفظِ قوت کا قانون کہتا ہے، کہ قوت صورتیں بدلتی رہتی ہے لیکن نہ کم ہوتی ہے نہ زیادہ، اور ضائع ہرگز نہیں ہوتی، اس لئے پتھر کو اوپر لیجانے میں جو قوت میں نے صرف کی ہے، وہ بھی ضائع نہ ہوئی ہوگی، اب وہ قوت کس طرح میری آنکھوں سے پوشیدہ ہے، جواب ملتا ہے، کہ وہ قوت زیادہ تر اس پتھر ہی میں مخفی و مضمر ہے، لیکن کیا اس پتھر کی شکل وصورت، حجم، اجزار کی تعداد یا ان کی ترکیب میں میری قوت کے صرف سے کوئی خفیف سا خفیف فرق بھی پڑا ہے؟ ہرگز نہیں، پتھر ویسا ہی ہے، جیسے پہلے تھا، تو پھر اس کا کیا ثبوت ہے کہ میری صرف شدہ قوت پتھر میں مخفی و مضمر ہے، جواب ملتا ہے، کہ پتھر کو ذرا چھت سے لڑھکا کر دیکھئے، جب نیچے فرش پر گرے گا، تو اس زور سے گریگا کہ جس سل پر پڑے گا، اسے توڑ دے گا، حالانکہ پہلے جب وہ پتھر اس سل پر پڑا تھا، تو بالکل بے ضرر تھا، سل کا اس طرح ٹوٹ جانا ثبوت ہے اس بات کا کہ میری قوت ضائع نہیں ہوئی تھی، بلکہ پتھر میں مضمر ہوکر اس کی تخریبی طاقت کو شدت سے بڑھا گئی تھی اب سوال یہ ہے کہ ایک قوت کے دوسری شے میں سطح چھپ جانے یا مضمر ہو جانے کو ہم سمجھ کیسے سکتے ہیں؟ ایک قوت دوسری صورت میں بدل کیسے جاتی ہے؟ بدلنے کا طریقہ کیا ہے؟ ان سوالات کا جواب نہیں ہیں صرف یہ بتایا جاتا ہے کہ قوت کی دو صورتیں ہوتی ہیں ایک حرکی و ظاہر دوسری مخفی و مضمر، ایک بالفعل اور دوسری بالقوۃ۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جاسکتا،

یہاں متوازیت کا مخالف اور تفاعلیت کا حامی بول اٹھتا ہے، کہ جب آپ قوت

کی مخفی اور بالقوۃ صورت کو نظام عالم کی مجموعی قوت میں شامل کر سکتے ہیں، تو آپ کو کیا حق حاصل ہے کہ ذہنی قوت کو اس نظام عالم سے خارج کر دیں، ذہنی قوت اپنے مفہوم اور طریق کار میں ذرہ برابر بھی مخفی قوت سے زیادہ مبہم یا ناقابل فہم نہیں ہے،

(۳) تحفظ قوت کی تعمیم کی بنیاد پر جو اعتراض تفاعلیت کے خلاف (اور متوازیت کے حق میں) پیش کیا گیا تھا، اسکی کمزوری، بلکہ خود تحفظ قوت کے پورے نظریہ کی کمزوری سب سے زیادہ اِس حقیقت سے کھل جاتی ہے، کہ خود قوت کا تصور ہی ابہام سے خالی نہیں، آخر قوت سے مراد کیا ہے،؟ قوت سے مراد ہے کام کرنے یا فعل کے صادر ہونے کی قابلیت جہاں بھی کام یا فعل ہوگا، اور جس صورت میں بھی وہ ظاہر ہوگا، وہ قوت کا مظاہرہ ہوگا، اس معنی میں ذہنی یا شعوری یا روحانی فعل اُسی طرح کام کہلایا جائے گا جس طرح کہ مادی یا کیمیاوی یا حیاتی عمل اور ردِّ عمل، قوت کی کوئی ایسی تعریف موجود نہیں ہے جس کے مفہوم اور تضمن میں ذہنی، شعوری یا روحانی افعال کو بالتصریح خارج کیا جا سکے، حقیقت تو یہ ہے، کہ انسانی شعور کے ذاتی احساسِ قوت کو اگر خارج کر دیا جائے تو تصورِ قوت اپنے اصلی مفہوم اور روح سے خالی ہو جائے گا اگر مجھے خود اپنے نفس میں قوت کا احساس نہیں ہے، تو میں کسی اور شئے میں اُس کی موجودگی کا قیاس کیسے کر سکتا ہوں،

یہاں اس بحث کو لمبی کرنے کی ضرورت نہیں ہے، جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے، وہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ جسم و ذہن کی تفاعلیت کے نظریہ کے خلاف قانونِ تحفظ قوت کو پیش کرنا بے سود ہے، نہ تو یہ قانون اٹل ہے، نہ اسکی حیثیت تعمیم سے زیادہ ہے، نہ وہ ابہام اور مغالطہ سے بالکل پاک ہے، نہ اس کے حدود مقرر ہیں، نہ خود لفظِ قوت ہی ابہام سے خالی ہے، اور نہ اس قانون یا تعمیم کی صحت سے جسم و ذہن کی تفاعلیت ناممکن ثابت ہوتی ہے،

(ب) دوسری دلیل جو نظریۂ تفاعلیت کے خلاف (اور اس کے مخالف نظریہ متوازیت

کے حق میں) پیش کی جاتی ہے، یہ ہے کہ آخر جسم و ذہن دو ایسی متضاد اور مختلف چیزوں میں تفاعلیت (یعنی باہمی عمل ورد عمل) ہو کیسے سکتا ہے؟ ایک مادی چیز دوسری غیر مادی ایک مکان میں محدود دوسری مکان سے آزاد، ایک کثیف دوسری کثافت کی ضد، ایک فانی اور دوسری شاید غیر فانی۔ ایسی متضاد چیزوں میں تفاعل و تعامل ناممکن محض ہے، کیونکہ ہم ایسے تفاعل کو نہ تو سمجھ سکتے ہیں، اور نہ اس کا تصور ہی کر سکتے ہیں،

یہ اعتراض بھی سلبی ہے اور اس سے نتیجہ یہ نکالا گیا ہے، کہ چونکہ جسم و ذہن کا باہمی تفاعل ناقابل فہم و ادراک ہے، اس لئے جسم و ذہن کی حالتیں دو متوازی سلسلوں ہی میں جاری رہ سکتی ہیں (جیسا کہ متوازیت کا دعوی ہے) لیکن نظریہ تفاعلیت کے حامیوں کی طرف سے اس اعتراض کا بھی قاطع جواب ملتا ہے، البتہ اُن کا جواب بالمثل ہے،

(۱) مثلاً اس کا سوال ہے کہ کب آپ مادی اجسام کا تفاعل (یعنی ان کا باہمی عمل اور رد عمل) سمجھ چکے ہیں، ؟ کیا آپ کو اس حقیقت کا مکمل فہم و ادراک ہو چکا ہے، کہ جب ایک مادی شے دوسری مادی شے پر اثر کرتی ہے، تو یہ اثر اس دوسری شے میں کیسے نفوذ پاتا ہے اور اس میں وہ کیسے جاری و ساری ہو جاتا ہے، ؟ مثلاً کیا آپ اسکی وجہ بتا سکتے ہیں کہ اگر میں چار یا پانچ کتابیں ساتھ ساتھ رکھ کر قطار بنا دوں اور پھر ایک اور کتاب کو قطار کے سرے کی کتاب سے زور سے ٹکرا دوں (لیکن سرے والی کتاب کو ہلنے نہ دوں) تو قطار کی آخری کتاب آگے سرک جائے گی، اور درمیان والی کتابیں ویسی کی ویسی رہیں گی؟ آپ فرمائیں گے کہ ٹکر کا زور یعنی قوت کتابوں میں سے گذرتی ہوئی آخری کتاب میں پہنچی اور چونکہ اس سے آگے کوئی رکاوٹ نہ تھی، اس لئے وہ کتاب سرک گئی، لیکن سوال یہ ہے کہ قطار کی کتابوں میں سے قوت نے راستہ کیسے بنا لیا، ؟ کس طرح یہ قوت یا زور ان کتابوں کے ذرات میں سے گذرتا ہوا آگے

نکل گیا؟ کیا اس قسم کے سینکڑوں ہزاروں مشاہدات کا آپ کے پاس کوئی صحیح حل یا ان کے سلسلہ عمل کی ایسی تشریح موجود ہے، جسے تمام سائنسدان صحیح تسلیم کرلیں، ؟ ہرگز نہیں، . . . . . .
یہ ہم مان لیتے ہیں کہ تصادم یا ٹکر سے مادّہ کے ذرات میں سے زور حرکت یا قوت کی ترسیل کا منظر ہم ہر روز اپنے ماحول میں دیکھتے ہیں، اور یہ منظر اس قدر عام ہے کہ ہم اسے معمولی سمجھتے ہیں لیکن کسی چیز کا معمولی ہو جانا اس بات کے مترادف نہیں ہے کہ ہم نے اُس چیز کو سمجھ لیا ہے، یا اسکی نوعیت اور حقیقت کو ہم پا گئے ہیں، سچ تو یہ ہے کہ ایسے عام مناظر سب سے زیادہ پیچیدہ ثابت ہوتے ہیں اور ان کا عام اور معمولی ہونا ہمیں دھوکے میں ڈالے رکھتا ہے، غرض مادی اجسام کا تفاعل اس وقت تک نہیں سمجھا جا سکا، تو پھر کس منہ سے ہم کہہ سکتے ہیں، کہ چونکہ جسم و ذہن کا تفاعل ہماری سمجھ میں نہیں آتا، اس لئے وہ سرے سے ممکن ہی نہیں؟ ہم صرف یہی پوچھ سکتے ہیں، کہ عام مشاہدہ کیا کہتا ہے، ؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ روزمرہ کا مشاہدہ جسم و ذہن کے تفاعل کو مادی اجسام کے تفاعل سے بھی زیادہ عام اور معمولی پاتا ہے،

(۲) پھر یہ دیکھئے کہ طبعیات جدید مادی اجسام کے تفاعل کی بعض ایسی صورتوں اور حالتوں کو بلا چون وچرا تسلیم کرتی ہے (اور صحیح طور پر تسلیم کرتی ہے) جن کی حقیقت و نوعیت کے متعلق ہماری فہم ابھی ابتدائی منزل سے بھی نہیں گذری، مثلاً کیا ہمیں کشش ثقل کی حقیقت و نوعیت کا صحیح فہم و ادراک ہے، ؟ ہرگز نہیں، ہم صرف یہ دیکھتے ہیں کہ مادی اجسام میں ایک ایسا رشتہ موجود ہے، جس کے طریق کار کو ہم ایک قسم کے عددی اور حسابی قانون میں بیان کرسکتے ہیں، لیکن یہ قانون صرف یہ بیان کرتا ہے کہ وہ مادی اجسام میں کشش ثقل اس خاص پیمانہ پر ہوتی ہے، لیکن کیوں ہوتی ہے اور یہ کشش ہے کیا چیز؟ ان کے متعلق سائنس اور اس کا یہ قانون خاموش ہیں، مشاہدہ ہمیں یہ منظر دکھاتا ہے، اس لئے ہمارا فرض ہے کہ اس منظر کو صحیح الفاظ میں قلمبند کردیں

یعنی اسے قانون کی شکل دیں، لیکن یہ قانون اس کشش کی علت کے متعلق بالکل خاموش ہے، اب فہم وادراک کے نقطۂ نظر سے مادی اجسام میں کشش ثقل جسم و ذہن کے تفاعل سے کہیں زیادہ بعید از قیاس اور عجیب ہے، لیکن چونکہ مادی اجسام کا یہ تفاعل ہمارے مشاہدہ سے ثابت ہے، اسلئے علمی دیانت کا تقاضا ہے، کہ اسے صحیح صحیح طور پر بیان کر دیا جائے، اسی طرح جسم و ذہن کا تفاعل بھی مشاہدہ سے ثابت ہے، اس لئے علمی دیانت کو یہاں بھی اپنا فرض ادا کرنا چاہئے، اور اس تفاعل کو صحیح صحیح طور پر قلمبند کر دینا چاہئے۔ بعد میں جب علم کی وسعت بڑھتی جائے گی، اور ہمارے فہم و ادراک کی تیزی اور باریک بینی ترقی کرے گی، تو جس طرح ہم مستقبل میں کشش ثقل کی حقیقت و نوعیت کے فہم کو ممکن سمجھتے ہیں، اسی طرح ہمیں جسم و ذہن کے تفاعل کا فہم بھی ممکن سمجھنا چاہئے، بہر حال علمی دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ امور واقعہ سے جان بوجھ کر چشم پوشی نہ کیجائے، یہ امر واقعہ ہے کہ کشش ثقل (یعنی مادی اجسام میں تفاعل) مادی دنیا میں جاری و ساری ہے، اسی طرح یہ بھی امر واقعہ ہے کہ عالم حیات کے ایک کثیر حصہ میں جسم و ذہن کا تفاعل بھی جاری و ساری ہے،

(۳) صرف حقیقتِ امر ہی کو اگر مدنظر رکھا جائے تو ہمیں ایک قدم اور آگے بڑھنا چاہئے، کیا یہ سچ نہیں ہو کہ جب سے انسان عالم شعور میں آیا ہو اُس نے اپنے جسم و ذہن (یا جسم و روح) کے تفاعل کو سب سے زیادہ بین حقیقت تسلیم کیا ہو؟ اور حقائق سے وہ انکار کرتا رہا ہے، لیکن اِس حقیقت کے انکار کی نہ تو اُسے کبھی جرأت ہی ہوئی ہے، اور نہ اس کے دل میں اس کا وہم تک گذرا ہے، کہ اس حقیقت کا انکار ممکنات میں سے ہے۔ انسان نے تہذیب کے ارتقا میں ہزاروں سال گذارے، اور پھر اُسے کشش ثقل کا خیال آیا، لیکن جسم و ذہن کا تفاعل اس کے شعور کے لئے اولیات کا کام دیتا رہا ہے، مادی اجسام کے تفاعل کا ادراک اسے بتدریج اور ہزاروں ٹھوکریں کھانے کے بعد ہوتا ہے، لیکن یہ حقیقت اسے اپنی شعوری زندگی کے پہلے ہی دن سے معلوم ہے کہ اگر چاہوں (ذہن) تو

باندھ دبلا سکتا ہوں، (جسم) اگر پاؤں میں کانٹا چبھ جائے (جسم) تو درد محسوس ہوتا ہے، اور طبیعت کا توازن بگڑ جاتا ہے، (ذہن) یعنی اُسے یقین ہے کہ میں اپنے خیالات سے اپنے جسم کو متاثر کرسکتا ہوں اور اپنے جسم سے اپنے خیالات کو متاثر کرسکتا ہوں، جہاں تک ہر انسان کے ذاتی مشاہدہ کا تعلق ہے جسم و ذہن کے تفاعل سے زیادہ صاف اور کھلی ہوئی حقیقت کوئی نہیں، تفاعل کی نوعیت (خواہ تفاعل مادی اجسام میں ہو یا جسم و ذہن میں) ابھی سائنس کے لئے ایک عقدہ سابن کررہ گئی ہے، لیکن قیاس یہی چاہتا ہے کہ اس عقدہ کی کشائش ذہن و جسم کے تفاعل کے بغور مطالعہ سے ہوگی،

(۴) ہر استقرائی[1] علم کی ترقی کی دو منزلیں ہوتی ہیں، اول منزل بیانیہ۔ دوسری منزل علّیہ۔ بیانیہ منزل میں اس علم کے لئے ضروری ہوتا ہے، کہ اپنے سے متعلق حوادثِ قدرت کو صحیح صحیح طور پر بیان کردے، تاکہ ان کے خط و خال، ان کے طرق کار اور ان کے متعلق باقی ضروری معلومات بلاکم و کاست قلمبند ہوجائیں۔ اس بیانیہ منزل میں کئی ایک تعمیمیں بھی ہاتھ آتی ہیں، اور ہر تعمیم اپنے اندر ایک بیانیہ قانون کی اہمیت رکھتی ہے، اس منزل کے طے ہونے کے بعد (اور بعض علوم میں اس منزل کے طے ہونے سے پہلے بھی) دوسری منزل یعنی منزل علّیہ شروع ہوجاتی ہے، اس منزل میں بھی ضروری ہوتا ہے، کہ ہر تعمیم کی وجہ اور علت ڈھونڈھی جائے، ہر امر کے متعلق کیوں، کیسے، کہاں سے، کس وجہ سے وغیرہ سوال کئے جائیں، اور ان کا حل ڈھونڈا جائے، یہی منزل اُس علم کی اصل آزمائش، اس کے درجہ کا حقیقی معیار اور اخیر میں اس کا معراج بنتی ہے، جہاں تک علوم جدیدہ کا تعلق ہے، وہ اس دوسری منزل کے ابتدائی مرحلوں

---

[1] استقرائی علم سے مراد سائنس کے وہ شعبے ہیں، جن کا انحصار تمام تر مشاہدۂ فطرت و قدرت اور تجربہ پر ہے۔ جسے عوام سائنس کہتے ہیں، وہ علوم استقرائیہ کا مجموعہ ہے،

سے ابھی پار نہیں ہوئے، اور ان کی ترقی کے راستہ میں ایک عجیب پتھر جو پڑا ہے، وہ یہی تفاعل کا عقدہ ہے، اس کے حل کے لئے سائنس کے لئے ضروری ہے، کہ جسم و ذہن کے تفاعل کی جس قدر مثالیں بھی اُسے مل سکیں، ان کو بیانیہ تعمیموں، کلیوں اور عمومیات کی شکل وصورت میں ڈھالا جائے اور پھر ان ہی سے جو چھوٹی چھوٹی اور کم مرتبہ ہوں، ان عمومیات کو چند بڑی اور زیادہ اہم تعمیموں اور کلیوں میں سمیٹا جائے۔ اس طریق کار سے مواد ترتیب پاجائے گا، اولیات طے ہوں گی، قوانین وضع ہوسکیں گے، اور پھر آخری حصار پر حملہ کے لئے (یعنی تفاعل کی علیت کی دریافت کے لئے) راستہ صاف ہو جائے گا، اس لحاظ سے عضوی نفسیات کی اہمیت جدید سائنس کے لئے بہت زیادہ ہے،

(باقی)

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن (علیگ) رفیق دار المصنفین

(۴)

ترمہ شیرین کا حملہ آگے چل کر فتوح السلاطین میں ترمہ شیرین کے حملہ کا بیان آتا ہے، برنی نے اس حملہ کے متعلق کچھ بھی نہیں لکھا ہے، تاریخ مبارک شاہی میں اس کا ذکر ہے، اور اس حملہ کی تاریخ ۷۲۹ھ یعنی دیوگیر کی پہلی تبدیلی کے بعد اور دوسری تبدیلی سے پہلے مذکور ہے۔ فرشتہ نے اسکی تاریخ ۷۲۷ھ لکھی ہے، جو غلط ہے، ترمہ شیرین کے حملہ کی تفصیل ہر مورخ نے بالکل مختلف لکھی ہے۔ فتوح السلاطین میں ہے، کہ ترمہ شیرین سندھ کے حدود سے گذر کر ملتان اور بھیرہ آیا، اس کے بعد عصامی رقمطراز ہے،

چو از پیک بشنید شاہ ایں خبر
که آمد صفِ فتنه نزدیک تر

بداں پور بغرا بفرمود شاہ
که راند سبک سوی میرٹھ سپاہ

برو با خود آں سرکش نامدار
زتازی سواران یل دہ ہزار

. . . .

چو فرمان شہ پور بغرا شنید
بزد کوس و افواج بیرون کشید

بمیرٹھ چو زد خیمه آں سرفراز
همی جست فرصت چو ترک دغا

مغلوں کو شکست ہوئی، ترمہ کا بھانجہ گرفتار ہوا، اور مغل بھاگے،

خبر چون بشاہ سرافراز گشت | کہ از ہند فوجِ مغل باز گشت
بزد کوس و بر بارگی بر نشست | سپہ راند دنبالِ شان در نشست
خزیدہ سواری فرستاد پیش | خود آہستہ میراند بنگاہ خویش
بتھانیسر آمد چو رایاتِ شاہ | فرستاد از آنجا فراوان سپاہ
بدنبالِ آن لشکرِ شوم پے | ہمی رفت لشکر بفرمان وے
. . . . | . . . .
چو دنبال شان کرد افواج ہند | بسے خوں نشاں ریخت تا آبِ سند
پس آنگہ ز تھانیسر آن بادشاہ | رواں کرد لشکر سوے تختگاہ

یحییٰ سرہندی کا بیان ہے کہ

"۷۲۹ھ میں قتلغ خواجہ کا بھائی اور خراسان کا بادشاہ ترمہ شیریں ایک انبوہ لشکر کے ساتھ دہلی پر حملہ آور ہوا، بہت سے حصار فتح کئے، اور لاہور، سامانہ اندری اور بدایوں کی حد تک لوگوں کو اسیر کر لیا، ... سلطان مقابلہ کے لئے دہلی اور حوض خاص کے درمیان ایک بڑے لشکر کے ساتھ اترا، ترمہ شکست کھا کر دریاے سندھ کی طرف بھاگا، سلطان نے اپنے لشکر کے ساتھ کلانور تک اس کا تعاقب کیا، کلانور کا حصار خراب ہو گیا تھا، اس لئے مجیر الدین ابورجا (یا محی الدین ابورجا) کے حوالہ کیا کہ اس کو درست کرے، اور بعض فوجی سرداروں کو ترمہ کے تعاقب میں بھیج کر دہلی کی طرف مراجعت کی"،

ابن بطوطہ اس حملہ کے پانچ برس بعد ہندوستان آیا، لیکن ہندوستان آتے وقت

۷۲۳ھ میں وہ خراسان میں ترمہ شیریں سے ملا، اس سلسلہ میں وہ لکھتا ہے:۔

"ہندوستان کا سلطان اور ترمہ شیریں ایک دوسرے کو بھائی کر کے مخاطب کرتے ہیں، .... یوران جب ترمہ شیریں کی جگہ ماوراء النہر کا حکمراں ہوا، تو آخر الذکر کا لڑکا شاہی (ادغلی)، اسکی بہن اور بہنوئی ہندوستان آئے، ہندوستان کا بادشاہ ترمہ شیریں کا دوست تھا، اس لئے وہ ان سے بہت لطف و کرم سے پیش آیا، اور ان کی پوری خاطر و تواضع کی، کچھ دنوں کے بعد ایک آدمی سندھ سے آیا، اور اپنے کو ترمہ شیریں بتایا، وہ پہچان لیا گیا، لیکن سلطان کے امراء میں خواجہ جہاں اور احمد ایاز نے اس سے کہا کہ ترمہ شیریں کی موجودگی خطرہ سے خالی نہیں خصوصاً جب اسکے قبیلے کے ۴ ہزار آدمی ہندوستان میں آباد ہو چکے ہیں، ان کے مشورے پر عمل کر کے سلطان نے ترمہ شیریں کو اپنی مملکت سے باہر کر دیا"۔

فرشتہ کا بیان اور بھی عجیب و غریب ہے:۔

"محمد تغلق کے ابتدائی زمانہ میں جب کہ حکومت پورے طور پر مضبوط نہ ہوئی تھی، ایک اسلامی بادشاہ مسمی ترمہ شیریں بن داؤد خان حاکم خاندان چغتائی جو اپنے وقت کا مشہور بہادر سخی اور منصف تھا، کثیر فوج اور جرار لشکر کو ہمراہ لے کر ہندوستان ۷۲۷ھ میں آیا، اس چغتائی حاکم نے لمغان اور ملتان سے لیکر دہلی کے دروازے تک بعض مقامات کو تاخت و تاراج کیا، اور بعض شہروں پر ہمیشہ کے لئے قبضہ کر کے حوالی شہر کو اپنا لشکر گاہ بنا لیا، محمد تغلق نے اپنے میں مقابلہ کی طاقت نہ پائی، اور عاجزی اور نیازمندی سے پیش آیا، بادشاہ نے چند معتبر امیروں کے وسیلہ سے اپنے چغتائی حریف کی خواہش کے موافق نقد و جواہر اس کی خدمت میں پیش کئے، اور اس طرح اپنی اور رعایا کی جان بچائی، ترمہ شیریں خان نے نواح دہلی سے تو کوچ کیا، لیکن گجرات پہونچکر اس نے جی کھول کر اسکو لوٹا

اور بہت سا مال غنیمت اور بے شمار قیدی گرفتار کرکے سندھ اور ملتان کے راستے سے

اپنے وطن کو روانہ ہوا"

ان متضاد بیانات پر کوئی رائے قائم کرنا مشکل ہے، لیکن عصامی اور یحییٰ قریب معاصر مورخ ہیں، اسلئے ان کے بیانات نسبتہً زیادہ صحیح قرار دیئے جا سکتے ہیں، خصوصاً جب عصامی اور یحییٰ کے بیان میں زیادہ اختلاف نہیں، بدایونی نے یحییٰ ہی کو صحیح سمجھا ہے، اسلیے اپنی منتخب التواریخ میں مبارک شاہی کی تحریر کو تھوڑے سے ردّ وبدل کے بعد نقل کر دیا ہے،

قراچل کی مہم | عصامی نے ترمشیرین کے حملہ کے بعد قراچل کی مہم (۷۳۸ھ) کا حال لکھا ہے، قراچل کو برنی نے قراجل یحییٰ نے قراجل، ابن بطوطہ نے قراچیل، فرشتہ، بدایونی اور نظام الدین نے ہماچل لکھا ہے، ایک انگریز اہل قلم کا خیال ہے، کہ قراچل کو دراچل کا فارسی نام ہے، جو سنسکرت میں کیلاش پہاڑ کے لئے مستعمل ہوتا تھا، مگر موجودہ دور کے بعض ارباب تحقیق کی رائے ہے، کہ قراچل کو دراچل نہیں، بلکہ کماچل کا فارسی نام ہے، اور کماچل موجودہ کمایون، گڑھوال کا پرانا نام تھا، بہرحال قراچل ہمالیہ کی ترائی کا علاقہ تھا، ہمالیہ ہی کی نسبت سے شاید فرشتہ، بدایونی اور نظام الدین نے قراچل کو ہماچل لکھا ہے، (چل کے معنی سنسکرت میں پہاڑ ہیں) مورخین صرف قراچل لکھتے ہیں، مگر یہ نہیں بتاتے کہ شاہی فوج اس کے کون سے حصہ میں گئی، ابن بطوطہ نے اس مہم کے سلسلہ میں دو جگہوں کے نام جدیہ اور ورنگل لکھے ہیں، جن پر شاہی فوجوں نے قبضہ کیا، مگر ان دونوں جگہوں کا تعین کرنا مشکل ہے، کیونکہ یہ نام اس علاقہ میں اب نہیں پائے جاتے ہیں، لیکن قراچل کو کماچل تسلیم کرلیں تو یہ کتنا آسان ہوگا، کہ شاہی فوج کمایوں گڑھوال کے علاقہ میں گئی،

عصامی نے اس مہم کے عجیب وغریب اسباب لکھے ہیں، :

یکے روز شہ اوّل بامداد — بہ گلگشت سوئے چمن سر نہاد

زگل گشت گلزارچوں بازگشت | بیازار باکوکبہ می گذشت
بہرسوے انبوہے خلق دید | کسے بود در بیع کس می خرید
بدل گفت آن شاہ آفاق سوز | کہ معمورست این شہروکشورہنوز
تدبیر باید تلف کردشان | ہمی داشت این رازدردل نہان
وزآن جا بدارالخلافہ رسید | ہمی چارۂ کشتن خلق دید
دگر روز کز غرفۂ آسمان | برآورد سرشاہ سیارگان
بفرمود تا طبل رحل زنند | یکے بارگاہے تبلیت زنند
خروش تبیرہ بگردون رسید | سپہ سربسر خیمہ بیرون کشید
بخسرو ملک گفت فرمان روا | کہ بودے پسر خواہرشاہ را
بسرلشکرے خیمہ بیرون زند | طنابش بران سوے گردون زند
زاقصائے دہلی سبک بگذرد | سپہ راکوہ قراجل برد

مگر ظاہر ہے کہ یہ سبب نہیں ہوسکتا ہے، برنی کا بیان ہی:۔

"اندیشۂ ششم سلطان محمد کہ اعمال آن واسطۂ خرق ختم مستقیم شدہ گشت اندیشۂ ضبط کوہ قراجل بودہ است وسلطان محمد را خاطر گشت کہ چون کیش نہادہاے ضبط خراسان و ماوراء النہر در کارشدہ است کوہ قراجل کہ درراہ نزدیک میان ممالک ہند وممالک چین حائل وحجاب شدہ مضبوط علم اسلام گردد تا راہ درآمد اسپ رفتن لشکر آسان شود"

لیکن خراسان اور ماوراء النہر کے راستہ میں قراجل کیسے آسکتا ہی، ہندوکش کی مقررہ راہ کو چھوڑکر قراجل ہوکر خراسان جانا خلاف عقل بات معلوم ہوتی ہے، چین کی تسخیر کی مہم میں قراجل حائل ہوسکتا تھا، شاید اسی غلطی کو محسوس کرکے فرشتہ نے لکھا ہی،

"اندیشۂ فرستادن لشکر کوہ ہماچل چنین است کہ سلطان بفکر تسخیر ولایت چین و ہماچل کہ مابین ولایت چین و ہندا ست افتادہ .... وہر چند ارکان دولت بکنایہ و تصریح معروض داشتند کہ این فکر مناسب نیست وہرگز نبودہ کہ بادشاہ ہندستان یک ذرع زمین ازان ممالک بتصرف درآوردہ و قبول نکرد و چون خسرو ملک و امرائے بیچارہ کہ بجز اطاعت چارہ نداشتند روانہ شدہ بکوہستان مذکور درآمدند جاہائے مناسب قلعہا بستہ و جمعیتے از پیادہ و سوار سپردہ بیشتر شدند، چون بسیارے از کوہہائے ہماچل راہ طے کردہ بحوالی شہرہائے سرحد چین رسیدند و عظمت و شوکت امرائے چین مشاہدہ کردند و محکمے حصار و تنگی راہہا و کمی علف بخاطر آوردند خوف و ہراس بر ضمائر ایشان مستولی شدہ عازم مراجعت گردیدند"

لیکن فرشتہ کے علاوہ کسی اور مورخ کے بیان سے یہ ظاہر نہیں ہے کہ سلطان محمد تغلق نے چین فتح کرنے کے لئے کوئی مہم بھیجی، برنی کی عبارت ہم پڑھ چکے ہیں یحییٰ لکھتا ہے:۔

"و فرمود تا کوہ قراجل کہ میان ممالک ہند و چین حایل شدہ است ضبط کنند، ہشتاد ہزار سوار با سران لشکر نامزد کرد و فرمود از انجا کہ در گھٹی در آیند در راہ تھانہا مستقیم کنند، تا لشکر را بوقت بازگشتن دشواری نباشد"

یحییٰ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے، کہ سلطان تغلق صرف قراجل کے علاقہ کو اپنی مملکت میں شامل کرنا چاہتا تھا، اور یہ بات ابن بطوطہ کی تحریروں سے بالکل واضح ہو جاتی ہے، وہ لکھتا ہے کہ

"کوہ قراجیل ایک بڑا پہاڑ ہے، جس کا طول تین مہینے کے سفر کا ہے، اور دلی سے دس منزل کے فاصلے پر واقع ہے، اس کا راجہ بہت بڑے راجاؤں میں ہے، بادشاہ

نے ملک نکبہ کو ایک لاکھ سوار اور پیادہ دے کر اس پہاڑ میں لڑائی کے لئے بھیجا اس نے شہر
جدیہ پر جو پہاڑ کے نیچے واقع تھا قبضہ کر لیا،......شاہی لشکر نے ورنگل کو بھی جو اس
پہاڑ کے اوپر تھا، فتح کر لیا، اور بادشاہ کو مبارکباد بھیجی،........جب برسات کا موسم
آیا، تو لشکر میں بیماری پھیل گئی،..... امیر نکبہ نے تمام خزانے اور جواہر لوگوں کو تقسیم کردئے
کہ ان کو پہاڑ کے نیچے پہنچائیں، ہندوؤں کو خبر ہوئی، تو غاروں اور تنگ جگہوں میں
بیٹھ گئے، اور راستہ روک لیا،..........اس طرح بہت سے آدمی مر گئے، لشکر میں
سے فقط تین آدمی بچ کر باہر آئے "

برنی کا بیان ہے کہ دس آدمی واپس آئے، مگر اس سلسلہ میں عصامی نے بہت سی ایسی
باتیں لکھی ہیں جو قطعاً صحیح نہیں،

سید جلال کی بغاوت قراجل کی مہم کے بعد عصامی محمد تغلق کے عہد کی پے در پے بغاوتوں کا ذکر کرتا ہے، ان
بغاوتوں کی ترتیب اور تاریخی کتابوں سے مختلف ہو مگر ہم عصامی کی ترتیب ہی کو پیش نظر رکھ کر ان
پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے،

سب سے پہلے سید جلال حاکم معبر کی بغاوت کا ذکر ہے، عصامی نے حسب معمول اس کی کوئی
تاریخ نہیں لکھی ہے، برنی اور ابن بطوطہ کے یہاں بھی کوئی تاریخ مذکور نہیں، یحییٰ، فرشتہ، اور
بدایونی نے ۷۴۲ھ لکھی ہی، (بدایونی نے غلط فہمی میں جلال الدین احسن شاہ کو بہمنی خاندان کے
بانی حسن گانگو سے خلط ملط کر دیا ہے) مگر الہ آباد یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کا خیال ہے، کہ اس
بغاوت کی تاریخ ۷۳۵ھ تھی، کیونکہ جلال الدین نے جیسا کہ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ بغاوت
کا علم بلند کرنے کے ساتھ ہی اپنے نام کا جو سکہ جاری کیا تھا اسی میں تاریخ ۷۳۵ھ لکھی
ہوئی ہے، جس سے تحقیق ہوتی ہے، کہ جلال الدین ۷۳۵ھ میں باغی ہو کر بادشاہ بن چکا

تھا، (دیکھو ہسٹری آف دی قرونہ ٹرکس، انڈین پریس الہ آباد، ص ۱۴۲-۱۴۱)

برنی کا بیان ہو کہ سلطان محمد تغلق جب قنوج میں تھا تو اسکو اس بغاوت کی خبر ملی، وہ دہلی آیا، اور فوج کو مرتب کرکے معبر روانہ ہو گیا، ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ سلطان روانہ ہونے سے پہلے ایک گانوں کوشنگ ندمیں ٹھہرا، جہاں آٹھ دن تک سامان فراہم کرتا رہا، پھر خواجہ جہان کو فوج کیساتھ آگے روانہ کیا، خواجہ جہان دھار پہونچا تھا، کہ اس کے بھانجے نے سازش کرکے اس کو قتل کرنا چاہا، مگر وہ مع اپنے ساتھیوں کے گرفتار کرکے بادشاہ کے پاس بھیجدیا گیا، جس نے ان کو ہاتھی کے پانوں سے کچلوادیا، اس کے بعد محمد تغلق کوچ کرکے دولت آباد پہونچا، عصامی نے اس کو بہت ہی اختصار سے لکھا ہی، برنی کا بیان ہو کہ دولت آباد پہونچکر محمد تغلق نے امراء و اکابر سے سخت مطالبے کئے اور پھر تلنگ کی طرف روانہ ہوا اور جب ورنگل پہونچا تو وہاں ایسی وبا پھیلی کہ اس کی فوج کے بہت سے سپاہی مرگئے، اور وہ خود علیل ہو گیا، فتوح السلاطین میں بھی یہی مذکور ہی،

سلطان معبر نہ جا سکا، اور دیوگیر واپس ہوا، اس کی علالت مرض الموت سمجھی گئی، اور سلطنت میں بغاوت ہو گئی، چنانچہ محمد تغلق تلنگ اور دیوگیر کے راستہ ہی میں تھا کہ اس کو دولت آباد کے حاکم ملک ہوشنگ کی بغاوت کی خبر ملی،

ہوشنگ کی بغاوت | برنی نظام الدین بدایونی اور فرشتہ نے ہوشنگ کی بغاوت کا ذکر نہیں کیا ہی لیکن عصامی نے کیا ہی،

بعہدی نشست ہمی رفت شاہ الاغی درآمد در اثنای راہ
دعا گفت و بنہاد سر بر زمین ہمی گفت کای ملجاء آدمین
ہما خان قتلغ مرا بے درنگ فرستاد بر شاہ فیروز جنگ
یکے راز پنہانیش گفت خان کہ این راز در سمع خسرو رسان
بگو کای جہانگیر فیروز جنگ ہمے شد کہ برگشت از شہ ہشنگ

زاقصائے اقلیم شہ عطف کرد | بکوہ بدسرا شدآن سست مرد
چواندر حوالی سپہ دررسید | شہنشہ سپہ را بجّاپاکشید،
بہرچند کان بارۂ پایدار | پنہ جائے ہندوست گاہ فرار
نزول سپہ کرد آن سرفراز | سپہ راند ہر سوئے ترک تاز
بگوش ہشنگ این خبر چون فتاد | بزوسروازاں مرز بیرون فتاد
باقصائے کوکن گریزان برفت | زاشترولی اشک ریزان برفت
ورنجا چنان شہسوار دغا | کہ درشب شتگا فد سرموے را
سلحدست وچالاک وچابک سوار | باقصائے ہندستان نامدار
دلاور بہودست فیروزجنگ | بہرکار بیکار یعنی ہوشنگ
غرض چوں کہ بشنید کان نابکار | سپردہ است کوکن عنان فرار
بفرمود کان خان قتلغ خطاب | رود زود بردستش اردشتاب
سپارد بدستش امان نامہ را | بحضرت کشد مرخود کامہ را
بفرمان شہ خان فیروزجنگ | جریدہ روان شد بسوئے ہشنگ
برفت ورسانید اورا بشاہ | وزآنجا بکتکہ روان شد سپاہ

سفرنامہ ابن بطوطہ اور تاریخ مبارک شاہی میں اس بغاوت کا ذکر ہے، ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ ہوشنگ ایک ہندو راجہ بربرہ کے پاس بھاگ کر چلا گیا جس کا علاقہ دولت آباد اور کوکن تھانہ کے بیچ میں تھا، سلطان تغلق نے تعاقب کرکے راجہ کے شہر کا محاصرہ کیا، راجہ ہوشنگ کو سپرد کرنے سے انکار کرتا رہا، مگر ہوشنگ خوفزدہ ہوا، اور اس شرط پر اپنے کو بادشاہ کے استاد قتلو (قتلغ) خان کے حوالہ کر دینا چاہا، کہ بادشاہ دولت آباد لوٹ جائے، چنانچہ محمد تغلق کوچ

کرکے دولت آباد چلا گیا، اور ہوشنگ قتلغ خان کے پاس آگیا جس نے اسکو اہل و عیال کے ساتھ بادشاہ کے پاس پہونچا دیا، محمد تغلق اس کے آنے سے بہت خوش ہوا، اور خلعت عنایت کیا، یحییٰ نے اس بغاوت کا حال بہت ہی مختصر لکھا ہے:-

"......تا تلنگ رسیدہ بود کہ رحمتی شد، از آنجا بازگشت و آوازہ شائع شدہ بودہ کہ سلطان را در پالکی مردہ می آرند، ملک ہوشنگ بدیدہن از فتنہ متواری شد (یا بدیدہیرا رفتہ متواری شد) چوں تحقیق کرد کہ سلطان زندہ است بازگشتہ بحضرت پیوست"

شاہو اور ہلاجوں کی بغاوتیں

عصامی نے شاہو کلچند راور ہلاجوں کی بغاوتوں کا حال ایک ساتھ بہت ہی مختصر لکھا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ یہ دونوں بغاوتیں ایک ہی وقت میں ہوئیں یحییٰ کا بیان ہے کہ ملک ہلاجون نے ۷۴۳ھ میں، اور شاہو نے اس کے فوراً ہی بعد ۷۴۴ھ میں بغاوت کی، بدایونی نے شاہو کی بغاوت کو نظر انداز کر دیا ہے، لیکن ملک ہلاجوں کی بغاوت کی تاریخ یحییٰ ہی کی تقلید میں ۷۴۳ھ لکھی ہے، فرشتہ نے عصامی کی طرح شاہو کی بغاوت کا بیان ہلاجوں کی بغاوت سے پہلے لکھا ہے اور ہلاجون کی بغاوت کا فوراً ہی ذکر کرکے اسکی تاریخ ۷۴۳ھ ہی لکھی ہے، لیکن برنی کا بیان ہے کہ سلطان محمد تغلق جب معبر کی بغاوت کو فرو کرنے کے سلسلہ میں دیوگیر میں مقیم تھا تو ہلاجوں کی بغاوت اسی زمانہ میں ہوئی، اس لحاظ سے اسکی تاریخ ۷۳۵ھ ہوتی ہے، ابن بطوطہ نے اس بغاوت کی کوئی تاریخ تو نہیں لکھی ہے لیکن اس کے بیان سے بھی صاف عیاں ہے، کہ یہ بغاوت معبر کے حاکم جلال الدین کی سرکشی کے بعد ہوئی، اس بغاوت کی جتنی تفصیل سفرنامہ ابن بطوطہ میں ہے کسی اور تاریخ میں نہیں،

اسی طرح شاہو کی بغاوت کی تاریخ ۷۴۴ھ صحیح نہیں ہو سکتی ہے، کیونکہ ابن بطوطہ ۷۴۳ھ میں ہندوستان چھوڑ چکا تھا، اور اس نے اس بغاوت کا ذکر اپنے سفرنامہ میں کیا ہے اور اس کے

سامنے شمالی ہند کی یہ آخری بغاوت تھی، محمد تغلق جب اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے گیا تو اس کا ذکر کرتے ہوئے ابن بطوطہ لکھتا ہے،

"بادشاہ ان دنوں ملک سندھ کو گیا ہوا تھا جب بادشاہ کو خبر ہونچی کہ میں تارک الدنیا ہوگیا ہوں، تو اس نے مجھے بلوایا، اور اس وقت بادشاہ سیوستان (سیہوان) میں تھا، میں فقیروں کے لباس میں بادشاہ کے سامنے حاضر ہوا، مجھ سے نہایت ملائمت کے ساتھ گفتگو کی، اور پھر ملازمت کر لینے کے لئے فرمایا، میں نے انکار کیا اور حج کے لئے اجازت طلب کی، بادشاہ نے اجازت دے دی............ یہ ماہ جمادی الثانی کا اخیر اور ۷۴۲ھ تھا"

اگر مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں ہلاجوں اور شاہو کی بغاوتوں کی تاریخیں علی الترتیب ۷۳۵ھ اور ۷۴۲ھ صحیح ہیں، تو پھر تعجب ہوتا ہے، کہ عصامی اور یحییٰ نے دونوں کو ایک ہی زمانہ کے واقعات لکھ کر کیوں خلط ملط کر دیا ہے،

ماہرو کی سرکشی

ان بغاوتوں کے بعد عصامی نے عین الدین ماہرو کی سرکشی کا ذکر کیا ہے، جس کی تاریخ یحییٰ، فرشتہ اور بدایونی نے ۷۴۲ھ لکھی ہے، لیکن یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ عین الدین کی سرکوبی کی مہم میں ابن بطوطہ محمد بن تغلق کے ساتھ تھا، اور جیسا کہ اوپر بیان ہوا ۷۴۲ھ میں وہ شاہی ملازمت چھوڑ چکا تھا، تو پھر یہ بغاوت اس سے پہلے ہوئی، برنی اور ابن بطوطہ کا بیان ہے، کہ محمد تغلق معبر کی مہم (۷۳۵ھ) پر جانے کے ڈھائی سال کے بعد دہلی لوٹا، اور دہلی میں کچھ دنوں رہکر سرگدواری آیا، جہاں وہ ڈھائی سال مقیم رہا، اور اس کے بعد عین الملک نے بغاوت کی، اس لحاظ سے اس کی بغاوت کی تاریخ ۷۴۱ھ ہو سکتی ہے، اس کے علاوہ برنی رقمطراز ہے کہ سرگدواری سے سلطان دہلی آیا، تو اس نے سکوں پر اپنے نام کے بجائے خلیفہ بغداد کا نام اور لقب نقش کرایا چنانچہ

ایڈورڈ ٹامس کے سکون کی فہرست میں محمد تغلق کے زمانہ کے ایک سکہ پر خلیفہ المستکفی باللہ ابو الربیع سلیمان کا نام منقوش ہے، اور تاریخ ۷۴۲ھ لکھی ہوئی ہے، اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ عین الملک کی بغاوت ۷۴۱ھ کے آخر تک ختم ہو چکی تھی،

عین الملک ماہر ظفر آباد، اور اودھ کا حاکم تھا، ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ جب ملک میں قحط پڑا تو محمد تغلق اپنا لشکر لیکر دریائے گنگ کے کنارے چلا گیا، جو دہلی سے دس منزل دور تھا جس سے ابن بطوطہ کی مراد سرگدواری ہے، یہاں عین الملک روزانہ بادشاہ کو پچاس ہزار من گیہوں، چاول اور چنے مویشی کے لئے بھیجتا تھا، ایک روز بادشاہ نے حکم دیا، کہ کیمپ کے ہاتھی، گھوڑے اور خچر دریا کے پورب طرف چرنے کے لئے بھیج دیئے جائیں اور عین الملک کو ان کی نگہبانی کے لئے مقرر کیا، عین الملک کے چار بھائی اور تھے، انھوں نے عین الملک سے ملکر سازش کی کہ بادشاہ کے ہاتھی اور مویشی بھگا لیجائیں، اور عین الملک سے بیعت کرکے اس کو بادشاہ بنائیں، چنانچہ عین الملک باغی ہو کر رات کو بھائیوں کے ساتھ فرار ہو گیا، اس بیان سے بغاوت کا اصلی سبب معلوم نہیں ہوتا اور عصامی نے بھی کوئی صاف وجہ نہیں لکھی ہی،

البتہ برنی اور یحییٰ کے بیان سے بغاوت کا اصلی سبب بالکل واضح ہو جاتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ سلطان نے دولت آباد کے ہر دلعزیز اور محبوب حاکم قتلغ خان کو دہلی بلا کر عین الملک کو اسکی جگہ پر بھیجنا چاہا، عین الملک ڈرا کہ بادشاہ دولت آباد بھیج کر اسکی ہلاکت کا سامان پیدا کرنا چاہتا ہے اسی لئے وہ کنارہ کش ہو کر باغی ہو گیا،

قنوج کے پاس شاہی لشکر اور عین الملک میں جنگ ہوئی، جس کی تفصیلات اور نتائج عصامی، ابن بطوطہ، برنی اور یحییٰ کے بیان کم وبیش یکساں ہیں،

نصرت خاں کی بغاوت

عین الملک کی سرکشی کے بعد عصامی نے نصرت خان کی بغاوت کا حال لکھا ہی جو ترتیب کے

لحاظ سے پہلے ہونا چاہئے تھا، برنی، ابن بطوطہ یحیی اور فرشتہ، اس کا ذکر عین الملک کی بغاوت سے پہلے کرتے ہیں، بدایونی کی ترتیب مختلف ہے، وہ نظام الملک حاکم کرہ عین الملک اور شہاب الدین نصرت خان کی بغاوتوں کا ذکر ایک ہی سال یعنی ۷۴۵ھ میں کرتا ہے، جو صحیح نہیں، یحیی اور فرشتہ نے بھی نصرت خاں کی بغاوت کی تاریخ ۷۴۵ھ لکھی ہے لیکن اگر ہم تسلیم کریں کہ یہ بغاوت عین الملک سے پہلے ہوئی، تو پھر اسکی تاریخ ۷۴۱ھ کے قبل ہونی چاہئے، اس کی تائید برنی کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ سلطان محمد تغلق نے دکن کے قیام کے زمانہ (۷۳۰-۳۵ھ) میں نصرت خان کو بیدر کا حاکم بنایا، اور اس عہدہ پر تین سال مامور ہونے کے بعد (۷۴۰-۳۹ھ) میں اس نے سرکشی کی،

عصامی نے اس بغاوت کا جو سبب لکھا ہے وہ بالکل غیر واضح ہے،

به بدرو بکو بر همان بیوفا بفرمانِ شہ بود فرمان روا،
یکایک بگشت از شہ بخت مند رسانید اطرافِ خود را گزند
یکے پور خواہر زجنس بغات بہ پیوستش ز کشور گوجرات
بافعال عفریت خورم بنام چو شیطان زیانکار ہر خاص و عام
ہمان غول یکسر زراہش ببرد یکایک بدست بلایش سپرد
ہم از اشتعالش سرے تافتہ است دماغش زسودا خلل یافتہ است

خورم کا ذکر کسی تاریخ میں نہیں آتا ہے، ابن بطوطہ نے یہ وجہ لکھی ہے، کہ تلنگانہ سے واپسی کے وقت جب محمد تغلق کی وفات کی خبر مشہور ہوئی تو نصرت خاں بھی علمِ بغاوت بلند کرکے بادشاہ بن بیٹھا، مگر بغاوت کی تاریخ ۷۴۰ھ پائی جاتی ہے، تو یہ وجہ کیسے قابلِ قبول ہو سکتی ہے، برنی کا بیان ہے کہ نصرت خان نے بیدر کی شاہی آمدنی میں سے ایک کروڑ تنکہ خیانت کر لیا تھا، اس لئے ڈر کر اطاعت سے منحرف ہو گیا، فرشتہ نے لکھا ہے کہ نصرت خاں نے ایک لاکھ تنکہ پر بیدر کا ٹھیکہ لیا تھا، ارقم مقررہ

اپنے وقت پر شاہی خزانہ میں نہ پہونچا سکا، اس لئے باغی ہوکر بیدر کے قلعہ میں چھپ گیا،

بغاوت کے سلسلہ میں جو جنگ ہوئی اسکا حال برنی، ابن بطوطہ، یحییٰ، فرشتہ اور بدایونی نے چند سطروں میں لکھ کر ختم کر دیا ہے، لیکن عصامی نے اس جنگ کی جو تفصیلات لکھی ہیں، وہ بہت ہی پر از معلومات ہیں، قتلغ خاں کی سرداری میں شاہی فوج کے منزل بمنزل کوچ، کتگھر کے مقام پر مخالف فوجوں کے مقابلہ، مدمقابل لشکروں کے سرداروں کے نام، جنگ کی ترتیب، قتلغ خاں کی فتح و کامرانی اور نصرت خاں کی ہزیمت و پسپائی کی پوری تفصیل موجود ہے، جو کسی اور تاریخ میں نہیں،

عصامی کا بیان ہے کہ قتلغ خاں نصرت خاں کی بغاوت کو فرو کرکے کوتگیر کی تسخیر کو گیا، جو کسی اور تاریخ میں مذکور نہیں، کوتگیر (؟) ایک پہاڑی علاقہ تھا جس کا حکمران ایک آتش پرست ہندو جیرہ مغلا تھا، اس مہم کا حال عصامی کے الفاظ میں ملاحظہ کریں،

سپہ راند خود جانب کوتگیر	بدر زید کسار ازان دار و گیر
چو خان معظم بمقصد رسید	سرِ رایت دین بفرقد رسید
ہمان جیرہ مغلا، مفسد نژاد	کہ آمد پدید از جہان فساد
بکوہے برآورده از خشت و سنگ	ببستہ ہمہ رہ گذرہای جنگ
نمونہ ازان بارهٔ استوار	بپرداز پیے سد بنای کار
چو خان معظم دران وز رسید	یکے دائرہ گرد او برکشید
تو گوئی کہ برگرد البرز کوه	زده خیمہ ایرانیان باشکوه
چو خان کرد ہر سو الگے تعیں	گرفتہ بہر سو ہزیمے زمیں
بہ آورد ہر سو یکے منجنیق	بخون می شد آن بہر دم غریق

بیک سو دوانید ثابات خانؑ بداں تا بود لشکرے را اماں

بہ بستند گرگج بسر کوب کوہ ہر انسان کہ بدخواہ کرد و ستوہ

دگر سو گرفتند یعنے نہاں ہمی رفت لشکر بفرمان خاں

چھ مہینے تک محاصرہ رہا، اور جنگ ہوتی رہی، آخر حصار کے اندر غلہ اور رسد کی کمی ہوئی تو جیرہ قلعہ چھوڑ کر فرار ہوگیا، اس کا تعاقب کیا گیا، تو صرف اسکی ایک لڑکی گرفتار ہوئی،

علی شاہ کی بغاوت — اس کے بعد ہی عصامی نے علی شاہ نتھو کی بغاوت کا حال بہت ہی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، برنی کا بیان ہے کہ نصرت خان کی بغاوت کے چند مہینے کے بعد علی شاہ جو ظفر خان علائی کا بھانجہ اور قتلغ خان کے ماتحت امیر صدہ تھا، دیوگیر سے روپیہ وصول کرنے کی غرض سے گلبرگہ گیا، اس علاقہ کو شاہی مقطع، والی اور سواروں اور پیادوں سے خالی پایا اور اپنے بھائیوں سے سازش کی، اور گلبرگہ کے تحصیلدار (متصرف) بھیرن کو قتل کر دیا، پھر بیدر و گلبرگہ کا مالک بن بیٹھا، سلطان محمد تغلق نے قتلغ خان کو علی شاہ کی سرکوبی کے لئے مامور کیا، اور امراء ملوک کو دہلی سے بھی بھیجا، قتلغ خان دھار پہونچ کر علی شاہ سے متصادم ہوا، علی شاہ شکست کھا کر بیدر میں پناہ گزین ہوا، لیکن یہاں بھی وہ پسپا ہوا، یحییٰ نے برنی ہی کے الفاظ کو نقل کیا ہے اور نظام الدین اور فرشتہ نے بھی برنی ہی کے اختصار کو لیا ہے، البتہ فرشتہ نے ایک نئی بات لکھی ہے، کہ اس بغاوت میں حسن گانگو بھی شریک تھا جو صحیح نہیں،

ان مورخوں کے مختصر بیانات کے بعد عصامی کی مندرجۂ ذیل تفصیلات ملاحظہ ہوں،

کونگیر کی مہم کے بعد قتلغ خاں نے کوبر (؟) کے مفسدوں کی سرکوبی کے لئے علی شاہ کو بھیجا، کوبر میں شاہی لشکر کا پڑاؤ ڈال کر علی شاہ نے باغیوں کو تاراج کرنا شروع کیا، ایک رات تلنگ کے مفسدوں نے اسکی فوج پر شب خوں مارا لیکن علی شاہ کے بھائیوں، احمد شاہ محمد شاہ

اور ملک اختیار نے ان کی ایسی سرکوبی کی، کہ وہ پھر نہ اُبھرے، اور علی شاہ نے کوبر میں ایک پرامن حکومت قائم کی،

باقصاے کوبر چو مسند نمود — علی شہ درو کام دل می براند
ہمہ کشور و شہر آباد گشت — ز اقصاے اقلیم صیتش گرفت
بہرسال آن مرد خلجی نژاد — بدیوان ہمی مال معہود داد
اطاعت ہمی کرد بر خان لُدم — شدہ شاکر از لطف او خاص و عام

دوسال کے بعد گلبرگہ کے اقطاع دار بہرن نے فتنہ پروری سے قتلغ خان کو علی شاہ کے غبن اور خیانت کی خبر دی، وہ چاہتا تھا کہ کوبر جیسا آباد اور خوشحال علاقہ بھی اس کو دیدیا جائے، قتلغ خان کو جب غبن کی خبر ملی تو کوبر کی مملکت کو بہرن کے سپرد کیا، علی شاہ کو یہ کب گوارا ہو سکتا تھا، اس نے اپنے ہمراہیوں اور بھائیوں کی ایک انجمن منعقد کی جس میں عبد اللہ، محمد شاہ، احمد شاہ اور ملک اختیار دین جمع ہوئے، ان میں سے عبد اللہ کے سوا ہر ایک غیظ و غضب کی آگ میں جل رہا تھا، مگر عبد اللہ خاں نے جو قتلغ خاں کا سپہ سالار تھا، دوراندیشی سے کام لینے کا مشورہ دیا، لیکن علی شاہ اور اسکے ہمراہیوں نے نہ مانا، اور ایک فوج لیکر گلبرگہ کی طرف بڑھے، اس پر قبضہ کرکے بہرن کو تہ تیغ کیا، اس کے بعد بدرکے حاکم محمود کو قید کرکے سکر پر حملہ آور ہوئے، کھنگر میں احمد قلعتا اور لاچین کو لڑکے ذانکا مقابلہ کیا لیکن علی شاہ کی فوج کو فتح ہوئی، اور اس نے دہار میں اپنی بادشاہت کا اعلان کرکے علاء الدین کا لقب اختیار کیا، سلطان محمد تغلق کو خبر ہوئی، تو آزمودہ فوجی سرداروں کے ماتحت دہلی سے ایک جرار لشکر قتلغ خان کے پاس بھیجا، قتلغ خان فوج لیکر دہار پہونچا، جہاں دونوں طرف کی فوجیں صف آرا ہوئیں، عصامی نے جنگ کی ترتیب میدان کارزار کی ہنگامہ آرائی، اور فوجی سرداروں کی نبرد آزمائی کا بہت ہی موثر نقشہ کھینچا ہے، جو اور کسی تاریخ

میں نہیں، علی شاہ کو شکست ہوئی، اور میدان جنگ سے بھاگ کر بدر کے قلعہ میں پناہ گزین ہوا مگر قتلغ خان نے اسکو بھی پانچ مہینے کے محاصرہ کے بعد تسخیر کیا، اور علی شاہ مع اپنے بھائیوں کے امن کا خواستگار ہو کر قتلغ خاں کے پاس حاضر ہوا، قتلغ خان نے ان کو محمد تغلق کے پاس بھیجدیا، عصامی اس کے بعد خاموش ہو جاتا ہے، لیکن برنی کا بیان ہے، کہ یہ قیدی سرگدواری آئے، جہاں بادشاہ قیام پذیر تھا، بادشاہ نے ان کو غزنی جلاوطن کر دیا، وہاں سے وہ بھاگ آئے، تو اُن کو پھر سزا دی، ابن بطوطہ کا بیان ہے، کہ وہ غزنیں سے واپس آئے، تو بادشاہ نے ان کو قتل کر دینے کا حکم دیا، یحییٰ، برنی کی طرح قتل کا ذکر نہیں کرتا ہی، بعد کے مورخوں میں فرشتہ اور نظام الدین بھی قتل کا ذکر نہیں کرتے ہیں، لیکن بدایونی نے لکھا ہی، کہ وہ قتل کر دیئے گئے،

اس بغاوت کی تاریخ یحییٰ نے ۷۴۶ھ لکھی ہے، جو صحیح نہیں، کیونکہ برنی کا بیان ہے کہ یہ بغاوت نصرت کی سرکشی (۷۳۹-۷۴۰ھ) کے چند مہینے کے بعد ہوئی، اور پھر علی شاہ گرفتار کر کے سرگدواری بھیجا گیا، سرگدواری میں شاہی قیام جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، ۷۴۱ھ تک رہا، اسلئے یہ بغاوت ۷۴۱ھ سے پہلے شاید ۷۴۰ھ میں ہوئی ہوگی،

اس کے بعد عصامی نے چاندگرہ (؟) کی ایک چھوٹی سی مہم کا ذکر کیا ہی، جو قتلغ خان کے بیٹے الپ خان کی سرداری میں واقع ہوئی، اس کا ذکر کسی اور تاریخ میں نہیں،

عصامی کا بیان ہی، کہ اسی زمانہ میں محمد تغلق نے لوگوں کو دیوگیر سے دہلی چلے آنے کا حکم دیا مگر برنی کی تحریر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ محمد تغلق کا یہ حکم اس وقت جاری ہوا، جب وہ ارنگل سے بیمار ہو کر دیوگیر ہوتا ہوا دہلی (۷۳۶ھ) واپس آرہا تھا،

(باقی)

"ریاضِ رضوانؔ"

از

شاہ معین الدین احمد ندوی،

اس عہد کے استادِ سخن حضرت ریاض خیرآبادی مرحوم کے دیوان کی اشاعت کا شائقین کو عرصہ سے اشتیاق تھا خوشی کا مقام ہی کہ ریاضِ رضواں" کے پردہ میں یہ بہار آگئی، یہ دیوان کئی مہینے ہوئے ریویو کے لیے آیا تھا، لیکن اب تک اس کی نوبت نہ آسکی، گذشتہ اپریل میں مرتبِ دیوان محترمی قاضی تلمذحسین صاحب رکن دارالترجمہ حیدرآباد نے اس لطیف پیرایہ میں ریویو کا تقاضا فرمایا کہ "اب تو ہولی کا موسم بھی گذرا جارہا ہی" موصوف کا یہ فقرہ کلام ریاض پر نہایت بلیغ تبصرہ ہی،

میں شاعر نہیں ہوں البتہ شعر و سخن کا ذوق ضرور تھا، لیکن اب عرصہ سے طبیعت ایسی بدل گئی ہی، کہ شعر سے لطف اندوزی کا ذوق بھی باقی نہیں رہا، اس لئے دیوان ریاض کے مطالعہ کی طرف طبیعت متوجہ ہی نہ ہوتی تھی، کئی مرتبہ کوشش کی، مگر طبیعت راغب نہ ہوئی لیکن فرض منصبی تھا کب تک معاملہ ٹلتا، بالآخر بادلِ ناخواستہ دیوان لے کر بیٹھا، دیوان کیا ہی میکدہ ہے غزلوں میں شراب کی تاثیر اور ہر شعر چھلکتا ہوا جام ہی، اس لئے جوں جوں آگے بڑھتا گیا، افسردہ طبیعت شگفتہ ہوتی گئی، اور شاعری سے مدتوں کی اکھڑی ہوئی طبیعت عارضی طور سے پھر مانوس ہوگئی، یہ بھی حسنِ اتفاق کہ اس میکدہ کی سیر کا اتفاق عین تو بہ شکن موسم ساون میں ہوا، بہرحال اس میکدہ کی سیر سے جو کچھ حاصل

۱؎ قیمت مجلد سے آٹھ روپیہ، پتہ:- قاضی تلمذحسین صاحب رکن دارالترجمہ حیدرآباد دکن،

ہوا ہے وہ خوش مذاق ناظرین کی ضیافت کے لئے پیش کیا جاتا ہے،

میکدۂ ریاض کی شراب اتنی تیز اور رنگین ہے کہ اسے پی کر نہ بہکنا بڑے ظرف کا کام ہے، اس لئے اگر سنجیدہ ناظرین کو کہیں قلم میں لغزش نظر آئے تو وہ میرا قصور نہیں، بلکہ بادۂ ہوشربا کا فیض ہے،

یہ دیوان مقدموں اور تبصروں کے علاوہ سوا سات سو صفحوں میں پھیلا ہوا ہے، شروع میں مہاراجہ کشن پرشاد بالقابہ، نواب اختر یار جنگ بہادر خلف حضرت امیر مینائی، مولوی سبحان اللہ صاحب رئیس گورکھپور اور نیاز فتحپوری کے قلم سے مقدمات اور تبصرے ہیں، اور فاضل مرتب کے قلم سے دیوان ریاض کی ترتیب و اشاعت کی روئداد ہے، ان مقدمون میں کلام ریاض کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ ہے، ان میں مولوی سبحان اللہ صاحب کا مقدمہ اپنی ندرت اور معنی آفرینی کے اعتبار سے قابل توجہ ہے، موصوف نے کلام ریاض سے نہ صرف تصوف کے رموز و اسرار منکشف کئے ہیں، بلکہ سیاست کے نکتے بھی حل کئے ہیں، یہ اُن کی دقت نظر ہے جہاں ہر شخص کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی،

اصل دیوان کے دو حصے ہیں پہلے حصہ میں جو ۴۰۰ صفحوں میں ہے، غزلیات ہیں اور دوسرے میں قصائد، ساقی نامہ، سہرے، قومی نظمیں، رباعیات، قطعات اور دوسری مختلف منظومات ہیں، دیوان کی حسن ترتیب کے لئے قاضی تلمذ حسین صاحب مرتب "کلید مثنوی" کا نام کافی ضمانت ہے،

ریاض اس دور کی یادگار تھے جب شاعری کی دنیا میں داغ و امیر کا طوطی بول رہا تھا، اور اقلیم شاعری میں انہی دونوں استادوں کی ٹکسال کا سکہ رواں تھا، پھر ریاض امیر کی مینا کے بادہ کش تھے، ان کی شاعری کا نشو و نما اسی دور کی فضائے شاعری میں ہوا، اس لئے ان کا ذوق و رنگ تمامتر اسی دور کا نمونہ اور ان کا کلام اس دور کی تمام خصوصیات

کا حال ہے،

ریاض نے بڑی عمر پائی، پرانی محفلیں دیکھیں، نئے جلسے دیکھے، شاعری کا نیا رنگ ان کی نگاہوں کے سامنے بدلا اور پھیلا، لیکن اولاً تو پرانے اساتذہ اس رنگ کو آنکھ نہ لگاتے تھے، پھر وہ بڑے ریاض پر پرانا رنگ اتنا گہرا تھا، کہ اس پر نیا خضاب نہیں چڑھ سکتا تھا، اس لئے انکی شاعری میں نئے رنگ کا کوئی اثر نہیں ہی،

ریاض امیر مینائی کے شاگرد تھے لیکن اس دور میں داغ کا رنگ اتنا مقبول ہوا کہ خود امیر مینائی کو اپنا پرانا طرز چھوڑکر داغ کا رنگ اختیار کرنا پڑا جس کا شاہد ان کے پہلے اور آخری دو کا کلام ہے، پھر ریاض کا فطری ذوق امیر مینائی کے مقابلہ میں داغ کے ذوق سے زیادہ مناسبت رکھتا تھا، اس لئے ان کے کلام میں داغ کا رنگ غالب ہی، انھوں نے داغ اور امیر مینائی دونوں کی خصوصیات کو اپنی شاعری میں سمو لیا تھا، اس میں زبان کی صفائی، سادگی، سلاست شیرینی، حلاوت اور برجستگی اور خیالات میں شوخی، بانکپن، رندی و سرمستی اور ظرافت و بذلہ سنجی داغ کی ہے، اور نازک خیالی اور معنی آفرینی امیر مینائی کی، اس طرح داغ اور امیر میں جو خصوصیات الگ الگ تھیں وہ ریاض میں یکجا نظر آتی ہیں، اسطرح انکی شاعری شراب دو آتشہ ہو گئی ہے،

چونکہ ان کا کلام امیر و داغ کے دور کی یادگار رہے، اس لئے اس میں تمام خصوصیات وہی ہیں جو اس دور کی شاعری کا طغراے امتیاز تھیں،

زبان کی نفاست اُن کے کلام کی ظاہری اور سب سے نمایاں خصوصیت زبان کی خوبی و پاکیزگی، سادگی و صفائی، لطافت و نفاست، محاوروں اور اصطلاحوں کا برجستہ استعمال ہی، کلام کیا ہے زبان کی ٹکسال اور محاوروں کا خزانہ ہے، اشعار ہیں کہ کھرے سکے ڈھل ڈھل کر نکلتے ہیں، فصاحت و بلاغت یہ ہو کہ کسی شعر میں ایک لفظ بھی حشو و نامناسب نہیں، جو لفظ جہاں ہو گویا نگینہ جڑا ہے، اگر اسے بدل دیا جائے

توزبان کا لطف خاک میں ملجائے گا، وہ الفاظ استعمال نہیں کرتے، بلکہ ان سے کھیلتے ہیں، داغ کے علاوہ کسی دوسرے شاعر کے کلام میں مشکل سے زبان کا یہ لطف مل سکتا ہی، ریاض کے کلام میں یہ وصف اتنا عام ہی کہ ایک شعر بھی اس سے خالی نہیں، اس لئے زبان کے نمونوں کی مثالیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں آیندہ مختلف مثالوں کے جتنے شعر آئیں گے کوئی لطف زبان سے خالی نہ ہوگا،

شوخی و رنگینی دوسری خصوصیت شوخی و رنگینی اور حُسن و عشق کے جذبات و معاملات کی بے ریا مصوری ہے، اس لحاظ سے ان کا کلام پریخانہ بلکہ بدمست میخانہ ہے، جہاں جلوت وخلوت کا کوئی امتیاز نہیں حسن کی ہر ادا بے محابا، کرشمہ و ناز کی ہر تصویر بے حجاب اور جذبات کا ہر مظہر بے باک ہے، عشاق کی بے تابیوں نے حریم حُسن کا پردہ چاک کر دیا ہی، کہیں کہیں یہ مناظر ایسے شوخ اور بے باکانہ ہیں کہ متانت آنکھیں نیچی کرلیتی ہے، یہ بے اعتدالیاں موجودہ مذاق کے لئے بہت گراں ہیں لیکن یہ ریاض کا قصور اور کلام ریاض کا نقص نہیں ہے، بلکہ ان کا ہنر ہے وہ جس دور کے شاعر تھے اس دور کا عام مذاق بلکہ کمال شاعری یہی تھا، اس لئے ایلورا اور ایجنٹا کے مناظر کی طرح ان آثار قدیمہ کی بھی قدر کرنی چاہیے، کہ اب یہ نمونے ڈھونڈھے نہ ملیں گے، کیا معلوم آج کا مذاق کل کیا درجہ پائے گا، ان کا سارا دیوان ان رنگینیوں بلکہ ہولی کی رنگ بیزیوں سے گلنار ہے، اسکی مثالیں آیندہ آئیں گی،

خمریات ان کی تیسری اور مابہ الامتیاز خصوصیت ان کے "خمریات" یعنی مے نوشی اور بادہ پرستی کے مضامین ہیں، یہ چیز ان کی شاعری کا طغرائے امتیاز ہے، اس میں مشکل سے ان کا کوئی حریف نکل سکتا ہی، وہ صحیح معنوں میں اردو کے ابونواس اور خیام ہیں، ان کا شاعرانہ کمال اسی میں نظر آتا ہی اور ان کے کلام میں سب سے زیادہ یہی چیز دکھانے کی ہی،

ان کا دیوان ایسا میخانہ ہے جس میں تنہا بادہ و مینا کا اہتمام نہیں ہے، بلکہ اسکی

زمین سے شراب کے چشمے اُبلتے ہیں، اس کے آسمان سے شراب کی گھٹا برستی ہے، ہر سمت شراب کی نہریں رواں ہیں اور ایسی لطیف خوش رنگ اور خوشبو کہ دیکھنے والا بے پیئے مست ہو جاتا ہے، ان کے خمریات میں مضامین کا ایک عالم نظر آتا ہے، اور ایسے لطیف و نازک کہ ذوق سلیم وجد کرنے لگتا ہے، ریاض نے شراب کی ایسی ایسی لطیف کیفیتیں بیان کی ہیں کہ شاید عالم مستی میں بھی مے پرستوں کا تخیل وہاں تک نہ پہنچتا ہو گا، اس میخانہ کے کچھ جام پیش کیے جاتے ہیں،

ہر مشرب میں پختگی کے لئے اخلاص اور عقیدہ کی پختگی جسے اصطلاحِ شرع میں ایمان کہتے ہیں ضروری ہے، ایمان مے پرستی یہ ہے کہ پی کر منہ پر نور کی جھلک آجائے،

پی کر بھی جھلک نور کی منہ پر نہیں آتی ہم رندوں میں جو صاحبِ ایمان نہیں ہوتا

مے پرستی کی عظمت و کرامت

بنائے کعبہ پڑتی ہے جہاں ہم خشتِ خم کھدیں جہاں ساغر ٹپک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے

ہر ایک قطرہ سے بہتی ریاض جوئے شراب جو پی کے ہم سرِ زمزم کبھی وضو کرتے

شراب کی علتِ جواز

جب اُن کے ہاتھ میں جامِ شراب ہوتا ہے حرام شے کا بھی پینا حلال ہوتا ہے

حرمت کا سبب

مے نوش ضرور ہیں وہ نا اہل جن پر یہ حرام ہو گئی ہے،

مے دو آتشہ کا جوش

تھی سر بمہر ٹوٹ گئی اپنے زور میں توبہ سے پہلے ٹوٹی ہے بوتل شراب کی

بادہ پرستوں کی نگاہِ جلال کا اثر

توبہ کی طرح ٹوٹتے ہیں سر بمہر خم کیا قہر ہے نگاہ کسی مے گسار کی،

ساقی کی تحریر کا رمز و کنایہ

اے سرشارِ محبت خطِ ساغر کو سمجھ — دستِ ساقی کی یہ تحریر تو کچھ کہتی ہے

اس "کچھ" کے پر لطف "ابہام" کی تشریح ہر شخص اپنے ذوق سے کر سکتا ہے،

ساقی کے پس خوردہ کی لذت

اپنی جھوٹی جو کبھی مجھکو پلا دیتا ہے — لبِ ساغر لبِ ساقی کا مزہ دیتا ہے

ساقی کے تبسم کا کتنا پر کیف اور لطیف اثر ہے،

میرے ساقی ترے تبسم سے — جام چھلکے چھلک پڑے خم سے

"تبسم" اور "چھلکنے" کی مناسبت بھی لائقِ غور ہے،

راہ کا پھیر

جاتے تھے سوئے میکدہ نکلے حرم میں ہم — کیا جانیں آج راہ میں کیا پھیر ہو گیا

بوئے شراب کی رہنمائی

کیا بہکتے بوئے مے تھی رہنما — میکدے جاتے کئی رستے ملے

یہ شعر حقیقت پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے، موج بادہ کی "رہنمائی"

کوئی جو بہکے نہ بڑھ کے راہبرِ موج — بتائے بادہ کشوں کو رہِ ثواب شراب

"رہِ ثواب" کے ٹکڑے نے شعر میں کتنا لطف پیدا کر دیا ہے،

مے پرستوں کی شانِ قلندرانہ

مست اپنی حال میں ہر ایک آتا ہے نظر — میکدے میں جا کے دیکھو جو گدا ہے شاہ ہے

منت کے اچھوتے جام

اچھوتے جام ہیں منت کے کچھ الگ رکھے — کسے پلائیں کوئی پارسا نہیں ملتا،

اس پارسائی کی نازک و لطیف شرح دوسرے شعر میں ملاحظہ ہو،

سب ہم نے مسکرا کے کھنگالے اچھوتے جام
یہ سُن کے میکدے میں کوئی پارسا نہیں

بیخودی میں ہشیاری

ہم گرے جب لڑکھڑا کر بزم میں
سرسبو پر ہاتھ ساغر پر پڑا

اس شعر پر شاد عظیم آبادی کا اس سے زیادہ لطیف شعر یاد آگیا،

لڑکھڑا کر جو گرا پاؤں پہ ساقی کے گرا
اپنی مستی کے تصدق کہ مجھے ہوش رہا

کمالِ مے پرستی کے نقطۂ نظر سے بعض الفاظ اور محاوروں کا استعمال اتنا برمحل ہوا ہے کہ شعر زمین سے آسمان تک پہنچ گیا ہے،

بُرا چال چلن

اک ہمیں ہیں کہ بہک جاتے ہیں توبہ کی طرف
ورنہ رندوں میں بُرا چال چلن کس کا ہے

عمر بھر کی کمائی لٹنا

توبہ کرتا ہوں میں دمِ نزع
لٹتی ہے کمائی عمر بھر کی

مے خلد مقام

جس دن سے حرام ہو گئی ہے
مے خلد مقام ہو گئی ہے

اپنی پونجی کے لئے کارِ خیر میں صرف کرنے کی وصیت

پاک طینت رند پی کر مجھکو پہنچائیں ثواب
میری پونجی نیک کاموں میں الٰہی صرف ہو

اس شعر کا تخیل اور ہر لفظ ریاض کے کمالِ استادی کی سند ہے،

زاہد شب زندہ دار کا شغل

پی پی کے اس نے سجدے کئے ہیں تمام رات
اللہ رے شغل زاہدِ شب زندہ دار کا

آخری دشوار مرحلۂ نزع کی آسانی کے لئے ایک رند کی دعا

حلق سے اُترے جو وقتِ نزع ٹپکائیں شراب ... اتنی آسانی الٰہی میری مشکل میں رہے

ٹپکا دے بوند بھر کوئی منہ میں ریاض کے ... دم مے کدہ میں توڑ رہا ہے پڑا ہوا

میخانے سے روح کے تعلق کا اثر

مر گئے پھر بھی تعلق جو ہے میخانے سے ... میرے حصہ کی چھلک جاتی ہے پیمانے سے

قبر کی حسرت و بیکسی کا علاج

مری قبر پر آ کے میکش پئیں ... گھٹا حسرتوں کی ہے چھائی ہوئی

"گھٹا" کے لفظ نے اور جان ڈال دی ہے،

جرأتِ رندانہ

پی کے آنا تھا کہ ہے روزِ حساب ... میکشو دیر میں فرصت ہو گی

خمریات کا ایک ضروری عنوان توبہ ہے، اس کے بعض نمونے اوپر گذر چکے ہیں چند مثالیں اور ملاحظہ ہوں،

توبہ کے بعد پیمانے کے ٹکڑوں سے محبت

بعد توبہ بھی یہ پھینکا نہیں جاتا ہم سے ... ہم لئے بیٹھے ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانے کو

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلبل خزاں میں پھولوں کی پراگندہ پنکھڑیوں کو پروں سے چھپائے بیٹھی ہے،

موسم گل کے اثرات خزاں میں

اتنی پی ہے کہ بعد توبہ بھی ... بے پئے بیخودی سی رہتی ہے

یہ شعر بھی حضرت ریاض کے کمالِ مے پرستی کا نمونہ ہے، اس موقع پر کسی فارسی

شاعر کا ایک شعر یاد آگیا،

خزان رسیدہ و زبوے بہار رفتہ ہنوز ذخیرہاے جنون در دماغ دل دارم

پاس وضعداری

وضع کے ساتھ رہی مست نگاہی کیسی دیکھ ساقی ہیں توبہ بھی نباہی کیسی

ہے ریاض اک جوانِ مست خرام نہ پئے اور جھومتا جائے،

متفرق اشعار

کیا کیا خوشامدیں ہیں کہ پی لوں بہار ہیں بادل کے ٹکڑے سر پہ مری چھائی جاتے ہیں

عادت سی ہو نشہ ہے نہ اب کیف پانی نہ پیا شراب پی لی،

بیعت پیر مغاں کی ہے جو توبہ کرکے یہی پانی مئے گلگوں کا مزا دیتا ہے

مزا تو آئے جو لیں رند بڑھکے ہاتھوں ہاتھ مزا تو آئے کہیں سے جو مُو اچھل کر چلے

رندان پاکباز کو پہنچائیں گے ثواب کورے گھڑے میں شیرہ انگبین رہے

برسا دی نور تو مری ریش سپید پر منہ دیکھتا ہے کیا مرے ساقی پلا مجھے

توبہ کرکے آج پھر پی لی ریاض کیا کیا کمبخت تونے کیا کیا،

کمر سیدھی کرنے ذرا میکدہ میں عصا ٹیکتے کیا ریاض آرہے ہیں

شراب و شباب شراب کی روح شباب بلکہ اس کی دلکش تعبیر ہے، جوانی کی شراب بادہ و ساغر کی محتاج نہیں اس کی ہر نگاہ موج شراب ہے، اس لئے شعرا، نے اس مئے دوآتشہ سے بڑے رنگین اور پرکیف مضامین پیدا کئے ہیں، ریاض کے میکدہ کی ویرانیاں آپ دیکھ چکے اب اُن کے خمکدۂ شباب کی رنگینیاں ملاحظہ فرمائیے، شباب کے ایسے رنگین اور دلآویز مرقعے کم نظر آئیں گے،

جوشِ شباب کی ایک تصویر

چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی ۔۔۔ تصویر کھینچیں آج تمھارے شباب کی

دوسری تصویر

جیسے ساقی تری ہنستی ہوئی تصویرِ شباب ۔۔۔ ہم نے دیکھا ہی چھلکتے ہوئے پیمانے کو

"چھلکتے ہوے پیمانہ" کی تشبیہ ہنستی ہوئی تصویر شباب سے کتنا رنگین اور پر کیف تخیل ہے،

تیسرا منظر

مے جوانی کی طرح جس سے اُبلتی ساقی ۔۔۔ تری تصویر مرے ہاتھ میں ساغر ہوتا

چوتھا رُخ

چھلکتے جام میں ساقی ذرا نمایاں کر ۔۔۔ جو کھچ کے آئی ہے تصویر ہی جوانی کی

شباب تصویر میکدہ ہے،

بدمست دل ہی آنکھ ہے ساغر شراب کا ۔۔۔ ساقی کا میکدہ ہی زمانہ شباب کا

جام شراب میں شباب کا عکس

کیا چھلکتا یہ کوئی جام شراب آتا ہے ۔۔۔ اے میں قربان مرا عہد شباب آتا ہے

شراب نوشی کے لئے شرط

آئے ہمارے آگے وہ ساغر شراب کا ۔۔۔ ساقی نے جس میں رنگ بھرا ہو شباب کا

اس کا نتیجہ

بھرے ساغر میں ہی بھر پور رنگ اُنکی جوانی کا ۔۔۔ غضب ہو بے پئے مستی میں میرا چور ہو جانا

شراب کی سر بمہر بوتلوں میں شباب کی راتیں بند ہیں،

یہ سر بمہر بوتلیں ہیں جو شراب کی ۔۔۔ راتیں ہیں اس میں بند ہماری شباب کی

چند مرقعے خالص شباب کے ملاحظہ ہوں،

وفور شباب :۔

کوئی شباب یہ ہو دیکھنے کی تاب نہ آئے　　شباب آئے مگر اس طرح شباب آئے

جوانی کی رنگین راتوں پر بہار گل صدقے

وہ شام و صبح صدقے ہو جس پر بہار گل　　چن چن کے ساتھ لائے ہیں راتیں شباب کی

شباب کی گریز پائی

بس ایک رات کا مہماں شباب ہوتا ہے　　غروب صبح کو یہ آفتاب ہوتا ہے،

"آفتاب" اور "غروب صبح" کی باریکیاں لائق غور ہیں،

وداع شباب،

کے دن ہوئے شباب کو رخصت کئے ہوئے　　اے ذوق معصیت ابھی توبہ گناہ ہے

بھولے ہوئے خواب کی یاد

نشئہ مے میں ذرا لطف شباب آتا ہے　　ہم جسے بھول گئے یاد وہ خواب آتا ہے

جوانی کی پرحسرت یاد

کیا پوچھتے ہو باتیں پیری میں جوانی کی　　وہ اور زمانہ تھا یہ اور زمانہ ہے،

آنکھ اور شراب اثر و کیفیت کے لحاظ سے شراب کے نشہ اور نشیلی اور مخمور آنکھوں کی مے باری میں کوئی نسبت نہیں، خماری انکھڑیاں بے پئے مست بنا دیتی ہیں، جس کا نشہ کبھی نہیں اترتا، اسلئے خمریات میں چشم مخمور کی شراب بڑی پرکیف ہوتی ہے، ریاض کے خمریات اس سے خالی نہیں ہیں، لیکن ان کے شراب کے مضامین اور مخمور آنکھوں کے مضامین سے کوئی مناسبت نہیں تاہم لطف سے خالی نہیں، دو چار مثالیں ملاحظہ ہوں،

نگہ مست سی کچھ موج کو نسبت ہی نہ تھی نرگسی آنکھ سے دیکھا کئے پیمانہ کو

خمار آلودہ آنکھوں پر ہزاروں میکدے صدقے وہ کافر بے پئے بھی رات دن مخمور رہتا ہے

چشم ساقی نے ہمیں آپ میں رہنے نہ دیا ہم کدھر آج گرے چھوڑ کے پیمانے کو

اہتمام اتنا مرے ساقی کی محفل میں رہے مست آنکھوں سے جو ٹپکے ساغروں میں آ رہے

اڑ کے آجائے وہ شے کھنچتی ہو جو انگور سے کچھ نگاہ مست سے کچھ نرگس مخمور سے

اس سلسلہ میں شاد عظیم آبادی اور اصغر مرحوم کے دو شعر لکھے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا،

دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار جب تک شراب آئی کئی دور چل گئے، (شاد)

عجب لطیف اشارے تھے چشم ساقی کے نہیں کبھی ہوا بے خود نہ ہوشیار ہوا، (اصغر)

تشبیہ خمریات | خمریات میں حضرت ریاض نے اتنی کثرت سے اور اتنی لطیف تشبیہیں پیدا کی ہیں کہ انھیں مستقل لکھنا مناسب معلوم ہوا،

ریزۂ مینا کی تشبیہ پھول کی پنکھڑی سے

میں رکھ لوں ریزۂ مینا کو دل میں ارے کس پھول کی یہ پنکھڑی ہے

فروغ مے کی نور سے اور ساغر کی چراغ طور سے

فروغ مے ہے یا عرش بریں سے نور آتا ہے کہ ساغر طاق سے بن کر چراغ طور آتا ہے،

مینا کی شجر طور سے

پھول برسائے عوض صاعقے کے مے کا فروغ شجر طور مری بزم میں مینا ہو جائے

موج مے کی شرر طور سے

شرر طور ہے جو موج ہے پیمانے میں بجلیاں کوندتی ہیں آج تو میخانے میں

بوتل کے کاگ کی دل سے اور خطِ پیمانہ کی نگہِ شوق سے،

کاگ بوتل کا اچھل کر دلِ مشتاق بنا نگہِ شوق لپٹ کر خطِ پیمانہ بنے

صراحی کے قہقہے کی بادل کی گرج سے، بوتل کی گھٹا سے، اور موجِ مے کی بجلی سے،

بادل کی گرج ہے کہ صراحی کے قہقہے بوتل میں موج ہو کہ ہو بجلی گھٹا کیساتھ

خُم کے خَم کی ابرِ رحمت کے جھکنے سے

خم مے لے کے نہ اڑ جائیگا اے پیرِ مغاں ابرِ رحمت جو جھکا ہو تو جھکا رہنے دے

ایک اور نادر و لطیف تشبیہ جس کا تعلق اگرچہ خمریات سے نہیں ہے، لیکن سننے کے لائق ہے،

نازک کلائیوں میں حنا بستہ مٹھیاں شاخوں میں جیسے منہ منڈھی کلیاں گلاب کی

شوخی رندانہ خمریات کا ایک شوخ اور دلچسپ پہلو واعظ و زاہد اور شیخ و محتسب کے ساتھ شوخی رندانہ ہے، ان دونوں طبقوں کی نوک جھونک بہت قدیم ہے، یہ چیز سب سے پہلے خیام نے شروع کی تھی، خواجہ حافظ نے اُسے کمال تک پہنچا دیا، درحقیقت ان لوگوں کا مقصد اس سے ریاکار واعظوں اور زاہدوں کی اصلاح اور ان کے عیوب کی پردہ دری تھی جیسا کہ خواجہ حافظ کا کلام شاہد ہے،

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند چوں بخلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند

مشکلے دارم ز دانشمندِ محفل باز پرس توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

گرچہ بر واعظِ شہر ایں سخن آساں نشود تا ریا ورزد و سالوس مسلماں نشود

غلامِ ہمت دُردی کشانِ یک رنگم نہ آں گروہ کہ ازرق لباس و دل سیہ اند

بادہ نوشی کہ درو ہیچ ریائے نبود بہتر از زہد فروشی کہ درو روی و ریا ست

مَی خور کہ صد گناہ ز اغیار در حجاب بہتر ز طاعتے کہ بہ روی و ریا کنند

من از پیر مغاں دیدم کراماتے مردانہ   کہ ایں دلق ریائی را بہ جامے درنمی گیرد

مے خور کہ شیخ و حافظ و قاضی و محتسب   چوں نیک بنگری ہمہ تزویر می کنند

خواجہ حافظ کے اس قسم کے سیکڑوں اشعار زبان زد خاص و عام ہیں،

لیکن بہت سی باتوں کی طرح جو کسی مصلحت و غرض کی بنا پر شروع کیجاتی ہیں، مگر بعد میں ان کی اصل روح غائب ہو جاتی ہے، اور محض اس کی ظاہری نقالی رہ جاتی ہے، ریا کار زاہدوں کی اصلاح کا مقصد تو فوت ہو گیا، محض ان پر طعن و طنز اور چوٹ ادر پھبتی رہ گئی، بلکہ اس طرح لوازم شاعری میں داخل ہو گئی، کہ مشکل ہی سے کسی شاعر کا کلام اس سے خالی نکل سکتا ہے، ریاض خمریات کے پیر مغان ہیں اسلئے انکی شاعری میں اس شوخی رندانہ کی بڑی کثرت ہے، چند نمونے ملاحظہ ہوں،

جناب شیخ نے جب پی تو منہ بنا کے کہا   مزا بھی تلخ ہے کچھ بو بھی خوشگوار نہیں

ذرا اس منہ بنانے کا تصور دماغ میں لائیے،

ایک پر لطف مذاق یا شیخ کی خفیہ مے پرستی پر لطیف تعریض دیکھیے،

قرض لایا ہو کوئی بھیس بدل کر شاید   مے فروشوں کا ہی زاہد سے تقاضا کیسا

ایک شوخ اور بے باک مذاق

جناب شیخ الجھتے ہیں کس تعلق سے   یہ دختِ رز کے کوئی رشتہ دار بھی تو نہیں

ریش کے خضاب رنگیں پر بدگمانی

یہ کیا دختِ رز تک رسائی ہوئی   جواب ریش زاہد حنائی ہوئی،

واعظ کی کم ظرفی

کیوں ابل پڑتے ہو میخانوں میں اکثر بیچ بیچ   واعظو تم بھی بڑے اوچھے بڑے کم ظرف ہو

بلند پروازی،

جام چھلکانے لگے بھر کر مئے کوثر سے آپ حضرت واعظ بہت اونچے گئے منبر سے آپ

عمامہ کا دلچسپ بدل

نہیں عمامہ تو سر پر سبوئے مے رکھ لیں جناب شیخ بہت آج ہلکے جاتے ہیں

پھبتیاں، "طرہ دستار" پر "دم روباہ" کی پرمعنی پھبتی

واہ رے دستار واعظ بے ریا بڑھ گیا طرہ دم روباہ سے

"واعظ بے ریا" اور دم روباہ" کی معنوی بلاغت کتنی دلچسپ ہے،

کوئی دیکھے اس کی جنبش اس کی گردش وقتِ وعظ طرۂ دستارِ واعظ بھی دم روباہ ہے

وقتِ وعظ طرۂ دستار کی گردش اور جنبش نے واعظ کی تصویر کھینچ دی ہے،

واعظ کے تن و توش پر خُم کی پھبتی،

سرِ بزم واعظ سے دبنا پڑا وہ خُم سے سوا تھا تن و توش میں

اس شعر کے ایک معنی تو ظاہر ہیں کہ واعظ مے پرست سے تن و توش میں سوا تھا، اس لئے دبنا پڑا دوسرے لطیف معنی ہیں کہ اس کا تن و توش خُم کے مشابہ یا اُس سے بھی بڑھ کر تھا جس پر کوئی بہت احتراماً ہاتھ نہیں اٹھا سکتے تھے،

واعظ کی شگفتگیِ بیان پر قلقل مینا کی پھبتی:

اتنی تو ہو بیان میں واعظ شگفتگی ہم رند سُن کے قلقلِ مینا کہیں جسے

واعظ کا احترام

میکدے میں جائے منبر خم ہی تھا اے میکشو میرے گھر واعظ جو آتے میرے سر پر بیٹھتے

بعض بعض اشعار میں یہ پھبتی متانت کے حدود سے گذر کر پھکڑ بن گئی ہے

ریشِ سفید کو ہے ضرورت خضاب کی — اے شیخ ڈال دوں کوئی کلی شراب کی

منہ زیرِ تاک کھولا واعظ بہت ہی چوکا — بیلوں نے داڑھی پکڑی خوشوں نے منہ میں تھوکا

منبر نہیں ہو تختِ شہی ہے یہ وقتِ وعظ — واعظ نہیں ہو جھوٹوں کا یہ بادشاہ ہو

جناب ریاض نے غریب حاجی کو بھی نہ چھوڑا معلوم ہوتا ہے انھیں کسی "ثواب فروش" حاجی سے سابقہ پڑ گیا تھا،

کیسی مے، مول لوں گا حج کا ثواب — ہے کہاں حاجی ثواب فروش

بادۂ عرفاں | مادی شراب سے زبردستی بادۂ عرفاں کشید کرنا اور خمریات کے مضامین کو خواہ مخواہ تصوف کے معنی پہنانا، خوش مذاقی کے خلاف ہو لیکن ہر شاعر کے خمریات میں مادی بادہ وجام کے ساتھ بادۂ عرفان کے بھی دو چار ساغر نکل آتے ہیں، ریاض کا کلام بھی اس سے خالی نہیں، اسلئے مے پرستی کے بعد اس کے کفارہ میں دو چار جام شراب طہور کے پیش کئے جاتے ہیں،

ملتی ہو در ساقی کوثر سے یہ خدمت — اس طرح کوئی پیر مغاں ہو نہیں سکتا

مے نورِ خدا ہوتی دل نورِ خدا ہوتا — تھوڑی سی جو پی لیتے کیا جانئے کیا ہوتا

اسی سے ملتا جلتا ہوا حضرت مجذوب کا ایک شعر یاد آگیا،

یہ آج تصور میں مرے کون حسیں ہو — ہر موشجر طور ہے دل عرش بریں ہو

جام جن کے رونقِ طاقِ حرم — ہوشیار ایسے بھی متوالے ہوئے

جھومتے ہیں بیٹھے حرم میں ریاض — آکے یہاں نشۂ سوا ہو گیا

بلا خوشبوں میں شاید آگیا ہو کوئی کعبہ میں — خم آتا ہی ہے طوف حرم خمی نہ آتا ہو

اے شیخ وہ کعبہ ہو یا ہو درِ میخانہ — تو نے مجھے جب دیکھا سجدہ ہی میں سر دیکھا

پی پی کے میں روتا ہوں در دِکرچمن بنا ہو — داغ جو کوئی پڑتا ہو تو یہ دامن دھوتی ہے

(باقی)

تلخیص و تبصرہ

ہندوستان کی پہلی مسجد

مندرجۂ بالا عنوان سے ایک ہندو مضمون نگار نے مدراس کے مشہور روزانہ انگریزی اخبار ہندو (مورخہ ۲۲ راکتوبر ۱۹۳۹ء) میں ایک مقالہ لکھا ہے جس کی تلخیص ذیل میں درج ہے،

ریاست کوچین میں قدیم چیر اسلطنت کے پایۂ تخت کرنگ نور کے پاس اراکولم تالاب کے کنارے ایک چھوٹی اور سادہ مسجد واقع ہے، اس کے ارد گرد کیٹولی کے قدیم مندر اور کرنگ نور کے حاکم کے مکانات کے کھنڈر اور سامنے ایک قبرستان میں بہت سے مقبرے ہیں، اس مسجد میں بعض ایسی خصوصیات ہیں، جن سے ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ پر کافی روشنی پڑتی ہے،

مالابار میں عام طور سے مشہور ہے کہ یہ ہندوستان کی سب سے پرانی مسجد ہے، اسکی بنیاد اسلام کے پیغمبر (صلعم) کی وفات کے چند سال بعد ہی پڑی، اس میں عجیب بات یہ ہے، کہ ہندوستان کی عام مسجدون کے برخلاف اس کا رُخ کعبہ کے بجائے مشرق کی طرف ہے، اور اسکے گرد ہندوؤں کا ایک مذہبی جلوس چکر لگاتا ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ مسجد اس وقت تعمیر کی گئی تھی، جب کرالا کے آخری بادشاہ نے اسلام قبول کیا تھا،

ایک اطالوی مصنف (J. T. Rivoira) نے اپنی کتاب "مسلم تعمیرات" میں

مسلمانوں کی مذہبی تعمیرات کے تین مدارج قرار دیئے ہیں، اس کا بیان ہے کہ ابتدا میں مسجدیں بھدی سادہ اور ایک دوسرے سے مختلف ہوتی تھیں، اسکی وجہ یہ تھی کہ ان کو یا تو مفتوحہ ممالک کے ملکی باشندے تیار کرتے تھے، یا ملکی معابد کے طرز پر نو مسلموں کی عبادت کے لئے ایسی مسجدیں بنادی جاتی تھیں، ساتویں صدی عیسوی کے آخر سے مسجدوں میں محراب، مینارے اور یکسانیت قائم ہوئی، محراب کی پہلی مثال فسطاط کی مسجد ہے، جس کو معاویہؓ نے ۷۳ھ میں بنوایا تھا، تین چار صدی کے بعد مسجدوں کی موجودہ شکل اس غرض سے شروع ہوئی کہ وہ درسگاہ کے کام میں بھی آسکیں،

اطالوی مصنف کی اس مستند رائے سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے، کہ مالابار کی یہ روایت کہ مذکورۂ بالا مسجد ساتوین صدی عیسوی کے وسط میں بنی، صحیح ہے،

مغربی سندھ کی مسجدوں مثلاً تھنبوار و اور کافرجوہاٹ میں شمالی دیوار میں ایک محراب ہے جس کا رُخ ملتان کی طرف ہے، مگر ان مسجدوں میں ایک محراب اور ہے جس کا رُخ مکہ کی طرف ہے، ملتان ساتویں صدی ہجری تک ایک مقدس مقام تھا، اسلئے یہ خیال ہے کہ عربوں نے اپنے حملہ کے زمانے میں پرانے ہندو مندروں کی جگہ پر یہ مسجدیں بنائی ہوں، اور شمالی دیوار کی محراب کو بجنسہ چھوڑ دیا ہو، لیکن جب مذہبی تعمیرات کا دوسرا دور شروع ہوا ہوگا، تو اس محراب کا اضافہ کردیا گیا ہوگا، جس کا رُخ مکہ کی طرف ہے،

کرنگنور کی مسجد کے متعلق بھی یہی خیال ہے کہ یہ کسی مندر کی جگہ پر بنائی گئی ہے، یہ ایک مندر کے پاس واقع ہے، اور اس کے گرد ہندوؤں کا ایک مذہبی جلوس گھومتا ہے، اس مسجد کے بننے کا ذکر مالابار کی ایک تصنیف کیرا اول پٹی (Keralolpatti) (جو ساتویں صدی عیسوی میں لکھی گئی ہے) اور شیخ زین الدین کی تحفۃ المجاہدین میں پایا جاتا ہے، اس کا حوالہ تامل زبان کی قدیم کتاب چیلاپدی کرم (Chilappadikaram) میں بھی ہے،

کیرالول پٹی میں اس کا ذکر اس طرح ہے:-

چیرامن کے آخری بادشاہ نے اپنے ایک فوجی سردار پت مل نائر کو موت کی سزا دی، کیونکہ اس کی بیوی نے اس فوجی سردار پر یہ الزام عائد کیا تھا کہ اس نے اسکی عصمت دری کی کوشش کی تھی جب فوجی سردار دم توڑ رہا تھا اس وقت معلوم ہوا کہ یہ الزام غلط تھا بادشاہ بہت نادم ہوا اور فوجی سردار سے اس گناہ سے نجات کا ذریعہ پوچھا، اوس نے نصیحت کی کہ وہ چوترا پورم کے یاوناجاجی (؟) کی خدمت میں جو اس وقت آدم کی چوٹی کی زیارت کے لئے لنکا جا رہا تھا، حاضر ہو اور اسکی معیت میں جہاز پر آسو جائے، اور وہاں چوتھے ویدیا اسلام کو قبول کرے، چنانچہ بادشاہ مذکور اپنی سلطنت کو اپنے اعزہ میں تقسیم کرکے عرب روانہ ہوگیا اور ایک بندرگاہ میں اترا جس کا نام زہار مخلہار (Zaha Zhakhalhah) تھا، اسلام کے پیغمبر کی عمر اس وقت ستاون برس کی تھی، اور وہ جدہ میں مقیم تھے، بادشاہ ان کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوا، اور اس کا نام تاج الدین رکھا گیا، اس کی شادی عرو (؟) (Arzazh) کے بادشاہ مالک بن دینار کی بہن سے کر دی گئی،

عرب میں پانچ برس کے قیام کے بعد بادشاہ مالک بن دینار اور اس کے پندرہ بچوں کے ساتھ زہار مخلہا واپس آیا، جہاں اوس نے ایک مکان اور ایک مسجد بنوائی، وہ یہاں سے مالابار جا کر اپنے نئے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کرنا چاہتا تھا، کہ بیمار پڑا اور مرگیا، اور اسی مسجد میں دفن کیا گیا، جو اس نے بنوائی تھی، موت سے پہلے اوس نے مالابار کے مختلف فرمانرواؤں کو عرب مبلغین کی مدد اور حفاظت کیلئے خطوط لکھے تھے، اسی زمانہ میں مالک بن دینار اپنے خاندان کے ساتھ دو جہازوں میں مالابار روانہ ہوا، ان میں سے ایک جہاز مالک بن دینار کے چوتھے لڑکے کی رہنمائی میں پانڈیا سلطنت کے حدود میں داخل ہوا، جہاں اس نے ایک مسجد بنوائی، دوسرا جہاز کرنیگ نور پہونچا، مالک بن دینار نے بادشاہ مذکور کا خط چیرا خاندان کے حکمران کو پیش کیا، اور اسکی اجازت سے ارکولم تالاب کے کنارے کرنیگ نور

کی مسجد تعمیر کی، اس کے رشتہ داروں نے مالابار اور جنوبی کنارا میں تو مختلف مسجدیں اور بنوائیں،

تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ یہی روایت تحفۃ المجاہدین میں بھی مذکور ہے، لیکن اس کے مصنف کی رائے ہے کہ یہ واقعات پیغمبر اسلام کی زندگی میں نہیں، بلکہ شاید ۸۲۲ء کے قریب ہوئے اس کا یہ بھی خیال ہے کہ مذکورہ بالا چیرا بادشاہ کا مقبرہ عرب کے جنوبی ساحل ظفار میں ہے، نہ کہ بحر احمر کے عرب ساحل پر، جیسا کہ موپلا کی روایت ہے، اور عرب میں یہ مقبرہ عام طور سے السموری کے نام سے مشہور ہے،

لیکن شیخ زین الدین کی رائے صحیح نہیں، مالاباری کی روایت زیادہ مستند ہے، کیونکہ کرینگ نور کی مسجد کا طرز تعمیر بھی اسی روایت کی تائید میں ہے، (Halasya - Mahatmyam.) اور (Sthlapurana) کا بیان ہے کہ عرب پانڈیا سلطنت میں کیجا پانڈیا کے زمانہ میں آئے، جس کا زمانہ ساتویں صدی عیسوی کا وسط ہے، اس بیان سے بھی مالابار کی مذکورۂ بالا روایت کی تصدیق ہوتی ہے، زین الدین نے مقبرہ کا نام السموری بتایا ہے، لیکن اس کو شاید کالی کٹ کے زمورون کے نام سے غلط فہمی پیدا ہوئی ہے، زمورون کا خاندان مذکورۂ بالا بادشاہ کے خاندان سے بالکل جدا ہے،

مالابار کی روایت کے صحیح ہونے کے شواہد اور بھی ہیں، بادشاہ مذکور کے سفر عرب کی تاریخ ۶۲۲ء بتائی جاتی ہے، یہ سال اسلام کی تاریخ میں نہایت اہم ہے، کیونکہ اسی یا اسی کے متصل سال میں پیغمبرؐ نے مصر، ایران، چین اور قسطنطنیہ کے حکمرانوں کے پاس دعوتِ اسلام کے لئے قاصد بھیجے، ممکن ہے کہ اسی طرح کوئی قاصد لنکا اور جنوبی ہندوستان بھی آیا ہو، جیسا کہ عربوں کی آبادی لنکا میں بہت پہلے سے تھی، اسلئے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ آسو کے حاجی نے حضرت آدم کی چوٹی کی زیارت کے لئے لنکا کا سفر کیا ہو، آسو دراصل عربی نام عیسیٰ کی خرابی ہے، یہ جن کا

یمن کا ایک ضلع ہے، جو عرب کے جنوب مغرب میں واقع ہے، پیری پلس کے عہد میں عرب کے ساحل پر بحر احمر کا ایک بندرگاہ تھا، جو صفار (Sapharaz) کہلاتا تھا، یہ حمیری اور سبائی حکمران یعنی یمن کے بادشاہ کے مقبوضات میں تھا، یمن نے رسول اللہ صلعم کے ابتدائی دور ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا، اور یہ چودہ اسی مخلاف (پرگنہ یا ضلع) پر تقسیم تھا، مالابار میں جو نام زہار مخلا سے مشہور ہے وہ دراصل صفار مخلا ہوگا، یہ مقام جیسا کہ پری پلس میں مذکور ہے، بحر احمر کے ساحل پر واقع تھا، اسلئے بہت ممکن ہے کہ مذکورہ بالا بادشاہ عسیر کے حاجی کے ساتھ اسی مقام پر اترا ہوگا، جدہ جہاں اس زمانہ میں پیغمبر صلعم مقیم تھے، العسیر سے شمال کی جانب میں تھوڑے ہی فاصلہ پر واقع ہے،

مالک ابن دینار کا تعلق قبیلہ عدنان سے معلوم ہوتا ہے، اسی قبیلہ سے پیغمبر (صلعم) تھے، چنانچہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ مذکورہ بالا بادشاہ نے پیغمبر کی بھتیجی سے شادی کی، مالابار کی روایت میں مالک ابن دینار کو عرو (؟) (Rohk) کا حکمراں بتایا جاتا ہے، اس عرو سے شاید بدوؤں کے قبیلہ جہینہ کی شاخ عرو (؟) مراد ہو، یہ قبیلہ مذہب اسلام میں شروع سے راسخ رہا، اور پیغمبر کی زندگی ہی سے وادی الحس پر قابض تھا، جو مدینہ کے جنوب سے بحر احمر کے ساحل وجہ تک پھیلی ہوئی تھی" (م ع)،

معارف:۔ یہ روایت بہت کچھ تصحیح کی محتاج ہے، اور اس سے پہلے معارف میں "ہندوستان میں اسلام کی اشاعت" کے تاریخی سلسلہ میں اس کا ذکر آچکا ہے، جدہ آنحضرت صلعم کا آنا کبھی ثابت نہیں، صفار مخلا اگر دو نام بتائے جائیں تو ان کی اصلیت ظفار اور مخا قرار دی جاسکتی ہیں، یہ دونوں یمن کے بندر تھے، صحابہ کرام میں مالک بن دینار نام کا کوئی نہ تھا، البتہ ایک تابعی تھے، لیکن وہ عجمی النسل بصری اور آزاد شدہ غلام تھے، ۱۲۳ھ سے ۱۳۱ھ تک کسی سنہ میں ان کی وفات ہوئی، پھر اس زمانہ میں حضرت آدم علیہ السلام کی زیارت کا شوق بھی مسلمانوں میں پیدا نہیں ہوا تھا، البتہ اسلام کی دوسری صدی کے بعد یہ سلسلہ شروع ہوا،

حسد

اکثر دیکھا گیا ہے کہ دو خاندانوں میں گہرا ربط ہوتا ہے لیکن کچھ عرصہ کے بعد وہ ایک دوسرے سے برگشتہ ہو جاتے ہیں، یا بعض میاں بیوی کی ازدواجی زندگی کا آغاز محبت سے ہوتا ہے مگر بہت جلد ان میں اختلاف شروع ہو جاتا ہے، یا دو دوست ایک زمانہ تک شیر و شکر رہتے ہیں، لیکن یکایک ان میں سخت دشمنی پیدا ہو جاتی ہے، آخر ایسا کیوں ہوتا ہے،

ہم جب کسی سے محبت کرتے ہیں، تو اس محبت میں ہم اپنی شخصیت پر کچھ پابندیاں عائد کرتے ہیں، کیونکہ ظاہر ہے کہ محبوب کا ہر فعل ہمارے جذبات اور احساسات کے مطابق نہیں ہو سکتا، چنانچہ کسی شخص سے خواہ کیسی ہی شدید محبت کیوں نہ کرتے ہوں لیکن ایک ایسا وقت ضرور آتا ہے، جب کہ اسکی بعض باتوں سے ہم کو غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے یا اسکی کسی رائے سے سخت اختلاف ہو جاتا ہے، یا اسکی بعض حرکتیں سخت ناگوار معلوم ہوتی ہیں،

ان کا ردِ عمل ہماری شخصیت پر ہمارے جذبات کے نشو و نما کے مطابق ہوتا ہے، اس قسم کا ردِ عمل اگر بچپن میں ہوتا ہے، تو طبیعت میں سخت قسم کی آزردگی اور حسد پیدا ہو جاتا ہے، جو زندگی کی مسرتوں کے لئے مہلک ہے، بچے عموماً اپنے والدین سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں لیکن اگر ان کو یہ احساس ہو جاتا ہے کہ وہ والدین کی محبت کا واحد مرکز نہیں، یا ان کے والدین ان کو نظر انداز کرتے ہیں، تو غیر شعوری طور سے ان کے دل میں تکدر اور ناراضگی پیدا ہو جاتی ہے، جس کا اظہار مختلف پیرایہ میں ہوتا ہے، مثلاً وہ اپنے چھوٹے بھائیوں اور بہنوں کو نظرِ التفات سے دیکھنے کے بجائے ان سے ہمیشہ متنفر رہتے ہیں، اور ان کا تنفر بعض اوقات نفرت کی حد تک پہونچ جاتا ہے،

بچپن کا یہ تکدر اور تنفر سنِ بلوغ تک قائم رہتا ہے، جس کا لازمی نتیجہ احساسِ کمتری ہے،

ایسے بچے بالغ ہوجانے کے بعد بھی اپنے جذبات کے لحاظ سے کمسن بچے ہی رہتے ہیں، اسباب وادراک کے بجائے احساسات وجذبات اور دماغ کے بجائے دل کے تاثرات کے محکوم ہوجاتے ہیں،

ایک جوان کی محبت کی نوعیت اس سے مختلف ہوتی ہے، جب وہ کسی دوست سے محبت کرتا ہے، تو اس کو اس سے ہرگز یہ توقع نہیں ہوتی ہے کہ وہ اپنے انس وشفقت میں جذب اور اس کے سوا اپنی ساری دلچسپیوں سے بے تعلق اور بے نیاز ہوجائے گا، وہ سمجھتا ہو کہ ایک حاسد شفیق دوست اور کامیاب شوہر نہیں بن سکتا، بلکہ وہ اپنے دوست اور بیوی کے لئے وبالِ جان ہوتا ہو، لیکن اس کے باوجود اس کے دل میں شکوک پیدا ہوجاتے ہیں، کہ ممکن ہو کہ آگے چل کر اسکی دوستی اور محبت قائم نہ رہے، یہ شک پیدا ہوتے ہی اس کو اپنے دوست کے دوسرے رفقا اور احباب سے اس تخیل کی بنا پر حسد اور جلن ہوتی ہے، کہ ممکن ہو کہ ان میں سے کوئی اس کی جگہ کو غصب کرلے، اسی طرح وہ دوست کی بڑھتی ہوئی کامیابی سے بھی غیر مطمئن ہوجاتا ہو کہ ممکن ہے کہ وہ ایک خوشحال، بااثر اور مقتدر شخص ہوکر اس سے غافل ہوجائے اور وہ دنیا میں تنہا رہجائے یہ خیال پیدا ہوتے ہی اس پر احساسِ کمتری کی تمام برائیاں غالب آجاتی ہیں، اور اسکے دل میں یہ بات جاگزیں ہوجاتی ہو کہ وہ محبت کئے جانے کے لائق ہی نہیں، گو وہ اس کا اظہار نہ کرتا ہو، رفتہ رفتہ دوست یا محبوب کی طرف سے یہ شک اور بے اطمینانی سوہانِ روح ہوجاتی ہو جن سے بعض اوقات قتل اور خودکشی کی وارداتیں پیش آجاتی ہیں، جذبات پر قابو رکھنے والے افراد تو اپنے رنج وحسد کے غیظ وغضب کو مغلوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر قابو نہ رکھنے والے اشخاص خود مغلوب ہوجاتے ہیں، وہ اپنی خامی، کمزوری، نقص اور عیب پر غور کرنے کے بجائے سارا الزام انکے دوست پر رکھتے ہیں، جسکے بعد نہ صرف شکر رنجی، اختلاف اور تصادم بلکہ بعض اوقات قتل اور خودکشی کی

احتمال پیدا ہو جاتا ہے، کیونکہ افتراق کے بعد گہرے دوستوں کی دشمنی بھی بڑی شدت کی ہوتی ہے،

جب حسد کا مادہ دل میں پیدا ہو گیا تو اس کا نکالنا بڑا مشکل کام ہے، کیونکہ کسی حاسد کو یہ باور نہیں کرایا جاسکتا ہے کہ وہ دوسروں کی کامیابی کو بری نظر سے دیکھتا ہے، اور دوسروں سے خواہ مخواہ نفرت کرتا ہے، جب اسکو ان باتوں کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے، تو وہ اپنے پندار و خود بینی میں اپنے کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے،

مگر ایک ماہر نفسیات کے لئے وہ پھر بھی قابلِ اصلاح ہے، اگر ہم کسی کو حاسد یا محرور المزاج یا دائمی مغموم یا تنہائی پسند پاتے ہیں، تو اس کے ہرگز یہ معنے نہیں کہ وہ اس طرح پیدا ہی ہوا ہے، بلکہ اس کی طبیعت کا یہ رنگ بچپن خصوصاً اس کے پہلے پانچ سال میں پیدا ہوتا ہے، جو سنِ بلوغ میں فطرت ثانی بن جاتا ہے، لیکن ان تمام چیزوں کی اصلاح ہو سکتی ہے، بشرطیکہ جب کوئی شخص اس کیلئے آمادہ ہو جائے، ایک حاسد اپنے حسد کے اسباب و علل معلوم کرنے کے بعد اپنی اصلاح خود کر سکتا ہے، مثلاً ایک عورت ہر حسین عورت کو محض اسلئے ناپسند کرتی ہے کہ وہ اسکی طرح حسین، قابلِ التفات اور دلکش نہیں، اسکی یہ ناپسندیدگی محض اسکے احساس کمتری کا نتیجہ ہے، وہ حسین نہ سہی لیکن وہ اپنے اخلاقِ حسنہ اور اوصافِ حمیدہ سے اپنے کو قابلِ توجہ اور دلکش بنا سکتی ہے،

حسد کے ازالہ کی ایک صورت اپنے فرائضِ منصبی میں غیر معمولی مشغولیت بھی ہے، اس مشغولیت میں اگر کوئی کامیابی اور ترقی پیشِ نظر ہو، خواہ وہ کوئی بلند اور اعلیٰ ترقی نہ ہو، تو بھی اس سے خودداری، خود اعتمادی اور عزتِ نفس پیدا ہوتی ہے، جس سے احساسِ کمتری کا انسداد ہوتا رہتا ہے،

حُسنِ اخلاق سے بھی حسد دور کیا جا سکتا ہے، اگر طبیعت میں صلح و آشتی اور سیرت و کردار میں سلامت روی ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ لوگ محبت سے پیش نہ آئیں، اور جب محبت کی محرومی نہیں ہے تو پھر دلوں میں کبھی حسد کی گنجائش پیدا نہیں ہو سکتی ہے،

"ص ع"

اخبارِ علمیّہ

یورپ مین مسلمانون کی آبادی

یورپ میں روس اور ترکی کے علاوہ مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی یوگوسلاویا، البانیہ، ہنگری، بلغاریہ، رومانیہ، یونان اور پولینڈ میں ہے، یوگوسلاویا میں ۱۲،۹۰۰۰ مسلمان آباد ہین، ان کی ایک قومی اور مذہبی جماعت ہے جس کا صدر رئیس العلماء کہلاتا ہے، رئیس العلماء کے ماتحت مذہبی پیشواؤن کی دو مجلسیں ہیں، جن میں ایک سراجیوو اور دوسری اسکوبلجی میں ہے، ایک محکمۂ وقف بھی ہے، جس کی جانب سے ۸۰۰ مکاتب قائم ہین، ان میں مذہبی تعلیم دیجاتی ہے، سرکاری صنعتی اسکولون میں بھی مسلمانون کی مذہبی تعلیم کا انتظام ہے، ۴۰ کالج ہین، ان میں ایک لڑکیون کا ہے، سراجیوو مین گت بے مدرسہ (Gutbey Madrassa) ۴۰۰ برس سے قائم ہے، اس کے تعلیم یافتہ اشخاص عزت کی نظرون سے دیکھے جاتے ہیں، مسلمانوں کے مقدمے شریعت کے مطابق فیصل ہوتے ہیں، اس کے لئے عدالتیں قائم ہیں، جو ۱۹۲۹ء سے پہلے صرف مسلمانون کی آبادی میں تھیں، لیکن ۱۹۳۶ء کے بعد یوگوسلاویا کے ہر حصہ میں قائم ہوگئی ہین،

البانیہ میں مسلمانون کی زیادہ تر آبادی بکتیشع صوفی گروہ کی معتقد ہے، یہاں عورتون کا درجہ بہت بلند ہے، ملک کے ہر حصہ میں اسلامی عہد کی پرشوکت یادگاریں موجود ہیں، مسلمان عام طور سے مذہبی واقع ہوئے ہیں، لیکن ان کی تعلیم خصوصاً مذہبی تعلیم بہت اعلیٰ نہیں ہے،

ہنگری میں ۳۰۰۰ مسلمان ہیں جن میں ۵۰۰ صرف بوداپسٹ میں ہیں اسٹ ۱۹۱۶ء سے حکومت نے مذہب اسلام کو سرکاری طور سے تسلیم کر لیا ہے ۱۹۳۱ء سے پہلے یہاں مسلمانوں کیلئے کوئی مسجد اور مدرسہ نہ تھا، لیکن اب انھوں نے اپنی عبادت گاہ بنالی ہے،

یونان کی کل آبادی ستر لاکھ ہے جس میں مسلمان ۴۰۰۰۰ ہیں، ان میں زیادہ تر ترکی نسل سے ہیں، کچھ بلغاری اور کاکیشین بھی ہیں، یہ لوگ زیادہ تر شمالی اور جنوبی تھریس میں آباد ہیں، جنگ عظیم سے پہلے سالونیکا میں ۴۴ مسجدیں تھیں، لیکن اب ان میں سے بعض گرجا بنالی گئی ہیں، حمزہ بے کی مشہور حسین مسجد میں سینما کا تماشہ دکھایا جاتا ہے،

یونان کے مسلمانوں کی معاشرتی، تمدنی، اور اقتصادی حالت بہت ہی خراب ہے، ان کی تعلیم پر اتنی قلیل رقم صرف کیجاتی ہے، جو ان کی تعلیمی ضروریات کے دسویں حصّہ کے لئے بھی کافی نہیں،

بلغاریہ کی کل آبادی ۵۵ لاکھ ہے جس میں گیارہ فی صدی ترکی النسل ہیں، یہاں ۵۰۰۰۰۰ مسلمان ہیں ان میں اکثریت ترکوں کی ہے، خالص بلغاری مسلمان بہ ہیں، مسلمان شوملا، رازگرید ل ویدن، روشتک اور صوفیہ کے علاقوں میں آباد ہیں، اور زیادہ تر کسان ہیں، ان میں تعلیم بہت کم ہے ایک اہم اقلیت ہونے کی وجہ سے مجلس قانون ساز میں ان کی نمایندگی ہوتی ہے، لیکن ان کی تعداد ۴، ۲ میں کل دس ہے، ان کا مذہبی پیشوا مفتی اعظم صوفیہ میں رہتا ہے، تمام مذہبی معاملات اسی کے ذریعہ سے طے پاتے ہیں، اور ایک مجلس کے مشورہ سے ہر مسجد میں امام مقرر ہوتا ہے، پورے علاقہ میں کل ۱۲۰۰ اسلامی مدارس ہیں،

رومانیہ کی پوری آبادی ایک کروڑ ۸۰ لاکھ ہے جس میں مسلمان دو لاکھ ہیں یہ زیادہ تر دوبروجا میں آباد ہیں، کونسٹینزا، ترچیا، دورستور، اور جزیرۂ اداکالع میں بھی ان کی بکھری آبادی ہے، معاشرتی اور تمدنی حالات میں بلغاری مسلمانوں سے بہتر ہیں، وہ حکومت کے بڑے بڑے

ملکی اور فوجی عہدون پر بھی مامور ہیں، ان میں بعض ممتاز ڈاکٹر، وکیل اور انجینیر بھی ہیں، سرکاری فوج میں بھی ان کی تعداد خاصی ہے، مسلمان فوجی عہدیداروں اور سپاہیوں کے لئے علحدہ امام ہے جس کا صدر مقام کونسٹینزا میں ہے،

جنگ عظیم سے پہلے پولینڈ میں ... مسلمان آباد تھے، لیکن وہ روسی حکومت کے محکوم ہونے کی وجہ سے کریمیا کے مفتی کے ماتحت تھے، کریمیا کی دوری کی وجہ سے ان کی مذہبی اور تعلیمی حالت کی طرف کافی توجہ نہ کیجاتی تھی، جس سے وہ حکومت سے غیر مطمئن تھے، یہاں کے تاتاری مسلمان فوجی اور ملکی عہدوں پر روس کے مختلف حصوں میں منتشر تھے، اسی لئے وہ اپنے بچوں کو باضابطہ مذہبی تعلیم نہ دلا سکتے تھے، پولینڈ کے مسلمان زیادہ تر روسی جرمن سرحد پر آباد تھے، اس لئے جنگ عظیم میں ان کو اپنا گھر چھوڑ دینا پڑا، جن میں بہت سے بے خانماں ہو کر ہلاک ہو گئے، جو واپس آگئے وہ آلام و مصائب کی زندگی بسر کرنے لگے، مگر پھر انھون نے اپنی حالت سنبھال لی، پولینڈ کی حکومت نے ان کیلئے مفتی، امام، اور مذہبی تعلیم کے لئے اساتذہ مقرر کئے، شاہ مصر نے بھی مسجدوں کی مرمت کے لئے ان کے پاس پانچ سو پونڈ بھیجے، امریکہ کے تاتاری مسلم باشندوں نے بھی ان کی مالی امداد کی، جرمنی اور پولینڈ کی جنگ سے پہلے ان کی مذہبی اور تعلیمی حالت خاصی تھی، (السٹریٹڈ ویکلی)

ریاضی دانون کے کمالات

ترکی میں حسن نامی ایک گڈریا ہے جس میں ریاضی کے عجیب و غریب جوہر ہیں، اگر اسکو کوئی اپنی پیدائش کا سنہ اور ساعت بتا دیتا ہے، تو وہ چند لمحوں میں اسکی عمر کے تمام گھنٹوں کا حساب لگا دیتا ہے، ہندسے کے مشکل اور پیچیدہ سوالات کو اپنے ذہن میں بالکل صحیح حل کر دیتا ہے، وہ لکھنا اور پڑھنا بالکل نہیں جانتا،

ایسے باکمال ریاضی دان پہلے بھی گذرے ہیں، جرمنی میں ذکریا نز داسے نامی ایک شخص تھا جو ۵۴ سکنڈ میں آٹھ آٹھ عدد اور چھ منٹ میں بیس بیس عدد کو اپنے دماغ میں ضرب دیتا تھا، فرانس میں ایک چھ سال کا بچہ تھا، جو ایک سوال کو دیکھے بغیر حل کرکے اس کے پورے عمل کو دہرا دیتا تھا،

اس قسم کے اور بھی باکمال ریاضی دان ہوئے ہیں لیکن سائنس کے ماہرین کا خیال ہے کہ یہ کوئی مافوق الفطرت اہل علم نہیں کہے جاسکتے، ان کی دماغی کاوشوں کو محض ایک ذہنی اعجوبہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، کیونکہ ایسے بہت سے اشخاص ہیں جنھوں نے ضخیم کتابوں کو حفظ کر لیا ہے لیکن ان کتابوں کا محض حفظ کر لینا ان کی علمی بصیرت اور ذہنی فوقیت کی دلیل نہیں، ایسے ریاضی داں بھی گذرے ہیں جنھوں نے بچپن ہی سے ریاضی کی طرف غیر معمولی شغف اور انہماک کا ثبوت دیا ہے مثلاً مشہور فرانسیسی ریاضی دان امپیرے چار ہی سال کی عمر میں ہر قسم کے مشکل سوالات حل کیا کرتا تھا، اور آگے چل کر وہ ایک مشہور ریاضی دان اور ماہر طبعیات ہوا، جرمنی میں سی۔ آف۔ گوس، ریاضی اور ہیئت کا ایک ممتاز عالم گذرا ہے، اس نے ۳ سال کی عمر ہی میں اپنے باپ کو ایک مشکل سوال میں غلطی بتائی تھی، دس سال کی عمر میں اُس نے اقلیدس، لیگرینج اور نیوٹن کا مکمل مطالعہ کر لیا تھا لیکن ایسی مثالیں دنیا میں بہت ہی کم ہیں،

یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو بچے اپنے بچپن میں ہندسے کے سوالات کو حل کرنے میں غیر معمولی طریقہ سے ماہر ہوتے ہیں، سن بلوغ میں ان کی مہارت جاتی رہتی ہے، ریاضی کا یہ کمال اوسطاً تقریباً آٹھ سال کی عمر میں شروع ہوتا ہے، اور بیس سال کی عمر تک ختم ہو جاتا ہے، مشاہدہ سے یہ بھی معلوم ہوا ہے، کہ ایسے لوگ ذہنی طور سے بہت مضبوط نہیں ہوتے ہیں، مثلاً لوئی فلوری ایک منٹ میں بڑے سے بڑے اعداد کو ضرب دیتا تھا، لیکن ایک گلاس شراب پی کر بالکل بدمست اور بیہوش ہو جاتا تھا،

"ص، ع"

باب التقریظ والانتقاد

فہرست کتبخانۂ بانکی پور

از

مولوی محمد یوسف صاحب رفیق دار المصنفین

یہ جلد کتبخانہ بانکی پور کے سلسلۂ فہرست کی بائیسویں کڑی ہے، جسے مولوی عبد الحمید صاحب نے مرتب کیا ہے، شروع میں جے۔ ایس۔ ارمور (J. S. Armour) کا ایک مختصر مقدمہ ہی، اس جلد میں حساب، جبر و مقابلہ، اقلیدس، ہیئت، نجوم، جفر و رمل، کیمیا، فلاحت، شعبدہ، اور تعبیر خواب کے ایک سو ستاون عربی مخطوطات پر تبصرہ ہی،

ہیئت اور نجوم کے علاوہ باقی فنون کی کتابیں چوتھی صدی ہجری کے بعد کی تصنیف ہیں، ہیئت اور نجوم میں زیادہ تر چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں، جن میں سے اکثر دوسری، تیسری اور چوتھی صدی کے لکھے ہوئے ہیں، ان میں چوتھی صدی ہجری کے مشہور ہندس ابراہیم بن سنان بن ثابت بن قرہ کے بہت سے رسالے ہیں، جو اکثر نایاب ہیں، ان کے نام یہ ہیں، (۱) الرسالۃ فی اصول الرصد (۲) الرسالۃ فی وصف المعانی التی استخرجہا فی الھندسۃ والنجوم (۳) المقالۃ فی طریق التحلیل والترکیب وسائر الاعمال فی المسائل الھندسۃ (۴) المقالۃ فی رسم القطوع الثلاثۃ

(۵) المقالۃ فی الاسطرلاب (۶) الکتاب فی حرکات الشمس (۷) الکتاب فی مساحۃ القطع المخروط المکافی،

ابراہیم کے دادا ثابت بن قرہ کے بھی دو رسالے ہیں (۱) کتاب ارشمیدس فی الدوائر المتماسۃ (۲) کتاب ارشمیدس فی اصول الھندسۃ،

مامونی عہد کے نامور عالم ریاضی محمد بن موسیٰ خوارزمی کا بھی ایک نایاب رسالہ المقالۃ فی استخراج تاریخ الیھود واعیادھم ہے،

اسی عہد کے مشہور عرب فلسفی ابو یوسف یعقوب بن اسحاق کندی کا آفتاب کی شعاعوں کے متعلق الکتاب فی الشعاعات نام ایک رسالہ ہے،

پانچویں صدی کے مشہور مورخ اور فلسفی ابو ریحان بیرونی کے چار رسالے ہیں (۱) افراد المقال فی امر الظلال (۲) المقالۃ فی راشیکات الھند (۳) تمھید المستقر فی معانی المر (۴) الکتاب فی استخراج الاوتار فی الدائرۃ بخواص الخط المنحنی الواقع فیھا ان میں پہلا اور تیسرا بالکل نایاب ہے، دوسرے کا صرف ایک نسخہ انڈیا آفس کے کتبخانہ میں ہے، اور چوتھے کا ایک نسخہ لیڈن میں پایا جاتا ہے،

بیرونی کے عہد کا ایک مصنف ابو نصر منصور بن علی بن عراق ہے، جو گو بیرونی کی طرح عام شہرت نہیں رکھتا، لیکن اس کے علمی کارنامے بھی کم نہیں، ابو نصر خلیفہ قادر باللہ کے عہد (۳۸۱ھ ۹۹۱ء – ۴۲۲ھ ۱۰۳۱ء) میں ہیئت اور نجوم کا مشہور ماہر تھا، یہ ریاضی، حساب، ہیئت اور نجوم کے مشہور امام ابو الوفا جوزجانی (۳۲۸ھ – ۳۸۸ھ) کا شاگرد تھا،

اس فہرست میں اس کے اکثر رسالے نایاب ہیں، ان کے نام یہ ہیں، (۱) الرسالۃ فی براھین اعمال جدول التقویم فی زیج حبش الحاسب، (۲) الرسالۃ

فی تصحیح ما وقع لابی جعفر الخازن فی السهو فی زیج الصفائح (۳) المقالة فی اصلاح شکل من کتاب مانالاؤس فی الکریات (۴) المقالة فی البرهان علی حقیقة المسئلة التی وقعت بین ابی حامد الصغانی وبین منجمی الری فیها منازعة (۵) الرسالة فی مجازات دوائر السموت فی الاسطرلاب (۶) الرسالة فی صنعة الاسطرلاب بالطریق الصناعی (۷) الرسالة المسماة جدول الدقائق (۸) الرسالة فی البرهان علی عمل محمد بن الصباح فی امتحان الشمس، (۹) الرسالة فی الدوائر التی تحد الساعات الزمانیه (۱۰) الرسالة فی البرهان علی عمل حبش فی مطالع السمت فی زیجه (۱۱) الرسالة فی معرفة القسی الفلکیة (۱۲) رسالة ابی نصر فی جواب مسائل الهندسة (۱۳) رسالة ابی نصر فی کشف عوار الباطنیة بما موهوا علی عامتهم فی رویة الاهلة (۱۴) الرسالة فی حل شبهة فی المقالة الثالثة عشر من کتاب الاصول (۱۵) فصل من کتاب ابی نصر فی کریة السماء۔

ناموں پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان یونانیوں کے محض مقلد ہی نہیں تھے بلکہ ابتدائی دور ہی سے یونانی کتابوں کے ترجمہ کے ساتھ ساتھ نئی تحقیقات اور تصانیف کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا، مسلمانوں نے یونانی فلاسفہ کے نظریوں کی علمی جانچ پڑتال کر کے غلط اور صحیح میں تمیز کی، اور ان کی کمزوریوں کو واضح کیا،

نئی تحقیقات کے ثبوت میں یوں تو اس فہرست کی اکثر کتابوں کو پیش کیا جا سکتا ہے لیکن ان میں کتاب انباط المیاہ الخفیہ ایک خاص درجہ رکھتی ہے، اس کا مصنف ابوبکر محمد بن الحاسب ہے، جو چوتھی صدی کا مشہور ماہر حساب ہے، اس کے تفصیلی حالات کہیں نہیں ملتے

اس کتاب کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہو کہ وہ عراق آیا تھا، اور یہاں کے لوگوں میں جب اس نے حساب
اور ہندسہ کا ذوق پایا تو ان فنون پر اس نے بہت سی کتابیں لکھیں، پھر عراق سے علاقہ جبل گیا
جو ایران کا جنوبی حصہ ہو، یہاں کے باشندوں میں نئے علوم کی کوئی رغبت نہ تھی، اس لئے اسکی
طبیعت بھی کچھ بجھ سی گئی، مگر وزیر ابو غانم معروف بن محمد کی حوصلہ افزائی سے اُس نے تصنیف و
تالیف کا سلسلہ جاری رکھا اور کتاب انباط المیاہ الخفیۃ لکھ کر وزیر کی خدمت میں پیش کی،
اس کتاب میں اس نے زمین کے طبقات اور پانی کے چشموں پر سیر حاصل بحث کی ہے اور
بتایا ہو کہ پانی کے پوشیدہ خزانے کہاں ہوتے ہیں، جن پہاڑوں اور پتھروں کے نیچے پانی ہوتا ہی
ان کی کیا علامتیں ہیں، کس قسم کی زمینوں میں پانی پایا جاتا ہو، وہ کونسی نباتات ہیں جو پانی ہونے
کا نشان ہیں، خشک پہاڑوں اور کم پانی والی زمینوں کے کیا اوصاف ہیں، پانی اور اس کے
مزہ کی کتنی قسمیں ہیں، وزنی اور ہلکا، پتلا اور گاڑھا، میٹھا اور بدمزہ پانی کس قسم کی زمینوں میں
ہوتا ہو، خراب پانی کی اصلاح کی کیا صورت ہو، زمین کی مٹی کتنی قسموں کی ہوتی ہے، کھوٗالی
زمینوں میں پانی مل سکتا ہے یا نہیں، زلزلہ میں جو چشمے پھوٹ نکلتے ہیں، یا ایک جگہ سے دوسری
جگہ منتقل ہو جاتے ہیں، اس کے اسباب کیا ہیں، کنوؤں کا پانی سیسہ کی نلکیوں کے ذریعہ
باہر کیسے لایا جا سکتا ہو، سخت زمین میں پانی کے فوارے پائے جا سکتے ہیں یا نہیں، نہروں اور
کنوؤں کی حفاظت کے طریقے کیا ہیں، نہروں اور کنوؤں کے کھودنے میں رکاوٹ ڈالنے والی
چیزوں کو کس طرح دور کیا جا سکتا ہو، گھروں کے کنوؤں میں بارش کا پانی کس طرح آتا ہو، زمین کی
شناخت کے آلات اور اُن آلات کا ذکر جن کو خود مصنف نے ایجاد کیا تھا، زمین کے اندر پانی
کے سوتوں کو کس طرح محفوظ کیا جا سکتا ہو، نہروں کا پانی خراب ہونے سے کس طرح بچایا جا سکتا
ہو، بند پانی کو کس طرح کھولا جا سکتا ہو، اس کتاب میں آب رسانی کے بعض آلات کی تصویریں

بھی دی ہیں،

ذرائع آب رسانی کے متعلق ایک اور اہم کتاب الرسالۃ فی علم الحساب المیاہ الجاریۃ فی مدینۃ دمشق ہے جس کا مصنف تیرھویں صدی ہجری کا مشہور ماہر حساب محمد بن حسین عطار ہے، اس میں دمشق کی نہر بردی سے کھیتوں اور باغوں میں پانی لیجانے کے طریقے بتائے ہیں، اور یہ طریقے وہی ہیں، جو آج کل بھی مستعمل ہیں،

مؤلف فہرست نے کتابوں کے مصنفوں کے ناموں اور ان کی تحقیق میں کافی محنت کی ہے لیکن شروع ہی میں ایک فاش غلطی ہوگئی ہے، امید ہے کہ آیندہ اڈیشن میں اس کی تصحیح کردی جائے گی،

اس فہرست کی ابتدا غنیۃ الحساب فی علم الحساب نامی کتاب سے ہوتی ہے، مؤلف فہرست کا بیان ہے کہ اصل نسخہ میں کتاب کے مصنف کا کہیں نام نہیں ہے، البتہ تاج بن حسن بن محمد کرمانی نے جنھوں نے یہ کتاب نقل کی ہے، کتاب کے سرورق پر شیخ ابوالعباس احمد بن ثابت قاضی الھامیہ رحمہ اللہ تعالیٰ کو اس کتاب کا مصنف ظاہر کرکے اسکے نیچے لفظوں میں کتاب کی تاریخ ۷۶۵ھ دیدی ہے،

غنیۃ الحساب کے مصنف نے کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے، کہ فن حساب پر اس نے اس سے پہلے دو کتابیں لکھی تھیں، ایک مختصر دوسری مطول، پہلے کا نام عمدۃ الرائض فی الحساب ہے جو معاملات اور مساحت وغیرہ کے بابوں سے خالی ہے، دوسری کا نام الحاوی ہے جو جبر و مقابلہ کے کئی باب آجانے کی وجہ سے طویل ہوگئی ہے، اس لئے مصنف نے چاہا کہ ان دونوں کے درمیان ایک اوسط درجہ کی کتاب لکھے، چنانچہ اسی مقصد سے اس نے غنیۃ الحساب لکھی،

مؤلفِ فہرست پہلے تو یہ استدلال کرتے ہیں کہ غنیۃ الحساب کا مصنف اس کی کتابت کے وقت یعنی ۸۶۰ھ میں زندہ نہیں تھا، اس لئے کہ کاتب نے ہر جگہ اس کو رحمہ اللہ تعالیٰ کے فقرہ سے یاد کیا ہے، پھر مؤلف نے کشف الظنون کی طرف رجوع کیا ہے، اس میں حساب کے فن میں الحاوی فی الحساب کے نام کی ایک ہی کتاب کا ذکر ہے، جس کا مصنف شہاب الدین احمد بن ہائم المصری القدسی المتوفی ۸۰۰ھ ہے، اور جس کو بعد میں احمد بن صدقہ صدیقی المتوفی ۹۰۵ھ نے نظم کیا ہے، مولفِ فہرست نے احمد بن صدقہ کی تاریخِ وفات کو صحیح اور ابن الہائم کی تاریخِ وفات کو غلط قرار دے کر یہ نتیجہ نکالا ہے، کہ غنیۃ الحساب کا مصنف ۹۰۵ھ سے پہلے کا ہے اور اس کی تائید میں پھر وہی تاج بن حسن بن محمد کرمانی کی تاریخِ کتابت ۸۲۶ھ کو پیش کیا ہے،

لیکن ہمارے پیشِ نظر کشف الظنون کا جو چھپا ہوا نسخہ ہے، اس میں ابن ہائم کی تاریخِ وفات ۸۹۰ھ اور احمد بن صدقہ کی ۹۰۵ھ ہے، مگر ابن ہائم کی یہ تاریخِ وفات بھی غلط ہے، ابن ہائم آٹھویں صدی ہجری کے آخر کا مشہور ماہرِ حساب ہے، اس کی تاریخِ وفات بالاتفاق ۸۱۵ھ ہے، (دیکھو شذرات الذہب ج ۷، ص ۱۰۹، البدر الطالع جلد اول صفحہ ۱۱۷، الضوء اللامع جلد دوم صفحہ ۱۵۷)

احمد بن صدقہ کا لقب صدیقی نہیں، بلکہ ابن الصیرفی ہے، اس کا باپ شاہی اصطبل میں صراف تھا، اسی کی نسبت سے اس کا لڑکا ابن الصیرفی کے لقب سے مشہور ہوا، احمد بن صدقہ باختلافِ روایت، ذی الحجہ ۸۲۳ھ یا ۸۲۹ھ کو پیدا ہوا، اس نے ابن ہائم کی کتاب حاوی کو نظم کیا، حافظ سخاوی کا معاصر تھا، تذکروں میں اس کی تاریخِ وفات درج نہیں، البتہ الضوء اللامع سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۸۹۴ھ میں زندہ تھا[1] احمد بن صدقہ کی وفات کا ۹۰۵ھ صحیح ہی

---

[1] الضوء اللامع جلد اول ص ۳۴۶،

صاحب کشف الظنون نے ایک اور جگہ بھی اس کی تاریخ وفات ۹۰۵ھ ہی لکھی ہے، یہاں اس نے صدیقی کے بجائے اس کا لقب ابن الصیرفی لکھا ہے، (دیکھو کشف الظنون زیر عنوان کتاب "ارشاد فی فروع الشافعیۃ لابن المقری)

مؤلفِ فہرست نے کشف الظنون کے حوالہ سے ابن ہائم کی وفات کی جو تاریخ ۸۸۶ھ بتائی ہے، اس میں درحقیقت کشف الظنون کے مصنف کو دھوکا ہوگیا ہے، اس سنہ میں اسی لقب کا ایک اور شخص گذرا ہے، جس کا نام بھی احمد تھا، مگر وہ شاعر تھا، ماہر حساب نہیں تھا، (دیکھو شذرات الذہب جزء سابع ۳۴۶)

اب غنیۃ الحساب کے اصل نسخہ پر غور کریں تو اصل حقیقت بالکل واضح ہوجاتی ہے، تاج بن حسن نے نسخہ کے نقل کرنے کی تاریخ یوں لکھی ہے "فرغ من نسخہ ...... سنۃ ست وثمانین وسعمائۃ" آخری لفظ پر نقطے نہیں دیے ہیں، اس لئے یہ سبعمائۃ اور تسعمائۃ دونوں پڑھا جاسکتا ہے، اور اوپر کی شرح وتفصیل سے یہ بالکل ظاہر ہے، کہ وہ سبعمائۃ نہیں ہے جیسا کہ مؤلفِ فہرست نے خیال کیا ہے، بلکہ تسعمائۃ ہے، اب یہ بات صاف ہوگئی کہ نسخہ کے نقل کرنے کی تاریخ درحقیقت ۹۸۶ھ ہے،

تعجب تو یہ ہے کہ مؤلف نے خود جبر و مقابلہ کے عنوان میں المسرع نامی کتاب کے مصنف کا نام ابن الہائم اور اس کی تاریخ وفات ۸۱۵ھ دی ہے، مگر یہاں ان کا ذہن اس طرف نہیں گیا کہ غنیۃ الحساب کا مصنف بھی وہی ہے، جو المسرع کا ہے،

مطبوعاتِ جدیدہ

دفتر دیوانی ومال وملکی سرکارِ عالی شائع کردہ دفتر مذکور تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۱ صفحے کاغذ نفیس آرٹ پیپر، حیدر آباد۔ دکن،

موجودہ حضور نظام خلد اللہ ملکہ کی تخت نشینی کے وقت سے جو عہد مسعود شروع ہوا ہے، اس نے جہاں مادی، اقتصادی اور سیاسی ترقی و فارغ البالی کے دروازے کھول دئے ہیں، وہیں ذہنی و علمی خزانوں کے دروازے بھی کھول دیئے ہیں، جامعہ عثمانیہ کے قیام اور وہاں کی پیداوار کی علمی مساعی تک یہ نعمت محدود نہیں، بلکہ ہر محکمہ نے اس میں مساوی حصہ لینا شروع کر دیا ہے، دفتر دیوانی ومال اس میں سب سے زیادہ آگے ہے، اور مولوی خورشید علی صاحب کی مسلسل وخاموش ہدایت و نگرانی میں وہ گرانمایہ علمی و تاریخی کام انجام دے رہا ہے، جس پر حکومتِ ہند کا "محافظ خانہ" بھی رشک کر سکتا ہے، دفتر دیوانی کا لفظ اس کی اُس وسعت وہمہ گیری کو جس کا وہ حامل ہے، ظاہر نہیں کرتا، مندرجۂ ذیل عبارت سے اسکی ابتدائی وُسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے،

"دفتر دیوانی کے دو اہم شعبے ہو گئے تھے، صوبہ جات خجستہ بنیاد و اورنگ آباد، برار، بیجا پور اور برہان پور سے متعلق، جملہ فوجی اور مالی انتظامات مثلاً نگہداشت جمعیت، تقرر، تعیناتی، برطرفی، عہدنامہ جات، تقرر عمالان و تعہد داراں، نیز انتظام مالیہ، وقائع نگاری، حسابات، جمع خرچ اجرائے اسناد و احکام نسبت عطائے جاگیر و انعام تنخواہ وغیرہ کی تکمیل جس دفتر سے متعلق تھی،

سے متعلق یہ امور جس دفتر میں طے پاتے تھے، وہ دفتر مال کہلاتا تھا"

اس کے علاوہ دوسرے محکمے بھی اس دفتر میں ملائے گئے، اتنا ہی نہیں، بلکہ اورنگ زیب وشاہجہاں کے عہد کے جو دفتر اورنگ آباد میں مقفل تھے، وہ بھی اب اس خزانہ میں جمع ہیں، مختصراً یہ ذخیرہ تاریخ دکن وتاریخ ہند کے طالب علموں اور آیندہ محققوں کے لئے بہت زیادہ بیش قیمت ہے اور سیکڑوں کام کرنے والوں کو بیک وقت جذب کر سکتا ہے، اس میں جتنے اقسام کے کاغذات ہیں، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ ان کی تعداد ۲۴ تک پہنچی ہے،

اس دفتر سے جو کتب خانہ متعلق ہے، گو وہ کتابوں کی تعداد کے لحاظ سے مختصر ہے، مگر یہ واقعہ ہے ہندوستان کی تاریخ پر کہیں بھی اتنا بڑا قلمی ذخیرہ نہیں، بہت سی تو ایسی کتابیں ہیں، جن کا دوسرا نسخہ کسی دوسری جگہ نہیں ہے، خوشی کا مقام ہے، کہ ان کتابوں کی مفصل فہرست مرتب کی جارہی ہے، اس کے علاوہ مختلف اقسام کے کاغذات کی جلدیں بھی زیر ترتیب ہیں، موجودہ جلد دراصل حضور نظام کی جوبلی کے سلسلہ میں دفتر کی پیشکش تھی، اس میں اس وقت سے لیکر شاہجہان کے زمانہ تک کے مختلف قسم کے کاغذات کے بلاک فوٹو آرٹ کاغذ پر نہایت نفاست سے شائع کئے گئے ہیں، ان کا ایک سرسری مطالعہ اس علمی وتاریخی دولت کی وسعت وبے پیمائی کی طرف اشارہ کرنے کیلئے کافی ہے، جو دفتر کی وسیع عمارتوں کی چار دیواری میں محفوظ ہے، امید کہ دفتر اپنے وعدوں کی تکمیل سے تشنگانِ تحقیق کی پیاس کو بجھانے کی جلد تر کوشش کریگا،

تاریخِ الہ آباد (جلد اول) مصنفہ مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدنی، تقطیع بڑی، ضخامت ۳۰۰ صفحے مصور، قیمت :- للعہ، پتہ :- مصنف دائرہ شاہ رفیع الزمان یحییٰ پور الہ آباد

مولوی مقبول احمد صاحب صمدنی اردو کے کہنہ مشق انشا پرداز اور دیرینہ سال محقق ہی نہیں بلکہ حلقۂ معارف کے قدیم ترین رکن بھی ہیں، ان کے علاوہ مضامین برسوں معارف

میں شائع ہوتے رہے ہیں، ان کی علمی تصانیف کو عام ہر دلعزیزی حاصل ہے، اہل علمی حلقوں میں خاص وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں، پیرانہ سالی کے باوجود جس جوان ہمتی سے وہ علم کی خدمت میں مصروف ہیں، وہ بہت سے نوجوانوں کے لئے سبق آموز اور باعث رشک ہے، انکی زیرِ نظر تصنیف نمونہ ہے، الہ آباد جو آب مولوی صاحب موصوف کا دوسرا وطن ہے، ان کی مساعی کا مرکز ہے، اور انھوں نے ارادہ کیا ہے کہ وہ الہ آباد کی تاریخ کو ایک نئے انداز سے پیش کریں، چنانچہ اس سلسلہ کا نام "آباتصویر سلسلہ" ہے، اور جس وسیع پیمانہ پر مولوی صاحب اس کام کو کرنا چاہتے ہیں، وہ اس سے معلوم ہو سکتا ہے، کہ تین سو صفحات کے باریک حرفوں والی یہ پہلی جلد صرف الہ آباد کی وجہ تسمیہ، اور خسرو باغ اور اس کے مقبروں کے حالات پر محدود ہے، موصوف نے بڑی تحقیق اور منصفانہ طرز سے حقیقت وصداقت کے دریافت کرنے کی کوشش کی ہے اور الہ آباد کی پچھلی تاریخ شہزادہ خسرو کے حالات، باغ کی تعمیر ان سب واقعات کو ہر ممکن ذریعہ سے یکجا کیا ہے، حاشیوں میں بکثرت معلومات اور تحقیقات ہیں، انشا پردازی کا وہ خاص اسلوب ہر جگہ نمایاں ہے، آزاد کے بعد جسکی جھلک مولوی صاحب ممدوح کی تحریروں میں نظر آتی ہے، کتاب میں متعدد بلاک کی تصاویر اور نقشے بھی ہیں، الہ آباد اور عہد جہانگیر و شاہجہان سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے یہ ایک دلچسپ و قیمتی تحفہ ہے۔ "ان"

رحمۃ للعالمین (حصہ اول) قاضی محمد سلیمان صاحب مرحوم منصور پوری تقطیع چھوٹی ضخامت

۴۰۴ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ:- مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

سیرت نبوی پر قاضی محمد سلیمان صاحب مرحوم کی مشہور تالیف رحمۃ للعالمین کا جو ملک میں کافی مقبول ہو چکی ہے، مکتبہ جامعہ نے اپنی کتابوں کے خوبصورت سائز پر دوسرا اڈیشن شائع کیا ہے جو خوش مذاق اور نفیس مزاج لوگوں کے رکھنے کے لائق ہے،

مشاہیر عالم، مؤلفہ جناب کے، اے حمید صاحب بیرسٹر ایٹ لا- تقطیع بڑی ضخامت

... صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ، پتہ قومی کتب خانہ، ریلوے روڈ لاہور

مؤلف نے اس کتاب میں مختلف شعبوں اور طبقوں کے سولہ مشاہیر اور ارباب کمال، ڈاکٹر آئن اسٹائن، برناڈ شا، آسکر وائلڈ، نپولین، مصطفے کمال، کرنل لارنس، مسولینی، لینن، ایچ جی ویلز، ہٹلر، سلطان ابن سعود، آغا خان، گاندھی، ڈی ویلرا اور ڈاکٹر اقبال کے مختصر حالات، ان کے کمالات اور علمی و عملی کارنامے لکھے ہیں، کتاب مفید اور دلچسپ ہے، البتہ طرز تحریر کچھ مناسب نہیں ہے، خصوصاً ہر صاحب ترجمہ کے لئے واحد کے بجائے جمع کی ضمیر کا استعمال مثلاً، دانتے پیدا ہوئے، برناڈ شا آئے آسکر وائلڈ گئے وغیرہ نہایت بدنما معلوم ہوتا ہے،

طبقات الشعراء، از جناب ابو اللیث صاحب صدیقی ام اے، بدایونی، تقطیع بڑی، ضخامت ۵۹ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مرقوم نہیں، پتہ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ،

قدرت اللہ شوق سنبھلی کا تذکرہ طبقات الشعراء مشہور تذکروں میں ہے، گو یہ ابھی تک چھپا نہیں ہے لیکن نایاب نہیں ہے، ہمارے کتب خانہ میں بھی اس کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے، یہ تذکرہ خاصہ ضخیم ہے، ابو اللیث صاحب صدیقی نے اس کا خلاصہ شائع کیا ہے، اس تلخیص کا کوئی فائدہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا اس میں چند شعراء کے حالات کے علاوہ باقی کے گویا صرف نام ہی گنا دیئے گئے ہیں، جس سے کوئی فائدہ بھی نہیں اٹھایا جا سکتا، لیکن اس اعتبار سے ضرور یہ ایک ادبی خدمت ہے، کہ ایک قلمی تذکرہ کی تلخیص ہی عام نگاہوں کے سامنے آگئی،

فہرس کتب خانہ سٹی کالج حیدر آباد دکن — مرتبہ جناب غلام رسول صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۳۰۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، پتہ سٹی کالج حیدر آباد دکن،

اس فہرست میں کتابوں کے بعض کے کوئی ندرت اور خصوصیت نہیں ہے، البتہ ...

فارسی کی مطبوعہ معلوم اور متداول کتابیں ہیں، البتہ اس کی ترتیب قابلِ توجہ ہے، موجودہ زمانہ میں علوم و فنون کی کثرت اور یورپ کے کتب خانوں کی وسعت و عظمت نے اس کی ترتیب و تنظیم (Library Science) کو مستقل فن بنا دیا ہے، جس پر کتابیں موجود ہیں، آج کل کتب خانوں کی ترتیب و تنظیم کے مختلف طریقے رائج ہیں، مدراس یونیورسٹی کے لائبریرین ایس آر رنگا ناتھن ایم اے نے یورپ کے بڑے بڑے کتب خانوں کی ترتیب و تنظیم کا مطالعہ کرکے خود ایک طریقہ "کولن تقسیم" ایجاد کیا ہے، اسی کے مطابق یہ فہرست مرتب کی گئی ہے، اس سے کتبخانوں کی ترتیب میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، ہر زبان کی کتابوں کی فہرست کے آخر میں مصنفین کا انڈکس بھی دیدیا گیا ہے بعض بعض مصنفین اور کتابوں کے نام غلط چھپ گئے ہیں،

جوئبار، مصنفہ جناب تھیم سین ظفر تقطیع بڑی ضخامت ۹۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت عمر پتہ :- قصر ادب ملتان،

جوئبار، جناب تھیم سین صاحب ناظم انجمن اربابِ ادب ملتان کے کلام کا مجموعہ ہے، اس میں کچھ غزلیں کچھ مختلف عنوانوں پر نظمیں اور چند ہندی گیت ہیں، ہم نے جابجا سے اسے دیکھا مؤلف میں شاعری کی فطری صلاحیت معلوم ہوتی ہے، انھوں نے مختلف اصناف میں کامیاب طبع آزمائی کی ہے، کلام میں پرانے رنگ کی بھی جھلک ہے، اور نئے تغیرات کا بھی اثر ہے، بعض غزلیں اور نظمیں بہت اچھی ہیں، لیکن جابجا جدید بے قید شاعری کے نقائص مثلاً زبان کی صحت سے بے توجہی محاوروں کی غلطی اور سب سے زیادہ بے معنی ترکیبیں، اور ایسے خیالات نظر آئے جنھیں خود مؤلف بھی صحیح طور سے ادا نہ کر سکے، ان خامیوں نے بعض اشعار کو ناقابلِ فہم بنا دیا ہے، لیکن مؤلف میں شاعری کی پوری صلاحیت ہے کسی صاحبِ نظر کی اصلاح سے یہ خامیاں آسانی کے ساتھ دور ہو سکتی ہیں،

"م"

نئی کتابیں

نقوشِ سلیمانی، از مولانا سید سلیمان ندوی، یہ ہندوستانی زبان وادب سے متعلق مولنا کی تقریروں مضامین اور مقدموں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے بعض ادبی کتابوں پر لکھے، یہ مجموعہ تاریخی و ادبی دونوں حیثیتوں سے ہماری زبان کا آئینہ ہے،

ضخامت ۴۷۶ صفحے، قیمت عہ

تاریخ اسلام حصہ اوّل (از آغاز اسلام تا حضرت حسن) اس کتاب میں عرب قبل از اسلام کے حالات اور ظہور اسلام سے لیکر خلافت راشدہ کے اختتام تک کی اسلام کی مذہبی، سیاسی، اور تمدنی تاریخ ہے، مرتبہ شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی،

حجم ۳۸۷ صفحے قیمت سے

تابعینؒ، اس میں چھیانوے ۹۶ اکابر تابعینؒ کے سوانح ان کے علمی، مذہبی، اخلاقی اور عملی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی

ضخامت ۵۶۰ صفحے، قیمت: للعہ

تاریخ اخلاق اسلامی، اس میں اسلامی اخلاق کی تاریخ اور قرآن اور احادیث کی اخلاقی تعلیمات پر مختلف حیثیتوں سے نقد وتبصرہ ہے، ضخامت ۳۷۶ صفحے قیمت ۱۲

فہم انسانی، یعنی ڈیوڈ ہیوم کی مشہور کتاب ہیومن اسٹینڈنگ" کا ترجمہ اور اس کے مختصر حالات کیساتھ اس کے خیالاتِ فلسفہ پر بحث وتبصرہ، حجم ۲۲۸ صفحے قیمت: عہ از مولانا عبد الباری ندوی،

مقالاتِ شبلی جلد ہشتم، مولانا کے مضامین کا یہ مجموعہ ان کے متفرق مضامین، مختلف تجاویز اور منصوبوں پر مشتمل ہے، ضخامت ۲۱۵ صفحے قیمت عہ

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں مولوی ابوالحسنات مرحوم نے نہایت تلاش وتحقیق سے ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہوں پر ایک مقالہ لکھا تھا، جو مقالہ اب کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے قیمت ۱۲ر ۱۳۲ صفحے

مسعود علی ندوی منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

(طابع محمد اویس وارثی)

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۸۷ دسمبر سنہ ۱۹۳۹ء

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت :- پانچ روپیہ (۵) سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ

سیرۃ النبیؐ

رسول اللہ صلعم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جس کا نام **سیرۃ النبی** عام طور سے مشہور ہے مسلمانون کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت و اہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔

اب تک اس کتاب کے چھ حصے شائع ہو چکے ہین، پہلے مین ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہین اور ابتدا مین ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جس مین فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے، دوسرے حصہ مین تکمیل دین تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے، تیسرے حصہ مین آپ کے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہے، اسمین سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثین کیگئی ہین، پھر ان معجزات کی تفصیل ہے جو بروایات صحیحہ ثابت ہین اسکے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کیگئی ہے، چوتھے حصہ مین ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپ کے ذریعہ مسلمانون کو تعلیم کئے گئے ہین، کوشش کیگئی ہے کہ اس مین قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائین، پانچوین حصہ مین عبادت کی حقیقت اعبادات کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح و حکم کا بیان اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے، چھٹے حصہ مین حقوق، فضائل اور آداب کے عنوان اور اس کی ذیلی سرخیون کے تحت اخلاقی تعلیمات کی تفصیل ہے، حجم ۱۲ صفحے،

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول تقطیع خورد للعہ، حصہ دوم تقطیع کلان ۶ تقطیع خورد ۵ و ۸، حصہ سوم تقطیع کلان ۷ و للعہ تقطیع خورد ۸ و ۸ حصہ چہارم تقطیع کلان ۷ و ۷ تقطیع خورد ۸ و ۸، حصہ پنجم تقطیع کلان ۸ و للعہ تقطیع خورد ۸ و ۸، حصہ ششم تقطیع کلان قسم اول ۸ قسم دوم للعہ

(منیجر دار المصنفین۔ اعظم گڈھ)

جلد ۴۴ | ماہ شوال المکرم ۱۳۵۸ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۳۹ء | عدد ۶

مضامین

خدا کا شکر ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی طرف قوم کی توجہ پھر منعطف ہو رہی ہے، شوال میں طلبہ کے داخلہ کی درخواستیں بھی غیر معمولی آئیں لیکن مالی حالت کی مجبوری سے ۵۴ طالب علموں کے وظائف کی درخواستوں میں سے صرف بارہ طالب علموں کو لیا جاسکا بہت سے ایسے غریب طالب علموں کی درخواستیں تھیں جن کو نامنظور کرتے ہوئے کارکنوں کو سخت صدمہ ہوا، مگر افسوس کہ چادر سے زیادہ پاؤں پھیلا کر بھی وہ ان کی مدد نہ کر سکے یعنی ندوہ کے پاس صرف ۳۰ طالب علموں کی گنجائش تھی اور اس وقت اس سے دگنے کا بوجھ اس نے اٹھا لیا، اور درخواستوں کا سلسلہ ان سطروں کے لکھتے وقت تک جاری ہے، ایک طالب علم پر سات روپیہ ماہوار کا خرچ ہے،

ہم میں اہل وسعت تو اپنے بچوں کو عربی نہیں پڑھاتے، عربی پڑھنے والے زیادہ تر غریب والدین کے بچے ہوتے ہیں، جو اپنا خرچ خود پورا نہیں کر سکتے، کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ اس ضروری کام میں اہل ثروت اپنی جیبوں سے اور غریب اپنے جگر گوشوں سے مدد کریں اور اس طرح علم دین کی تعلیم و تعلم کا فرض باہمی تعاون سے انجام پائے،

الندوہ جس نے ۱۹۰۴ء سے کر ۱۹۰۹ء تک علمی تعلیمی اور مذہبی خدمات مولانا شبلی [illegible] حبیب الرحمان خان شیروانی کی ادارت میں بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیئے اور آج کے [illegible] [illegible] کتب کے [illegible] ہوئے ہیں اب کمال [illegible]

اور اس کو ملک کی پوری شہرانے کی تجویزیں سوچیں، اور پرزور تقریریں کریں،

کہئے یہ حکم رہے، کہئے وہ ارشاد رہے

ہمارے مخدوم مولوی عبدالحق صاحب اردو کی جو جوانمردانہ خدمت کر رہے ہیں وہ اردو کے ہر حامی کے شکریہ کی مستحق ہے، دسمبر کے آخر میں وہ دلی میں انجمن ترقی اردو کا ایک عام اجلاس کر رہے ہیں جس میں زبان کی ترقی کے ہر مسئلہ پر گفتگو ہوگی، ضرورت ہے کہ ہم اس وقت صرف کچھ کہنے کے لئے نہیں بلکہ کچھ کرنے کے لئے اٹھے ہوں، اور زبان کی خدمت صرف زبان سے نہیں بلکہ عمل سے بھی کرکے دکھائیں،

انھی دنوں میں کلکتہ میں مسلم تعلیمی کانفرنس کے اجلاس ہونگے، ہم کو امید ہے کہ بنگال کے مسلمان اس کانفرنس میں سیاست کی خاطر نہیں، بلکہ تعلیم کی خاطر کچھ کریں، اور بنگال کے مسلمانوں کے سامنے ان کی علمی، تعلیمی، تمدنی اور ادبی مستقبل کی ایسی تجویزیں پیش کریں، جن سے بنگال ہندوستان کا ٹکڑا بن جائے، کیا عجیب بات ہے کہ قریب قریب مسلمانوں کی آدھی تعداد بنگال میں آباد ہے اور وہ زبان کی بیگانگی کے سبب ہندوستان کی ساری اسلامی تحریکوں سے ایک سخت بے خبر ہے، کیا یہ سوچنے کی بات نہیں،

سیرۃ النبیؐ کی چھٹی جلد کی چھوٹی تقطیع کی مانگ ہو رہی ہے، مگر لڑائی نے کاغذ کو اتنا گراں کر دیا ہے کہ کوئی بڑی کتاب کاغذ کے کافی ذخیرہ کے بغیر چھپنی مشکل ہو، معلوم نہیں ایک کاغذ پر کتنے جز چھپنے کے بعد وہ کاغذ پھر نہ مل سکے، اس لئے ہم کاغذیوں سے خط وکتابت کر رہے ہیں، جس وقت کاغذ کی طرف سے اطمینان ہوا وہ چھپنی شروع ہو جائیگی،

بعض احباب کی تحریک ہے کہ دارالمصنفین کی پچیس سال کے کارناموں کی ایک مختصر تاریخ مرتب کر دیجائے جس میں اسکے تخیل، نظام، قیام، اور ہر رفیق کے مختصر حالات، اور اس کی تصانیف کے نام، اور پھر ان دارالمصنفین کے مطبوعات، اور اس کے آیندہ کاموں کا پروگرام ہو،

مقالات

"تذکرۃ السّامع والمتکلم"

اور

فنِ تعلیم پر ایک نظر

از

مولینا ابوعبد اللہ محمد بن یوسف السورتی

"دائرۃ المعارف العثمانیہ" ہندوستان ہی نہیں، دنیاے اسلام میں اپنی قسم کا واحد علمی ادارہ ہے، جو متقدمین کی تالیفات کی اشاعت، اور انھیں بکفایت اہلِ علم کے ہاتھوں پہونچانے کے لئے قائم کیا گیا ہو، اُس نے ۱۳۵۱ھ میں ایک اسکیم تیار کی تھی جس میں کم وبیش دس سال کے لئے کتب نادرہ کا انتخاب کرلیا تھا، ضرورت ہو کہ اراکینِ دائرہ اس اسکیم کی تکمیل مقدم واہم خیال کریں، اور جہاں تک ممکن ہو نئی کتابوں کی طرف توجہ نہ کریں،

۱۳۵۳ھ میں دائرہ نے کتاب "تذکرۃ السامع والمتکلم" شائع کی جو اگرچہ دہ سالہ اسکیم میں نہیں ہے، مگر اپنے موضوع کے اعتبار سے دلچسپ اور مفید ہے اور اس کے وہ حواشی وشروح بھی قابلِ ذکر ہیں جنھیں دائرہ نے بڑی محنت وجانفشانی سے تیار کیا ہے، اگر ان کو شرح کی شکل میں کردیا جاتا تو زیادہ مفید ہوتا،

موضوعِ کتاب | کتاب "تذکرۃ السامع والمتکلم" فنِ تعلیم پر کم وبیش سوا دوسو صفحوں کی کتاب ہو،

مسلمانوں نے اپنے عروج اور علمی کمال کے زمانہ میں ہر ایک موضوع پر کافی بحث و تنقیح اور اعلیٰ سے اعلیٰ تحقیق کی ہے، علوم نقلی و عقلی صنعت و حرفت علمی او رعملی ہر پہلو پر بسط و توضیح سے کام کیا ہے ہر فن کے اہم ابواب و فصول پر خاص خاص تحقیقاتوں کا بے بہا خزانہ خلف کے لئے چھوڑا ہی، یہ ہماری غفلت کہئے یا قومی ادبار و انحطاط کا نتیجہ، کہ وہ علمی خزانے زمانہ کے ہاتھوں تلف ہو گئے یا ہمارے یہاں سے دوسرون کے یہاں پہونچ گئے، اور جو موجود ہیں، انکی طرف ہماری توجہ و نظر نہیں، نہ ہمیں اوسکی کوئی قدر ہے،

یورپ نے اپنی ضرورت کے مطابق تاریخ جغرافیہ، سیاسیات وغیرہ کے نوادر شائع کئے، اور اُسے اپنی خاص مصلحت کی بنا پر ایک حد تک پہونچایا، مگر ہمارے یہاں نہ اہل علم کی کوئی ایسی جماعت ہے اور نہ کوئی ادارہ جو اس بے بہا خزانہ کی قدر و قیمت پہچانتا، اور اس کی اشاعت سے اسے نشاۃ ثانیہ بخشتا، ایک دائرۃ المعارف ہی جس نے اس فرض کا ایک حصہ اپنے ذمہ لیا، اور وہ اس کیلئے کام کر رہا ہے،

یہ عام خیال جو زیادہ تر انگریزی خواں طبقہ میں سرایت کیا گیا ہے، کہ مسلمانون نے اپنے ترقی کے زمانہ میں کوئی علمی کام نہیں کیا، بالکل غلط اور اصلیت سے دور اور محض ہمارے دشمنون کی دسیسہ کاری اور ابلہ فریبی ہو،

تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کے علوم و فنون میں مسلمان کئی صدیوں تک استاد و امام کی حیثیت رکھتے تھے، انھون نے عرصۂ دراز تک علمی امانت کی تنہا حفاظت و نگہداشت ہی نہیں کی، بلکہ اس کو ترقی کے اعلیٰ مدارج تک پہونچایا، اور تکمیل و تہذیب کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا، اگر علما و فضلا علم و فن کی خدمت کرتے تھے تو سلاطین و امراء انکی کفالت و خدمت باعث سعادت سمجھتے تھے، اس زمانہ کا علمی شغف، علوہمت، ذوق تحقیق قابل قدر ہو، مسلمانون نے دوسروں سے جو کچھ لیا، اس کو بہت

زیادہ تہذیب و اضافہ، تصحیح و تنقیح سو عملی تکمیل تک پہونچایا، کوئی علم و فن ایسا نہیں جس میں انھوں نے اجتہاد و تحقیق سے کام نہ لیا ہو اور کوئی غلطی قدما کی ایسی نہیں جس پر ان کی تنقید نہ موجود ہو، آج یورپ بہت سی چیزوں میں انہی کا خوشہ چیں ہے، مگر ہمارے نوجوانوں کو اس کا احساس نہیں، وہ اپنے اسلاف کے کارناموں سے اس قدر دور، غافل اور ناواقف ہیں، کہ اجانب کی پرستش کرتے ہوئے تھکے جاتے ہیں، مگر اپنوں کا حق ادا نہیں کرتے، اور کمال تحقیق یہ سمجھتے ہیں، کہ کسی یورپین زبان سے کوئی مضمون نقل کر دیا جائے، اور خود اپنے گھر کے خزانوں کی ان کو خبر نہیں،

مصر نے احادیث کے مضامین کی ایک فہرست "مفتاح کنوز السنۃ" کے نام سے ترجمہ کرکے شائع کی، قرآن مجید کے مضامین کا ایک خاکہ "تفصیل آیات القرآن" کے نام سے ترجمہ کرکے شائع کیا، یہ کام اچھا ہے، مگر یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ہم اپنی چیزوں کے لئے بھی دوسروں کے دست نگر ہیں، مستشرقین کچھ نہ کچھ کام کرتے ہیں، مگر علوم اسلامیہ کے بارہ میں ان کی معلومات بہت ناقص ہیں، ان کی تحقیقات کا دارومدار سطحیات پر ہوتا ہے، ان کی غلطیاں ان کی صحت سے زیادہ ہوتی ہیں، اس لئے ان کے فوائد کیساتھ خطرات بھی زیادہ ہیں، جو لوگ سنت اور مطالب قرآن کریم سے ناواقف اور نابلد ہوں ان کا ان کی فہرست بنانا ایک علمی تفریح سے زیادہ نہیں، ضرورت تھی کہ ان کی فہرست کی پوری تنقید کیجاتی، اور پورے غور و تدبر سے کامل فہرستیں تیار کرکے شائع کیجاتیں، مگر ہم اسی پر قناعت کر چکے، جو یورپ نے ہمیں دیا،

ایک زمانہ ایسا بھی تھا، کہ لوگ یورپ کی تحقیقات کو وحی آسمانی کی طرح حقیقت اور صحت کا سرچشمہ تصور کیا کرتے تھے، لیکن اب یہ حقیقت آشکارا ہو چکی، کہ مغرب کا بنایا ہوا کہیں ناقابل اعتبار اور زیادہ سے زیادہ نقد و نظر کا محتاج ہوتا ہے، اسکی تحقیقات میں تعصب، غلط فہمی، جہالت ہر طرح کی خامیاں ہوتی ہیں، یہ مسلمانوں کا فرض تھا، کہ وہ اسکی غلطیوں کی اصلاح کرتے، باطل اور لغو

پروپگنڈے کو روکتے، اسکی علمی تحقیقات اور تاریخی معلومات کا پردہ چاک کرتے، مگر اس کے لئے ایک مجمع علمی کی ضرورت تھی، جس میں اساطین علم وارباب تحقیق شامل ہوتے، اور ماہرین السنہ کے ساتھ مل کر یہ فرض انجام دیتے، تا آنکہ یورپ اپنے خیالات پر نظر ثانی کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا اور اسکے غلط تخیلات و نظریات ناقابل اعتبار ٹھہرتے،

مقصود یہ ہو کہ مسلمانوں نے اپنے دور ترقی میں ہر ایک علم و فن اور ہر قسم کی تحقیقات پر کافی کام کیا اور خلف کے لئے بہت کچھ ذخیرہ چھوڑ گئے، گو اس زمانہ میں طباعت اور نشر و اشاعت اور سفر و حمل کی سہولت نہ تھی، مگر ان کی علمی قدر دانی علو ہمت اور ذوق و شوق نے یہ تمام مشکلات آسان کر دیئے تھے، باوجود ان مشکلات کے تصنیف و تالیف تحقیق و تنقید اور اسکی نشر و اشاعت کا سلسلہ جاری تھا، مشرق میں مغرب کے اہل علم آتے تھے، حج و زیارت کے سلسلے میں بہت کچھ مشکلات حل کیجاتی تھیں، جگہ جگہ ایسے آدمی بطور ایجنٹ مقرر تھے، جن کے ذریعہ کتاب مؤلف کے ہاتھ سے نکلتے ہی تمام علمی مرکزوں میں بہت جلد پہونچ جاتی تھی، باوجود ہزاروں میل کی مسافت کے علم کی نشر و اشاعت کے لئے مشرق و مغرب کا سلسلہ اتنا ملا ہوا تھا، کہ اس آسانی اور سہولت کے دور میں بھی اسکی مثال نہیں ملتی، خطیب بغدادی متوفی ۴۶۳ھ بغداد میں بیٹھے ہوئے ابن حزم الاندلسی المتوفی ۴۵۶ھ کے علوم سے استفادہ کرتے ہیں، اور اپنی تاریخ بغداد میں ان کے حوالے پیش کرتے ہیں، خود ابن حزم جو کبھی مشرق نہیں آئے، قرطبہ میں بیٹھے ہوئے مصر و بادیہ عرب کے حالات انساب و دیگر معلومات خط و کتابت کے ذریعہ سے حاصل کرتے ہیں، اور اس کا ذکر اپنی کتابوں میں کرتے ہیں،

اس زمانہ میں طباعت کے قائم مقام فن وراقت تھا، وہ زمانہ اس کے عروج کا تھا، جہاں کوئی تالیف تیار ہوئی، اس کے سیکڑوں نسخے ایک سے ایک اعلیٰ نہایت اہتمام و تصحیح سے تیار ہو کر بازار میں فروخت ہونے لگے، تاجر کتب وراق کہلاتے تھے، بہت سے باکمال ایسے گذرے جنھوں نے ذریعہ

وراقت کے سلسلہ میں علم و تالیفات کی بڑی خدمت انجام دی، مثلاً ابن الندیم جس نے اپنے زمانہ تک کے علوم و فنون کی تالیفات اور مؤلفین کیلئے کتاب الفہرست بطور یادگار چھوڑی،!

جس طرح آجکل اخبار و رسائل کے ذریعہ متفرق خیالات، سیاسی و مذہبی افکار کی نشر و اشاعت ہوتی ہے، اور اس میں یورپ کو ید طولیٰ حاصل ہے، اسی طرح گذشتہ زمانہ میں خاص خاص جماعتیں، امراء و خلفاء اپنے خیالات، سیاسیات اور مذہبیات کی اشاعت کیلئے مختصر رسائل اور کتابوں سے کام لیا کرتے تھے، ابو العیناء، ابن الراوندی، الجاحظ اور اس قسم کے بہت سے مؤلفین ہیں جو سیاست وقت کی خدمت کرتے تھے، اور ارکان سلطنت ان کی انشاپردازی اور سحر طرازی سے پورا پورا فائدہ اٹھانیکی کوشش کرتے تھے، اور ان کے رسائل اخبار و مجلات کی طرح شائع کئے جاتے تھے،

فن تعلیم | اس فن پر اصولاً و فروعاً بہت کچھ لکھا گیا، اسلام عقائد و اعمال کے ساتھ علم بھی لایا، اور اس نے سب سے پہلے تمام دنیا کو ہر قسم کی ذہنی غلامی سے آزاد کرکے صحیح علم کا شیدا بنایا، اسلام کا مدرسہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے قائم ہوا، آپ اس درس گاہ کے پہلے معلم تھے، آپ کے مدرسہ میں صحابۂ کرام بالخصوص اصحاب صُفّہ کی جماعت تھی، جن کی پاک زندگی علم و عمل کے لئے وقف تھی، انھیں آل و اولاد کسب معاش وغیرہ کسی چیز کی فکر نہ تھی، صحابۂ کرام بھی اپنی اپنی ہمت کے مطابق علم کے لئے فرصت نکال کر حاضر ہوتے تھے، بعض ایک دن اپنا کام کرتے، اور ایک دن تحصیل علم کرتے، کتب حدیث و سیر، اور اصحاب صُفّہ کے لئے خاص تاریخیں اس امر کی شاہد ہیں، کہ علم سے ان کا شغف اعلیٰ درجہ کا تھا، بدر کے کفار جب قید ہو کر آئے، تو علم ہی کے لئے چند آدمیوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دینا ان کا فدیہ قرار دیا گیا، علم ہی کی شان ہے کہ تعلیم قرآن کے مہر پر نکاح کر دیا گیا، اور اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْقُرْآنِ اَقْوَامًا وَیَضَعُ بِہٖ آخَرِیْنَ" کا اعلان ہوا (جس نے علم قرآن حاصل کیا، وہ عزت پائے گا، اور جو اس سے جاہل رہا، وہ ذلیل و خوار ہو جائے گا)

صحابۂ کرام کو جب جنگ سے ذرا اطمینان ہوا تو انھوں نے فوراً تعلیم کا سلسلہ قائم کر دیا، چنانچہ حضرت امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے عام تعلیم کا اعلان فرمایا، اور جگہ جگہ معلمین مقرر کرکے بدوی اور شہری آبادی میں تعلیم کی اشاعت کی، یہ گویا جبری تعلیم کا طریقہ تھا، کہ جنگلی پکڑ پکڑ کر لائے جاتے، اور کتابت و حرف شناسی سے آشنا کئے جاتے تھے، اس طرح امت اسلامیہ کا ہر ایک فرد قلیل مدت میں علم و تعلم سے تعلق قائم کر لیتا تھا، متفرق مقامات پر خاص معلمین مقرر کئے گئے، مثلاً حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کوفہ میں، ابو موسیٰ اشعریؓ بصرہ میں، عبادہ بن صامتؓ اور ابو الدرداؓ شام میں،

پھر جسے علم سے سیراب ہونے کا شوق ہوتا، وہ مدینہ کا رخ کرتا، اور وہاں جلیل القدر صحابہ سے استفادہ کرکے اپنی پیاس بجھاتا،

پہلی صدی ہجری تک یہی رنگ رہا، اور تعلیم صحیفہ کے بجائے سینہ بسینہ ہوتی رہی، خاص خاص اشخاص کی وجہ سے مخصوص مقامات علمی مرکز بن گئے، مثلاً حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ذات سے مکہ مکرمہ اور طائف، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، اور حضرت عائشہ صدیقہ وغیرہما کی ذات سے مدینہ منورہ وغیرہ علم کے مرکز تھے، پھر رفتہ رفتہ اس میں ترقی ہوتی گئی، تاآنکہ مدارس کی بنیاد پڑی، ان کی ضروریات کیلئے تالیفات، تراجم، اور اس ضرورت کی تکمیل کیلئے کاغذ سازی، کتابوں کی نقل و اشاعت کیلئے فن وراقہ پیدا ہوا، مدارس کے واسطے اصول و ضوابط، معلمین و متعلمین کے فرائض، "طبیب"، "معید"، "حفاظ"، "قراء" وغیرہ مقرر کئے گئے،

باقاعدہ مدرسہ کی عمارت کے بارہ میں سخت اختلاف ہی، کہ کس سنہ مین اسکی ابتدا ہوئی مگر تیسری صدی یا اسکے کچھ بعد سے یہ سلسلہ جاری ہونا ہر طرح مسلم ہے، چھٹی اور ساتویں صدی اور اسکے مابعد مدارس کی تاریخ، ان کے مدرسین و طلبہ کے حالات میں متعدد کتابیں لکھی گئیں، جن کا بڑا حصہ آج مفقود ہے،

علامہ ابن خلدون نے اپنی مشہور تاریخ کے مقدمہ میں علوم وفنون، ان کی ضرورت، طرزِ تعلیم وغیرہ پر مفید اصولی بحث کی ہے، اور متفرق علوم وفنون کی اہم کتابوں کے بارہ میں جا بجا اپنے اور اپنے اساتذہ کا خیال پیش کیا ہے، اس اعتبار سے ان کا مقدمہ آٹھویں صدی کے علمی حالات، اور کتب نصاب کا ایک خاکہ ہے، اس کے علاوہ علم کے فضائل، طریقِ تعلم وتعلیم پر اہل علم نے بہت کچھ تالیفات چھوڑی ہیں جن میں سے موجودہ کتب کا معتدبہ حصہ ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں،

۱- **جامع بیان فضل العلم واھلہ**، حافظ المغرب ابن عبد البر الاندلسی المتوفی ۴۶۳ھ علم کے فضائل، ضرورتِ تعلیم، علماء کے اخلاق، طریقِ تعلم اور دوسرے اہم معلومات کا ذخیرہ ہے، یہ کتاب بطور مراسلہ تحریر کی گئی، اس کا مختصر مدت ہوئی شائع ہو چکا تھا، پھر اصل نسخہ بھی دو حصوں میں شائع ہوا، مگر مختصر زیادہ صحیح ہے،

۲- **فاتحۃ العلوم للغزالی**، المتوفی ۵۰۵ھ، یہ رسالہ مصر سے ۱۳۲۲ھ میں شائع ہوا، اس میں علم کی فضیلت، اس کی ضرورت، آدابِ تعلیم وتعلم، علوم کی تقسیم، وغیرہ مضامین ہیں، امام موصوف نے احیاء العلوم کی ابتداء میں بھی اس موضوع پر طویل بحث کی ہے،

۳- **تعلیم المتعلم**، برہان الدین الزرنوجی، مطبوع ۱۲۹۳ھ وغیرہ، یہ رسالہ تقریباً ساتویں صدی میں لکھا گیا، اس کی متفرق شرحیں بھی شائع ہو چکی ہیں، یہ بھی تعلیم وتعلم، اور آدابِ تعلیم پر حاوی ہے،

۴- **ارشاد القاصد الی اسنی المقاصد**، ابن ساعد الاکفانی المتوفی ۷۴۹ھ، یہ بے مثل کتاب گو مختصر ہے، لیکن تعلیم وتعلم اور نصابِ علم پر جامع ومفید ہے، اس کتاب میں ۶۰ علوم وفنون پر تبصرہ اور ان کی تقریباً ۶۰۰ کتابوں کا مختصر بیان ہے، گویا ہر ایک علم کی منتخب کتابوں کا ایک تذکرہ ہے، اس کے مؤلف تذکرۃ السامع والمتکلم کے معاصر ہیں، ان کی ایک دوسری کتاب جس کا ذکر علامہ سخاوی نے "الاعلان بالتوبیخ" میں خاص طور پر کیا ہے، **الدر النظیم فی آداب التعلم والتعلیم** ہے

مگر اس کا نسخہ شائع نہیں ہوا،

۵۔ روضۃ العلماء زندویسی، ایک ضخیم کتاب علم و علماء کے متعلق تقریباً پانچویں صدی میں مرتب کی گئی، قلمی نسخے ہندوستان میں متعدد کتبخانوں میں موجود ہیں،

۶۔ "اللؤلؤ النظیم" شیخ زکریا انصاری کا مختصر رسالہ تعلیم و تعلم کی بابت غالباً شائع ہو چکا ہے میری نظر سے قلمی نسخہ گذرا ہے،

۷۔ المعید فی ادب المفید والمستفید" مختصر کتاب الدر النضید" تالیف الشیخ عبد الباسط ابن موسی العلموی المتوفی ۹۸۱ھ طبع دمشق ۱۳۴۹ھ،

یہ کتاب بھی "تذکرۃ السامع والمتکلم" کے اکثر مضامین پر حاوی ہے، اور جا بجا اس سے نقل و استفادہ کیا ہے، تعلم و تعلیم کے آداب وغیرہ پر بہت کچھ مسائل و فوائد اس میں ہیں،

تعلم و تعلیم اور اس کے متعلقات پر محدثین کے یہاں اصول حدیث میں نہایت اہم اور ضروری مباحث ہیں، خود حدیث کی کتابوں میں بھی "ابواب العلم" کے ذیل میں بہت سے مسائل ہیں، شرح و بسط کیلئے کتب ذیل خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں،

(۱) المحدث الفاصل للرامہرمزی المتوفی حدود ۳۶۰ھ یہ اصول حدیث میں اولین کتاب شمار کیجاتی ہے، اس میں تعلم و تعلیم، تالیف و تصنیف، مقابلہ و تصحیح، طریقہ تعلیم کس عمر میں کونسی تعلیم حاصل کیجائے وغیرہ مباحث اور خاص ابواب پر مشتمل ہیں، یہ کتاب ابتک شائع نہیں ہوئی قلمی نسخہ پیش نظر ہے،

(۲) کتاب الکفایہ فی علوم الروایہ، للخطیب البغدادی، المتوفی ۴۶۳ھ، اس کا قلمی نسخہ پیش نظر تھا، یہ دائرہ کی دہ سالہ اسکیم میں تھا، اور ۱۳۵۷ھ میں شائع ہو چکا،

(۳) کتاب الجامع فی آداب الراوی والسامع، للخطیب، اس کا قلمی نسخہ شام میں ہے

یہ گویا الکفایۃ کی تکمیل ہے،

۴۔ کتاب الالماع فی آداب السماع، قاضی عیاض بن موسیٰ الیحصبی المتوفی ۵۴۴ھ بھی اسی قسم کی کتابوں میں شامل ہے، اس کے قلمی نسخے متعدد جگہ ہیں،

۵۔ مقدمہ ابن الصلاح، شرح مقدمہ، تدریب الراوی، الباعث الحثیث وغیرہ میں بھی یہ مباحث ہیں،

تذکرۃ السامع والمتکلم کے ابواب مؤلف نے کتاب کو پانچ حصوں پر تقسیم کیا ہے،

۱۔ باب اول، علم اور علما، کے فضائل، اس میں آیات اور احادیث صحیحہ وغیرہ درج ہیں صفحہ ۵ سے ۲۴ تک،

۲۔ باب دوم، عالم کے کیسے اخلاق ہونے چاہئیں، اس کی تین فصلیں ہیں، الف عالم اپنی ذات سے کیسا ہو، ب درس و تدریس کے وقت کیسا ہو، ج طلبہ کے ساتھ کیسا برتاؤ کرے، یہ باب ص۲۵ سے ص۶۶ تک ہے،

۳۔ باب سوم، طالب علم کو کیسا ہونا چاہئے، اسکی بھی تین فصلیں ہیں، الف خود طالب علم کیسا ہو، ب استاد کے ساتھ کیسے برتاؤ کرے، ج درس کے وقت اور رفقاء سے کیسا برتاؤ ہو یہ باب ص۶۷ سے شروع ہو کر ص۱۶۳ پر ختم ہوتا ہے،

ان تینوں ابواب کے متعلق احیاء العلوم اور جامع بیان فضل العلم میں بہت زیادہ تفصیل سے ملیگی، اسی طرح فاتح العلوم میں بھی تمام احادیث کی تخریج کے لئے شرح احیاء العلوم اور المغنی عن حمل الاسفار حافظ زین الدین العراقی کی کافی ہے جو احیاء العلوم کے ساتھ مصر میں شائع ہو چکی ہے،

ابوبکر محمد بن الحسین الآجری المتوفی ۳۶۰ھ نے ایک مختصر رسالہ "اخلاق العلماء" کے نام سے لکھا ہے جو ان مضامین پر حاوی ہے، یہ ۱۳۴۹ھ میں مصر سے شائع ہو چکا ہے، اس رسالہ

ہیں آجری نے صفحہ ۲۸ تک فضائل علم و علماء لکھے ہیں، پھر صفحہ ۲۹ پر کتاب کے تمام ضروری مطالب کی فہرست اس طرح تحریر کی ہے، "عالم کے مختلف حالات ہیں جن میں خاص خاص باتوں کا اسے خیال رکھنا چاہئے، طلب علم کے وقت، درس کے وقت، علم سے فارغ ہونے کے وقت علماء کی مجلس میں تعلیم کے وقت، مناظرہ و افتاء کے وقت متفرق حالات میں کن کن اخلاق و اصول کا پابند ہونا چاہئے، اُمراء کی مجالس میں کیا کرے، ؟ کن لوگوں سے اختلاط و ارتباط رکھے؟ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اُسے کیسا تعلق ہو، بندوں سے کس طرح پیش آئے، ؟" ان تمام باتوں پر ایک ایک کرکے پوری کتاب میں مفید بحث کی ہے،

علامہ ابن الاکفانی مؤلف "ارشاد القاصد" نے صفحہ ۲۱ پر تعلم و تعلیم کے بارہ میں ۱۲ شرطیں لکھی ہیں جنہیں اس فن کی تمام ضروری باتوں کا خلاصہ سمجھنا چاہئے، ہم اس جگہ ان کی بحث کا مختصر خاکہ پیش کرتے ہیں، تاکہ یہ اندازہ ہو سکے، کہ مسلمانوں میں صحیح علمی مذاق پیدا کرنے کے واسطے کن اصول کی پابندی ضروری سمجھی جاتی تھی، جنہیں آج ہم نے پس پشت ڈال دیا، اور دوسرے ان سے متمتع ہو رہے ہیں،

(۱) علم و فضل حاصل کرنے کا خاص مقصد کسی فن میں کمال حاصل کرنا یا جس کے واسطے یہ فن مرتب ہوا ہے، اس میں کمال کا خیال ہونا چاہئے، محض مال و جاہ، دولت و ترقی کے لئے آلہ کار نہ بنائے، کیونکہ علمی فضل و کمال صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے،

(۲) ہمیشہ اُسی علم و فن میں کوشش کرنی چاہے، جس کی جانب طبعی رجحان ہو، کیونکہ نہ تمام لوگ عالم بن سکتے ہیں، نہ ہر ایک عالم تمام علوم و فنون میں کمال حاصل کرنے کی قابلیت رکھتا ہے،

(۳) جس علم و فن کی تعلیم حاصل کرنا مقصود ہو، پہلے اس کی حقیقت معلوم کرے، اس کی غرض

و غایت اچھی طرح سے سمجھے، اور یہ معلوم کرے، کہ یہ علم کب اور کس طریقہ سے حاصل کرنا چاہئے،

(۴) جس فن کو سیکھے، پوری جانفشانی اور محنت سے سیکھے، اپنی طاقت کے مطابق اس کے مسائل و مشکلات حل کرے، جہانتک ہوسکے فن کے تمام مسائل پر عبور حاصل کرنے کی کوشش کرے

(۵) ہر ایک فن کی بہترین تالیفات پڑھے، انہی کو اپنے مطالعہ میں رکھے، ہر ممکن ذریعہ سے ان سے استفادہ کرتا رہے، اس میں کسی طرح کی سستی نہ کرے،

کتب علوم و فنون کی تقسیم، علوم و فنون کی تالیفات تین قسم کی ہیں، :-

(۱) مختصرات (۲) متوسطات (۳) مبسوطات،

مختصر وہ تالیف ہے، جس کے الفاظ کم اور مطالب زیادہ ہوں، انھیں تذکرہ (نوٹس) سمجھنا چاہئے، جس سے منتہی استفادہ کر سکتے ہیں، اگر مبتدی ذہین اور ذکی ہے تو وہ بھی مستفید ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے،

متوسط وہ تالیف ہے، جس کے الفاظ و مطالب برابر ہوں، اور جس میں فن کی ضروریات آسان طریقہ سے بیان کی گئی ہوں، اس سے ہر طبقہ کے اشخاص استفادہ کر سکتے ہیں،

مبسوط وہ تالیف ہے جو اپنے فن پر جامع ہو، اور اس میں تمام مشکلات و مباحث فن پر پوری تحقیق ہو، یہ علمی کمال اور مطالعہ کے لئے ضروری ہے،

مؤلفین کی تقسیم معتبر مولفین صرف دو قسم کے ہیں

الف وہ ائمۂ فن اور کاملین جنھیں کسی مخصوص فن سے پورا ذوق ہو، اور وہ اس میں راسخ ملکہ رکھتے ہوں اور ان کو اس کا وسیع تجربہ ہو، اور اس کے مشکلات و مسائل پر گہری نظر ہو، ان کے دماغ میں اس فن کے بیشتر مسائل مستحضر اور مشکلات حل شدہ اور مرتب ہوا کرتے ہیں، ان کی تصنیف و تالیف فنی ملکہ پیدا کرنے اور تکمیل و فاضل بننے کے لئے ضروری ہے، چونکہ ان کے

الفاظ مرتب اور مہذب ہوتے ہیں، ان کی نظر دقیق و تیز اور ان کی تحقیق جامع و مانع ہوتی ہے، اسلئے ان کی تالیفات سے کسی وقت استغنا ممکن نہیں، ان کے نتائج افکار اور لطائف و نکات بے شمار ہوتے ہیں، ہر ایک شخص ان کے کلام سے زیادہ سے زیادہ علمی فوائد و تحقیقات حاصل کر سکتا ہے،

ب وہ صاحب فضل و کمال مولفین جو ذہن سلیم اور طبع مستقیم رکھتے ہیں جنھیں انشاء و تحریر کا خاص سلیقہ ہے، اگرچہ وہ ائمہ فن و کاملین کا سا رسوخ علمی اور تبحر نہیں رکھتے، مگر اس خاص فن سے محض کورے اور نابلد بھی نہیں ہوتے، ان کے مطالعہ میں ائمہ فن کی اعلیٰ و بیش بہا کتابیں رہیں، انھوں نے اپنی تحریر و انشاء کے ذریعہ متقدمین کے مضامین ملخص و مرتب صورت میں پیش کئے، ایسی تالیفات سے مبتدی اور متوسط طبقہ مستفید ہو سکتا ہے، ان دونوں طبقہ کے متعلمین کو ان تالیفات پر توجہ کرنی چاہیئے،

(۶) کسی استاد کامل اور ماہر فن مشفق سے علم حاصل کرنا چاہئے، فضلاء کا مقولہ ہے العلم فی الصدور لا فی السطور، (یعنی علم در سینہ نہ در سفینہ)

تربیت و تعلیم کا طریقہ | استاد کامل کا فرض ہے کہ جو فن طالب علم کو سکھائے، پہلے اسکو خاص طور پر مرتب کرلے، ابتدا میں ضروری اور عام فہم مسائل کی سادہ طور پر تعلیم دے، پھر رفتہ رفتہ ترقی اور شرح و بسط دلائل و شواہد کا اضافہ کرتا جائے جب طالب علم کو ایک حد تک تیار کرلے تو پھر مشکلات فن اور اعتراضات و جوابات سے مانوس کرے، اس طرح بتدریج اسے کامل تحقیق کے واسطے تیار کرے،

(۷) علمی مذاکرہ جاری رکھے احباب اور اہل علم سے علمی بحث و نظر تحقیق و تنقید کا سلسلہ قائم کرے، لیکن اس سے محض علمی تعاون استفادہ و افادہ مقصود ہو، مکابرہ و مجادلہ نہیں کہ اسکو تلقیح العقول عقل کی ترقی و کمال مذاکرہ سے ہوتی ہے، کسی شاعر نے اس مضمون کو یوں ادا کیا

وَمَا بَقِيَتْ مِنَ اللَّذَّاتِ إِلَّا مُحَادَثَةُ الرِّجَالِ ذَوِي الْعُقُولِ

(آج تمام لذتوں میں سے صرف عقلمندوں سے مذاکرہ باقی رہ گیا ہے)

وَقَدْ كُنَّا نَعُدُّهُمْ قَلِيلًا فَقَدْ صَارُوا أَقَلَّ مِنَ الْقَلِيلِ

(ہم انہیں تھوڑا خیال کرتے تھے، مگر اب وہ اقل قلیل یعنی کالعدم ہو چکے)

دراصل مذاکرہ ہی سے آدمی اپنی صحیح قابلیت اور اپنی تحقیق کی اصلی حالت کا کچھ اندازہ کرسکتا ہے تنہا کوئی شخص اپنے نقص و کمال تحقیق و تحریر کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتا، مذاکرہ سے بہت سے مشکلات حل ہوتے ہیں اور جدید تحقیقات کا انکشاف ہوتا ہے۔

۸۔ جب کسی علم و فن میں کمال پیدا ہو جائے، تو اُسے ایک امانت الٰہی سمجھے اور اس فکر میں رہے، کہ جب موقع ملے، اُسے مستحق تک پہونچائے، خواہ تعلیم کے ذریعہ یا تالیف و تصنیف کے ذریعہ اور اپنی علمی تحقیقات کو جہاں تک ممکن ہو تحریر میں مرتب و منظم کرتا جائے معلوم نہیں کب اسے ان کی ضرورت پیش آجائے، یا وہ اُسے دوسروں تک پہونچانے سے قبل ہی اس دار فانی سے رحلت کرجائے، یا اس کی صحت جواب دیدے، اور لوگ اسکے فوائد سے محروم رہ جائیں،

۹۔ کسی علم و فضل میں انتہائے کمال اور احاطہ و استقصار کا ہرگز دعویٰ نہ کرنا چاہئے ایسے لغو خیال کو نہ بھٹکنے دے، کیونکہ یہ حقیقی فضل و کمال سے اُسے محروم کردے گا، بلکہ ہمیشہ ترقی کا خواہاں رہے اور ہمیشہ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا (اے رب مجھے علم میں ترقی دے) کو اپنا نصب العین رکھے،

۱۰۔ ہر ایک علم و فن کی ایک غایت اور حد ہوتی ہے اس سے کبھی تجاوز نہ کرے، اکثر ایسا ہوتا ہے، کہ جو شخص کسی علم و فن میں ماہر و فاضل ہوتا ہے، وہ اپنے مخصوص علم و فن کی بابت مبالغہ اور غلو کیا کرتا ہے اسے تمام علوم و فنون سے بڑھا دیتا ہے، اسکے لئے طرح طرح کے فضائل تلاش کیا کرتا ہے اس کے واسطے حجتیں گڑھتا ہے، انکی ہرگز ضرورت نہیں بلکہ ان سے بچنا چاہئے،

۱۱۔ تقریر، تحریر اور مناظرہ میں ایک علم و فن یا اسکی اصطلاحات کو دوسرے علم و فن میں ہرگز نہ ملائے، اس طریقہ سے ایک تو اسکی علمی کمزوری اور فرومایگی ظاہر ہوگی، دوسرے لوگوں کو اس سے تشویشِ خاطر اور اشکال پیدا ہوگا،

۱۲۔ استاد کے آداب و حقوق کا خاص طور پر لحاظ کرے، اسکندر سے کسی نے دریافت کیا، اپنے استاد کا اس قدر کیوں احترام کرتے ہو، جو باپ سے بھی زیادہ معلوم ہوتا ہے، ؟ جواب دیا کہ باپ مجھے دار الفنا میں لایا مگر معلم مجھے دار البقا کی رہبری کرتا ہے"

اسی طرح ہم سبق بھائیوں سے اخوت کا برتاؤ کرتا رہے، شاگرد کو اولاد کے قائم مقام سمجھے،

غرض اس طرح سب حقوق و فرائض کا پورا پورا لحاظ کرے،

تذکرۃ السامع کا چوتھا باب کتابوں کی حفاظت اور ان سے متعلق بعض آداب و نصائح پر مشتمل ہے، جو ص۱۶۳ سے ص۱۹۳ تک ہی،

باب پنجم، مدرسون کے متعلق اور ان میں اقامت کے آداب پر ہے، یہ ص۱۹۳ سے ص۲۱۳ تک ہی،

یہ مباحث تعلیم المتعلم اور المعید وغیرہ مین بھی ہیں،

آداب تالیف و تصنیف، اور نقل و تصحیحِ کتب کے قواعد و ضوابط فن اصول حدیث کے آخر میں کافی بسط و شرح سے ملتے ہیں،

ائمۂ فن نے تعلیمات پر جو کتابیں چھوڑی ہیں ابتک ان کا بڑا حصہ نایاب ہے، ابن حزم الاندلسی کی ایک کتاب مراتب العلوم کے نام سے معنون ہے، جس میں علوم و فنون سے متعلق اہم معلومات مین اور ہرایک فن کی اعلیٰ تالیفات اور ان کے مدارج وغیرہ بیان کئے گئے ہین، نیز متفرق علوم و فنون کی تعلیم کا طریقہ اور ان کی ترتیب بیان کی گئی ہے، ابوبکر بن العربی الاندلسی نے "العواصم من القواصم"

کے آخر میں علوم و فنون اور اپنے زمانہ کی تعلیمی حالت اور طریق تعلیم پر مفید بحث کی ہے،

موجودہ تعلیم اور مسلمان

ایک زمانہ میں ہر عالم کا گھر مدرسہ اور ذی حیثیت کا گھر مکتب یا دارالعلم تھا، قوم کو تعلیم سے بیحد دلچسپی تھی، اس کے لئے زیادہ سے زیادہ قربانی کرتے تھے، بڑی بڑی جائدادیں وقف کیجاتی تھیں، اہل علم کی تلاش ہوتی تھی، اور بڑے بڑے مراتب واعزاز ان کے لئے مخصوص تھے، اب صرف تاریخ کے پارینہ اوراق میں ان کا کچھ کچھ پتہ مل سکتا ہے،

مسلمانوں نے جہاں اپنی بہت سی مذہبی خصوصیات آہستہ آہستہ چھوڑ دیں، علم کے میدان میں بھی آج وہ سب سے پیچھے نظر آتے ہیں، خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں میں دینی اور دنیاوی تعلیم کی کمی بالکل عیاں ہے،

(۱) چند اداروں کے سوا عموماً مذہبی تعلیم کے ادارے بہت معمولی درجہ کے اور کم تعداد میں ہیں، اعلیٰ درجہ کے نہ ابتدائی مدارس ہیں، اور نہ اعلیٰ تعلیم کے دارالعلوم ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کی خاک چھانئے کسی جگہ مسلمان بچوں کی صحیح مذہبی تربیت و تعلیم کا کوئی مرکز نظر نہ آئے گا،

(۲) پھر ان مدارس اور اداروں کی مالی حالت نہایت خراب بلکہ ناگفتہ بہ رہتی ہے، اسکے برعکس دوسری قوموں کے بیشمار مدارس ہیں، اور مالی اور علمی ہر اعتبار سے قابل اطمینان ہیں،

(۳) صنعت و حرفت کے ادارے جن کی سب سے بڑی ضرورت تھی بہت کم ہیں،

(۴) اسی طرح غربا، اور یتامیٰ کی تعلیم و تربیت کا کوئی معقول انتظام نہیں، اور جس قدر ہے وہ ناکافی اور غیر مفید ہے، ہماری قوم میں غربا کی اکثریت ہے، اس لئے اس کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے،

(۵) عربی تعلیم تقریباً فنا ہو رہی ہے، انگریزی تعلیم میں بھی باکمال شاذ و نادر ہی نکلتے ہیں، خاص مسلمانوں کے علمی ادارے ہی نہیں ہیں جو مشترک ہیں، ان کی باگ قوم کے سچے بہی خواہوں کے ہاتھ

میں نہیں، بلکہ ان پر دوسری قوموں کا غلبہ ہے،

آج ہمیں ڈاکٹری اور دوسرے ضروری شعبوں میں ہندوستان کی زبردست اسلامی آبادی میں برائے نام مسلمان ملیں گے،

(۶) جس طرح عربی تعلیم سے سچے مبلغ خطیب اور محدث و فقیہ کی ضرورت ہے، اسی طرح انگریزی تعلیم سے ڈاکٹر، انجینیر اور ماہرین فنون جدیدہ درکار ہیں، جو مختلف قومی و ملی اداروں میں کام کر سکیں،

(۷) ضرورت تھی کہ تمام دنیائے اسلام خصوصاً ہندوستان کے مسلمان عربی اور انگریزی کا ایک مشترکہ نصاب بناتے، جو خود ان کی کتابوں پر مشتمل ہوتا، یہ نصاب تمام مدارس میں جاری ہوتا اور سب میں ایک سا نظام ہوتا، لیکن اسکی امید نہیں، دوسری قومیں اپنے لئے ہر قسم کا راستہ صاف کرتی جا رہی ہیں، ہمارا کام محض شور و غوغا اور بے عملی کی زندگی گذارنا ہے، حد یہ ہو کہ آج تک اردو اور دینیات اردو کے اعلیٰ معیار کے رسائل تیار نہ ہو سکے، نہ اسلامی اور غیر اسلامی دنیا کی تاریخ کی درسی کتابیں اردو میں تیار کی گئیں، بازار میں آئے دن اس قسم کی کتابیں نکلتی رہتی ہیں، مگر ان میں سے ایک بھی معیاری نہیں کہی جا سکتی[1]،

ہمارے لئے "کتاب اللہ" کا متن متین ابدی اور سرمدی سرچشمۂ حیات ہے، یہ بدستور قائم و باقی رہے گا، باقی ہر علم و فن کی کتابیں ہمیشہ تنقیح و تحقیق، رد و بدل اور کمی و بیشی کی محتاج ہیں، عربی کی تعلیم کی بڑی اصلاح و تنظیم کی ضرورت ہے، اسی طرح انگریزی کے لئے بھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے،

ہمارا اولین فرض ہو کہ تعلیم خواہ کوئی سی ہو، اپنے مذہب اپنی تاریخ اور اپنی روایات کو ہاتھ سے نہ جانے دیں، ہماری پوری زندگی، مذہبیت کی روح میں ڈوبی ہوئی ہونی چاہئے، نہ موجودہ تعلیم

[1] معارف اسلامی تاریخ کا سلسلہ دار المصنفین میں مکمل ہو چکا ہو، اسکی پہلی جلد چھپ کر شائع ہو گئی ہو۔

عربی کی ہو، خواہ انگریزی کی، اسلامی روح سے بہت دور، اور صحیح تبلیغی شان سے سراسر اجنبی بنا دیتی ہے،

یہ بحث بہت لمبی ہے، جس کا یہ مضمون متحمل نہیں، سر دست اتنے ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے،

(دار المصنفین کی نئی کتابیں)

دولتِ عثمانیہ

(حصہ اول)
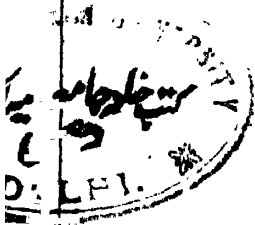
مرتبہ مولوی محمد عزیر صاحب ایم اے رفیق دار المصنفین

یہ مسلمانوں کی زندہ حکومت ترکی کے عروج و زوال اور جمہوریہ ترکی کی مفصل تاریخ ہے، پہلے حصہ میں عثمان اول سے مصطفےٰ رابع تک پانچ صدیوں کے مفصل حالات ہیں، اردو میں اب تک ترکی حکومت کی اس سے زیادہ مبسوط اور مستند تاریخ نہیں لکھی گئی،

ضخامت ۴۹۰ صفحے، قیمت سے ر

تاریخِ اسلام حصہ اول

(از آغازِ اسلام تا حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

اس کتاب میں عرب قبل از اسلام کے حالات، اور ظہور اسلام سے لیکر خلافت راشدہ کے اختتام تک کی اسلام کی مذہبی، سیاسی اور تمدنی تاریخ ہے، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی

حجم ۲۰۰ صفحے قیمت سے۔ منیجر

از

جناب خواجہ عبدالحمید صاحب ایم اے، لکچرار فلسفہ گورنمنٹ کالج لائل پور،

(۲)

۴۔ متذکرۂ بالا جوابی حملہ (۱۔ سے ۴ تک) جو تفاعلیت کے حامیوں کی طرف سے ہوا ہے، اس حقیقت کے ثبوت کے لئے کافی ہی، کہ متوازیت کی بنیادیں بہت کمزور ہیں، سچ تو یہ ہو کہ متوازیت کو صرف مشکلات سے گریز سمجھنا چاہئے، متوازیت صرف اس بات پر ٹھہر جاتی ہے کہ چونکہ تفاعل کا سمجھنا آسان نہیں ہے، اسلئے اس کا سرے سے انکار ہی کر دیا جائے اور بجائے اسکے کہ کوئی نیا نظریہ پیش کرکے ان مشکلات کا حل ڈھونڈا جائے، اور اس عقدہ کی کشائش کیجائے صرف اس بات پر ڈٹ جائیے کہ جسم کی عملداری الگ ہے، اور ذہن کی عملداری الگ، اور ان دونوں میں باہمی لین دین، تعامل اور تفاعل ہے ہی نہین، البتہ ہیں دونوں بھلے مانس، اگر ایک دوسرے سے بات چیت نہیں کرتے، تو کم از کم جھگڑتے بھی نہین، دو متوازی سلسلوں میں وہ اپنا اپنا کام کئے جا رہے ہین، یہ ممکن ہو کہ پس پردہ کوئی فاعل موجود ہو، جو ان دو سلسلوں کو گاڑی کے دو گھوڑوں کی طرح متوازی راستوں پر چلا رہا ہو، لیکن ہم پس پردہ جائین کیون؟ ہمیں تو اسی پر قناعت کرنا چاہئے کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ دو سلسلے متوازی جا رہے ہیں،

یہ ہے متوازیت کا نقطۂ نظر،

ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال اور یہ طرزِ استدلال کسی مفکر کے لئے ہرگز تسلی بخش نہیں ہوسکتا، وہ ایک مصنوعی اور باطل سد کے سامنے دیر تک کھڑا رہ نہیں سکتا، اسے خود اپنی صحت کی بقا کے لئے یہ سد گرانا ضروری ہوجاتا ہے، اس لئے مفکر کے لئے متوازیت صرف ایک عارضی مقام بن سکتی ہے، منزل ہرگز نہیں حقیقتِ حال بھی یہی ہے متوازیت کے مبلغ بالعموم وحدۃ الوجود یا وحدتِ جوہر کے نظریہ پر جاکر ٹھہرتے ہیں یعنی یا تو وہ یہ کہتے ہیں، کہ صرف ایک ذات موجود ہے، اور جو کچھ ہے وہ اسی ایک ذات کا پرتو ہے، اور یا یہ کہتے ہیں، کہ مادہ اور روح جسم و ذہن کی تفریق بالکل باطل ہے دونوں ایک ہی چیز ہیں، یہاں وحدۃ الوجود یا وحدتِ جوہر کی بحث میں الجھنا مقصود نہیں ہے، کیونکہ اس مقالہ کا مقصد صرف یہ ہے، کہ نفس و جسم یا ذہن و مغز کے تعلق کی حقیقت و نوعیت کی بحث میں جو کچھ کہا جائے، وہ حتی المقدور مابعد الطبیعیاتی قیاسات[1] و دلائل کو چھوڑ کر کہا جائے،

یہاں یہ پوچھا جاسکتا ہے، کہ جو سائنسداں متوازیت کے حامی ہیں، وہ اس نظریہ پر مطمئن کیوں ہیں،؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ بالعموم صرف اسلئے مطمئن ہیں، کہ انھوں نے اس پر غور نہیں کیا، اور نہ غالبًا اس پر غور کرنے کے لئے ان کے پاس (سائنسداں ہونے کی حیثیت سے) وقت ہے، اس مسئلہ کی حیثیت ان کے لئے محض ضمنی ہے، سائنسداں ہونے کی حیثیت سے ان کا کام حوادث و مظاہرِ قدرت کا بیان، تشریح اور علت جوئی ہے، ان مقامات سے گذرنے کے بعد ان کے سامنے اصل اور غایت کے مابعد الطبیعیاتی سوال آتے ہیں جن سے ان کو کوئی خاص سروکار نہیں جو سائنسدان

[1] مابعد الطبیعیات یا فلسفۂ الہیات سے مراد وہ علم تحقیق ہے، جو تمام دوسرے علوم کے بنیادی تصورات اور اولیات اور ان کے آخری ذاتی اور ناقابل حل مسائل سے بحث کرتا ہو، باقی علوم کا تعلق مظاہرِ قدرت اور حوادث سے ہوتا ہے لیکن مابعد الطبیعیات اصل اور غایت سے بحث کرتا ہے،

ان سوالات پر بحث کرتا ہے، (اور متوازیت، تفاعلیت یا کسی اور نظریہ کے حق میں تفکر کرتا ہے)
وہ اپنی سائنسدانی کی حیثیت کو عارضی طور پر چھوڑ کر فکر ہی حیثیت اختیار کر لیتا ہے، علوم حیاتیات و
نفسیات کے محققین کے لئے البتہ ایک خاص مقام پر پہونچکر یہ بحث ناگزیر ہو جاتی ہے، کہ آخر جسم
و ذہن یا مادہ وحیات کا باہمی تعلق کیا ہے، ؟ ایسے ہی مفکر اس مسئلہ کی تحقیق اور تشریح مین زیادہ
حصہ لے رہے ہین،

۹۔ تفاعلیت جس طرح سے اپنے خلاف اعتراضات کو رد کرتی ہے، اُسے آپ اوپر پڑھ چکے
اب وہ ایک قدم آگے بڑھتی ہے، اور اپنی تائید مین اور متوازیت کے خلاف دلائل پیش کرتی ہے،
استقرائی علوم کے اولیات دو ہیں، قانون علیت، قانون یکسانی فطرت، قانون علیت
کہتا ہے، کہ ہر اُس چیز کے لئے جو حادث ہے، کوئی علت ضرور موجود ہے، یعنی کوئی حادثہ اس وقت تک واقع
ہو نہیں سکتا، جب تک اس کیلئے علت موجود نہ ہو، اس قانون کی ایک نہایت ضروری اور جدید شق
یہ بھی ہے کہ علت (جو معلول سے کچھ عرصہ پہلے واقع ہوتی ہے) اپنے معلول میں تدریج بدل جاتی
ہے، مثلاً اگر ج علت ہے د کی، تو مراد یہ ہے، کہ جو قوت ج مین تھی، وہ کچھ عرصہ کے بعد د
کی شکل پا گئی ہے، اس نقطۂ نظر سے کہنا پڑتا ہے، کہ علت و معلول اپنی نوعیت میں ایک دوسرے سے
بالکل الگ نہیں ہوتے، اُن کے اندر ایک قسم کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے، اور وہ ایک ہی سلسلہ کی
دو اہم کڑیاں ہیں،

قانون یکسانی فطرت کہتا ہے کہ قدرت کے معمولات ہی اسکی سُنت ہیں، اور کچھ عرصہ کے
مشاہدہ کے بعد ہم ان مین سے بہت سے معمولات کو پا جاتے ہیں، جو کچھ ہو رہا ہے وہ ان معمولات
کے مطابق ہو رہا ہے، اسلئے اگر آج کسی خاص ماحول کے اندر کوئی خاص حادثہ واقع ہوا ہے
تو ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں، کہ آیندہ بھی جب وہی ماحول ہوگا، تو اسی قسم کا حادثہ ہوگا

ہوگا، مثلاً آج اگر پانی کے پینے سے ہماری پیاس بجھ گئی ہے، تو آیندہ بھی یہی ہوگا، ان دونون قوانین کو اکٹھا کر دینے سے ہمیں ایک جامع قانون یکسانی سلسلۂ علیت ہاتھ آئے گا، اس قانون کے مطابق ہم کہہ سکتے ہیں، کہ علت و معلول کا سلسلہ ہمیشہ یکسان قائم رہتا ہے، مثلاً اگر کسی خاص ماحول مین کسی خاص علت نے کوئی خاص معلول پیدا کیا ہے، تو آیندہ بھی ہمین اُس قسم کی علت سے اُسی قسم کے ماحول میں اُسی قسم کے معلول کے ظاہر ہونے کی توقع رکھنی چاہئے،

(۱) اب تفاعلیت کا پہلا اعتراض یہ ہے، کہ متوازیت سے قانونِ علیت (یعنی قانونِ یکسانی سلسلۂ علل) کی شکست اور اس کا نقض لازم آتا ہے، حالانکہ یہ بنیادی قانون تحفظِ قوت کی تعمیم سے بدرجہا زیادہ اہم، یقینی اور محقق ہے، خود تفاعلیت نہ صرف اِس نقض سے بری ہے، بلکہ اس کا انحصار تمامتر اس قانون پر ہے، اور اس دعویٰ کا ثبوت یہ ہے،

اگرچہ مظاہرِ قدرت مختلف ماحول کے اندر پیدا ہونے اور مختلف شرائط سے بندھے ہونے کے باوجود ہمیشہ ایک ساتھ (یعنی تقریباً ایک ہی زمانہ میں) حادث ہوتے رہیں، تو اس سے ہم نتیجہ نکال سکتے ہیں، کہ یہ مختلف مظاہرِ قدرت آپس میں کسی علّی رشتہ سے جکڑے ہوئے ہیں، یہ ہوسکتا ہے کہ ہم اس علّی رشتہ کو اس وقت یا اُس کے بعد بھی نہ پاسکیں، مثلاً فرض کیجئے، کہ چند دیہاتوں میں موسمی بخار کی وبا پھوٹ پڑی ہے، بہت سے لوگ بیمار ہوگئے ہیں ہم اس وبا کا سبب دریافت کرنا چاہتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں، کہ مریض مختلف حیثیتون کے، مختلف عادات واطوار کے مختلف عمروں کے اشخاص ہیں، جن کا کھانا بھی مختلف تھا، ان کی روزمرہ کی صحت کا معمول بھی مختلف تھا، اور ان کے دیہات بھی مختلف تھے، لیکن ایک بات میں سب یکساں نکلے، ان وبا زدہ دیہاتون میں غلیظ پانی کے جوہڑ موجود ہیں، اور وہان مچھروں کی بہتات ہے، یہ بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جہان ایسے جوہڑ زیادہ ہیں، وہان وبا کی شدت بھی زیادہ ہے، اور جہاں نسبتہً صفائی اچھی ہے، اور مچھر کم ہیں،

سو وہاں وبا کی شدت بھی کم ہے، اس سے ہم نتیجہ نکالیں گے، کہ غلیظ پانی کے جوہڑ اور مچھروں اور موسمی بخار کی وبا میں علت و معلول کا رشتہ ہے، یہ استدلال صحیح ہے، اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جب کبھی ہمیں حسیات حاصل ہوتی ہیں، (یعنی اپنے حواس کے ذریعہ سے ہمیں گرمی، سردی، ذائقہ وغیرہ محسوس ہوتا ہے) تو ان ذہنی یا نفسی حالتوں کے ساتھ ساتھ، ہمارے مغز اور عصبی نظام کے اندر عصبی تغیرات بھی ہوتے رہتے ہیں، اور کبھی ایسا نہیں ہوتا، کہ یہ حسیات موجود ہوں، اور عصبی تغیرات ان کے ساتھ واقع نہ ہوئے ہوں، اس سے ہم یہ نتیجہ نکالنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ عصبی تغیرات اور حسیات میں کوئی علی تعلق یا رشتہ موجود ہے، (یعنی ہر ذہنیہ کسی عصبیہ کے ساتھ ساتھ واقع ہوتا ہے) یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ تعلقِ علیت کس نوع کا ہے، ہم صرف یہ اعتراف کرتے ہیں، کہ تعلقِ علیت ہے ضرور موجود، اب اس استدلال سے جسم و نفس یعنی مغز و ذہن میں تفاعلیت کا تعلق ثابت ہوتا ہے، اس کے برعکس متوازیت اس تعلقِ علیت سے چشم پوشی کرتی ہے، اور ایک بین حقیقت کو بے وجہ نظرانداز کر دیتی ہے،

۱۰- متوازیت کے بعض متوالے یعنی متعصب ترین طبقہ کے مادیین[1] یہ کہہ دیتے ہیں، کہ ہاں ہم اس تعلق کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن ہم یہ کہتے ہیں، کہ یہاں جسم و نفس یعنی مغز و ذہن، دو مستقل اور مختار ہستیاں موجود نہیں ہیں، بلکہ معاملہ کی حقیقت یہ ہے کہ ہستی صرف ایک ہے، یعنی جسم و مادہ (اور مغز مادہ کی ایک صورت ہے) اور جس شے کو آپ روح یا نفس یا ذہن یا فکر کہتے ہیں، وہ دراصل اسی ایک واقعی ہستی کا پرتو ہے، اور اس کی حیثیت بالکل ایک غیر حقیقی سایہ

[1] انیسوی صدی عیسوی کے اخیر میں اس قسم کی مادیت کو جرمنی میں ہیگل (Haeckel) نے اور انگلستان میں ہکسلے نے نہایت پر زور طریقہ سے پیش کیا ہے، مثلاً ہکسلے کہتا ہے کہ جس طرح گردوں سے بول خارج ہوتا ہے یا آنکھی غدود سے آنسو جاری ہوتے ہیں، یا جگر سے صفرا پیدا ہوتا ہے، اسی طرح مغز سے خیالات پیدا ہوتے ہیں،

پرچھائیں کی سی ہے، مادیین کا یہ گروہ تعداد میں بہت کم ہے، لیکن ان میں ایک خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے مقدمات کو ان کے منطقی نتیجہ تک پہنچانے سے گریز نہیں کرتے، خواہ وہ نتیجہ دوسروں کو کتنا ہی لغو اور بے حقیقت نظر آئے، پچھلی صدی کے اخیر میں اس گروہ کی قیادت جرمنی میں ہیگل نے کی اور انگلستان میں اس نظریہ کو ہکسلے نے پیش کیا، لیکن آج کل جب خود مادہ ہی طبیعیات جدید کی بحث سے تصورِ قوت میں غائب ہو رہا ہے، کوئی مفکر اس شدت کی مادیت کی تبلیغ کی جسارت نہیں کرتا، مادیت کے اس سخت نظریہ کے مطابق ذہن و نفس کی حقیقت مستقل طور پر کچھ بھی نہیں، ذہن و نفس کی حقیقت بس ایسی ہے جیسی انسان کے سایہ کی، سایہ کی موجودگی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، لیکن کسی شے اور اسکے سایہ میں جو زمین و آسمان کا فرق ہے، وہ ظاہر ہے، جس طرح سایہ کا اثر اس شے پر کچھ بھی نہیں ہوتا، اسی طرح (ان مفکرین کے نزدیک) ذہن و نفس کا اثر بھی مغز و جسم پر کچھ بھی نہیں، جس طرح ایک لمحہ کے بعد سایہ کی جو کیفیت یا حرکت ہو رہی ہے، وہ خود سایہ کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ اس شے کی وجہ سے ہے، جس کا وہ سایہ ہے، اسی طرح نفس و ذہن و شعور کی حالتیں ایک دوسرے کے لئے کوئی علی حکم نہیں رکھتیں، بلکہ اپنے سلسلۂ علل کے لئے جسم و مغز کی حرکت و حالت کے تابع ہوتی ہیں، مادیت کی اس صورت کو ہم نظریۂ ضمنیتِ ذہنی[1] کہہ سکتے ہیں، اس کے خط و خال شکل نمبر ۳ سے ظاہر ہوتے ہیں ا ب ج د وغیرہ مغزی حالتیں ہیں، جو حقیقی ہیں، اور مستقل و مختارانہ حیثیت رکھتی ہیں، ان کا ایک دوسرے کے

شکل نمبر ۳

انسان

ذہنیہ	عصبیہ
ل	ا
م	ب
ن	ج
و	د
وغیرہ	

---

[1] Epiphenomenalism.

سا تھ علت و معلول کا رشتہ قائم ہے، ا سے ب پیدا ہوتا ہے، ب ج کی علت ہے، اور اسی طرح آگے
لیکن ذہنی حالتوں میں یہ رشتہ عمل موجود نہیں ہے، ل معلول ہے ا کا، ھ معلول ہے ب کا وعلیٰ ہذا
لیکن ل ھ ن و (یعنی ذہنی حالتوں) میں کوئی باہمی تعلق نہیں ہے، وہ سایہ کی طرح پیدا ہوتی
ہیں، اور سایہ کی طرح ہی گم ہو جاتی ہیں، ان کی حیثیت مستقل و مختارانہ نہیں ہے، بلکہ محض اضافی اور ثانوی ہے

نفسیاتِ جدید میں مادیت کی اس شکل کو آج کل نظریۂ کردارئیت کہتے ہیں، اس نظریہ کو اگر صحیح ان
لیا جائے، تو علمِ نفسیات کا نام بھی غلط ہو جائے گا، کیونکہ نفس تو کوئی واقعی ہستی ہے نہیں، جو علم نفسیات
کے نام سے مشہور ہے، اور نفس کی خیالی صورتوں کے مطالعہ میں اپنا وقت ضائع کر رہا ہے، اُسے صرف
انسان اور حیوان کے کردار کی نہایت باریک، دقیق اور جامع تحقیق کرنی چاہیئے، انسان اور حیوان
سے جو عمل سرزد ہوتا ہے وہ کسی محرک یا مہیج کی جوابی صورت کی حیثیت سے ہوتا ہے یعنی اگر محرک و مہیج
نہ ہو تو عمل بھی صادر نہ ہوگا، جب آپ کسی انسان یا کسی حیوان کا پورا اور دقیق مطالعہ کریں گے تو آپ اس
قابل ہو جائیں گے، کہ اس کے عمل کے متعلق کوئی صحیح پیشین گوئی کرسکیں، انسان وحیوان صرف زندہ مشینین
ہیں، آپ کسی مشین کی ساخت اور ماموریت کو اچھی طرح سے سمجھ لیجئے، پھر آپ مشین کے آیندہ عمل کے
متعلق صحیح حکم لگا سکیں گے، اسی طرح آپ انسانی اور حیوانی مشینوں کو اچھی طرح سے سمجھ لیجئے، اور ان کے
متعلق بھی صحیح صحیح پیشین گوئی کر لیجئے، باقی رہی وہ چیز جسے مفہوم یا معنی یا تفکر کہتے ہیں، سو وہ تو محض پرانی
نفسیات کا ایک ڈھکوسلا ہے، جو کچھ ہے صرف مشین ہے، مشین کے پُرزے ہیں اور پرزوں کی ماموریت
ہے، شعوری ذہنی نفسی حالتیں محض پرچھائین ہیں، جنکی حقیقت کچھ بھی نہیں،

یہ ہے مختصر سا خاکہ نظریۂ ضمنیت ذہن اور اس کی جدید شکل یعنی نظریہ کردارئیت کا، یہاں ان پر مفصل
جرح کی ضرورت نہیں ہے، البتہ چند اعتراضات کو ضرور ذہن نشین کر لینا چاہیئے،

ا Behaviourism

(۱) اوپر قانون علل (ہر حادثہ کی کوئی علت ہوتی ہے) کا مختصر ذکر ہو چکا ہے، اس قانون کی ایک شق یہ ہے کہ علت کی قوت معلول میں منتقل ہو جاتی ہے، یعنی علت و معلول ایک دوسرے سے مختلف ضرور ہوتے ہیں، لیکن دونوں نہایت مضبوط رشتے میں بندھے ہوتے ہیں، بلکہ یوں کہئے کہ دونوں ایک ہی قوت کی دو مختلف شکلین یا ایک ہی سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں، اگر قانون علل کی یہ ضمنی شق صحیح ہے (اور جدید سائنس اسے ایک اہم اصول تسلیم کرتی ہے) تو پھر اگر علت اپنے اندر واقعیت اور مستقل حیثیت رکھتی ہے، تو اس علت کا معلول بھی اُسی درجہ کی واقعیت اور مستقل حیثیت رکھے گا، اس سے لازم آیا، کہ اگر ایک مغزی حالت (مغزیہ یا عصبیہ) حقیقی ہے، اور مستقل حیثیت رکھتی ہے (جیسا کہ مادیت اور کرداریت کا دعوی ہے) تو ذہنی حالت یعنی ذہنیہ) جو اسی مغزیہ کا معلول کہی جائے گی وہ بھی اسی طرح حقیقی ہو گی، اور مستقل حیثیت رکھے گی، نتیجہ یہ نکلا کہ مادیت اور کرداریت خود سائنس ہی کے اصولوں سے غلط ثابت ہوئیں،

۲- منطقی لحاظ سے بھی مادیت کے یہ دونوں نظریے بالکل غلط ہیں، مشاہدہ بتاتا ہے کہ کسی ایک لمحہ میں میری جو حالت ہوتی ہے، وہ مرکب ہوتی ہے، اس کا ایک حصہ مغزیہ ہوتا ہے، اور دوسرا ذہنیہ اور یہ دونوں اکٹھے حادث ہوتے ہیں، اس کے بعد ایک اور مرکب حالت ظاہر ہوتی ہے، اور اس میں بھی مغزیہ اور ذہنیہ دونوں عنصر موجود ہوتے ہیں، یعنی ایک لمحہ پہلے مرکب حالت یہ تھی، (دیکھو شکل نمبر ۴) ا۔ل یعنی مغزیہ اور ذہنیہ اس کے بعد ب ھ (مغزیہ اور ذہنیہ) پھر ج ن (مغزیہ و ذہنیہ) غرض ہر لمحہ میں میری حالت مرکب ہوتی ہے، جو پہلے گذرتی ہے اُسے علت کہہ سکتے ہیں، جو بعد میں آتی ہے، وہ معلول بنتی ہے، اور جو اُس کے بعد آتی ہے، وہ اس دوسری حالت کی معلول کہلائے گی،

شکل نمبر ۴

انسان

ال
↓
ب ھ
↓
ج ن
↓
وغیرہ

جیسا کہ ب ه معلول ہے ل کا، اور علت ہے ج ن کی، ان مرکب حالتوں کا یہ تواتر شکل نمبر ۵ سے ظاہر ہوتا ہے،

اب مادیت (نظریۂ ضمنیت و کرداریت) یہ بے انصافی کرتی ہے کہ ہر مرکب حالت کو (خیالی طور پر) ذہنیہ اور مغزیہ ٹکڑوں میں تحلیل کر دیتی ہے، اور پھر بلا وجہ حکم لگا دیتی ہے، کہ ہر مغزیہ علت ہے اگلے مغزیہ حصہ کی، لیکن ذہنیہ حصے اپنے اپنے درجوں کے مغزیہ حصوں کے معلول ہیں، اور خود کسی ذہنیہ یا مغزیہ حصہ کی علت نہیں بن سکتے، مادیت کے اس غلط استدلال کے جواز کے لئے کوئی بودی سے بودی دلیل بھی موجود نہیں ہے، متوازیت البتہ ایک قدم پہلے ہی سہم کر ٹھہر جاتی ہے، اور کہہ دیتی ہے کہ مغزیہ حصوں میں الگ سلسلۂ علل قائم ہے، اور ذہنیہ حصوں میں الگ، دونوں سلسلے متوازی طریقے سے بڑھتے ہیں، لیکن ان میں باہمی لین دین بالکل نہیں ہے،

مادیت اور متوازیت دونوں سے منطقی ربط کی شکست اسلئے لازم آتی ہے، کہ وہ بلا وجہ دو مرکب حالتوں کو ان کے عنصروں میں تقسیم کر کے حکم لگا دیتے ہیں، کہ پہلی مرکب حالت کا فلان حصہ دوسری مرکب حالت کے فلان حصہ کی علت ہے، علمی دیانت انھیں صرف یہ کہنے کی اجازت دیتی ہے، کہ فلاں مرکب حالت، فلاں مرکب حالت کی علت ہے، اور ان دونوں مرکب حالتون میں مغزی اور ذہنی عناصر موجود ہیں، نظریۂ تفاعلیت اپنا استدلال اسی نقطۂ نظر پر قائم کرتا ہے،

۳- متوازیت کا استدلال تو خالص اور راشد مادیت سے بھی زیادہ بودا ہے، مادیت میں کم از کم یہ خوبی تو ہے، کہ اس کے غلط اصولوں سے غلط اور لغو نتائج بھی نکل سکتے ہیں، تو ان کے اخذ کرنے سے جھجکتی نہیں، اس کے برعکس متوازیت سہم کر ٹھہر جاتی ہے، اور ایسی جگہ ٹھہرتی ہے، جہاں اسکی کمزوری اور واضح ہو جاتی ہے، مثلاً جدید سائنس کے اصولوں کے مطابق مادی دنیا میں جو سلسلۂ علل قائم ہے، وہ سراسر میکانکی (مشینی) سمجھا جاتا ہے، یعنی یہ کہا جاتا ہے کہ حوادث یکے بعد دیگرے

ظاہر ہوتے ہیں، اور ان میں ارادہ، مقصد اور غایت کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا، یہ دعویٰ ہے میکانکی سائنس دانوں کا، عالمِ کائنات کو وہ ایک مشین مانتے ہیں، اور جس طرح مشین ارادہ، مقصد اور غایت سے محروم ہوتی ہے، اسی طرح یہ عالم بھی ان ذہنی و معنوی عناصر سے یکسر خالی ہے، مغز و جسم مادی ہیں، اس لئے سائنس کے اصولوں کے مطابق ان کی حالتوں میں جو سلسلۂ علل قائم ہے، وہ بھی میکانکی (مشینی) ہونا چاہئے، لیکن متوازیت خود تسلیم کرتی ہے کہ ان مغزی حالتوں کے سلسلہ کے بالکل متوازی ایک اور سلسلہ جاری ہے جس میں ارادہ، مقصد اور غایت روح رواں کا کام دیتے ہیں، یہ دونوں سلسلے ایک میکانکی اور دوسرا غایاتی ساتھ ساتھ اور متوازی جارہے ہیں، گویا انسان مرکب ہے دو گھوڑوں سے جن میں ایک میکانکی ہے، اور دوسرا غایاتی، اور دونوں بھلے مانسوں کی طرح ایک رفتار سے اس انسانی گاڑی کو کھینچے لئے جارہے ہیں، یہ استدلال کون صحیح مانے!

(۴) نظریۂ کرداریت کی حالت نہایت پرلطف ہے، اس کے مطابق، شعور، تفکر، مفہوم اور معنیٰ ایسے اسم ہیں، جن کا مسمّیٰ نہیں، جو کچھ ہے وہ صرف کردار ہے، جو میکانکی (مشینی) اصولوں کے مطابق جاری ہے، ارادہ، مقصد، غایت، اور مفہوم، بے حقیقت اوہام ہیں جن کا اس انسانی کرداری دنیا میں گذر نہیں، اس دعویٰ میں خرابی یہ ہے، کہ اگر یہ تصورات بالکل بے معنی ہیں اور معنی بالکل ایک غیر واقعی چیز ہے، تو کیا کرداریت کے مبلغ کے استدلال کو سمجھنے کی کوشش کرنا تضیع اوقات نہیں ہے؟ جہاں بولنے والا خود ہی کہہ دے، کہ میری دنیا میں معنی عنقا چیز ہے تو پھر اس کے الفاظ میں کوئی شخص معنی تلاش کرے، اور اس جنس نایاب کو نہ پائے، تو مقرر بیچارے کا اس میں کیا قصور؟

بات یہ ہے کہ سائنس داں جب تک امورِ واقعہ کے بیان و تشریح اور ان کے قوانین کی تحقیق و جستجو میں مصروف ہوتا ہے، اس کا ایک ایک لفظ نہایت غور و خوض سے پڑھنے کے لائق ہوتا ہے،

لیکن جب وہ اپنا خالص ذہنی اور علمی میدان چھوڑ کر متفکر کی حیثیت سے نظریہ گڑھنا شروع کرتا ہے، تو ان نظریوں کو صرف اسلئے مان نہ لینا چاہئے کہ فلان سائنس دان نے انھیں اختراع کیا ہے، بلکہ پورے شد و مد سے اُن پر جرح کرنی چاہئے، سائنسدان بھی انسان ہی، جب انسان کسی دلپسند نظریہ کو صحیح ثابت کرنے کی ٹھان لیتا ہے، تو استدلال کے جوشِ جنون میں وہ ایسی باتیں کہہ گذرتا ہے جن کی تائید کے لئے اس کے پاس کوئی سامان نہیں ہوتا، کرداریت اسی قماش کی ایک چیز ہے،

اب ہمیں مادیت کی اس ضمنی بحث کو چھوڑ کر اصل موضوع کی طرف لوٹنا چاہئے، کہ جسم و ذہن کا تعلق واقعی ہے، یا نہیں، اور اگر ہے، تو اسکی واقعیت اور نوعیت کے متعلق کیا کچھ کہا جاسکتا ہے، تفاعلیت اور متوازیت کا مناظرہ اسی مضمون سے متعلق تھا،

(۱۱) ایک شخص کوئی بات کہتا ہے مخاطب اس بات کو سمجھ لیتا ہے یہ سمجھنا کیا ہوتا ہے، اس سے مراد یہ ہوتی ہی کہ جو خیالات بولنے والے کے دل میں تھے، وہی یا اُس جیسے خیالات سننے والے کے دل میں پیدا ہو گئے ہیں، یعنی ایک کا مافی الضمیر دوسرے کا مافی الضمیر بن جاتا ہے، زبان اسی مقصد کے لئے بنی ہے، کہ جو کچھ میرے دل میں ہے وہی آپ کے دل میں اتار سکوں، ہر لفظ کا کچھ مطلب معنی یا مفہوم ہوتا ہے، بولنے والا ایسے الفاظ چنتا ہے، جو اس کے دلی خیالات کو سمیٹ لیں، اور ان کی لفظی تصویر بنا دیں، جب مخاطب ان الفاظ کو سنتا ہے، تو وہ کہنے والے کے مفہوم کو سمجھ لیتا ہی، اگر انسان کی زندگی اور اس کے تمدن و تہذیب کی لمبی داستان کے بیان کے لئے ایک کلیدی لفظ ڈھونڈا جائے تو معنی سے بہتر لفظ شاید ہی مل سکے، مختلف زبانیں، کتبے، عمارتیں، آمد و رفت کے ذریعے اختراعات وایجادات کیا ہیں، سب کسی نہ کسی شکل میں کسی نہ کسی شخص کے دل کے مفہوم و معنی کے اظہار و تشہیر کے ذریعے ہیں، جس نے معنی کے تصور کو نہ سمجھا، وہ انسانیت کو نہ سمجھا،

اب سوال یہ ہو کہ جب میرے ذہن میں کسی لفظ یا تصور یا فقرے کا مفہوم یا اس کے معنی موجود

ہوتے ہیں، تو میرے مغز میں اُس ذہنی حالت کے متوازی کونسا مغزیہ کام کرتا ہے، اور کس طرح کام کرتا ہے؟ مثلاً میں کچھ دیکھتا ہوں تو ماہر عضویات فوراً کہہ دیتا ہے، کہ مغز کے پچھلے حصہ کے فلاں فلاں ذرّے میں فلاں قسم کی حرکات ہو رہی ہیں، جب میں سنتا ہوں یا بولتا ہوں، یا کوئی ذائقہ محسوس کرتا ہوں تو وہی عضوی ماہر مجھے ٹھیک بتا دیتا ہے، کہ فلاں فلاں مغزی حصوں میں یہ یہ تغیرات اور حرکات ہو رہی ہیں، لیکن جب میں بات کرتا ہوں، اور عضوی ماہر کہتا ہے کہ فلاں مغزی حصہ جو الفاظ کے لئے مخصوص ہے، مصروفِ کار ہے، تو وہ مجھے یہ نہیں بتاتا، کہ الفاظ کا مفہوم جو میرے ذہن میں ہے وہ مغز کے کس حصہ کی اور کیسی حرکات کے ذریعہ سے ظاہر ہو رہا ہے، محسوسات (دیکھنا سننا سونگھنا وغیرہ) بھی نفسی حالتیں (یعنی ذہنیہ) ہیں، ان کی متوازی مغزی حالتوں (مغزیہ) کو ماہر عضویات فوراً بتا دیتا ہے لیکن جب ہم محسوسات سے اوپر کی ذہنی دنیا کی طرف جاتے ہیں، اور ان پیچیدہ اور اہم ترین ذہنی حالتوں کی متوازی مغزی حالتوں کے متعلق دریافت کرتے ہیں، تو عضوی ماہر خاموش ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ متوازیت کا حامی بھی جو ہر ذہنیہ کے لئے کسی مغزیہ کی موجودگی لازم سمجھتا ہے، چپ ہے،

مغز میں ان گنت مادی لیکن ذی حیات ذرات موجود ہیں، اب کیا ہر مغزی ذرہ کے متوازی کوئی خاص ذہنی ذراتی حالت بھی ہوتی ہے، ؟ اگر ہوتی ہے تو کیسے، ؟ پھر یہ مختلف ذہنی ذراتی حالتیں کیونکر مل کر مرکب ذہنی حالت کی شکل پاتی ہیں، ؟ ان سوالوں کا جواب بھی متوازیت کے پاس نہیں ہے،

یہ دو اعتراضات کہ معنی کی مغزی صورت کیا ہے؟ اور ہر مغزی ذرّے کی متوازیت ذہنی حالت ہوتی ہے، یا نہیں، اگر ہوتی ہے تو کیسے، اور اگر نہیں ہوتی، تو متوازیت کہاں گئی، ؟ ایسے شدید ہیں کہ ان سے نہ صرف متوازیت کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے، بلکہ مادیت کی لاف زنی، اور مغز کے

بہت بڑے حصہ کے متعلق موجودہ سائنس کی لاعلمی بھی ظاہر ہو جاتی ہے، اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ تفاعلیت کے پاس ان مشکلات کا حل موجود ہے، ہرگز نہیں، فرق صرف یہ ہے کہ تفاعلیت ان امور کے متعلق اپنی لاعلمی کا اقرار کرتی ہے، لیکن چونکہ وہ ذہن و مغز میں تفاعل و تعامل کی قائل ہے، اسلئے مغز کے طریق کار کے متعلق جو انکشافات بھی ظہور پذیر ہوں گے، وہ اس نظریہ کو تقویت ہی دیں گے، اس کی تنقیص نہ کریں گے، اس کے برعکس (جیسا کہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں) متوازیت کے ضمنی اور منطقی نتائج اس قدر ناقابلِ حل و فہم ہیں، کہ ان سے خود متوازیت کا رد لازم آتا ہے،

(۳) تفاعلیت کا یہ امتیاز ایک اور طرح سے بھی ظاہر ہوتا ہے، مغز و ذہن کے تعلق کی بحث میں نفسی مختلف مذاہب میں بٹے ہوئے ہیں، لیکن جب وہ اس بحث کو چھوڑ کر حسیات اور ان کے محرکات جذبات اور ان کے نہیج افعال، اور ان کے محرکات، اور ذہنیہ اور عصبیہ (مغزیہ) کا باہمی تعلق بیان کرتے ہیں، تو جو الفاظ، اور جو زبان بلاتکلف ان کی تصانیف میں استعمال ہوتی ہے، وہ تفاعلیت کی زبان ہے، مثلاً ہاتھ میں سوئی چبھی، اور درد محسوس ہوا کیوں؟ سوئی ہاتھ میں چبھی، اعصابی تار کا سرا (جو ہاتھ کی جلد میں ہے) متاثر ہوا، ایک اعصابی رو (جو بجلی کی طرح کی ہوتی ہے) حرام مغز میں سے ہوتی ہوئی مغز کے ایک خاص حصہ میں داخل ہوئی، وہاں اس رو کے پہونچنے پر چند خلیے[1] بموں کی طرح پھٹے، اور وہیں درد (یعنی سوئی کے چبھنے کا نتیجہ) محسوس ہوا، اور یہ سب عمل آن کی آن میں ہو گیا، اب ترتیب دیکھئے ان عملوں کی، پہلے محرک (سوئی کا چبھنا) پھر اعصابی (مغزی) عمل اور پھر ذہنی حالت یہ تفاعلیت کی زبان ہے، متوازیت کی زبان نہیں، دوسری مثال لیجئے، میں چاہتا ہوں کہ اپنے ہاتھ سے قلم گرا دوں، اس کے بعد گرا دیتا ہوں، یعنی پہلے ایک ذہنیہ حالت تھی اس کے بعد ایک جسمیہ (مغزیہ) حالت ظاہر ہوئی یہاں بھی الفاظ ذہن و مغز میں تفاعل

[1] Cells.

ظاہر کرتے ہیں، ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے، کہ تعاملی نقطۂ نظر ایسے بیانات میں لابدی ہے، متوازیت کی زبان میں روزمرہ کے حالات کا بیان قریباً ناممکن ہے،

۱۲۔ متوازیت کا زور تمامتر اس بات پر صرف ہوتا ہے کہ حیوان اور انسان میں ذہنیہ اور مغزیہ سلسلے ایک دوسرے سے بالکل الگ ہوجاتے ہیں، اوپر ذکر ہوچکا کہ سائنسداں جسمی یا عصبی (مغزی) سلسلہ کو میکانکی (مشینی) سمجھتے ہیں، لیکن ذہنی سلسلہ میکانکی نہیں ہے، کیونکہ اس میں قدم قدم پر مقصد، ارادہ اور غایت کام کر رہے ہیں، اب یہ دو مختلف سلسلے یعنی ایک میکانکی، اور دوسرا غایاتی، ہرگز ہم آہنگ نہیں ہوسکتے، اور نہ ان میں ہر لمحہ متوازیت ہی قائم رہ سکتی ہے، ایک کہہ رہا ہے کہ وہ حوادث زمانہ اور مظاہر قدرت محض طبعی حرکت کا نتیجہ ہیں، دوسرا کہتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کسی غایت یا مقصد سے ہورہا ہے، اور کسی نہ کسی کا ارادہ اس طبعی حرکت کا محرک ہے، ایسے دو سلسلوں کا (اگر دونوں کو بالکل صحیح مان بھی لیا جائے) ایک ہی ہستی کے اندر متوازی جاری رہنا کیونکر تسلیم کیا جاسکتا ہے، (اٹھارہویں صدی کے مشہور جرمن مفکر لائبنٹز نے اس متوازیت کا حل یوں کیا تھا، کہ خدا نے ازل سے مادہ اور روح، یعنی میکانکی اور غایاتی سلسلوں کو دو گھڑیوں کی طرح ہم آہنگ کر دیا ہے اور اس ازلی چابی کی وجہ سے وہ متوازی جا رہے ہیں، حالانکہ ان کے طریقے مختلف، زبان مختلف اور چال مختلف ہے، مشکل کا یہ حل سائنسدان کے لئے کوئی آسانی پیدا نہیں کرتا، سائنس داں حوادث کو دیکھتا ہے، اور سائنس حادث معلولوں کی حادث علتوں سے توجیہ کرتی ہے، مانا کہ خدا نے ازل سے ان دو سلسلوں کو ہم آہنگ کر دیا، لیکن کیسے؟ جب تک اس کیسے کی مفصل توضیح نہیں ہوتی مشکل کا حل نہیں ہوتا،

کیا اس سے یہ بہتر نہیں ہے، کہ ان دو سلسلوں کی نوعیت اور حقیقت کی بحث کو چھوڑ دیا جائے اور صرف ان کے باہمی تعامل اور تفاعل کو بیان کیا جائے، جو امر واقعہ ہے، اور جس کا ہر شخص کو مشاہدہ ہے؟

لائبنٹز نے ۔۔۔

تفاعلیت بھی چاہتی ہے، اور یہ طریق کار نہ صرف صحیح علمی مواد کے جمع میں بیحد مفید ہوگا، بلکہ علمی دیانت کا تقاضا بھی یہی ہے، کہ اس منزل کو پہلے طے کیا جائے، پھر مابعد الطبیعیاتی نظریوں میں الجھا جائے، اگر میکانیت اور غائیت کی مابعد الطبیعیاتی بحث میں الجھنا ہی ہے، تو پھر کیوں نہ ہم اُس نظریہ کو زیادہ اہم سمجھ کر قبول کریں، جو ان دو میں سے زیادہ جامع ہے،؟ مثلاً بعض مفکروں کی رائے یہ ہے، کہ غائیت سے میکانیت کی توجیہ ہو سکتی ہے لیکن میکانیت سے غائیت کی عقدہ کشائی نہیں ہوتی، اسلئے غائیت (اور تفاعلیت یہاں ہم آہنگ ہے) کا قبول علمی و منطقی لحاظ سے زیادہ صحیح ہے،

۱۳- تفاعلیت اصولاً سائنس کے کسی بنیادی قانون یا ادعیہ کی خلاف ورزی نہیں کرتی، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مشاہدہ کی حد سے آگے نہیں بڑھتی، اور نہ متوازیت کی طرح وہ کوئی ایسا نظریہ ہی اختراع کرتی، یا ایسا دعویٰ کرتی ہے، جس کے حق میں نہ مشاہدہ پیش کیا جا سکتا ہے، اور نہ کوئی صحیح دلیل، اس لئے طریق کار کی حیثیت سے تفاعلیت اپنے اندر ایسی وسعت رکھتی ہے، کہ بالکل مختلف الخیال مفکر بھی اس کے دائرے کے اندر رہ کر اپنی تحقیق جاری رکھ سکتے ہیں،

اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں، کہ متوازیت نفسی و عضوی محققین کے درمیان تقسیم کار کی غرض سے شروع ہوئی، مثلاً انسان ایک نہایت پیچیدہ ہستی ہے، نفسی کہتا ہے کہ میں اپنا وقت ذہنی حالات کی تحقیق میں صرف کروں گا، عضوی کہتا ہے کہ میں اسی انسان کی بدنی اور عصبی حیثیت کی تحقیق کرونگا یہ تقسیم کار محض ایک منہاجی تدبیر کی حیثیت سے ہے، اس سے انسان کے جسم اور ذہن میں ایسا فرق مقصود نہ تھا، کہ دونوں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے الگ الگ تسلیم کر لئے جائیں، متوازیت کی بنیادی غلطی یہی ہے کہ اس نے ایک عارضی اور منہاجی تقسیم کار کو ابدی اور قطعی اہمیت دیدی ہے، ورنہ نظر انصاف سے اگر دیکھا جائے تو شاید ذہن کی ہر حالت جسم و مغز کی کسی حالت سے وابستہ ہوتی ہے، اور جسم کی اکثر حالتیں (اور کوئی تعجب نہیں، کہ شروع میں جسم کی تمام حالتیں) کسی نہ کسی نفسی یا ذہنی حالت سے وابستہ ہوتی

یں نفسی اپنی سہولت کے لئے بعض اوقات جسمی یا مغزی حالتوں کو نظر انداز کر دیتا ہے، اسی طرح عضویاتی
اپنی سہولت کے لئے بعض اوقات یا اکثر اوقات ذہنی یا نفسی حالتون کو نظر انداز کر دیتا ہے، لیکن اس
نظر اندازی سے ان حالتون کی عدم موافقیت لازم نہیں آتی، مثلاً اگر کوئی شخص رنگوں کی تحقیق میں مصروف ہے
تو وہ ان کے اقسام، ان کے باہمی تعلقات اور ان کی نوعیت و حقیقت پر اپنا وقت صرف کرتا ہے
وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ جو رنگ بھی دنیا میں موجود ہے، وہ کسی سطح یا جگہ یا شے مین ہے
مثلاً کسی کپڑے یا پتے، پھول یا جانور یا کاغذ یا ہوا یا پانی یا کسی اور چیز میں ہے، رنگ کا وجود بغیر سطح
و جگہ و شے کے ممکن نہیں، لیکن اس محقق نے اپنے لئے جو کام مخصوص کر لیا ہے، وہ صرف رنگ ہے، رنگ
کے مقام سے اُسے کوئی غرض نہیں، لیکن اس کا وہ انکاری بھی نہیں، البتہ اُسے صرف اس مقام سے
دلچسپی نہیں ہے، یہی حالت جسم و نفس، یا مغز و ذہن کے تضاد کی ہے، یہ تضاد صرف علمی تحقیق و تجسس کی
سہولت کی غرض سے قائم رکھا گیا ہے، ورنہ علمی حیثیت سے کوئی اس حقیقت کا انکار نہیں سکتا، کہ
ایک ہی ہستی میں یہ دو حالتیں بیک وقت موجود ہیں،

متوازیت کے نظریہ کو اگر صحیح مان لیا جائے، تو نفسی حیثیت سے ہمارے لئے ناممکن ہو جائے گا
کہ انسانی عزم و ارادہ، انسانی خود اختیاری اور قوتِ تمیز و انتخاب کی صحیح توجیہ کر سکیں ہیں ان نفسی
حالتوں کا انکار کرنا پڑے گا، اور بعض مادیین نے (مثلاً کرداریت والون نے) سچ مچ انکار کر دیا ہے
انہی نفسی حالتوں پر اخلاقیات اور تمام مدنی علوم کا انحصار ہے، ظاہر ہے کہ جو شخص انسان کو ارادہ
اور تمیز سے محروم سمجھتا ہے، وہ اُسے کسی اخلاقی کمزوری یا برتری کا ذمہ دار یا حامل بھی نہیں سمجھ سکتا، علیت
اس الزام سے بری ہے، وہ انسان کی ہر حالت کو امر واقعہ سمجھ کر لیتی ہے، اور چونکہ ہم میں سے ہر ایک
کا ذاتی مشاہدہ اور تجربہ گواہی دیتا ہے، کہ ہم مختلف راستوں میں سے کسی ایک کو اختیار کر سکتے ہیں، مختلف
چیزوں میں اپنی ضروریات اور خواہشات کے مطابق انتخاب کر سکتے ہیں، اور بدی اور نیکی کرتے وقت اپنے

آپ کو ذمہ دار محسوس کرتے ہیں، اس لئے اس نظریہ کے مطابق احساس ذمہ داری اور اخلاقیات اور علوم مدنی، دونوں کی صحیح توجیہ ہوتی ہے اور معقولیت ثابت ہوتی ہے (۱۴) اس بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ،

(۱) انسان ایک مختلف الحیثیات اور مرکب ہستی ہے، جس میں جسمیت بھی ہے اور نفسیت بھی (حیوان میں بھی یہ دونوں حیثیتیں پائی جاتی ہیں، اگرچہ ادنیٰ درجہ پر)

(۲) یہ امر واقعہ ہے، کہ ان دو اہم حیثیتوں میں (جو خود بھی نہایت پیچیدہ ہیں) باہمی تعامل جاری ہے،

(۳) ان دو اہم حیثیتوں کی دو خاص صورتوں یعنی ذہن و مغز میں نہایت گہرا اور پیچیدہ تعلق ہے اور مشاہدہ بتاتا ہے کہ ایک کا دوسرے پر اثر ہوتا ہے، نظریہ تفاعلیت اس باہمی تعامل کو امر واقعہ مان کر ثابت کرتا ہے کہ اس اقرار سے کسی معلوم قانونِ قدرت کا (جو طبعی دنیا میں محقق ہو) تناقض لازم نہیں آتا،

(۴) اس کے برعکس نظریہ متوازیت ذہن و مغز کے اس باہمی تعامل کو امر واقعہ نہیں بلکہ محض ایک غلطی یا غلط فہمی تصور کرتا ہے، اس نظریہ کا دعویٰ ہے کہ ذہنی اور مغزی حالتیں الگ الگ سلسلوں میں متوازی حیثیت سے جاری ہیں، لیکن ہم دیکھ چکے ہیں، کہ یہ نظریہ ہر لحاظ سے ناقص ہے، اس سے معلوم اور محقق قوانین قدرت کی تنقیض بھی لازم آتی ہے، اور کوئی خاص فائدہ بھی اس سے حاصل نہیں ہوتا،

(۵) یہ بھی اوپر گذر چکا ہے کہ حیاتیات، نفسیات، اخلاقیات اور جملہ مدنی علوم ترقی نہیں کر سکتے، اگر ہم متوازیت کے نظریہ کو صحیح مان لیں، ان علوم کے لئے تفاعلیت کا نقطۂ نظر بہترین ہے،

۱۵۔ کیا تفاعلیت سے بہتر نظریہ ممکن نہیں؟

فصل نمبر ۱ میں ہم نے دو سوال سامنے رکھے تھے جسم و نفس سے مراد کیا ہے، اور ان کا باہمی تعلق کیسا ہے؟ متذکرۂ بالا بحث تمام تر انہی دونوں سوالات سے متعلق تھی، یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ان دو سوالات کا آخری، قطعی اور ناقابلِ تغیر جواب ابھی ممکن نہیں، فصل نمبر ۲ میں بتایا گیا تھا، کہ انسان مرکب ہے چار قسم کے عملوں سے یعنی کیمیادی، حیاتی، نفسی، شعوری، اور روحانی، ان میں سے پہلے تین عملوں کو ہم نے قابلِ بیان سمجھا تھا، اور

جہ سے کہ ان کا ہر شخص مشاہدہ کر سکتا ہے) اور پچھلے تین عملوں کو داخلی یا ذہنی، یہ داخلی عمل بلا واسطہ اور مستقیم
اور صرف اُس شخص کے مشاہدہ میں آسکتے ہیں، جس کے (ذہن کے) وہ عمل ہوں، دوسرے اشخاص کیلئے
ان کا ادراک محض بالواسطہ ہوگا، خارجی عملوں سے انسان کا جسم بنتا ہے، اور داخلی سے اس کا ذہن یا نفس، جسم
ذہن کا باہمی تعلق کیا ہے؟ اس سوال سے مراد صرف یہ ہونا چاہئے، کہ ان داخلی اور خارجی عملوں کا باہمی
تعلق کیا ہے، یہ ہم نے دیکھ لیا ہے، کہ ان داخلی اور خارجی عملوں میں واقعی اور اہم تعلق ہے، لیکن اس
سوال کا جواب ابھی ہمارے پاس موجود نہیں ہے کہ یہ تعلق کس نوعیت کا ہے، اور کیسے جاری رہتا ہے، جدید
سائنس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جسے مادہ کہتے ہیں وہ محض قوت ہے، اور قوت کہتے ہیں کام کرنے کی قابلیت کو،
مادہ بحیثیت ایک جامد اٹل اور غیر متغیر چیز کے جو نفس اور ذہن کا نقیض سمجھی جاتی تھی، غیر حقیقی ہے، ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ مادہ کی جامد حالت اس کی ابتدائی حالت نہیں، بلکہ آخری حالت ہے، جسم زندہ ہے اور
ذی حیات ہونے کی حیثیت سے اس میں ایسے عمل ہوتے ہیں، جو اس کے مردہ ہو جانے کی حالت میں (جبکہ
وہ مادہ کی نسبتہً جامد حالت میں بدل جائے گا) ممکن نہیں، یہ حیات کیا چیز ہے جس کی وجہ سے مادہ جسم بنجاتا ہے
اور جس کی غیر موجودگی سے جسم مادہ بن جاتا ہے، اور جس کی بعض حالتوں میں نفس و ذہن و شعور و ذہنیت
پیدا ہو جاتی ہے، اس سوال کا جواب ابھی سائنس کے پاس موجود نہیں ہے، یہاں صرف ایک بات
کو ذہن نشین کر لینا چاہئے، کہ ہم میں سے کسی نے بھی اپنے نفس کو جسم کے بغیر نہیں دیکھا، اور اپنے جسم
کو نفس کے بغیر نہیں دیکھا، ہم کیا ہیں؟ شخصیت اور شخصیت کو ہم محض سہولتِ مطالعہ کے لئے نفس اور
جسم کی مبہم اور پیچیدہ حیثیتوں میں تحلیل کر دیتے ہیں،

معارف، علم نفس اور علم حیات کی ترقیاں جس حد تک بھی پہونچیں، جو کچھ جواب دے سکی ہیں وہ کیسے (کیف) کا ہے کیوں
(لِم) کا نہیں اور اس راز پر جو پردہ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (کہدو کہ روح میرے پروردگار
کے حکم سے ہے اور انسانو! تم کو علم نہیں بخشا گیا مگر تھوڑا) کا پڑا ہے وہ اب تک نہ اٹھا اور نہ اٹھنے کی امید ہے،

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن (علیگ)، رفیق دارالمصنفین

(۵)

گجرات کی بغاوتیں گجرات کی بغاوتوں کا حال عصامی نے بہت ہی تفصیل سے لکھا ہے، اس کا بیان ہے کہ قتلغ خان کی معزولی کے دو برس بعد گجرات میں جو رنبال، قاضی جلال، جلال ابن لالہ اور جھلو افغان شاہی افسر مقبل کے ظلم وستم سے عاجز ہو کر بردوہ میں جمع ہوئے، اور اس سے انتقام لینے کی قسم کھائی، مقبل کو خبر ملی تو ان کی طرف فوج لیکر بڑھا مگر کچھ؟ میں وہ مخالف فوج سے رزم آرا ہوا، مگر شکست کھا کر پٹن کے قلعہ میں پناہ لی، مذکورۂ بالا چاروں گجراتی امرا فاتح و کامران ہو کر کھنبائت پہنچے، اور وہاں کے شحنہ طغی کو اپنا مطیع بنایا، لیکن وہ ان سے برگشتہ ہو کر مقبل سے پٹن میں جا ملا، مگر گجراتی امراء کے ایک ساتھی مبارک نے اس قلعہ کو بھی فتح کر لیا، دو مہینہ کے بعد دبار کا حاکم عزیز خمار مالوہ سے لشکر لیکر ان کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوا، مقبل نے بھی اس کا ساتھ دیا، گجراتیوں کے پاس صرف سات سو سوار، اور شاہی فوج میں چھ ہزار سوار تھے، جنگ شروع ہوئی، عصامی نے لڑائی کی تفصیل حسب معمول پورے رزمیہ انداز میں لکھی ہے، شاہی فوج پسپا ہو کر بھاگی، عزیز خمار زندہ گرفتار ہوا، اور مارا گیا، دوسرے روز یہ فوج (جس کو عصامی لشکر بردہ کہتا ہے) کھنبایت میں داخل ہوئی، لیکن وہاں کے باشندوں نے ان کی اطاعت کرنا پسند نہیں کیا، لشکر بردہ ان کی سرکوبی

میں مشغول تھا، کہ طغی ان کی مدد کو آگیا، پھر دونوں طرف سے تین چار مہینے تک کشت و خون جاری رہا

برنی کی تفصیلات عصامی سے کچھ مختلف ہیں، اس نے ان بغاوتوں کو گجرات کی ایک غیر ملکی

جماعت امیر صدگان کی طرف منسوب کیا ہے، یہ امیر شاید سو سواروں کے عہدہ دار ہوتے تھے، جو

ضلع یا پرگنہ کا انتظام کیا کرتے تھے، یہ اصطلاح یحییٰ، فرشتہ، نظام الدین اور بدایونی بکثرت استعمال

کرتے ہیں، لیکن ابن بطوطہ اور عصامی نے اس کو کہیں استعمال نہیں کیا ہے، برنی یحییٰ اور فرشتہ وغیرہ

قاضی جلال اور جور نبال وغیرہ کے نام نہیں لیتے ہیں، البتہ سفرنامہ ابن بطوطہ میں قاضی جلال اور جلول

(شاید جھلو مراد ہو) کے نام مذکور ہیں،

بغاوت کے اسباب کے سلسلہ میں برنی نے لکھا ہے، کہ سلطان محمد تغلق کو خبر ملی، کہ قتلغ

خاں کے کارکن شاہی آمدنی میں زیادہ تر غبن کر لیتے ہیں، تو اس نے دکن کو چار شقوں (اضلاع) میں

تقسیم کیا اور ہر شق ایک امیر کی نگرانی میں دیا، ایک شق میں ملک سرو انداز، دوسرے میں

مخلص الملک، تیسرے میں یوسف بغرا، چوتھے میں عزیز خمار کو مامور کیا، اور عماد الملک کو دیوگیر کا

وزیر بنایا، ان میں سے ہر ایک کو ہدایت کی، کہ امیر صدگان کی ہر ممکن صورت سے سرکوبی کی جائے،

کیونکہ اس کا خیال تھا، کہ فتنہ و فساد ان ہی کی وجہ سے ہوتا ہے، اس کے بعد قتلغ خان کو

دہلی بلا لیا، اور عزیز خمار کو مالوہ کا حاکم بنا کر دھار بھیجا، دیوگیر میں قتلغ خاں کا بھائی نظام الدین جانشین

ہوا، عزیز خمار دھار پہونچا، تو اس نے امیر صدگان کو ایک روز دعوت دی اور ان میں اسی امراء کو

اپنے محل کے سامنے قتل کرا دیا، یہ واقعہ ایسا نہ تھا، کہ اس جماعت کے لوگ خاموش رہتے، اسی کے

بعد گجرات کا نائب وزیر ملک مقبل اپنے صوبہ کا خزانہ لیکر دہلی چلا، بڑودہ اور دبھوئی (صحیح لفظ ڈبھوئی

ہے جو اب تک بڑودہ سے اٹھارہ میل جنوب میں واقع ہے) کے بیچ میں اس نواح کے امیران

صدہ نے مقبل پر حملہ کیا، اور اس کا تمام مال و اسباب لوٹ لیا، ملک مقبل نہروالہ واپس ہوگیا، امیران صدہ

میں بغاوت کی آگ ہر جگہ پھیل گئی، اور وہ اکٹھا ہو کر کنبھائت کی طرف بڑھے،

عصامی اور برنی کی کے مذکورۂ بالا بیانات میں اختلاف ہے، عصامی کے یہاں ملک مقبل کی تصویر زیادہ نمایاں ہے، اس کا بیان ہے کہ ملک مقبل گجراتی امرا پر خود حملہ آور ہوا، وہ امیر صدگان کی جماعت کے امرا کے قتل کا بھی ذکر نہیں کرتا ہے، عزیز خمار اور امیر صدگان کی جنگ کا حال برنی نے صرف دو تین سطروں میں لکھ کر ختم کر دیا ہے، مگر عصامی نے پوری تفصیل سے بیان کیا ہے،

برنی رقمطراز ہے کہ سلطان محمد کو ان بغاوتوں کی خبر ملی، تو انتہائی غیظ و غضب میں دار الخلافت سے دکن روانہ ہوا، روانگی کے قبل گجرات کی نیابت شیخ علاؤ الدین اجودھنی کے لڑکے شیخ معز الدین کے سپرد کی، اور تین لاکھ تنکہ دیکر دو تین دن کے اندر ایک ہزار سوار مرتب کرنے کا حکم دیا، وہ کوچ کر کے سلطان پور پہونچا، جو دہلی سے پندرہ کوس پر واقع تھا، یہاں اس کو عزیز خمار کے پسپا ہونے اور مارے جانے کی خبر ملی، عصامی کا بیان ہے کہ سلطان محمد دہلی سے روانہ ہوا، تو اس کے مظالم سے فوج پریشان تھی، اور فاقہ مست ہو رہی تھی، اس لئے تیزی سے کوچ نہ کر سکی، آخر اس نے ناگور پہونچکر اعظم ملک کو بھروچ کی طرف روانہ کیا، اعظم ملک نے بھروچ کے قلعہ پر قبضہ کر لیا، تو باغیوں کی فوج نے قلعہ پر یلغار کیا، گو ان کے پاس کل سات سو سوار تھے، مگر جنگ شدت کی ہوئی، آخر شاہی فوج نے قلعہ سے باہر نکل کر لڑنا شروع کیا، باغیوں کا سردار جھلو مارا گیا، اور

اور چو رنبال اور قاضی جلال فرار ہو کر ایک ہند و راجہ مانڈیو کے یہاں پناہ گزین ہوئے، مگر وہ عہد ثابت نہ ہوا، بلکہ ان کے مال و اسباب کو لوٹ کر سلطان محمد کے حوالہ کر دینا چاہا،

برنی کی تفصیل میں تھوڑا سا فرق ہے، وہ لکھتا ہے کہ سلطان محمد سلطان پور سے کوچ کر کے نہر والہ کے پاس پہونچا، شیخ معز الدین کو نہر والہ بھیجکر خود ابو پہاڑی کی طرف بڑھا جہاں سے بڑودہ اور ڈبھوی نزدیک تھے، یہاں سے باغیوں کی سرکوبی کے لئے فوج بھیجی، باغی مقابلہ کی تاب

نرلا سکے اور شکست کھاکر دیوگیر کی طرف بھاگے، بادشاہ ابھو سے بہروچ آیا، اور مفرورین کے تعاقب میں نائب وزیر ممالک ملک مقبول کو دہلی کی فوج اور بہروچ کے امیران صدہ کے ساتھ بھیجا، ملک مقبول نربدا تک تعاقب کرتا ہوا گیا اور باغیوں کی پوری سرکوبی کی، ان کے بعض ممتاز امرا، (نام نہیں درج ہیں) سالیر اور مالیر کے حاکم مانڈیو (فرشتہ بگلانہ کا حاکم لکھتا ہے) کے یہاں جاکر پناہ گزیں ہوئے، ملک مقبول کچھ دنوں نربدا کے ساحل پر مقیم رہا، اور شاہی فرمان کے بموجب اپنے بہروچ کے ہمراہی امیرانِ صدہ کو تہ تیغ کر دیا جو قتل سے محفوظ رہے وہ دیوگیر بھاگ گئے،

اس کے بعد برنی کا بیان ہے کہ سلطان بہروچ میں مقیم رہا، بہروچ اور گجرات کی مالگذاری وصول کی، باغیوں کو اچھی طرح سزا دی، اور زین بندہ اور رکن تھانیسری کے منجھلے لڑکے کو دیوگیر کی بغاوت کے اسباب کی تفتیش کے لئے مقرر کیا، مگر یہ دونوں اپنی فتنہ پردازی اور شر انگیزی کے لئے مشہور تھے، اس لئے عام طور سے ان کی اس خدمت پر نفرت کا اظہار کیا گیا، اسی اثنا میں سلطان نے قتلغ خان کے بھائی نظام الدین کے پاس دو امیر (نام مذکور نہیں) بھیجکر فرمایش کی کہ بندہ و سو سوار اور ممتاز امیرانِ صدہ اس کے پاس بھیجے جائیں، نظام الدین نے حکم کی تعمیل کی، مگر یہ دونوں امیر سوار اور امرا کو لئے جا رہے تھے، کہ راستے میں امیرانِ صدہ نے بغاوت کی، اور دونوں کو قتل کر دیا اور دولت آباد واپس آکر نظام الدین کو قید اور تھانیسری کے لڑکے کو تہ تیغ کر دیا، اس کے بعد ایک امیر مخ افغان کو بادشاہ تسلیم کرکے مرہٹوں کی مملکت کو آپس میں تقسیم کر لیا، بروده اور دیوئی کے امیرانِ صدہ جو مانڈیو کے یہاں پناہ گزیں تھے، آکر اُن سے ملے، ان بغاوتوں کا حال سن کر سلطان محمد دیوگیر پہونچا، جہاں باغیوں نے اس کا مقابلہ کیا، لیکن ان کو شکست ہوئی، مخ افغان اپنے اہل و عیال کے ساتھ دھارگیر کے قلعہ میں جا چھپا، حسن کانگو، بیدر کے باغی اور مخ افغان کے بھائی اپنے اپنے ملکوں کو فرار ہو گئے، سلطان نے عماد الملک سرتیز سلطانی کو گلبرگہ روانہ کیا

مالک اس علاقہ پر قابض ہو جاتے، اور خود دیوگیر میں ٹھہرا، اسی اثنا میں گجرات میں طغی نے علم بغاوت بلند کیا، بادشاہ جلد گجرات کی طرف روانہ ہوگیا، اور اس بغاوت کو فرو کرنے میں مشغول تھا کہ اس کو خبر ملی، کہ حسن گانگو نے سرتیز سے جنگ کر کے اس کو قتل کر دیا ہے، اور قوام الدین ملک جو ہرا اور ظہرا بجیوشس دیوگیر چھوڑ کر دھار میں پناہ گزین ہیں، اور حسن گانگو دیوگیر کا بادشاہ بنا بیٹھا ہے، سلطان پیچ و تاب کھا کر رہ گیا،

عصامی نے ان واقعات کو برنی سے زیادہ تفصیل کیساتھ لکھا ہے، جو محض موازنہ کے لئے ذیل میں درج ہے،

شاہی فرمان کے بموجب عالم ملک نے ایک فوج احمد لاجین کی قیادت میں بادشاہ کے پاس بھیجی، اس فوج کے ساتھ کچھ امراء تھے، جن میں نورالدین اور اسمٰعیل نمایاں تھے، انھوں نے اپنے کو خطرے میں محسوس کر کے راستہ میں بغاوت کی[1]، اور احمد لاجین قتاش اور حسام کو تہ تیغ کر کے دولت آباد آئے، عالم ملک نے ان کا مقابلہ کیا، لیکن وہ زندہ گرفتار ہوگیا، اس کے بعد باغیوں نے ستارہ کا محاصرہ کیا، اور فتح حاصل کی، نصرت و کامرانی کے نشہ سے مخمور ہو کر انھوں نے اسمٰعیل کو اپنا بادشاہ بنایا، اسمٰعیل حسن (یعنی حسن گانگو) کو بادشاہ بنانا چاہتا تھا، لیکن وہ اس وقت ان سے دور دراز مقام پر تھا، اس لئے مصلحتاً اسمٰعیل کو بادشاہ بنالیا گیا، اور اس کا لقب ناصرالدین ہوا، نورالدین خواجۂ جہاں کے لقب سے سرفراز کیا گیا، اس بادشاہت کے اعلان کے بعد قاضی جلال اور مبارک مفتی جو راجہ مانڈیو کے یہاں پناہ گزیں تھے، بلائے گئے، جلال کو قدر خان اور مبارک کو خان کا خطاب عطا کیا گیا،

دو مہینہ کے بعد نورالدین نے الغ خان اور بہرام افغان کو لیکر گلبرگہ کی طرف یلغار کی گلبرگہ

[1] فرشتہ کا بیان ہے کہ یہ بغاوت دھولکہ ــــ کے پاس ہوئی جو کچھ اور دون کے درمیان واقع ہے،

مین ایک ہند و کھتری کندھرا نے مسلمانوں پر بڑے مظالم کئے تھے، نورالدین کے ایک ہی حملہ میں وہ پسپا ہوگیا، لیکن اوس نے کلیان کے حاکم جلال دہنی سے مدد مانگی، اور وہ اس کی مدد کو کلیان سے روانہ ہوا، جلال دہنی کو راستہ میں روکنے کے لئے حسین ستیہ مامور ہوا، دونوں میں جنگ ہوئی، جلال دہنی مارا گیا، اور حسین ستیہ فتحیاب ہوا،

ان واقعات سے متاثر ہو کر حسن نورالدین کی مدد کے لئے اپنی مملکت سے گلبرگہ کی طرف بڑھا، اسکو یلغار کرتے ہوئے دیکھکر بیدر اور سکر کے حاکموں نے بھی مدد پہونچائی، ناصرالدین بیحد خوش ہوا، اور حسن کو ظفرخان کے خطاب سے سرفراز کیا، گلبرگہ کے محاصرہ کی جنگ میں شدت پیدا کی گئی، اور جب یہ فتح ہونے کے قریب تھا، تو ناصرالدین نے اس فوج کے سرداروں کو طلب کیا، انھون نے جانا پسند نہ کیا تو ظفرخان خود دولت آباد روانہ ہوا، اسی اثنا میں گلبرگہ کے حصار میں غلہ کی کمی ہوگئی، اور محصورین نے سپر ڈال دیا،

محمد بن تغلق اپنے شاہی حاکموں کی ہزیمت اور شکست سے پیچ و تاب کھا کر دیوگیر کی طرف روانہ ہوا، اور ساری بھوپکر اپنی فوج کو جنگ کے لئے ترتیب دیا، قلب میں تاتارخان، یسار میں مقبول، اور میمنہ میں خود بادشاہ کھڑا ہوا، ناصرالدین کے لشکر میں قلب میں اس کا لڑکا خضرخان، خان جہان، حاتم خان وغیرہ، میمنہ میں قدرخان و مبارک خان، میسرہ میں ظفرخان اور حسام الدین مامور ہوئے عصامی نے جنگ کی تفصیل حسب معمول پورے رزمیہ انداز میں لکھی ہے، محمد تغلق کے ہاتھیوں نے دشمنون کی فوج میں انتشار پیدا کر دیا، اور وہ منتشر ہو کر فرار ہوگئی، ناصرالدین دیوگیر کے قلعہ میں آکر پناہ گزین ہوا، اسی اثنا میں گجرات میں طغی باغی ہوگیا، تغلق اس بغاوت کو خطرناک سمجھکر طغی کی سرکوبی کے لئے خود چلا، اور سرتیز کو گلبرگہ کی طرف روانہ کیا، دولت آباد میں تغلق کے ایک فوجی سردار جوہر نے وہان کے مسلمانوں پر سخت مظالم کرکے ناصرالدین، خضرخان، خان جہان، تاتارخان، قدرخان، مبارک خان،

صفدر خان، بہاء الدین حاجب، اور نصیر تغلقی کو گرفتار کر لیا،

ظفر خان آزاد رہا، اور اس نے دیوگیر سے مرج کی طرف کوچ کیا، یہاں پہونچکر اس نے فوج کو از سرِ نو ترتیب دینے کی کوشش کی، سگر کے فوجدار سکندر خان اور قیر خان نے اس کا ساتھ دیا، سرتیز گلبرگہ پہونچا، اور وہاں سے کوچ کرتا ہوا ظفر خان کے مقابلہ میں آیا، ظفر خان بھی اپنی فوج لیکر گوداوری کے پاس پہونچا، اور ایک فوج حسین کی سرکردگی میں بطور مقدمۃ الجیش بھیجی، حسین اور سرتیز کی فوجوں میں بمقام کھیڑہ مڈبھیڑ ہوئی، سرتیز نے مبارک کو حسین سے نبرد آزمائی کے لئے مقرر کیا، مگر وہ پسپا ہو کر بیر کی طرف فرار ہو گیا، مقدمۃ الجیش کی نصرت و کامرانی کی خبر پاکر ظفر خان کتی ھوا، ہوتا ہوا سندہتن پہونچا، یہاں سرتیز سے گھمسان لڑائی ہوئی، سرتیز مارا گیا، ظفر خان فتح یاب ہو کر دولت آباد پہونچا، اس کی آمد کی خبر سنتے ہی جوہر دھار کی طرف فرار ہو گیا، اور ظفر خان نے ناصر الدین کو قید سے آزاد کیا، ناصر الدین نے ظفر خان کی موجودگی میں پھر بادشاہ بننا پسند نہیں کیا، اور اس کے حق میں بادشاہت سے دست بردار ہو گیا،

ظفر خان عصامی کا ہیرو ہے، اسلئے اس کی فتح و کامرانی جرأت و شجاعت اور آخر میں ناصر الدین کا اسکے حق میں بادشاہت سے دست بردار ہونے کو بہت ہی عقیدتمندانہ انداز میں لکھا ہے،

اسکے بعد عصامی نے سلطان علاؤ الدین بہمنی کی حکومت کے واقعات لکھنے شروع کر دیئے ہیں، وہ اس کا درباری شاعر تھا، لہذا اس عہد کے جتنے واقعات اس نے قلمبند کئے ہیں، وہ صحیح اور مستند ہیں، اور بعد کے مورخوں کے لئے شاید واحد اور معتبر ماخذ ہے، برہانِ مآثر میں واقعات کی ترتیب اور تفصیل بالکل اس سے ملتی جلتی ہے،

طغی کی بغاوت کے مختصر ذکر کے بعد فتوح السلاطین کے تاریخی واقعات ختم ہو جاتے ہیں، بغاوتوں کے سلسلہ میں عصامی نے ہانسی اور سرستی کے حاکم سید ابراہیم خریطہ دار، اور کرہ کے حاکم

نظام الدین شاہ کی سرکشی کا حال نہیں لکھا ہے، خلیفہ بغداد کے یہاں سے خلعت کی آمد کا بھی ذ وہ ذکر نہیں کرتا ہے، حالانکہ اس عہد کا یہ مشہور واقعہ ہو، اُس نے محمد تغلق کی علمی سرپرستی علمی فیاضی اُس علمی تبحر کی طرف بھی مطلق اشارہ نہیں کیا ہے، بلکہ اس کی شان میں ہمیشہ سخت اور بُرے الفاظ مثلاً ظالم سفاک، خونریز، بیداد گر، بدخواہ دین، اور دُون پرور وغیرہ استعمال کیا ہی، ایک جگہ لکھتا ہی،

شہنشاہ دون دست بدخواہ دین | کہ یکسر سر تافت از راہ دین
شد آزردہ از وے صغار و کبار | برگشتہ جائز خروج دیار
شریعت رضا داد در خون او | طبیعت فسردہ ز افسون او
بخونش روان گشتہ حکم قضاۃ | قضا بستہ بر وے طریق نجاۃ
ز آئین اسلام سر تافتہ | ابا زمرۂ کفر در یافتہ
بر انداختہ رسم بانگ نماز | شب و روز از و اہل دین در گداز
جماعت اجمعہ در انداختہ | ابا ہندوان ہولی باختہ
ابا جوگیان گشتہ خلوت گرا | بدل راہ کفار را دادہ جا
بر و متفق مفتیے کم شدہ | وگر خود شدہ نیز ملزم شدہ
نفیر از خواصش بہر کشورے | بر و حرب جایز بہر محضرے
ہمان شاہ خونخوار ناپاک کیش | شنیدم کہ در آخر ملک خویش
بسے فوج برگشتہ گمان را شکست | بسے صاحب چترش آمد بدست
ہمی کرد ضحاک را اتباع | ہم آخر بر آئین اہل خداع

مگر ظاہر ہے کہ یہ اشعار عصامی کی عصبیت اور جذبات کی شدت اور مبالغہ آمیز طرز بیان کا نتیجہ ہیں ورنہ تاریخی حقائق کی روشنی میں محمد تغلق کی تصویر اتنی تاریک اور نفرت انگیز نہیں جتنی کہ عصامی

حصے دکھانے کی کوشش کی ہے،

اس طویل خامہ فرسائی سے اندازہ ہوا ہوگا، کہ فتوح السلاطین میں تاریخی حیثیت سے مفید اور نئی معلومات بھی ہیں، اور کچھ فروگذاشتیں غیر معتبر اور مبالغہ آمیز واقعات بھی، مجموعی طور سے شاہان دہلی کے حالات کے متعلق تاریخی لٹریچر میں ایک نیا اضافہ ہے، جو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، یہ کتاب اور بھی زیادہ مفید ہو سکتی تھی، اگر اس کے لائق اڈیٹر محنت و کاوش سے اڈٹ کرکے اس پر ناقدانہ حواشی اور تشریحات تحریر کرتے، مگر اڈیٹر مذکور کو اسکی اشاعت میں اتنی عجلت تھی، کہ اس کام کو انجام نہ دیسکے، گو اس کتاب کا ایک علحدہ ضمیمہ اور انگریزی ترجمہ شائع کرنے کا وعدہ کیا ہے، اس کا انگریزی ترجمہ تو شاید سیر حاصل نہ ہو، البتہ اگر ضمیمہ میں عمیق مطالعہ اور نقد و تبصرہ کے ساتھ اس کتاب کی تاریخی فروگذاشتوں اور غلطیوں کو درست کرنے کی کوشش کی گئی، تو اس کتاب سے دلچسپی لینے والے اصحاب کی بہت سی مشکلیں رفع ہو جائیں گی،

فتوح السلاطین کی ادبی حیثیت

فتوح السلاطین نہ صرف تاریخی نقطۂ نظر سے قابلِ التفات ہے، بلکہ ادبی حیثیت سے اپنے عہد کی ایک بلند پایہ تصنیف ہے، اس میں سلاطین ہند کی فتوحات کی رزمیہ داستان شروع سے آخر تک بحر متقارب میں لکھی گئی ہے، اس کے مصنف کا اصلی کمال یہ ہے کہ وہ میدان جنگ کی معرکہ آرائی، فوجی سرداروں کی نبرد آزمائی، لشکروں کی صف آرائی کی بہت ہی جیتی جاگتی تصویر کھینچتا ہے، اس سلسلہ میں اس کے بیان کا زور، تحریر کی قوت اور رزمیہ شاعری کا اثر کہیں پر ختم ہونے نہیں پاتا، بلکہ ہر جگہ یکساں طور پر قائم رہتا ہے، جو شاعری پر اسکی اعلیٰ قدرت کی دلیل ہے، چنانچہ فتوح السلاطین کو ہندوستانی فارسی کی رزمیہ شاعری کی پہلی مثال اور عصامی کو ہندوستان کے فارسی شعرا میں قابلِ قدر رزمیہ شاعر کہا جا سکتا ہے،

عصامی نے ایک دو موقع پر غنائیہ مضامین بھی لکھنے کی کوشش کی ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے،

کہ وہ عشق و محبت کے رموز و نکات سے بالکل ناواقف ہے، اس لئے وہ ان کے سچے جذبات کی ترجمانی کرنے کے بجائے سادے طریقے پر صرف ان کی اداؤں اور واردات کو بیان کر دیتا ہے، جو محض واقعہ نگاری ہو جاتی ہے، مثلاً خضر خان اور دول رانی کی محبت کے سلسلہ میں جذبات عشق کی جان گدازی اور جانسوزی کی شدت بیان کرنے کے بجائے وہ عشق ہی پر ایک حکیمانہ وعظ شروع کر دیتا ہے، اسی سلسلہ میں لیلے و مجنون کے عشق کا بھی حال لکھا ہے، لیکن اس میں کچھ ایسی بے سروپا باتیں لکھدی ہیں، کہ ان کے عشق کے بیان میں کوئی تاثیر پیدا نہیں ہو سکی ہے،

فتوح السلاطین کی سب سے نمایان خوبی اسکی زبان ہے، شاعر نے شروع سے آخر تک ایک ہی قسم کی زبان اختیار کی ہے، اور کہیں مغلق ثقیل اور نامانوس الفاظ کے استعمال سے اپنے طرز ادا کی خوبی کو مجروح نہیں کیا ہے، اس عہد کے دو ممتاز شاعر اور ہیں، امیر خسرو اور بدر چاچ، ان دونوں سے عصامی کا کوئی مقابلہ نہیں، لیکن الفاظ کی جتنی سادگی اور شستگی عصامی کے یہاں ہے، وہ اس کے معاصرین کے یہاں نہیں ہے، اس کے طرز بیان میں کہیں آورد اور تصنع نہیں ہے، اور نہ کہیں تشبیہات و استعارات سے معانی و مطالب میں پیچیدگی پیدا ہوئی ہے، زیادہ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ عصامی نے ہزاروں اشعار لکھے اور ہندوستان کے واقعات بیان کئے، لیکن ہندی الفاظ، محاورات اور مصطلحات کہیں نہیں استعمال کئے ہیں، حالانکہ اسی عہد میں برنی اور خسرو اپنی زبان میں بھاشا کے الفاظ قبول کر رہے تھے،

ریاضِ رضوان

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

(۲)

تخیل کی رنگینی اور بیان کی شوخی،

تخیل کی رنگینی اور بیان کی شوخی شاعری کے عارضِ زیبا کا گلگونہ ہے بغیر اسکے شاعری کا رنگ نہیں نکھرتا، لیکن اسکے لئے بڑے ذوقِ سلیم کی ضرورت ہے، ورنہ اس کا رنگ پھوٹ کر شاعری کے پاک دامن کو داغدار بنا دیتا ہے، جناب ریاض اس دور کے شاعر تھے، جب غیر معتدل رنگینی اور شوخی ہی کمال شاعری تھا، اس لئے ان کے کلام میں تخیل اور طرزِ ادا کی رنگینی اور شوخی کی اتنی بے اعتدالی ہے، کہ اس کی حد پستی و ابتذال تک پہنچ جاتی ہے، لیکن یہ انکے کلام کا نقص نہیں ہے، بلکہ اس دور کے مذاقِ شاعری کا لازمی نتیجہ ہے، لیکن خوشگوار رنگینی کی جو مثالیں ہیں، وہ تخیل کی لطافت، بیان کے لطف اور زبان کی نفاست اور چھلکے پن کے بہترین نمونے ہیں، بعض مثالیں ملاحظہ ہوں،

وہ گل اندام ہو تم ٹوٹتے بلبل تم پر ... تم جدھر جاتے ادھر شورِ عنادل ہوتا

حنا ہاتھوں میں ہونٹوں پر تبسم گدگدی دل میں ... وہ آئے پھول برساؤ مری پھولوں کی محفل میں

پھولوں کا زیور آج کھلا ان پر اس قدر ... تصویر بن گئے ہیں عروسِ بہار کی

ابھی تو خونِ بسمل کچھ یوں ہی سا رنگ لایا ہے ... شفق پھولی نظر آتی ہے یا رب کوئے قاتل میں

انگڑائی لیکے اور بھی سوئے وہ چین سے ۔ پھولوں کی پنکھیاں جو نسیم آکے جھل گئی

ترے نازک سے چہرے پر جہاں رنگِ عتاب آیا ۔ صباحت رخ کی بول اٹھی کہ رخ زیرِ نقاب آیا

چلے آتے ہیں خوش خوش کس کے گھر سے ۔ وہ ہنستے کھیلتے بادِ سحر سے

نہ شرماؤ سکھاؤ شوخیاں ہم سن ہیں کم سن ہیں ۔ ذرا یہ منہ بندھی کلیاں ہنسیں بولیں عنادل سے

کسے بتائے کوئی خونِ آرزو کیا ہے ۔ انھیں یہ ضد ہے کہ دیکھیں گے رنگ وہ کیا ہے

سرِ تربت نہ سنبھلے گر پڑے پھول ۔ میں شرمندہ ہوں دستِ نازنیں سے

اچھی نہیں ہیں آپ کی محشر خرامیاں ۔ دنیا کو اس طرح تہ و بالا نہ کیجئے

وہ پونچھتے ہیں آنسو کیا دستِ حنائی سے ۔ یہ آگ بجھانا ہے یا آگ لگانا ہے،

کبھی آنچل اڑے ان کے کبھی زلفیں بکھر گئیں ۔ وہ پریشان ہوئے بادِ سحر سے کیا کیا

نشہ میں جھکی پڑتی ہیں یوں ہی تری آنکھیں ۔ چھیڑوں سے مری اور بڑھا بوجھ حیا کا

باطنی کیفیتیں شوخی و رنگینی شاعری کے ظاہری خط و خال کا سنگار ہے، لیکن اس کی روح باطنی کیفیتیں ہیں، تخیل کی رنگینی سے شاعری میں لطف تو ضرور پیدا ہوتا ہے، لیکن اس میں بلندی اور تاثیر نہیں آتی، اس کے لئے دل کی جراحت درکار ہے، کہ دل کا ساز اسی مضراب سے بیدار ہوتا ہے، بغیر لذتِ الم کے دل کیفیت سے محروم رہتا ہے، زندگی کی دائمی خوشگواری اور خوش عیشی دل کو مردہ اور روح کو پژمردہ کر دیتی ہے، روح کی کھیتی خونِ آرزو سے لہلہاتی ہو، ع ابر تر گرتی ہے، تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے؛

ریاض طربیہ شاعر ہیں، بزمِ رنداں میں ساغر کے تبسم اور صراحی کے قہقہوں کے سوا سوزِ دل اور زندگی کی گہرائیوں پر غور و فکر کا گذر کہاں اسلئے ان کی شاعری میں خیالات کی بلندی، گہرائی، اور باطنی کیفیتوں کی بڑی کمی ہے، اس سے میری مراد نالہ و شیون اور مرثیہ و ماتم نہیں ہے بلکہ

بلکہ دل کی وہ چوٹ ہے جس سے چشم دل وا، اور روح بیدار ہوتی ہے،

لیکن شاعری دل کے جذبات وخیالات کا عکس ہے، اور ہر انسان کو دنیا کے مختلف نشیب وفراز سے گذرنا پڑتا ہے، پھولوں کی سیج بھی کانٹوں کی کھٹک سے خالی نہیں شراب کے کیف وسرور کے بعد خمار کا خمیازہ بھی ضروری ہے حضرت ریاض انسان تھے، ان پر بھی مختلف کیفیتیں طاری ہوتی تھیں، اس لئے ان کی شاعری اس جنس گرانمایہ سے بالکل خالی نہیں ہے اور مے خوشگوار کے چھلکتے ہوئے جام میں کبھی کبھی دو چار گھونٹ تلخ بھی ملجاتے ہیں، گو ریاض کا یہ اصل رنگ نہیں ہے، بلکہ ان کے مذاق کے بالکل ضد ہے، لیکن وہ حقیقی شاعر تھے، اس لئے جس رنگ کی طرف بھی متوجہ ہوجاتے تھے، خوب کہتے تھے، ان کے اس رنگ کے اشعار میں میر کی روح بولتی ہے،

پوچھا کسی نے حال کہ آنسو ٹپک پڑے ... رونا مجھے ہے گریۂ بے اختیار کیا،

اب سوئے آسماں نہیں اٹھتا ... اپنے دستِ دعا کو روتے ہیں

یادِ ایام و جام باقی ہے، ... مے کہاں ہے کا وہ سرور کہاں

مدت ہوئی رسائی قسمت کو رو چکے ... وہ سنگِ در کہاں یہ ہماری جبیں کہاں

نہ شگوفہ نہ گل نہ رنگِ بہار ... اب تو وحشت کا گھر چمن بھی ہوا

صدقے ترے صیاد یہ باتیں تھیں چمن تک ... کچھ فکر بہار اب ہے نہ کچھ فکر خزاں اب

وہ نخل نہ وہ باغ نہ وہ شاخ نشیمن ... اے اہل چمن چھوٹ کر اب جائیں کہاں اب

لہو بھی تو آنکھوں سے آنے لگا ہے ... ان آنکھوں کو اشکوں سے نم کرتے کرتے

اب دل ہے ریاض اور نہ دل کی وہ تمنا ... منجدھار میں ہم کشتی امید ڈبو آئے

سوکھے ہوئے مرجھائے ہوئے پھول لحد پہ ... آجاتے ہیں دو چار کبھی اڑکے ہوا میں

ہم تھک کے گرے گر کے اُٹھے اُٹھ کے چلے بھی ۔۔۔ مجھ پر اثر اے دوری منزل نہیں ہوتا

دل وارفتہ بھی پہلو سے گیا وائے نصیب ۔۔۔ نہ رہا کوئی شریک اب غم تنہائی کا

خیال یار کے صدقے خیال یار ہی ہوگا ۔۔۔ تسلی مجھ کو دینے کوئی وقت اضطراب آیا

ریاض احساس ہی مجھ کو نہیں ہے ۔۔۔ یہ فصل گل ہے یا فصل خزاں ہے

تمنائیں بہت ہیں وقت کم ہے ۔۔۔ کسے دیکھوں نگاہ واپسیں سے

وہ دل ہی نہیں اے ہجوم تمنا ۔۔۔ جدا ہو گیا ہے جرس کارواں سے

دن رات وہی ہیں مگر اللہ رے تغیر ۔۔۔ خلوت میں بھی شغل مے و مینا نہیں ہوتا

نقش چھوڑے ہوئے تیرے نہیں دیکھے جاتے ۔۔۔ عمر رفتہ نہ مرے دل میں تری یاد رہے

نشیمن میں گذرے کئی موسم گل ۔۔۔ قفس میں جو ٹوٹے تھے وہ پر نہ نکلے

خون تیرے ساتھ تیری آرزوئیں بھی ہوئیں ۔۔۔ اے دل مرحوم تیرا حادثہ جانکاہ ہے

شمع افسردہ بجھتی ہے سونی محفل ہوتی ہے ۔۔۔ حسرت بیٹھی دل میں اب میری جان توڑتی ہے

لگی آگ میرے جگر میں یوں نہ لگے کسی کے بھی گھر کو یوں ۔۔۔ نہ تو لو اُٹھی نہ چمک ہوئی نہ شرر اڑے نہ دھواں اٹھا

مٹا ہوں میں مجھ میں کیا رہا ہے حزیں کو تو کیا ستا رہا ہے ۔۔۔ تو اے مغنی جو گا رہا ہے تو رو رہا ہے رباب میرا

بیان حقیقت جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے عاشقانہ، اور رندانہ اشعار میں سلوک و معرفت کے اسرار تلاش کرنا کچھ خوش مذاقی نہیں ہے، اس وقت تک اشعار کے ظاہری معنی ہی لینے چاہئیں جب تک الفاظ یا شعر کا جلال و اثر خود باطنی معنی کی شہادت نہ دے، اس میں عموماً بڑی بے اعتدالی برتی جاتی ہے، معنی پرستوں کو مجاز میں بھی حقیقت کا جلوہ نظر آتا ہے، اور ظاہر بین نگاہوں سے حسن حقیقت بھی مستور رہتا ہے، جس طرح عاشقانہ اشعار میں تصوف کے معنی پہنانا مضحکہ انگیز ہے، اسی طرح یکسر اس سے انکار بھی کچھ کم بدمذاقی نہیں ہے، جب تسلیم ہے کہ شاعری جذبات کا آئینہ ہے، تو ہر انسان میں سفلی جذبات کے ساتھ

کبھی کبھی علوی جذبات بھی پیدا ہوتے ہیں، کیسا ہی رند شاہد باز کیوں نہ ہو اسکی روح کبھی نہ کبھی عارضی طور سے ہی اصل مرکز کی طرف ضرور متوجہ ہوتی ہے، اور وہ اپنی ہوسناکی کی داستان کی طرح اس کیفیت کو بھی اپنی زبان میں ادا کر دیتا ہے، یہ ضروری نہیں کہ کہنے والا صوفی یا اہل دل ہی ہو، نظیر اکبرآبادی ناسخ، آتش اور داغ کا کلام بھی ایسے اشعار سے خالی نہیں،

نفس شاعری کی عظمت و بلندی کے نقطۂ نظر سے صوفیانہ تخیل شاعری کی روح ہے، یہ ضروری نہیں کہ ہر شعر میں تصوف کا کوئی نکتہ ہو، لیکن مجموعی حیثیت سے کلام بادۂ عرفاں سے خالی نہ ہونا چاہئے، ورنہ وہ ایک نشۂ بے کیف ہوگا، عارفانہ تخیل سے کلام سدرۃ المنتہیٰ تک پہونچ جاتا ہے، اردو شعراء میں خواجہ میر درد، اثر، غالب اور دوسرے بعض اکابر شعراء کے کلام کی گرمی، اثر و کیف اسی وادی ایمن کی شرر باریوں کا نتیجہ ہے، اس مرد سالک کی بعض باطنی کیفیتیں اور واردتیں ملاحظہ ہوں،

تعین سے منزہ شوخیاں ہیں ان کے جلوؤں کی ہماری وسعتِ دلمیں بنا ہے لامکاں رکھدی

کتنے کعبے ملے رستے میں کئی طور ملے ان مقامات سے لیکن وہ بہت دور ملے

تیرے نظارہ نے مجھ کو نہ کہیں کا رکھا جلوۂ یار کہاں تونے کیا گم مجھ کو،

بیخودی گم گشتگی سکر و تحیر محویت کچھ مقامات اور بھی پڑتے ہیں مینائی کے بعد

یہ ہوا ہے خدا خدا کر کے رات دن بیخودی سی رہتی ہے،

خلوت گہ دل میں تم چپکے سے جو آجاتے پردہ میں سویدا کے کیا جانئے کیا ہوتا

نہیں ہوا اور کوئی دوسرا سر دلمیں ارے تو ہے تیری تمنا نہیں ہے،

چشم و دل ہیں مقامات خلوت کے آڑ پردے پڑے ہیں غفلت کے

حضرت مجذوب فرماتے ہیں،

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی،

فلک تک لے گئی آہِ رسا مجھکو یہ کہہ کہکر | اب انکا بام آتا ہو اب انکا بام آتا ہی
اٹھانے نہیں دیتے سر مجھ کو سجدے | کہاں جائیں اٹھ کر ترے آستاں سے
خاک کسکی ہی یہ نقشِ پا کس کے ہیں | ناتوان ہم سے جو گرتے ہیں تو سو جاتے ہیں
طور سے پہلے بھی دیکھا ہی تجھے | کان ہیں کچھ آشنا آواز سے
تو درونِ خانہ برون در تو ہزاروں پردوں میں جلوہ گر | ارے او حقیقت پر وہ در تری شوخیاں ہیں مجاز میں
تری سجدی میں وہ مزا ملا کہ تڑپ کے سینے میں آرہا | کوئی داغ ہی کہ ہی دل مرا یہ مری جبین نیاز میں

کلام ریاض کے عیوب اور اس کی بے اعتدالیاں

اوپر جو کچھ دکھایا گیا، وہ کلام ریاض کے محاسن اور اس کا دلکش رُخ تھا، تنقید کا تقاضا یہ ہی کہ ان کے عیوب پر بھی سرسری نظر ڈال لیجائے، اس سے مراد فنی خامیاں نہیں ہیں، اس لحاظ سے ان کا کلام منزہ عن الخطا ہے، وہ اس دور کے استاد کامل تھے، ان کے کسی شعر میں اس نوع کی کوئی خامی نہیں دکھائی جاسکتی، بلکہ اس سے مراد تخیل و طرز ادا کی بے اعتدالی اور اس دور کی شاعری کے دوسرے نقائص ہیں،

ریاض کمال فن کے ساتھ خوش مذاق بھی تھے، لیکن جس دور اور جس اسکول کے وہ شاعر تھے، اس میں تخیل کا ابتذال، جذبات کی عریانی، معاملہ بندی، خارجی اوصاف کی مصوری، الفاظ کی رکاکت، صنائع لفظی اور اس قبیل کی دوسری باتیں شاعری کے حقیقی اجزاء و عناصر بلکہ کمالِ شاعری سمجھی جاتی تھیں، اس لئے ریاض خوش مذاقی کے باوجود ان عیوب سے اپنا دامن نہ بچا سکے، اور کم و بیش ان سب کی مثالیں ان کے کلام میں موجود ہیں، اور تخیل اور جذبات کی تو ایسی عریاں تصویریں ہیں، کہ انھیں جلوت کیا خلوت میں بھی دیکھنا مشکل ہی، لیکن تھے وہ خوش مذاق، اس لئے دورِ آخر کی لکھنوی شاعری کی طرح ان کا کلام پھیکا اور بدمزہ نہیں ہونے پایا ہی اور ان خامیوں کے باوجود ان کا قدم شاعری کی دائرہ سے باہر نہیں نکلا ہی، وہ پھکڑ بھی بکتے ہیں تو اس رنگین نوائی کے ساتھ کہ سننے والا

ناگواری کیساتھ ساتھ لطف اندوز بھی ہوتا ہے،

بہرحال اگرچہ یہ ایک ناخوشگوار فرض ہے اوران کی شاعری کا لطیف و دلکش رُخ دکھانے کے بعد تاریک پہلو دکھاتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے لیکن اگراسے قلم انداز کر دیا جائے تو ان کے کلام کا ایک رُخ نگاہوں سے مخفی رہ جائے گا، ان کی شاعری کا یہ رُخ اتنا غیر معتدل ہے کہ اسکی ستھری سی ستھری مثال بھی غالباً سنجیدہ طبائع پر بار ہوگی، بہرحال اس بدمنظر رُخ کی بھی ایک جھلک دیکھ لیجائے،

تخیل کی پستی اور ابتذال | انکے کلام میں تخیل کی پستی و ابتذال کی بکثرت مثالیں ہیں نمونتہً صرف چند مثالیں پیش کیجاتی ہیں

سو رہتے ہو روتے نہیں اب جان کو اسکی ۔۔۔ اب غیر کے گھر رات کو ماتم نہیں ہوتا

پاپوش ان حسینوں کی آتی ہے مرے گھر ۔۔۔ ان کی نظر میں کچھ میری اوقات بھی تو ہو

دعوت تھی رقیب کی میرے گھر ۔۔۔ جوتی میں وال کیا بٹی ہے،

بے طرح ٹوٹتے ہیں دیکھتے ہی دور سے ۔۔۔ تم نے اچھا سگ دربان کو لگا رکھا ہے

ملجائے جس کسی کو وہی لالوں لال ہے ۔۔۔ کیا چیز ان حسینوں کے منہ کا اُگال ہے

ہم کو مل جائیں تو آجائے مزا ۔۔۔ اچھے معشوق اور سستے دام کے

لیلیٰ پکاری جامے سے باہر ہوا جو قیس ۔۔۔ یہ بے حجابیاں مرے محمل کے سامنے

برابر میری تربت کے کیا ہے دفن دشمن کو ۔۔۔ یہ اچھا میرے حصہ میں جہنم کا عذاب آیا

بوسہ لینے میں یہ سمجھے ہم گلوری ہے دبی ۔۔۔ گالیاں لاکھوں بھری تھیں بھولے بھولے گال میں

وہ شب کا خواب ہم کو یاد آئے ۔۔۔ تمھاری بات کہہ دینگے تم ہی سے

معاملہ بندی اور خارجی مصوری | معاملہ بندی اور خارجی مصوری کی مثالیں اس سے بھی زیادہ عریاں ہیں ناظرین انھیں بھی سن لیں،

مسکی ہوئی محرم ہے کوئی آنکھ نہ ڈالے آنچل سے چھپالے ارے آنچل سے چھپالے

آنچل ڈھلا رہا مرے مست شباب کا اوڑھا گیا کبھی نہ ڈوپٹہ سنبھال کے

جو مجھ کو گد گدائے وہ ...... کسی کا ہو جو تجھ کو گد گدائے وہ میری نگاہ ہے

جو گونج ابھی پاؤں میں جھنجلا کے وہ لے گئے پیار کو آگ ابھی کان جاتا

کہنا کسی کا ہائے وہ جھنجلا کے ناز سے کمبخت ہاتھ چھوڑ کوئی دیکھتا نہ ہو

تھی آج ہاتھ پاؤں میں مہندی لگی ہوئی موقع بہت بُرا یہ تری بے کسی کا تھا

مرے ہاتھ سے پہننا انہیں اور بار ہوتا مگر اور بھی پھلتی جو گلے میں ہار ہوتا

اڑی آنچل کو چوم لے گی وہ چیز جو کچھ اٹھی ہے

انکے آنچل میں ادا بن کر قیامت چھپ بھی وہ میری جانی ہوئی وہ میری پہچانی ہوئی

اس طرح کہ گھنگرو کوئی چھاگل کا نہ بولے جب چھم سے چلیں گو دیں چھکے سوا اٹھالے

ڈر ہے نہ ڈوپٹہ کہیں سینہ سے سرک جائے پنکھا بھی ہمیں پاس سے جھلنے نہیں دیتے

کہتے ہیں جان پڑ گئی آفت میں روز وصل ل دل کے رکھ دیا مجھے اچھا یہ پیار ہے

چھپا کر دل کو تم نے رکھ لیا نازک سے محرم میں بہت نازک ہے شیشہ جس نے کھائی چوٹ پتھر کی

جوانی بھی ہوا کرتی ہے دیوانی مثل سچ ہے وہ برساتے ہوئے چلتے ہیں پتھر اپنے ...... سے

یہ بت ہاتھ آئیں تو ہیں نرم و نازک ٹٹولا جوان کو تو پتھر کے نکلے،

یہ اس رنگ کے مہذب سے مہذب اشعار کی مثالیں ہیں،

رعایت لفظی ومعنوی لفظی و معنوی رعایت لکھنؤ کے شعراء کی خاص خصوصیت تھی، وہ اس دھن میں شاعری کی مٹی پلید کر دیتے تھے، ان کی شاعری الفاظ کا گورکھ دھندا ہو کر رہ گئی تھی، ریاض کے یہاں بھی اس کی مثالیں ہیں، لیکن ان کی خوش مذاقی ان کا قدم شاعری کے دائرہ سے باہر نہیں نکلنے دیتی

چند مثالیں ملاحظہ ہوں،

دامن کے بدلے [illegible] کو وہ چوٹی میں دیں جگہ اب عرش پر تو ان سے چڑھایا نہ جائے گا،

پاؤں کا آگے بڑھانا مجھ کو دوبھر ہو گیا دیکھ کر سر پر سبو واعظ میری سر ہو گیا

سرِ تربت بھی گھوڑے پر چڑھ کے وہ آئے سوار قیامت ہم عناں آئی نہ دشمن ہم رکاب آیا

گالیاں دیں نامہ بر کو تلخ تلخ حرفِ بوسہ زہر تھا پیغام میں

مرا پانی بھریں یہ بجلیاں کالی گھٹا والی جو دیں کانوں کی اپنے زلفوں والی بجلیاں مجھکو

مسی مل کے منہ آ رہے ہیں وہ اس پر زباں سے نہ کچھ آج سوسن کے نکلے

کہا سوسن کو جو کچھ منہ میں آیا بڑی منہ پھٹ یہ مسی کی دھڑی ہے

میں اپنے خون کا بیڑا اٹھاؤں خود کیونکر وہ پان دیتے ہیں شوخی سے مسکرا کے مجھے

کیوں کوستے ہو آگ لگے رنگِ حنا کو میں چومتے جواب ہاتھ پڑیں ہونٹوں میں چھالے

الفاظ کا ابتذال ان کا کلام الفاظ کے ابتذال سے بھی خالی نہیں ہے، لیکن زبان پر ان کو غیر معمولی قدرت حاصل ہے، اس لئے وہ اس کے استعمال سے ایک لطف پیدا کر دیتے ہیں،

چند مثالیں ملاحظہ ہوں،

واعظ شراب خانہ میں کھولے گا کیا زباں ہم خوب جانتے ہیں وہ ٹرا ہی تھان کا

شریکِ شکایت لب جو تھا ناصح مجھے تاڑ اُسے [illegible] تاڑ دینا

نہ جھوٹ بول کہ ہم شام سے کل آ گئے نہ کھا قسم ادے جھوٹے کبھی جو تو آئے

چُل دیا کرتے ہیں دن رات حسینوں کو بیاض بڑی نٹ کھٹ بڑی چنچل ہے طبیعت میری

ایک صاحبِ علم کی وفات

از

مولوی سید آل علی صاحب نقوی بدایونی

آج کل ہندوستان میں جب علوم مشرقی کے واقف کار روز بروز کم ہو رہے ہیں، کسی پرانے صاحبِ علم کے سانحۂ ارتحال پر دلی صدمہ ہوتا ہے کہ اون کی جگہ جو آئیں گے وہ اپنے قدیم علوم کے اتنے واقف بھی نہ ہون گے،

بدایون ہمیشہ سے فضل و کمال کا گھر رہا ہے یہیں ایک پُرانا خاندان مولینا علاؤ الدین اصولی کا تھا، مولینا ممدوح الشان علم ظاہر و باطن دونوں میں ممتاز تھے، اور یہ فخر کچھ کم نہیں کہ حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا انکے شاگردوں میں تھے، فقہ حنفی میں قدوری مولینا سے پڑھی تھی، کہتے ہیں کہ بچپن میں وہ شیخ جلال تبریزی کے فیض سے مشرف ہوئے تھے، زہد و ورع اور فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی، مگر کسی سے نذر و ہدیہ ضرورت سے زیادہ کبھی قبول نہیں فرمایا، اصولی کے لقب سے شہرت کے یہ معنی ہیں کہ وہ اصولِ فقہ میں کمال رکھتے تھے مذ ماذ، وفات معلوم نہیں، لیکن بہرحال وہ ساتوین صدی ہجری میں تھے،

مولینا اصولی کی مبارک یادگار اس زمانہ میں مولوی سید عنایت احمد صاحب نقوی بدایونی تھے، افسوس ہے کہ موصوف نے ابھی پچھلے مہینہ ۲۲ رمضان [illegible] کو بدایون میں وفات پائی، ان کا بڑا علمی کارنامہ علامہ کمال الدین فارسی شاگرد علامہ محمد دین مسعود شیرازی

کی تنقیح المناظر کے نسخوں کی تصحیح و مقابلہ ہے، تنقیح المناظر مشہور عالم بصریات (علم المرایا والمناظر) ابن ہیثم المتوفی ۴۳۰ھ کے رسائل علم المناظر کی تلخیص و شرح ہے، نواب عماد الملک مرحوم جو اسلامی علوم و فنون کے اس زمانہ میں سب سے بڑے قدر دان تھے، ان کو اس کتاب کی اشاعت کی جو مسلمانوں کی علم نور او علم بصر کی عظیم الشان تحقیقات پر مشتمل ہے، بڑی فکر تھی، اس کتاب کے دو نسخے ہندوستان میں موجود تھے، ایک رامپور کے اور دوسرا پٹنہ کے کتبخانہ میں، اور تیسرا نسخہ لیڈن کے کتبخانہ میں ملا، چونکہ یہ کتاب ریاضیات کے اہم مسائل پر مبنی تھی، اسلئے اس کی تصحیح کوئی آسان کام نہ تھا، چنانچہ نواب عماد الملک مرحوم نے اس کیلئے مولوی عنایت احمد صاحب نقوی کا انتخاب کیا، موصوف نے رامپور اور پٹنہ کے نسخوں کا مقابلہ کیا، اور حتی الامکان تصحیح فرمائی، اور یہ کام مئی ۱۹۲۱ء میں انجام دیا، اسکے بعد یہ نسخہ لیڈن کے نسخہ کے مقابلہ کے لئے مستشرق کرنکو کے پاس لندن بھیجا گیا، اور اس کے بعد دائرۃ المعارف حیدرآباد نے اسکو دو جلدوں میں ۱۳۴۷ھ میں چھاپکر شائع کیا،

مرحوم کا یہ کام چونکہ اسلامی علوم و فنون کی ترقی و بقا کی راہ میں ہمارے شکریہ کا مستحق ہے، اس لئے ان کی زندگی کے مختصر سوانح کو جو ان کے صاحبزادہ خان بہادر سید آل علی نے لکھا ہے، ہم ذوالقرنین سے لیکر شائع کرتے ہیں،

"س"

مولوی سید عنایت احمد صاحب نقوی مرحوم و مغفور بدایون کے معزز و قدیم خاندان سادات قبائی سے تعلق رکھتے تھے، اس خاندان کے مورث اعلیٰ مولینا سید علاؤ الدین اصولی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ نظام الدین اولیا رسلطان جی صاحب بدایونی ثم الدہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے استاد تھے، اور یہ خاندان علم و فضل اور خوشنویسی کے لئے بھی مشہور رہا ہے،

سید صاحب مرحوم ۱۲۶۹ھ میں پیدا ہوئے، ابتدا میں اپنے گھر پر رہ کر مولینا مجید الدین صاحب مرحوم سنبھلی سے فارسی وعربی کی درس نظامی کے مطابق تکمیل کی، خاندانی ماحول کی علمی فضا، قابل اور شفیق استاد کی تربیت اور ذاتی شوق علم کا یہ نتیجہ تھا کہ سید صاحب کو تا دم آخر مطالعہ کتب اور اضافہ معلومات کا شغف رہا، اور باخبر اصحاب کو بخوبی معلوم ہے، کہ سید صاحب کا علم آخر عمر تک مستحضر رہا، اور وہ اپنی وسعت نظر، روشن خیالی اور ذہانت کی وجہ سے نہ صرف مذہبی وعلمی امور میں بلکہ زمانہ حاضرہ کے واقعات ومسائل پر بھی صحیح وصائب رائے رکھتے تھے، عربی علوم کی تکمیل کے بعد سید صاحب نے امتحان وکالت پاس کیا، بعد کو شاعری سے بھی ذوق پیدا ہوا، اور نواب مرزا خان داغ دہلوی سے اصلاح لیتے رہے، اور ان کے ارشد تلامذہ مین انکا شمار ہوتا ہی،

سید صاحب مرحوم نے ابتداءً شاہجہاں پور وبدایون میں وکالت کی، بعد ازان اپنے خاندانی تعلقات دحقوق کی بنا پر ریاست گوالیار میں تقریباً تیس سال تک منصف ومجسٹریٹ وسپرنٹنڈنٹ پولیس پرسنل اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل پولیس کے معزز عہدوں پر تعینات رہے، پرسنل اسسٹنٹی کے زمانہ میں انھون نے ریاست گوالیار کا پولیس مینوئل مرتب کیا، ۱۹۱۳ء میں ریاست گوالیار کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر وطن میں واپس آئے، اور چند سال بدایون وسہسوان میں وکالت کرتے رہے، یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے، کہ باوجود مشاغل ملازمت اور وکالت ممدوح کا علمی شوق اور مطالعہ کتب برابر جاری رہا، ۱۹۲۰ء میں وکالت ترک کر دی، بعدہٗ نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی مرحوم نے ان کو ایک نہایت گرانقدر اور اہم ترین خالص علمی خدمت کیلئے انتخاب کیا، علامہ ابن الہیثم کی نادر اور شہرۂ آفاق تصنیف کتاب المرایا والمناظر کے قلمی نسخہ موجودہ حیدرآباد (جس کے تمام دنیا میں صرف تین قلمی نسخے حیدرآباد وپٹنہ ورامپور میں موجود تھے) کے دیگر دو نسخون سے مقابلہ اور تصحیح اور اپنی نگرانی میں از سر نو لکھائے جانے کا کام کئی سال تک انجام دیا، یہ کتاب

سلطنت آصفیہ حیدرآباد کے زیر اہتمام قبل ازیں چھپ کر شائع ہو گئی ہے ۱۹۲۳ء کے بعد سے سید صاحب مرحوم گوشہ نشین تھے، اور عبادت الٰہی سے جو وقت بچتا تھا، باوجود ضعف بصارت زیادہ تر مطالعۂ کتب میں صرف کرتے تھے،

انتقال سے چند ماہ قبل سید صاحب بدایوں آگئے تھے، چار ماہ بعارضۂ فالج علیل رہنے کے بعد تقریباً اسی سال کی عمر میں بروز دوشنبہ ۲۳ رمضان المبارک ۱۳۵۵ھ کو واصل بحق ہوئے، اور اپنے خاندانی باغ میں اندر احاطۂ درگاہ جناب مذاق میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ دفن ہوئے،

انتقال کے وقت سید صاحب مرحوم نے تین فرزند، پانچ صاحبزادیاں، پانچ پوتے پوتیاں، ۲۰ نواسے نواسیاں اور دو پرنواسے چھوڑے، تینوں صاحبزادے بفضلہ معزز عہدوں پر ممتاز ہیں، (۱) خان بہادر سید آل علی نقوی ایم اے پی ای ایس رجسٹرار ڈیپارٹمنٹل امتحانات صوبۂ متحدہ (۲) ڈاکٹر سید آل محمد نقوی ایم بی بی ایس پرسنل فزیشن نواب صاحب ٹونک (۳) سید سبط نبی نقوی، ایم ایس سی اسسٹنٹ میٹرولاجیکل ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ ہند پونا،

تلخیص و تبصرہ

ڈاکٹر فرانز پلیوا کا لکچر

ویانا کے مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر فرانز پلیوا نے آکسفورڈ کی ایک مجلس نفسیات میں، نفسیات کے مختلف مسائل پر کئی لکچر دیئے ہیں، ان کی تلخیص ذیل میں درج ہے،

احساس کمتری کسی شخص میں کمتری کا احساس اسوقت پیدا ہوتا ہے، جب وہ اپنی اندرونی دنیا میں اپنے آپ کو اور اپنے ذاتی کردار کو اپنے اخلاقی معیار کے مطابق نہیں پاتا، احساس کمتری گویا اپنی ذات کی اخلاقی ملامت ہے، جب اس جذبہ سے کوئی مغلوب ہوتا ہے، تو وہ بعض معاشرتی فرائض کو انجام دینے سے قاصر رہتا ہے، کمتری کے جذبہ اور کمتری کی گرہ میں فرق ہے، اول الذکر ایک انسانی صفت ہے، لیکن جب معاشرتی فرض کو پورا کرنے میں کوتاہی اور اخلاقی معیار کو نظر انداز کرنے کی کوشش کیجاتی ہے، تو احساس کمتری کی گرہ پڑجاتی ہے،

برتری کی گرہ کمتری کی گرہ کی مخالف نہیں بلکہ دونوں توام ہیں، کوئی نفسیاتی معالج کسی شخص کی کمتری کی گرہ کا استیصال نہیں کر سکتا، البتہ وہ اس کی تدابیر بتا سکتا ہے، اس مرض کا علاج خود مریض کے ہاتھ میں ہے،

بچوں کی تربیت عام طور سے جسمانی سزا بچوں کی برائیاں دور کرنے کے لئے دی جاتی ہے مگر درحقیقت سزا دیتے وقت سزا دینے والے محض اپنی فوقیت اور برتری سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اس سے ایک بچہ تھوڑی دیر کے لئے فرمانبردار اور اطاعت گذار تو ضرور ہوجاتا ہے مگر آگے چل کر اسکی

طبیعت پر خوشگوار اثرات مرتب نہیں ہوتے ہیں، ہر بچہ شخصیت رکھتا ہے، اور اس کے دل میں
اس کا احترام ہوتا ہے، سزا سے اسکی احترام ذات کو صدمہ پہونچتا ہے، جو لوگ بچوں کی جسمانی سزا
کے قائل ہیں، ان کو درحقیقت بچوں کی شخصیت کے احترام کا احساس نہیں جسے ہر حال میں ہونا چاہئے
جس طرح پودون کے اُگنے اور بڑھنے میں آفتاب کی شعاعیں لازمی ہیں، اسی طرح بچون کے صحیح
نشو و نما کے لئے محبت و شفقت ضروری ہے، جبر اور تحکم سے بچون میں ذمہ داری کا احساس پیدا
نہیں ہوتا، اگر بچون اور ان کے بزرگون اور استادوں میں موانست ہے تو انکی تربیت اور تعلیم
میں کوئی دقت حائل نہیں ہوتی اسی لئے ایک ماہر نفسیات کی نظر میں بچہ کی تعلیم میں سب سے اہم عنصر اساتذہ کی موانست ہے
یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ بچوں پر بہت جلد ذمہ داری عائد نہ کیجائے، کیونکہ وہ مشکل سے اس
کا بار سنبھالتے ہیں، خصوصاً معاشرتی ذمہ داری کا بار ان پر ڈالنا بالکل غلط ہے، ان کی تربیت
ایسی ہونی چاہئے، کہ وہ معاشرت کی ذمہ داری کو خود بخود محسوس کریں، ایسی تربیت مشکل ضرور ہے
مگر تعلیم اور تربیت کا یہ بہت ہی اہم پہلو ہے،

عصبی المزاجی بعض امراض ایسے ہیں، جو نفسیاتی مشکلون اور دقتون سے پیدا ہوتے ہیں، مثلاً ایک لڑکا اپنے
اسکول کا کام کسی دن انجام نہیں دیتا، وہ اسکول جانے سے ڈرتا ہے، مگر اسکول نہ جانا بھی پسند نہیں کرتا
ہے، اس کشمکش میں اس میں عصبی المزاجی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، وہ سر کے درد میں مبتلا ہو جاتا ہے
جس سے اسکو اسکول نہ جانے کی ایک معقول وجہ ہاتھ آجاتی ہے، عصبی المزاجی سے مختلف قسم کے جسمانی
امراض پیدا ہو سکتے ہیں، جن کا علاج ایک محلل نفسی ہی کر سکتا ہے، اسی لئے امراض کے علاج میں
یہ جاننے کی بڑی ضرورت ہے کہ وہ جسمانی فتور یا نفسیاتی انتشار کے باعث سے تو نہیں ہیں،
عصبی المزاج لڑکا کہنا درست نہیں، کیونکہ ایک لڑکے کو عصبی المزاج اسی وقت کہہ سکتے
ہیں، جب اس کی مشکلات کا اصلی سبب ہم سمجھنے سے قاصر رہ ہیں، عصبی المزاجی کوئی فطری چیز نہیں

اور نہ یہ باپ سے بچے کو وراثت میں ملتی ہے، بلکہ بچہ جب مشکلات میں پڑ جاتا ہے، تو وہ عصبی المزاج ہو جاتا ہے، وہ اپنے دل میں مختلف قسم کے حوصلے اور ارمان رکھتا ہے، جب ان کی تکمیل مشکل سمجھتا ہے تو وہ اپنے کو کمزور اور بودا پاتا ہے، اور جب اسکو اپنی کمزوری اور بودے پن کا احساس ہو جاتا ہے، تو وہ اپنے کو غیر محفوظ اور غیر مامون تصور کرتا ہے جس کا لازمی نتیجہ عصبی المزاجی ہے، والدین عموماً حوصلہ مند اور پُر ارمان لڑکے کو بہت پسند کرتے ہیں، اور کاہل لڑکے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے، مگر کاہلی حوصلہ کی محض ہزیمت خوردہ صورت ہی، لڑکا کاہل اسلئے ہو جاتا ہے، کہ وہ اپنے حوصلہ کی تکمیل میں ناکام رہتا ہے، ایک بچہ کا اعلیٰ حوصلہ اور بلند ارادہ کوئی بری چیز نہیں، مگر والدین کو یہ احتیاط رکھنی چاہئے کہ وہ اپنے حوصلوں اور ارادوں کی تکمیل میں اس طرح منہمک نہ ہونے پائے کہ ان کی ناکامی کے بعد اس کو پھر کسی اور شے سے دلچسپی اور لگاؤ پیدا نہ ہو سکے، اسی لئے والدین کا فرض ہے کہ اپنے بچوں کو زندگی کی مختلف قسم کی دلچسپیوں میں مشغول رکھیں، تاکہ ایک کی ناکامی کی تلخی دوسرے کی کامیابی کی خوشی سے زائل ہوتی رہے،

زندگی میں ناکامیابی کسی شخص کی زندگی کی ناکامیابی کے عموماً دو سبب ہوتے ہیں، یا تو وہ اپنی زندگی کا مقصد بالکل غلط یا بہت بلند قرار دیتا ہے، اور اگر کوئی شخص اسکو اسکے مقصد کو ناممکن الحصول بتاتا ہے، تو وہ اسکی طرف مطلق دھیان نہیں دیتا ہے، اس سے دو نتیجے پیدا ہوتے ہیں، یا تو وہ اپنی ساری قوت اور سرگرمی فضول ضائع کرتا ہے، یا پھر وہ پوری قوت اور سرگرمی سے کام کو انجام دینے میں کوتاہی شروع کر دیتا ہے، اور جان چرانے کے لئے طرح طرح کے بہانے اور حیلے تراشنے کا عادی ہو جاتا ہے،

عورت اور مرد کی حیثیت یہ کہنا کہ عورتیں مردوں سے کمتر ہیں، محض مردوں کا اختراع ہے، اور وہ اپنی خود غرضی سے ایسا کہتے ہیں، عورت اور مرد دونوں ازدواجی زندگی کے برابر حصہ دار

اور ذمہ داریاں، اس لئے زندگی کی گتھیوں اور پیچیدگیوں کو سلجھانے کے لئے دونوں کی مساویانہ جرأت اور ہمت کی ضرورت ہے، ان میں سے کسی کا یہ خیال کرنا کہ بعض مشکلات کو حل کرنا اس کا فرض نہیں، دونوں کی زندگی کے لئے مہلک ہے، کیونکہ زن وشو کی زندگی ایک فریضہ ہے، کوئی صلحنامہ یا معاہدہ نہیں کہ "تم یہ کام کرو اور میں وہ کام انجام دوں"، اگر اسکو صلحنامہ یا معاہدہ قرار دیا جائے، تو بہت ممکن ہے کہ کچھ دنوں کے بعد فریقین میں سے کوئی فریق اسکی پابندی میں ہر قسم کا نقصان اٹھانے کے بعد صلحنامہ سے دست بردار ہونے کی کوشش کرے، یا اگر ازدواجی زندگی کا تخیل یہ ہو کہ ایک طاقتور فرد ایک کمزور فرد کو اپنے سایۂ عاطفت میں لیتا ہے، تو اسکی بنیاد بہت مستحکم نہیں ہوسکتی ہے، کیونکہ ایسی حالت میں بہت ممکن ہے، کہ طاقتور فرد کمزور فرد کی لاچاری اور بے بسی سے بے جا فائدہ اٹھا کر اسکی زندگی کو بے مزہ کردے یا اس کو اپنے لئے بار سمجھکر اپنی زندگی کو تلخ بنالے،

ازدواجی زندگی کا انحصار سراسر محبت پر نہیں ہوسکتا، محبت، شادی کی محض جذباتی تمہید ہے یہ ازدواجی زندگی کے لئے ایک اچھی بنیاد ہوسکتی ہے، مگر اس سے ازدواجی زندگی کی پوری عمارت تعمیر نہیں ہوسکتی، زوجین میں سے اگر کوئی یہ سمجھتا ہے، کہ دوسرا فریق ہر چیز اسکی خواہش کے مطابق انجام دیتا رہے گا، سراسر غلطی ہے، ازدواجی زندگی اسی وقت کامیاب ہوسکتی ہے، جب فریقین میں سے ہر ایک اپنے سے دلچسپی لینے کے بجائے دوسرے کی طرف اپنی ساری توجہ برابر قائم رکھے،

ازدواجی زندگی میں اقتصادی اور دوسری مشکلات برابر پیش آتی رہتی ہیں، ان کا دور کرنا مشکل نہیں، بشرطیکہ فریقین میں یکجہتی اور یگانگت ہو، بعض عصبی المزاج زوجین مشکلات کو حل کرنے کے لئے اپنے کو بالکل بے بس پاتے ہیں، مگر یہ عموماً وہی ہوتے ہیں، جو تاہل زندگی کو ایک فریضہ تصور کرنے کے بجائے اپنے کسی خاص مقصد کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتے ہیں،

ازدواجی زندگی میں ایسا زمانہ آتا ہے جب کہ وہ بالکل مکدر اور تلخ معلوم ہوتی ہے، لیکن دراصل یہ تکدر اور تلخی نہ شریک حیات کے خلاف پیدا ہوتی ہے، اور نہ متاہل زندگی کے، یہ سراسر دنیاوی زندگی سے بیزاری کا نتیجہ ہوتا ہے، اگر زندگی کا ایک خوشگوار تخیل، اور دلپذیر نصب العین رکھا جائے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ متاہل زندگی اجیرن ہو،

خواب کا تواتر — تکلیف دہ اور ناخوشگوار واقعات کی یاد سے خواب میں تواتر پیدا ہوتا رہتا ہے، کبھی گذشتہ حادثہ کا خوف، یا آیندہ ناکامیابی کا خطرہ ایسا دل میں بیٹھ جاتا ہے کہ خواب میں یہ خوف اور خطرات بہیم نظر آتے رہتے ہیں، اقتصادی پریشانی، مالی تباہی، اور بے روزگاری کی داستانیں خواب میں مختلف صورتوں میں نمودار ہوتی ہے، جو اعلیٰ جذبات کی پرورش اور ذہن کے نشو و نما کے لئے مہلک ہے، بعض اوقات خواب کے تواتر کا نتیجہ ذہنی انتشار، دنیا سے بیزاری بلکہ خودکشی ہوتا ہے، اور یہ محض اسلئے کہ بچپن میں لڑکوں کو عام طور سے نئے واقعات اور حوادث کے مطابق اپنے کو بنا لینے کی تربیت نہیں دی جاتی ہے، جن لڑکوں کو نئے حالات و واقعات کے مطابق اپنے کو ڈھالنے کا تجربہ ہے، وہ اپنی مشکلوں اور دقتوں کو اپنی کامیابی اور بھلائی کا زینہ سمجھتے ہیں،

"ص ع"

کام

کام کی زیادتی کا آخر کیا سبب ہوتا ہے؟ یا تو کام کرنے والے میں کوئی نقص ہوتا ہے، جسکی بنا پر وہ سارے کام کو وقت پر انجام دینے سے قاصر رہتا ہے، یا وہ اپنے حریف اور مدمقابل سے سبقت لیجانے کی کوشش میں برابر مشغول رہتا ہے یا اس کو اپنی کمتری کا احساس ہوتا ہے، اور وہ اپنے کو برتر ثابت کرنے کی خاطر کسی نہ کسی کام میں منہمک ہوتا ہے، یا اپنے تکدر، رنج اور ملال کو دور کرنے کے خیال سے وہ مختلف قسم کے کاموں میں دلچسپی لیتا رہتا ہے، اگر کام کی کثرت کے باعث اسکی صحت خراب ہوجاتی ہے،

تو اس کا بڑا سبب کام کی زیادتی نہیں، بلکہ حصول مقصد کی ناکامی کا خوف ہے،

کام مضر ہونے کے بجائے ہمیشہ مفید ہے، ایک مشغول آدمی ایک کاہل شخص سے کہیں زیادہ مسرور رہتا ہے، کام میں خواہ کیسی ہی مشکل اور پیچیدگی ہو اس کے انجام دینے میں جو حظ اور لطف ملتا ہے، وہ بیکاری میں نہیں ملتا، خواہ اس میں کتنا ہی عیش و تنعم کیوں نہ میسر ہو، کام کا نتیجہ حسب خواہ نہ سہی، لیکن اس کی مشغولیت سے جو لذت حاصل ہوتی ہے، وہ بیکاری کی مضرت سے بہرحال بہتر ہے،

کام سے اگر زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا مقصود ہو تو سب سے پہلے اس غلط خیال کو دور کرنا چاہئے، کہ کام مقصد حاصل کرنے کا ایک ناخوشگوار ذریعہ ہے، کام سے لطف لینا ہی کام سے فائدہ حاصل کرنا ہے، بچے کھیل میں غیر معمولی جوش اور انہماک کا اظہار کرتے ہیں، یہ جوش اور انہماک کھیل سے نہیں، بلکہ اس جذبہ اور دلچسپی سے پیدا ہوتا ہے، جو ایک بچہ کھیل سے رکھتا ہے، وہ اپنی ہر مشغولیت میں اسی قسم کے جوش اور انہماک کا ثبوت دے سکتا ہے، مگر وہ اپنے بزرگوں کی زجر و توبیخ اور جبر اور دباؤ سے بعض خوشگوار چیزوں کو بھی ناخوشگوار سمجھنے کا عادی ہو جاتا ہے، اگر ایک شخص اپنے کام میں وہی جذبہ رکھتا ہو، جو بچے اپنے کھیل میں رکھتے ہیں، تو پھر اس کی زندگی کا ہر کام محض کھیل ہو جائے، بعض لوگ کام کو اپنے اعمال کی سزا تصور کرتے ہیں، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ اسکو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کا فضل سمجھنا چاہئے، جس کے ذریعہ بہت سی برائیوں سے چھٹکارا اور غم و مصیبت سے نجات ملتی ہے، جو شخص زندگی کے آخری لمحہ تک کام کرتا ہے، وہ اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک خوش رہتا ہے، کاہلی زندگی کو افسردہ اور مغموم بنا دیتی ہے، اس سے بڑھاپے کے آثار بھی جلد پیدا ہو جاتے ہیں،

کوئی شخص پیدائشی کاہل نہیں ہوتا، بچے فطرۃً بہت چست اور جوشیلے ہوتے ہیں، ؤ

جو کچھ دیکھتے اور سنتے ہین، اس سے ان کو دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے، دنیا ان کے لئے ایک عجائب خانہ ہوتی ہے، وہ کام کے ہر راز کو جاننا چاہتے ہین، اسی لئے ان کی تلاش و تجسس کی کوئی حد نہیں ہوتی، جب اون کی فطری تلاش و تجسس مین کوئی مزاحمت یا مداخلت ہوتی ہے، تو ان کی سرگرمی اور چستی مین فرق آجاتا ہے، اور ان کے بڑھتے ہوئے حوصلون مین کمی ہو جاتی ہے،

بچون کی ضرورت سے زیادہ نگہبانی اور محافظت بھی ان میں کاہلی پیدا کرتی ہی، بعض محتاط والدین اپنے بچوں سے کسی قسم کی غلطی کا ارتکاب پسند نہیں کرتے ہیں، اسلئے ان کو وہ کوئی ایسا موقع نہیں دیتے ہیں جس سے کسی غلطی کے ارتکاب کا احتمال بھی ہو، مگر یہ صحیح تربیت نہیں، بچے آزادی سے اپنی اندرونی قوت کا اظہار چاہتے ہیں، جب ان کو یہ آزادی نہیں ملتی ہی، تو وہ صحیح نشو و نما سے محروم ہو کر کاہل ہو جاتے ہیں، پھر آگے چل کر ان کو آزادی بھی ملتی ہے، تو ان میں اتنی خود اعتمادی نہیں ہوتی، کہ وہ کوئی کام انجام دے سکین، ان کی شخصیت فنا ہو کر برباد ہو چکی ہی،

بعض بچے اپنے شفیق والدین کے لاڈ پیار کو اپنی کاہلی کا ذریعہ بناتے ہیں شفیق والدین اپنی محبت کی بنا پر اپنے بچوں کو کوئی ایسا کام نہیں کرنے دیتے جس میں وہ غیر معمولی طور سے منہمک ہو کر پریشان ہوں، بچے اس شفقت سے فائدہ اٹھا کر اپنی ساری سرگرمی اور اولوالعزمی کھو بیٹھتے ہیں، اور اپنا ہر کام والدین ہی کے ہاتھوں سے انجام پانے کے عادی ہو جاتے ہیں، اور جب وہ اپنی کاہلی اور سستی ہی کے ذریعہ والدین کی محبت سے مستفیض ہوتے رہتے ہیں، تو پھر ان کو چست اور سرگرم بننے کی کیا ضرورت ہی،

بعض کام ایسے ہیں، جن کو انجام دینے میں بچوں کو تکدر اور الجھن پیدا ہوتی ہے، مگر ایسے کام وہی ہوتے ہیں جنکا کرنا خود ان کے والدین کو جبراً و کراً گوارا کرنا ہی، کام خواہ کیسا ہی ادنیٰ

مشکل ہو اگر والدین خود اسکو بطیب خاطر کریں تو پھر کوئی سبب نہیں کہ ان کے بچے بھی اسکی طرف رضا و رغبت کیساتھ متوجہ نہ ہوں، بچوں کی سستی اور کاہلی میں ان کے والدین کے عادات و اطوار کا مظاہرہ ہوتا ہے،

کام مشکل بھی ہوتا ہے، مگر اسی وقت جب کام کرنے والا بعض خاص اسباب کی بنا پر اس کو ظاہر کرنا نہیں چاہتا، کہ وہ کام اس کو پسند نہیں، اور جب کام پسند نہیں تو اسکو انجام دینے میں ہر قسم کی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں، ان پیچیدگیوں سے گھبراہٹ اور تکدر ہی کا نام جسمانی اضمحلال ہے، جس کا ردعمل سستی اور کاہلی ہے، مگر کام کرنے والے کو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے، کہ وہ کام کی زیادتی سے تھک گیا ہے، اور اسکو آرام کرنے کی ضرورت ہے،

کام کا خوشگوار اور ناخوشگوار یا مشکل اور آسان ہونا کام کرنے والے کے جذبہ پر منحصر ہے اگر اس کے جذبہ میں امنگ، جوش اور اولوالعزمی ہے، تو ہر ناخوشگوار کام خوشگوار ہے، اور اگر بیدلی بےرغبتی اور بےاعتنائی ہے، تو ہر آسان کام مشکل ہے، جس کا لازمی نتیجہ سستی اور کاہلی ہے،

کاہلی اور سستی کا علاج اس کو دور کرنے کی ہیم کوشش میں نہیں ہے، اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ وہ کاہل ہے اور اپنی کاہلی کو دور کرنے کی کوشش کر رہا ہے، تو یہ بالکل مضحکہ خیز ہے، کاہلی کا واحد علاج کام میں غیر معمولی دلچسپی پیدا کرنا ہے، خواہ وہ کام کیسا ہی ہو، کسی کام کو اپنے سے فروتر سمجھنا بھی کاہلی کی دلیل ہے، ہر کام اپنے رتبہ اور معیار کے مطابق ہو سکتا ہے، بشرطیکہ وہ رضا اور رغبت سے انجام دیا جائے،

"ص ع"

اخبار علمیہ

امریکہ کا تعلیم یافتہ طبقہ

ممالک متحدہ امریکہ کے ایک ماہر تعلیم نے ایک ہزار گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ کو سوالات کی ایک لمبی فہرست بھیجی تھی، ان کے جو جوابات موصول ہوئے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں اکثر ۲۵۰۰ سے ۱۰۰۰۰ ڈالر تک کی سالانہ آمدنی رکھتے ہیں، ان میں زیادہ تر اپنے پیشے کو پسند کرتے ہیں، اور اپنے آقا اور افسر سے خوش ہیں، گو ½ سے زیادہ اپنی آئندہ ترقی سے مطمئن نہیں ہیں، ان میں سے اکثر تجارتی خط و کتابت، اپنے پیشے کی روداد اور بجٹ تیار کرنے میں مہارت نہیں رکھتے اور صرف ½ تقریر کر سکتے ہیں، ان میں سے ½ اپنے مقررہ بجٹ کے اندر زندگی بسر کرتے ہیں، ⅓ بڑھاپے کے لئے مالی حیثیت سے کچھ مطمئن ہیں، زن و شو میں اختلاف عموماً گھریلو اخراجات کے سلسلہ میں پیدا ہوتا ہے، شادی کے بعد زن و شوہر میں مکان کی آرائش کی قدرتی خواہش ہوتی ہے، چنانچہ وہ مکان کو آرام دہ اور خوبصورت بنانے کی کوشش کرتے ہیں، بچوں کو ۵۰ فی صدی معقولیت سمجھا بجھا کر اور ۵۰ فی صدی زد و کوب کے ذریعہ قابو میں رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، ۰۰ فی صدی گھروں میں ماں اور باپ دونوں بچوں کی تربیت کے ذمہ دار ہوتے ہیں، فرصت کے اوقات کے مشاغل زیادہ تر اخبار بینی، اہل خاندان سے مختلف مسائل پر گفتگو، دوستوں سے ہنسی مذاق اور ریڈیو سے دلچسپی ہوتے ہیں، ریڈیو کے پروگرام میں زیادہ دلچسپی خبروں اور فٹ بال کے کھیلوں سے لی جاتی ہے، میگزین اور رسالے بھی پڑھے جاتے ہیں، جن میں Readers Digest، Time اور Life بہت مقبول

ہیں، عام طور سے کھیل، سفر اور علمی تحریروں کا کافی ذوق ہے، مگر ان چیزوں کے لئے ان کے پاس وقت نہیں،

مردوں کی خواہشات زیادہ تر یہ ہیں، کہ وہ ایک مسرور ازدواجی زندگی بسر کریں، مالی حیثیت سے مطمئن ہوں، اور بڑھاپے میں مالی سکون حاصل ہو، ان کا طرز رہایش آرام دہ ہو اور ان کے گھر کے لوگ خوش و خرم ہوں، عورتیں بھی عام طور سے مسرور ازدواجی زندگی، آرام دہ طرز رہایش اور خوشحال گھر کی متمنی ہوتی ہیں، مگر اس کے ساتھ ہی وہ ایسی اولاد کی خواہاں رہتی ہیں جن پر وہ فخر کر سکیں، وہ سفر اور اپنی زندگی میں کوئی غیر معمولی اور اہم واقعہ بہت پسند کرتی ہیں،

۸۰ فی صدی ووٹ دینے کے مستحق ہیں، سیاسی اور معاشرتی مسائل پر ۵۰ فی صدی اپنے مہمانوں سے . . . . ۷۹ فی صدی اپنے خاندان کے افراد اور ۶۳ فی صدی اپنے ساتھ کام کرنے والوں سے بحث و مناظرہ کرتے ہیں، صرف ½ سیاسی کاموں میں حصہ لیتے ہیں، ووٹ دینے کے علاوہ اور دوسرے شہری فرائض انجام دینا نہیں چاہتے، اور میونسپلٹی اور دوسرے مقامی معاملات کی طرف بھی بہت زیادہ متوجہ نہیں ہوتے،

مذکورۂ بالا ماہر تعلیم کا خیال ہے کہ اس صورتِ حال کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے، کہ امریکہ کی یونیورسٹیوں کی تعلیم بالکل ناقص اور ناکام نہیں، گو یہ عجیب بات ہے، کہ گریجوایٹ اور انڈر گریجوایٹ کے درمیان صرف تھوڑی سی مالی رعایت اور برتری کے علاوہ ذہنی اور ثقافتی حیثیت سے کوئی فرق نہیں، یہی کیفیت ان لوگوں کی بھی ہے، جو کالج کی تعلیم کے زمانہ میں اچھے اور خراب طلبہ کہلاتے ہیں، روزمرہ اور کاروباری زندگی میں دونوں یکساں سطح پر آجاتے ہیں، دونوں ایک ہی قسم کے ریڈیو کے پروگرام کے سننے کے عادی ہو جاتے ہیں، دونوں سینما میں ایک ہی قسم کا تماشا دیکھنا پسند کرتے ہیں، دونوں ایک ہی قسم کے رسائل پڑھتے ہیں، اپنے اپنے پیشے کے متعلق دونوں کا ایک ہی نقطۂ نظر قائم ہو جاتا ہے، دونوں

اپنی گھریلو زندگی میں ایک ہی قسم کے تفکرات میں مبتلا رہتے ہیں، اور دونوں معاشرتی اور شہری معاملات میں حصہ لینا بالکل غیر دلچسپ اور غیر اہم سمجھتے ہیں،

ایڈورڈ ویسٹر مارک کا انتقال

ایڈورڈ ویسٹر مارک نے جو ایک عرصہ تک لندن یونیورسٹی میں عمرانیات کا پروفیسر تھا، گذشتہ اکتوبر میں انتقال کیا، وہ ایک عمیق النظر فلسفی اور بین الاقوامی شہرت کا مالک تھا، اوائل زندگی میں اسکو خیال پیدا ہوا، کہ اخلاقی خیالات اور مذہبی اعتقادات میں گہرا تعلق ہے، چنانچہ اس نقطہ نظر سے اس نے یورپ کے علاوہ دوسری قوموں کی روایات اور اعتقادات کا مطالعہ کرنا چاہا، اور اس کے لئے مراکش کو منتخب کیا، اور وہاں جاکر چار سال تک مقیم رہا، یہاں اس نے نہ صرف انسانیاتی معلومات جمع کئے، بلکہ وہاں کے لوگوں طرز زندگی و غور وفکر سے بھی واقفیت حاصل کرکے ان کے رسم ورواج کو آسانی سے سمجھا جو تمدن کے مختلف دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں، یہاں کی تحقیقات اس نے اپنی مشہور کتاب "اخلاقی تخیلات کی ابتدا اور نشو ونما" (The origin and Development of moral ideas.) میں قلمبند کی جو دو جلدوں میں ۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی تھی، یہ کتاب بہت اہم اور بلند پایہ سمجھی جاتی ہے، اور اخلاقیات پر ایک فلسفیانہ مقالہ یا اخلاقی خیالات کی تاریخ کہی جاسکتی ہے، اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں تحلیلی اور تاریخی تجربوں میں امتزاج پیدا کرکے یہ دکھایا گیا ہے، کہ اخلاقی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کی ابتدا، معاشرتی تکدر اور تشکر سے ہوتی ہے، ڈاکٹر ویسٹر مارک کی اور دوسری تصنیفات یہ ہیں، مراکش میں انسانی شادی، رسم اور اعتقاد کی تاریخ (۲) اخلاقی اضافیت (۳) عیسائی مذہب اور اخلاق،

مصر کے آرٹس کالج میں مشرقی زبانوں کی تعلیم

مصر میں ایک شاہی فرمان صادر ہوا ہے، کہ مصر کے آرٹس کالج میں مشرقی زبانوں اور ان کے ادب کی تعلیم کے تین شعبے کھولے جائیں، پہلا شعبہ سامی زبانوں کی تعلیم کا ہو، اس میں اکادمی، کنعانی، آرامی، جنوبی، سامی کے ادب، زبان اور قواعد وغیرہ کی تعلیم دیجائے گی، دوسرا شعبہ اسلامی زبانوں کا ہو، جس میں فارسی، ترکی، اردو اور دوسری پرانی اور نئی زندہ غیر سامی زبانوں کی تعلیم ہوگی، تیسرا شعبہ مختلف ملکوں کی عربی بولیوں کی تعلیم کا ہو، اس میں مختلف ملکوں کے نئی اور پرانی عربی بولیوں کی تعلیم ہوگی،

ان شعبوں میں سے کسی ایک میں داخلہ کے لئے شرط یہ ہے، کہ عربی یا اس کے برابر کسی زبان کا سند یافتہ ہو، سامی زبانوں کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ان یورپین زبانوں کا جاننا ضروری ہوگا، جن میں طالب علم کو ادب کی سند ملتی ہے، طالب علم کو اجازت ہوگی، کہ مشرقی زبانوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان زبانوں کی بھی تعلیم حاصل کرے،

کامیاب طلبہ کو مشرقی زبانوں کے اس شعبہ کی سند دیجائے گی، جس میں انھوں نے تعلیم پائی، اور یہ سند اس علمی درجہ کے برابر ہوگی، جس سے ایک طالب علم ادب میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کر سکتا،

تصحیح

اکتوبر کے معارف میں دمشق کے علمی اداروں (۳۱۱) کی سرخی کے تحت میں بعض غلطیاں ہوگئی تھیں، ناظرین تصحیح کرلیں

غلط	صحیح	غلط	صحیح
دار الکتب الاہلیۃ الظہیریہ	دار الکتب الاہلیۃ الظاہریہ	الجمعیۃ السوریہ	الجامعۃ السوریہ
خیر الدین الزورق	خیر الدین الزرکلی،	قاموس العالم	قاموس الاعلام

قند پارسی

صحرا

از جناب اسد ملتانی

بیا منزل کنیم اے ہمدم فرزانہ در صحرا ۔۔۔ کہ دل بے پردہ بیند جلوہ جانانہ در صحرا

زمیں تصویر یکرنگی، فلک نقشِ ہم آہنگی ۔۔۔ فضا باشد مئے توحید را پیمانہ در صحرا

بہر گامے روا سجدہ، صنم پنہاں بہ ہر ذرّہ ۔۔۔ نہ باشد امتیازِ مسجد و بُت خانہ در صحرا

ہوائے صحن و بام و در بود نسوانیت پرور ۔۔۔ شود نشو و نمائے ہمتِ مردانہ در صحرا

نیارد تابِ ہا و ہُو در و دیوارِ کاخ و کُو ۔۔۔ "بکامِ دل[1] توان زد نعرۂ مستانہ در صحرا"

بیا دیوار بشگافیم زندانِ تمدن را ۔۔۔ کہ چُون موجِ ہوا رقصیم آزادانہ در صحرا

چہ داند برگِ گل در باغ روداد غمِ الفت ۔۔۔ زبانِ خار خوش می گوید این افسانہ در صحرا

کجا باشد خبر وابستگانِ شمعِ محفل را ۔۔۔ کہ می سوزد چراغِ لالہ بے پروانہ در صحرا

تبسم کردۂ بر خود حجابِ رنگ و بو داری ۔۔۔ اگر حکمت نمی بیند بجز ویرانہ در صحرا

نباید اے اسد ما را چرا ذوقِ بیابانہا

خدا را ہم پسند آمد بنائے خانہ در صحرا

---

[1] مصرع علامہ مستغنی مرحوم ملک الشعرا افغانستان۔

غزل

از جناب احسن صاحب نگرامی ایڈوکیٹ پرتاپگڈھ

نگاہِ یار کہ مستیش صد بہار دہد   ہزار بادہ بہ رندانِ بادہ خوار دہد

چہ عیشہا بہ دل این سلب اختیار دہد   رضاے یار دہد کیفِ اضطرار دہد

چہ کیف ہا نگہِ نیم باز یار دہد   نویدِ بادہ بہ ہر مست و ہوشیار دہد

ازیں فزون و ازین بہ چہ بایدم از عشق   دلِ فگار دہد چشمِ اشکبار دہد

جنون چہ طرہ ہمی پروردفضاے بہار   کہ دامنِ گلِ رعنا بدستِ خار دہد

خوشا بہارِ تصورِ شبِ درازِ فراق   بصد کرشمہ تماشاے زلفِ یار دہد

گلِ حیات بہ خارِ اجل ہم آغوش است   ہزار مرحلہ یک شامِ انتظار دہد

ہم آنچہ او بپسند د بہ آن روش دارم   مرا بہ اخترِ بختم چہ اختیار دہد

غزل

از نواب ضیا یار جنگ بہادر ضیا حیدرآباد دکن،

بادہ را صرف بے سبو چہ کنیم،   دل نداریم آرزو چہ کنیم،

دل شود مطمئن ز ذکرِ خدا،   ہمچو دیوانہ ہائے ہو چہ کنیم،

آب در چشمۂ طہارت نیست   فکرِ خوشش کردن وضو چہ کنیم،

غنچۂ دل سمومِ حسرت سوخت   باز امیدِ رنگ و بو چہ کنیم،

گوہر اندر صدف نیا سوداست   کوششِ حفظِ آبرو چہ کنیم

جامۂ عافیت ضیا چون گل   تار تا ماست شست و شو چہ کنیم

مطبوعات جدیدہ

اتاترک مولفہ جناب محمد مرزا صاحب دہلوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۶ صفحے کاغذ کتابت
طباعت بہتر قیمت مجلد ۶/ پتہ کتب خانہ علم و ادب دہلی،

اردو میں اتاترک مصطفےٰ کمال کی متعدد سوانحمریاں لکھی جا چکی ہیں لیکن یہ کتاب معلومات ماخذ کے استناد اور اسلوب تحریر، ہر لحاظ سے ان سب میں بہتر ہے، اس میں اتاترک کی پیدائش سے لیکر وفات تک کے حالات اور کارنامے اختصار اور جامعیت کے ساتھ لکھے گئے ہیں، اتاترک کی پوری زندگی عبارت ہے ترکی قوم کی خدمت سے، اسلئے یہ کتاب درحقیقت ترکی قوم اور ترکی حکومت کے زوال و عروج اسکی تباہی اور دوبارہ زندگی کی تاریخ ہی کہ جنگ عظیم میں کس طرح اس کا خاتمہ ہوا، اور مصطفےٰ کمال نے ایک شکست خوردہ اور پست و پامال قوم کو جس کا سیاسی وجود دنیا سے مٹ چکا تھا، گوناگوں مشکلات مخالف حالات اور ہر طرح کی بے سروسامانی کے باوجود محض اپنے عزم و استقلال ہمت و شجاعت اور تدبیر و سیاست سے کس طرح زندہ کرکے دنیا کی طاقتور اور ترقی یافتہ حکومتوں کی صف میں کھڑا کر دیا، ان سیاسی حالات کے ساتھ مصطفےٰ کمال کے اصلاحی اور تعمیری کارناموں کو بھی اس طرح پیش کیا گیا ہے، کہ اس سلسلہ کی بعض قابل اعتراض باتوں کے اسباب و مصالح بھی روشنی میں آجاتے ہیں، سیاسی واقعات کی خشکی ظاہر ہو لیکن مصنف کے طرز تحریر نے ان خشک واقعات کو دلچسپ داستان بنا دیا ہے، کتاب کے شروع میں ماخذوں کی فہرست بھی دیدی

محکومیتِ نسوان مترجمہ مولوی معین الدین صاحب انصاری بیرسٹرایٹ لا تقطیع چھوٹی،

ضخامت ۳۰۳ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ ر پتہ :۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

محکومیتِ نسوان (The. Subjection of Women) جان اسٹوارٹ مل کی مشہور تصنیف ہی، کچھ زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ یورپ میں بھی عورتوں کی حالت مشرق کی عورتوں سے کچھ بہتر نہ تھی، بلکہ ان کو وہ حقوق بھی حاصل نہ تھے، جو بعض مشرقی اقوام کی عورتوں کو حاصل ہیں، جان اسٹوارٹ مل نے عورتوں کی آزادی ومساوات اوران کے حقوق کی حمایت میں یہ کتاب لکھی تھی، اس میں اخلاقی تمدنی تاریخی، معاشرتی اورطبی مختلف پہلوؤں سے بحث کرکے دکھایا ہی کہ عورتیں کسی صلاحیت میں مردوں سے کم نہیں ہیں، انھیں ان کےحقوق اورآزادی سے محروم رکھنا صرف اس جنس پرظلم ہے، بلکہ اخلاق تمدن، شرافت تہذیب ومعاشرت اورازدواجی زندگی کے ساتھ دشمنی ہے، عورتوں کی آزادی کے خلاف جواعتراضات اوردلائل پیش کئے جاتے تھے، ان سب کا رد بھی ہے، خالص مشرقی نقطہ نظر سے مصنف کے تمام خیالات قابل قبول نہیں ہیں، لیکن اپنے دعووں کو بڑے فلسفیانہ استدلال سے پیش کیا ہے، بعض مقامات پر مذہبِ اسلام سے مصنف کی ناواقفیت ظاہر ہوتی ہے، لائق مترجم نے حاشیہ میں اس کی تردید کردی ہے، کسی فلسفیانہ کتاب کا ترجمہ کرنا بڑا دشوار کام ہے، لیکن لائق مترجم نے ایسا سلیس، شستہ اورسلجھا ہوا ترجمہ کیا ہی کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا،

کلیاتِ اسمٰعیل مرتبہ جناب محمد اسلم صاحب سیفی تقطیع بڑی ضخامت تقریباً ۵۰۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد للعہ ر پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

مولوی اسمٰعیل صاحب میرٹھی مرحوم کا کلام تعارف وتبصرہ سے مستغنی ہی، وہ اردو شاعری کے مجددوں میں تھے، ان کے صاحبزادے محمد اسلم صاحب سیفی نے ان کی زندگی ہی میں سنہ ۱۹۱۱ء میں ان کا کلیات مرتب کرکے شائع کیا تھا، اب اٹھائیس برس کے بعد دوسرا اڈیشن شائع کیا ہے، پہلے سے زیادہ جامع کیا

ت کے وقت جو کلام کلیات میں شامل ہونے سے رہ گیا تھا، یا بعد کو کہا گیا، وہ بھی اس ایڈ
یشن میں مرتب نے مصنف کے سوانح حیات کا بھی اضافہ کیا ہے جس میں خاندانی حالات پیدائش
ات تک کے سوانح، علمی، ادبی، تعلیمی اور قومی خدمات تصانیف و تالیفات کی تفصیل اور مصنف کی
ں کی تاریخ، اسکی خصوصیات، ہر دور کے تغیرات، اور اس عہد کی تصانیف پر تبصرہ ہے، سوانح کا
ید اضافہ ہے، اس سے مصنف کے حالات زندگی کے ساتھ اس دور کے اور بہت سے مفید اور دلچسپ
ت معلوم ہوتے ہیں، یہ کلیات یوں بھی ہر لحاظ سے قدر دانی کا مستحق تھا، مرتب نے اسکی آمدنی کو
یل گرلز اسکول پر وقف کرکے اسکی خریداری کو ہم خرما و ہم ثواب بنا دیا ہے،

قتیل اور غالب

مؤلفہ جناب سید اسد علی صاحب انوری فریدآبادی تقطیع چھوٹی ضخامت

۱۳۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲؍ پتہ:- مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

غالب اور قتیل کے حامیوں کی ادبی معرکہ آرائی، غالب کے دور کا مشہور واقعہ ہے، سید اسد علی
نے اس کتاب میں اسکی تاریخ اور قتیل پر غالب کے اعتراضات کی غلطیوں اور اپنے نقطہ نظر سے
ی غلط بیانیوں، افترا پردازیوں، اور خود ان کے کلام کی غلطیوں اور خامیوں اور ان کی تحریروں
ان کی اخلاقی کمزوریوں کو دکھایا ہے، اگر مؤلف نے اس بحث کو اس کے دائرہ تک محدود
ا ہوتا، تو خیر کسی حد تک یہ ادبی خدمت یا کم از کم ادبی تفریح ضرور ہوتی، لیکن اس میں غالب کی
یات اور ان کی برائیوں اور اخلاقی کمزوریوں کو شامل کرکے اسے بدنما بنا دیا ہے، اگر ان واقعات
ح مان بھی لیا جائے، جو خود ایک بحث طلب امر ہے، تو اس سے اس بحث کو کیا تعلق، بغیر اس کے
ن کی بحث زیادہ باوقعت ہوتی، البتہ اس کتاب نے غالب سے متعلق ایک نئے موضوع کا در وا کر دیا

پھول والوں کی سیر

مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی تقطیع چھوٹی ضخامت

۹۶ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مرقوم نہیں، پتہ کتب خانہ علم و ادب دہلی،

دہلی مرحوم کے تفریحی میلوں میں پھول والوں کا میلہ خاص چیز تھی جس میں عوام و خواص شریک رہتے تھے، جن چیزوں سے دلی عبارت تھی، ان میں ایک پھول والوں کا میلہ بھی تھا، مرزا غالب نے دلی کی تباہی کے سلسلہ میں پھول والوں کے میلہ کا بھی ماتم کیا ہے، اس میلہ میں بادشاہ اور شاہی بیگمات بھی شریک ہوتی تھیں، بلکہ انہی کی شرکت سے جان پڑتی تھی، شاہی بیگمات امریوں میں ساون مناتی تھیں، مرزا فرحت اللہ بیگ کے جادو نگار قلم نے دلی کے آخری مشاعرہ کی طرح پھول والوں کی سیر کی بھی پوری تصویر دکھا دی ہے، کتاب نہایت دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہے۔

مختار دلھن مؤلفہ محمد مرزا صاحب دہلوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۹ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۸ر پتہ کامران بک ڈپو دریا گنج، دہلی،

اس کتاب میں مؤلف نے شادی بیاہ کے بُرے مراسم، عورتوں کی جہالت کے نتائج، ان کی صحیح تعلیم و تربیت وغیرہ، ہماری معاشرت کے بعض قابلِ اصلاح پہلوؤں کو صحیح اور معتدل نقطۂ نظر سے افسانے کی شکل میں پیش کیا، زبان نہایت ستھری ہے، کتاب دلچسپ اور عورتوں کے لئے مفید ہے،

عروسِ سخن مرتبہ بیگم رضا صاحبہ تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۵ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ نظامی پریس بدایوں،

میر انیس کے مرثیوں کے متعدد انتخابات شائع ہو چکے ہیں، بیگم رضا نے زنانی مجلسوں میں پڑھنے کے گیارہ مرثیوں سے یہ انتخاب کیا ہے، لیکن بیان کا سلسلہ نہیں ٹوٹنے پایا ہے، اس انتخاب میں عورتوں کی زبان اور ان کے ذوق اور جذبات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے،

(م)

نئی کتابیں

نقوشِ سلیمانی، از مولانا سید سلیمان ندوی،
یہ ہندوستانی زبان و ادب سے متعلق مولنا کی تقریروں
مضامین اور مقدموں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے
بعض ادبی کتابوں پر لکھے، یہ مجموعہ تاریخی ادبی دونوں
حیثیتوں سے ہماری زبان کا آئینہ ہے،
ضخامت ۴۷۶ صفحے، قیمت عا ر

تاریخ اسلام حصہ اوّل (از آغاز اسلام تا حضرت حسینؓ)
اس کتاب میں عرب قبل از اسلام کے حالات اور
ظہور اسلام سے لیکر خلافت راشدہ کے اختتام تک کی
اسلام کی مذہبی، سیاسی، اور تمدنی تاریخ ہے،
مرتبہ شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی،
حجم ۳۸۷ صفحے قیمت سے ر

تابعینؒ، اس میں چھیانوے ۹۶ اکابر تابعینؒ کے سوانح
ان کے علمی، مذہبی، اخلاقی اور عملی مجاہدات اور
کارناموں کی تفصیل ہے، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی
ضخامت ۵۰۰ صفحے، قیمت : للعہ ر

تاریخ اخلاق اسلامی، اس میں اسلامی اخلاق کی تاریخ
اور قرآن اور احادیث کی اخلاقی تعلیمات پر مختلف
حیثیتوں سے نقد و تبصرہ ہے ضخامت ۴۷۰ صفحے قیمت عہ

فہم انسانی، یعنی ڈیوڈ ہیوم کی مشہور کتاب "ہیومن
انڈرسٹینڈنگ" کا ترجمہ اور اس کے مختصر حالات کیساتھ
اس کے خیالاتِ فلسفہ پر بحث و تبصرہ، حجم ۲۲۸ صفحے،
قیمت : عہ ر از مولانا عبدالباری ندوی،

مقالاتِ شبلی جلد ہشتم، مولانا کے مضامین کا یہ
مجموعہ ان کے متفرق مضامین، مختلف تجاویز اور
منصوبوں پر مشتمل ہے، ضخامت ۲۱۵ صفحے قیمت عہ

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں مولوی
ابوالحسنات مرحوم نے نہایت تلاش و تحقیق سے ہندوستان
کی قدیم اسلامی درسگاہوں پر ایک مقالہ لکھا تھا جو یہ
مقالہ اب کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے قیمت ۱۲ / ۱۳۲ صفحے

مسعود علی ندوی
منیجر
دارالمصنفین اعظم گڈھ

(طابع محمد اویس وارثی)